جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

سرکش

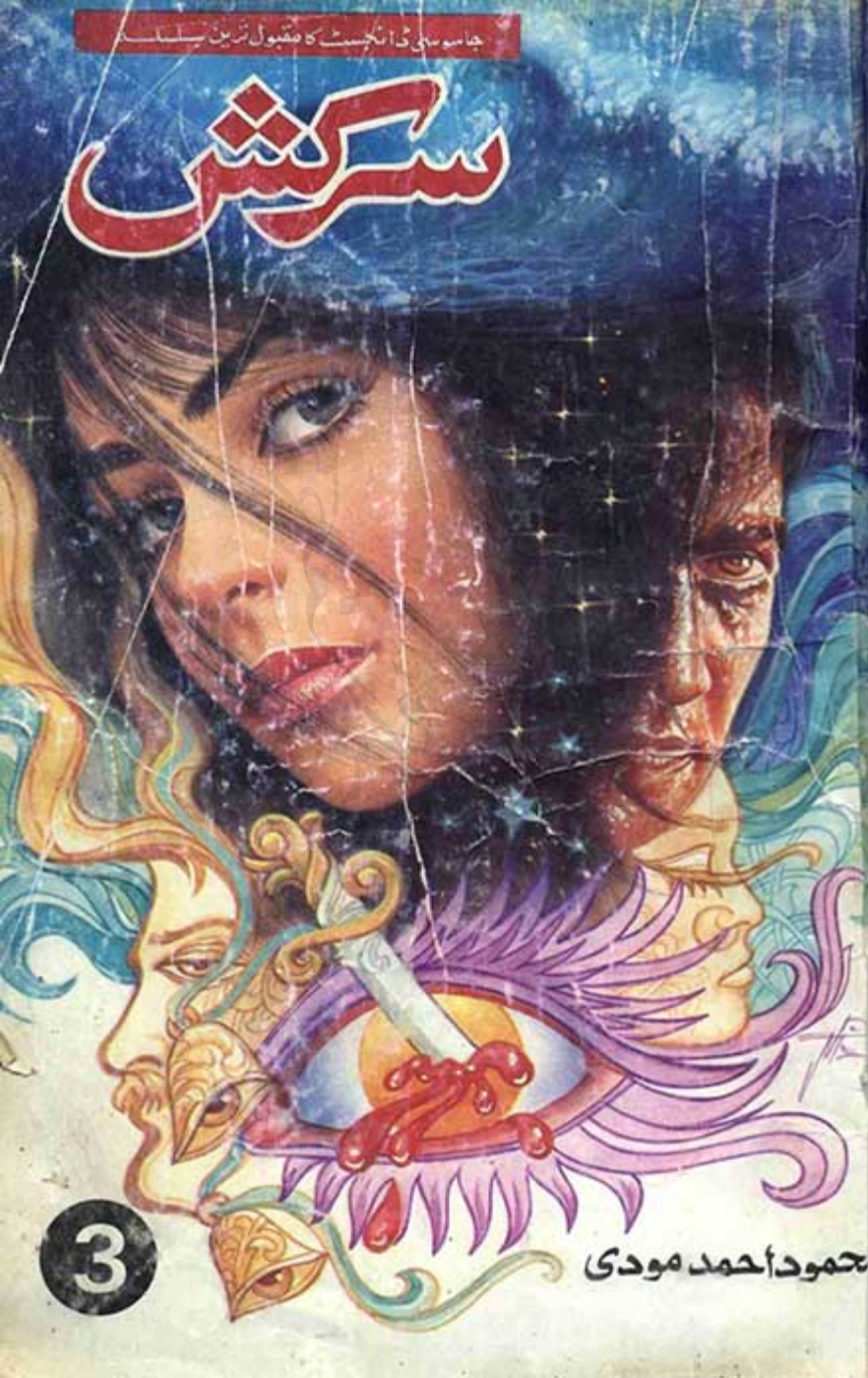

3

محمود احمد مودی

ایک ثانئے کے لئے تو میں گھبرا سا گیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسی دوران غیر ارادی طور پر میرا ایک ہاتھ جیب میں پڑے ہوئے ریوالور کی طرف چلا گیا اور دوسرے ہاتھ سے میں نے اس عورت کو مزید آگے بڑھنے اور اپنے آپ پر جھپٹنے سے باز رکھا۔

وہ مجھ سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر ہی رک گئی اور میں نے ریوالور نکالنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ اتنی خوفناک نہیں تھی جتنی چیخنے اور اچانک اٹھ کر جھپٹنے کی وجہ سے نظر آئی تھی۔ اس کی انگلیوں میں ایک سگریٹ سلگ رہی تھی جس سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی نو معمول سے کچھ زیادہ ناگوار تھی۔

جوانی میں وہ یقیناً ایک حسین عورت رہی ہو گی۔ مگر اب محض ایک کھنڈر تھی۔ اس کے کھچڑی بال منتشر تھے۔ لباس کا اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے دن سے وہ اس کے تن پر تھا۔ اس

کے ہونٹ کچھ سوچے ہوئے سے لگ رہے تھے اور ان پر بیماروں
ں نقاہت سی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ چہرے پر
جھائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ آنکھیں جو یقیناً کبھی بے حد خوبصورت
رہی ہوں گی وحشت سے پُر تھیں۔

مجھ پر جھپٹتے وقت تو وہ چلائی تھی۔ "آخر تم آ ہی گئے.... آؤ.... آؤ" لیکن جب میں نے ہاتھ سے اسے دو ڈھائی فٹ کے فاصلے پر روک دیا تو اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یوں میری طرف دیکھا جیسے از سر نو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر اس کے تاثرات یکدم بدل گئے۔ وحشت زدہ چہرے پر یک لخت شکست خوردگی پھیل گئی۔ ہونٹ لرزنے لگے اور سرخ سرخ وحشی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اس کا سر دھیرے دھیرے نفی میں ہلا اور پھر وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔ "نہیں.... نہیں.... تم تو وہ نہیں ہو...." اس کی آواز معدوم ہو گئی لیکن ہونٹ دھیرے دھیرے لرزتے رہے۔ ... پھر وہ شکست خوردہ سے انداز میں خود ہی پیچھے ہٹی اور اسی کمرے کی دہلیز پر جا بیٹھی جہاں سے اٹھ کر آئی تھی۔ آنسوؤں کی دو لکیریں اس کے رخساروں پر نمودار ہو چکی تھیں اور وہ قدرے مجنونانہ سے انداز میں اس مڑی تڑی سی سگریٹ کے کش لینے لگی جیسے اسے آن کی آن میں ختم کر دینا چاہتی ہو۔ فضا میں چرس کی ناگوار بُو پھیل گئی۔

اپنے عقب میں کسی کے گہری سانس لینے کی آواز سن کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ دبلا پتلا سا ایک سانولا نوجوان نہ جانے کس وقت میرے عقب میں سیڑھیاں چڑھ آیا تھا۔ اسے غالباً آگے جانا تھا لیکن میں اس کی راہ میں حائل تھا۔ تاہم وہ قطعی عجلت میں نہیں تھا۔ میری اس سے نظر ملی تو وہ قدرے افسردگی سے مسکراتے ہوئے ملائم لہجے میں بولا۔ "آپ پریشان نہیں ہوئے؟" اس وقت تک میرے تاثرات یقیناً معمول پر آ چکے تھے۔

"ہوا.... لیکن زیادہ نہیں...." میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ عورت پاگل ہے تو اسے پاگل خانے کیوں نہیں پہنچایا گیا؟"

"جن پاگلوں سے لوگوں کو ہمدردی ہوتی ہے انہیں عموماً پاگل خانے نہیں پہنچایا جاتا۔" نوجوان بڑے دھیمے لہجے میں بولا۔ وہ بے حد نرم خو نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ اس میں نوجوانوں والی تندی و طراری نہیں تھی۔ وہ معمولی سی قمیص پتلون اور سویٹر میں تھا اور اس کی روح پر کسی بے عنوان سی اداسی کی تہہ جمی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں بھی ہلکی سی افسردگی تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "اور پھر یہ کوئی ایسی خطرناک پاگل بھی نہیں ہے۔ یہ کسی کو نہیں ستاتی۔ اپنے آپ کو مختلف قسم کے نشوں میں غرق کئے اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہے۔ اس کا پاگل پن بس اتنا ہے کہ آپ جیسے کسی خوش پوش اور خوبرو آدمی کو آتے دیکھتی ہے تو بے اختیار اٹھ کر چلاتی ہوئی بھاگتی ہے۔ تم آ گئے..... تم آ گئے....؟ لیکن یہ اس کی صحیح الدماغی کی دلیل ہے کہ چند لمحے بعد خود ہی پیچھے ہٹ کر بیٹھ جاتی ہے۔ یعنی ا احساس ہو جاتا ہے کہ آنے والا وہ نہیں ہے جس کا اسے انتظا

"اوہ...." میں نے جتاسفانہ سے انداز میں گہری سانس کر عورت کی طرف دیکھا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک ا بیٹھی تھی۔ اب وہ ہماری طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ اس ک وا آنکھیں بظاہر بالکونی کے جنگلے کو دیکھ رہی تھیں لیکن ا نظریں یقیناً اس سے بھی کہیں دور مرکوز تھیں۔ ان دیوارو پار۔ یا پھر شاید وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

"آپ اسی عمارت میں رہتے ہیں؟" میں نے نوجوان پوچھا۔

"جی ہاں۔ میں پیدا ہی اس عمارت میں ہوا تھا۔" ا مسکراہٹ میں افسردگی کی آمیزش کچھ بڑھ گئی۔ "اور شاید عمارت میں مروں گا۔" لیکن دوسرے ہی لمحے وہ گویا اپنی افسرد چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ ہم میں سے بھی نہیں جانتا کہ اس عورت کو کس کا انتظار ہے۔" ان دو لفظوں 'اس عورت' پر اس نے کچھ زور دیا تھا۔ قدرے ہچکچاتے ہو انداز میں یہ الفاظ ادا کئے تھے۔

پھر وہ خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں اس کے 'اس عورت' کے الفاظ آپ کی طرف سے استعمال کر رہا ہوا ورنہ ہم کم از کم اسے پہچانتے ضرور ہیں اور اس کی آج بھی ع کرتے ہیں۔ مگر مجھے معلوم ہے آپ نے اسے نہیں پہچانا ہو آپ کی نظر میں یہ ایک عام سی پاگل عورت ہو گی۔ بہت کم لو اب اسے پہچانتے ہیں۔"

"کون ہے یہ خاتون؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"اپنے وقت کی ملکۂ جذبات شکیلہ بیگم۔" نوجوان نے ٹھہر ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔ "کبھی لوگ پردہ سیمیں پر اس اداکاری دیکھ کر رو پڑتے تھے۔ آج اس کی حقیقی زندگی دیکھ کر کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ شاید یہ دنیا میں صرف رونے رلا کے لئے ہی آئی تھی۔"

میں اپنی جگہ سن سا ہو کر رہ گیا۔ میں نے گہری نظروں اس عورت کی طرف دیکھا۔ اس کھنڈر میں واقعی مجھے ایک پہچانی سی عمارت کے مسخ شدہ خدوخال نظر آئے۔ اپنے بچپن لڑکپن میں میں نے اس کی بہت سی فلمیں دیکھی تھیں جو میر بچپن یا لڑکپن سے بھی پہلے کی بنی ہوئی تھیں اور بڑے بڑے شہر میں چلنے اور گھس پٹ جانے کے بعد ہمارے قصبے یا قریبی سیالکوٹ میں آ کر لگتی تھیں۔

میں نے ایک فلم میں اسے جوان کردار میں بھی دیکھا تھا۔ پناہ خوبصورت عورت تھی وہ۔ لیکن جوان کرداروں میں بہت آئی تھی۔ جوانی میں ہی مستقل طور پر اس کے بالوں پر سفیدہ ل گیا تھا۔ وہ ملکۂ جذبات کہلانے لگی تھی۔ بہت سے ایوارڈ لے

ے نے۔ بہت نام کمایا تھا۔ لیکن مجھے یاد نہیں تھا کہ کب اس کی ت کا سورج غروب ہونا شروع ہوا تھا اور کب وہ مکمل گمنامی کے ھیرے میں چلی گئی تھی۔ عملی زندگی میں آنے کے بعد ویسے بھی وں میں میری دلچسپی کم ہو گئی تھی۔

"یہ اس حال کو کیونکر پہنچ گئی؟" میں نے دکھ سے پوچھا۔

"یہ تو شاید اسے خود بھی معلوم نہ ہو۔ ہمیں بھی معلوم نہیں ہے۔ اسے یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔" نوجوان دھیمے لہجے ں بولا۔ "دو سال پہلے تک یہ لبرٹی مارکیٹ کے ایک فلیٹ میں ہتی تھی.... اور اس سے پہلے ایک اچھی بھلی کوٹھی میں رہتی تھی۔ نا ہے کوئی بانکا سجیلا نوجوان تھا جس کو اس سے محبت کا دعویٰ تھا۔ اس کا سب کچھ بیچ باچ کر ملک سے باہر چلا گیا۔ کچھ عرصہ اور ا میں رہتا تو شاید وہ اسے بھی بیچ جاتا...." نوجوان اپنے صوص افسردہ سے انداز میں مسکرایا اور ایک لمحے کے توقف سے ولا۔ "فلمی عورتیں بہت چالاک سمجھی جاتی ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ چالاکیوں میں انہیں بھی مات دے جاتے ہیں۔"

مجھے اس نوجوان میں ذرا کشش محسوس ہوئی۔ وہ بالکل ہی عام سا نوجوان نہیں تھا۔ اس میں یقیناً کچھ صلاحیتیں موجود تھیں جو شاید مناسب حالات میسر نہ آنے کی وجہ سے پنپ نہیں سکی تھیں۔ اگر یہ اندازہ غلط تھا تب بھی اس میں کم از کم انسانی اخلاص اور س کے سینے میں ایک درد مند دل ضرور موجود تھا۔

"تم کرتے کیا ہو نوجوان؟" میں نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"وہی جو اس ملک کے بیشتر نوجوان کرتے ہیں۔" اس کا لہجہ بارحانہ نہیں تھا پھر بھی اس میں ایک کاٹ تھی۔

میں سمجھ تو گیا تھا پھر بھی میں نے یونہی تصدیق کی خاطر کہا۔ میں سمجھا نہیں۔"

"بی اے کا بے وقعت سرٹیفکیٹ ہاتھ میں لئے جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہوں۔" اس نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں جواب دیا پھر ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک خالی لفافہ ذرا بلند کر کے مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔ "گھر والوں کے پکانے کے لئے دال دلیے کا کچھ سامان لینے گیا تھا۔ یہ انہیں دے کر میں اپنے سرٹیفکیٹس اور متعلقہ جیسوں کاغذات کی موٹی سی فائل اٹھاؤں گا اور حسب معمول دفتروں کے چکر لگانے اور ان افسروں کے سامنے پیش ہونے کے لئے نکل جاؤں گا جو اپنے ائرکنڈیشنڈ دفتروں میں بیٹھے 'انٹرویو انٹرویو' کھیل رہے ہوں گے۔ اس وقت تو میں آپ کو کافی حد تک انسانی حلیے میں نظر آ رہا ہوں لیکن واپسی پر آپ مجھے دیکھنے کے لئے یہاں موجود نہیں ہوں گے۔ اس وقت تک بسوں اور ویگنوں میں مرغا بن کر نہ جانے کہاں کہاں تک کا سفر کر کے اور نہ جانے کہاں کہاں تک پیدل چلنے اور دھول مٹی پھانکنے کے بعد حالت بہت بدل چکی ہو گی لیکن پھر بھی ان سب چیزوں سے زیادہ تکلیف دہ اور تھکا دینے والی چیز وہ ناکامی کی شرمندگی ہو گی جسے چہرے پر لئے مجھے اپنی ماں اور بہن بھائیوں کا سامنا کرنا ہو گا۔" اس کے لہجے میں اب بھی احتجاج یا تندی نہیں تھی لیکن اس پُرسکون جھیل کی تہہ میں یقیناً زہر گھلا ہو تھا۔

"تم رہتے کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس نے دوسری منزل کی بالکونی کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں ایک کمرے میں ہم پانچ افراد رہتے ہیں۔" جس کمرے کی طرف وہ اشارہ کر رہا تھا اس کا سفید دروازہ بند نظر آ رہا تھا۔

میں نے اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "نوجوان! تم کسی کل میں فون پر وقت طے کر کے مجھ سے ملو۔ شاید میں تمہارے لئے کچھ کر سکوں۔" اپنے نوجوان مجھے کارآمد محسوس ہوتے ہیں جن کے سینے میں راکھ کی تہہ میں کوئی نہ کوئی چنگاری سی سلگ رہی ہو۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

"محسن علی۔" وہ گہری نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے پہلی بار قدرے واضح انداز میں مسکرایا۔ "لیکن میں کبھی کسی پر کوئی احسان کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔ بلکہ کسی محسن کی تلاش میں ہی رہا ہوں مگر وہ بھی مجھے نہیں ملا۔"

"ممکن ہے اب تمہاری اس تلاش میں کامیابی کا وقت آ گیا ہو۔" میں نے کہا۔

"شاید" وہ بے یقینی سے مسکرایا۔ میرا کارڈ بھی اس نے قدرے بے یقینی ہی کے سے عالم میں دو انگلیوں میں دبایا ہوا تھا۔ شاید اس کم عمری میں ہی اسے اتنی مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ اب اسے لوگوں کی باتوں کا زیادہ اعتبار نہیں رہا تھا۔ خصوصاً یوں سرراہ مل جانے والے لوگوں کی باتوں کا۔

"تمہارے توسط سے شاید میں اس کے لئے بھی کچھ کرنا چاہوں۔" میں نے شکیلہ بیگم کی طرف اشارہ کیا جو اپنی سگریٹ ندیدے انداز میں تقریباً فلٹر تک ختم کر کے اٹھ کر کمرے میں جا رہی تھی۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور اسے اپنے گرد و پیش سے اب گویا قطعاً کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔

نوجوان نے ایک بار پھر گویا نظروں ہی نظروں میں مجھے تولنے کی کوشش کی۔ میں نے شکیلہ بیگم کے کمرے کے بوسیدہ سے دروازے کو دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "میرے لڑکپن میں یہ میری پسندیدہ ترین فنکاراؤں میں شامل تھی۔ میں سوچا کرتا تھا' کاش میں بھی اس کی ایک جھلک دیکھنے میں کامیاب ہو سکوں..... فلمی دنیا واقعی عبرت کی جگہ ہے۔"

"ساری دنیا ہی عبرت کی جگہ ہے جناب" محسن علی جلدی سے بولا۔ "فلمی دنیا کے عبرت آموز تماشے نظروں کے سامنے کچھ زیادہ ہی آتے ہیں اس لئے وہ زیادہ زبان زد عام رہتے ہیں۔ ورنہ عبرت کا سامان کس جگہ نہیں ہے؟ دیکھنے والی نظر چاہئے...."

وہ درست کہہ رہا تھا مگر پھر وہ گویا خود ہی اس بحث کو بیکار سمجھتے

کالی دنیا

ایم اے راحت کے ایڈونچر

قلم سے

قیمت =/200 روپے

ناشر مکتبہ القریش
اردو بازار لاہور

ہوئے موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "کوئی رفاہی ادارہ شکیلہ بیگم کی مدد کرنا موزوں نہیں سمجھتا۔ حتیٰ کہ پبلسٹی کے نقطۂ نظر سے بھی نہیں۔ ... شاید اس لئے کہ معاشرے کے مروّجہ معیار اور پیمانے کے مطابق اس کا شمار اچھی عورتوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کیونکر اس کی مدد کا ارادہ کر رہے ہیں؟"

"اچھے لوگوں کے لئے تو اس دنیا میں کوئی بھی کسی بھی وقت کوئی بھی کام کر سکتا ہے۔ میں بھی حسب توفیق کرتا رہتا ہوں۔ لیکن معاشرے کی نظر میں برے آدمیوں کے لئے کچھ کرنے کے لئے ذرا زیادہ حوصلہ اور ذرا زیادہ کشادہ دلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے بھی یہ پابندی رکھ دی ہوتی کہ وہ صرف اچھے، پارسا اور نیک لوگوں ہی کو رزق دے گا تو دنیا کتنی ویران سی ہو جاتی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور پھر میں تو عموماً ان بروں کے کام آنے کی کوشش کرتا ہوں جو کبھی اچھے تھے یا کبھی جن کے اچھے ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔"

"بے شک۔" وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔ پھر وہ جیسے کسی خیال سے چونکا اور سر کو خفیف سا جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ "یہ بتایئے آپ یہاں کس سے ملنے کے لئے آئے ہیں؟ کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

"مجھے کسی سے ملنا نہیں ہے۔ صرف ایک کمرے کے سازوسامان پر ایک نظر ڈالنی ہے۔ تیسری منزل پر ہے وہ کمرا۔ میرا خیال ہے میں رہنمائی کئے بغیر بھی آسانی سے وہاں تک پہنچ جاؤں گا۔"

وہ سمجھ گیا کہ میں اسے ساتھ لے جانا نہیں چاہتا۔ مودبانہ انداز میں سلام کر کے بولا۔ "تو پھر مجھے اجازت۔ میں آپ کو فون ضرور کروں گا۔ میرا نام یاد رکھیئے گا۔ محسن علی۔"

"مطمئن رہو۔ اس نام کو میں نے اپنے ذہن کے اس خانے میں ڈالا ہے جہاں یاد رکھی جانے والی چیزیں موجود ہیں۔" میں نے اسے تسلی دی اور آگے بڑھ کر دوسری منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

محسن علی کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ تیزی سے میرے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ "سر! میں ایک بات اور بتا دوں.... شاید اس کا ابھی بتا دینا ہی اچھا ہو.... میرا مسئلہ یہ بھی ہے کہ میں اپنے بارے میں کوئی بات چھپا نہیں سکتا.... سر! ہمارا خاندانی پس منظر کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔"

"میرے دفتر میں کوئی تم سے تمہارے خاندانی پس منظر کے بارے میں نہیں پوچھے گا۔" میں نے ایک لمحے کے لئے رک کر بے پروائی سے کہا۔ اس نے ایک آسودہ سی طویل سانس لی اور میں مڑ کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں کئی سیڑھیاں چڑھ چکا تب اس نے آہستگی سے میرے عقب میں سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ میں اس وقت تیسری منزل پر پہنچ چکا تھا جب میں نے اسے نیچے والی بالکونی میں اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ میں کچھ آگے بڑھا اور تیسری منزل کی بالکونی میں داخل ہو گیا۔ غنیمت تھا کہ عمارت کی ترمیم بوسیدگی کے باوجود ہر کمرے کی پیشانی پر نمبر موجود تھا۔

میرے مطلوبہ نمبر والے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ میں اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی اور ایک انگلی سے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟ اندر آجاؤ...." ایک بیٹھی بیٹھی اور قدرے لرزاں سی آواز سنائی دی۔ آواز نسوانی تھی۔ اس کے ساتھ مدھم سی ایک ایسی آواز بھی سنائی دی جیسے کوئی بچہ نیند میں رو اور پھر کروٹ بدل کر خاموش ہو گیا ہو۔

میں نے ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں دروازہ کھول کر قدم رکھا۔ وہ بڑے دروازوں اور بڑی کھڑکیوں والا ایک طویل عریض کمرا تھا جیسے پرانی طرز کی کئی منزلہ عمارتوں میں عام طور ہوتے ہیں۔ فرش ٹائیلوں کا تھا۔ کمرے کے دوسری طرف بھی باہر کو نکلی ہوئی ایک چھوٹی سی بالکونی موجود تھی۔ کمرے میں دیوار الماریاں بھی موجود تھیں۔ ایک کونے میں مٹی کے تیل کا چولہا اور دیگر مختصر سامان موجود تھا، جیسا بچپن میں ہوتا ہے۔ وہ گوشہ یقیناً ہی کا کام دیتا تھا۔

کمرے میں دائیں بائیں دونوں دیواروں کے ساتھ پرانی ساخت ہی کی دو مسہریاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک خالی تھی اور ایک سانولی سی ایک عورت گندمی سی رنگت کے ایک چھ سات سالہ بچے کو لئے لیٹی تھی۔ بچے کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور وہ آنکھیں بند کئے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے شبہ سا ہوا کہ وہ نیند میں نہیں بلکہ غشی کی سی کیفیت میں تھا۔

خود عورت بھی کوئی اچھی حالت میں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ ایک مڑے تڑے سے تکیے کے سہارے نیم دراز تھی اور ناہموار سے انداز میں سانس لے رہی تھی مگر اس کا ایک بازو بچے کے سر کے نیچے اور دوسرا ہاتھ اس کے سینے پر تھا۔ مسہری کے قریب ایک پرانی سی تپائی پر دواؤں کی بہت سی شیشیاں وغیرہ الٹی سیدھی پڑی تھیں۔

عورت کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بھیانک ویرانی تھی۔ جاننا مشکل نہیں تھا کہ اس کے پہلو میں لیٹا ہوا بچہ اس کا بیٹا تھا اور دونوں ماں بیٹا ہی بیمار تھے۔ شاید یہاں بھی کوئی کہانی میری منتظر ہو.... غربت و افلاس کی ان گنت کہانیوں میں سے ایک اور کہانی۔ افلاس کی بھی اپنی ایک بو ہوتی ہے جو اس کمرے کے ہر گوشے میں رچی ہوئی تھی۔

اس عورت میں غالباً اتنی سکت نہیں تھی کہ میری دستک پر دروازے تک آتی لیکن اب مجھے سامنے دیکھ کر اس نے سیدھی ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹی رہو.... لیٹی رہو۔" میں نے نیچی آواز میں جلدی سے کہا۔ "میں تمہیں بے آرام کرنے نہیں آیا۔"

میرے منع کرنے کے باوجود اس نے نہایت آہستگی سے بچے کے سر کے نیچے سے بازو نکالا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ماں بیٹے کے کپڑے اور بستر کی چادر وغیرہ سبھی کچھ میلا میلا سا تھا۔

نہایت دھیمی آواز میں وہ بولی۔ "بے آرام تو انہیں کیا جاتا ہے جن کی زندگی میں کوئی آرام ہو۔" بظاہر وہ ان پڑھ سی عورت لگتی تھی لیکن اس کا لہجہ بے حد شائستہ تھا۔

"غالباً آپ دونوں ماں بیٹا بیمار ہیں؟" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔ پہلے صرف میرا بچہ بیمار تھا۔ اس کی تیمارداری کرتے اور اس کی فکر میں گھلتے چند دن سے میں بھی بیمار ہو گئی ہوں۔" ... وہ سرگوشی سے ذرا ہی بلند آواز میں بولی۔

"بچے کو بیماری کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹروں کو پتا نہیں چل پاتا تو میں ان پڑھ سی عورت کیا بتا سکتی ہوں جی۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی "جن چھوٹے موٹے ڈاکٹروں کے پاس جانے کے ہم متحمل ہو سکتے تھے، ان کے پاس جاتے رہے ہیں۔ اب دو تین دن سے تو ان کے پاس بھی جانے کی طاقت نہیں رہی۔ ہمت نہیں پڑتی کہ کسی ڈاکٹر سے جا کر کہا جائے کہ وہ بغیر فیس کے ہمیں دیکھ لے۔ مفت دوا دے دے۔"

"اوہ۔" میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ "اس بچے کا باپ .... میرا مطلب ہے آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟" میں غیر ارادی طور پر سوال کئے جا رہا تھا۔ جس مقصد کے لئے میں یہاں آیا تھا وہ سرد ست جیسے پس منظر میں چلا گیا تھا۔

"بچے کا باپ....؟" اس نے استہزائیہ سے انداز میں ہنسنے کی کوشش کی لیکن اس کی ہنسی مجھے ایک کراہ سے مشابہ محسوس ہوئی۔ ... ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ "آپ میرے لئے اجنبی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم آپ کس سلسلے میں یہاں آئے ہیں لیکن بہرحال آپ ایک شریف اور معزز آدمی معلوم ہوتے ہیں اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ آپ مجھے برا بھلا نہیں کہیں گے، کوئی فتویٰ صادر نہیں کریں گے۔ اس لئے بتا دیتی ہوں...." لیکن پھر وہ یکدم خاموش ہو گئی اور اجڑی اجڑی آنکھوں سے ہوا میں نہ جانے کس چیز کو گھورنے لگی۔

ایک لمحے انتظار کے بعد میں نے ملائمت سے پوچھا۔ "آپ کیا بتانے لگی تھیں؟"

"ایک سچی بات۔" وہ سرسراتی آواز میں بولی۔ "لیکن پھر ڈر گئی۔"

"مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

تب وہ پہلے سے بھی زیادہ مدھم لہجے میں بولی۔ "سچی بات یہ ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم اس بچے کا باپ کون تھا.... اور اگر معلوم بھی ہوتا تو کوئی فرق نہ پڑتا.... وہ بہرحال مجھے یا اس بچے کو ڈاکٹروں کے پاس لے جانے یا ہماری دیکھ بھال کرنے کا پابند نہ ہوتا۔ ... چند لمحوں کی سودے بازی کے ثمر کو کوئی عمر بھر کے لئے گلے میں لٹکائے تو نہیں پھرتا۔"

میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ کبھی فرش کی طرف دیکھنے لگتی اور کبھی اپنے بچے کی طرف۔ میں سوچ رہا تھا۔ بڑی باحوصلہ ہوتی ہیں یہ مائیں جو ان بچوں کو بھی دیگر ماؤں ہی کی طرح سینے سے چمٹا کر اپنا خون پلا کر پالتی ہیں جو ان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ کہلاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ معاشرے میں قدم قدم پر مطعون ہو سکتی ہیں۔

"تم کون ہو؟" مجھے اب اس کو اجنبیت آمیز لہجے میں پکارنا اچھا نہیں لگا۔

"ایکسٹرا گرل ہوں.... بلکہ تھی ہی سمجھئے.... خاصا طویل عرصہ ہو گیا ہے اب تو اسٹوڈیو گئے ہوئے بھی۔ لگتا ہے کچھ زیادہ ہی ایکسٹرا ہو گئی ہوں۔ کسی کو بھی میری ضرورت نہیں پڑتی۔" اتنا کچھ بول کر گویا اس کے دل کا بوجھ کچھ کم ہوا اور وہ ذرا چونک کر قدرے بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ "آپ مجھے نہیں جانتے اس لئے زیادہ امکان تو یہی ہے کہ آپ مجھ سے ملنے نہیں آئے ہوں گے۔ اخلاقاً مجھے آپ سے پوچھنا چاہئے تھا کہ آپ کون ہیں اور کس سے ملنا چاہتے ہیں لیکن میں آپ کو اپنے دکھڑے سنانے بیٹھ گئی۔"

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا

..."اس دنیا میں دکھڑے سنانے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھتی جارہی ہے اور دکھڑے سننے والے معدوم ہوتے جارہے ہیں۔ کسی کے پاس بھی کسی کے دکھڑے سننے کا وقت نہیں ہے۔ میں اپنے بارے میں بھی بتادوں گا اور اپنی آمد کا مقصد بھی بیان کردوں گا۔ لیکن اس سے پہلے تم ایسا کرو....."

میں نے اپنا پرس نکال کر دیکھا۔ اس میں تقریباً دو ہزار روپے تھے۔ نیچے گاڑی میں بریف کیس موجود تھا اور اس میں میری چیک بک اور کچھ نقد رقم بھی موجود تھی لیکن فی الحال میں نے وہ دو ہزار روپے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سروست تو یہ رکھو اور آج ہی خود کو اور اپنے بچے کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ ایک دو دن میں' میں تمہارے لئے مزید کچھ رقم بھجواؤں گا۔ اتنی رقم کہ تم اچھی طرح اپنا اور بچے کا مکمل علاج کرا سکو اور اس کے بعد اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکو۔ تم یقیناً باہمت عورت ہو۔ ایک بار سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں تو جلد ہی سنبھل جاؤ گی اور دوبارہ زندگی کے راستے پر چل پڑو گی۔ بس میں اتنا ہی تمہارے کام آسکوں گا۔ کبھی کبھی بہادر لوگ بھی زندگی کی جنگ میں گر پڑتے ہیں۔ انہیں صرف اتنے ہی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے کہ سنبھالا لے سکیں۔ اس کے بعد وہ خود ہی سب کچھ کر لیتے ہیں۔"

اس نے میری بات توجہ سے سنی لیکن اس کا ہاتھ نوٹوں کی طرف نہیں بڑھا بلکہ اس نے ہاتھوں کی انگلیاں مضبوطی سے ایک دوسرے میں پھنسالیں اور مجروح سے لہجے میں بولی۔ "نہیں جی.... بہت بہت شکریہ..... میں نے کبھی کسی اجنبی سے ایسی رقم قبول نہیں کی جو ترس کھا کر دی جارہی ہو۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ مجھ پر ترس یا رحم کھایا جائے۔ اسی خواہش نے تو مجھے زیادہ قابل رحم بنا دیا ہے۔"

"تم میری توہین کر رہی ہو۔ میرے جذبے کی توہین کر رہی ہو!" ...میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "میں یہ رقم تم پر ترس کھا کر نہیں دے رہا..... اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم نے اپنے متعلق جو بھی تھوڑا بہت بتایا ہے وہ میری ہمدردیاں حاصل کرنے یا میرے جذبۂ ترحم کو بیدار کرنے کے لئے نہیں بتایا۔ وہ سب کچھ بالکل غیر ارادی تھا... اور میں اگر تمہارے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں تو اسے بھیک مت سمجھو۔ یہ ایک مخلص انسان کا دوسرے انسان کے لئے حقیر سا تحفہ ہے۔ جب تم سنبھل جاؤ' زندگی کے منہ زور گھوڑے کی لگام دوبارہ تمہارے ہاتھ میں آجائے تو تم بھی میرے لئے کوئی خلوص بھرا تحفہ بھیج دینا۔ خواہ وہ بازار سے خریدا ہوا ایک گلدستہ ہی ہو۔ میں سمجھوں گا خلوص کا قرض خلوص سے ادا ہو گیا۔"

میں نے ایک بار پھر نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ اس بار اس نے کانپتے ہاتھ سے نوٹ تھام لئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"ملکہ...." اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئی استرائیہ سے لہجے میں کہا۔ "والدین بھی بعض اوقات اولاد کے نام ایسے رکھ دیتے ہیں کہ آگے چل کر ستم ظریفانہ محسوس ہوتے ہیں۔ بے چاری ملکہ بیمار بچے کے ساتھ اس افلاس زدہ پرانی عمارت میں پڑی سسک رہی ہے۔ مالک مکان نے عمارت میں رہنے والے سب لوگوں کو بے دخلی کے نوٹس دے رکھے ہیں کیونکہ وہ بھاری پگڑیاں لے کر یہ کمرے فلمی دفاتر کے لئے دینا چاہتا ہے۔ بے چاری ملکہ.....!"

"یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں۔ بعض کہانیوں میں کسی ملکہ یا شہزادی پر ایسا وقت بھی آجاتا ہے۔"

وہ نوٹ تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے بولی۔ "لیکن سر.....! مجھ جیسی عورتیں..... بچے اور مرد تو اس معاشرے میں بلکہ ساری دنیا میں قدم قدم پر بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ان گنت تو ہم سے بھی کہیں برے حال میں ہوں گے۔ آپ کس کس کی مدد کریں گے' کس کس کو اپنے خلوص کا نذرانہ پیش کریں گے؟"

"میرا ایک خواب ہے ملکہ..." میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "کہ دنیا میں حد سے زیادہ پریشان حال' مظلوم' ازیتوں اور ذلتوں کے مارے لوگ نہ ہوں۔ یہ دنیا سبھی کو رہنے کے قابل نظر آئے۔ لوگ زندگی کو محض سزا سمجھ کر نہ کاٹیں۔ لیکن ظاہر ہے میں اکیلا اس خواب کی تعبیر نہیں ڈھونڈ سکتا۔ اگر کسی طریقے سے میری حیثیت کے دو چار سو آدمی بھی یکجا ہو سکتے اور ہم خیال ہو کر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چل سکتے تو شاید ہم دنیا کے نہیں تو کم از کم اپنے ملک کے کسی چھوٹے موٹے گوشے میں تو کوئی چھوٹا موٹا انقلاب لے ہی آتے۔ لیکن فی الحال چونکہ یہ بھی ممکن نہیں۔ اس لئے بس سرراہ چلتے چلتے جو کچھ میں آسانی سے کر سکتا ہوں کرتا چلا جاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دنیا کے دکھوں میں اس سے کوئی کمی نہیں آسکتی لیکن چند لمحوں کے لئے میرے ضمیر کو اپنے حبس زدہ خول سے نکل کر فرحت بخش ہوا میں چند سانسیں لینے کا موقع مل جاتا ہے۔ اگر لوگ انسان کی فلاح کی طرف سے اتنے ہی مایوس ہو جائیں تو بڑی مشکل ہو جائے۔ تمام فلاحی ادارے بند ہو جائیں اور تمام نیک طینت لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قیامت کے انتظار میں بیٹھ جائیں۔ دنیا اور بھی زیادہ بدصورت ہو جائے۔"

ملکہ ایک میلی سی چادر اپنے گھٹنوں پر ڈالتے ہوئے بولی۔ "آپ نے اپنے نظریات اور خیالات کے بارے میں تو مجھے اتنا کچھ بتا دیا۔ اب کچھ اپنے بارے میں بھی بتا دیجئے۔"

"بتادوں گا۔ لیکن وہ زیادہ اہم نہیں ہے۔ زیادہ اہم وہ کام ہے جس کے لئے میں یہاں آیا ہوں۔ مجھے بھی چونکہ کبھی کبھی ہی اپنے دل کی باتیں کرنے کا موقع میسر آتا ہے اس لئے میں کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول بھال جاتا ہوں۔"

"میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے ابھی تک آپ کو بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔ مجھے یہاں آپ کے شایان شان کوئی کرسی نظر نہیں آرہی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کو کہاں بٹھاؤں۔" اس کے لہجے میں واقعی انتہائی معذرت اور انتہائی احساس محرومی تھا۔

"میں کوئی ایسا شان و شوکت والا آدمی نہیں۔" میں نے قریب ہی موجود ایک پرانی اور نیم شکستہ سی کرسی کھینچتے ہوئے کہا۔

میں اس پر بیٹھ چکا تو وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کے کس کام آسکتی ہوں؟"

"نشاط عرف بے بی نامی ایک ایکسٹرا گرل غالباً اس کمرے میں تمہارے ساتھ رہتی تھی؟" میں نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"رہتی تھی نہیں.... رہتی ہے۔" اس نے گویا تصحیح کی۔ "کل سے وہ کہیں غائب ہے۔ لیکن ہم جیسی لڑکیوں کا چونکہ ایک دو راتوں کے لئے اپنے ٹھکانوں سے غائب ہو جانا کوئی انوکھی بات نہیں اس لئے مجھے اس کے بارے میں کوئی تشویش نہیں۔"

"اب تمہیں تشویش ہوتی بھی تو کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" اس کی آنکھیں کچھ پھیلیں۔

"اسے گزشتہ رات قتل کر دیا گیا ہے۔" میں نے اسے بتا دینا بہتر سمجھا۔

"نہیں...." اس کے حلق سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی اور وہ گویا مسہری سے گرتے گرتے بچی۔ اس کے اس طرح لڑکھڑانے سے بچہ ایک بار پھر نیند یا غشی میں کسمسایا اور کراہنے کے انداز میں ایک لمحے کے لئے رویا۔ اس کی آواز افسردہ کر دینے والی تھی۔ ملکہ اس پر یوں جھک گئی جیسے کوئی مرغی اپنے چوزے کو پروں تلے چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ اس کی پیشانی سہلانے اور اسے چومنے لگی مگر اس دوران اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے رہے۔

بچہ ذرا بہلا تو وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی اور نہایت خاموشی سے رونے لگی۔ چند لمحے بعد اس نے خود ہی سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر اور آنکھیں سرخ تھیں۔ بخار کی تپش نے اس کے جسم کو دہکایا ہوا ہی تھا' اب آنسوؤں کی آگ نے یقیناً اس کے دل کو بھی آتش کدہ بنا دیا تھا۔

اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ شاید اس میں بولنے کی سکت باقی نہ رہ گئی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ میں نے اسے مختصراً بتا دیا کہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا۔

وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن پولیس تو میرے پاس نہیں آئی۔ ابھی تک مجھے اس قیامت کی اطلاع ہی نہیں ہوئی۔"

"پولیس بھی پہنچے گی لیکن ذرا آرام سے پہنچے گی۔ زیادہ امکان ہے کہ وہ محض ضابطے کی کارروائی کرے گی۔" میں نے کہا۔ "اپنے احساس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پولیس سے زیادہ مستعد ہو گئی اور اس معاملے میں زیادہ دلچسپی لے رہا ہوں۔ میں اس لڑکی سے زندگی میں کبھی نہیں ملا۔ میں نے اسے صرف مردہ حالت میں دیکھا.... اور یہ کوئی پہلی لاش نہیں تھی جو میں نے زندگی میں دیکھی.... لیکن میرے دل کو نہ جانے کیا ہو گیا.... وہ بہت کم عمر' معصوم اور پھول کی طرح نازک معلوم ہوتی تھی۔"

"پھول سے بھی زیادہ نازک اس کا دل تھا۔" ملکہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی۔ "لیکن اپنے ارادوں کے معاملے میں وہ فولاد کی طرح مضبوط تھی۔ اس نے اپنے ارادوں کی شکست کو تسلیم کرنا یا کسی معاملے میں ہار ماننا نہیں سیکھا تھا۔ اور ایسی شاخیں جو جھکنا نہیں جانتیں' عموماً ٹوٹ ہی جایا کرتی ہیں.... وہ ہیروئن بننے کا عزم لے کر انڈسٹری میں آئی تھی۔ اور اس خواہش کے لئے اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ بارہا جھکی' بارہا بکی۔ لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے وہ تیار نہیں تھی کہ وہ ہیروئن نہیں بن سکتی۔ ہونے کو تو اس دنیا میں خیر کیا نہیں ہو سکتا.... لیکن مجھے یہ کام اس لئے بھی مشکل نظر آتا تھا کہ جس نو آموز اور نادان لڑکی کو انڈسٹری کے گرگ کے ابتدا میں ہی کھلونا بنانے میں کامیاب ہو جائیں اس کے ہیروئن بننے کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے۔ باقی سوال تو بعد میں اٹھتے ہیں...." وہ خاموش ہو گئی۔

"میں اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لئے ہی یہاں آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کبھی انسان بلاوجہ ہی کوئی کام اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ میں نے بھی اس کے قاتل کی گردن تک ہاتھ پہنچانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ وہ مدد کی طلب میں میرے پاس آئی تھی۔ میں اس کی زندگی میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔ اگر اس کا قاتل ہی میری وجہ سے کیفر کردار کو پہنچ جائے تو شاید اس کی روح کو کچھ تسکین ملے۔"

"عجیب بات یہ ہے...." وہ مضطربانہ سے انداز میں بولی۔ "کہ صبح ہی صبح ایک اور شخص بھی آیا تھا... اس نے کہا کہ نشاط اپنے ایک 'دوست' کے گھر ہے اور اسے اپنی ایک ڈائری کی ضرورت پڑ گئی ہے جو الماری میں ہے۔ اس نے وہ منگوائی ہے۔ نشاط کا سامان بہت مختصر سا ہے اور وہ سارا کا سارا ہی میری نظر میں رہا ہے۔ میں نے اس کے پاس کبھی کوئی ڈائری نہیں دیکھی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ شخص ہر حال میں نشاط کے سامان کا جائزہ لے کر رہے گا۔ میری طبیعت بھی اس وقت کچھ زیادہ خراب تھی۔ میں نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ نشاط کا کل سامان بس اس الماری میں ہے....." اس نے ایک دیوار گیر الماری کی طرف اشارہ کیا۔ الماری اس وقت بند تھی۔

ملکہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اس شخص نے الماری ذرا کھول کر ہر چیز کا جائزہ لیا۔ ہر چیز کو کھنگال کر دیکھا۔ سامنے کیس مجھے ذرا نشاط کا چھوٹا سا سوٹ کیس پڑا ہے۔ اسے بھی یقیناً نشاط کے ساتھ ساتھ پلٹ کر دیکھا لیکن اسے کوئی بات اس کی خوبصورتی اور عمدگی برقرار تھی۔ زور دے کر کئی مرتبہ مجھ

نہیں رکھا؟ آخر کار وہ سارے ہی کمرے کا نظروں ہی نظروں میں جائزہ لے کر یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ شاید نشاط نے ڈائری کے بارے میں صحیح طرح نہیں سمجھایا۔ میں اس کے بارے میں مطمئن نہیں تھی لیکن میں اس سے الجھنے یا کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔"

"وہ شخص تمہارے لئے قطعی اجنبی تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے اس سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

"کس قسم کا حلیہ تھا اس کا؟"

"جینز جیکٹ میں تھا۔ درمیانے قد اور مضبوط جسم کا تھا۔ سانولی رنگت اور موٹی موٹی مونچھیں تھیں۔ کچھ بدمعاش سا معلوم ہوتا تھا۔" ملکہ نے بتایا۔

"ممکن ہے ڈائری کا صرف بہانہ رہا ہو۔ وہ یہاں کچھ اور تلاش کرنے آیا ہو اور وہ چیز تلاش کر کے بھی لے گیا ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں" ملکہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے اس کے بارے میں اور کسی بھی بات کا یقین نہیں لیکن اس بات کا یقین ہے کہ وہ یہاں سے لے کر کچھ نہیں گیا کیونکہ جتنی دیر وہ کمرے میں رہا میری نظر اس پر رہی۔ میں اپنی جگہ لیٹے لیٹے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے بھی اپنی حرکات و سکنات مجھ سے چھپانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ ...اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے میری کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ اگر اس کی مطلوبہ چیز اسے نظر آجاتی تو وہ ہر حال میں اسے لے جاتا۔ ...اس کے موڈ کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا.... میں کچھ خوفزدہ بھی تھی.... وہ اگر کچھ لے جانے کی کوشش کرتا تو میں یقیناً اسے منع نہ کرتی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اطمینان محسوس کیا تھا۔"

"خیر.... تم مجھے نشاط کے بارے میں بتاؤ.... اس کی شخصیت ...عادت.... اس کے ملنے جلنے والے.... کوئی ایسی بات جو تمہارے خیال میں اس کے قتل کا سبب بن سکتی ہو؟"

اس کی پیشانی پر سوچ کی شکنیں ابھر آئیں۔ "وہ ساتھ رہتی تھی تو محسوس ہوتا تھا کہ میں اس کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں...." وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ "لیکن اب یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں تو محسوس ہو رہا ہے کہ میں اس کے بارے میں کوئی خاص بات.... کوئی کام کی بات شاید نہیں جانتی...."

اس نے قدرے بے بسی سے میری طرف دیکھا تاہم بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اس سے میری ملاقات چار پانچ ماہ پہلے اسٹوڈیو میں ہوئی تھی۔ وہ غالباً اسٹوڈیو میں میرا اب تک کا آخری نے کانپتے ہاتھ تھے۔ اس کے بعد سے میں کچھ ایسی الجھی ہوں کہ آج تک جھلملا رہے تھے۔ میں نے دھیمے سے کہا۔ "وہ نشاط سے میری پہلی ملاقات تھی اور پہلی اچھی لگی.... ہمارے درمیان اتنی دوستی

"ملکہ...." اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے کی دعوت دے دی کیونکہ وہ کسی عورت کے گھر میں بنے ہوئے چھوٹے سے نجی قسم کے ہوسٹل میں رہتی تھی جہاں چند ملازمت پیشہ عورتیں رہتی تھیں۔ اس نے خود کو بھی وہاں ملازمت پیشہ ہی بتایا ہوا تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ اب وہ وہاں کے اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ مجھے معلوم ہے' بے یار و مددگار عورتوں کے لئے رہائش کا مسئلہ کتنا سنگین ہوتا ہے۔ میرے کمرے میں جگہ تھی۔ میں نے اسے آنے کے لئے کہہ دیا اور وہ دوسرے دن ہی آگئی۔ میرے ساتھ رہنا اسے ہر لحاظ سے سستا پڑتا لیکن اس نے خود ہی اسے بھی اپنے لئے مہنگا بنائے رکھا۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے کہا۔

"مطلب یہ کہ بے چاری میرے اور میرے بچے کے مسائل سے لاتعلق نہیں رہتی تھی حالانکہ اگر وہ لاتعلق رہتی تب بھی مجھے اس سے کوئی شکوہ نہ ہوتا کیونکہ اس کے اپنے مسائل ہی کچھ کم نہیں تھے۔ لیکن وہ تو ہماری ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی۔ ہماری ہر ماہی پریشانی پر ہم سے زیادہ پریشان ہو جاتی۔ جو کما کر لاتی وہ زیادہ تر ہم پر ہی خرچ کر دیتی۔ وہ ان نایاب لوگوں میں سے تھی جو خود بھوکے رہ کر اپنے منہ کا نوالا دوسرے کو کھلا دیتے ہیں۔ وہ مجھے بہنوں سے زیادہ عزیز معلوم ہونے لگی تھی۔"

"اس کے باوجود تم اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتیں ...میں نے ملائمت سے کہا۔

"ہاں.... وہ ساتھ رہتی تھی تو کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ شاید مہلت بھی نہیں ملی اگر وہ مزید کچھ عرصہ ساتھ رہ جاتی تو شاید کچھ اور جاننے کا موقع ...ہر وقت تو وہ سرگرداں سی رہتی تھی۔ صبح نکلتی تھی تو تھکی ہاری رات گئے آتی تھی۔ جو تھوڑا بہت وقت میسر ہوتا تھا اس میں بھی اس کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ میری باتیں سنتی رہے' مجھ سے کچھ نہ کچھ معلوم کرتی رہے۔ اور کچھ نہیں تو انڈسٹری میں گزارا کرنے کے گر ہی معلوم کرنے لگتی تھی۔ میرا چونکہ ہر چیز پر اعتبار اٹھ چکا ہے اور صرف مقدر پر اعتبار رہ گیا ہے اس لئے اسے کوئی کام کی بات بتانے سے قاصر رہتی تھی۔ میں بس یہی کہہ بات ختم کر دیتی تھی کہ اگر تقدیر میں کچھ ہو تو وہ بڑے انہو طریقوں سے پورا ہو جاتا ہے۔ سارے گر' ساری کوششیں دھ رہ جاتی ہیں۔ میری باتیں سن کر شاید اسے کچھ مایوسی ہوتی تھی۔

"بہرحال تم نے کبھی نہ کبھی اس کے بارے میں جاننے کوشش تو کی ہوگی۔ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی.... ا خاندانی پس منظر کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ دو ایک مرتبہ میں نے سرسری انداز میں کچھ جا کوشش کی ہوگی لیکن کبھی زور دے کر پوچھنے کی کوشش نہیں وہ بہت مضطرب' بہت بے چین معلوم ہوتی تھی۔ اس کا انداز ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ بس مجھے کچھ بن جا پھر میں اپنے متعلق سب کچھ تمہیں تو کیا پورے زمانے کو بھی

گی۔ ویسے بھی وہ مجھے اتنی بے ضرر' اتنی معصوم معلوم ہوتی تھی کہ میں اسے کریدنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی تھی۔"

"اس کے ملنے جلنے والوں کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں؟ ...کسی سے کوئی خاص میل ملاقات رہی ہو اس کی؟" میں نے پوچھا۔

"جب سے اس نے یہاں رہنا شروع کیا تھا تب سے مجھے اس کے ساتھ اسٹوڈیو جانے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ ویسے بھی اسٹوڈیو والے مراسم کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ہم جیسے لوگوں کو تو وہاں ہر ایک سے ہی ہنس کر بات کرنی پڑتی ہے۔ بہرحال وہ کبھی کسی کو یہاں لے کر نہیں آئی اور نہ ہی کبھی کوئی اسے پوچھتا ہوا یہاں تک آیا۔ ایکسٹرا سپلائر عبدالواحد سے اس کی ذرا زیادہ جان پہچان معلوم ہوتی تھی۔ تاہم ان کے درمیان رشتہ صرف احترام اور ہمدردی کا معلوم ہوتا تھا۔ عبدالواحد بہت اچھا آدمی ہے۔ میں اسے برسوں سے جانتی ہوں۔ وہی اسے زیادہ سے زیادہ کام دلوانے کی کوشش کرتا تھا۔ بغیر کسی غرض اور لالچ کے۔ عبدالواحد تو خیر سبھی کے ساتھ حتی الامکان ہمدردی سے پیش آنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو لڑکیاں زیادہ ضرورت مند ہوتی ہیں بعض اوقات ان کے پیسوں میں سے کمیشن بھی نہیں کاٹتا بلکہ اگر کوئی زیادہ ہی مشکل میں گرفتار ہو اور عبدالواحد کے پاس گنجائش ہو تو پلے سے بھی دے دیتا ہے۔ وہ طوطا چشم نہیں ہے اس لئے اس کے مالی حالات بھی بہت زیادہ اچھے نہیں ہیں۔"

"نشاط کے بارے میں کوئی خاص بات؟" میں نے ایک بار پھر کچھ جاننے کی کوشش کی۔

"خاص بات...." وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "مجھے بس یہی بات کچھ خاص معلوم ہوتی تھی کہ وہ ہمارے ماحول کی پروردہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس میں جو بگاڑ' جو تھوڑی بہت چالاکی' جو تھوڑی بہت بکنے یا جھکنے کی عادت پیدا ہوئی تھی وہ بالکل نئی ہی معلوم ہوتی تھی۔ اور اس میں کوئی گھٹیا پن نہیں تھا۔ ایکسٹرا گرل کے طور پر وہ مجھے بہت عجیب' بہت مختلف معلوم ہوتی تھی۔ اسے دیکھ کر بار بار احساس ہوتا تھا کہ اسے کم از کم فلمی دنیا میں نہیں ہونا چاہئے تھا' اور خواہ وہ کہیں بھی ہوتی۔" اس نے سسکی کے سے انداز میں ایک گہری سانس لی اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ ...."میری عمر اچھی خاصی ہے.... میں نے زمانے میں بہت عرصہ ٹھوکریں کھا کر بہت کچھ سیکھا ہے لیکن اس مختصر سے عرصے میں میں نے اس لڑکی سے بھی بہت اچھی اچھی باتیں سیکھیں۔"

"گزشتہ دنوں میں اس میں کوئی تبدیلی محسوس کی ہو؟" میں نے جاننا چاہا۔

"معلوم یہی ہوتا تھا کہ اس کم عمری میں اس نے دل پر بہت بوجھ سہنا سیکھ لیا تھا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ "لیکن پچھلے چند دنوں سے اس کے رویئے میں تبدیلی بہرحال میں محسوس کر رہی تھی۔ ...دو ایک مرتبہ میں نے پوچھا بھی لیکن اس نے حسب عادت ہنس کر ٹال دیا۔ البتہ ایک بار اس نے مذاق ہی کے سے انداز میں اتنا ضرور کہا کہ اگر مجھے کوئی خاص مسئلہ درپیش بھی ہو تو آپ کو بتانے سے کیا فائدہ؟ آپ تو خود اتنی کمزور پوزیشن میں ہیں کہ اپنے ہی مسائل حل نہیں کر سکتیں' آپ سے کچھ کہنا آپ کے بوجھ میں اضافہ ہی کرنے والی بات ہے۔ دکھڑا اس کے سامنے رونا چاہئے جو اس کا کچھ نہ کچھ مداوا کر سکتا ہو' ہر ایک کے سامنے اپنے دکھوں کی پوٹلی کھول کر بیٹھنے سے کیا حاصل؟ بس اس قسم کی باتیں کر کے اس نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔"

"میں ذرا اس کے سامان کا جائزہ لے سکتا ہوں؟" میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" وہ الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں کہ اس کا کل سامان بس اس الماری میں ہے۔ باقی ضرورت کی تمام چیزیں وہ میری ہی استعمال کرتی تھی جو اس کمرے میں پہلے سے موجود تھیں۔"

میں نے اٹھ کر الماری کھولی اور کھولتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی ہر چیز کو پہلے ہی کھنگالا جا چکا ہے۔ اس کے آدھے حصے میں کچھ سستے قسم کے ملبوسات لٹکے ہوئے تھے اور کچھ بے ترتیبی سے نیچے ڈھیر تھے۔ دوسرے حصے میں کئی شیلف تھے۔ ان میں بھی زیادہ تر معمولی قسم کے ملبوسات اور نسوانی ضروریات کی دوسری چیزیں تھیں۔ ایک شیلف میں بہت سی تصویریں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی تھیں۔ یہ مختلف سائز کی رنگین اور بلیک اینڈ وائٹ تصویریں تھیں۔

میں نے سرسری نظر سے ہر تصویر کا جائزہ لیا۔ وہ سب کی سب تصویریں نشاط کی تھیں اور ہر تصویر میں وہ تنہا ہی تھی۔ تصویریں اسی قسم کی تھیں جس طرح کی عموماً ایکٹنگ کے شوقین لڑکے لڑکیوں کی ہوتی ہیں۔ کہیں ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکائے خیالوں میں گم۔ کہیں ہاتھ اٹھا کر مصنوعی قہقہہ لگاتے ہوئے۔ کہیں بڑے ناز و ادا سے سر کو دیکھتے ہوئے۔ کوئی تصویر بھی ایسی نہیں تھی جس سے نشاط کے بارے میں میری معلومات میں کوئی اضافہ ہوتا۔

میں نے نشاط کو صرف مردہ حالت میں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی ہوئی تھیں اور کرب ناک موت نے اس کی صورت مسخ کر دی تھی لیکن پھر بھی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ زندگی میں وہ خوش شکل اور گوری چٹی رہی تھی لیکن اس کی تصویریں بتاتی تھیں کہ اس کا چہرہ زیادہ فوٹو جینک نہیں تھا۔ تصویروں کی نسبت وہ عام زندگی میں کہیں بہتر معلوم ہوتی ہوگی۔

الماری میں چھوٹا موٹا دوسرا کاٹھ کباڑ تھا۔ کوئی بھی ایسی چیز نہیں تھی جس سے نشاط کی شخصیت کے بارے میں کوئی قابل ذکر معلومات حاصل ہوتیں۔ البتہ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس مجھے ذرا غیر معمولی لگا۔ اس سوٹ کیس نے بھی یقیناً نشاط کے ساتھ ساتھ خاصے دھکے کھائے تھے لیکن اس کی خوبصورتی اور عمدگی برقرار تھی۔

یہ ایک بیش قیمت غیر ملکی سوٹ کیس تھا۔ کوئی غریب لڑکی ایسا سوٹ کیس خریدنے کی متحمل مشکل سے ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے سوچا، ممکن ہے وہ نشاط کو کسی نے تحفتاً دیا ہو۔

میں نے ہر چیز اسی طرح چھوڑ کر قدرے مایوسی کے عالم میں الماری بند کر دی۔ ملکہ نے جس نامعلوم شخص کی آمد کا ذکر کیا تھا وہ بھی شاید میری ہی طرح مایوس ہو کر یا پھر شاید مطمئن ہو کر گیا تھا۔ نشاط کا قتل غیر اہم معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ شخص یقیناً کسی ایسی چیز کی تلاش میں آیا تھا جس سے حقائق کا کوئی سرا ہاتھ آ سکتا تھا۔

میں نے ملکہ کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "یہاں آ کر مجھے نشاط کے افسوس ناک قتل کے سلسلے میں کوئی خاص سراغ تو نہیں ملا لیکن کم از کم اس کی شخصیت کے کچھ نکتے ضرور واضح ہوئے ہیں۔ شاید ان سے ہی کچھ مدد ملے۔"

"ممکن ہے قدرت نے آپ کو نشاط کے ساتھ ساتھ درحقیقت میری مدد کے لئے یہاں بھیجا ہو۔" ملکہ نے دھیمے لہجے میں یہ کہتے ہوئے غالباً مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے مسہری سے اترنا چاہا لیکن میں نے اشارے سے اسے روک دیا۔ "تم سکون سے بچے کے پاس بیٹھی رہو۔ تکلفات کی ضرورت نہیں۔ صرف اس وقت الصنا جب تم محسوس کرو کہ بچے کو لے کر ڈاکٹر کے پاس لے جا سکتی ہو۔ خدا حافظ۔"

میں تیزی سے کمرے سے نکل آیا۔ اس وقت تک بھی اس کی آنکھوں میں آنسو خشک نہیں ہوئے تھے۔ عمارت سے باہر آ کر میں نے چند گہری گہری سانسیں لیں۔ ہر عمارت اپنے سینے میں نہ جانے کتنی کہانیاں چھپائے ہوتی ہے۔ میں اپنے ذہن میں بہت سے الجھے سوال لئے کار میں بیٹھ کر ہنی کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہنی کی تلاش کے سلسلے میں ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میرے سامنے کوئی سراغ نہیں تھا اور اس کے بارے میں مجھے تشویش بے پناہ تھی۔ وہ مخلص لڑکی نہ جانے کس حال میں تھی، کہاں تھی!

ہنی کے تینوں ملازم گھر پر موجود تھے۔ چوکیدار گیٹ پر اپنی ڈیوٹی سنبھال چکا تھا اور باقی دونوں میاں بیوی چھوٹے موٹے گھریلو کاموں میں مصروف تھے۔ تینوں اداس تھے اور اپنی مالکن کے بارے میں فکر مند تھے۔ کسی حد تک خوفزدہ بھی تھے لیکن بہرحال ان کا گھر چھوڑ کر جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ ان سے ملنے اور کچھ دیر اس مکان میں گزارنے کے بعد بھی کوئی نئی بات میرے سامنے نہیں آئی۔

میں قدرے مایوسی کے عالم میں ایک بار پھر گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ میں نے اب اسٹوڈیو کا ایک چکر لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مین بلیوارڈ پر پہنچتے ہی مجھے احساس ہوا کہ ایک گاڑی میرے تعاقب میں ہے۔ ایک سفید گاڑی تو پہلے ہی میرے تعاقب میں تھی۔ وہ میرے اپنے آدمی تھے جو اپنے طور پر میری حفاظت کے لئے میرے تعاقب میں رہنے لگے تھے۔ وہ دوسری گاڑی ان کے پیچھے تھی۔

وہ پرانے ماڈل کی ایک سرخ شیورلیٹ کنورٹیبل تھی۔ اس قسم کی گاڑیاں اب شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی تھیں۔ اس کی کینوس کی چھت اس وقت کھلی تھی اور اس میں جس شخص کی جھلک مجھے نظر آئی تھی وہ بھی خاصا عدیم المثال ہی معلوم ہوتا تھا۔ خاصے قدیم زمانے کے بوڑھے انگریزوں کی طرح اس کے کانوں کے آس پاس بھورے گھنگریالے بالوں کی جھالر تھی اور باقی چندیا بالکل صاف اور چمکیلی تھی۔ اگر ڈارون کی تھیوری کو درست مان لیا جائے کہ بندر ہمارے آباؤ اجداد تھے تو اس میں اپنے آباؤ اجداد کی بہت زیادہ مشابہت موجود تھی۔ جس انداز میں وہ اس بڑی سی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ میں دھنسا ہوا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خاصا مختصر الوجود آدمی ہے۔

جب بھی مجھے عقب نما آئینے میں اس کی جھلک نظر آئی، وہ اپنے گرد و پیش بلکہ تمام دنیا سے بے خبر سا نظر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خواب کے سے عالم میں گاڑی چلا رہا ہے لیکن جوں ہی میں ذرا رفتار بڑھاتا اور میرے ساتھ سفید گاڑی کی رفتار بڑھتی تو فوراً ہی اس سرخ شیورلیٹ کی رفتار میں بھی اضافہ ہو جاتا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ سرخ شیورلیٹ میرے یا ہماری سفید گاڑی کے تعاقب میں ہے تو مجھے تشویش کے بجائے ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہوا۔ وہ یقیناً کہیں ہنی کے گھر کے آس پاس سے ہی ہمارے پیچھے لگی تھی کیونکہ جب میں رائل پارک گیا تھا اور واپس آیا تھا تو ہماری اپنی سفید گاڑی کے علاوہ کوئی گاڑی میرے تعاقب میں نہیں تھی۔ آج کل میں خود بھی کافی حد تک محتاط رہنے لگا تھا اور کہیں آتے جاتے وقت اپنے گرد و پیش پر نظر رکھتا تھا۔

ممکن ہے وہ بندر نما شخص ہنی کے گھر کی نگرانی کر رہا ہو اور مجھے وہاں آتے اور پھر رخصت ہوتے دیکھ کر میرے پیچھے لگا ہو۔ اگر یہ قیاس درست ہوتا تو اس سے یقیناً ہنی کے اغوا کے سلسلے میں کوئی سراغ ہاتھ آ سکتا تھا۔ اس معاملے میں یہ امید کی پہلی کرن نظر آئی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس شخص کو احساس ہو کہ میں تعاقب سے باخبر ہو گیا ہوں۔ اس لئے میں نے بے مقصد ادھر ادھر بھٹکنے کی کوشش نہیں کی اور اسٹوڈیو کی طرف سفر جاری رکھا۔

نہر کے کنارے پہنچ کر میں نے کار کی رفتار درمیانی رکھتے ہوئے خفیہ خانے سے ٹرانسمیٹر نکالا اور غیر محسوس انداز میں سفید گاڑی میں موجود ٹونی سے رابطہ قائم کیا۔

"تمہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ سرخ شیورلیٹ ہمارے تعاقب میں ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"یس سر! مجھے گلبرگ میں ہی اندازہ ہو گیا تھا۔" ٹونی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

"لیکن تم اسے احساس مت ہونے دو کہ تم میرے تعاقب میں ہو۔" میں نے ہدایت کی۔ "کیمپس والے موڑ پر تم سیدھے کیمپس کی طرف نکلتے چلے جانا۔ میں علامہ اقبال ٹاؤن کی طرف

جاؤں گا لیکن چند لمحے بعد تم اس طرح واپس آ جانا کہ سرخ گاڑی کے پیچھے رہ سکو۔ اس بندر کو نکلنے نہیں دینا ہے۔ یہ بہت اہم سراغ ثابت ہو سکتا ہے۔"

"او کے سر!" ٹونی نے مستعدی سے کہا۔

اس ہدایت پر عمل ہوا اور چند لمحے بعد سفید کار درمیان سے ہٹ چکی تھی۔ اس کے چند لمحے بعد وہ شیورلیٹ کے پیچھے نظر آنے لگی لیکن اب درمیانی فاصلہ کافی تھا۔ بندر نما شخص حسب سابق، بظاہر دنیا مافیہا سے بے خبر، نیم خوابیدہ سے انداز میں میرے تعاقب میں گاڑی لئے آ رہا تھا۔

ملتان روڈ پر مڑتے وقت مجھے ایک لمحے کے لئے گاڑی روکنی پڑی اور اس دوران میرے عقب میں شیورلیٹ کا فاصلہ کچھ اور کم ہو گیا اور مجھے عقب نما آئینے میں اس شخص کی ایک اور جھلک بہتر طور پر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور اس کی نظر صرف سڑک پر تھی۔

وہ سفید قمیص اور دھاری دار کوٹ کے ساتھ سرخ بو لگائے ہوئے تھا۔ اس کی شخصیت کا تاثر بڑا عجیب تھا۔ وہ بیک وقت جوکر بھی معلوم ہوتا تھا اور نہایت سنجیدہ و متین بھی۔

میں نے اسٹوڈیو کی طرف سفر جاری رکھا لیکن اسٹوڈیو پہنچ کر میں رکا نہیں بلکہ اس سے آگے نکلتا چلا گیا۔ اسٹوڈیو اور اس کے آس پاس کے علاقے میں بڑی گہما گہمی تھی۔ یہاں ذرا سی بھی گڑبڑ کی صورت میں فوراً سیکڑوں لوگ ہماری طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔

ان دنوں ملتان روڈ پر اسٹوڈیوز سے آگے کوئی خاص آبادی نہیں تھی۔ تقریباً دو میل آگے نکلنے کے بعد ویرانی شروع ہو گئی۔ کبھی کبھی مخالف سمت سے کوئی بس آتی دکھائی دیتی اور ہمارے قریب سے گزر جاتی۔ پھر گویا بسوں کی آمد و رفت میں بھی تعطل واقع ہو گیا۔ حد نظر تک پھیلی ہوئی تیز چمکیلی دھوپ میں بس تین کاریں آگے پیچھے یوں فراٹے بھرتی جا رہی تھیں جیسے انہیں کہیں پہنچنے کی بہت جلدی ہو۔

وہ شخص بڑی دل جمعی سے میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اسے کوئی تشویش نہیں تھی اور اس بات کی بھی گویا کوئی پروا نہیں تھی کہ ایک گاڑی اس کے عقب میں بھی چلی آ رہی تھی۔ اس کا کام تو بس جیسے آنکھیں بند کر کے میرے پیچھے آتے رہنا تھا۔ اس کے علاوہ اسے دنیا کی کسی چیز سے شاید کوئی غرض نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں وہ کوئی سنکی یا خبطی تو نہیں جو اپنی دھن کا دھن بہک جانے کی وجہ سے نہ جانے کیا سوچ کر میرے پیچھے لگ گیا ہو۔ لیکن یہ خیال میرے دل کو نہیں لگا۔ سنکی اور خبطی لوگ غیر مستقل مزاجی سے شاید ہی کسی کا تعاقب کرتے ہوں۔ عجیب بات یہ تھی کہ دور و نزدیک کوئی ایسا شخص بھی نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس کا مددگار سمجھا جا سکتا۔ اس کے باوجود بالکل مطمئن اور بے پروا تھا۔

تھے۔ بائیں طرف قدرے نشیب میں سڑک جتنی ہی چوڑی کچی پٹی تھی اور اس کے بعد باغ کی نیچی سی کچی دیوار تھی جس کے عقب سے سگنٹروں سے لدے ہوئے درخت جھانک رہے تھے۔

میں نے یکدم ہی اس الجھن کا حل تلاش کرنے کا فیصلہ کیا کہ آخر وہ بندر نما شخص چاہتا کیا تھا۔ میں نے گاڑی کو ترچھا کرتے ہوئے یک لخت بریک لگائے۔ میری دیوہیکل مرسیڈیز کے ٹائروں نے سڑک پر بری طرح رگڑ کھائی مگر دوسرے ہی لمحے گاڑی گویا سڑک سے چپک کر رہ گئی۔

سرخ شیورلیٹ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اگر بندر نما انسان اناڑی ڈرائیور ہوتا تو اس کی گاڑی میری گاڑی سے ٹکرا بھی سکتی تھی لیکن اس کے بارے میں میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ وہ اناڑی ڈرائیور ہرگز نہیں تھا۔ اس نے گاڑی کو زبردست لہرا دیتے ہوئے کچے میں اتار کر نکل جانے کی کوشش کی لیکن میں اسے چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس سے کہیں زیادہ تیزی سے میری گاڑی ریورس ہو کر اس کے راستے میں حائل ہو گئی اور سرخ شیورلیٹ یوں باغ کی دیوار کے ساتھ جا کر رکی کہ ایک لمحے کے لئے گرد و غبار کے طوفان میں چھپ کر رہ گئی۔

ٹونی نے بھی گاڑی نہایت مشاقی سے شیورلیٹ کے عقب میں ترچھی کر کے لا روکی تھی۔ سب سے پہلے میں گاڑی سے اترا۔ میں نے کوئی ہتھیار نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن مختصر الوجود شخص بڑا بے جگر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اسے دھول کے بادل میں گاڑی کا دروازہ کھولے بغیر اچھل کر کھلی چھت کی گاڑی سے کودتے دیکھا۔ اس کے مختصر سے بازو کے سرے پر مجھے لمبی نال والے پستول کی جھلک نظر آئی۔

میں فوراً اپنی گاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔ بغیر کسی دھماکے کے گولی میرے سر پر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جو کوئی بھی تھا بہرحال اس قسم کے حالات سے اچھا خاصا مانوس معلوم ہوتا تھا لیکن شاید ہمارے بارے میں اس کے اندازے کچھ غلط رہے ہوں۔ اسے دو سرا فائر کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ ٹونی کے پاس بھی سائیلنسر والا ریوالور تھا۔ اس کے خاموش ریوالور نے کچھ اس طرح گولی اگلی کہ مخنی شخص کے ہاتھ سے صرف پستول نکل کر کہیں دور جا گرا۔ مجھے امید تھی کہ اس کے ہاتھ پر خراش بھی نہیں آئی ہو گی۔

ممکن وہ شخص ہتھیار کی عدم موجودگی میں بھی 'محاورتاً' ہتھیار ڈالنے کا قائل معلوم نہیں ہوتا اور فیصلہ شاید ہم سے بھی کہیں تیزی سے کرتا تھا اور پھر صرف اس کا ذہن ہی نہیں جسم بھی بجلی کی سی تیزی سے حرکت کرتا تھا۔ پستول ہاتھ سے جاتے ہی میں نے اسے کسی راکٹ کی طرح ہوا میں بلند ہوتے دیکھا۔ وہ باغ کی دیوار پھلانگ کر اندر جا رہا تھا۔

میں اس کی چھلانگ کی بلندی دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ

کہیں زیادہ اونچائی تک ہوا میں بلند ہوا لیکن اسی لمحے ٹونی کے ریوالور کی گولی اسے چاٹ گئی۔ میں ٹونی کو روک بھی نہ سکا۔ مجھے ٹونی کو یہ بتانے کی مہلت ہی نہ ملی کہ میں اس شخص کو زندہ سلامت پکڑنا چاہتا ہوں۔ ٹونی سے بھی فائر شاید اضطراری حالت میں ہوا تھا۔ اسے غالباً یہی احساس ہوا تھا کہ وہ شخص ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔

دیوار سے کچھ بلندی پر ہوا میں ہی میں نے اس شخص کے مختصر وجود کو ڈھیلا پڑتے دیکھا' جیسے کسی غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ مجھے اس وقت یہ اندازہ تو نہیں ہو سکا کہ گولی اسے کہاں لگی ہے لیکن یہ اندازہ بہرحال ہو گیا کہ وہ اس کے لئے مہلک ثابت ہو چکی ہے۔ دوسرے ہی لمحے میں نے دیوار کے عقب میں باغ کے اندر دھپ سے اس کے گرنے کی آواز سنی۔

میں نے کار کی اوٹ سے نکل کر ٹونی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی کار کے قریب ایک گھٹنے کے بل کھڑا تھا۔ ریوالور ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ شبیر ریوالور لئے گاڑی کے دوسری طرف کھڑا تھا۔ میں نے انہیں اشارہ کیا۔ دونوں نے ریوالور جیبوں میں رکھ لئے اور ہم نے ایک ساتھ دیوار پھلانگی۔

اندر قطار در قطار درختوں کے درمیان کچی زمین پر وہ چت پڑا تھا۔ مردہ حالت میں اس کے چہرے میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا سوائے اس کے کہ نیم وا آنکھیں اب مکمل بند ہو گئی تھیں۔ اس کے دھاری دار کوٹ کا بٹن کھلا تھا اور پسلیوں کے قریب سے اس کی سفید قمیص خون سے سرخ ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی اور ٹونی نے ناک کے سامنے ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ نبض ختم ہو چکی تھی۔ زندگی میں وہ جتنا پھرتیلا تھا' مرنے میں بھی اس نے اتنی ہی پھرتی دکھائی تھی۔

میں نے اور ٹونی نے پھرتی سے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کے کوٹ کی جیبوں سے صرف ایک پرس اور ایک کھٹکے دار چاقو برآمد ہوا۔ پرس میں صرف رقم تھی۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے اس کی شناخت میں مدد ملتی۔ میں نے دونوں چیزیں واپس اس کی جیب میں ڈال دیں۔

باغ میں قریب ہی کہیں سے دو آدمیوں کے تیز تیز بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ شاید وہ باغ کے رکھوالے تھے جو کسی بات پر بحث کرتے ہوئے ادھر ہی آ رہے تھے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی کہ ہمیں کسی لاش کے سرہانے بیٹھا ہوا دیکھا جاتا۔ اور لاش بھی ایک ایسے شخص کی جسے لاش میں تبدیل کرنے کے ذمے دار ہم ہی تھے۔

میں نے ٹونی اور شبیر کی طرف اشارہ کیا اور ہم اٹھ کر دیوار کی طرف لپکے لیکن اسی لمحے میری نظر ایک قدرے چمکیلی سی چیز پر پڑی۔ یہ دھات کے روپے سے بھی کچھ بڑا پیتل کا ایک بٹن تھا جس لیکن درختوں کے درمیان سے تھوڑی سی دھوپ اس پر پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے وہ خود ہی میری نظر میں آ گیا تھا۔

بٹن کچھ غیر معمولی سا تھا۔ میں نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ اس کی موٹائی بھی دھات کے روپے سے کچھ زیادہ ہی تھی اور اس کے پیچھے تک نما حصے میں تازہ ٹوٹے ہوئے دھاگے بھی اٹکے ہوئے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ جس وقت میں نے اس نامعلوم شخص کو باغ کی دیوار سے اوپر ہوا میں بلند ہوتے دیکھا تھا تو اس کے کوٹ کے بٹن بند معلوم ہوتے تھے لیکن جب ہم نے اسے مردہ حالت میں چت پڑے دیکھا تو اس کے کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ شاید گرتے وقت اس کا کوٹ کسی درخت کی شاخ میں اٹکا تھا جس کی وجہ سے یہ بٹن ٹوٹ گیا تھا۔

میں نے فوراً ہی پلٹ کر لاش کے کوٹ کا اگلا حصہ الٹ کر دیکھ لیا اور میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اس کے کوٹ میں یہی ایک بٹن تھا جو ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ اس تصدیق کے چکر میں ان دو نامعلوم آدمیوں کی آوازیں کچھ اور قریب آ گئی تھیں۔ تاہم درختوں کی قطاروں کے درمیان وہ کہیں نظر نہیں آئے تھے۔ ہم تینوں دیوار پھلانگ کر تیزی سے ٹونی کی گاڑی کے قریب جا پہنچے۔

میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "تم نے صورت حال کو سمجھنے میں تھوڑی سی غلطی کی۔ میں اس شخص کو زندہ سلامت پکڑنا چاہتا تھا۔"

"مجھے آپ کے کہنے سے پہلے ہی اپنی غلطی کا اندازہ ہو چکا ہے سر!" ٹونی کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ "میں نے اس کی ٹانگ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی حیرت انگیز پھرتی کی وجہ سے میرا اندازہ کچھ غلط ہو گیا۔"

"تم کچھ دیر کے لئے میری نگرانی ملتوی کر کے ابھی واپسی پر ہی رجسٹریشن آفس ہوتے آؤ۔" میں نے سرخ شیورلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "نمبر تو تمہیں یاد ہو ہی گیا ہو گا؟"

"اتنی دیر نظر کے سامنے رہا ہے سر! وہ تو ابتدائی چند سیکنڈ میں ہی ازبر ہو گیا تھا۔" ٹونی مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کے بعد ہم اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر تیزی سے واپس روانہ ہو گئے۔ اس وقت باغ میں دیوار کے عقب میں کوئی ایسی آواز نہیں ابھری تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ لاش دریافت کر لی گئی ہے۔ عین ممکن تھا لاش بہت دیر تک دریافت نہ ہو پاتی۔

چند لمحے بعد میں نے ٹونی کو آگے نکل جانے دیا اور خود رفتار بالکل کم کر لی۔ مجھے امید تو کم ہی تھی کہ گاڑی کے نمبر کی مدد سے اس مختصر الوجود شخص کے بارے میں کوئی سراغ میسر آ سکے گا لیکن چیک کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ وہ بٹن میں نے رکھ لیا تھا۔ جانے کیوں وہ مجھے کچھ غیر معمولی لگا تھا اور میں چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ اس مجہول سے شخص کے ڈھیلے ڈھالے کوٹ کی کوشش کر رہا تھا کہ اس مجہول سے شخص کے ڈھیلے ڈھالے کو

اس وقت میں اسٹوڈیو سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا جب ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے مجھے کچھ دیر کے لئے سڑک کے کنارے گاڑی روکنی پڑی۔ سڑک کے درمیان کوئی رکاوٹی پٹی نہیں تھی اور ٹریفک دو طرفہ تھا۔ یہاں سے کچھ آگے تک ہر قسم کی گاڑیوں کی بہت آمدورفت رہتی تھی اور بدنظمی کی وجہ سے کبھی کبھار ٹریفک جام ہو جاتا تھا۔

میرے بائیں ہاتھ پر نشیب میں خاصا طویل و عریض گڑھا تھا جس میں گندا پانی کھڑا تھا۔ اسی گڑھے سے متصل ایک جزیرہ نما' جگہ تھی جس پر بہت بڑا نیم پختہ چھپر ڈال کر کسی نے عوامی قسم کا ریستوران کھول رکھا تھا جس کی بے ہنگم کرسیاں میزیں سڑک کے کنارے تک آئی ہوئی تھیں۔

میرے آگے ملتان سے آنے والی ایک بس کھڑی تھی جس کا ڈرائیور مسلسل پریشر ہارن بجا رہا تھا مگر کوئی اس کی بھیانک آواز پر کان نہیں دھر رہا تھا۔ اس سے آگے ایک آدھ کار' ایک آدھ تانگہ' ایک ٹھیلا' مالٹوں سے لدی ہوئی ایک بہت بڑی گھوڑا گاڑی' چند سائیکل سوار اور چند اسکوٹر سوار غرض کہ ہر طرح کی سواریاں موجود تھیں۔

سب سے آگے ایک اومنی بس تھی جس میں کوئی نہایت اطمینان سے چڑھ رہا تھا اور کوئی اتر رہا تھا جبکہ کنڈکٹر زنانہ حصے کے قریب کھڑا چند برقع پوش عورتوں سے جھگڑا کر رہا تھا۔ انہیں گرد و پیش کی گویا کوئی پروا نہیں تھی۔ صحیح طور پر کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ٹریفک پھنسا ہوا کہاں ہے۔

میرا ذہن اس وقت کئی معاملات میں الجھا ہوا تھا اس لئے میں صبر و سکون سے ٹریفک رواں ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی دوران میری نظر دو آدمیوں پر پڑی جو چھپر والے ریستوران سے نکلے تھے۔ ان میں سے ایک کا حلیہ ایسا تھا کہ اس کا اس قسم کے ریستوران میں جانا کچھ عجیب سا ہی لگ رہا تھا۔ وہ بیش قیمت سوٹ میں تھا اور اس کے سر سے پاؤں تک آسودگی کی چمک نظر آ رہی تھی۔

وہ قدرے ترچھا ہوا تو فاصلہ کافی ہونے کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ معروف فلمی مصنف نصیر نواز تھا۔ اس کے ساتھ چھپر سے باہر آنے والا شخص ہر لحاظ سے اس سے بہت مختلف تھا۔ وہ معمر اور مفلوک الحال تھا۔ نہایت معمولی سی شکن آلود شلوار قمیص' پیروں میں کینوس کے گرد آلود جوتے' سر پر پرانی سی ٹوپی' ناک کیپ اور آنکھوں پر موٹے موٹے عدسوں کی عینک۔ اس کی ٹیوبڑھی ہوئی تھی۔

ان کے درمیان کسی مسئلے پر بحث و تکرار گویا آخری مرحلے میں تھی۔ معمر شخص بے بسی آمیز انداز میں بار بار دونوں ہاتھ پھیلا پھیلا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ نصیر نواز کے انداز سے ظاہر تھا جیسے وہ اس پر دانت پیس رہا ہو لیکن گرد و پیش کا خیال کرتے ہوئے خود پر ضبط کر رہا ہو۔ وہ کچھ مضطرب بھی معلوم ہوتا تھا۔ بار بار غیر محسوس انداز میں ادھر ادھر بھی دیکھ رہا تھا۔

اپنی وجاہت اور خوش پوشی کی وجہ سے وہ دور سے ہی نمایاں نظر آ رہا تھا لیکن شاید وہ اکثر مضطرب بھی رہتا تھا۔ گزشتہ روز سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں بھی میں نے جب اسے اس کی دوست اور ایک دولت مند خاتون طاہرہ خانم کے ساتھ دیکھا تھا تب بھی وہ مجھے کچھ مضطرب ہی معلوم ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تخلیق کار قسم کے لوگوں پر اس وقت قدرے اضطراب اور ہیجان طاری ہوتا ہے جب وہ کچھ تخلیق کر رہے ہوں لیکن وہ شاید ہر وقت ہی تخلیقی موڈ میں رہتا تھا۔

چند لمحے بعد بالآخر ان کے درمیان بحث شاید ختم ہو گئی۔ اس وقت تک سب سے آگے والی اومنی بس نے رینگنا شروع کر دیا تھا۔ معمر اور قدرے مفلوک الحال شخص گرتا پڑتا اس کی طرف لپکا اور جلدی سے بس میں چڑھ گیا۔ نصیر نواز ایک لمحے وہیں کھڑا رہا پھر اس نے شاید قدرے سکون محسوس کرتے ہوئے سر اٹھا کر گہری سانس لی اور کچے ہی میں آگے بڑھ گیا۔ چھپر سے ذرا آگے نشیب میں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ جگہ ایسی تھی کہ وہ پھنسے ہوئے ٹریفک سے آگے گاڑی سڑک پر لا کر اطمینان سے روانہ ہو سکتا تھا۔

اس نے ایسا ہی کیا اور چند لمحے بعد میری نظر سے اوجھل ہو گیا۔ اس کی گاڑی نئے ماڈل کی فورڈ کیپری تھی۔ خاصی مہنگی گاڑیوں میں سے ایک۔ مانا کہ نصیر نواز ایک کامیاب فلمی مصنف تھا لیکن میرا خیال تھا کہ محض کہانی نویسی کے بل بوتے پر اس کے یہ ٹھاٹ باٹ نہیں ہو سکتے تھے۔ شاید اس کی دولت مند دوست کی عنایات بھی شامل حال تھیں۔ آخر وہ اس کی فلم بھی تو فائنانس کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی نہ جانے کہاں کہاں اس کا فائنانس کام میں آ رہا تھا۔

میں اسٹوڈیو پہنچا تو چھوٹے سے کمپاؤنڈ میں نصیر نواز کی گاڑی بھی کھڑی نظر آئی۔ میں گاڑی پارک کر کے اپنے آفس میں چلا گیا۔ اس آفس میں اب مہینوں بعد ہی میرا چکر لگتا تھا لیکن ایک کمرا میرے لئے مخصوص تھا۔ میں اس میں جانے کے بجائے آفاق کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ فون پر کوئی نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور مودبانہ انداز میں اٹھ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "سر! میں آپ سے ہی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

اس کے مقابل شلوار قمیص میں ایک ادھیڑ عمر فربہی مائل سا شخص بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی مودبانہ انداز میں سلام کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر موٹی موٹی مونچھوں کی موجودگی کے باوجود بچپنے کا سا بھولپن تھا۔

آفاق اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "سر! یہ عبدالواحد ایکسٹرا سپلائر ہے۔ میں نے اس خیال سے اسے بلوایا تھا کہ شاید آپ براہ راست اس سے بات کرنا پسند کریں۔ میں انہیں ہیڈ آفس کا نمبر ہی ملا رہا تھا۔"

تعارف ہونے پر عبدالواحد نے دوبارہ مجھے سلام کیا اور کچھ زیادہ ہی انکساری سے جھکتے ہوئے مصافحہ کیا۔ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اکثر وبیشتر زبان خلق 'نقارہ خدا' ہی ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں اب تک جس شخص نے بھی بات کی تھی' اسے ایک اچھا آدمی ہی قرار دیا تھا اور وہ چہرے مہرے سے حقیقتاً اچھا آدمی ہی معلوم ہوتا تھا۔

میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی آفاق کے مقابل بیٹھ گیا۔ آفاق کے سامنے قلم کا اسکرپٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ اس نے ایک طرف کھسکا دیا اور یوں میز پر قدرے جھک گیا جیسے کوئی اہم کانفرنس شروع ہونے والی ہو۔

"اوہ۔۔۔ تم تو بہت سنجیدہ ہو گئے آفاق!" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ "میں یہاں کوئی میٹنگ طلب کرنے ہرگز نہیں آیا۔ میں تو ایک کام سے اس علاقے میں آیا ہوا تھا۔ سوچا ذرا دفتر میں بھی جھانکتا چلوں۔۔۔ ہو سکے تو اچھی سی کافی پلواؤ۔"

آفاق نے انٹر کام پر ریسپشنسٹ لڑکی کو کافی بھجوانے کی ہدایت کی۔ وہ ریسیور رکھ چکا تو میں نے عبدالواحد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے مجھے امید نہیں ہے کہ مقتولہ نشاط کے بارے میں کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے اس کے بارے میں تو آپ بھی کوئی خاص بات نہیں بتا سکتے۔"

"ہاں جناب! یہ تو آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "جب وہ زندہ تھی اور اس سے واسطہ رہتا تھا تو کبھی اسے کریدنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ بالکل کھلی کتاب لگتی تھی وہ۔۔۔ ہر وقت ہنستی مسکراتی ہوئی۔۔۔ اور اپنی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی سب کو بتا دینے والی۔۔۔ لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ صحیح معنوں میں ہم تو اس کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں جانتے تھے۔۔۔"

نشاط کے بارے میں کم وبیش یہی بات اس کی روم میٹ ملکہ نے کہی تھی۔ عبدالواحد بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "درحقیقت اسی وجہ سے میں زیادہ پریشان ہوں۔ کون اس بات پر یقین کرے گا کہ جن لوگوں سے چوبیس گھنٹے نشاط کا واسطہ پڑتا تھا وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔" اس کے لہجے سے واقعی پریشانی جھلک رہی تھی۔

"میں اس بات پر یقین کر چکا ہوں عبدالواحد!" میں نے ملائمت سے کہا۔ "ہمارے معاشرے میں جہاں اور بہت سے بڑے مسائل پیدا ہو گئے ہیں وہاں ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں لوگ ایک دوسرے کا اعتبار کھوتے جا رہے ہیں۔ کوئی کسی کا یقین ہی نہیں کرتا۔ ہر کوئی دوسرے کو جھوٹا سمجھتا ہے اور ہر ایک کو دوسرے کی بات میں ہیرا پھیری نظر آتی ہے۔"

"اللہ آپ کی عمر دراز کرے جی۔۔۔ آپ نے میرے دل کی کہہ دی۔" عبدالواحد جلدی سے بولا۔ "ایسے میں ان لوگوں کا [illegible] ہو کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "ہمارے پیشے کو یا ہم کو کچھ زیادہ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا سر جی! ایکٹر اگر لڑکی کو کوئی عزت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا لیکن جناب! دکھ سکھ ہمارے بھی دوسرے لوگوں جیسے ہی ہیں۔ ہمارے بھی مسائل ہیں۔ ہمارے بھی جذبات ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اچھی قدریں' اچھے جذبے' چھوٹی چھوٹی کمینگیاں' بڑی بڑی ضرورتیں' سب کچھ دوسروں ہی کی طرح ہے۔ ہم بھی بچوں کے لئے دو وقت کی روٹی کمانے کے چکر میں صبح شام سرگرداں رہتے ہیں۔۔۔"

اس نے بے چینی سے آرام دہ کرسی پر پہلو بدلا۔ "اب اگر میں کسی سے کہتا ہوں کہ نشاط بہت اچھی لڑکی تھی تو کوئی یقین نہیں کرتا۔ کم از کم دل میں یقین نہیں کرتا۔ میں یہ نہیں کہتا جی کہ پارسا تھی' بہت بھولی تھی' اس نے دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں تھا اسے تو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھی کوئی اچھا ہو سکتا ہے نا؟ دلدل میں پھنسے ہوئے لوگ بھی تو اچھے ہو سکتے ہیں نا! یہ میرا نظریہ ہے۔ آپ چاہے اس سے متفق ہوں۔"

وہ اب پہلے کی طرح اٹک اٹک کر نہیں بول رہا تھا۔ جذبات سے اس کے لفظوں میں روانی آ گئی تھی۔ "اسٹیج اگر میں یہ کہوں کہ مجھے نشاط سے بغیر کسی غرض کے ہمدردی تھی تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔ لوگ سمجھتے ہیں جی کہ ہمارے ماحول میں تو اچھے جذبے پنپ ہی نہیں سکتے۔ میں اب اس عمر میں اس سے کیا غرض رکھتا جی۔ بڑے بڑے بچے ہیں۔ بیس سال ہو گئے ہیں انڈسٹری میں دھکے کھاتے ہوئے۔ بہت کچھ دیکھ لیا ہے جی۔۔۔ بہت کچھ برت لیا ہے۔ اب دل بجھ سا گیا ہے۔ بس وہ لڑکی اچھی لگتی تھی۔ اس کے دل میں شفقت سی تھی۔ اس کی مدد کرنے کو جی چاہتا تھا لیکن سچی بات ہے' ہم جیسے لوگ کسی کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

"مختصر یہ کہ اس کے بارے میں آپ جانتے کچھ نہیں تھے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔ اب یہی سوچ کر تو حیرت ہوتی ہے" اس نے یقینی سے سر ہلایا۔ "حالانکہ ہمارا زیادہ تر واسطہ لڑکیوں سے بس کی حد تک ہی رہتا ہے لیکن پھر بھی ہم زیادہ تر لڑکیوں کے پورے شجرۂ نسب سے واقف ہوتے ہیں۔ کون کہاں سے آئی ہے' کس کی ماں کون ہے۔۔۔ کون بال بچے دار ہے اور کون چھڑی چھانٹ۔ سب ہمیں زبانی یاد ہوتا ہے لیکن نشاط کے بارے میں بس معلوم ہے کہ وہ پہلے کسی ہوسٹل ٹائپ مکان میں رہتی تھی پھر کے پاس چلی گئی تھی۔ وہ سیس اسٹوڈیو میں مجھ سے ٹکرائی تھی ایک دو ملاقاتوں کے بعد ہی یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں سے اسے جانتا ہوں۔ اس نے پہلی ملاقات میں ہی صاف بتا کہ وہ آئی تو ہیروئن بننے کے لئے تھی لیکن اس نے بہت دھکے لئے ہیں اور اب وہ ایکسٹرا کے طور پر بھی کام کرنے کے لئے

ہے۔"

"اس کے کسی سے کسی خاص تعلق کا اندازہ نہیں ہوا کبھی آپ کو؟" میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں نے خود اس پہلو پر بہت سوچا لیکن میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا سر جی!" وہ قدرے بے بسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ ہر ایک سے ہی ہنس کر ملتی تھی لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی سے اس کا تعلق خاص تھا یا نہیں۔ ویسے۔۔۔ ایک بات میں نے چند دن پہلے محسوس کی تھی لیکن۔۔۔ شاید وہ میرا وہم ہی ہو۔۔۔"

وہ تذبذب کے سے عالم میں خاموش ہو گیا۔ پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے خود ہی بولا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ بار بار مجھے کچھ بتانے یا شاید مجھ سے کچھ پوچھنے کا ارادہ باندھتی ہو اور پھر توڑ دیتی ہو۔ میں ان دنوں اپنے کچھ چکروں میں پریشان تھا۔ اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکا اور شاید اسی لئے وہ بھی کہتے کہتے رہ گئی کہ میں تو پہلے ہی اپنے چکروں میں پھنسا ہوا ہوں۔ یہ خیال شاید اب زندگی بھر کانٹے کی طرح ذہن میں چبھتا رہے کہ اگر میں نے اسے کریدا ہوتا' ذرا اصرار کیا ہوتا تو شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جاتی۔"

کافی آ چکی تھی۔ کافی پینے کے دوران بالکل ہی خاموشی چھائی رہی۔ ہم تینوں ہی گویا اپنی اپنی جگہ خیالوں میں الجھے ہوئے تھے۔ دفعتاً انٹر کام کا بزر بجا۔ آفاق نے ریسیور اٹھا کر بات سنی پھر ہاتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سر نصیر نواز آیا ہے۔ کیا اسے یہیں بلوا لوں؟"

"ہاں۔ بلوا لو" میں نے بلا تامل کہا۔

اس نے ریسپشنسٹ کو ہدایت کی اور ریسیور رکھ کر نیچی آواز میں بولا "اس سے پہلے تو یہ کبھی یہاں نہیں آیا۔ آج کیسے آ گیا۔"

"ہر کام کا کوئی نہ کوئی پہلا دن ہوتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور نصیر نواز بہ آواز بلند سلام کرتے ہوئے اندر آ گیا۔ میں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اور وہ عبدالواحد ہی کی طرح جھک کر مجھ سے ملا حالانکہ وہ مجھے جھکنے والا آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"آپ سے ملنے کا کافی دنوں سے اشتیاق تھا۔۔۔" وہ گرمجوشی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "گزشتہ رات آپ سے تعارف ہوا بھی تو سعید صاحب کے ہاں پارٹی کی ہڑبونگ کے دوران ہوا۔۔۔ اور پھر وہ اس لڑکی والا ناگوار حادثہ پیش آ گیا۔۔۔ کیا نام تھا اس کا۔۔۔" اس نے گویا اپنی یادداشت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے کنپٹی پر انگلی ماری۔

"نشاط؟" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"ہاں۔۔۔ نشاط۔۔۔ سو ٹنگ پول سے اس بے چاری کی لاش برآمد ہونے کے بعد تو پارٹی تباہ ہی ہو کر رہ گئی۔ آپ سے مزید بات چیت کا شرف ہی حاصل نہیں ہو سکا۔ اب پتا چلا کہ آپ اسٹوڈیو میں آئے ہوئے ہیں تو میں نے سوچا' چل کر نیاز حاصل کروں۔ اسٹوڈیو میں آپ کی آمد بھی ایک خبر ہوتی ہے۔" اس نے مصافحے کے بعد اب تک میرا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔

"بس۔۔۔ محبت ہے آپ کی۔۔۔ اور دوسرے لوگوں کی۔" میں نے مسکراتے ہوئے ملائمت سے کہا۔ "تشریف رکھیئے نا۔"

وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھا کیا بلکہ ڈھیر ہو گیا۔ پھر وہ بغیر کسی بات کے ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔ "مجھ جیسے لوگوں کو تو آپ جیسے لوگوں سے ویسے بھی ملتے رہنا چاہئے۔ کیا پتا کب آپ لوگوں کی نظر کرم ہو اور کب آپ ہمیں خدمت کا موقع دیں۔"

"نظر کرم۔۔۔ اور خدمت کا موقع۔۔۔" آفاق استہزائیہ سے انداز میں ہنس کر بولا۔ "اب کی بات تو میں نہیں کر سکتا لیکن کچھ عرصہ پہلے تک کم از کم مجھ جیسے آدمیوں کے لئے تو تمہارے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔ یاد ہے میں نے پچھلے سال تمہارے گھر کے کتنے چکر لگائے تھے۔ حالانکہ سبجیکٹ بھی میرے پاس تھا۔ صرف اسکرین پلے اور ڈائیلاگز ہی کی بات تھی اور میں مکمل طور پر ہر چیز کے کریڈٹ پر تمہارا نام دینے کو تیار تھا۔ بس میرے پاس پیسے ذرا کم تھے۔ تمہارے پاس بات کرنے کا وقت نہیں ہوتا تھا۔" آفاق نے اپنے لہجے میں زیادہ طنز جھلکنے نہیں دیا تھا۔ وہ کافی حد تک ملائمت کے ساتھ ہی گویا کسی شخص کو محض کوئی بھولی بسری بات یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

نصیر نواز ذرا بھی شرمندہ یا پریشان ہوئے بغیر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "بات کرنے کا وقت تو میرے پاس اب بھی نہیں ہے میری جان! لیکن تم دراصل بات کو سمجھتے نہیں ہو اسی لئے ہر تھوڑے عرصے بعد تم پر زوال آ جاتا ہے۔ بھئی اس وقت میں ہر وہ چیز لکھ رہا تھا جس کے لئے مجھے پیسے مل رہے تھے۔ کوئز اکرکٹ لکھ رہا تھا میں۔۔۔ ہر ایک سے پیسے پکڑے ہوئے تھے میں نے۔ لوگ میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ چل سو چل کا زمانہ تھا۔ ہر ماہے گانے کے لئے "اسٹوری" لکھ رہا تھا میں۔ میرے پاس واقعی وقت نہیں تھا۔ میں تم جیسے شریف آدمی کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ ایسی کیا بات تھی میری جان! چار پیسے کم یا زیادہ۔ اس سے کیا فرق پڑ جاتا؟ اب میں کم کام کرتا ہوں' ستھرا کرتا ہوں۔ اسکرپٹ پر ٹائم لگاتا ہوں اور لمبے پیسے لیتا ہوں۔ اب میں چالو کام نہیں کرتا۔ خاص خاص پارٹیوں کے لئے کرتا ہوں اور خاص خاص پارٹیاں ہی اصل میں میرا کام افورڈ کر سکتی ہیں۔ اللہ کا بڑا کرم ہے' اب میں آسودہ ہوں۔ اب میں آنکھیں بند کر کے کنٹریکٹ سائن نہیں کرتا۔ اب تو صرف چوہدری صاحب جیسے لوگوں کے لئے کام کرنے کا موڈ بنتا ہے۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ جب خاموش ہوتا تھا تو بڑا کم گو اور متین آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن میں نے اب پہلی مرتبہ اسے صحیح معنوں میں بولتے سنا تو اندازہ ہوا کہ وہ زبردست لفاظ اور چرب زبان تھا۔

آفاق نے اس موضوع کو آگے نہیں بڑھایا۔ بحث نہیں

چھیڑی بلکہ اس کے لئے کافی منگوائی۔ نصیر نواز نے عبدالواحد ایکسٹرا سپلائر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس سے ہاتھ بھی نہیں ملایا تھا بلکہ وہ گویا اسے نظر ہی نہیں آیا تھا۔

کافی آئی تو پیالی اٹھانے سے پہلے نصیر نواز نے اپنا دھوپ کا بیش قیمت اور نفیس چشمہ اتار دیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور ان کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ شاید کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ سوتا بہت کم تھا۔

کچھ دیر فلموں کی، کہانیوں کی اور ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ زیادہ تر نصیر نواز ہی بول رہا تھا۔ باتوں باتوں میں وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس لڑکی کی موت میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں؟"

"آپ کو کیسے اندازہ ہوا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے گزشتہ رات آپ کے تاثرات سے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔" وہ کافی کی پیالی رکھ کر اپنے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے بولا۔ لہجے میں بے پروائی سی تھی۔

"یہ تو بڑی افسوسناک اطلاع دی آپ نے۔ کہ مجھے اب اپنے تاثرات پر قابو نہیں رہا" میں نے بدستور خوشگوار لہجے میں کہا۔

"قابو تو یقیناً ہو گا لیکن جناب، تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔" اس نے ایک بار پھر بے وجہ سا قہقہہ لگایا۔ "اور پھر ہم تو رہتے ہی تاثرات کی دنیا میں ہیں۔ اسکرین پر تاثرات بیچتے ہیں۔ تاثرات کی کمائی کھاتے ہیں۔"

"مصنوعی تاثرات کی۔" میں نے گویا تصحیح کی۔

"جی ہاں۔ مصنوعی تاثرات کا کاروبار کرتے کرتے اصلی تاثرات کو پرکھنے کا بھی سلیقہ آجاتا ہے۔" وہ ایک بار پھر ہنسا۔ وہ گویا کسی لڑکی کی موت کا نہیں بلکہ اس سے میرے حسین معاشقے کا تذکرہ کر رہا تھا۔

"تو آپ نے اندازہ لگا لیا کہ میں اس لڑکی کی موت میں دلچسپی لے رہا ہوں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"پچھلی رات تو محض شبہ ہوا تھا کہ آپ دلچسپی لیں گے لیکن اب انہیں یہاں دیکھ کر یقین ہو گیا ہے۔" اس نے پائپ سے عبدالواحد کی طرف اشارہ کیا۔

"تو آپ انہیں جانتے ہیں؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ بہت پرانے ایکسٹرا سپلائر ہیں یہ اسٹوڈیو کے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک خوبصورت لائٹر سے پائپ کو شعلہ دکھایا۔

اس لمحے عبدالواحد بھی بول اٹھا۔ "شکر ہے نصیر نواز صاحب! آپ نے اس خادم کو بھی پہچان لیا۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا، میں آپ کو نظر ہی نہیں آیا۔"

"بھئی میں نے تو کمرے میں داخل ہوتے ہی سب کو سلام کیا تھا۔ ان میں آپ بھی شامل تھے۔" نصیر نواز نے ملائمت سے کہا۔ عبدالواحد چپ ہو گیا۔

ایک طویل کش لے کر نصیر نواز میری طرف دیکھتے ہو۔ مسکرایا۔ "بہرحال میرا اندازہ درست رہا نا۔ آپ اس لڑکی نا کی موت میں دلچسپی لے رہے ہیں؟"

"نائیلہ نہیں، نشاط" میں نے تصحیح کی "اور میں اس کی موت میں نہیں اس کے قتل میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ نصیر نواز صاحب اس کے چہرے پر دراصل فریاد رقم تھی۔ اور فریادی چہرے میرے لاشعور میں بیٹھ جاتے ہیں۔"

"لیکن چوہدری صاحب! آپ اتنے بڑے آدمی ہیں.... ا۔ کاروبار پھیلے ہوئے ہیں آپ کے.... کتنی مصروفیت رہتی ہو گی آ کو.... آپ یہ ایسے چھوٹے موٹے معاملات میں پولیس والوں طرح تفتیش کے لئے وقت کیسے نکال لیتے ہیں؟" اس کے لہجے حیرت بھی تھی، ستائش بھی، تجسس بھی اور بے یقینی بھی۔ لیکن اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون سا جذبہ حقیقی تھا۔

"میرے کاروبار مشینی انداز میں چل رہے ہیں" میں کہا۔ "میں چاہوں تو میرے پاس وقت ہی وقت ہے اور نہ چاہوں چوبیس گھنٹے بھی مصروف رہ سکتا ہوں۔"

"خیر جی.... آپ کا جذبہ لائق تحسین ہے۔" اس امریکیوں والے انداز میں کندھے اچکائے۔ پھر گویا موضوع بد ہوئے بولا۔ "کل آپ نے وہ بھی بڑا کمال کیا.... ہمارے صاحب کو ایک ہی گھونسے میں زمین چٹا دی۔ بے چارے کا رعب تھا اسٹوڈیوز میں۔ سچ مچ کا ٹارزن سمجھا جاتا تھا اسے۔"

"بہت بے وقوف سا آدمی ہے۔" میں نے بے پروائی کہا۔

"بے وقوف نہیں ہے جناب! اس بے چارے کے انداز غلط نکلے آپ کے بارے میں۔" نصیر نواز کے لہجے میں ایک بار ستائش جھلک آئی۔ وہ مجھ سے متاثر ضرور تھا لیکن اس کے اظ میں خلوص نہیں تھا۔ وہ درحقیقت بڑی ہوشیاری سے یہ اند کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھ پر خوشامد کا زہر اثر انداز ہوتا یا نہیں۔ میں نے اپنا رویہ مبہم ہی رکھا۔ میں اسے کوئی بھی اندازہ لگانے کا زیادہ موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔

کافی ختم کر کے میں نے گھڑی دیکھی اور اٹھنے کا ارادہ کر۔ لیکن اسی لمحے آفاق کو انٹرکام پر ریسپشنسٹ نے اطلاع دی کہ فون ہے۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف تھا۔

"سر! اس سرخ شیورلیٹ کی نمبر پلیٹ جعلی تھی۔" اس اطلاع دی۔ "غالباً وہ گاڑی چوری کی تھی۔"

"مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا' .... مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ انتظار کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں ہوتا ہے۔" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرے آدمیوں کارکردگی تسلی بخش تھی۔ کم سے کم وقت میں وہ مطلوبہ معلو حاصل کر لیتے تھے۔

نصیر نواز کافی ختم کر کے اٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے اب اجازت جئے۔" پھر وہ آفاق کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت شیریں لہجے میں ا۔ "آفاق! میری جان! تم جب بھی میری ضرورت محسوس کرو' رف ایک فون کر کے مجھے بلوا سکتے ہو۔" بڑے اسٹائل سے اس ہ دھوپ کا چشمہ اٹھا کر ناک پر جمایا اور رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد چند لمحے خاموشی رہی پھر میں نے آفاق سے پوچھا۔ "تمہارے خیال میں نصیر کیسا آدمی ہے؟"

"میرا اس سے واسطہ کم رہا ہے۔ میں اسے زیادہ سمجھ نہیں کا۔" آفاق ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "تاہم میرا خیال ہے کہ یہ ن لوگوں میں سے ہے جو دنیا میں لامحدود ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ زیادہ ے زیادہ آگے جانا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے وہ کوئی بھی رم اٹھانے سے گریز نہیں کرتے۔ ان کی کوئی اخلاقیات یا اصول میں ہوتے۔ بس اپنا کام نکالنا ان کے لئے ہر چیز سے مقدم ہوتا ہے۔ ہمارا سلیم سید بھی اسی کے درجے کا مصنف ہے بلکہ اس کی بعض کہانیاں اس سے بھی بہتر رہی ہیں اور اس نے اکثر و بیشتر فلموں کو ایک نیا ٹریڈ دینے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ شریف، سلجھا ہوا اور قناعت پسند آدمی ہے اس لئے وہ اس جتنا دولت مند آدمی نہیں ہے۔ وہ اپنے اسٹائل سے مصنف لگتا ہے۔ نصیر نواز نہ جانے کیوں مجھے رائٹر نہیں لگتا۔ کوئی تیز طرار اور شاطر قسم کا بزنس مین لگتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تمہاری رائے اس کے بارے میں اچھی نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن اگر کبھی وہ مجھے آپ کے کسی بھی پروجیکٹ کے لئے کارآمد نظر آیا تو میں اس کے پاس ضرور چلا جاؤں گا کیونکہ یہاں میں آپ کے مفادات کی نگرانی کے لئے بیٹھا ہوں۔ ذاتی پسند اور ناپسند کو مقدم سمجھنے کے لئے نہیں" آفاق بلا تامل بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں آفاق ڈیئر!" میں نے ملائمت سے کہا "میرے مفادات کے سلسلے میں تم اپنے آپ کو اتنا پابند ہرگز مت سمجھو۔ تمہیں اپنی پسند اور ناپسند کو بھی معقول حد تک اہمیت دینے کی آزادی ہے۔ آخر تم ایک معقول آدمی ہو۔ ظاہر ہے تمہاری ذاتی پسند اور ناپسند اتنی نامعقول تو نہیں ہو گی۔"

"شکریہ سر! یہ آپ کی مردم شناسی بھی ہے اور کشادہ دلی بھی۔" آفاق کے لہجے میں حقیقی ممنونیت تھی۔

عبدالواحد اٹھتے ہوئے بولا۔ "سر جی! مجھے اب اجازت.... آپ سے مل کر طبیعت بڑی خوش ہوئی ہے سر جی! بہت مدت بعد ایک ایسے آدمی سے ملاقات ہوئی ہے جس کا دل سونا ہے سونا۔"

"بھئی آج تو شاید میرے لئے اپنی تعریفیں ہی تعریفیں سننے کا دن ہے۔" میں نے حقیقتاً تھوڑی سی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ عبدالواحد نہایت انکساری سے ایک بار پھر جھک کر ملا اور رخصت ہو گیا۔ آفاق نے بتایا کہ کچھ دیر بعد اسٹوڈیو ہی کے ایک فلور پر ہماری فلم کی شوٹنگ شروع ہونے والی ہے، میں چاہوں تو دیکھنے کے لئے رک سکتا ہوں لیکن میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی اور آفس سے نکل کھڑا ہوا۔

مال پر پہنچ کر میں نے پہلے انٹرکان میں کھانا کھایا پھر اپنے آفس میں آن بیٹھا۔ چند ایک دفتری کام نمٹانے کے بعد فراغت ہوئی تو میں نے وہ بٹن جیب سے نکالا جو ٹوٹی کے ہاتھوں مارے جانے والے اجنبی کے کوٹ سے ٹوٹ کر گرا تھا۔

ابھی میں ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اس کا جائزہ لینے ہی لگا تھا کہ کمرے میں مکھی کی بھنبھناہٹ سے مشابہ نہایت ہلکی سی آواز گونجنے لگی۔ میں نے ادھر ادھر محض تصدیق کی خاطر دیکھا ورنہ مجھے احساس ہو چکا تھا کہ آواز میرے ہاتھ میں موجود بٹن ہی سے ابھری ہے۔ کمرے میں کوئی مکھی موجود نہیں تھی۔

میں نے بٹن کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے پچھلے حصے پر مجھے مسور کے دانے کے برابر ایک ننھا سا ابھار نظر آیا۔ میں نے احتیاط کے ساتھ ناخن سے اسے ذرا دبایا تو وقفے وقفے سے ابھرنے والی معمولی سی بھنبھناہٹ ختم ہو گئی اور اس کی جگہ تیز سرگوشی سے مشابہ ایک آواز ابھری۔ یہ انداز کرنا مشکل نہیں تھا کہ کسی کو مخاطب کیا جا رہا تھا لیکن زبان میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

میں نے بٹن میز پر رکھ دیا اور تذبذب و خاموشی کے عالم میں اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے عین وسط میں سرخ رنگ کا جو ایک گول دھبا تھا وہ درحقیقت نہایت ہی باریک قسم کی جالی تھی جس کے سوراخ انسانی جلد کے مساموں سے شاید ہی کچھ بڑے رہے ہوں۔

آواز زیادہ دیر جاری نہیں رہی۔ جلد ہی خاموشی چھا گئی۔ میں نے بٹن کو الٹ کر ایک بار پھر اس ننھے سے ابھار کو ناخن سے دبایا۔ وہ دوبارہ ذرا سا ابھر کر اپنی اصلی حالت پر واپس آگیا۔ میں نے ایک بار پھر بٹن کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا۔ آخر کار مجھے اس کے کناروں پر وہ خفیف سی لکیر نظر آگئی جو کسی جوڑ کی نشاندہی کرتی تھی۔

میں نے میز پر سے اپنی چابیوں کا پرس اٹھایا۔ اس میں چابیوں کے ساتھ چھوٹی موٹی کئی کام کی چیزیں آویزاں تھیں۔ میں نے بلیڈ کی طرح تیز لیکن نہایت مضبوط ایک ننھے سے چاقو کے ذریعے تھوڑی سی کوشش کی اور آخر کار وہ بٹن ڈبیا کی طرح کھل گیا۔ اس کے اندر بال سے زیادہ باریک تاروں اور خوردبینی پرزوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ مائیکرو بیٹری بھی موجود تھی۔ میں نے اس کا بہت اچھی طرح جائزہ لیا۔ میری چھٹی حس نے ابتدا ہی میں مجھے احساس دلا دیا تھا کہ وہ محض کوٹ کا بٹن نہیں ہے۔ وہ بہت عمدہ قسم کا ٹرانسمیٹر تھا۔ ٹرانسیٹر ہمارے پاس بھی تھے لیکن اتنا نفیس اور اتنے کم حجم کا ٹرانسیٹر ہم آج تک بھی حاصل نہیں کر سکے تھے حالانکہ رسائی ہماری بھی بہت دور دور تک تھی۔ حجم کم ہونے کے باوجود اس کا دائرۂ کار خاصا وسیع معلوم ہوتا تھا۔

میں ریوالونگ چیئر پر تقریباً نیم دراز ہو گیا اور میز پر رکھے

ہوئے اس ٹرانسمیٹر کو یوں دیکھتا رہا جیسے ابھی اس میں سے کوئی مہذب و شائستہ آواز ابھرے گی اور میری تمام الجھنیں چند لمحے میں دور کردے گی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس ننھی سی ڈبیا نے میرے ذہن میں ان گنت سوالوں کا دروازہ کھول دیا تھا جبکہ الجھنوں کا ایک پینڈورا بکس پہلے ہی کھلا پڑا تھا۔

اس قسم کے ٹرانسمیٹر بہت منظم قسم کے لوگوں کے پاس ہی ہوسکتے تھے۔ وہ لوگ کون تھے اور کس چکر میں میرے پیچھے لگ چکے تھے یا آئندہ زیادہ زور و شور سے لگنے والے تھے؟ یہ کونسی زبان تھی جو میں نے چند لمحے پہلے ٹرانسمیٹر پر سنی تھی؟ وہ شخص کون تھا جس نے میرا تعاقب کیا تھا اور ٹونی کے ہاتھوں مارا گیا تھا؟

ایک تو یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوگیا تھا کہ میں اس شخص کے بارے میں یہ بھی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ ملکی تھا یا غیر ملکی؟ وہ پاکستانی بھی ہوسکتا تھا اور غیر ملکی بھی۔ کسی مخصوص قوم سے بھی ہوسکتا تھا اور دوغلی نسل کا بھی ہوسکتا تھا۔ میں نے اسے اس کی مضحکہ خیز سی شخصیت کے ساتھ اس پرانی کار میں دیکھ کر زیادہ اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب اس ٹرانسمیٹر کو دیکھنے اور اس پر ایک اجنبی زبان میں چند الفاظ سننے کے بعد مجھے نہایت سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچنا پڑ رہا تھا بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ مجھے تشویش لاحق ہو چلی تھی۔

کسی سوال کا تو مجھے کوئی جواب نہ ملا البتہ انٹرکام کے بزر نے مجھے چونکا دیا۔ دوسری طرف کیتھرین تھی۔ وہ خط و کتابت کی کچھ فائلیں ایک نظر دکھانے کے لئے میرے پاس بھیجنا چاہتی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اگر سوالوں کا کوئی جواب نہیں مل رہا تو تھوڑا سا دفتری کام ہی کرلیا جائے۔

دفتری کام میں الجھا تو پھر شام ہی ڈھل گئی۔ گھر جاکر لباس تبدیل کرکے، فریش ہوکر میں ایک بار پھر باہر نکلا۔ مجھے ایک پارٹی میں جانا تھا لیکن اس میں ابھی دیر تھی۔ میں نے سوچا، راستے میں تاجاں کو دیکھتا چلوں کہ میرے آدمیوں نے اس کی رہائش اور علاج معالجے کا کیا بندوبست کیا ہے اور اتنے عرصے میں اس کی حالت میں کتنی بہتری ہوئی ہے۔

اس صاف ستھری بلڈنگ کی دوسری منزل پر پہنچ کر میں نے مطلوبہ فلیٹ کی بیل بجائی۔ راہداری میں سناٹا تھا۔ یہ بلڈنگ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ بس چند کشادہ اور آرام دہ فلیٹوں پر مشتمل تھی جن میں سفید پوش اور قدرے آسودہ حال لوگ آباد تھے۔

دروازہ ادھیڑ عمر کی ایک سنجیدہ صورت عورت نے کھولا۔ وہ صاف ستھری سوتی ساری میں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چونک کر مودبانہ انداز میں ایک طرف کو ہٹ گئی۔ معلوم نہیں کس طرح وہ مجھے پہچانتی تھی۔

"آپ.....؟" میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارا نام مہرالنساء ہے صاحب!" وہ میرا ان کہا سوال سمجھتے ہوئے بولی "ہمیں تاجاں بیگم کی خدمت کے لئے رکھا گیا ہے۔ ہمارے علاوہ روزانہ ایک نرس بھی دو گھنٹے کے لئے یہاں آتی ہے اور تیسرے چوتھے دن ڈاکٹر صاحب بھی تاجاں بیگم کو دیکھنے آتے ہیں۔"

"بہت خوب" میں نے طمانیت کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "تاجاں ہے کہاں؟"

"اپنے بیڈ روم میں ہیں صاحب!" مہرالنساء نامی اس آیا نے مستعدی سے آگے بڑھ کر میری رہنمائی کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے ایک کمرے کے دروازے پر ہولے سے دستک دی اور دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے بڑے مسرور سے لہجے میں بولی "تاجاں بیگم! دیکھیے تو کون آپ سے ملنے آئے ہیں؟"

وہ ایک نہایت صاف ستھرا کمرا تھا۔ آرائش میں سادگی تھی مگر وہاں ضرورت کی ہر معیاری چیز موجود تھی۔ صاف ستھرے، بے داغ بستر پر تاجاں نہایت آرام دہ، ڈھیلے ڈھالے لباس میں بستر پر گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی اور فلمی رسالے اس کے سامنے کھلے پڑے تھے۔ وہ اس تاجاں سے بہت مختلف تھی جسے میں نے کچھ عرصہ پہلے گاؤں کی اس جھونپڑی میں غلیظ بستر پر بیماری کی حالت میں سسکتے ہانپتے دیکھا تھا۔

اس کے بال جو اس وقت گھاس پھونس کی طرح الجھے ہوئے تھے۔ اب صاف ستھرے، برش کئے ہوئے اور ریشم کی طرح چمکیلے نظر آرہے تھے اور بڑی خوبصورتی سے اس کی کمر، کندھوں اور رخساروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے گندمی رخسار جو اُس وقت دھنس چکے تھے اور جن پر موت کی زردی نے قدم جما لئے تھے، اب ان پر زندگی کی چمک لوٹ آئی تھی۔ اس کی آنکھیں جو مایوسی اور مصائب کے دھوئیں سے دھندلا چکی تھیں اب ان میں امید اور بے عنوان جذبوں کے ستارے جھلملانے لگے تھے۔ اس کی جوانی کسی نہ کسی حد تک لوٹنے لگی تھی۔ بہت کم عرصے میں اس کی حالت میں خاصی بہتری آگئی تھی۔ اس پر یقیناً بہت توجہ دی گئی تھی۔ بہت عمدگی سے اسے موت کی دہلیز سے واپس لایا گیا تھا۔

اسے اتنی بہتر حالت میں دیکھ کر میرا دل ایک عجیب، بے نام سی خوشی سے بھر گیا۔ ایک لمحے کے لئے میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ وہ بھی یکدم بے اختیار سی ہوکر بستر سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "افضل! میرے چندا... میرے دوست... میرے محسن!"

الفاظ اس کے منہ سے صحیح طرح نہیں نکل رہے تھے۔ شاید اس کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ مجھے کس القاب سے پکارے مجھ سے کون سا رشتہ استوار کرے۔ وہ عمر میں مجھ سے صرف چند سال بڑی تھی اور درحقیقت ہمارے درمیان کوئی رشتہ بھی نہیں تھا۔ وہ بس میرے گاؤں کی تھی اور میری یادوں کا ایک حصہ تھی اور جب وہ خود لبِ گور تھی تو میری جان بچانے کا سبب بن گئی تھی۔ یوں اس کے اور میرے درمیان کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی ان گنت رشتے تھے۔

وہ کسی غیر مرئی دھارے میں بہتی ہوئی میرے قریب آئی تو میں نے کندھوں سے اسے تھام لیا۔ اس کے وجود سے کلون کی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ خوابناک سے انداز میں مسکرائی تو اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک اٹھے۔ یہ دانت کچھ عرصے پہلے تک گھٹیا سگریٹوں کے دھوئیں سے پیلے ہوچکے تھے۔ اب ان کی وہ سفیدی اور چمک لوٹ آئی تھی جو میں اس زمانے میں دور دور سے دیکھا کرتا تھا جب اس پر شباب کی آمد آمد تھی۔ میں اس وقت بچہ ہی ہوا کرتا تھا۔

وہ اب بھی کمزور تھی۔ ابھی اسے بہت دیکھ بھال، بہت علاج معالجے کی ضرورت تھی لیکن پھر بھی بہرحال زمین آسمان کا فرق تھا۔ میں اس مصور کی طرح اسے دیکھے جارہا تھا جس سے کسی خاص کوشش کے بغیر کوئی شاہکار تخلیق ہوگیا ہو۔

"افضل...!" دفعتاً وہ رُندھی ہوئی سی آواز میں بولی "تو نے مجھے احسانوں کے ایک اونچے پہاڑ تلے دبا دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا میں کیسے تیرے احسانوں کا بدلہ اتاروں گی۔ میں... میں نالی کا کیڑا بن چکی تھی۔ تو نے مجھے اٹھا کر اس جنت میں لا بٹھایا ہے۔" اس نے اپنے گردوپیش کی طرف اشارہ کیا۔ "میں مٹی کوڑے میں رُلنے والی غریب و بساتن! میں نے تو یہ چیزیں کبھی خواب میں بھی دیکھنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ تو نے میرے لئے اتنا کچھ کیا ہے۔ میں تیرے لئے کیا کروں گی؟ میں تو کسی قابل بھی نہیں ہوں۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی گن۔ کوئی خوبی بھی نہیں ہے۔ میں تو بیکار روڑے پتھر کی طرح ہوں۔"

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں" میں گلے میں پھیل جانے والی ہچکی سی نگلتے ہوئے کہا۔ "اگر تو نے آئندہ احسانوں کا ذکر کیا یا ان کے بدلے اتارنے کی بات کی تو میں تجھے اس کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا۔ سچ مچ کے روڑے اور پتھروں کی طرح۔" میں نے بیڈ روم کی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جس پر ریشمی پردہ پھیلا ہوا تھا۔

خادمہ نے ایک بار پھر کمرے میں جھانکا اور کھنکار کر مجھے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ "صاحب! میں آپ کے لئے کیا تیار کروں... چائے کافی... ٹھنڈا سا.....؟"

"کچھ نہیں، قطعاً کچھ نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں فی الحال صرف چند منٹ کے لئے آیا ہوں۔ کھڑے کھڑے بات کرنے کے لئے اور یہ دیکھنے کے لئے کہ تاجاں بیگم کے لئے انتظامات ٹھیک ہیں یا نہیں۔"

"یہ تو آپ انہی سے پوچھ لیجئے گا صاحب!" خادمہ نے تاجاں کی طرف اشارہ کیا۔

"اب پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔" میں نے کہا اور خادمہ واپس چلی گئی۔

تاجاں آنکھیں بند کرکے مٹھیاں بھینچتے ہوئے گہری سانس لے کر بولی "قسم سے، مجھے صبح شام یہی وہم ہوتا رہتا ہے کہ میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ ابھی آنکھ کھولوں گی اور سپنا ٹوٹ جائے گا۔"

"خدا نے چاہا تو یہ سپنا میری زندگی میں تو نہیں ٹوٹے گا۔" میں کہا۔

وہ یکدم آنکھیں کھولتے ہوئے بولی۔ "اللہ کرے میری زندگی بھی تجھے لگ جائے۔ میرا دل کہتا ہے کہ تو صرف میرے لئے ہی یہ سب کچھ نہیں کررہا بلکہ اور بھی نہ جانے کتنے لوگوں کے لئے کیا کچھ کرتا ہوگا۔ ان سب کی دعائیں تیری زندگی کی حفاظت کریں گے۔ بہت لمبی عمر پائے گا تو... اور ہر دن تیرے لئے عروج ہی عروج لے کر آئے گا۔"

میں نے بستر پر پھیلے ہوئے رسالوں کی طرف اشارہ کرکے موضوع بدلنے کی غرض سے کہا "تاجاں! خیر سے اب تو پڑھنے بھی لگی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تو تو ان پڑھ ہوا کرتی تھی۔"

"پڑھ کہاں رہی ہوں... میں تو بس تصویریں دیکھ رہی تھی ٹی وی اور فلم ایکٹروں کی۔" اس نے سادگی سے کہا "اب جسم میں تھوڑی سی جان آگئی ہے نا... اور کوئی کام ہے نہیں کرنے کے لئے۔ اس لئے ذرا بے چینی سی ہونے لگتی ہے۔ کبھی بالکونی میں بیٹھ کر آتی جاتی گاڑیاں دیکھتی ہوں۔ لوگوں کو دیکھتی ہوں۔ کبھی ٹی وی دیکھتی ہوں اور کبھی رسالے پرولنے لگتی ہوں۔ کوئی [illegible] نہیں ہے۔ میرے ہاتھ تو جیسے الہ دین کا چراغ لگ گیا ہے۔ ہر کام خود بخود ہوجاتا ہے۔ ہر چیز تیار ملتی ہے۔ جو مانگتی ہوں، حاضر کردیا جاتا ہے۔"

پھر جیسے اسے یکدم کوئی خیال آیا۔ ناک سکیڑ کر بولی "ویسے میں اتنی زیادہ ان پڑھ بھی نہیں ہوں۔ تھوڑی بہت اردو تو پڑھ لیتی ہوں ذرا کوشش کرکے۔ گاؤں میں تیسری چوتھی جماعت تک تو اسکول گئی ہوں میں۔ بعد میں ابا نے کپاس چننے پر لگا دیا تھا۔"

میں مسکراتا رہا اور محبت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "افضل! تو مجھے کسی کام پر کیوں نہیں لگا دیتا؟ کوئی بھی ایسا کام جس میں میرا دھیان بٹا رہے۔ میں مصروف رہوں۔ ایسا کوئی کام جو میں کرسکوں۔ اب تو مجھ میں بڑی جان آگئی ہے۔ ساری زندگی کام کاج کرتے گزری ہے نا۔ بیکار بیٹھنا مشکل لگتا ہے۔"

"ابھی تو کافی عرصہ تجھے اسی طرح بیکار بیٹھنے کی سزا کاٹنی ہے۔" میں نے کہا "پھر جو تیرا جی چاہے کرلیا کرنا۔ ایک عمر پڑی ہے کام کرنے کو۔ اب میں چلتا ہوں۔"

"میں تجھے رکنے کو کہتی۔" وہ میرے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "لیکن مجھے پتا چل گیا ہے کہ تو بہت بڑا آدمی ہے۔ بہت کام ہوتے ہوں گے تجھے۔ بڑی مصروفیت ہوتی ہوگی۔ آج بھی پتا نہیں میری خاطر کس طرح وقت نکال کر آیا ہوگا۔"

"نہیں، اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ میں اتنا بڑا یا اتنا مصروف آدمی بھی نہیں۔" اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور اس ہاتھ میں زندگی کی حرارت اور گداز لوٹنے لگا تھا۔

"میں بہت جلد دوبارہ تجھے دیکھنے آؤں گا۔" میں نے بیرونی دروازے پر رکتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تجھے اور بہتر ہونا چاہئے' تیری صحت اور اچھی ہونی چاہئے۔"

"دنیا بھر کی دوائیاں' پھل فروٹ' طاقت کی چیزیں تو کھا رہی ہوں میں۔ ڈاکٹر نے سگریٹ بھی چھڑا دی ہے میری۔ اب میں نے اچھا نہیں ہونا تو اور کیا ہونا ہے۔" وہ اپنے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

میں اسے دروازے پر کھڑی چھوڑ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اس وقت تک وہیں کھڑی رہی جب تک میں اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔

وہاں سے میں ہلٹن میں پہنچا۔ پارٹی ہلٹن میں تھی۔ وہاں میرا وقت اچھا گزرا۔ رات گئے واپسی ہوئی اور میں فوراً ہی شب خوابی کا لباس پہن کر بستر پر ڈھیر ہوگیا لیکن اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ نیند سے میری آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں۔ میں نے بے دلی سے ریسیور اٹھایا۔

"تو تم نے اسے قتل کردیا مسٹر چوہدری!" دوسری طرف سے بغیر کسی تمہید کے انگریزی میں کہا گیا۔ آواز بہت بھاری اور گونجیلی تھی۔ مجھے اس میں خمار کی جھلک بھی محسوس ہوئی۔ بولنے والے کی زبان انگریزی معلوم نہیں ہوتی تھی اور وہ پاکستانی بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔

میری نیند یک لخت کافور ہوگئی اور میں بالکل چوکنا ہوگیا لیکن میں نے اپنی آواز حتی الامکان نیند کے خمار سے بوجھل بناتے ہوئے انگریزی میں ہی جواب دیا۔ "سوری! رانگ نمبر۔ یہاں کوئی چوہدری' کوئی مقتول' کوئی مسٹر چوہدری نہیں رہتے۔"

"شٹ اپ۔" گونجیلی آواز نے مجھے ڈانٹا۔ "یہ ایک قتل ہم تمہیں معاف کررہے ہیں۔ شرط صرف یہی ہے کہ تم ہنی کی تلاش میں دلچسپی لینا بالکل چھوڑ دو۔ بھول جاؤ اسے۔ آئندہ تمہیں اس کے گھر کے آس پاس یا کہیں بھی اس کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے ہوئے نظر نہیں آنا چاہئے۔ سمجھ گئے؟"

"ہنی سے اگر آپ کی مراد شہد ہے تو میں حلفیہ بیان دے سکتا ہوں کہ میں نے ایک عرصے سے اس میں دلچسپی نہیں لی۔" میں نے بدستور سادگی سے کہا۔ "اب اگر آپ اجازت دیں تو میں فون بند کرکے تھوڑی دیر سولوں؟"

"زیادہ شوخ بننے یا زیادہ اونچا اڑنے کی ضرورت نہیں۔" گونجیلی آواز میں ناگواری در آئی۔ "یہ پہلی اور آخری وارننگ ہے۔ اگر عمل کرنے کا ارادہ نہیں ہے تو خود کو آج سے ہی مردہ سمجھنا شروع کردو۔"

"بہت بہتر۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔ "آپ کی تعریف؟"

"ریڈ ڈاٹ" دوسری طرف سے مبہم جواب ملا۔

"تو مسٹر ریڈ ڈاٹ! میں نے آپ کے حسب ہدایت اپنے آپ کو مردہ فرض کرلیا ہے اور آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ مردوں کو فون پر بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس لئے..."

"ریڈ ڈاٹ میرا نام نہیں ہے۔" وہ غرایا۔

"تو پھر...؟" میں نے سادگی سے پوچھا لیکن دوسری طرف۔ کوئی جواب نہیں ملا بلکہ ہلکی سے کلک کے ساتھ رابطہ منقطع ہوگیا۔ کئی لمحے تک میں ریسیور کو گھورتا رہا۔ آخر کار مجھے یقین ہوگیا کہ اب اس سے ٹون کے علاوہ کوئی آواز نہیں ابھرے گی۔ میں نے آہستگی سے اسے واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ بظاہر معمولی سے انداز میں شروع ہونے والے واقعات گنجلک ہوتے جارہے تھے۔

ہنی کے اغوا کے سلسلے میں سکوت کچھ ٹوٹا تو تھا لیکن بات اور الجھ گئی تھی۔ اس شخص نے یہ تو بتادیا تھا کہ ریڈ ڈاٹ اس کا نام یا عرفیت نہیں تھی لیکن اگر یہ کسی تنظیم کا نام تھا تو اس کی نوعیت کس قسم کی تھی اور ہنی کو اغوا کرنے میں ان کی کیا غرض پوشیدہ تھی... ان باتوں کا کچھ اندازہ نہیں ہوپارہا تھا اور کیا مجھے اس سلسلے میں دلچسپی لینے سے باز رکھنا ان کی نظر میں اتنا ضروری تھا؟

آخر کار میں نے ان سوالوں پر غور کرنے کی نسبت سوجانا بہتر سمجھا چنانچہ سب کچھ ذہن سے جھٹک کر میں سوگیا۔

سوتے میں اگر اچانک آنکھ کھل جائے تو انسان کو فوری طور پر تو قطعاً اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کتنی دیر سویا ہے۔ سوتے سوتے یکایک ہی میری آنکھ کھلی تھی۔ جیسے اچانک کسی مشین کا سوئچ آن ہوجائے۔ وہ جس درندوں میں موجود ہوتی ہے جو نیند میں بھی انہیں خطرے سے خبردار کردیتی ہے اور کوئی کتنا ہی دبے قدموں ان کے قریب پہنچے وہ عموماً ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ وہ جس کسی نہ کسی حد تک مجھے میں بھی موجود تھی۔ اس جس نے گویا مجھے سوتے میں اطلاع دی تھی کہ کمرے میں میرے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ میرے حواس یک لخت بیدار ہوگئے تھے لیکن تب بھی کسی نہ کسی حد تک تاخیر ہوچکی تھی۔ نہایت ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی اور نائٹ بلب کی مدھم اور رنگین روشنی گویا معدوم ہوگئی۔

سب سے پہلے میری نظر سوئچ بورڈ کے قریب کھڑے ہوئے شخص پر پڑی۔ وہ سیاہ پتلون اور چمڑے کی جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ قمیص گہرے سرخ رنگ کی تھی۔ وہ دراز قد اور نوجوان تھا مگر عام سی جسامت کا مالک تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کی کمر سے کینوس کا ایک چھوٹا سا تھیلا بندھا ہوا تھا۔ جس وقت میری نظر اس سے ملی اس کا ایک ہاتھ سوئچ بورڈ پر اور دوسرا ایک ریوالور کے دستے پر تھا جس کی نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایک گورا چٹا' خوبصورت نوجوان تھا مگر اس کی آنکھوں میں کینگی اور گھٹیا پن کی جھلک تھی۔

طویل و عریض بیڈ روم کے دو کونوں میں دوسرے دو آدمی بھی موجود تھے جو بڑی مستعدی سے گویا پوزیشن سنبھالے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خودکار رائفلیں تھیں۔ وہ گہرے رنگ کی شلوار قمیصوں میں تھے۔ دونوں ہی بھاری بھرکم اور مضبوط تھے اور دونوں ہی جمے ہوئے بدمعاش معلوم ہوتے تھے۔ ان کی شکلیں اور حلیے ملتے جلتے سے تھے۔ نمایاں فرق یہ تھا کہ ان میں سے ایک کی موٹی موٹی مونچھیں تھیں جبکہ دوسرا کلین شیو تھا۔ موسم ٹھنڈا ہونے کے باوجود انہوں نے کوئی گرم کپڑا پہنا ہوا نہیں تھا۔ وہ دونوں قہر آلود نظروں سے مجھے یوں گھور رہے تھے جیسے ان سے میری بہت پرانی دشمنی چلی آرہی ہو۔

ساؤنڈ پروف کمرے کا دروازہ پہلے ہی کی طرح بند تھا۔ کہیں کسی قسم کی توڑ پھوڑ کے آثار نظر نہیں آرہے تھے حالانکہ میں ہمیشہ کی طرح کمرا مقفل کرکے سویا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ تالا کھول کر یا کسی اور پُراسرار طریقے سے اسے ناکارہ بنا کر اندر آئے تھے۔ میں نے بظاہر ایک سرسری سی نظر ہی ڈالی تھی لیکن تمام چیزوں کا مکمل جائزہ لے لیا تھا۔ میری جس نے حقیقتاً مجھے خاصی تاخیر سے خبردار کیا تھا۔ ان کے اندر آنے اور یوں پوزیشن سنبھال کر کھڑے ہونے میں کچھ دیر تو لگی ہی ہوگی۔ شاید مجھ پر نیند کا غلبہ زیادہ تھا جو میں جلدی خبردار نہیں ہوسکا تھا۔

رائفل والے دونوں بھاری بھرکم آدمی پیشہ ور لڑاکے اور جرم پیشہ معلوم ہوتے تھے۔ سوئچ بورڈ کے قریب کھڑا ہوا نوجوان لڑائی جھگڑے میں زیادہ ماہر معلوم نہیں ہوتا تھا تاہم ریوالور کے دستے پر اس کی گرفت مشاقانہ تھی۔ شاید ریڈ ڈاٹ والوں کو یقین ہوگیا تھا کہ میں ہنی کی تلاش سے باز نہیں آؤں گا اور انہوں نے فوراً ہی اپنی طاقت اور رسائی کا مظاہرہ شروع کردیا تھا۔

یہ بھی گویا ایک ستم ظریفی ہی تھی کہ ادھر اُدھر آتے جاتے وقت تو ٹونی اور شبیر یا کوئی نہ کوئی دوسرے دو آدمی میری حفاظت کے لئے سائے کی طرح ساتھ لگے رہتے تھے لیکن میرے گھر کے جہاں مجھے ساری رات گزارنی ہوتی تھی۔ حفاظتی انتظامات اتنے تسلی بخش نہیں تھے۔ ویسے عام حالات میں میں کبھی اپنے گھر کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں فکرمند نہیں ہوا تھا۔ گھر میں چار بلڈ ہاؤنڈ رکھتے تھے جو سہ طرفہ لان پر رات کو خاموشی سے ٹہلتے رہتے تھے۔ دن اور رات کے لئے الگ الگ چوکیدار تھے۔ دونوں ہی اپنی اپنی ڈیوٹی کے دوران گیٹ کا بھی خیال رکھتے تھے اور چاردیواری کے اندر' اندر کوٹھی کی اصلی عمارت کے گرد چکر بھی لگاتے تھے۔ وہ دونوں بظاہر عام سے چوکیدار ہی معلوم ہوتے تھے لیکن درحقیقت وہ گوریلا فوجیوں سے کم نہیں تھے۔ مزید چند چھوٹی چھوٹی احتیاطی تدابیر بھی میں نے اختیار کررکھی تھیں اور میرے خیال میں اتنا ہی بندوبست کافی تھا۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی میں نے کبھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

میرا سر اس وقت خاصے اونچے تکیے پر تھا۔ میں نے کمبل ہٹاتے ہوئے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن موٹی موٹی مونچھوں والا آٹومیٹک رائفل کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔ "بس بس' لیٹے ہی رہو سیٹھ جی' ہم نے تو پوری پوری کوشش کی تھی کہ تمہاری آنکھ نہ کھلنے پائے تاکہ تمہاری موت تمہارے لئے کم سے کم تکلیف دہ ہو۔" اس کا لہجہ استہزائیہ بھی تھا اور اس میں برسوں کی نفرت بھی رچی ہوئی تھی۔ شاید یہ نفرت سب ہی دولت والوں کے خلاف تھی اس لئے اس کے اندازِ تخاطب میں مجھے زیادہ زہر رچا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس نے کافی حد تک مجھے اس فلمی ہیرو کی طرح سیٹھ جی کہا تھا جو فلم کے آخری سین میں اس سیٹھ سے حساب کتاب برابر کرنے آیا ہو جس نے پوری فلم میں نہایت ہی گھٹیا قسم کے ولن کا رول ادا کیا ہو۔

میں نے نرمی سے کہا "اگر تمہیں میرے آرام کا اتنا ہی خیال تھا تو تمہیں لائٹ آن نہیں کرنی چاہئے تھی تاکہ میری آنکھ نہ کھلتی۔"

"مجبوری تھی" وہ سفاکی سے زیر مونچھ مسکرایا "ہمیں شکل بھی اچھی طرح دیکھنی تھی۔ ہم غلط آدمی پر گولیاں ضائع کرنا بالکل پسند نہیں کرتے۔ ریپوٹیشن خراب ہوتی ہے۔"

"تم لوگوں کو اندر آنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا "میرے کتوں کو کیا ہوا؟ وہ ذرا بھی نہیں بھونکے؟"

"کتوں کا کیا ہے سیٹھ جی!" مونچھوں والے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "کتوں کو خاموش کرانے کے بہت سے نسخے ہیں ہمارے پاس۔"

"کیا تم نے ان کو مار دیا؟" میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ مجھے اپنی کنپٹیوں میں غیظ و غضب کے آتش فشاں کی سرسراہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ وہ کمیاب نسل کے انتہائی جاں نثار قسم کے کتے تھے۔

"ممکن ہے وہ بچ جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مرجائیں۔" مونچھوں والے نے مبہم جواب دیا۔

"کیا تم نے ان کو زہر دیا ہے؟ مگر وہ تو گھر والوں کے علاوہ کسی کے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں کھاتے' راستے میں پڑی ہوئی بھی کوئی چیز نہیں کھاتے۔" میں نے کہا۔

"میں نے کہا نا کہ ہمارے پاس بہت سے نسخے ہیں۔ اور پھر کتے آخر کتے ہی ہوتے ہیں۔ غلطیاں تو انسان سے بھی ہوتی ہیں وہ تو پھر جانور ہیں۔" مونچھوں والا بولا۔

"اور چوکیدار؟"

"وہ بھی آرام سے سو رہا ہے۔"

میرا بیڈ روم بالائی منزل پر تھا۔ میں نے مونچھوں والے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "اور تمہیں راستے میں تمام تالے کھولنے میں بھی کوئی دقت پیش نہیں آئی؟"

"اس قسم کے کاموں کے لئے یہ جو ہمارا یار ساتھ تھا" مونچھوں والے نے گورے چٹے نوجوان کی طرف اشارہ کیا جو ریوالور تھامے سوئچ بورڈ کے قریب کھڑا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ

وہ حقیقتاً نہایت اعلیٰ درجے کا قفل شکن اور نقب زن لگتا تھا۔ شاید یہ اس پیشے ہی کی کینگی تھی جو اس کی آنکھوں میں رچ بس گئی تھی۔

مونچھوں والا گویا اسے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بولا "اس جیسا فنکار پورے ملک میں شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ تالے تو اس کی شکل دیکھ کر خود بخود کھل جاتے ہیں۔ دیسی ہوں' ولایتی ہوں' چینی ہوں' جاپانی ہوں۔ چاہے کسی بھی قسم کے تالے ہوں۔"

کلین شیو شخص کے چہرے پر پہلی مرتبہ خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ اپنے ساتھی سے ملتے جلتے لہجے میں بولا۔ "سیٹھ! تم تو ہمیں اپنے کمرے میں دیکھ کر کچھ زیادہ ہی حیران پریشان ہو گئے ہو۔ تمہارے گھر میں تو کچھ بھی انتظام نہیں تھا۔ ہم تینوں اگر اکٹھے ہو جائیں تو ان جگہوں پر بھی پہنچ جاتے ہیں جہاں چیونٹیاں بھی اپنی شناخت کرائے بغیر داخل نہیں ہو سکتیں۔"

مونچھوں والے نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کے قہقہے کی آواز کسی دور افتادہ مقام سے سنائی دینے والی بادلوں کی گڑگڑاہٹ سے مشابہ تھی۔ وہ غالباً اپنے شکار کی زندگی کے آخری لمحات سے بہت لطف اندوز ہو رہا تھا۔ رائفل کے ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھنے لگا تھا۔

میں نے آنکھیں یوں بند کر لیں گویا مجھ میں موت کا سامنا کرنے کی تاب نہیں ہے لیکن درحقیقت میں دو چار سیکنڈ کی اس مہلت میں اپنی آنکھوں کو روشنی سے یکدم اندھیرے میں دیکھنے کے قابل بنا رہا تھا۔ اندھیرے میں یوں تو میری نظر قابل رشک حد تک کام کرتی تھی لیکن تیز روشنی سے یکدم اندھیرے میں فوری حرکت کرنے کے لئے تھوڑی سی پیش بندی ضروری تھی۔ خصوصاً جبکہ ذرا سا بھی غلط اندازہ جسم چھلنی کرانے کا باعث بن سکتا تھا۔

میرا پاؤں گفتگو کے دوران غیر محسوس طور پر کھسکتا ہوا پائنتی کی چوبی پٹی تک پہنچ چکا تھا اور وہاں ننھا سا ایک پیش بٹن موجود تھا جو بظاہر چوبی پٹی ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے پاؤں کے انگوٹھے کا دباؤ بڑھایا اور کمرا گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ نائٹ بلب تک بجھ گیا۔ یہ ان چھوٹی چھوٹی احتیاطی تدابیر میں سے ایک تھی جو میں نے اپنے گھر میں قدم قدم پر اختیار کر رکھی تھیں۔

اندھیرا ہوتے ہی میں بیڈ سے قالین پر گر چکا تھا۔ کمرے میں درندوں کی غراہٹیں اور پھر رائفلوں کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ غیر ارادی طور پر ان کی گنوں کا رخ بیڈ کی طرف ہی رہا تھا اور میں نے اسی نفسیاتی پہلو پر تکیہ کیا تھا۔ وہ یقیناً بری طرح نروس ہو گئے تھے کمرے میں گھپ اندھیرا ہو جانا ان کے شیڈول میں شامل نہیں تھا۔

مجھے یقین تھا کہ ان میں سے ٹارچ وغیرہ صرف قفل شکن نوجوان کے پاس ہو گی اور وہ غالباً اسے کینوس کے اس تھیلے میں رکھ چکا تھا جو اس کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ اسی تھیلے میں شاید اس کے ضروری اوزار تھے۔ فاصلے کے اعتبار سے بھی وہ مجھ سے نزدیک ترین تھا۔ اس لئے میں بیڈ سے لڑھکتے ہی ایک لمحے میں اس تک پہنچ چکا تھا۔ میں اندھیرے میں سب کچھ کم از کم اس حد تک ضرور دیکھ رہا تھا جتنا شاید وہ نائٹ بلب کی روشنی میں دیکھ پاتے۔

قفل شکن نوجوان سب سے زیادہ نروس ہوا تھا۔ ٹارچ تک تو درکنار' وہ ہاتھ میں موجود ریوالور کو بھی فوری طور پر استعمال نہیں کر پایا تھا۔ وہ اندھیرے میں اسے گھمانے ہی لگا تھا کہ میں نے اسے جا لیا۔ ایک بازو سے اس کی گردن دبوچتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی موڑ کر میں نے ریوالور اس کے ہاتھ سے قالین پر گرنے دیا اور پھر اس نوجوان کو ہی اٹھا کر میں نے مونچھوں والے پر دے مارا جس نے اندھا دھند فائرنگ سے کمرے کا فرنیچر وغیرہ کافی حد تک تباہ کر دیا تھا۔

ان دونوں کے گرنے کی دھمک کے ساتھ ان کی خوفزدہ غراہٹیں سی ابھریں اور ایک گن کم از کم وقتی طور پر خاموش ہو گئی۔ اسی دوران میں کلین شیو شخص کی کلائی قابو میں کر کے اس کا سر دیوار سے ٹکرا چکا تھا۔ اسے بھی میں نے جوڈو کی ٹیکنیک استعمال کرتے ہوئے ان دونوں پر اچھال دیا جو کمرے کے دوسرے کونے میں ڈھیر تھے اور اٹھ ہی رہے تھے۔ مونچھوں والے کے ہاتھ سے گن ایک لمحے کے لئے چھوٹ چکی تھی مگر وہ فوراً ہی اسے دوبارہ تلاش کر چکا تھا لیکن اس کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ اسی لمحے کلین شیو شخص پہاڑ کی طرح ان دونوں پر جا گرا اور وہ تینوں ایک دوسرے میں الجھ کر رہ گئے۔

میں نے انہیں اس لئے یکجا کیا تھا کہ اس طرح ان پر قابو پانا میرے لئے زیادہ آسان تھا۔ کلین شیو شخص کی گن میرے ہاتھ میں آ چکی تھی لیکن میں انہیں قتل کرنا نہیں چاہتا تھا ورنہ ایک لمحے میں تینوں کا قصہ پاک ہو سکتا تھا۔ تاہم میں انہیں محض گن کے اشارے سے بھی حکم دینا نہیں چاہتا تھا انہیں تھوڑی سی سزا دینا بھی میرے خیال میں ضروری تھا۔

میں نے گن کو بال کی طرف سے پکڑ کر ان کی ٹھکائی شروع کر دی۔ وہ تینوں ایک دوسرے پر ڈھیر تھے اور میں انہیں اٹھنے کی مہلت نہیں دے رہا تھا۔ رائفل کا بٹ ان کے جسموں کے مختلف حصوں پر برس رہا تھا لیکن میری کوشش یہی تھی کہ ان میں سے کسی کی بھی کھوپڑی یا کوئی دوسری ہڈی فریکچر نہ ہونے پائے یعنی میں ہاتھ ہلکا ہی رکھ رہا تھا۔

بھاری بھرکم بدمعاشوں کے حلق سے تو غراہٹ آمیز گھٹی گھٹی سی چیخیں ہی برآمد ہو رہی تھیں لیکن قفل شکن نوجوان نے خاصے زور و شور سے چیخنا شروع کر دیا تھا۔ چند لمحے چیخ و پکار کے بعد وہ تو باقاعدہ رونے لگا اور رحم کی فریاد کرنے لگا۔ معافیاں مانگنے لگا۔ اس وقت تک دونوں بدمعاشوں نے بھی اٹھنے اور کسی طرح صورتحال کا مقابلہ کرنے کی جدوجہد ترک کر دی تھی کیونکہ ان تینوں میں سے کسی کو بھی اپنا دفاع کرنے یا وار سے بچنے کی مہلت ہی نہیں مل

تھی۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ سزا ان کا مقدر ہو چکی ہے ا وہ انہیں برداشت کرنی پڑے گی۔

آخر کار میں نے محسوس کیا کہ اب ان میں آسانی سے اٹھنے سکت نہیں رہی یا اب وہ کم از کم مجھ پر حملہ کرنے کی جرأت ں کریں گے تب میں نے ہاتھ روک لیا۔ میں نے رائفل پھینک ں اور قفل شکن نوجوان کا ریوالور اٹھا لیا۔ دونوں رائفلیں میں نے پاؤں سے بیڈ کے نیچے کھسکا دیں اور صرف ریوالور ایک ہاتھ ں رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بیڈ کی چوبی پٹی میں چھپا ہوا بٹن ن دبا دیا۔ کمرا دوبارہ منور ہو گیا۔

میں فائرنگ سے ہونے والی تباہی پر ایک نظر ڈالے بغیر نہ رہ کا لیکن تباہی میری توقع سے کم ہی ہوئی تھی۔ انہیں زیادہ گولیاں سانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ پھر بھی سینڈلیس ادھر کر رہ گئی تھی ور بیڈ کے ساتھ والی دیوار کا کھڑکی سے نیچے پلستر ادھر کر رہ گیا تھا ور خاصے بڑے حصے میں گڑھے ہی گڑھے پڑ کر رہ گئے تھے۔

لیکن ان تینوں کی حالت دیکھ کر میری کوفت کچھ کم ہو گئی۔ ان کے چہروں سے وہ رعونت' وہ اذیت پسندی اور وہ خونخوار غائب ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ ان کے چہروں پر اب خوف اور تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ قفل شکن نوجوان تو باقاعدہ سسکیاں لے رہا تھا۔ س کا چہرہ خون اور آنسوؤں سے تر تھا۔ ان کی آنکھوں میں کافی حد تک بے یقینی بھی تھی۔ شاید ان کی اب بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ آخر اس طرح آناً فاناً کس طرح پانسا پلٹ سکتا ہے؟ حقیقتاً پانسا تو چند ہی سیکنڈ میں پلٹ چکا تھا' زیادہ دیر تو ان کی پٹائی میں ہی لگی تھی۔

میں نے بیڈ کے ایک قدرے محفوظ کنارے پر بیٹھتے ہوئے حتی الامکان پُرسکون لہجے میں کہا "کس نے بھیجا تھا تمہیں؟"

تینوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ نوجوان کی سسکیاں کمرے میں ابھرتی رہیں۔ مجھے اٹھ کر ایک بار پھر ان کے قریب جانا پڑا۔ سب سے آگے مونچھوں والا ڈھیر تھا۔ میں نے اسے مونچھوں ی سے پکڑ کر اٹھایا۔ وہ بری طرح چیختے ہوئے تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کے پیٹ میں گھٹنا رسید کیا۔ اس نے اوغ کی آواز کے ساتھ جھکنا چاہا لیکن اس کی مونچھیں میری مٹھی میں تھیں۔ وہ جھک نہیں سکا۔ اس کے دونوں ہاتھ آزاد بھی تھے اور بظاہر سلامت بھی نظر آ رہے تھے لیکن اس نے انہیں کام میں لانے یا مزاحمت کرنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ میں اس کے لئے بھی تیار تھا۔

مجھے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ وقتی طور پر ان کی قوت اور جرأت سلب ہو کر رہ گئی تھی لیکن زبان کھولنے کے لئے وہ ابھی تیار نہیں تھے۔ قوت برداشت ان میں یقیناً کافی تھی۔ مار پیٹ سہنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے کس بل توڑ ڈھیلے ہو چکے تھے لیکن ان کے انڈر جیسے مضبوط جسموں میں بہرحال ایک ڈھیٹ روح موجود تھی رمیں ان پر اپنا وقت صرف کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے اسے اس کے دونوں ساتھیوں پر دھکیل دیا اور اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی۔ وہ ڈکرا کر رہ گیا۔ میں نے ریوالور سے اس کے دل کا نشانہ لیتے ہوئے پوچھا "تم ریڈ ڈاٹ کے آدمی ہو؟"

اس نے خوفزدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کراہنے کے سے انداز میں پوچھا "وہ کیا چیز ہوتی ہے جی؟"

مجھے اس کے انداز میں بے ساختگی سی محسوس ہوئی۔ شاید وہ اداکاری نہیں کر رہا تھا لیکن سروست میں اتنا پُریقین نہیں تھا۔ میں واپس بیڈ کے کونے پر آ بیٹھا۔ ریوالور ایک ہاتھ میں رکھتے ہوئے میں نے دوسرے ہاتھ سے دیوار گیر انٹرکام کا ریسیور ہک سے اتارا اور اسی ہاتھ کی انگلی سے ایک نمبر کا بٹن دبا دیا۔ نظر میری ان تینوں پر ہی رہی۔ وہ خواہ کتنے ہی نڈھال تھے لیکن ان کی طرف سے بے پروا نہیں ہوا جا سکتا تھا۔

دوسری بار بزر بجنے پر دوسری طرف میرے سرونٹ کوارٹر میں ریسیور اٹھایا گیا اور رشید کی قدرے غنودگی زدہ سی آواز سنائی دی۔ رشید ایک دیانتدار اور محنتی نوجوان تھا' میرے گھر کے تمام معاملات کی نگرانی اور ہر چیز کا انتظام اس کے ذمے تھا۔

"رشید!" میں نے ہموار لہجے میں کہا لیکن وہ علی الصباح چار بجے کے قریب میری آواز سن کر یکدم گویا مستعد ہو گیا۔ اس کی آواز سے غنودگی اور نیند کا خمار غائب ہو گیا۔

"یس سر!" وہ مستعدی سے بولا۔

رات کو جاگنا اور گھر کی حفاظت کرنا اس کی یا دوسرے گھریلو نوکروں کی ذمے داری نہیں تھی اس لئے میں نے اسے فی الحال یہ بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ ان کے سوتے ہوئے گھر میں کیا کچھ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ انہیں رات کے اس پہر زحمت دوں لیکن مجبوری تھی۔ سردی میں وہ اپنے اپنے کمروں کے دروازے کھڑکیاں بند کئے بستروں میں دُبکے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہوں گے۔

میں نے معذرت خواہانہ سے لہجے میں کہا۔ "رشید! تمہیں خود بھی زحمت کرنی پڑے گی اور نیک محمد اور بلے وغیرہ کو بھی اٹھانا پڑے گا۔" یہ ڈرائیور اور مالی وغیرہ تھے۔

"خیریت سر؟ کیا میں اوپر آؤں؟" وہ گویا اور زیادہ مستعد ہو گیا۔

"نہیں' اس کی ضرورت نہیں" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "تم بس لان پر چاروں کتوں کو اور چوکیدار کو دیکھو۔ اگر ان کی حالت ذرا بھی تشویشناک ہو تو کتوں کو ڈاکٹر فاروق کے پاس لے جاؤ۔" وہ جانوروں کا ڈاکٹر تھا۔ اس کا کلینک اس کے گھر کے قریب ہی تھا۔ "اسے گھر جا کر جگا لینا۔ میرا نام لینا' وہ فوراً کتوں کا معائنہ کر لے گا۔ چوکیدار کو کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس یا اسپتال میں جہاں بھی لے جانا ضروری محسوس ہو وہاں لے جاؤ۔ تم اور بلا ایک گاڑی میں کتوں کو لے جاؤ۔ نیک محمد اور پرویز دوسری گاڑی میں چوکیدار کو لے جائیں۔ ٹھیک ہے؟"

"آپ فکر ہی نہ کریں سر!" اس نے غیر ضروری سوالات میں وقت ضائع نہیں کیا اور خود ہی سلسلہ منقطع کردیا۔

وہ تینوں اب اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں تکلیف اور خوف کی پرچھائیاں کچھ مدھم پڑ رہی تھیں اور ان کی جگہ ذہنی کشمکش کا عکس جھلکنے لگا تھا۔ شاید وہ اس فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کررہے تھے کہ انہیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔

میں نے اب ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "اب بھی وقت ہے' تم چاہو تو بتادو کہ تمہیں کس نے بھیجا ہے۔ اگر تم سچ سچ بتادو گے تو میرا وعدہ ہے کہ تمہیں جانے دوں گا۔"

وہ بس شکست خوردہ درندوں کی طرح میری طرف ایک ٹک دیکھتے رہے' کچھ بھی نہیں بولے۔ انکار نہ اقرار۔ شاید انہیں میرے وعدے کا بھی اعتبار نہیں آیا تھا۔

میرا ریوالور والا ہاتھ اس سائیڈ ٹیبل پر ٹکا ہوا تھا جس پر ٹیلی فون رکھا تھا۔ غنیمت تھا کہ ٹیلی فون سیٹ گولیوں کی زد میں آنے سے بچ گیا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کندھے اور کان کے درمیان پھنسایا اور پھر اسی ہاتھ سے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس لمحے میں نے ان کی آنکھوں میں قدرے طمانیت کی لہر ابھرتے دیکھی۔ آنکھیں گھر کی بھیدی ہوتی ہیں' لنکا ڈھاتی ہیں۔ بشرطیکہ کسی کو آنکھیں پڑھنے کا فن آتا ہو۔

"تم لوگ شاید اس لئے اطمینان محسوس کررہے ہو کہ میں پولیس کو بلا رہا ہوں اور یہ تمہارے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہوگی۔ پولیس کے چکروں سے تو تم نمٹ ہی لو گے۔" میں نے نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔ دوسری طرف بیل بجنے لگی تھی۔

وہ اب بھی خاموش رہے۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ "لیکن تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں پولیس کو نہیں بلا رہا ہوں۔"

اس دوران دوسری طرف ریسیور اٹھایا جاچکا تھا۔ ریسیور جولی نے ہی اٹھایا تھا۔ اس کی آواز میں نیند کے خمار کی ہلکی سی جھلک تھی۔ میں عام طور پر اسے اس کے اصلی نام سے ہی مخاطب کرتا تھا لیکن اس وقت میں نے ان تینوں بدمعاشوں کے سامنے اسے اس کی عزت سے ہی مخاطب کرنا بہتر سمجھا "مس ٹریپ! تمہیں زحمت تو ہوگی لیکن فوری طور پر یہاں آکر تین پارسل اپنے ساتھ لے جاؤ۔ حنیف خان کو بھی ساتھ لے آنا۔ وہ پارسل لوڈ کرانے میں تمہارا ہاتھ بٹادے گا۔"

"او کے سر! میں دس منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔" جولی نے مستعدی سے کہا۔ اس کی آواز سے غنودگی یک لخت کافور ہوگئی تھی۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ تینوں اب بھی ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر کار مونچھوں والا کراہنے کے سے انداز میں بولا "سیٹھ صاحب! آپ ہمیں معاف کردیں" اس کی ساری اکڑفوں رخصت ہوچکی تھی لیکن اس کا معافی طلب کرنا اس مکاری کا مظہر تھا۔ دلی طور پر نہ تو اس نے شکست تسلیم کی تھی اور نہ ہی وہ اپنے عمل پر شرمندہ تھا۔ انہیں اگر دوبارہ موقع ملتا تو وہ اس بار پھر مجھ پر حملہ کرکے قسمت آزمائی کرنے سے ہرگز باز نہ رہتے۔

"تم تو بہت ہی بودے بدمعاش نکلے یار!" میں نے ریوالور دھیرے دھیرے حرکت دیتے ہوئے کہا۔ "ذرا سی مار پڑی تو معافی مانگنے لگے۔"

"ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے صاحب!" کلین بدمعاش نے اپنے ساتھی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے یہ غلطی کی ہی کیوں تھی؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سرجھکا لئے۔ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میرے لئے جولی کا انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے سیدھا ہوکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اب تم سے کچھ بھی نہیں پوچھوں گا۔"

جولی دس منٹ میں تو نہیں البتہ پندرہ منٹ میں پہنچ گئی۔ مردانہ سلیپنگ سوٹ میں تھی۔ اس کے تراشیدہ' چمکیلے اور ریشمی بال کندھوں پر لہرا رہے تھے اور سانولے چہرے پر کولڈ کریم کی معمولی سی چمک نظر آرہی تھی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ اس کی آنکھیں ویسے ہی بڑا غضب ڈھاتی تھیں۔ گلابی ڈوروں کی موجودگی میں تو یہ آنکھیں قاتل آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ جولی کی سانولی سلونی شخصیت میں بڑی کشش تھی لیکن آنکھیں تو اس کی شخصیت کا نمایاں ترین حصہ تھیں۔

حنیف خان اس کے ساتھ تھا۔ وہ باریش آدمی تھا۔ سر پر سفید گول ٹوپی رکھتا تھا۔ عام طور پر بڑی نفیس قسم کی شلوار قمیص میں رہتا تھا۔ اس کے چہرے پر نہایت گہری بلکہ اداسی آمیز سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ پہلی نظر میں تو وہ کوئی بہت ہی سنجیدہ متین قسم کا استاد یا سوشل ورکر نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مارشل آرٹ میں ماہر اور ہر قسم کے ہتھیاروں کے استعمال میں یکتا ہوگا۔ وہ بہت کم گو اور قدرے سست نظر آتا تھا لیکن جب وہ ایکشن میں ہوتا تھا تو اس کے جسم سے بجلیاں بھری ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ تاہم اپنی تمامتر صلاحیتوں کے باوجود وہ ٹونی یا شبیر شاہ کے مقابلے کا آدمی نہیں تھا اور نہ ہی میرے کراچی والے پروجیکٹس کے انچارج شفیع شاہ کی برابری کرسکتا تھا لیکن بہرحال وہ بھی میری تنظیم کے اہم آدمیوں میں شمار ہوتا تھا۔ زیادہ تر ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پر ہی رہتا تھا جو ایک طرح سے لاہور میں میرا خفیہ ہیڈ کوارٹر تھی۔ وہ جولی کے ساتھ ضروری معاملات سنبھالتا تھا۔

جولی نے بظاہر بے پروائی سے تینوں بدمعاشوں کا جائزہ لیا۔ سرسری سے لہجے میں بولی۔ "لگتا ہے گھر میں خاصی گڑبڑ ہوئی۔ آپ پر حملہ ہوا تھا؟" میں نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا

کیا۔ میری نظر ان تینوں پر تھی۔ وہ میرے حکم کے بغیر ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

قفل شکن نوجوان تو اب بھی کراہ رہا تھا لیکن دونوں بدمعاش سنبھل چکے تھے۔ وہ بہرحال سخت جان تھے۔ انہوں نے پہلے جولی کو آمیز نظروں سے دیکھا تھا لیکن پھر شاید جسم میں اٹھتی ہوئی درد کی لہروں نے انہیں احساس دلایا کہ صورتحال کچھ ایسی صورت بھی نہیں کہ وہ اس سانولی سلونی عورت کو دیکھ کر محظوظ ہوسکیں جس کے خدوخال ڈھیلے ڈھالے مردانہ سلیپنگ سوٹ میں بھی دل کی دھڑکنیں تیز کرنے کا باعث بن رہے تھے اور جو دو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود کالج گرل دکھائی دیتی تھی۔

حنیف خان کو تو انہوں نے شاید درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا کیونکہ وہ انہیں غالباً بالکل بے ضرر نظر آیا تھا۔ جولی کو بلائے جانے کا غالباً مقصد ہی ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"یہ ہیں تینوں پارسل؟" جولی نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گویا مجھ سے رسمی تصدیق چاہی۔ میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

جولی نہایت دوستانہ لہجے میں ان سے مخاطب ہوئی۔ "تم لوگ دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہوجاؤ... اور ہاتھ پشت پر کرلو۔ مجھے تمہارے ہاتھ پاؤں باندھنے ہیں۔"

اس کا انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہی ہو ذرا ماچس دینا۔ مجھے سگریٹ سلگانی ہے۔

وہ ان کے قریب بھی جا پہنچی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آرہا تھا اور وہ بہرحال ایک عورت تھی۔ اس کے ہاتھ میں نائیلون کی ڈوری کا لچھا تھا جو اس نے حنیف خان سے لیا تھا۔ حنیف خان کے پاس ان کے ہونٹوں پر چپکانے کے لئے ٹیپ وغیرہ بھی موجود تھی۔

انہیں یقین ہوگیا کہ اگر وہ اسی طرح ساکت کھڑے رہے تو ان کے ہاتھ پاؤں بندھ ہی جائیں گے۔ انہوں نے اپنی تمامتر شکستہ حالی کے باوجود غالباً جان پر کھیل کر ایک آخری کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ غالباً صرف مونچھوں والے کا تھا لیکن ان کے درمیان گویا ایک طرح کا ذہنی رابطہ چل رہا تھا اور اسے دونوں ساتھیوں کی تائید حاصل تھی۔

طریقہ بھی اس نے اپنی دانست میں صورتحال کے مطابق مؤثر اختیار کیا تھا لیکن اس بدنصیب کو شاید ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کا واسطہ کن لوگوں سے ہے۔ کسی نے ان بے چاروں کو مکمل معلومات کے بغیر آگے دھکیل دیا تھا اور کسی کو ہمارے بارے میں معلومات ہو بھی کس طرح سکتی تھیں؟

جولی جونہی ان کے قریب پہنچی' مونچھوں والے نے اپنی تمامتر جسمانی ٹوٹ پھوٹ کے باوجود حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے سامنے ڈھال بنانے کی کوشش کی... تاکہ مجھے فائر کرنے سے باز رکھا جاسکے لیکن اس بے چارے کی یہ حسرت دل میں ہی رہ گئی۔

جولی کے بازو تو اس کے ہاتھوں میں کیا آنے تھے' اس کے اپنے دونوں بازو نہ جانے کیونکر ہوا میں بلند ہوئے اور دوسرے ہی لمحے جولی نے بجلی کی سی تیزی سے گھوم کر الٹی لگ' چاپ سوئی' اس کی ٹھوڑی پر رسید کی۔ اس کا کلین شیو ساتھی جو اس کی آڑ لینے کی کوشش کررہا تھا' اس کے نیچے دب گیا۔

اس دوران قفل شکن نوجوان اس توقع پر کہ مونچھوں والے کی کوشش کامیاب ہوگی' خود بھی بڑی ہمت کرچکا تھا۔ یعنی اس نے حنیف خان کو آسان شکار سمجھتے ہوئے اس پر چھلانگ لگادی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بڑے عجیب انداز میں قلابازی کھا کر واپس اپنی جگہ پر آگرا۔ حنیف خان نے اس دوران اپنے صرف ایک بازو کو خاص انداز میں حرکت دی تھی اور اس کی اداسی آمیز سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

وہ تینوں دم بخود سے اپنی اپنی جگہ پڑے چند لمحے تک آنکھیں پٹ پٹاتے رہے۔ شاید ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ ان کے ساتھ ہوا کیا ہے' تاہم اس حد تک وہ ضرور سمجھدار ثابت ہوئے کہ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو مزید آزمانے کی کوشش نہیں کی اور ایک ہی کوشش سے سبق پکڑ لیا ورنہ جولی اور حنیف خان کے ہاتھوں ان کی مزید درگت بنتی اور ان میں جو تھوڑا بہت دم خم رہ گیا تھا۔ وہ بھی نکل جاتا۔

جولی نے مونچھوں والے کو گریبان سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھایا۔ اس نے تب بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جولی کی طرف دیکھے جارہا تھا' شاید اس سے پہلے اسے زندگی میں کبھی اس قسم کی عورت سے پالا نہیں پڑا تھا اور نہ ہی اسے ایسی توقع رہی تھی۔ جولی نے اسے زیادہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کا موقع نہیں دیا اور دوسرے جھٹکے سے اسے پیپوں والے ڈرم کی طرح گھما کر اس کا منہ دیوار کی طرف کردیا۔ جولی صرف داؤ پیچ میں ہی ماہر نہیں تھی' وہ حیرت انگیز طور پر طاقتور بھی تھی۔

حنیف خان اس کی مدد کے لئے اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے کلین شیو بدمعاش کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ تقریباً دے ہی مارا۔ چند سیکنڈ میں ان کے ہاتھ پشت پر باندھے جاچکے تھے۔ انہیں یوں قابو میں دیکھ کر قفل شکن نوجوان نے تو خود ہی سعادت مندی سے ہاتھ بندھوالئے۔ ان کے صرف ہاتھ ہی نہیں پاؤں بھی باندھ دئے گئے اور انہیں قالین پر اوندھا لٹا کر ان کے ہونٹوں پر مضبوطی سے ٹیپ بھی چپکادی گئی۔ آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔

"پارسل تیار ہیں سر!" جولی نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے مستعدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ انہیں لے جاؤ۔" میں نے ریوالور سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں آج سکون سے سونا چاہتا تھا۔ کمبخت نے میری نیند خراب کردی۔"

"سر! ان کا بنانا کیا ہے؟ جام' جیلی' مارمیلیڈ یا نمانو کیچپ؟"

جولی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اصل میں ان سے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ انہیں کس نے مجھ پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اگر یہ نہ بتائیں تو پھر ان کا جو دل چاہے بتا دینا اور جو کچھ بھی بنے اسے راوی میں بہا دینا۔" میں نے نیم بے زاری سے کہا۔

حنیف خان نے انہیں باری باری نیچے اپنی اسٹیشن ویگن میں پہنچانے کے لئے سب سے پہلے موچھوں والے کو کندھے پر اٹھایا۔ جولی نے اس کے کندھے پر ہلکا سا ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا "واہ بچو! کیا عیش ہیں تمہارے بھی۔ ہوش میں ہونے کے باوجود کندھے پر سوار ہو کر جا رہے ہو۔"

آخر وہ سب رخصت ہو چکے تو میں بالائی منزل پر ہی دوسرے بیڈ روم میں آ کر لیٹ گیا۔ یہ میرا خاص کمرا تھا۔ میرا گوشۂ تنہائی۔ جب میں بہت اداس ہوتا تھا تو اس کمرے میں آ کر پناہ لیتا تھا اور اس وقت تک یہیں رہتا تھا جب تک میری اداسی اور ڈپریشن دور نہیں ہو جاتا تھا۔ بعض لوگ اداسی اور ڈپریشن دور کرنے کے لئے پُرہجوم اور ایسی جگہوں کا رخ کرتے ہیں جہاں رنگا رنگ دلچسپیاں موجود ہوں لیکن میری اداسی اور ڈپریشن تنہائی میں ہی دور ہوتا تھا تاہم اس قسم کا دورہ مجھ پر شاذ و نادر ہی پڑتا تھا اور آج تو میں یہاں محض سونے کی غرض سے آیا تھا۔

چند لمحے تک گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر کے میں نے اپنا خفیف سا اعصابی ارتعاش دور کیا اور پھر سب کچھ ذہن سے جھٹک کر سو گیا۔

دوسرے روز دن چڑھے تک میں سوتا ہی رہا۔ آخر کار دس بجے کے قریب اٹھا اور کاہلی آمیز انداز میں تیار ہونے لگا۔ تیار ہو کر میں نیچے ڈائننگ روم میں پہنچا تو خانساماں نے میرے پوچھنے سے پہلے ہی بتایا "کتوں کو پچا لیا گیا ہے صاحب! جلدی خبر ہو گئی ورنہ ان کا بچنا مشکل تھا۔ ابھی وہ ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں ہی ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ایک دو دن میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گے۔ چوکیدار بھی ہوش میں آ گیا ہے۔ ڈاکٹر گابا صاحب کے کلینک میں داخل ہے۔ اس کے سر پر شاید گن کے دستے سے یا کسی اور بھاری اور ٹھوس چیز سے ضرب لگائی گئی تھی۔ خاصی زوردار چوٹ تھی لیکن اب خطرے والی کوئی بات نہیں۔"

"خدا کا شکر ہے۔" میں نے زیرِ لب کہا۔ "کتوں کو غالباً زہر دیا گیا تھا؟"

"جی ہاں۔ لان پر باہر سے زہر آلود گوشت کے ٹکڑے پھینکے گئے تھے اور ان پر ایک ایسی دوا سی لگائی گئی تھی جس کی بُو کی وجہ سے کوئی بھی کتا ان ٹکڑوں پر منہ مارے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔" پھر خانساماں میرے لئے ناشتے کے برتن سجاتے ہوئے بولا۔ "بہرحال رشید نے سب کچھ سنبھال لیا صاحب! ہر چیز کنٹرول میں ہے۔"

"بہت خوب" میں نے طمانیت محسوس کرتے ہوئے کہا۔

بھرپور ناشتا کرنے کے بعد میں اخبارات کی طرف متوجہ ہوا۔ سیاسی لغویات اور جرائم کی دیگر خبروں کے ساتھ اندر کے صفحات پر تقریباً سبھی اخبارات میں غیر نمایاں انداز میں نشاط عرف بے قتل کی مختصر سی خبر موجود تھی۔ دو اخباروں میں اس کی تصویر بھی موجود تھی۔ تصویر مردہ حالت میں ہی لی گئی تھی جس اس کا پہچانا جانا بھی مشکل تھا۔ شاید خبر ریلز کرنے تک بھی نے جا کر اس کمرے کو چیک نہیں کیا تھا جہاں نشاط رہتی تھی اس کی زندگی کے دوران کی کوئی تصویر اخبارات میں دینا تاکہ اس کے اگر کوئی ورثا موجود تھے تو انہیں پہچاننے میں رہتی کیونکہ خبر میں یہ اپیل بھی موجود تھی کہ اگر اس موجود ہوں تو پولیس سے رابطہ قائم کریں ورنہ دو دن بعد لاوارث قرار دے کر دفن کر دی جائے گی۔

خبر میں ایک سطر ایسی بھی تھی جسے پڑھنے کے بعد میں نہیں کر سکا کہ مجھ پر اس کا ردِ عمل کیا ہوا تھا۔ معلوم نہیں صدمہ پہنچا تھا' حیرت ہوئی تھی یا بس دل خراب سا ہوا تھا کچھ عجیب سی کیفیت ہوئی تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا کافی دیر تک میں ساکت بیٹھا رہا۔

اس سطر میں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ مطابق مقتولہ نشاط امید سے تھی۔ گو اس کے ماں بننے کا بہت دور تھا لیکن بہرحال یہ ایک حقیقت تھی جو روایتی انداز چند لفظوں میں بیان کر دی گئی تھی۔

میں نے اس نوخیز اور معصوم صورت لڑکی کی زندگی بھرپور' رنگا رنگ تصویریں بھی دیکھی تھیں اور بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ مردہ حالت میں بھی دیکھا تھا۔ ایک بار پھر چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ میں نے وقتی طور ذرا ہٹانے کے لئے دوبارہ اخبارات کی ورق گردانی شروع کر کسی اخبار میں کہیں کسی ایسی لاش کی دستیابی کا ذکر جسے میں اس عجیب سے شخص کی لاش سمجھ سکتا جو ٹونی کے باغ میں مارا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی لاش شاید پولیس کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہو گی لیکن ابھی اس کی خبر رپورٹروں تک پہنچنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔ کل کے اخبارات اس سلسلے میں کوئی خبر نظر آنے کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔

اس کا خیال آیا تو میں ایک بار پھر اپنے کوٹ کی جیب ٹرانسمیٹر نکال لایا جو کوٹ کے بٹن میں فٹ تھا۔ ڈائننگ ٹیبل دوبارہ اسے کھول کر بیٹھ گیا لیکن ظاہر ہے اس کے اندر کوئی موجود نہیں تھا۔ کل دوپہر صرف ایک بار اس پر سگنل ہونے کے بعد سے ٹرانسمیٹر خاموش ہی رہا تھا حالانکہ ظاہر لوگوں کے پاس اس ساخت کے اور بھی ٹرانسمیٹر رہے ہو لیکن شاید ہر ایک کی فریکوئنسی مختلف تھی یا پھر ان میں فریکوئنسی تبدیل کرنے کی گنجائش موجود تھی اور انہوں نے اب فریکوئنسی تبدیل کر لی تھی۔ فریکوئنسی تبدیل کرنے کا نظام مجھے اس

آ رہا تھا لیکن ٹرانسمیٹر کا تفصیلی آپریشن کرنے کے لئے نہایت ین قسم کے اوزاروں کی ضرورت تھی جو فی الحال میرے موجود نہیں تھے۔

میں نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ اس پر وسط میں چھوٹا سا جو سرخ ں نشان موجود تھا غالباً یہی ریڈ ڈاٹ تنظیم کا شناختی نشان تھا۔ سیٹ کو میں نے دوبارہ جیب میں رکھ لیا اور فون اپنی طرف کھسکایا۔ ناطہ والی خبر اب بھی میرے ذہن میں اٹکی ہوئی تھی۔

میں نے گلبرگ تھانے کا نمبر ملایا اور اے ایس آئی شریف ں کو فون پر بلوایا۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے کہا۔ ال صاحب! آپ نے مجھے کل صبح نشاط کے امید سے ہونے بات نہیں بتائی تھی۔"

"بتا کیسے جناب! اس وقت تک تو خود مجھے بھی معلوم نہیں یہ بات۔" وہ اپنے مخصوص جھنجھلے دار لہجے میں بولا۔ "پوسٹ م رپورٹ آ تو چکی تھی لیکن وہ انسپکٹر صاحب کی میز پر پڑی تھی۔ انہوں نے پڑھی تھی نہ میں نے۔ آپ سے بات ہونے کے کچھ بعد میں نے پڑھی تھی میرے لئے یہ کوئی حیران کن بات نہیں۔ ا خیال ہے کہ اس قسم کی لڑکیوں کے بارے میں ایسی ہی باتیں نے آ سکتی ہیں۔ ان کے بارے میں یہ تو معلوم ہونے سے رہا کہ مہ بڑی پارسا و پاک باز خاتون تھیں' پابند صوم و صلوٰۃ تھیں۔"

"خیر چھوڑیں" میں نے کہا "یہ بتائیں تفتیش کچھ آگے ی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ اپنی تمامتر مصروفیات کے باوجود میں نے وقت ں کر اس لڑکی کی روم میٹ ملکہ بی بی سے اور اس ایکسٹرا سپلائر نام ہے اس کا۔ ہاں' عبدالواحد سے بیان لے لیا ہے۔ دونوں ب کی لگتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے انہوں نے جو کچھ کہا ہے ب ٹھیک ہی کہا ہے۔ بہرحال میں نے احتیاطاً دونوں پر تھوڑا سا ب شوب ڈال دیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ مجھ سے ہی ان دونوں سے مل چکے ہیں۔ آپ بہت تیز جا رہے ہیں ب! لیکن خیر' ہماری بھی تفتیش اپنے حساب سے آگے بڑھ رہی ۔ مقتولہ کا سامان وغیرہ میں نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ ں دنیا کے دو چار اور لوگوں کے نام پتے میں نے نوٹ کئے ہیں جن ے پوچھ گچھ کرنی ہے۔ آپ فکر نہ کریں جناب! کچھ نہ کچھ ضرور جائے گا۔ شریف سیال جس کام کو ہاتھ میں لیتا ہے اس کا کچھ نہ ہ کر کے چھوڑتا ہے۔ اس کیس کے اصل تفتیشی افسر انسپکٹر د صاحب تھے لیکن انہوں نے خود ہی یہ کیس میرے سپرد کر دیا ۔ آج صبح اس سلسلے میں ایک صاحب کا فون بھی آیا تھا۔ وہ چھ رہے تھے کہ اس کیس کی تفتیش کون کر رہا ہے۔ انسپکٹر حب نے میرا نام ہی لیا اور فون مجھے پکڑا کر خود ضلع کچہری چلے ۔" اچانک وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے اسے احساس ہو گیا ہو کہ انی میں اس کے منہ سے کوئی غیر ضروری بات نکل گئی ہے۔

میرے کان کھڑے ہوئے۔ تاہم میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا "فون کس نے کیا تھا؟"

وہ صرف ایک لمحے خاموش رہا پھر ذرا نیچی آواز میں بولا۔ "ابھی بتاتا ہوں۔"

پھر اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے بغیر کسی کو مخاطب کیا "اللہ دتے! تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟ چل جا کے ہیڈ محرر صاحب کے پاس بیٹھ کر گاہے قصائی والے کیس کی رپورٹ تیار کرا کر فائل مکمل کر۔ آج مجسٹریٹ صاحب کو پیش کرنی ہے۔"

غالباً تخلیہ میسر آ جانے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا "میں نے سوچا آپ کو بتا ہی دوں۔ آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔ اور ویسے بھی ہمارے درمیان باہمی تعاون کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ فون تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے ہی آیا تھا۔ بولنے والے نے اپنا نام نہیں بتایا لیکن آواز سے وہ بہت غمزدہ لگ رہا تھا۔ شاید بہت دیر روتا بھی رہا ہو۔ مجھ سے جب اس کا رابطہ قائم ہوا تو اس نے پہلے اچھی طرح تصدیق کی کہ قتل کی تفتیش میں ہی کر رہا ہوں۔ پھر وہ التجا کے سے انداز میں کہنے لگا۔ بھائی صاحب! میری آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ آپ باقی ہر کام کو بھول کر اس کیس کی تفتیش پوری سرگرمی اور تندہی سے کریں اور ہر حال میں قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں۔ میں آپ کی محنت کے اعتراف میں ایک بڑی رقم انعام کے طور پر آپ کے لئے بھجواؤں گا۔ یہ میری طرف سے آپ کے لئے ایک حقیر سا تحفہ ہو گا اور یہ بات صرف میرے اور آپ کے درمیان رہے گی۔" لگتا ہے اس آدمی نے اخبار پڑھتے ہی فون کیا تھا۔"

"آپ نے پوچھا نہیں کہ وہ کتنی رقم انعام میں بھجوائے گا؟" میں نے دریافت کیا۔

"پوچھا تھا جناب! بس یونہی غیر سنجیدگی سے ہی پوچھا تھا۔ اس نے کہا کہ کم از کم دو لاکھ۔ اور اگر میں قاتل کو عبرت ناک سزا دلوانے میں کامیاب رہا تو اس کے بعد مزید انعام بھی بھجوایا جا سکتا ہے۔ یہ سن کر دل میں گدگدی تو ہوئی جناب! لیکن ظاہر ہے اس قسم کی باتوں پر اعتبار تو نہیں کیا جا سکتا نا۔ اگر میں اس آدمی کی بات کو سچ بھی سمجھ لوں تو سمجھیں کہ قاتل کے پکڑے جانے کے بعد اس کا کام تو نکل ہی گیا نا۔؟ اور کام نکل جانے کے بعد کون کس کو پوچھتا ہے۔ اس قسم کی باتیں مذاق ہی ہو سکتی ہیں جی۔ ویسے بھی میں لالچ میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے تو بہرحال اپنی ڈیوٹی سرانجام دینی ہی ہے۔ اپنا فرض ادا کرنا ہی ہے۔ قاتل کو تلاش کرنا میرا تو فرض ہی ہے جناب!"

"ظاہر ہے آپ نے یہ جاننے کی کوشش تو کی ہو گی کہ وہ کون تھا؟" میں نے کریدا۔

"کیوں نہیں جناب۔ میں نے اس سے بہت پوچھا کہ وہ کون ہے' مقتولہ سے اس کا کیا رشتہ ہے' اور وہ آ کر مقتولہ کی لاش کیوں نہیں لے جاتا؟ لیکن وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ مقتولہ سے اس کا کوئی رشتہ نہیں اس لئے وہ لاش وغیرہ لینے نہیں آ سکتا' وہ تو بس انسانی

ہمدردی کی بنا پر مجھے وہ پیشکش کر رہا ہے۔ اسی لئے تو جناب مجھے یہ بات زیادہ کھٹکی تھی اور میں نے اس پر اعتبار نہیں کیا۔ ویسے باتوں باتوں میں میں نے اس شخص کو آپ کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔"

"میرے بارے میں کیا بتا دیا تھا؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"یہی کہ ایک بہت بڑے سیٹھ صاحب جو ہمارے بڑے کرم فرما ہیں وہ بھی اس معاملے میں ذاتی دلچسپی لے رہے ہیں۔ وہ بھی چاہتے ہیں کہ قاتل کو عبرت ناک سزا ملے اور وہ بھی محض انسانی ہمدردی کی بنیاد پر۔ یہ سب کچھ چاہ رہے ہیں۔" شریف سیال نے بتایا۔

"پھر اس کا ردِ عمل کیا رہا؟"

"یہ بات اس نے بڑی دلچسپی سے سنی اور مجھ سے آپ کا فون نمبر بھی لے لیا۔ شاید وہ آپ کو بھی انعام کی پیشکش کرے۔" وہ دھیرے سے ہنسا پھر فوراً ہی کھنکار کر گلا صاف کرنے لگا۔

"یہ تو بڑی دلچسپ بات بتائی آپ نے سیال صاحب! لیکن افسوس کہ اس سے بھی نہ تو قاتل کی تلاش میں کوئی مدد مل سکتی ہے اور نہ نشاط کی اصلیت پر کوئی روشنی پڑ سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں جناب! یہ بات تو ہے" اس نے تسلیم کیا "لیکن آپ دیکھ لیں کہ میں آپ سے کوئی بات چھپا نہیں رہا۔ پرسنل اور کانفیڈنشل، دونوں طرح کی باتیں آپ کو بتاتا جا رہا ہوں۔ یعنی میرا آپ سے تعاون جاری ہے۔"

"میں اس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں سیال صاحب! پولیس ڈیپارٹمنٹ میں بہت سے چھوٹے بڑے ایسے افسران میرے کرم فرما ہیں جو دل کے بڑے اچھے اور نہایت انسان دوست ہیں۔ میں ان کا بڑا قدردان ہوں۔ انسانی بھلائی کے کاموں اور ظالموں اور بدمعاشوں کو سبق آموز انجام تک پہنچانے میں وہ قانون سے ہٹ کر بھی خاموشی سے میری مدد کرتے ہیں۔ ان میں اب آپ کا نام بھی شامل ہو گیا ہے۔"

"مہربانی ہے جناب آپ کی۔" وہ خوش دلی سے بولا "لوگ کہتے ہیں پولیس والوں کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی اچھی۔ لیکن ہم نے تو جناب اچھے آدمیوں کو ہمیشہ دوست رکھنے کی کوشش کی ہے۔"

"ایک تکلیف اور کیجئے گا سیال صاحب!" میں نے کہا "اگر برسوں تک بھی نشاط کا کوئی وارث لاش لینے نہ آیا تو آپ کوشش کیجئے گا کہ اس کی تکفین و تدفین بہت اچھے اور موزوں طریقے سے ہو جائے۔ کوئی کمی نہ رہے۔ ہر کام باعزت طریقے سے ہو۔ اخراجات کے لئے میں رقم اپنے آدمی کے ہاتھ بھجوا دوں گا۔ میرا مطلب ہے کہ اگر وہ لاوارث بھی تھی تو اس کی لاش لاوارثوں کی طرح دفن نہیں ہونی چاہئے۔"

"ٹھیک ہے جناب! جیسے آپ کہتے ہیں ویسے ہو جائے گا۔" شریف سیال نے مستعدی سے کہا اور میں نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر میں نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

گاڑی میں بیٹھ کر پہلے میں ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں پہنچا بالکل سکون تھا۔ وہ ہمیشہ ہی ایک ایسا پُرسکوت گھر معلوم ہو جہاں گنجائش سے کہیں کم افراد رہتے ہوں اور وہ بھی بے حد پسند ہوں۔ حالانکہ یہاں بڑے بڑے اہم اور ہنگامہ خیز قسم کے بھی نمٹائے جاتے تھے اور تھوڑا بہت دفتری قسم کا کام بھی ہو

جولی لان پر بیٹھی اپنے ناخن تراشنے اور انہیں سنوارنے مصروف تھی گویا اسے دنیا میں اور کوئی مصروفیت ہی نہ ہو۔ وہ ٹراؤزر اور ڈھیلی ڈھالی شرٹ میں تھی۔ آستینیں چڑھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مسکراتے ہوئے کھڑی ہوئی۔

"وہ تینوں مہمان خانے میں ہی ہیں؟" میں نے ہیلو ہیلو کے بعد پوچھا۔

"یس سر! آپ دیکھیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا "کچھ زیادہ تو نہیں کرنا پڑی ان پر؟"

"نہیں سر! کوئی ایسی خاص محنت نہیں کرنی پڑی۔" جولی نے بے پروائی سے کہا "ویسے وہ عام بدمعاشوں سے خاصے اونچے درجے کے بدمعاش ہیں۔ بڑا منظم قسم کا ایک باقاعدہ گروہ ہے۔ کا۔ اسلحہ بھی ان کے پاس کافی ہے، بلکہ مشین گنیں تک ہیں طرح کی وارداتوں پر کمربستہ رہتے ہیں۔ خود اپنے طور پر بھی آرڈر پر بھی کام کرتے ہیں...."

اس دوران اندر سے حنیف خان بھی ہمارے ساتھ ہو اور ہم عقبی ہال کی طرف جا رہے تھے۔ جولی بات جاری ہوئے بولی۔ "میں نے ساری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اگر حکم دیں تو ان کے گروہ کا صفایا کر دیا جائے؟"

"فی الحال تو صرف انہیں سبق سکھانا اور اصل بات کرنا ہی میرا مقصد تھا۔ اگر انہوں نے سبق نہ سیکھا اور آئندہ ٹکرانے کی کوشش کی تو پھر دیکھا جائے گا۔ تمہیں معلوم ہے کسی وجہ کے خونریزی ہماری پالیسی نہیں ہے اور نہ ہی مجھے پسند"

"یس سر!" جولی مسکرائی "میں نے تو احتیاطاً پوچھا تھا۔"

اس دوران ہم سیڑھیاں اترنے لگے تھے۔ ہم تہ خانے کی طرف جا رہے تھے۔ حنیف خان خاموشی سے آگے چل رہا تھا۔

"ان کے گروہ کا نام ریڈ ڈاٹ ہے کیا؟" میں نے پوچھا

"نہیں سر!" جولی نے نفی میں سر ہلایا "کوئی نام وغیرہ نہیں ہے ان کے گروہ کا۔ بس یونہی دس آدمیوں کا گروہ ہے۔ دھڑلے سے بدمعاشی کرتے ہیں۔ جوئے کے اڈے وغیرہ بھی ہیں ان کے۔ لیکن کوئی ایسی پڑھی لکھی قسم کی چیزیں نہیں گروہ کا انگریزی میں نام وغیرہ رکھنے کا سوچنے لگیں۔"

میں نے ابھی تک اصل بات نہیں پوچھی تھی۔ وہ خانے میں پہنچ کر ہی پوچھنا چاہتا تھا۔ سیڑھیاں بظاہر ایک روم کی معلوم ہوتی تھیں جو بائیں ہاتھ پر تھا۔ دائیں طرف

ں۔ اس کے قریب ہی سوئچ بورڈ موجود تھا۔ حنیف خان نے ترتیب ایک کنٹرول کے تین سوئچ ایک خاص ترتیب سے کئی مرتبہ ئے اور دیوار ایک طرف ہٹ گئی۔

سامنے ٹھوس اسٹیل کا ایک ساؤنڈ پروف دروازہ موجود تھا۔ ں کے کنٹرول کے سوئچ الگ تھے۔ حنیف خان نے انہیں بھی ب خاص ترتیب سے دبایا۔ وہ بظاہر نظر بھی نہیں آتے تھے۔ سٹیل ہی کی ایک پٹی کے نیچے چھپے ہوئے تھے اور پٹی کو ہٹانے کی ب الگ ترکیب تھی۔

سیاہ اسٹیل کا دروازہ بے آواز طریقے سے کھل گیا اور ہم یل و عریض تہ خانے میں جا پہنچے۔ یہ تہ خانہ کئی حصوں پر مشتمل ۔ اس میں قیدیوں کو رکھنے کے لئے مختلف ساخت کی کوٹھریاں ں تھیں اور بارچ سیل بھی۔ یہاں تک پہنچنے کی نوبت صرف انہی وں کی آتی تھی جو انسانیت اور معاشرے کے لئے ناسور سے کم یں ہوتے تھے یا پھر جو ہمارا جینا دوبھر کرنے کی کوشش کرتے تھے ر کسی طرح بھی باز نہیں آتے تھے۔ یہاں بھی ان کو سیدھا کرنے ے مختلف مراحل ہوتے تھے۔ ہماری کوشش یہی ہوتی تھی کہ خری مرحلے تک کوئی نہ جائے۔

وہ تینوں کنکریٹ کے ایک چبوترے پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان ے جسموں پر قمیصیں نہیں تھیں۔ جسموں پر بظاہر نشانات بھی نولی سے تھے لیکن ان کی حالت مردوں سے بدتر تھی۔ وہ بغیر کسی رشوں کے چت لیٹے ہوئے تھے۔ کلین شیو بدمعاش کے جسم کو تو قفے وقفے سے یوں جھٹکے لگ رہے تھے جیسے اس پر نزع کا عالم ری ہو۔ مونچھوں والے کی آنکھیں نیم وا تھیں اور باچھوں سے ف بہ رہا تھا۔ قلل شکن، آنکھیں بند کئے لیٹا تھا اور ہچکیاں سی ے رہا تھا۔

تہ خانے میں بدرو بھی موجود تھا اور خاموشی سے بعض چیزوں وان کی صحیح جگہوں پر رکھ رہا تھا اور دیوار گیر الماریوں کے تالے یرو چیک کر رہا تھا۔ بدرو بھی ہمارے خاص آدمیوں میں سے ایک ۔ وہ بہت زیادہ ذہین یا پھرتیلا نہیں تھا مگر پھر بھی بہت کام کا آدمی ۔ ہمیں ادب سے سلام کر کے وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف گیا۔

وہ تقریباً ساڑھے چھ فٹ کا ایک سیاہ فام آدمی تھا لیکن اس ے موٹے موٹے ہونٹ قدرتی طور پر خون کی طرح سرخ معلوم تے تھے۔ اس کا جسم ساٹھ سے زیادہ مضبوط تھا۔ علی الصباح جسم ایک خاص تیل کی مالش کر کے وہ جب باغیچے میں درختوں کے رمیان کسرت کرتا تھا تو اس کے جسم میں مچھلیاں اسی طرح تڑپتی یں جس طرح سچ مچ کی مچھلیاں پانی میں مچلتی ہیں۔ وہ ہاتھوں سے ہے کی موٹی موٹی سلاخیں موڑ دیتا تھا اور ٹھوس دیواروں پر کریں مارنے سے بھی اس کے تربوز نما سر کا کچھ نہیں بگڑتا تھا۔ م خواہ کچھ بھی ہوتا وہ ہمیشہ نکر بنیان اور کینوس کے جوتوں میں ں نظر آتا تھا۔ وہ اس تہ خانے کا انچارج تھا اور حنیف خان کا ماتحت تھا۔

جولی نے مونچھوں والے بدمعاش کے بال پکڑ کر اسے بٹھایا مگر وہ ادھر اُدھر کو جھولنے لگا۔ جولی کے اشارے پر بدرو نے اس کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور کچھ پانی اسے پلایا بھی۔ تب وہ ذرا بیٹھنے کے قابل ہوا لیکن اس کی گردن اب بھی گویا ڈھلکی جا رہی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" جولی نے اس کے بالوں کو ہلکا سا جھٹکا دے کر پوچھا۔

"محمد طارق" اس نے سرگوشی نما آواز میں لیکن بغیر کسی حیل حجت کے فوراً جواب دیا۔ اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اسے فوری جواب دینے کے لئے سدھایا گیا ہے۔

"تمہیں کس نے بھیجا تھا اور کیوں بھیجا تھا؟" جولی نے مزید پوچھا۔

"قیصر ملک نے.... سیٹھ صاحب کو قتل کرنے کے لئے۔" اس نے چڑھی چڑھی سی آنکھوں سے میری طرف اشارہ کیا۔

"کتنی رقم دی تھی؟" جولی گویا کسی بچے سے اس کا سبق سن رہی تھی۔

"پانچ لاکھ جی.... کام مشکل تھا۔ ہم نے ساری رقم ایڈوانس لی تھی۔" اس کی آواز سرگوشی سے ہی مشابہ رہی۔

"تم نے بہت کم رقم پر ہامی بھر لی تھی چندا!" جولی نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ وہ ہاتھ چبوترے پر ٹکائے اس طرح بیٹھا رہا کہ اس کی ٹھوڑی سینے کو تقریباً چھونے لگی۔

میں ایک طویل سانس لے کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی تھی اور جب میں بولا تو یہ مایوسی غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں جھلک آئی۔ "کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ یہ تو اسی الو کے پٹھے قیصر ملک کا چکر تھا۔ اس بدبخت کا دماغ ابھی ٹھکانے پر نہیں آیا۔ وہی گھٹیا حربے.... وہی کرائے کے قاتل۔"

مجھے اپنی کنپٹیوں میں تپش سی محسوس ہو رہی تھی۔ جولی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنی بے زاری کو کنٹرول کرنے اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے ملک بھر کے جرائم پیشہ گروہوں سے اس لعنتی کی شناسائی ہے اور وہ میرے قتل کے لئے یکے بعد دیگرے سب کی خدمات حاصل کرتے رہے گا۔ اس کی زندگی کا گویا مقصد صرف یہی رہ گیا ہے۔"

"بالکل یہی بات ہے سر!" جولی سنجیدگی سے بولی۔ وہ تقریباً تمام حالات سے آگاہ تھی۔ "یہ اس کے لئے زندگی موت اور انا کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس کا چین سے بیٹھنا بہت مشکل ہوگا۔ اس قسم کے لوگ حالات سے کوئی سبق نہیں سیکھتے۔ اپنی ضد پر اڑے رہتے ہیں۔"

اسی دوران محمد طارق نامی اس بدمعاش میں شاید زندگی کی کچھ لہر ابھری یا وہ بھد کوشش اپنی بچی کھچی توانائی مجتمع کر کے چبوترے

سے کھسکا اور ایک دم لڑھک کر میرے قدموں میں آگرا۔ سسکیوں اور ہچکیوں کے امتزاج کے درمیان وہ اسی عجیب سی سرگوشی نما آواز میں بول رہا تھا۔ "صاحب... بڑے صاحب! خدا کے لئے مجھے معاف کردیں۔ قیصر ملک نے ہمیں بتایا تو تھا کہ آپ بہت خطرناک آدمی ہیں۔ کام بہت مشکل ہے' لیکن ہم اس کی بات کو صحیح طرح سے سمجھے نہیں تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ..... بہرحال ہوں گے تو دوسرے بڑے سیٹھوں ہی کی طرح زیادہ سے زیادہ بس یہی ہوگا کہ آپ نے کچھ بدمعاش پال رکھے ہوں گے۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا صاحب کہ آپ تو چیز ہی کچھ اور ہیں۔ خدا کے لئے ہمیں معاف کردیں۔"

"آہ وزاری کرنے اور پاؤں پکڑنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے نرمی سے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر واپس چبوترے پر بٹھادیا۔ "تمہیں اتنی تکلیف ہی نہ اٹھانا پڑتی اگر تم مجھے میرے گھر پر ہی بتادیتے کہ تمہیں قیصر ملک نے بھیجا ہے۔ میں تمہیں اسی وقت چھوڑ دیتا۔ مجھے تم جیسے کرائے کے قاتلوں سے بھلا کیا لینا تھا۔ اصلی مجرم تو وہ ہوتے ہیں جو ان کو بھیجتے ہیں۔ سزا کرائے کے قاتلوں کو بھی ملنی چاہئے لیکن اس کی پرورش کرنے والوں کو زیادہ کڑی سزا ملنی چاہئے۔ اب بھی جیسے ہی میں نے تمہارے منہ سے سنا کہ تمہیں قیصر ملک نے بھیجا تھا تو میں نے اسی لمحے تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔"

اس کے شکستہ وجود میں گویا زندگی کی لہر عود آئی۔ اس کی سوجی سوجی آنکھیں جن کے گرد نیلے حلقے پڑ چکے تھے' قدرے ٹھیک نظر آنے لگیں اور اس نے امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی سے زیادہ بلند آواز میں بے یقینی سے پوچھا۔ "صاحب! کیا آپ واقعی ہمیں چھوڑ دیں گے؟ بالکل معاف کردیں گے؟"

"ہاں۔ اب سے کچھ دیر بعد تم آزاد ہوجاؤ گے اور مجھے اس بات کی بالکل پروا نہیں ہوگی کہ تم باہر جاکر کیا کرتے ہو۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن قیصر ملک کو ایک پیغام ضرور دے دینا کہ زندہ رہنے کا اس کے پاس اب صرف ایک راستہ ہے کہ آئندہ وہ خود یا کرائے کے قاتلوں کے ذریعے میری جانب ایک انچ بھی پیش قدمی نہ کرے۔ یہ آخری موقع تھا کہ میں اسے معاف کررہا ہوں لیکن آئندہ ایسی کوئی بھی کوشش اس کی زندگی کی آخری کوشش ہوگی۔ تم اچھی طرح سن رہے ہو نا؟" میں نے قدرے جھکتے ہوئے کہا۔

اس نے اثبات میں سرہلانے کی کوشش کی لیکن کراہ کر گردن تھام لی۔

"تمہیں یہ پیغام اسی طرح لفظ بہ لفظ.... اسی مفہوم کے ساتھ قیصر ملک کو دینا ہے۔ بس یہی تمہاری رہائی کی واحد شرط ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا اور ایک لمحے کے لئے غیر ارادی طور پر میرے دانت بھنچ گئے لیکن پھر میں نے فوراً ہی جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"میں.... میں اسے ضرور آپ کا پیغام دوں گا۔ بلکہ ا
طرف سے بھی سمجھاؤں گا۔" رہائی کی امید نظر آتے ہی محمد طا
کی حالت عجیب سی ہوگئی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن
اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ گئیں اور وہ دوبارہ دھپ
چبوترے پر بیٹھ گیا۔ کلین شیو بدمعاش اور قفل شکن نوجوان
بھی یہ خوشخبری سن کر آنکھیں کھول دی تھیں اور کانپتے بازو
کے سہارے اٹھنے کی کوشش کررہے تھے۔

میں نے محمد طارق سے کہا "قیصر ملک تو زخمی تھا۔ اسپتال
داخل تھا۔ کیا وہ صحت یاب ہوگیا؟"

"جی ہاں" محمد طارق نے نحیف آواز میں جواب دیا "
ابھی چھڑی کے سہارے لنگڑا کر چلتا ہے۔ مگر صاحب.... سچی
یہ ہے اس پر جنون طاری ہے آپ کو قتل کروانے کا.... اس کا
نہیں چل رہا کہ وہ کیا کرے.... اور معلوم نہیں وہ کیا کر گزرے
اسے سو فیصد یقین ہوجائے کہ کوئی آپ کو قتل کرسکتا ہے تو شا
اس مقصد کے لئے اپنی ساری دولت بھی دے دے.... ب
صاحب! میں اس کا جنون اتارنے کی کوشش کروں گا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور حنیف خان سے کہا "ا
انہی کی گاڑی میں محفوظ طریقے سے کہیں بھجوادینا۔"

"بہت بہتر" حنیف خان نے دھیمے لہجے میں کہا اور ا
آنکھوں پر پٹیاں باندھنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ میں اور جولی وا
چل دیئے۔

لان پر پہنچ کر میں نے جولی کو خدا حافظ کہا اور گاڑی میں
بیٹھا۔ وہ دوبارہ لان چیئر پر بیٹھ کر سامنے تپائی پر رکھی ہوئی نیل پا
ریسیور اور نیل کٹر وغیرہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

میں آفس پہنچا تو کیتھرین نے بتایا کہ محسن علی نامی ا
نوجوان مجھ سے ملاقات کے انتظار میں بہت دیر سے بیٹھا ہوا
صبح اس نے فون کرکے اپائنٹمنٹ لینے کی کوشش کی تھی لیکن
ہی چلا آیا۔ وہ ویٹنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ چند منٹ بعد اسے میرے آفس میں بھیج
گا۔" میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا اور اندر جا بیٹھا۔

چند لمحے بعد محسن علی کو میرے پاس بھیجا گیا۔ وہ یقیناً
امیدوں کے ساتھ تیار ہوکر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ معمولی مگر
ستھرے کپڑوں کو اس نے یقیناً بڑی محنت سے استری کیا تھا۔
میں تیل بھی لگایا ہوا تھا اور انہیں شاید چند منٹ پہلے بھی
کیا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں امید اور ناامیدی کی کشمکش
سائے تھے اور وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"سر! وہ آپ نے نوکری کے لئے...؟" اس نے گویا
دلانے کی کوشش کی۔

"مجھے یاد ہے" میں نے اسے اطمینان سے بیٹھے رہنے کا
کرتے ہوئے کہا۔ چند ضروری خطوط پر سرسری نظر ڈالنے
میں نے فائل ایک طرف کھسکائی اور انٹرکام پر اپنے ایکسپو

سے رابطہ قائم کیا۔

"مجھے یاد پڑتا ہے کہ چند دن پہلے آپ ذکر کررہے تھے کہ ہمیں کارگو سپروائزر کی آسامی کے لئے ایک ایماندار نوجوان کی ضرورت ہے؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔" منیجر بولا "کارگو میں تمام تر احتیاطوں کے باوجود ہیرا پھیری کا اندیشہ رہتا ہے۔ کوئی بھروسے کا نوجوان چاہئے۔ اسی لئے میں ابھی تک اخبار میں اشتہار دیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کہ کوئی جاننے والا مل جائے تو بہتر ہے۔"

"میں ایک نوجوان کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ فی الحال اسے آزمائشی بنیادوں پر رکھ لیجئے گا۔ بعد میں مستقل کرلیجئے گا۔" میں نے کہا۔

انٹرکام کا ریسیور رکھ کر میں نے محسن علی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "ملازمت بھی تمہیں ایسی دی جارہی ہے جس میں اوّلین شرط صرف دیانتداری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں تمہیں دو ایک کام اور ایسے سونپ رہا ہوں جن میں دیانتداری کی اشد ضرورت ہوگی۔ میرے کسی بھی کاروبار' کسی بھی پراجیکٹ سے وابستہ ہونے والے وہ لوگ بہت ترقی کرتے ہیں جو بنیادی طور پر ایماندار اور میرے ساتھ مخلص ہوتے ہیں۔"

"سر! آپ مجھے ضرور آزمائیے۔ قبل از وقت میں کوئی دعویٰ کرنا نہیں چاہتا۔" وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔

"دعوے کرنے والے لوگ مجھے متاثر بھی نہیں کرتے۔" میں نے کہا "نوکری میں تمہیں جو کچھ کرنا ہوگا وہ تو تمہیں ایکسپورٹ منیجر صاحب سمجھادیں گے۔ میں تمہارے ذمے جو دو کام لگا رہا ہوں وہ یہ ہیں کہ تمہیں اپنی ہی بلڈنگ کی دو خواتین کی مدد نہایت رازداری اور نہایت خلوص سے کرنی ہے۔ ایک تو تمہیں شکیلہ بیگم کو کسی ایسے پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرانا ہے جہاں اس کی نشوں کی عادت چھڑائی جاسکے اور ضروری علاج کیا جاسکے۔ صحت یابی کے بعد بھی اسے جس حد تک مدد کی ضرورت ہوگی وہ تم فراہم کروگے۔ وہ اپنے زمانے کی بہت اچھی اداکارہ تھی۔ اور اس سے قطع نظر میں نے سنا ہے کہ وہ بہت نیک دل عورت تھی۔ اپنے خرچ پر اس نے کئی غریب لڑکیوں کی شادی کرائی اور کئی بیواؤں کی وہ مستقل مدد کرتی تھی۔ معلوم نہیں آسمان اس پر کیوں اتنا نامہرباں ہوا کہ آج وہ اس حال میں ہے۔ ممکن ہے اسے کسی کی محبت نے برباد کیا ہو یا پھر اس کی اپنی ہی ذات کے کسی خلل نے۔ بہرحال ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ ہماری غرض صرف اتنی ہونی چاہئے کہ وہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوجائے اور معاشرے کی ایک کارآمد رکن بن جائے۔ کیا تم نوکری کے علاوہ اپنے فاضل وقت میں یہ کام کرلوگے!"

"کیوں نہیں سر!" وہ بلا تامل بولا۔ "یہ کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں۔ مجھے تو خود بہت شوق رہا ہے دوسروں کے کام آنے کا.... کسی کے لئے کچھ کرنے کا.... جذبۂ خدمت بہت تھا مجھ میں..... لیکن افسوس کہ قدرت نے مجھے اس قابل ہی نہیں بنایا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے میں تو خود دوسروں کی مدد کا محتاج رہا۔" اس کے لہجے میں تاسف ضرور تھا مگر احساسِ محرومی کی جھلک نہیں تھی۔

"اس تاسف کو دل سے نکال دو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ قدرت کو نہ جانے کیا منظور ہے۔" میں نے کہا "دوسری عورت جس کا میں ذکر کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ تمہاری بلڈنگ کی تیسری منزل پر رہنے والی ایکسٹرا گرل ملکہ ہے۔ جانتے ہو اسے؟"

"جی ہاں۔ اچھی طرح۔ آج کل اس بے چاری کا بچہ بہت بیمار ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"ہاں وہی۔" میں نے طمانیت سے کہا "میں نے ان کے لئے تھوڑا بہت انتظام تو کیا تھا۔ لیکن لگتا ہے ان دونوں ہی ماں بیٹے کو اچھے اور خاصے طویل علاج کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اس وقت تک ان کے علاج معالجے اور دیگر ضروریات کا خیال رکھو جب تک ملکہ اور اس کا بچہ مکمل طور پر تندرست نہیں ہوجاتے اور ملکہ دوبارہ کوئی کام کاج کرنے کے قابل نہیں ہوجاتی۔ شکیلہ بیگم اور ملکہ جب دوبارہ حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوجائیں تو پھر ان کی مدد جاری رکھنے کی ضرورت نہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے محسن علی! کہ معاشرے میں جو زیادہ تر محتاج' کچلے مسلے ہوئے اور ناکارہ لوگ نظر آتے ہیں وہ دراصل وہ لوگ ہیں جو زندگی کی اس قیامت خیز دوڑ میں کبھی ٹھوکر کھا کر گر پڑے تھے اور اس کے بعد کسی نے انہیں سہارا دے کر نہیں اٹھایا۔ انہیں دوبارہ ان کے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں بنایا۔ وہ زمانے کے قدموں تلے روندے جاتے رہے اور آخر کار اس قابل ہی نہیں رہے کہ کسی بھی طرح دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔ اس دوران اگر ان میں سے کسی خوش نصیب کی مدد بھی کی گئی تو وہ بس اس طرح تھی جیسے بھوک اور پیاس سے مرتے ہوئے کسی انسان کے حلق میں محض ڈراپر سے پانی کے دو چار قطرے ٹپکادیئے جائیں اور روٹی کا ایک آدھ نوالہ منہ میں ڈال دیا جائے۔ اس مدد کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔ لیکن جذبہ بہرحال اس کے پیچھے بھی نیک ہو تو اس کو بھی سراہنا ہی چاہئے۔ بہرحال میری نظر میں زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ایک بار کسی کو سہارا دینے کے لئے اس کا ہاتھ تھاما جائے تو اسے دوبارہ زمانے کی بے رحم دوڑ میں حصہ لینے کے قابل بنانے کی کوشش کی جائے۔ اسے ہمیشہ مدد کا محتاج نہ رکھا جائے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

وہ مبہوت سا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یکدم گویا چونک کر بولا۔ "بہت اچھی طرح سر!"

"امدادی کاموں کے سلسلے میں تم جس وقت بھی چاہو براہِ راست انٹرکام پر یا فون پر مجھ سے بات کرسکتے ہو۔ میں اسی وقت کیشیئر سے کہہ دیا کروں گا اور وہ تمہیں مطلوبہ رقم دے دیا کرے گا۔ ان کاموں کے لئے میرا ایک الگ چھوٹا سا متوازی نظام کام کررہا ہے۔ دفتری کاموں کے سلسلے میں آئندہ تمہارا رابطہ زیادہ تر

دوسرے لوگوں سے رہے گا۔ امید ہے تنخواہ اور دیگر مراعات تمہارے لئے قابل قبول ہوں گی۔"

"سر! میری قبولیت کی آپ کیا پوچھتے ہیں" وہ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے ذرا مسکرایا۔ "میں تو کچھ دنوں سے چپراسی کے طور پر بھی کام کرنے کے لئے تیار تھا۔ ایک دو جگہ اس اسامی کے لئے انٹرویو دینے بھی جا پہنچا مگر انہوں نے معذرت کرلی کہ یہ بی اے کی ڈگری کی توہین ہوگی۔ عجیب ستم ظریفی تھی۔ ایک طرف تو وہ مجھے ڈگری کے مطابق بھی کوئی نوکری نہیں دے سکتے تھے اور دوسری طرف اگر میں اپنی تعلیمی سطح سے نیچے آکر کوئی کام کرنا چاہتا تھا تو وہ بھی نہیں کرنے دیتے تھے۔ آئندہ کے لئے میرا ارادہ یہ تھا کہ اگر چپراسی کی اسامی کے لئے درخواست دوں تو اس میں اپنی تعلیم صرف میٹرک بتاؤں گا۔"

"بہرحال...." میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ مت بھولنا کہ فی الحال تمہیں آزمائشی بنیاد پر رکھا جارہا ہے۔"

"مجھے جب تک بھی یہاں رہنا نصیب ہوا میں اپنے آپ کو آزمائشی بنیادوں پر ہی ملازم سمجھوں گا سر!" وہ اٹھتے ہوئے بولا اور اجازت پاکر رخصت ہوگیا۔ میں اسے آزمانے سے پہلے ہی اس کی طرف سے مطمئن تھا۔ میں لوگوں کی آنکھوں میں ایمانداری، وفا اور خلوص کے جو گمشدہ خزانے تلاش کیا کرتا تھا۔ محسن علی کی آنکھوں میں مجھے ان کی جھلک نظر آئی تھی۔ خزانے عموماً خرابوں ہی میں ملتے ہیں۔ خوبصورتیاں عموماً کھنڈروں ہی میں مدفون ہوتی ہیں۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنی ترجیحات پر غور کیا۔ سرفہرست مجھے ہنی کے اغوا کا معاملہ اہم نظر آیا۔ شریف سیال نچلی سطح کا پولیس آفیسر تھا اور اس کی جان بہت جھنجٹوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ تفتیش تو گو کہ ہرحال میں اسی تھانے کو کرنی تھی لیکن میں آخر کار اسی نتیجے پر پہنچا کہ اگر ذرا اوپر سے تھوڑا سا دباؤ ڈلوادیا جائے تو بہتر رہے گا۔ مجھے اپنے طور پر تو کوشش کرنی ہی تھی لیکن پولیس بہرحال اپنی جگہ ایک محکمہ تھی۔ اس کے اپنے انداز، طور طریقے اور وسائل تھے۔ اگر وہ بھی اس سلسلے میں تھوڑے سے سرگرم رہتے تو کوئی حرج نہیں تھا۔

ایس پی جہاں زیب میرا دوست تھا۔ میں نے فون پر اس سے رابطہ قائم کرکے تفصیلی بات کی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ فوری طور پر متعلقہ لوگوں کو تیزی سے حرکت میں آنے کی ہدایات جاری کردے گا۔ اس سے خاصی طویل گفتگو رہی۔ گپ شپ بھی ہوئی۔ آخر کار میں نے اس کا شکریہ ادا کرکے سلسلہ منقطع کیا اور دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہوا۔ میرا ارادہ تھا کہ اگر جہاں زیب کے کہنے سے بھی تفتیش کی رفتار کچھ تسلی بخش نظر نہ آئی تو پھر ڈی آئی جی صاحب سے بھی کہلوادوں گا۔

دفتر کے کاموں میں الجھ کر مجھے مزید دو گھنٹے گزر گئے۔ اس دوران ضروری ٹیلی فون کالز بھی آتی رہیں۔ دفتر کے سب لوگ کھانے کا وقفہ کرنے کے بعد واپس بھی آگئے لیکن میں کھانے کے لئے بھی نہیں اٹھا۔ آخر کار گھڑی دیکھنے کے بعد میں کچھ دیر کے لئے اٹھنے کا ارادہ ہی کررہا تھا کہ کیتھرین نے بتایا ایک صاحب مجھ سے بات کرنے کے لئے بہت اصرار کررہے ہیں مگر اپنا نام نہیں بتا رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ نام وہ صرف مجھے ہی بتائیں گے۔ اس انداز سے فون کرنے والوں کو کیتھرین ٹال دیتی تھی۔ انہیں بھی ایک مرتبہ ٹال چکی تھی لیکن انہوں نے فوراً ہی دوبارہ فون کیا تھا اور بہت منت سماجت کررہے تھے۔

"ٹھیک ہے، بات کراؤ۔" میں نے ایک لمحے سوچنے کے بعد کہا اور فون کا ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے جس ٹھہری ٹھہری سی آواز نے سلام کیا وہ میرے لئے اجنبی تھی۔ پھر اس نے جس انداز سے میری خیروعافیت دریافت کی اس سے یوں لگا جیسے وہ میرا کوئی غائبانہ جاننے والا ہو۔ بہرحال اس لہجے میں سادگی اور شرافت کی جھلک تھی۔

"چوہدری صاحب! میں آپ سے ملنے کی حسرت لے کر کچھ دیر پہلے ہی گوجرانوالہ سے یہاں پہنچا ہوں۔ میں آپ جیسا بڑا آدمی تو نہیں، لیکن بہرحال ایک کاروباری آدمی ہوں۔" پھر اس نے ایک شناسا برانڈ نام بتاتے ہوئے کہا "اس نام کے پنکھوں کا کارخانہ ہے میرا۔ میرے بیٹوں کے بھی الگ الگ چھوٹے موٹے کارخانے ہیں۔ اللہ کا کرم ہے۔ اچھے آسودہ حال لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن مجھے آپ سے کاروباری نہیں، اخلاقی مدد درکار ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے آپ کا قیمتی وقت خراب کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں لیکن میں بس ایک موہوم سی امید کے سہارے چلا آیا ہوں۔ شریف سیال نے آپ کے متعلق جو کچھ کہا اور یہاں کے کاروباری حلقوں سے میں نے جو تھوڑی بہت معلومات حاصل کیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ جتنے بڑے آدمی ہیں اتنے ہی بڑے دل کے بھی مالک ہیں.... اور دل بھی ایسا جس میں دوسروں کے لئے دردمندی پائی جاتی ہے۔ کیا میں امید رکھوں کہ آپ میری مدد کے لئے وقت نکالیں گے؟ میں ہلٹن میں ٹھہرا ہوا ہوں.... اگر آپ مجھے یہاں ملاقات کا اعزاز بخشنا چاہیں تو یہاں تشریف لے آئیں۔ مجھے اجازت دیں میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں؟"

میں نے خاموشی اور توجہ سے اس کی بات سنی تھی۔ بظاہر اس کا لہجہ ٹھہرا ٹھہرا تھا لیکن پھر بھی اس کے لفظوں میں جیسے جذبات کا ایک بہاؤ سا تھا۔ وہ بہت بے تاب بھی معلوم ہوتا تھا اور کسی صدمے سے نڈھال بھی۔ مگر وہ گویا بہت جرأت اور ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔

"لیکن آپ کو کس سلسلے میں میری مدد کی ضرورت آن پڑی؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"نشاط کے قتل کے سلسلے میں" اس نے نہایت دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ان لفظوں کے عقب میں گویا سسکیاں مچل رہی تھیں۔

"اچھا.... تو آپ ہی نے غالباً آج صبح شریف سیال کو بھی فون کیا تھا؟" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"جی ہاں" اس نے بلا تامل کہا "اسے میں نے گوجرانوالہ سے فون کیا تھا۔ اس نے جب آپ کے بارے میں بتایا تو مجھے امید کی ایک کرن نظر آئی۔ میں فوراً گاڑی نکال کر گوجرانوالہ سے چل دیا۔ پہلے میرے ذہن میں شک بھی تھا کہ آخر آپ نشاط کے قتل میں دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟ لیکن پھر میں نے معلومات کیں اور آپ کے بارے میں اطمینان ہوگیا کہ آپ کی دلچسپی بے بہانہ ہے اور کسی نے نشاط کو آپ کے پاس مدد مانگنے کے لئے ہی بھیجا تھا مگر اس سے پہلے ہی...." اس کی آواز ایک لمحے کے لئے گم ہوگئی مگر پھر اس نے گویا خود کو سنبھالا۔ "مجھے معلوم ہوا کہ آپ کے لئے بالکل اجنبی تھی مگر آپ کو اس کی دردناک موت کا علم ہوا۔ اس دکھ کے ناتے کیا آپ میری مدد کریں گے؟"

"مگر آپ کی اس معاملے میں دلچسپی کی بنیاد کیا ہے؟ کیا صرف انسانی ہمدردی؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"یہ میں آپ کو فون پر نہیں بتا سکتا۔ میں آپ سے ملاقات کے لئے بے تاب ہوں۔"

میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا "میں ہی آپ کے پاس آجاتا ہوں۔ لیکن آدھے گھنٹے بعد۔ آپ مجھے اپنا نام اور کمرا نمبر بتا دیجئے۔"

"اس عزت افزائی کے لئے میں تا زندگی آپ کا شکر گزار رہوں گا۔" اس کے لہجے میں حقیقی ممنونیت تھی۔ "میرا نام وحید ہے۔" پھر اس نے اپنا کمرا نمبر بھی بتادیا۔ میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

آدھے گھنٹے بعد جب میں ہلٹن ہی میں کھانا وغیرہ کھا کر ڈائننگ ہال سے اوپر مطلوبہ کمرے تک پہنچا تو وحید صاحب مجھے کمرے کے دروازے پر ہی کھڑے ملے۔ شاید وہ خاصی دیر پہلے ہی باہر آکر کھڑے ہوگئے تھے اور بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔

وہ گہرے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے سے سوٹ میں تھے۔ قدرے فربہ اندام آدمی تھے اور بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ چکے تھے۔ جوانی میں وہ خاصے وجیہہ رہے ہوں گے۔ عام حالات میں ان کے چہرے پر سخت گیری بھی جھلکتی ہوگی لیکن اس وقت وہ شکستہ دل اور مضمحل نظر آرہے تھے۔ میں ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے اندازے سے مجھے پہچان لیا اور خود ہی آگے بڑھ کر گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔ "چوہدری صاحب! آپ نے یہاں تشریف لاکر مجھے بڑی عزت بھی دی ہے اور میرے دل کو بڑا حوصلہ بھی بخشا ہے۔"

انہوں نے میرے لئے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر پہنچ کر کہنے لگے۔ "میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں"

میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "رسمی باتوں کو چھوڑیئے وحید صاحب! کام کی بات کیجئے۔ نشاط آپ کی بیٹی تھی؟"

ان کی آنکھیں بلوری تھیں۔ نشاط کی آنکھوں کا رنگ بھی ایسا ہی تھا لیکن میں نے انہیں ڈراؤنے انداز میں حلقوں سے نکلے ہوئے دیکھا تھا۔ وحید صاحب کی آنکھوں میں نمی چھلک آئی۔ ایک لمحے وہ بالکل خاموش رہے۔ کمرے میں بوجھل سا سکوت چھا گیا

"آپ ٹھیک سمجھے۔" آخر کار وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے اور ٹشو پیپر سے آنکھیں خشک کرنے لگے۔ "وہ میری سب سے چھوٹی اولاد تھی۔ اکلوتی بیٹی۔ ضدی، خود سر اور لاڈلی۔ دھن کی پکی۔ ہم دونوں ابھی کھڑے ہی تھی۔ میرا بیٹھنے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ انہوں نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر ان کی آواز گویا بہت دور سے آنے لگی۔ "ہم کاروباری لوگ ہیں۔ ہمارے گھرانے میں تعلیم زیادہ نہیں ہے۔ لڑکے واجبی سی تعلیم حاصل کرکے کاروبار میں لگ جاتے ہیں لیکن رخشندہ کو تعلیم دلانے کا ہمارا ارادہ تھا۔ نشاط کا اصل نام رخشندہ تھا۔ مجھے بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ لاہور آکر اس نے اپنا نام نشاط رکھ لیا تھا۔ کیونکہ وہ ہمارے حوالے سے پہچانی جانا نہیں چاہتی تھی۔"

انہوں نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ آخر کار وہ خود تھکے تھکے انداز میں ایک صوفے پر ڈھیر ہوگئے اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولے "وہ اس وقت صرف انٹر کی طالبہ تھی جب اس پر فلمی ہیروئن بننے کا جنون سوار ہوا۔ ہمارے گھرانے اور ہمارے خاندان میں کئی نسلوں سے دولت ہونے کے باوجود ہم لوگ زیادہ آزاد خیال نہیں ہیں۔ رواجوں کی سخت پابندی ہے ہمارے ہاں۔ کسی حد تک قدامت پسند بھی کہہ سکتے ہیں آپ ہمیں۔ لیکن رخشندہ کے معاملے میں ہم نے کبھی زیادہ قدامت پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہم دیکھتے تھے کہ وہ فلمی رسالے شوق سے پڑھتی ہے۔ اداکاروں کو خط لکھتی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کالج کے ڈراموں وغیرہ میں پیش پیش ہوتی ہے۔ آئینے کے سامنے ایکٹنگ کرتی ہے۔ ایک بار اس کا بھائی لندن سے ویڈیو کیمرہ لایا تو اس نے باقاعدہ خود اسکرپٹ لکھ کر تنہا اداکاری کرکے ایک لڑکی کی مدد سے اپنی بیس پچیس منٹ کی ایک فلم بھی تیار کی۔ جس پر ہم سب نے اس کا خوب مذاق اڑایا اور اس نے وہ کہیں چھپا کر رکھ دی یا شاید ضائع کردی۔ ان سب چیزوں کو ہم نے کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ بچکانہ شوق ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی ختم ہوجائیں گے۔ بے شمار لڑکے لڑکیوں کو ہوتے ہیں یہ شوق۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے پڑجاتے ہیں۔"

وہ ایک بار پھر ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگئے۔ ان کا سر جھک گیا اور لہجہ خود کلامی کا سا ہوگیا۔ "انٹر کے بعد ہم اسے پڑھنے کے لئے گوجرانوالہ کے بجائے لاہور بھیجنا چاہتے تھے۔ اس موقعے پر اس نے اعلان کردیا کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ لاہور میں فلموں میں بھی کام حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس کا انداز فیصلہ کن تھا اور اس کے لہجے میں غیر متزلزل عزم کی جھلک تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ اب سختی اختیار کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اب ہمیں اس کے سر سے یہ بھوت اتارنا پڑے گا۔ چنانچہ ہم نے سختی

اختیار کی۔ اسے لاہور بھیجنا تو درکنار' ہم نے اسے گوجرانوالہ کے کالج سے بھی اٹھالیا۔ ہم نے سوچ لیا تھا کہ اگر اسے مزید پڑھانا ہی ہوا تو پرائیویٹ پڑھائیں گے۔ اس پر دوسری پابندیاں بھی لگائیں۔ کافی سختی کی ... شاید ہمارا طرز عمل غلط تھا۔ شاید ہم سچویشن کو صحیح طور پر ہینڈل نہیں کرسکے۔ اس مسئلے کو زیادہ وقت نہیں دے سکے۔ ہم سب مصروف بھی بہت رہتے تھے۔ کسی کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ بیری میری تقریباً دس سال پہلے اللہ کو پیاری ہوچکی ہے....."

ایک نیا نشو پیپر لے کر انہوں نے ایک بار پھر آنکھیں خشک کیں "ہم نے دن بہ دن سختیاں بڑھائیں اور اس کے دل میں دن بہ دن بغاوت طاقتور ہوتی گئی۔ ہم نے اس کے لئے ہر راہ مسدود کردی لیکن اس نے آخری راہ اختیار کرلی اور ایک رات گھر سے فرار ہوگئی۔"

انہوں نے ایک سسکی سی لی اور ان کی آواز پہلے سے بھی مدھم ہوگئی۔ "بہت عزت دار لوگوں میں ہمارا شمار ہوتا ہے۔ ہم نے اس کے فرار کی خبر کو گھر سے باہر نہیں پہنچنے دیا۔ یہی مشہور کردیا کہ ہم نے اسے پڑھنے کے لئے لندن بھیج دیا ہے۔ ہم نے اسے تلاش کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔ ہمیں صدمہ بھی بہت تھا اور غصہ بھی۔ بلکہ کافی عرصہ تو ہم پر نفرت غالب رہی۔ وہ گھر سے معمولی سی رقم کے علاوہ کچھ بھی لے کر نہیں گئی تھی۔ اپنی سونے کی چوڑیاں وغیرہ تک اتار کر رکھ گئی تھی۔ حتیٰ کہ اپنی شناخت بھی گھر پر ہی چھوڑ گئی تھی۔ وہ کوئی ایسا کاغذ کا پرزہ تک ساتھ لے کر نہیں گئی تھی جس سے ہمارے ساتھ اس کے تعلق کا کوئی حوالہ بنتا۔ ... ایک بہت طویل جذباتی خط چھوڑ گئی تھی کہ اگر اس کے شوق کی وجہ سے ہماری ناموس کو خطرہ لاحق ہے تو وہ ہماری خوشنودی کی خاطر اپنے آپ کو ہم سے لاتعلق کررہی ہے اسے کسی شناخت' کسی سہارے کی ضرورت نہیں..... اور ایک روز وہ اتنا نام کمائے گی کہ ہم خود اس سے تعلق جوڑنے کے لئے دوڑے آئیں گے اور اس سے ناتا ظاہر کرنے میں فخر محسوس کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ بس اسی قسم کی بہت سی بچکانہ اور جذباتی باتیں۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انہوں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "ایک طویل عرصے بعد اس کے بارے میں جو پہلی خبر ہماری نظر سے گزری وہ اس کے قتل کی خبر تھی..... اور ہم نے اس کے متعلق جو کچھ بھی معلومات حاصل کیں وہ آج ہی کی ہیں۔ اب بھی ہم نے سب سے پہلے تو اسی بات پر شکر ادا کیا کہ کسی نے اس کو ہماری بیٹی کی حیثیت سے نہیں پہچانا۔ بہت خود غرض' بہت سنگدل ہیں ہم... لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں نے اس کی یاد میں بہت سی راتیں کروٹیں بدلتے گزاری ہیں۔ ہم نے اپنے جذبوں پر غم وغصے کا آتشیں خول پہن لیا تھا لیکن اس رشتے کی کونپل تو ہر حال میں ہری رہتی ہے نا۔

بھائی بھی چپ چپ رہتے تھے .... اور اب جو کچھ بھی ا
متعلق معلوم ہوسکا ہے۔ اس نے ہمیں اپنی اپنی زندگی
نفرت دلا دی ہے۔ ہم وہاں عالیشان کوٹھیوں میں ایئر کنڈیشنر
میں سوتے رہے اور وہ میری پھول سی بچی..... ضد اور انا کی
نہ جانے کہاں کہاں ٹھوکروں میں رُلتی رہی۔ کن کن ہاتھوں
کھلونا بنتی رہی۔ صرف معاشرے میں ناک اونچی رکھنے کے
کتنے کھوہ ہوجاتے ہیں..... اور اب بھی ہیں۔ اب بھی ہم
اخلاقی جرأت نہیں کہ آگے بڑھ کر اس کی موت کے بعد
اپنا کہیں اور عزت آبرو سے اس کا جنازہ اٹھوانے کی کوشش
... وہ اسپتال کے مردہ خانے میں لاوارث لاش کی حیثیت
ہے۔ معلوم نہیں اسے ڈھنگ سے کفن بھی نصیب ہوگا یا نہیں
"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ نہایت اچھے طریقے
تدفین کا میں نے بندوبست کردیا ہے۔" میں نے ان کے
تپتے صحرا پر اوس کا ایک قطرہ ٹپکانے کی کوشش کی۔

"میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا چوہدری صا
"وہ بھیگی بھیگی آنکھوں سے ایک نظر میری طرف دیکھ کر بو
"اس کے بھائی گم صم ہیں۔ وہ اپنے آپ سے بھی خفا ہیں اور
بھی .... اور اب میں سوچتا ہوں..... واقعی بات تو کوئی ایسی
بھی نہیں تھی کہ جس سے ہم اتنے سنگدل ہوتے چلے گئے
نے اس بچی کو ذلت آمیز موت کے راستے پر بھیج دیا..... اگر
قاتل کرنے میں یا اس کی مناسب رہنمائی کرنے میں ناکام ر
تو ہم تھوڑا سا جھک بھی سکتے تھے..... میں تو اس کے شوق کی
کے لئے خود اس کے لئے فلم بنا کر مارکیٹ میں پھینک سکتا تھا
دس لاکھ روپے کی کیا بات تھی۔ لیکن اب یہ سب
پچھتاوے ہیں..... ندامتیں ہیں..... جو اس زخم کو نہیں بھر
... اب ہمیں تھوڑی بہت تسکین شاید صرف اس طرح مل
کہ ہم اس کے قاتل کو تلاش کریں اور اپنے ہاتھوں سے
عبرت ناک انجام تک پہنچائیں۔ لیکن ہم بہت ہی بے کار لو
... اس معاملے میں بھی ہم بے دست وپا ہیں۔ سمجھ میں نہیں
کیا کریں۔ ویسے تو میں نے پولیس والوں کو بھی تحریک د
کوشش کی ہے لیکن اول تو مجھے ان کی کامیابی کی امید کم
اگر اتفاق سے قاتل ان کے ہاتھ آبھی گیا تب بھی ضروری
وہ قرار واقعی سزا پاسکے۔ عین ممکن ہے وہ قانونی موشگافیو
فائدہ اٹھاتے ہوئے بری ہوجائے یا تھوڑی بہت سزا
ہوجائے۔ میں چاہتا ہوں کہ پولیس کو اپنی جگہ معروف عمل
کسی اور طریقے سے بھی قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کی
اس لئے میں ذرا سی امید پاکر آپ کے پاس دوڑا آیا ہوں۔
چوہدری صاحب! کیا آپ میری مدد کریں گے؟"

وہ آنکھوں میں ان گنت التجائیں لئے میری طرف دیکھ
اور میں خاموش تھا!

میری مسلسل خاموشی کے باعث آخر کار سیٹھ وحید کی
ں میں مایوسی کے سائے لہرا آئے اور وہ ٹوٹتے لہجے میں
"مجھے معلوم ہے میری یہ فرمائش' میرا یہ اصرار بے جا
جب ہم جیسے چھوٹے موٹے صنعتکاروں کی مصروفیات کا یہ
ہے کہ ہم اپنی اولاد کے لئے ان کی زندگی میں' خاطر خواہ وقت
نکال پاتے تو آپ جیسا بڑا آدمی کسی کی مری ہوئی بچی کے لئے
وقت کس طرح نکال سکتا ہے۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔"
میں افسردگی سے مسکرا دیا۔ مزید ایک لمحے کے توقف کے بعد
نے دھیمے لہجے میں کہا "وقت بے شک بہت قیمتی ہے لیکن
وم کے لہو سے زیادہ قیمتی نہیں۔ اگر میں اس معاملے میں کچھ
نے کا ارادہ نہ رکھتا تو آپ سے ملنے کی زحمت بھی نہ کرتا۔ میں تو
اصل یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں نے آپ سے کوئی وعدہ کرلیا تو
یں شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔"

"آپ صرف ہاں بھر لیجئے۔ میرے سینے میں بھڑکتے آتش
ناں میں کچھ ٹھنڈک سی اتر آئے گی۔" وحید صاحب بولے "اور
ھے یہ بھی یقین ہے کہ نیک مقاصد میں اوپر والے کی تائید بھی
امل ہوتی ہے۔"

"میں بھی اسی یقین کے سہارے آپ سے وعدہ کررہا ہوں کہ
یک ہفتے کے اندر اندر قاتل کو آپ کے قدموں میں لا پھینکوں
گا۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

"بہت بہت شکریہ افضل صاحب!" وہ میرا ہاتھ تھامتے
ہوئے گلوگیر آواز میں بولے "میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں
بھولوں گا۔"

"آپ بار بار احسان کا ذکر کرکے مجھے شرمندہ کئے جارہے
ہیں۔" میں نے حقیقتاً شرمندگی سے کہا "میں اس قسم کا جو بھی کوئی
چھوٹا موٹا کام کرتا ہوں' اپنے دل کی تسکین کے لئے کرتا ہوں۔
ایک عجیب بے عنوان سی تشنگی ہے' ایک غیر واضح سی بے اطمینانی
ہے جو ایک مدت سے میری ہم سفر چلی آرہی ہے۔ صرف اسے
بھلانے کے لئے میں کسی کے کام آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے
نہیں معلوم کہ اس کا مجھے کوئی اجر ملے گا یا نہیں۔ میں تو بس اپنی
غرض کے لئے کرتا ہوں۔ آپ کو احسان مند ہونے کی ضرورت
نہیں۔"

وہ آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں سے ایک لمحے میری طرف
دیکھتے رہے۔ ان کے ہونٹ دھیرے سے کانپے مگر وہ کچھ بولنے سے
قاصر رہے۔ آخر کار وہ گویا بڑی مشکل سے بول پائے "آپ بہت
عجیب آدمی ہیں افضل صاحب.....! اور جہاں تک بے اطمینانی اور
تشنگی کا تعلق ہے تو وہ آج کے دور کے ہر چھوٹے بڑے آدمی کا
مقدر ہوچکی ہے۔ کیوں کہ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ اس مادی دور کے
چکروں میں پھنسا ہوا ہے۔ انگریزی میں "جسے ریٹ ریس" کہتے ہیں
نا..... ہر شخص چوہوں کی اس دوڑ میں شریک ہے۔ اور بس دوڑ رہا
ہے۔ کسی کو نہیں معلوم اس کی منزل کیا ہے۔ اسی طرح دوڑتے
دوڑتے ایک روز انسان ختم ہوجاتا ہے۔"

"میں اب چلتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے فلسفے سے بور ہوگئے۔" وہ افسردگی سے مسکرائے "رخشندہ کی موت نے یکایک ہی مجھے فلسفی سا بنا دیا ہے ورنہ میں تو ایک سیدھا سادا کمرورا سا بزنس مین تھا۔"

"اندر سے میں بھی خاصا فلسفی ہوں۔" میں نے ان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "لیکن میں زیادہ تر تنہائی میں اپنے فلسفے اپنے آپ سے ہی ڈسکس کرکے زیادہ اطمینان محسوس کرتا ہوں۔"

میں دروازے کی طرف چل دیا۔ سیٹھ وحید اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے "اس پر میرے ٹیلی فون نمبرز اور گھر' دفتر' فیکٹری کے ایڈریس موجود ہیں۔ میں آپ کی طرف سے کسی اطلاع کا منتظر رہوں گا۔" وہ مجھے لفٹ تک چھوڑنے آئے۔

نیچے پہنچ کر میں جیسے ہی لفٹ سے نکلا' ٹوٹی سامنے کھڑا نظر آیا۔ ٹوٹی اور شبیر شیخ آج کل ایک سفید گاڑی میں ہمہ وقت میرے تعاقب میں رہتے تھے۔ انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو میری حفاظت کے لئے مامور کرلیا تھا۔ میں گاڑی سے اتر کر کہیں جاتا تھا تو ان میں سے ایک میرے پیچھے رہتا تھا' دوسرا اپنی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے میری گاڑی پر نظر رکھتا تھا۔

"سر!" وہ بلا تمہید سرسری لہجے میں بولا "ایک گوری چٹی' اسمارٹ اور بہت خوب صورت لڑکی آپ کی گاڑی میں گھسی ہے۔"

"لگتا ہے بہت غور سے جائزہ لیا ہے تم نے اس کا؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"آنکھیں پوری طرح کھلی رکھنا تو ضروری ہے نا سر!" اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ نہایت تیکھے نقوش کا مالک اور گورا چٹا نوجوان تھا۔ جب وہ ایکشن میں ہوتا تھا تو اس کے پتلے پتلے ہونٹوں سے سفاکی جھلکتی تھی لیکن عام حالات میں وہ بہت نرم خو اور مہذب نظر آتا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "آپ شاید گاڑی کو لاک کرنا بھول گئے تھے۔"

"قفس کو کبھی کبھی اسی طرح چھوڑ دینا چاہئے۔ کوئی نہ کوئی آوارہ پنچھی آن ہی پھنستا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس پنچھی کو کتنی دیر ہوگئی گاڑی میں داخل ہوئے؟"

"تقریباً بیس منٹ ہوگئے ہیں۔" ٹوٹی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ اندر ہی ہے اور غالباً پچھلی سیٹ کے نیچے چھپی ہوئی ہے۔ وہ سلیٹی رنگ کی ایک پرانی سی نیٹ میں آپ کے آفس سے ہی آپ کے تعاقب میں روانہ ہوئی تھی۔"

"اگر وہ بیس منٹ سے پچھلی سیٹ کے نیچے چھپی بیٹھی ہے تب

تو کافی تکلیف دہ پوزیشن میں ہوگی۔ حسینوں کو اتنی تکلیف دینا کوئی مناسب بات نہیں۔ میرا خیال ہے مجھے چل کر فوراً گاڑی میں بیٹھنا چاہئے۔" میں نے لابی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"سر.... ! آپ رسک لیں گے؟ معلوم نہیں اس کا ارادہ کیا ہو؟" ٹونی ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"دیکھ لیتے ہیں۔ ایسی تشویش کی کیا بات ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "تم اپنی گاڑی میں تعاقب جاری رکھو اور جب تک میری طرف سے کوئی سگنل نہ ملے یا خطرہ بڑھتا ہوا محسوس نہ ہو تب تک مداخلت نہ کرنا۔"

"اوکے سر!" وہ اثبات میں سر ہلا کر دوسری طرف چلا گیا تاکہ ہمیں ایک ساتھ لابی میں داخل ہوتے اور پھر ہوٹل سے نکلتے نہ دیکھا جاسکے۔

میں نے پارکنگ لاٹ میں آکر بظاہر بے خیالی کے سے عالم میں گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اگر ٹونی نے مجھے خبردار نہ کیا ہوتا تب بھی یقیناً مجھے احساس ہوجاتا کہ گاڑی میں کوئی لڑکی موجود ہے۔ گو اس نے شاید اپنے طور پر احتیاط کر رکھی تھی کہ کوئی کلون وغیرہ نہیں لگایا ہوا تھا مگر ہر عورت کے وجود کی اپنی بھی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ اس لڑکی کے وجود کی بھی بہرحال ایک خوشبو تھی جو کم از کم مجھے ضرور خبردار کردیتی۔

بظاہر بے پروائی سے سیٹی بجاتے ہوئے میں گاڑی ہال پر لایا۔ آرٹس کونسل کے سامنے پہنچ کر میں واپس جانے کے لئے گاڑی سڑک کی دوسری سائیڈ پر موڑنے لگا تھا کہ عقب نما آئینے میں میں نے اپنی سیٹ کے عقب سے ایک سر نمودار ہوتے دیکھا۔ اس کے بال اخروٹ کے رنگ کے تھے۔ ٹونی نے اس کے بارے میں مبالغے سے کام نہیں لیا تھا۔ خوب صورت وہ بلاشبہ تھی مگر اس کی خوب صورتی محض آنکھوں کو بھلی لگنے والی تھی۔ دل کو گرمانے والی نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے پلاسٹر آف پیرس کے مجسمے بہت حسین ہوسکتے ہیں مگر انہیں دیکھ کر رگ و پے میں چنگاریاں نہیں تیر سکتیں۔

اس کے سپید مرمریں ہاتھ میں چھوٹا سا پستول دبا ہوا تھا جو اس نے اپنی دانست میں میری بے خبری میں میری کنپٹی پر رکھ دیا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولی "گاڑی موڑنا مت۔ سیدھے چلتے رہو۔"

حکم اس نے انگریزی میں دیا تھا تاہم لہجے سے وہ ایشیائی ہی معلوم ہوتی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر ذرا سا اچھل کر خوفزدگی کا اظہار کروں مگر پھر میں نے ہلکی سی آواز میں محض "اوہ" کہنے پر اکتفا کیا۔ اس کا چہرہ مجھے شناسا محسوس ہو رہا تھا۔ گاڑی صحیح سائیڈ پر لے آنے کے بعد میں نے ایک بار پھر عقب نما آئینے میں اس کی صورت پر نظر ڈالی۔ عقب نما آئینہ ہر چیز کو بہت چھوٹی کرکے دکھاتا ہے تاہم میں نے خاصی آسانی سے اسے پہچان لیا۔

مجھے یاد آگیا کہ میں نے اسے سعید احمد سعید صاحب کی پارٹی میں دیکھا تھا۔ وہ جنگل گرل کے ہیرو اور نارزن نما مخدوم موتی کے ساتھ ڈانس کررہی تھی اور ستارہ نے مجھے بتایا تھا کہ ایرانی تھی اور فلمی دنیا کے بہت سے لوگوں سے اس کی دوستی تھی۔ شغل ہی شغل میں اسے جنگل گرل میں چھوٹا سا کردار بھی دے دیا گیا تھا جو شوٹ بھی ہوچکا تھا۔ فلم میں کام کرلینے تک تو ٹھیک تھا لیکن ایک سیاح قسم کی لڑکی کا کم از کم یہ نہیں ہونا چاہئے تھا کہ پستول کے زور پر کسی کو کہیں لے جانے کی کوشش کرتی پھرے۔ لگتا تھا کہ اس کی چیزیں بھی شاید کہیں گم ہوئی تھیں۔ یا وہ انہیں گرائی میں لے جانے کی کوشش کررہی تھی۔ شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کوشش میں اس کی جرکت بند ہوسکتی تھی۔

ایک لمحے کے سکوت کے بعد میں نے ملائمت سے کہا "تمہارا ایران واپس جانے کا ارادہ نہیں ہے جو تم نے اس قسم کے دھندے شروع کردئے ہیں؟"

"اوہ... تو تم نے مجھے پہچان لیا۔" وہ گہری سانس لے کر بولی "یادداشت بہت اچھی ہے۔ بھیڑ بھاڑ میں دیکھے ہوئے چہرے یاد رکھتے ہو۔"

"ہر چہرہ نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "صرف چہرہ یاد رہتا ہے جو یاد رکھے جانے کے قابل ہو۔"

"سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں میں نے دیکھا تھا نا تم نے مجھے نہ جانے کیوں اس نے تصدیق چاہی۔

"ہاں" میں نے بلا تامل کہا "وہی پارٹی جہاں تم جیسی خوب صورت اور نوجوان لڑکی کی لاش سوئمنگ پول سے نکلی تھی اور تمام مہمانوں کا لطف و سرور غارت ہوگیا تھا۔"

"تمہیں کس نے میرے متعلق بتایا تھا؟" وہ گویا لڑکی لاش والی بات ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

"ایک مہربان نے۔" میں نے جواب دیا "تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

"ایک مہربان نے۔" اس نے گویا تڑکا دیا۔ لڑکی جواب دینے کی کوشش کی۔

"ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے۔" میں نے اردو میں معنی پڑھ کر ٹھنڈی سانس لی۔

"کیا مطلب؟"

"انگریزی میں اس کا صحیح مفہوم سمجھانا میرے لئے ذرا مشکل ہے۔ لیکن اتنا بتادوں کہ لوگوں کی مہربانیاں کبھی کبھی جان بھی لیتی ہیں۔" میں نے نہایت سنجیدہ اور مربیانہ لہجے میں کہا "تم کم اور حسین ہو۔ ممکن ہے ایک حسین مستقل تمہارا مختصر ہو۔ واقعی تمہیں لہمان واپس نہیں جانا ہے جو ان چکروں میں پڑ

رہی ہو؟" میں نے انگلی سے پستول کی طرف اشارہ کیا۔

"ایران میں میرے لئے اب کیا رکھا ہے۔ مجھے تو مدت ہوگئی وہاں سے نکلے ہوئے۔ ماں باپ گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ گھر بندرِ آتش ہوگیا۔ بھائی کو پھانسی لگ گئی۔ بہن کو کوئی اٹھا کر لے گیا۔ میں تو نہ جانے کس طرح جان بچا کر ملک در ملک بھٹکتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہوں اور ابھی نہ جانے کہاں کہاں جانا پڑے۔ کوئی گھر، اس کی پروا نہیں رہی۔ میں اب دنیا کی ہر چیز سے بے پروا ایک بہن موتی لڑکی ہوں۔ جو میرے دل میں آئے کرتی ہوں۔ تمہیں میری فکر میں دبلا ہونے یا زیادہ حاجی صاحب بننے کی ضرورت نہیں۔" اس کا دل برف کی قاش معلوم ہوتا تھا۔ بعض لوگ بہت زیادہ صدمات سے گزرنے کے بعد ایسے ہی ہوجاتے ہیں۔"

"اوہ!" میں نے متاسفانہ سے انداز میں طویل سانس لی "کیا زمانہ آگیا ہے۔ ہمدردوں اور غمخواروں کی اس طرح طبیعت صاف کرکے انہیں ایک طرف بٹھادیا جاتا ہے۔ خیر۔ تمہاری مرضی!" میں نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور عقب نما آئینے میں ایک بار پھر اس پر نظر ڈالی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رکھا تھا اور اس کی بھوری آنکھوں میں نہ جانے کن خون آشام لمحوں کی پرچھائیاں تھیں۔ ایک لمحے کے لئے وہ مجھے بہت سفاک اور بہت زہریلی دکھائی دی۔

میں کار بہت سست رفتاری سے ڈرائیو کررہا تھا۔ اس نے رفتار تیزی کرنے کی فرمائش نہیں کی۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "مجھے حکم ملا تھا کہ تمہیں بہلا پھسلا کر، تم پر ڈورے ڈال کر، ناز و ادا دکھا کر ساتھ لے آؤں لیکن نہ جانے کیوں میرے دل نے کہا کہ شاید یہ جادو تم پر نہ چل سکیں۔ میں نے سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں تمہیں ستارہ کے ساتھ دیکھا تھا مگر میں تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکی۔ میرا دل تمہارے بارے میں بیک وقت متضاد رائے دے رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تم بہت عاشق مزاج اور دل پھینک لگتے تھے اور دوسرے ہی لمحے دل کہتا تھا کہ تم عورت کے معاملے میں بہت بے حس اور بے نیاز ہو۔ اس الجھن کی وجہ سے میں نے بہتر سمجھا کہ پستول ہی استعمال کیا جائے۔"

"اپنے بارے میں تو میں خود بھی الجھن میں رہتا ہوں۔ تم محض ایک بار دور سے دیکھ کر کیا اندازہ لگا سکتی ہو۔" میں نے کہا اور کھڑکی پر لگے ہوئے عقب نما آئینے پر ایک نظر ڈالی۔ ٹونی اور شبیر سفید کار میں بدستور پیچھے آرہے تھے۔ لڑکی تعاقب وغیرہ کی طرف سے بالکل بے نیاز معلوم ہوتی تھی۔ وہ یا تو ان معاملات میں زیادہ منجھی ہوئی نہیں تھی یا پھر اس نے میرے بارے میں بالکل ہی غلط اندازے لگائے ہوئے تھے۔ میں اس کے بارے میں الجھن میں تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ اسے جس نے بھیجا تھا وہ بھی میرے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا۔ لیکن وہ کون ہوسکتا تھا اور مجھے اغوا کرانے کا اس کا مقصد کیا تھا؟ کیا اس کا رخشندہ عرف بے بی نشاط کے قتل سے کوئی تعلق ہوسکتا تھا؟

ایک لمحے کے لئے مجھے اس نازک اندام سی لڑکی پر ترس بھی آیا جو میری کنپٹی پر پستول رکھے بیٹھی تھی اور اس خوش فہمی میں مگن تھی کہ وہ مجھے اغوا کرکے لے جارہی ہے۔ اسے شاید ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اگر میں چاہتا تو اس کا پستول مجھے اس کی خوب صورت سی گردن موڑنے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس بے چاری کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس قسم کی صورت حال کے لئے میری گاڑی میں کئی طرح کے میکینزم بھی موجود تھے۔ میں چاہتا تو پاؤں کے قریب ہی موجود ایک غیر نمایاں سا بٹن دبا تا اور میری سیٹ کے عقب سے تقریباً چار انچ لمبا بغیر دستے کا پتلا سا ایک زہر آلود خنجر تقریباً گولی کی سی رفتار سے برآمد ہوتا اور اس کے سینے میں پیوست ہوجاتا۔ وہ بالکل اسی سیدھ میں بیٹھی تھی جہاں ڈارٹ گن کے اصول پر کام کرنے والی وہ گن پوشیدہ تھی جو خوب صورت ساخت کا مہلک خنجر پھینکتی تھی۔ اور بھی دو تین چیزیں تھیں جن کی زد میں آکر وہ ہلاک ہوسکتی تھی، بے دست و پا ہوسکتی تھی۔ اور اگر میں خود بھی ہاتھ پاؤں ہلانے کی زحمت کرنا چاہتا تو وہ میرے لئے.... کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں تھی۔ لیکن میں بخوشی اس کے ساتھ جارہا تھا۔ کیوں کہ آج کل میرے چاروں طرف الجھے ہوئے معاملات کا ایک عجیب سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ان میں سے کسی معاملے کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ یہ لڑکی ان میں سے یقیناً کسی نہ کسی معاملے کا سراغ تھی۔ میں اس کے سہارے کسی بڑی مچھلی تک پہنچنا چاہتا تھا۔

مزید کچھ دیر کے سفر کے بعد اس نے مجھے گارڈن ٹاؤن کے ایک دور افتادہ حصے میں ایک ویران، اجاڑ اور نامکمل سی کوٹھی کے سامنے رکنے کا حکم دیا۔ اس کے آس پاس کافی پلاٹ خالی پڑے تھے اور بعض کو تو جھاڑیوں یا بے ہنگم گھاس پھوس نے ڈھانپ رکھا تھا۔

"میں نے تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں۔" میں نے اترنے سے پہلے کہا "ہوسکتا ہے میرا آخری وقت قریب ہو۔ مرنے سے پہلے مجھے کم از کم تمہارا نام تو معلوم ہو ہی جانا چاہئے۔"

"مہ پارہ مشہدی" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ وہ بالکل پرسکون اور بے خوف نظر آرہی تھی۔ پستول ایک لمحے کے لئے کنپٹی سے ہٹا کر اس نے مجھے گاڑی سے دو قدم دور جانے کا حکم دیا پھر خود بھی پھرتی سے اتر آئی۔ وہ پستول لئے میری پیچھے رہی اور مجھے آگے بڑھنے کے سلسلے میں ہدایات دیتی رہی۔

کوٹھی میں دروازے نہیں لگے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی وجہ سے اس کی تعمیر کا کام بہت عرصہ پہلے روک دیا گیا تھا اور کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں رہا تھا۔ برآمدے سے

گزر کر ہم اس کمرے میں پہنچے جسے غالباً ڈرائنگ روم ہونا چاہئے تھا۔ فرش پر گرد و غبار کی تہ تھی مگر اس میں بہت سے جوتوں کے نشانات بھی گڈمڈ نظر آرہے تھے۔ کونے کھدروں میں جالے لگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں جانوروں کی پھیلائی ہوئی غلاظت بھی نظر آرہی تھی۔

ڈرائنگ روم سے گزر کر ہم ایک کشادہ ہال میں پہنچے۔ یہاں کچھ صفائی نظر آرہی تھی۔ ہال کے ایک سرے سے نامکمل سیڑھیاں نیچے جارہی تھیں۔ سیڑھیوں کے قریب ایک نیم شکستہ چارپائی پر ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص میں ملبوس غیر معمولی طور پر بھاری بھرکم ایک شخص نیم دراز تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور تیل کی مالش کی وجہ سے خوب چمک رہا تھا۔ گردن سانڈ کی طرح موٹی تھی اور اس پر بل پڑے ہوئے تھے۔ وہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا اور کثیف دھواں بڑی ہی ادا سے فضا میں بکھیر رہا تھا۔ ہوا میں پھیلی ہوئی بُو بتا رہی تھی کہ سگریٹ میں چرس بھری ہوئی تھی۔ اس کی چارپائی کے سہارے سیون ایم جی کی ایک گن کھڑی ہوئی تھی۔ چارپائی پر سرہانے کی طرف ایک فاضل میگزین بھی رکھا ہوا تھا۔

ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پکی عمر کا تھا اور اندازہ تھا کہ ماضی قریب میں وہ پیشہ ور پہلوان تھا۔ بلکہ کوئی بعید نہیں تھا اب بھی پیشہ ور پہلوان ہی ہو۔ رخساروں پر چڑھے ہوئے گوشت کی وجہ سے اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی دکھائی دے رہی تھیں اور ان میں لہو کی سی سرخی تھی۔ موٹے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ بڑی ترنگ میں معلوم ہوتا تھا۔

اس نے گن اٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی اور استقبالیہ انداز میں ہاتھ پھیلا کر سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیم استہزائیہ سے لہجے میں بولا "آؤ... آؤ... میرے شہزادے۔ آؤ... تشریف لاؤ... تمہارے بغیر یہ گھر بالکل سونا پڑا ہوا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گہری نظر سے صرف اس کا سرتاپا جائزہ لینے پر اکتفا کیا۔ مہ پارہ نے مجھے سیڑھیوں کے راستے نیچے چلنے کا حکم دیا۔ وہ خود جب اس پہلوان کے قریب سے گزرنے لگی تو میں نے اس کی زوردار سسکاری کی سی آواز سنی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک جگہ سے اپنا جسم سہلا رہی تھی اور اس کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔

"بینڈے! میں نے تمہیں کتنی مرتبہ منع کیا ہے کہ میرے ساتھ بے ہودگی مت کیا کرو۔" وہ برہمی سے چلاتے ہوئے انگریزی میں بولی۔

"ساڈے نال پنجابی یا اردو وچ گل کیا کرو بادشاہو!" بینڈا اپنا پھولا پھولا سا گال کھجاتے ہوئے قربان جانے والے انداز میں مسکرا کر بولا "انگریزی شنگریزی سانوں نئیں آندی۔" پھر وہ لہجہ بدل کر قدرے سنجیدگی سے اردو میں بولا "ویسے شہزادی! صرف ہم سے ہی کیوں ناراض رہتی ہو؟ ہمارے میں کیا کانٹے لگے ہوہیں؟"

غالباً مہ پارہ کی سمجھ میں اس کی کوئی بات نہیں آئی تھی۔ پستول ہوا میں لہراتے ہوئے بولی "کسی دن تمہاری اس تربوز جیسی کھوپڑی میں میرے ہی پستول کی گولیوں سے روشن دان بنیں گے۔"

میں خاموش تھا اور اس صورتِ حال سے کسی حد تک محظوظ بھی ہو رہا تھا۔

"جیسے کا بچہ!" مہ پارہ پاؤں پٹختے ہوئے پلٹی پھر اس نے پستول میری کمر میں چبھوتے ہوئے مجھے آگے دھکیلنے کی کوشش کی اور بینڈے کے حصے کا باقی غصہ مجھ پر اتارتے ہوئے چلائی "آگے چلو۔ تم یہاں کیوں جم کر کھڑے ہو گئے خبیث!"

اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو ان شعلوں میں گویا پانی سا پڑ گیا اور اس نے فوراً نظر چرالی۔ پھر پہلے سے بہت مختلف اور مرتعش سے لہجے میں بولی "چلو... چلو... نیچے چلو۔"

میں گہری سانس لے کر مڑا اور نپے تلے انداز میں سیڑھیاں اترنے لگا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر بھاری بھرکم آہنی گیٹ لگا ہوا تھا۔ اس اجاڑ اور نامکمل مکان میں یہ واحد دروازہ تھا جو فی الحال مجھے نظر آیا تھا۔ گیٹ اندر سے بند تھا۔

"دستک دو" مہ پارہ نے بدستور میرے پیچھے رہتے ہوئے حکم دیا۔ میں نے نہایت سعادت مندی سے آہنی بولٹ سے گیٹ کو کھٹکھٹایا۔ گیٹ ہلکی سی گھرگھراہٹ کے ساتھ تھوڑا سا کھلا اور بینڈے ہی جیسی ایک شخصیت نے باہر جھانکا لیکن یہ شخصیت سیاہ پوش تھی۔ اس نے سر پر بھی مختصر سی سیاہ پگڑی لپیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھاری بھرکم ریوالور تھا۔

باہر کی صورتِ حال دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس کی مونچھیں نہیں تھیں مگر نہ جانے کیوں اس نے اپنی خیالی مونچھوں پر تاؤ دیا اور گیٹ تقریباً پورا کھول دیا۔

اندر پہنچ کر میں تہ خانے کی وسعت اور کشادگی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جتنے رقبے پر کسی نے کوٹھی تعمیر کرانا شروع کی تھی اتنے ہی رقبے پر پوری ایک منزل زیرِ زمین بھی بنوانا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں اس کا مقصد کیا تھا اور اب کون لوگ اس پر قابض تھے۔ یہ لوگ بہرحال اصلی مالک تو معلوم نہیں ہوتے تھے۔ تہ خانے میں بھی بغیر دروازوں کے کئی کمرے نظر آرہے تھے۔ یہاں کافی ستھرائی تھی مگر کچھ عجیب سیلن آمیزی بُو پھیلی ہوئی تھی جو کئی قسم کی ہلکی سی بدبوؤں کا آمیزہ معلوم ہوتی تھی۔

ہال میں موٹے موٹے شہتیر نما پایوں والی دو بڑی بڑی چارپائیاں پڑی تھیں۔ ان پر تین چار موٹے موٹے آدمی آلتی پالتی

بیٹھے تھے۔ کوئی بوتل اور گلاس تھامے ہوئے تھا۔ کوئی چرس سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور ایک ایسا ہی تھل تھل کرتا ہوا کونے میں بیٹھا بھنگ گھوٹ رہا تھا۔ اس کے جسم پر صرف میلی بنیان اور مختصر سی دھوتی تھی۔ چارپائیوں پر تین رائفلیں بھی ترچھی پڑی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ کچھ کارٹن بھی اوپر رکھے تھے۔ معلوم نہیں خالی تھے یا بھرے ہوئے۔ اچھا بھلا کسی سین کا سا منظر تھا۔

چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا ایک پہلوان مجھے دیکھتے ہی کر بولا "تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آگیا۔ آؤ آؤ چوہدری ب! جی آیاں نوں۔" اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے یف دھویں کا مرغولا ہوا میں چھوڑا۔ "سنا ہے بہت بڑے ہیں آپ... کروڑ پتی' بلکہ شاید ارب پتی ہیں۔ خیر... کوئی نہیں۔ ہمارے اس غریبانہ ڈیرے پر بڑے بڑے کروڑ پتی ری دیتے ہیں۔ کچھ اپنی مرادیں پاتے ہیں اور کچھ کے کس بل لے جاتے ہیں جس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے سیدھے ہو جاتے ۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کچھ عرصے کے لئے یہیں مہمان ہیں لیکن ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کرلایا جاتا ہے۔ ایک مہمان یہاں ایسا بھی آیا ہے جس کی ہڈیاں باہر کے کسی خالی ں دفن ہیں۔ افسوس' مجھے ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم کہ کا شمار کون سے مہمانوں میں ہوتا ہے۔"

اس کی گفتگو میرے لئے خاصی بے ربط اور تقریباً ناقابلِ فہم ۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی کفل اٹھا چکا تھا اور کھلونے کی طرح اسے تھامے ہوئے تھا۔ کا رخ میری طرف ہی تھا۔ دوسرا پہلوان اپنی رائفل اٹھا کر اور گلاس چھوڑ کر ایک کونے میں جا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے یوں نشانہ لے رکھا تھا جیسے کہیں سے کوئی اشارہ ملتے ہی مجھے چھلنی ے گا۔ تیسرے پہلوان کا ایک ہاتھ رائفل پر تھا مگر اس نے ل اٹھائی نہیں تھی۔ وہ چارپائی سے ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا اور ں دھیرے دھیرے ہلاتے ہوئے کچھ گنگنا رہا تھا۔ وہ سب سے ترنگ میں معلوم ہوتا تھا۔

چوتھا پہلوان جو کونے میں بیٹھا بھنگ گھوٹ رہا تھا' ایک نظر طرف دیکھنے کے بعد بدستور جوش و خروش سے اپنے کام میں ف رہا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا گویا اس کے نزدیک دنیا کا اہم کام بھنگ گھوٹنا ہی ہو۔ بظاہر میری نظر صرف اس پہلوان پر جس نے میری آمد پر ایک طرح کی استقبالیہ تقریر جھاڑی تھی ور حقیقت میری نظر اس ہال کی ہر چیز اور وہاں موجود ہر شخص ۔ میں صرف مہ پارہ کو نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ وہ میرے عین ۔ میں تھی اور اب بھی میری کمر سے پستول لگائے کھڑی تھی۔ ۔ میں نے اسے بے زاری آمیز لہجے میں کہتے سنا "مسٹر شکرا! کو بلاؤ۔ میں کیا یہاں اس طرح شام تک کھڑی رہوں گی؟"

شکرا غالباً اسی کا نام یا عرفیت تھی جس نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ وہ مخمور سے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر باچھیں پھیلاتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا "اب تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں حسین چڑیا! اب یہ آدمی ہماری ذمے داری ہے۔ تم اپنے نازک ہاتھوں کو مزید تکلیف مت دو اور اپنا پستول پرس میں رکھ کر جدھر تمہارا جی چاہے بیٹھ جاؤ... بلکہ ضرورت محسوس کرو تو لیٹ جاؤ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

لڑکی نے گہری سانس لی۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھ رہا تھا مگر میرا اندازہ تھا کہ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔ وہ ان پہلوانوں سے خوش معلوم نہیں ہوتی تھی مگر نہ جانے کس شخص کی خاطر یا کس مفاد کے لئے ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے شکرا کی ہدایت پر عمل کیا اور پستول میری کمر سے ہٹالیا۔ پھر میں نے اسے اپنے قریب سے گزر کر اس چارپائی کی طرف بڑھتے دیکھا جس پر ایک پہلوان ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔

اب میں نے پہلی بار صحیح طور پر مہ پارہ مشہدی کا سرتاپا جائزہ لیا۔ وہ سرخ رنگ کے چست ٹراؤزر اور نیلی سفاری شرٹ میں تھی۔ کمر سے چوڑی بیلٹ بندھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے کمر کی نزاکت اور دیگر اعضا کی سرکشی کچھ اور نمایاں ہو گئی تھی۔ چال کچھ اور غضب ڈھا رہی تھی۔ ان پہلوانوں کے درمیان اس کا عالم کچھ ایسا ہی تھا جیسے بندروں کے درمیان ایک ریسلی لالی پاپ پھینک دی گئی ہو۔ معلوم نہیں کون سی طاقت انہیں اس لالی پاپ پر چھینا جھپٹی سے باز رکھے ہوئے تھی۔ شاید وہ طاقت نامعلوم باس کی تھی۔ لیکن کچھ بعید نہیں تھا کہ کسی وقت چھینا جھپٹی ہو ہی جاتی۔

مہ پارہ چارپائی پر اس پہلوان سے حتی الامکان دور ہٹ کر بیٹھ گئی جو ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس پہلوان نے بھی باچھیں پھیلا کر اس کی طرف کھسکتے ہوئے اس کی کمر میں بازو حمائل کرنے کی کوشش کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھی مہ پارہ پر رال ٹپکانے کے معاملے میں پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مہ پارہ نے اسے پرے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن اس کا پہلوان کو دھکیلنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی ہرنی کسی ہاتھی کو دھکیلنے کی کوشش کرے۔ اس نے برہمی کے عالم میں چیخ کر کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ پہلوان تیزی سے دور کھسک گیا۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ مہ پارہ کے چیخنے کے اندیشے سے خوف زدہ ہو گیا بلکہ اس کی وجہ غالباً وہ نقاب پوش تھا جو اندر ہی کے کسی کمرے سے ہال میں داخل ہوا تھا۔

وہ سیاہ چرمی جیکٹ اور سیاہ پتلون میں تھا۔ شرٹ بھی سیاہ تھی اور چہرہ بھی گردن تک سیاہ نقاب میں ہی چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھوں کی جگہ دو سوراخ نظر آرہے تھے۔ وہ دراز قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔

وہ ہال میں داخل ہوتے ہی بھنگ گھوٹنے والے پہلوان پر برس پڑا "تم نے ابھی تک رسہ نہیں لٹکایا۔" اس نے پہلوان کے شجرۂ

نسب میں چند شرمناک سی ترامیم کیں پھر بولا "بھنگ گھوٹنے کے علاوہ بھی کبھی کچھ کر لیا کر سالے!"

"رسہ لٹکانے میں کون سی دیر لگتی ہے باس! ابھی لٹکا رہا ہوں۔ میں تو یہی سوچ رہا تھا کہ دنبہ آجائے تو لٹکانے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔" پہلوان بڑی بے پروائی سے بھنگ گھوٹنے کا سوٹا رکھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ اس نے بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے میرا سرتاپا جائزہ لیا پھر گویا دل ہی دل میں محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا دیا اور ہال کی ایک دیوار کی طرف بڑھ گیا جس کے قریب موٹے رسے کا ایک بڑا سا لچھا پڑا تھا۔

اس نے رسہ اٹھایا اور ہال کے وسط میں آگیا۔ تب میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ چھت کے وسط میں ایک بڑا سا کنڈا لگا ہوا تھا۔ پہلوان نے بڑی مہارت سے رسہ اوپر پھینکا اور وہ کنڈے میں لٹک گیا۔ اس نے بڑی مہارت سے ہی اس کے دونوں سرے پکڑ کر موٹی سی ڈھیلی گرہ لگائی پھر ایک سرے کو پکڑ کر کھینچنا شروع کیا۔ دوسرا سرا اس طرح اوپر جانے لگا کہ عین کنڈے پر جا کر گرہ لگ گئی۔ وہ اس کام میں بہت مشاق معلوم ہوتا تھا۔ معلوم نہیں آج تک کتنے لوگوں کو اس طرح رسے سے لٹکا کر ان پر کس کس انداز سے تشدد کیا گیا تھا۔ میں خاموشی سے کھڑا یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔

میں نقاب پوش کی آواز پر بھی غور کر رہا تھا اور اس کی جسمانی ساخت پر بھی۔ لباس میں انسان کا جسم چھپ جاتا ہے اور ہر لباس میں اس کا بصری تاثر مختلف ہو جاتا ہے مگر پھر بھی اگر کوئی باریک بینی کی صلاحیت رکھتا ہو تو اسے ہر انسان کی جسمانی ساخت اسے پہچاننے میں مدد دے سکتی ہے۔ دستِ قدرت کا یہ کمال بھی بے پناہ حیران کن ہے کہ اس نے ان گنت انسانوں کو تخلیق کیا ہے مگر ان کی جسمانی ساخت، ان کی آواز، رنگ روپ، خدوخال میں کوئی نہ کوئی فرق ضرور رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک پیدا ہونے والے اربوں کھربوں انسانوں میں شاید ہی کوئی دو انسان ایسے پیدا ہوئے ہوں جنہیں مکمل طور پر یکساں کہا جا سکے۔ جن میں کوئی معمولی سا بھی فرق نہ ہو۔ میں قدرت کی اس ضاعی پر غور کرتا تھا اور بہت جلد بڑے عجیب عجیب بھید پا لیتا تھا۔

نقاب پوش اپنی آواز بدل کر بولنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس میں بڑی حد تک کامیاب تھا لیکن میں نے اس کے اتار چڑھاؤ پر ذرا سا غور کیا تو یاد آگیا کہ یہ آواز اصل میں کیسی تھی اور کس کی تھی۔ غیر محسوس طور پر میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس شخص کو پہچان کر مجھے قدرے مایوسی ہوئی تھی۔ میرا سارا تجسس ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔

وہ غراہٹ آمیز لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا "تمہیں اس رسے کے ذریعے چھت سے الٹا لٹکا کر اس وقت تک تمہارے جسم پر لاٹھیاں برسائی جائیں گی جب تک تم ملغوبے میں تبدیل نہیں ہو جاتے۔ آخر میں ملغوبہ بھی نہیں رہے گا، صرف چند ٹوٹی پھوٹی ہڈیاں رسے سے لٹکی رہ جائیں گی۔ تمہارا وجود صرف فرش پر پھیلی ہوئی غلاظت کی سی صورت میں باقی رہ جائے گا۔ پھر یہ غلاظت صاف کر دی جائے گی۔ صفحۂ ہستی سے نام و نشان مٹ جائے گا تمہارا۔ بس اتنی سی کہانی ہوگی تمہاری۔ بہت گھمنڈ ہے نا تمہیں خود پر؟"

"میں بھلا گھمنڈ کس بات پر کر سکتا ہوں؟" میں نے مرتے ہوئے ملائمت سے کہا "میں تو خالقِ کائنات کا ایک بہت عاجز بندہ ہوں۔ گھمنڈ تو تمہارے لہجے میں بول رہا ہے۔ اور شاید بھی۔ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟ کیوں اتنا تاؤ کھائے ہو مجھ پر؟"

اس نے گویا میرے سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی اور اس پہلوان کی طرف دیکھا جو مستعدی سے رائفل سنبھالے کونے میں کھڑا تھا۔ اس نے چٹکی بجا کر پہلوان کو حکم دیا "اسے رسے میں نہیں لٹکے گا۔ اس کی ٹانگ میں گولی مار دو تاکہ قسم کی اچھل کود نہ کر سکے۔"

نقاب پوش کے پاس غالباً اس وقت کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ یہ فریضہ وہ خود انجام دیتا۔ پہلوان کی نالی ذرا نیچے کو ہوئی اور ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا۔ میں اپنی ہی ٹانگوں کو گولی کی زد سے بچانے کے لئے تیار تھا لیکن حرکت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ تہ خانے میں فائر کی آواز گونجی اور رائفل پہلوان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دیوار سے ٹکرا کر گر پڑی۔ ہلکی سی چیخ کے ساتھ پہلوان اپنا ایک ہاتھ چہرے کے سامنے لا کر دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ سے خون ٹپکنے لگا تھا۔

سبھی نے بیک وقت آہنی دروازے کی طرف دیکھا۔ فائر کرنے کے بعد کسی نے اس کا اندر کا بولٹ چڑھانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس وقت گیٹ صرف اتنا کھلا ہوا تھا کہ ایک گہری سی نالی اندر جھانک رہی تھی۔ دوسرے پہلوان نے تیزی سے رائفل سیدھی کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہاتھ سے رائفل دور جا گری۔ اس کے بھی صرف ہاتھ میں ہی سوراخ ہوا۔ متحرک چیزوں پر ہی درست نشانہ لگانے میں ٹونی کا جواب نہیں تھا۔

تیسرے پہلوان کی جو چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا ٹانگیں بالکل ساکت ہو چکی تھیں۔ اس کا جو ہاتھ رائفل پر تھا وہیں کا وہیں رہ گیا۔ اس نے نہ تو رائفل اٹھانے کی کوشش کی نہ ہی اس پر سے ہاتھ ہٹایا۔ بھنگ گھوٹنے والا پہلوان ہال میں رسہ تھامے کھڑا تھا اور حیرت سے پلکیں جھپکا رہا تھا۔ توند تیزی سے پھول پچک رہی تھی۔

ٹونی نے ٹھوکر مار کر گیٹ کھولا۔ شبیر شیخ اس کے ساتھ تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گن تھی۔ مہ پارہ مشہدی جا بجا کبھی میری طرف اور کبھی ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بیٹڑے۔" دفعتاً نقاب پوش نے مرتعش سی آواز میں پکارا۔ اس پر کوئی جواب نہ پا کر قدرے غضب ناک سے لہجے میں ٹونی کو مخاطب کیا "کیا تم نے بیٹڑے کو مار ڈالا ہے؟"

"اگر بیٹڑا اسی مخلوق کا نام ہے جو اوپر سیڑھیوں کے قریب پڑی ہوئی رہی تھی تو وہ زندہ ہے۔" ٹونی نے ملائمت سے جواب دیا۔ البتہ اس کی تروز نما کھوپڑی شاید چٹخ گئی ہو۔ وہ اپنی چارپائی پر پڑا ہوا نیند لے رہا ہے۔ ایک آدھ دن میں ہوش میں آجائے گا۔"

"تم لوگ یہاں سے زندہ نہیں جا سکو گے۔" نقاب پوش گویا کسی امید کے سہارے بولا۔ شاید یہاں اس کے کچھ اور ساتھیوں کی آمد متوقع تھی۔

"تم میرے بارے میں مسلسل غلط اندازے لگائے جا رہے ہو ارشد موتی!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ میں اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ جھرجھری سی لے کر رہ گیا تھا۔

"تو تم نے مجھے پہچان لیا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا، پھر اس نے اپنے چہرے سے تھیلا نما نقاب کھینچ کر اتار دیا۔ اس کے پرکشش چہرے پر پسینے کے قطرے تھے اور خوب صورت بال بکھرے ہوئے تھے۔

"گدھا شیر کی کھال پہن کر آجائے تب بھی پہچانا جاتا ہے۔" میں نے ہموار لہجے میں کہا "تم فلمی دنیا کے کوئی بہت زیادہ پرانے آدمی نہیں ہو مگر معلوم نہیں کیوں فلمی انداز و اطوار تمہاری فطرت میں رچ بس گئے ہیں۔ یہ اس طرح کے ڈیرے بنا کر بیٹھنا، ان ڈھیلے پہلوانوں کے سر پر معاشی چلانا، مجھے کوئی عام سا سیٹھ سمجھتے ہوئے اس طرح اغوا کرانا۔۔۔ اور میرا ملغوبہ اور نہ جانے کیا کیا بنوانے کی باتیں کرنا۔ مجھے تو شبہ سا ہونے لگا ہے کہ تمہاری کھوپڑی کا کوئی اہم پرزہ گرا ہوا ہے۔"

وہ خاموش کھڑا مجھے گھورتا رہا۔ میں نے نرمی سے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا تم میرے چکر میں کیوں پڑ گئے ہو۔ تمہاری میری کوئی دشمنی نہیں۔ اور تم جیسے روایتی، فرسودہ ذہن کے مالک اور ڈیرے دار بدمعاشوں سے دشمنی رکھنا میں اپنے شایانِ شان بھی نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے تمہارا کچی شراب کا دھندا بھی ہوگا۔ جوئے میں سے جی بھی لیتے ہوگے۔ کہیں کہیں سے جگا ٹیکس بھی جمع کراتے ہوگے۔ کسی کی آرڈر پر شریف شرفا کو اغوا بھی کراتے ہوگے۔ معاوضے پر کبھی کبھار قتل بھی کراتے ہوگے۔ ادھر کا مال ادھر بھی کرتے ہوگے۔ اس قبیل کے تھرڈ کلاس بدمعاشوں سے الجھنا میں پسند نہیں کرتا۔"

"میں تمہاری یہی اکڑ تو نکالنا چاہتا ہوں۔ تم اپنے آپ کو معلوم نہیں کیا سمجھتے ہو۔" ارشد موتی کی جرأت گویا عود کر آئی۔

"یہ اپنے آپ کو کچھ سمجھنے کی نہیں بلکہ اپنے اپنے حلقے، اپنے اپنے حلقے اور اپنی اپنی لائن کی بات ہے۔" میں نے مربیانہ لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی "تم اپنے اس قسم کے تہ خانوں اور دوسرے اڈوں پر اپنے دھندوں میں مصروف رہتے۔ پولیس کو بھتہ جاتا رہتا اور گلشن کا کاروبار چلتا رہتا لیکن میرے ساتھ پنگا لے کر معلوم نہیں تم اپنے لئے کیں مصیبت مول لینا چاہتے ہو۔"

"تم نے سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں بیسیوں معزز مردوں اور عورتوں کے سامنے مجھے گھونسا مارا تھا۔ میرا پاؤں پھسل گیا تھا اس لئے میں دور جا گرا تھا۔ ورنہ میں کوئی ایسا گیا گزرا آدمی نہیں ہوں۔ آج تک کسی نے مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔ میں تمہاری اس حرکت کو بھول نہیں سکتا، معاف نہیں کر سکتا۔"

مجھے اس کی "پاؤں پھسلنے" والی بات پر ہنسی آگئی۔ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا "وہاں بھی تم نے خودی پنگا لیا تھا۔ میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں تھا اور نہ ہی جاننا چاہتا تھا۔"

"لیکن میں تمہیں ضرور جان کر رہوں گا۔" وہ بے خوفی سے بولا "میں نے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے بڑی بھاگ دوڑ کی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں تمہارے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جان سکا۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بھی تمہارے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن نہ جانے کیوں لوگ تم سے ڈرتے ہیں۔ تمہیں پُراسرار سا سمجھتے ہیں۔ میں تمہیں بے نقاب کر کے چھوڑوں گا۔"

"میں نے کوئی نقاب نہیں چڑھائی ہوئی ہے جو تم مجھے بے نقاب کرنے کا شوق پورا کر سکو۔" میں نے اس کے اندازِ گفتگو سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا "نقاب وغیرہ تم جیسے فلم زدہ لوگ چڑھاتے ہیں اور اس شوق میں کبھی کبھی کمال تک اتر آبیٹھتے ہیں۔ میں تو اس شہر کا ایک عام سا، تھوڑا معزز سا، تھوڑا شریف سا آدمی ہوں۔ بس اتنا ضرور ہے کہ تم جیسے اچکے مجھ سے الجھنے سے پرہیز کریں تو فائدے میں رہتے ہیں۔ سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں تو گھونسا کھا کر تمہارا پاؤں پھسل گیا تھا۔ چلو۔۔۔ میں، تمہیں یہاں پورا پورا موقع دینے کو تیار ہوں۔ تم اپنے ساتھیوں کو ایک طرف ہٹا دو۔ میرے ساتھی بھی صورتِ حال میں مداخلت نہیں کریں گے۔ آؤ ہم دو دو ہاتھ کر لیتے ہیں۔ طاقت کی آزمائش کا وہی صدیوں پرانا طریقہ۔ تم اسی وقت اسی جگہ اپنے ارمان نکال لو۔" میں نے مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کر کے اسے اپنے اوپر حملہ کرنے کی دعوت دی مگر اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے مجھے گھورتا رہا۔

"شاید تمہاری کھوپڑی میں یکدم ہی تھوڑی بہت عقل سرایت کر گئی ہے۔" میں نے بدستور چڑانے والے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "اچھا ہی ہوا تم جوش میں نہیں آئے۔ میں تمہارا چوبھگا نہ نہیں چاہتا کیوں کہ تم جینگل کرل" کے ہیرو ہو اور اس فلم کا شیڈول پہلے ہی بہت مختصر ہے۔ میں چاہتا ہوں حد واقعی کم سے کم مدت میں مکمل ہو جائے۔ تمہارا چوہا کر میرے ہاتھوں بگڑا تو

تم بڑے سے بڑے میک اپ مین کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے بعد بھی کیمرے کے سامنے آنا پسند نہیں کرو گے۔"

"تمہیں "جنگل گرل" کے مکمل ہونے یا نہ ہونے سے کیا دلچسپی ہے؟" ارشد موتی آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولا "تم تو اس کے فائنانسر نہیں ہو۔"

"انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہے پیارے فلمی ٹارزن!" میں نے گہری سانس لے کر کہا "اس کا ڈائریکٹر راحیل بٹ مجھے شریف آدمی لگا ہے۔ اگر فلم جلدی مکمل نہ ہوئی تو اس کا نقصان ہو جائے گا۔ اس کی ہیروئن ستارہ میری دوست ہے۔ فلم کی تکمیل میں تاخیر ہوئی تو وہ بھی خواہ مخواہ اپ سیٹ ہو گی۔ وہ کم فلمیں سائن کرتی ہے اور اپنی فلموں کے بارے میں بڑی حساس ہے۔ وہ دوسری ہیروئنوں سے بڑی مختلف ہے۔"

ہماری گفتگو کچھ طول کھینچ گئی تھی۔ اس دوران تیسرا پہلوان جو چارپائی پر بیٹھا تھا اور جس کا ایک ہاتھ رائفل پر ہی تھا' غالباً اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ سب کا دھیان اس کی طرف سے ہٹا ہوا ہے۔ اس نے نہایت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رائفل اٹھانے اور ٹریگر دبانے کی کوشش کی مگر اس کی بھی یہ حسرت پوری نہیں ہو سکی۔ رائفل اس کے ہاتھ سے بھی نکل گئی اور اس کے بھی دائیں ہاتھ میں عین اسی جگہ سوراخ ہو گیا جہاں پہلے دو پہلوانوں کے ہوا تھا۔ ٹونی آج شاید ہاتھوں میں سوراخ کرنے کا کوئی ریکارڈ قائم کرنے پر تلا ہوا تھا۔

اس بار گولی مہ پارہ مشہدی کے عین قریب سے گزری تھی اور وہ دہشت زدہ سی ہو کر چارپائی پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ اس کے قریب بیٹھے ہوئے پہلوان نے اپنا زخمی ہاتھ دوسرے ہاتھ میں دبا کر بری طرح کراہنا شروع کر دیا تھا۔ ارشد موتی ایک بار پھر اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے ہوئے تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے اپنے ساتھی پر زیادہ غصہ آ رہا تھا یا ٹونی پر؟

"میرا خیال ہے آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اب ہم چلتے ہیں۔" میں نے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ میں نے جان بوجھ کر کچھ اسی انداز سے یہ الفاظ ادا کئے تھے جیسے ہم کسی ٹی پارٹی میں آئے ہوئے تھے' جہاں بہت اچھا وقت گزرا تھا اور اب میں میزبانوں سے اجازت طلب کر رہا تھا۔

میں بے پروائی سے مڑا اور سیڑھیوں کے دروازے کی طرف چل دیا۔ ارشد موتی کی طرف سے مجھے ایک آخری کوشش کی توقع تھی لیکن میرا اندازہ اس وقت غلط ثابت ہو گیا جب ارشد موتی کے بجائے اس پہلوان نے اچانک مجھ پر چھلانگ لگائی جس کے ہاتھ پر سب سے پہلے گولی لگی تھی۔ ہاتھ زخمی اور جسم کسی پلے ہوئے سانڈ کی طرح بھاری بھرکم ہونے کے باوجود اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے درحقیقت مجھے ڈھال بنانے کی کوشش کی تھی اور اس حد تک وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا کہ ٹونی یا شبیر شیخ نے فوری طور پر گولی نہیں چلائی۔

اسی ثانیے ارشد موتی بھی حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری آڑ میں ہو چکا تھا۔ پہلوان نے مجھے عقب سے بازو کے شکنجے میں لینے کی کوشش کی اور ارشد موتی نے جھک کر میری ٹانگیں پکڑنے کی کوشش کی۔ اس دوران ٹونی اور شبیر کی سیون ایم کی گنیں گرجیں۔ شاید موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلوان نے رائفل اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

میں نے ارشد موتی کے منہ پر الٹی کک رسید کی اور پہلوان اپنی کمر پر لاد کر سامنے فرش پر دے مارا۔ فرش چوں کہ میڈیم گارزن اسکوائر کے رنگ کا نہیں تھا جس پر ٹھوس ربڑ کی موٹی بچھی ہوتی ہے اس لئے پہلوان کسی ریسلنگ چیمپئن کی طرح فوراً نہیں اٹھ سکا۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ گویا کمر درد سے ٹھوس فرش سے چپک کر ہی رہ گیا۔

اس دوران ارشد موتی سنبھل کر دوبارہ مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبا سا خنجر تھا۔ ٹونی یا شبیر نے اب بھی غالباً اس لئے فائر نہیں کیا کہ میرے بھی گولی کی زد میں آنے کا اندیشہ تھا۔ باقی لوگوں کو یقیناً انہوں نے کور کیا ہوا تھا کیوں کہ کسی اور نے حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ارشد موتی نے غالباً عجلت اور بدحواسی میں نہایت احمقانہ طریقے سے خنجر میری پسلیوں میں گھونپنے کی کوشش کی۔ میں نے جھکائی دیتے ہوئے اس کی گردن پر ہلکا سا ہاتھ رسید کیا۔ وہ ساتھی پہلوان پر جا پڑا جو اس دوران اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بے چارہ دوبارہ ڈھیر ہو گیا اور ارشد موتی کا خنجر اس کی پسلیوں میں پیوست ہوتے ہوتے رہ گیا۔

میں نے ان دونوں کو دو چار تسلی بخش قسم کی ٹھوکریں دیں کیں جنہوں نے ان دونوں ہی کو اٹھنے سے باز رکھا لیکن ارشد موتی سانپ کی طرح پھنکار کر پلٹا اور پوری طرح کھڑے ہونے سے پہلے ہی اس نے اندھا دھند خنجر ہوا میں میں نے اس کے وار سے بچتے ہوئے یکدم اس کی کلائی گرفت لے لی۔

دوسرے بازو کا شکنجہ میں نے اس کی گردن کے گرد اس کی کلائی پر میں نے بتدریج دباؤ بڑھانا شروع کیا اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ وہ کسمسا رہا تھا رہا تھا اور میری گرفت سے نکلنے کے لئے پوری طاقت صرف تھا۔ وہ بلاشبہ ایک طاقتور آدمی تھا لیکن میری گرفت سے کے بس کی بات نہیں تھی۔

میں اسے کھینچ کر فرش پر پڑے ہوئے پہلوان سے ذرا گیا تھا تاکہ کہیں وہ میری ٹانگ نہ کھینچ لے۔ پہلوان جرأت اور ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک بار پھر اٹھنے کی لیکن اب چوں کہ اس پر فائر کرنے کی صورت میں میں

ہونے کا اندیشہ نہیں رہا تھا اس لئے ٹونی نے اس پر محض وارننگ کے طور پر ایک گولی چلا دی جو اس کی ناک کو چھوتی ہوئی گزری۔ وہ یکدم اپنی جگہ پر دوبارہ چت ہو گیا اور مضحکہ خیز سے انداز میں آنکھیں پٹ پٹانے لگا۔

میری گرفت میں ارشد موتی کے چہرے کی رگیں بری طرح پھول چکی تھیں اور اسے سانس لینے میں سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اس بڑے سے چقندر سے مشابہ نظر آنے لگا تھا جو کسی نامعلوم وجہ کے تحت پھٹنے کے قریب تھا۔ اس کا جو بازو آزاد تھا اس سے اس نے میرے بازو کا شکنجہ ڈھیلا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ طاقت بھی صرف کی تھی' ناخنوں سے میرا بازو ادھیڑنے کی بھی سعی کی تھی اور الٹے رخ سے میرے پیٹ میں کہنی سے ضربیں لگانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن اس کی یہ کوششیں اسی طرح بے سود رہی تھیں جیسے کوئی ننھا بچہ کسی بڑے کی گرفت میں آنے کے بعد اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے مچلتا ہے' ہاتھ پاؤں مارتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔

چند لمحے بعد ہی اس کی طاقت جواب دینے لگی اور وہ بے دم سا ہونے لگا۔ میں نے اس کی گردن پر دباؤ ذرا سا اور بڑھاتے ہوئے کہا "اسی حالت میں کھڑے کھڑے تمہارا انتقال بھی ہو سکتا ہے۔ اور اگر تمہیں عالم بالا پر جانے کی جلدی ہو تو اسی لمحے ایک جھٹکے سے تمہاری گردن ٹوٹ سکتی ہے۔ میرا خیال ہے تم اس کے مستحق بھی ہو لیکن میں ایک بار پھر تمہیں یقین دلا رہا ہوں کہ صرف وہ معمولی سی فلم "جنگل گرل" تمہارے زندہ رہنے کا بہانہ بن گئی ہے۔ اگر اس فلم میں تمہارا کام مکمل ہو چکا ہوتا تو شاید آج تمہاری زندگی کی فلم کی بھی آخری ریل چل جاتی۔ ایک بار پھر تمہیں محض اس لئے چھوڑ رہا ہوں کہ تم "جنگل گرل" میں اپنا کام مکمل کرا سکو۔ ورنہ آدمی تم بہت کمینے ہو اور زندہ رہنے کے مستحق نہیں ہو۔ میں اچھا بھلا تمہیں چھوڑ کر جا رہا تھا مگر تمہیں اپنی طاقت کے مظاہرے کا جو شوق چڑھا ہوا ہے وہ کسی طرح کم ہونے میں نہیں آ رہا۔ اگر میں یا میرے ساتھی بھی غیر ضروری خونریزی کے شوقین ہوتے تو اس وقت یہاں تم سب کی لاشیں پڑی ہوتیں۔"

میں نے جب یہ محسوس کیا کہ اس کے کس بل نکل چکے ہیں اور وہ زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے کے قابل نہیں رہا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ دھب سے فرش پر گر پڑا اور منہ پھاڑ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ ہال میں گہرا سکوت طاری تھا۔ اس کی سانسوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

تینوں زخمی پہلوان عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ چوتھا پہلوان بدستور ہال کے وسط میں رسہ تھامے ساکت و صامت کھڑا تھا۔ وہ ایک مضحکہ خیز بت نظر آتا بشرطیکہ اس کی توند پھول پچک نہ رہی ہوتی۔ اس نے اب تک کی چھوٹی موٹی سی کشمکش میں ہاتھ تک ہلانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ معلوم نہیں یہ کس قسم کے پہلوان تھے جو پہلوانی کی اعلیٰ و ارفع روایات کو ترک کر کے بھنگ' افیم اور چرس کے رسیا بنے ہوئے تھے۔ میں نے ایسے تو کئی پہلوانوں کو دیکھا تھا جو اس قسم کی چیزوں کے دھندے چلواتے تھے۔ اپنے ڈیرے پر طرح طرح کے کاروبار کراتے تھے۔ معاوضے پر مختلف خدمات انجام دیتے تھے لیکن وہ عموماً خود منشیات کے رسیا نہیں ہوتے تھے مگر یہ لوگ تو گویا بالکل ہی گئے گزرے تھے۔

مہ پارہ مشہدی کو دیکھ کر بھی مجھے خفیف سی حیرت ہوئی۔ وہ نہ جانے کب چارپائی سے اتر کر اکڑوں بیٹھ چکی تھی۔ چہرہ زرد تھا۔ غالباً اس کا ارادہ یہی تھا کہ زیادہ زور شور سے گولیاں چلنے لگیں تو چارپائی کے نیچے گھس جائے گی۔ اس کا چرمی بیگ چارپائی پر پڑا تھا مگر اس نے اس میں سے پستول نکالنے کی قطعاً کوشش نہیں کی تھی۔

میں نے ارشد موتی کو ہلکی سی ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔ "ایک آدھ دن میں تم شوٹنگ میں حصہ لینے کے قابل ہو جاؤ گے۔ اس دوران تمہیں سب سے ضروری کام یہ کرنا ہے کہ یہاں سے یہ اڈہ ختم کرنا ہے۔ کل سے یہاں نہ تو تمہارا کوئی آدمی موجود ہونا چاہئے اور نہ ہی تمہارا کوئی دھندا چلنا چاہئے۔ پرسوں میرے آدمی آ کر چیک کریں گے۔ اگر یہاں تم لوگوں کی موجودگی کے کوئی آثار ہوئے تو اس جگہ کو بم سے اڑا دیا جائے گا۔ جس کسی کی یہ پراپرٹی ہو گی اس کا نقصان میں خود پورا کر دوں گا۔"

میں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ ٹونی اور شبیر شیخ نے اس وقت تک اپنی جگہ نہیں چھوڑی جب تک میں ان کے درمیان سے گزر کر اوپر نہیں آ گیا۔ پینڈا اپنی چارپائی پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کا ایک بازو چارپائی سے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ اس کی کنگ سائز کھوپڑی پر کان کے قریب خاصا نمایاں ابھار نظر آ رہا تھا اور کھال تھوڑی سی پھٹی ہوئی تھی۔ اس کی رائفل بدستور چارپائی کے سہارے کھڑی ہوئی تھی۔ ٹونی نے اسے بھی وہاں سے ہٹانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

میری مرسیڈیز اس نامکمل کوٹھی کے قریب ہی کھڑی تھی جبکہ ٹونی اور شبیر شیخ اپنی سفید فورڈ کیپری وہاں سے کافی دور درختوں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ کے عقب میں چھوڑ آئے تھے۔ وہ مکان سے نکل آئے تو میں نے انہیں انہی کی گاڑی کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اچانک ٹونی تیزی سے چیتے کی طرح پلٹا اور ایک بار پھر اس نے گن سیدھی کر لی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ مہ پارہ مشہدی مکان سے نکل رہی تھی مگر وہ پہلے ہی دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھی اور اس کا بیگ بھی اس کے پاس نہیں تھا۔

"سر!" اس نے دور سے ہی چلا کر مجھے مخاطب کیا "میں کچھ بھی نہیں کروں گی۔ مجھ میں تو اتنی جرأت ہی نہیں ہے۔ میں تو بس آپ سے ایک منٹ بات کرنا چاہتی ہوں۔ بہت ضروری بات۔"

میں نے ٹونی اور شبیر کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی گاڑی کی طرف چلے جائیں۔ وہ لڑکی کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں تھی۔ وہ پیٹھ موڑ کر آرام سے آپس میں باتیں کرتے ہوئے چل دئے اور مہ پارہ مشہدی میرے قریب آگئی۔ میں گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

وہ گلابی ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی "سر! میری ایک درخواست تھی۔۔۔ آپ مجھے اپنے گینگ میں شامل کرلیں۔ میں آپ کے بہت کام آسکتی ہوں۔"

"مثلاً؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مثلاً بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات پیدا کرنا۔ اہم سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں کو مٹھی میں کرنا۔ اس کے علاوہ میں کیریئر کے فرائض بھی انجام دے سکتی ہوں۔ باہر سے کوئی مال لے کر آسکتی ہوں یا یہاں سے لے کر جاسکتی ہوں۔ اس کے علاوہ میں فائٹر کے طور پر بھی اتنی نکمی نہیں ہوں جتنی آج آپ کو نظر آئی ہوں۔ آج تو مجھے نہ جانے کیا ہوگیا تھا ورنہ تو میں خاصی کام کی چیز ہوں۔ اور بھی جو خدمت آپ کہیں گے میں بجالاؤں گی۔ آپ کچھ عرصے کے لئے مجھے آزما کر تو دیکھیں۔"

وہ بڑے جوش و خروش سے مجھے قائل کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ مجھے ہنسی آگئی۔ وہ مزید پُرجوش لہجے میں بولی "سر! آپ یہ مت سمجھیں کہ میں کوئی چکر چلانے کی کوشش کررہی ہوں یا ارشد موتی نے مجھے سکھا پڑھا کر بھیجا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے سر۔ موتی تو ابھی تک وہیں پڑا ہے۔ اٹھنے کے قابل بھی نہیں ہوسکا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک منٹ آپ کی گرفت میں رہ کر اس کا یہ حال ہوجائے گا۔ سر! میں نے اپنے طور پر ہی آپ سے یہ درخواست کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ مجھے ایک بار ضرور آزمائیں۔ مجھے بہت تجربہ ہے ہر قسم کے کاموں کا۔"

میں ایک بار پھر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اس کے انداز سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا "تمہیں کیوں کر خیال آیا کہ تم میرے کام آسکتی ہو؟"

"سر! ظاہر ہے آپ زیرِ زمین دنیا کے کوئی بہت بڑے آدمی ہیں۔ بہت مضبوط گینگ ہوگا آپ کا۔ تبھی تو آپ نے موتی اور اس کے آدمیوں کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی اور انہیں محض انگلیوں کے اشاروں سے بے بس کرکے رکھ دیا۔ ظاہر ہے آپ جیسے لوگوں کے ہاں مجھ جیسی لڑکیوں کی گنجائش تو نکلتی ہی رہتی ہے نا۔ بلکہ گنجائش نہ ہو تب بھی پیدا کرلی جاتی ہے۔"

"دیکھو بے بی!" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "ممکن ہے تمہاری باتیں اپنی جگہ درست ہوں لیکن تمہارے' میرے بارے میں اندازے درست نہیں ہیں۔ میرا کسی زیرِ زمین دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا کوئی گینگ نہیں۔ میں تو اس شہر کا ایک عام معمولی اور شریف سا آدمی ہوں۔"

"عام' معمولی اور شریف آدمیوں کے پیچھے اس طرح ماہر اور مسلح قسم کے محافظ ہر جگہ آتے ہیں کیا؟" اس نے ٹونی اور شبیر کی طرف اشارہ کیا جو ابھی اپنی گاڑی تک نہیں پہنچے تھے۔

"وہ پیشہ ور محافظ نہیں' میرے جاں نثار دوست ہیں۔ اس دنیا میں صرف دوست بنانے چاہئیں۔ جو کام دوست کرسکتے وہ گروہوں کے پیشہ ور کارکن نہیں کرسکتے۔" میں نے ملائمت سے کہا "مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ تم ابھی وفا اور وابستگی کی آزمائشوں سے گزر کر کندن نہیں بنی ہو۔ میں نے تم جیسی بھٹکی لڑکیوں کو اہم لوگوں کے پاس بھیج کر کبھی اپنے کام نکلوانے کی کوشش نہیں کی۔ اول تو میرے کام کہیں اٹکے ہوئے ہی نہ ہوتے اور اگر ہوں بھی تو اپنے کام نکلوانے کے میرے اپنے ہی طریقے ہیں۔ بہرحال یوں گلی لپٹی رکھے بغیر اظہارِ مدعا کا تم کا انداز مجھے پسند آیا۔"

"سر! آپ مجھے ادھر اُدھر کی باتوں میں مت ٹالیں۔" وہ دلربائی سے مسکرائی "مجھے ان لوگوں کے ساتھ کام کرنے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔" وہ پیچھے کوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "معاوضہ بھی بہت اچھا مل رہا ہے۔ معاملہ ارشد موتی کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن میں ان پہلوانوں سے بڑی تنگ ہوں۔ موتی تو لا پندرہ بیس پہلوانوں پر مشتمل ہے اور یہ سب کے سب نکمے ہیں۔ مگر ہیں چربی بھنگی۔ اپنا حلیہ تک ٹھیک نہیں رکھتے۔ ان سے بعض کے جسموں سے تو بکروں جیسی بو آتی ہے۔"

"تم انہیں اتنے قریب آنے کا موقع مت دیا کرو تاکہ اس محسوس کرنے کی نوبت آئے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کب موقع دیتی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی "لیکن ان کا چلے تو ان میں سے ہر ایک میری ہڈیاں تک چبا جائے۔ ارشد کے احکامات کی بھی وہ کوئی خاص پروا نہیں کرتے۔ ان کے ہاں ڈسپلن نہیں ہے۔"

"حیرت کی بات ہے! تم اچکوں میں ڈسپلن ڈھونڈ رہی ہو۔" میں نے حقیقتاً حیرت سے کہا۔

"برے سے برے کام کو بھی سرانجام دینے کا کوئی طریقہ کچھ اصول ہونے چاہئیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

میری نظر نامکمل کوٹھی کی طرف بھی تھی لیکن ابھی تک اس سے کوئی برآمد نہیں ہوا تھا۔ کسی نے مہ پارہ کی تلاش میں بھی آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مہ پارہ مجھے کوٹھی کی طرف متوجہ پاکر بولی "یہ کوٹھی بھی ارشد موتی کی اپنی ہے۔ میرا خیال ہے تم اسے یہ ٹھکانا چھوڑنے کا حکم دے دیا ہے۔ وہ بہت پریشان ہوگا۔ وہ تو عنقریب اسے مکمل کرانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔"

"اچھا ہوا تم نے بتادیا۔ اسے تو میرا شکر گزار ہونا چاہئے۔ میں نے اسے اتنی سزا نہیں دی جتنی سزا کا وہ مستحق ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔" میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے ٹونی اور شبیر درختوں کے عقب میں غائب ہوچکے تھے۔ غالباً وہ

میں بیٹھ چکے تھے۔

مہ پارہ دم بخود سی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی تھی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "بے بی! میری دلی خواہش تھی کہ میں آپ کے ساتھ چلتی۔"

"خوبصورت بے بی!" میں نے آہستگی سے اس کا گال تھپتھپایا "ہم ذرا مختلف طرح کے لوگ ہیں۔" میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آہستگی سے آگے بڑھائی۔ کچھ آگے نکل آنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ وہاں میں ہاتھ دئے وہیں کھڑی تھی۔ اس کے بھورے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور اس کے چہرے پر زمانے بھر کی اداسی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ میرا حتمی انکار سن کر وہ غصے میں کسی پتھر وغیرہ کو ٹھوکر مارے گی' حقارت سے زمین پر تھوکے گی اور پاؤں پٹختی ہوئی واپس چلی جائے گی مگر وہ وہیں بت بنی کھڑی تھی۔ عجیب سی لڑکی تھی۔ اس نے مجھے تھوڑا سا حیران کردیا تھا۔ تاہم میں رکا نہیں۔

ایک موڑ کاٹنے کے بعد میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ ٹونی اور شبیر کی گاڑی کافی فاصلہ رکھتے ہوئے میرے پیچھے آرہی تھی۔ تقریباً ایک میل کے بعد گارڈن ٹاؤن کا آباد علاقہ شروع ہوا جہاں دو رویہ خوب صورت اور طویل و عریض بنگلوں کی قطاریں تھیں تاہم سڑکوں پر ویرانی تھی۔

گلبرگ کا علاقہ شروع ہونے سے کافی پہلے میں نے سڑک کے ایک طرف کچے میں ایک شخص کو مشتعل سے انداز میں چلتے دیکھا۔ وہ قدرے مفلوک الحال سا آدمی تھا۔ غالباً اسی طرح سڑک کے کنارے کنارے کافی دور سے کچے میں ہی چلا آرہا تھا۔ کیوں کہ اس کے نیم شکستہ جوتوں سے بھی ذرا اوپر تک دھول جمی ہوئی تھی۔ بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوا جارہا تھا۔ شاید اسے بس یا ویگن کی تلاش تھی مگر کسی پبلک ٹرانسپورٹ کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ گرمیوں کے موسم کے ابھی دور دور تک آثار نہیں تھے مگر وہ دھوپ میں نہ جانے کتنی دور سے پیدل چلا آرہا تھا کہ اس کے چہرے پر پسینہ دور سے چمکتا نظر آرہا تھا۔ وہ دبلا پتلا' سانولا اور دراز قد تھا۔ چہرے پر پریشانی اور مایوسی رقم تھی۔ یہ چہرہ مجھے کچھ شناسا سا لگا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں نے اس چہرے کو یاد رکھنے کے لئے اس تصویر اپنے ذہن کے کمپیوٹر میں کیس ڈالی تھی۔ میں نے رفتار بالکل کم کرلی اور ذہن پر ذرا زور دیا۔ کمپیوٹر کے کسی نہاں خانے سے کھٹ سے وہ تصویر برآمد ہوگئی۔ مجھے یاد آگیا۔ میں نے اس شخص کو علمی مصنف نصیر نواز کے ساتھ ملتان روڈ کے ایک ریستوران سے نکلتے دیکھا تھا اور دونوں کے درمیان کسی موضوع پر گرما گرم بحث ہورہی تھی۔ پھر یہ شخص ایک بس میں ٹک گیا اور نصیر نواز اپنی خوب صورت گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ اور نصیر نواز ایک ایسا شخص تھا جو پہلی ملاقات سے ہی میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔

میں نے گاڑی اس شخص کے قریب لے جارکی۔ وہ بری طرح ٹھٹک کر رہ گیا۔ گاڑی کے شیشے رنگین تھے اور وہ آنکھیں سکیڑے اندر دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ ان آنکھوں میں گو کہ یاسیت تھی مگر اس یاسیت کی تہ میں ذہانتوں کے برباد خرابے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ آنکھیں ایسی ہی تھیں جیسے اس کی ذات کے کھنڈر میں دو قمقمے کبھی جل اٹھتے ہوں اور کبھی بجھ جاتے ہوں۔

میں نے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر قدرے جھکتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا "آپ کو کہاں جانا ہے؟ آیئے میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔"

اس نے میرے چہرے پر شناسائی کی کوئی رمق تلاش کرنے کی کوشش کی اور اس میں ناکام ہونے کے بعد قدرے خوف زدہ سا نظر آنے لگا۔ وہ خاصا اعصاب زدہ اور کمزور سا آدمی نظر آتا تھا۔ پیشانی اور گردن کی نسیں ابھری ہوئی تھیں۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ تھوک نگل کر بولا "نہیں۔۔۔ نہیں شکریہ۔ میں چلا جاؤں گا۔ ابھی بس آجائے گی۔"

"ارے حضور! بیٹھ جایئے۔ ان علاقوں میں بس خوش نصیبوں ہی کو ملتی ہے۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "آپ اتنا خوف زدہ کیوں نظر آنے لگے ہیں؟ قبلہ! نہ تو میں ڈاکو لیٹرا یا چور اچکا ہوں اور نہ ہی آپ کوئی ایسے سرمایہ دار نظر آرہے ہیں کہ راستے میں میرے ہاتھوں آپ کے لٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کوئی جنونی قاتل بھی نہیں ہوں اور نہ ہی آپ کوئی البیلی حسینہ ہیں کہ میں آپ کو اغوا کرکے قتل کردوں گا۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں جناب! یہ بات نہیں۔" وہ قدرے کھسیانا نظر آنے لگا۔ پھر اس نے ایک نظر اپنے سراپا پر اور ایک گاڑی پر ڈالی اور بہت دھیمے لہجے میں بولا "میرا حلیہ اس قابل نہیں ہے کہ میں اتنی شاندار گاڑی میں سفر کروں۔ آپ دیکھ رہے ہیں' میرے جوتے مٹی میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ آپ کی گاڑی کے خوب صورت کارپٹ پر نشان نہ پڑجائیں۔ میں پسینے میں شرابور ہوں۔ آپ کی گاڑی کی مخملیں سیٹ پر نشان نہ پڑجائیں اور اس کے اندر کے خنک اور معطر ماحول میں میرے پسینے کی بو بدمزگی نہ پیدا کردے۔" اس نے اپنے لہجے میں تہذیب و شائستگی کی ملائمت برقرار رکھنے کی پوری پوری کوشش کی تھی لیکن اس ملائمت کی تہ میں کسی زہر کی کڑواہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ میں اندازہ نہیں کرسکا کہ یہ تلخی' یہ زہریلا پن میرے لئے تھا' کسی اور کے لئے یا پھر سارے دولت مندوں کے لئے۔

"بعض لوگ ان چھوٹی موٹی چیزوں پر پڑنے والے داغوں کی پروا نہیں کرتے لیکن وہ روح پر پڑے ہوئے داغوں کا جائزہ لینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔" میں نے اب بھی خوشگوار لہجے میں کہا۔

"اب بحث چھوڑیئے اور آجایئے۔ اتنا اصرار اگر میں تنہا جاتی ہوئی کسی حسینہ سے کرتا تو وہ بھی گاڑی میں آن بیٹھتی۔"

اس کے خشک لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ مدھم سی آواز میں بولا "جی ہاں..... بلکہ جس قبیل کی حسیناؤں کی طرف آپ کا اشارہ ہے وہ تو اصرار کی نوبت بھی نہیں آنے دیتیں۔ گاڑی رکتے ہی بیٹھ جاتی ہیں۔ خصوصاً جبکہ گاڑی روکنے والا آپ جیسا خوبرو ہو اور تنہا بھی۔" وہ پاؤں سڑک پر جھاڑنے کی کوشش کرنے کے بعد گاڑی میں آبیٹھا۔

"تعریف کا بھی شکریہ اور لفٹ قبول کرنے کا بھی۔" میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے پشتے سے ٹیک لگا کر ایک طویل سانس لی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "آپ زندگی میں پہلے آدمی ملے ہیں جو میرے حصے کا بھی شکریہ ادا کر رہے ہیں۔"

"زندگی باقی رہنی چاہئے۔ لوگ تو ہر طرح کے ہی مل جاتے ہیں۔ اچھے بھی' برے بھی۔ مہرباں بھی نامہرباں بھی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کچھ لوگ جلدی مل جاتے ہیں اور کچھ لوگ تاخیر سے۔" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"درست کہا آپ نے۔ لیکن شاید کچھ لوگ بہت جلدی مل جاتے ہیں اور کچھ بہت ہی زیادہ تاخیر سے۔" وہ مسکرایا۔ اب وہ کچھ پُرسکون نظر آرہا تھا۔

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر ذہن پر زور دینے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے آپ کو نصیر نواز کے ساتھ کہیں دیکھا ہے۔ غالباً دوست ہے وہ آپ کا؟"

میں نے محسوس کیا کہ گاڑی میں بیٹھ کر اس کے اعصاب کو جو تھوڑا بہت سکون ملا تھا وہ یک لخت رخصت ہوگیا اور اس کے جسم میں ایک عجیب سا تناؤ آگیا۔

"کون نصیر نواز؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ انجان بننے کی یہ کوشش خاصی اچھی تھی لیکن میرے سامنے بے اثر تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے ایک ثانیے کے لئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے فوراً نظر چرالی۔

میں نے نظر دوبارہ سڑک پر مرکوز کرتے ہوئے کہا "نصیر نواز کے ساتھ نظر آنا کوئی جرم تو نہیں جسے چھپانے کی کوشش کی جائے۔"

وہ ایک لمحے خاموش رہا۔ وہ پوری پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کے اندر جو نامعلوم سی کشمکش جاری ہے اس کی جھلک چہرے پر نہ آنے پائے۔ غالباً اس نے لفٹ قبول کرنے پر پچھتانا بھی شروع کردیا تھا۔ شاید اس کا بس چلتا تو چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دیتا مگر اس میں اس کی بھی جرأت نہیں تھی۔ وہ ان شریف آدمیوں میں سے معلوم ہوتا تھا جن کی شرافت اور بزدلی کے درمیان بہت ہی باریک سی لکیر حائل ہوتی ہے۔

"آپ نصیر نواز سے اپنی شناسائی کے معاملے میں بہت ... یا پھر شاید بہت خوف زدہ معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے ملا ... کہا "کیا اس میں کوئی بھید ہے؟ کوئی راز ہے؟"

"مجھے جان لینا چاہئے تھا کہ آپ نے مجھے خواہ مخواہ ... نہیں دی..... اس دنیا میں کوئی چھوٹا سا بھی احسان بے سبب ... کرتا۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

"آپ کوئی بات کریں یا نہ کریں' میں آپ کی منزل ... کو ضرور چھوڑ کر آؤں گا۔" میں نے گہری سانس لیتے ہو...

"نصیر نواز کے ساتھ آپ کو دیکھنے کی بات تو مجھے یونہی یاد ... میرا آپ کو کریدنے کا کوئی خاص مقصد نہیں ہے اور نہ ہی ... سے زبردستی کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایک غیر متعلق ... ہوں۔ میں تو یونہی دوستی اور قدرے بے تکلفی کا ماحول ... کے لئے یہ تذکرہ چھیڑ بیٹھا تھا۔ بلکہ آپ کے انکار نے ... تجسس کردیا ہے۔ آپ مجھے کچھ پریشان حال معلوم ہوتے ... آپ مجھے دوست سمجھ کر کچھ کھل کر بات کریں تو شاید میں ... کچھ کام آسکوں۔"

میرے الفاظ سے اس کا کچھ حوصلہ تو بندھا لیکن شا... جلدی کسی پر اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ معلوم ... کس کا ڈسا ہوا تھا۔ مسکراتے ہوئے بولا "کچھ پتا نہیں ... کون کس کا دوست ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ جسے آپ ... سمجھیں وہ کسی دشمن جاں کا دوست ہو۔"

"ہاں یہ تو عین ممکن ہے۔" میں نے تسلیم کیا "لیکن ... ایک اچھے اور سچے آدمی ہیں تو آپ مجھے اپنے اچھے ... دوستوں میں شمار کرسکتے ہیں۔"

وہ پشتے سے ٹیک لگائے چند لمحے گہری گہری سانسیں ... میں بہت ہی سست رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے ... بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا تھا کہ کس طرف چلنا ہے ... میں نے کچھ پوچھا تھا۔

"مجھ سے پہلے آپ بتایئے کہ آپ نصیر نواز کو ... ہیں؟" آخر کار وہ بولا۔ وہ اب زبان کھولنے پر کچھ آمادہ ...

"میں اسے کچھ زیادہ نہیں جانتا۔" میں نے آہستہ ...

"بس اتفاقاً ہی فلم انڈسٹری سے میرا کچھ غائبانہ سا تعا... ہوگیا ہے اور اتفاقاً ہی اس شخص نصیر نواز سے میری ... آشنائی ہوگئی ہے۔ اور نہ جانے کیوں میں اس کے بار... کچھ جاننے کے لئے متجسس ہوگیا ہوں۔"

"کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہے جناب! انسان یو... بارے میں متجسس نہیں ہوجاتے۔" وہ ہچکچاتے ہوئے ... دل مجھ پر اعتبار کرنے کو بھی چاہ رہا تھا لیکن ساتھ ہی ... ہوا سا بھی تھا یا پھر شاید وہ حد سے زیادہ محتاط تھا۔

"بات یہ ہے عزیز محترم!" میں نے گہری سانس ...

... عرصے سے مجھے احساس ہونا شروع ہوا ہے کہ قدرت نے ... مجھے روپے پیسے سے نوازا ہے وہاں کچھ غیر معمولی ذہن اور ... جسمانی صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے جن سے ابتدا میں' میں خود بھی ... بے خبر رہا ہوں۔ جسمانی طاقت کے معاملے میں قدرت کی مہربانی مجھ ... پر یہ ہے کہ بظاہر جو لوگ مجھ سے بھی کہیں زیادہ جسیم اور طاقت ور ... نظر آتے ہیں ان کے لئے بھی مجھے مغلوب کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ... اس کے برعکس اگر میں انہیں گرفت میں لے لوں تو چند ہی لمحے میں ... ان کی حالت نچڑے ہوئے آم کی سی ہوجاتی ہے یا وہ میرا ایک آدھ ... گھونسا کھا کر ہی ڈھیر ہوجاتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے ... جیسے میرے اندر کوئی جن مقید ہے۔ ذہنی صلاحیت کے معاملے میں ... عالم یہ ہے کہ میں ایک بار جس شخص سے ملتا ہوں چند ہی لمحوں میں ... اس کے باطن کی ایک تصویر سی میرے سامنے آجاتی ہے۔ یہ تصویر ... کبھی زیادہ واضح نہیں ہوتی' دھندلی ہی ہوتی ہے لیکن پھر بھی مجھے ... اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ شخص بنیادی طور پر کیا ہے۔ خواہ اس نے ... اپنی شخصیت پر کیسا ہی لبادہ کتنی ہی عمدگی سے چڑھا رکھا ہو۔ آپ ... میری باتوں کو محض لن ترانی سمجھ کر تو نہیں سن رہے؟" میں نے ... مسکراتے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔

وہ گویا کسی خیال سے چونکتے ہوئے بولا "آپ میری آنکھوں ... میں جھانک کر دیکھ سکتے ہیں کہ ان میں بے اعتباری کے سائے نہیں ... ہیں۔"

مجھے اس کی آنکھوں میں بھی جھانکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ... مجھے معلوم تھا وہ درست کہہ رہا تھا۔ میں نے محض رسماً ہی اس سے ... پوچھا تھا۔ اگر مجھے احساس ہوتا کہ وہ میری باتوں پر یقین نہیں کر رہا ... تو میں اس موضوع پر بات جاری ہی نہ رکھتا۔ میں کسی سے بھی اپنی ... ذات کے بارے میں باتیں کرنا زیادہ پسند نہیں کرتا تھا۔ قدرت جن ... جن خزانوں سے مجھے نواز رہی تھی انہیں میں اپنی ذات کے خول ... میں ہی چھپا کر رکھنا چاہتا تھا لیکن اس شخص کی زبان کھلوانا مجھے ... بہت مشکل نظر آرہا تھا۔ اس سے اس کے دل کی بات اگلوانے کے ... لئے اس کے سامنے خود بھی تھوڑا بہت کھلنا ضروری تھا۔

میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "میں جو نصیر نواز سے متعارف ہوا تو میرے دل نے کہا کہ یہ شخص ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی شخصیت کی عمارت کے کونے کھدروں میں ضرور کچھ مکروہ سے بھید چھپے ہوئے ہیں اور یہ نہ جانے کن کن چکروں میں الجھا ہوا ہے۔ ایسے لوگ مجھے اچھے نہیں لگتے جو اندر سے زہریلے سے ہوں۔ بس صرف اسی لئے میں اس کے بارے میں متجسس ہوں اور مزید کچھ جاننا چاہتا ہوں تاکہ میرے ذہن میں اس کے باطن کی جو دھندلی سی تصویر ابھری ہے وہ کچھ اور روشن' کچھ اور واضح ہوجائے۔"

وہ جھرجھری سے لے کر بولا "بہت ہی خوش ہوا آپ کی باتیں سن کر۔ دراصل کوئی بات کرنے سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ میں اپنے دوست سے بات کر رہا ہوں یا نصیر نواز کے دوست سے۔ اچھا یہ بتایئے میرے بارے میں آپ کا دل کیا کہتا ہے؟"

"آپ بنیادی طور پر حد سے زیادہ شریف اور حد سے زیادہ بزدل ہیں اور طویل عرصے سے کسی کشمکش' کسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ چوں کہ میں آپ کو نصیر نواز کے ساتھ دیکھ چکا ہوں اور آپ کے درمیان کچھ بحث و تمحیص سی بھی ہو رہی تھی اس لئے مجھے کافی امکان نظر آیا کہ شاید آپ کی مصیبت کا تعلق نصیر نواز کے ساتھ بھی ہو۔ ویسے میرا وجدان یہی کہتا ہے کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن پر زندگی ہمیشہ ہی نامہربان رہتی ہے۔ جو ہمیشہ طرح طرح کے مصائب میں گرفتار رہتے ہیں اور حالات کی چکی میں کسی نہ کسی زاویئے سے پستے ہی رہتے ہیں۔ تاہم میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایسا ان کی اپنی کمزوریوں اور حماقتوں کی وجہ سے ہوتا ہے یا ان کی تقدیر ہی کچھ ایسی ہوتی ہے۔ میں ابھی اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ ان معاملات میں کوئی فتویٰ صادر کرسکوں۔"

"آپ کا وجدانی تجزیہ بالکل درست ہے۔ اور اگر آپ مجھ سے میرے بارے میں رائے لیں تو میں یہی کہوں گا کہ اپنے بیشتر مصائب کا ذمے دار میں خود ہوں۔ قدرت نے مجھے بہت سی صلاحیتوں سے نوازا تھا لیکن نہ جانے کب اور کیوں کر میں محض حماقتوں' کمزوریوں اور بزدلی کا ایک الجھا ہوا سا جال بن کر رہ گیا۔ بالکل ناکارہ سا آدمی بن گیا۔ ردی کے پلندے کی طرح۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہاں سے موڑ لیجئے گا۔ انٹرکان کی بلند و بالا اور شاندار عمارت کے عقب میں ایک کچی بستی چھپی ہوئی ہے۔ وہیں میں رہتا ہوں۔ آپ مجھے باہر ہی اتار دیجئے گا۔ گلیوں میں تو یہ گاڑی نہیں جاسکے گی۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے گاڑی موڑتے ہوئے کہا "میں تو

رومانی ناول

دل کا آنگن	سلمیٰ رعنا	75/-
کالے کنول	سلمیٰ رعنا	75/-
اور دیا جلتا رہا	سلمیٰ رعنا	100/-
موج گرداب	سلمیٰ رعنا	100/-

مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2

آپ کے ساتھ جاسکوں گا۔ کیا آپ مجھے اپنے گھر لے جانا پسند کریں گے؟"

"آپ بہت تنگ ہوں گے جناب!" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا "وہاں گندی نالیاں ہیں۔ کچے پکے گھر ہیں۔ گلیوں میں کھیلتے ہوئے گندے سندے بچے ہیں۔ ویسے ہمیں خوش خبری سنادی گئی ہے کہ جلدی ہی وہ بستی پکی ہونے والی ہے۔ پھر اس کی حالت بڑی حد تک سدھر جائے گی۔ لیکن اس قابل شاید وہ پھر بھی نہ ہوسکے کہ آپ وہاں تشریف لاسکیں۔"

"میں تو خیر اتنا طویل انتظار بھی نہیں کرسکتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اور مجھے آج تک کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی جس کے بارے میں مجھے یہ خیال آیا ہو کہ وہاں میں تشریف نہیں لے جاسکتا۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ میں نے زندگی کو ہر رنگ ہر پہلو سے دیکھا ہوا ہے۔ اور ابھی تو اصل موضوع پر آپ سے بات ہی نہیں ہوئی۔ وہ باتیں آپ کے گھر پر ہی بیٹھ کر ہوں گی۔ گھر پر بات کرنے کا اپنا ایک لطف ہے۔ گھر چاہے کیسا بھی ہو، بہرحال گھر ہے۔"

اسٹرکان کے عقب میں پہنچ کر کئی گلیوں کی بھول بھلیوں میں گھومنے کے بعد آخر کار اس نے ایک ایسی جگہ گاڑی رکوالی جہاں سے آگے پیدل ہی جایا جاسکتا تھا۔ میں نے اتر کر دیکھا گلی کے موڑ پر نوٹی اور شبیر کی گاڑی بھی پہنچ چکی تھی تاہم وہ اترے نہیں تھے۔ میں نے غیر محسوس طور پر انہیں اشارہ دے دیا کہ انہیں میرے پیچھے آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔

میں اس شخص کے ساتھ چل دیا۔ وہ خاموش اور فکرمند سا نظر آرہا تھا۔ پھر اس نے بغور میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ شاید وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میں گردوپیش کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھا رہا ہوں یا نہیں۔ میں اطمینان سے چلا جارہا تھا۔ مجھے ایسی جگہوں پر جانے میں حقیقتاً کبھی کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ میرا بچپن اور لڑکپن جن گلی کوچوں میں گزرا تھا وہاں ان سے ذرا زیادہ کشادگی اور سبزہ ضرور تھا کیوں کہ وہ گاؤں کی گلیاں تھیں لیکن ماحول یہاں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔

"میں نے ابھی تک آپ کا نام ہی نہیں پوچھا۔" میں نے کہا۔

"سجاد نسیم۔" اس نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جواب دیا "اور..... کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ اس نے مزید کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ مزید چند قدم چلنے کے بعد وہ رک گیا۔ اس کا مکان دیگر مکانوں کی نسبت پھر بھی کچھ بہتر تھا۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے یوں دروازے پر دستک دی گویا اپنے نہیں، کسی اور کے گھر آیا ہو۔

دروازہ کیا کھلا گویا تاریک بادلوں کے عقب سے چاند طلوع ہوگیا۔ اتنا حسین چہرہ کم از کم یہاں دیکھنے کی مجھے توقع نہیں تھی۔ مگر یہ چاند چہرہ اداس تھا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ناامیدی دھندلاہٹیں پھیلی ہوئی تھیں، سرمئی شاموں نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا اس چہرے کی چاندنی کچھ زرد زرد سی تھی۔ اداس چاندنی تھی۔ اور ویران راتوں کی چاندنی!

اس کے بال سیدھے سادے انداز میں بنے ہوئے تھے ان میں چاندی کے تار جھلملا رہے تھے۔ لباس نہایت معمولی سادہ تھا مگر خدوخال کا حسن اس میں بھی نمایاں تھا۔ شاید وہ شعلہ رہی ہو مگر اب اس پر بجھی بجھی سی تہیں جما رہی تھی۔ اگر وہ راکھ تھی تو اب اس پر راکھ کی تہ جمنے لگی تھی۔

سجاد کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے پھر دوپٹہ درست کرتے ہوئے ایک طرف کو ہٹ گئی۔

"یہ..... میری بیٹی سارہ ہے۔" سجاد نسیم کے لہجے میں نہ جانے کیوں ارتعاش سا آگیا۔ جیسے وہ کسی جرم کا اعتراف کررہا ہو۔ اس کے چہرے پر صرف آنکھیں سجاد کی تھیں۔ موٹی موٹی آنکھیں۔ اور کسی بھی نقش میں سجاد کی کوئی مشابہت نہیں تھی ویسے بھی سجاد سانولا تھا اور لڑکی حد سے زیادہ گوری۔ ممکن ہے اس کی ماں ایسی رہی ہو اور وہ ماں پر ہی گئی ہو اور یہ بھی کچھ بعید نہیں تھا کہ خود سجاد رنگ روپ کے معاملے میں نوجوانی میں بہتر رہا ہو۔ بعض لوگ جوانی میں بہت کھلے کھلے ہوتے ہیں مگر مصائب کی دھوپ میں نامہرباں گلی کوچوں میں دھکے کھاتے کھاتے ان کا خدوخال پر ایسے رنگ چڑھ جاتے ہیں کہ اصل صورت پہچانی جاتی۔

لڑکی نے سرسری ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا اور جلدی سے چلی گئی۔ سجاد نے اسے میرے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں کھڑے تھے جو بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں چند کرسیاں اور تپائی تھی۔ اسی میں ایک دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا۔ سارہ دروازے سے اندر گئی تھی۔

"تشریف رکھئے" سجاد نے ایک بہتر کرسی کی طرف اشارہ کیا پھر ہاتھ ملتے ہوئے بولا "میری بیوی کئی برس سے بیمار ہے۔ عرصے سے وہ بستر پر ہے۔ میرا معمول ہے کہ باہر سے آتا ہوں تو سب سے پہلے اسے دیکھنے جاتا ہوں۔ اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو میں پہلے ایک نظر اسے دیکھ آؤں۔ پھر آپ کے پاس بیٹھتا ہوں۔"

"ضرور۔ ضرور" میں نے کرسی پر بیٹھ کر اطمینان سے کہا۔

وہ ممنونیت بھرے انداز میں سر ہلا کر اندر چلا گیا اور میں میں سکوت چھا گیا۔ باہر گلی میں کہیں دور لڑکے جھگڑتے بچوں کی سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن مکان کے اندر سے کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید مکان خاصا کشادہ تھا۔ سجاد سرگوشیوں میں اپنی بیوی اور بیٹی سے بات کررہا تھا۔

چند لمحے بعد وہ لوٹ آیا۔ اب قدرے مطمئن نظر آرہا تھا۔ میرے مقابل بیٹھتے ہوئے بولا "خدا کا شکر ہے، میری بیوی اس وقت تکلیف میں نہیں ہے۔"

"انہیں کیا بیماری ہے؟" میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"غربت بجائے خود سب سے بڑی بیماری ہے۔" وہ قدرے مسکراتے ہوئے بولا "سو بیماریوں کی جڑ ہے۔ جس طرح غربت کی وجہ سے معمولی سے زخم میں بھی انفیکشن ہوجاتی ہے اور ناسور بن جاتا ہے اسی طرح غربت کی وجہ سے بھی معمولی سے بیماریاں طول کھینچ کر کچھ سے کچھ ہوجاتی ہیں۔ خیر..." اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا "آپ ان باتوں کو چھوڑئے۔ یہ بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"میں آپ سے صرف نصیر نواز کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں اور اس سے آپ کے تعلق کے بارے میں بھی۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

اس نے نوٹی اتار کر گود میں رکھ لی اور سفید بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے چھت کو گھورنے لگا۔ چند لمحے بعد وہ بولا "نصیر نواز عجیب ہے جو کئی سال پہلے مجھ پر مسلط ہوگیا تھا۔ یا پھر شاید میں نے خود ہی اسے اپنے آپ پر مسلط کرلیا تھا۔ ہم کس طرح مسلط ہوئے اور کس طرح ہمارے مراسم بڑھے، یہ ایک طویل داستان ہے۔ میں اس کی تفصیل میں جاکر آپ کو بور نہیں کروں گا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ اس کی فلمی دنیا میں شناسائی تھی اور اسے لوگوں سے معاملت کرنے کا ہنر آتا تھا۔ شاید آپ کو اندازہ ہو فلمی لوگوں سے معاملت کرنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا، فلمی دنیا سے متعلق کوئی بھی اسے نہیں آتا تھا مگر نہ جانے کس طرح فلم والوں سے اس کی یاریاں تھیں اور وہ ان سے معاملہ کرنا جانتا تھا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اسے فلمی کہانی وغیرہ بھی لکھنی نہیں آتی تھی؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ پڑھا لکھا ضرور ہے مگر فلمی کے فن سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس نے فلمی دنیا میں جو پہلی کہانی اپنے نام سے دی تھی اور جو سپرہٹ ہوئی تھی، وہ اصل میری لکھی ہوئی تھی۔"

"اوہ!" میں گہری سانس لئے بغیر نہ رہ سکا۔

"تقسیم ہند سے قبل بمبئی میں، میں نے فلمی دنیا میں چند ایک پیشوں کی زبان و بیان وغیرہ درست کرنے کا کام کیا تھا۔" وہ اسی لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس زمانے میں سکرپٹ پر بہت محنت کی جاتی تھی۔ بہت سے لوگ اس پر باری باری کام کرتے تھے۔ اس کی نوک پلک سنوارتے تھے اور اسکرین پلے کو بہتر بنانے کے سلسلے میں اپنی اپنی رائے دیتے تھے لیکن وہ اصل میں باہر ہوتے تھے۔ یعنی اگر گانوں کو بہتر بنانے کے سلسلے میں مشورہ لیا جاتا تھا تو کسی شاعر سے ہی لیا جاتا تھا۔ زبان و بیان بہتر بنانے کا کام کسی ثقہ ادیب کو ہی سونپا جاتا تھا۔ آج کل کی یہاں کی فلمی دنیا میں بھی اسکرپٹ میں بڑھی اکھاڑ پچھاڑ ہوتی ہے مگر وہ غیر متعلق لوگ کرتے ہیں۔ محض اس لئے کہ فلم میں ان کی اہمیت ہوتی ہے مثلاً ہیرو کو کوئی مکالمہ پسند نہیں تو وہ اسے تبدیل کروادیتا ہے۔ ہیروئن کو کوئی پوزیشن پسند نہیں تو وہ اسے تبدیل کروادیتی ہے۔ ڈسٹری بیوٹر کو کوئی کردار پسند نہیں تو وہ اسے نکلوا کر وہاں اس لڑکی کو شامل کروادیتا ہے جو اسے ذاتی طور پر پسند ہوتی ہے یا جو اس کے عشرت کدے کے دو چار چکر لگا چکی ہوتی ہے۔ اس طرح اسکرپٹ کا حلیہ بگڑتا ہے سنورتا نہیں۔ اس کے باوجود بہرحال فلمیں ہٹ ہوتی ہیں کیوں کہ بنیادی کہانی کی کچھ نہ کچھ جان ان میں ہوتی ہے۔ اور کچھ اب فلم بینوں کے ذوق بھی بدل چکے ہیں، رجحانات تبدیل ہوچکے ہیں۔"

روانی سے بات کرتے کرتے وہ یکدم کچھ چونکا اور گویا سنبھل کر بولا "اوہ۔ معاف کیجئے گا۔ میں تو غیر ضروری تفصیلات میں چلا گیا۔ یہ باتیں تو آپ کو معلوم ہی ہوں گی۔ میں آپ کو بتا رہا تھا کہ بمبئی کی فلمی دنیا میں، میں نے معمولی سی تنخواہ پر کچھ اسکرپٹس پر کام کیا تھا۔ وہیں میں نے اپنی ذاتی دلچسپی کی بنا پر اسکرپٹ کی ٹیکنک کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور بہت کچھ سیکھا تھا۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ اٹھانے کی نوبت نہ آسکی اور ملک تقسیم ہوگیا۔ میں یہاں چلا آیا۔ جب ہجرت کے زخم کچھ مندمل ہوئے تو میں نے کئی ماہ کی محنت سے ایک اسکرپٹ لکھا۔ میں ان دنوں گھر کا چولہا جلتا رکھنے کے لئے ایک آڑھتی کے پاس منشی گیری کررہا تھا۔ وہ اسکرپٹ لے کر میں نے فلمی دنیا میں کافی دھکے کھائے۔ کہیں تو میری خستہ حالی دیکھ کر اسٹوڈیو کے چوکیدار نے مجھے گیٹ سے ہی بھگادیا اور کہیں فلم ساز یا ڈائریکٹر نے میری فائل کا ایک ورق الٹے بغیر مجھے اپنے دفتر کے دروازے سے ہی چلتا کردیا۔ یا بہت مہربانی کی تو ایک پیالی چائے پلادی اور معذرت کرکے اپنے سیٹ پر چلا گیا۔ آخر کار بددل ہوکر میں نے اس اسکرپٹ کو اسی گھر کے ایک کونے میں پھینکا اور یکسوئی سے اپنے ہی کھاتوں میں ہی دل لگالیا۔"

ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر اس نے میری طرف دیکھا اور مجھے ہمہ تن گوش پاکر سلسلۂ کلام جوڑا "پھر نصیر نواز سے میری ملاقات ہوگئی۔ شاید اس نے کہیں مجھے اسٹوڈیوز میں دھکے کھاتے دیکھ لیا تھا۔ بہرحال..... ملاقات بظاہر اتفاقاً ہی ہوئی تھی۔ چند ملاقاتوں کے بعد باتوں باتوں میں اس اسکرپٹ کا ذکر نکلا۔ نصیر نواز نے وہ اسکرپٹ مجھ سے لے لیا اور غائب ہوگیا۔ چند روز دن بعد وہ دوبارہ ملا تو اس نے ایک ہزار روپے میرے ہاتھ پر رکھ دئے اور نوید سنادی کہ اس اسکرپٹ پر فلم بنے گی لیکن مصنف کے طور پر نام اس کا آئے گا کیوں کہ بقول اس کے 'پروڈیوسر میرا نام سن کر شاید

اسکرپٹ کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ سچی بات ہے اس وقت مجھے نام آنے یا نہ آنے کے مسئلے سے ذرا بھی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں تو ایک ہزار روپے دیکھ کر ہی سب کچھ بھول گیا تھا۔ میرے حالات کچھ ایسے تھے اور ضروریات نے مجھے ایسا مجبور کر رکھا تھا کہ ایک ہزار روپے مجھے کسی خزانے سے کم نہیں لگے تھے۔ نصیر نواز نے فرمائش کی کہ میں فلم ریلیز ہونے سے پہلے ہی زبردست محنت سے ویسے ہی تین چار زوردار اسکرپٹ اور لکھ دوں۔ میرے لئے تو گویا یہ ایک بہت بڑا وسیلہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے بڑے دل و جان سے تین چار اسکرپٹ اور لکھ ڈالے۔ اسکرپٹ لیتے ہی نصیر نواز ہزار روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔ مجھے تو اپنی منشی گیری کی نوکری بھی غیر اہم لگنے لگی کیوں کہ وہاں سے مجھے چھ سو روپے ماہوار ملتا تھا۔"

اپنے خالی ہاتھوں کو پھیلا کر دیکھتے ہوئے وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا "پھر وہ پہلی فلم ریلیز ہو گئی جس کی کہانی میری لکھی ہوئی تھی۔ فلم سپرہٹ گئی۔ فلمی دنیا کا چلن تو آپ کو معلوم ہی ہو گا۔ جو فلم ہٹ ہو جائے اس سے تعلق رکھنے والی پوری ٹیم کی قسمت راتوں رات پلٹ جاتی ہے۔ نصیر نواز بھی ایک سپرہٹ مصنف کے طور پر سامنے آگیا اور راتوں رات اس کے دروازے پر ڈائریکٹرز' پروڈیوسرز کی لائن لگ گئی۔ ظاہر وقت کے لئے اس نے پہلے ہی مجھ سے تین چار کہانیاں لے کر رکھ لی تھیں۔ اس نے سب سے زیادہ بولی لگانے والوں کو کہانیاں تھما دیں۔ اور اس کے بعد تو بس سلسلہ چل نکلا۔ کہانیاں میں لکھ کر دیتا رہا' وہ انہیں بیچتا رہا۔ پھر اس نے اور کاموں میں بھی ہاتھ ڈال دیا۔ ڈسٹری بیوشن..... پروڈکشن..... اور نہ جانے کیا کچھ۔ سنا ہے آج کل ایک کروڑ پتی خاتون بھی اس کی مٹھی میں ہے۔ اسے وہ پروڈیوسر اور فائنانسر کے طور پر انڈسٹری میں لایا ہے۔ معلوم نہیں اس بے چاری کا انجام کیا ہو گا۔" وہ ایک آہ سی بھر کر خاموش ہو گیا۔

"اتفاق سے میں اس عورت سے بھی مل چکا ہوں۔" میں نے کہا "وہ ہماری ہمدردیوں کی کچھ زیادہ مستحق معلوم نہیں ہوتی۔ زبردست عیاش اور سفاک عورت معلوم ہوتی ہے۔"

"نصیر نواز سے زیادہ عیاش اور سفاک شاید وہ نہ ہو۔" سجاد نے خیال ظاہر کیا "اس جیسا سنگدل اور بے حمیت شخص میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔"

"سجاد صاحب! میں بہت کم باتوں پر حیران ہوتا ہوں لیکن یہ سب کچھ سنا کر آپ نے واقعی مجھے حیران کر دیا ہے۔ یقین نہیں آرہا..... کیا واقعی اس نے آج تک ایک بھی کہانی نہیں لکھی اور اتنا کامیاب' اتنا معروف مصنف بنا ہوا ہے؟"

"آپ جو قسم کہیں میں وہ کھانے کے لئے تیار ہوں۔ دنیا میں اپنی بیٹی مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں اس کی قسم کھانے کے لئے تیار ہوں۔"

"نہیں' نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" میں شرمندگی سے کہا "میں تو صرف اپنی حیرت کا اظہار کر رہا"

"کبھی کبھی مجھے خود بھی حیرت ہوتی ہے۔" سجاد بولا "عرصے سے فلمی دنیا کی جڑوں میں اترا ہوا ہے۔ اتنی کہانیاں اس کے ہاتھ سے گزری ہیں۔ فلموں کی کامیابیوں اور ناکامیوں پر اس کی گہری نظر ہوتی ہے۔ وہ اگر چاہتا تو اور بھی طبع آزمائی کر سکتا تھا۔ اتنا عرصہ فلم انڈسٹری میں سیٹ لگانے والے مزدور اور لائٹ مین تک مختلف شعبے مارنے لگتے ہیں لیکن اس نے آج تک ایک صفحہ بھی کوشش نہیں کی۔"

"شاید وہ حد سے زیادہ آسانی پسند ہے۔ اسے جب بنی بنائی چیز آسانی سے دستیاب ہے تو پھر دماغ کی ضرورت ہے۔"

"جی ہاں۔ میں نے خود ہی اپنے آپ کو مکمل طور پر بنائے رکھا۔" سجاد افسردگی سے بولا "مجھے یہ بھی معلوم ایک اسکرپٹ کا چالیس سے پچاس ہزار کے درمیان لیکن میں پھر بھی خاموشی سے ایک ہزار لیتا رہا۔ کیوں کہ آگئی تھی کہ میں اس سے خوف زدہ بھی رہنے لگا تھا۔ وہ خطرناک آدمی ہے۔ اس کے دل میں رحم یا ملامت کی نہیں۔ آپ اسی سے اندازہ کر لیں کہ اگر اس میں اتنی کوئی چیز ہوتی تو وہ اتنا ضرور سوچتا کہ جس چیز سے وہ بلا پچاس ہزار کما رہا ہے اس کا ایک ہزار معاوضہ تو بہت وہ اس میں تھوڑا بہت ہی اضافہ کر دیتا مگر اس نے کبھی پر بات بھی کرنا پسند نہیں کی بلکہ جب میں نے اپنی ضرورت مجبور ہو کر تھوڑی بہت چوں چاں شروع کی تو اس نے میں کہہ دیا کہ زندگی کے معاملات میں اس کے نظریات ہیں۔ اور ان میں سے ایک نظریہ یہ ہے کہ اگر سونے دینے والی مرغی بھی زیادہ کڑ کڑ کرنے لگے تو اسے ذبح گندے نالے میں پھینک دو' اگر تم مقدر کے تیز ہو۔ دوسری مرغی مل جائے گی۔ یہ تھا اس کا جواب۔"

"بہت خوب" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"آسودہ حال تو میں کبھی بھی نہیں رہا۔" سجاد جوڑتے ہوئے بولا "لیکن بیوی کی بیماری نے مجھے کچھ زیادہ دست' قلاش اور مجبور کر دیا۔ اوپر سے بیٹی کا بوجھ بھی تھا۔ غریب آدمی کی بیٹی تو خوب صورت ہو تب بھی اسے سے ہی میسر آتا ہے۔"

بیٹی کی شاید عمر لمبی تھی کہ جونہی اس کا ذکر آیا ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے صرف میری طرف دیکھا پھر اس کی نظریں پہلے ہی کی طرح بوجھ سے جھک گئیں۔ دوپٹہ اس نے کس کر بالوں اور چ

واتھا۔ شاید اس کا مقصد بالوں کی چاندی کو چھپانا بھی تھا۔ چائے رکھ کر وہ خاموشی سے واپس چلی گئی۔ چائے کے ساتھ بھی تھے۔ مجھے بے حد شرمندگی ہوئی۔ نہ جانے بچاری سارہ س طرح اور کس کے ہاتھ منگوائے ہوں گے۔

"آپ کو یہ تکلف نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یہ بات میں محض نہیں کہہ رہا۔ مجھے حقیقتاً شرمندگی ہو رہی ہے۔" میں نے

"مجھے معلوم ہے' یہ آپ کے شایان شان نہیں ہیں۔ شاید ں دیکھ کر آپ کو ابکائی آرہی ہو لیکن اگر آپ انہیں چکھ لیں تو میرا دل بڑا ہو جائے گا۔ سارہ کو بھی یقیناً خوشی ہو گی۔ انسان کو بان کر ضرور خوشی ہوتی ہے کہ کسی بڑے آدمی نے اسے اور اس چیزوں کو حقیر نہیں سمجھا۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

"اگر میرے ان بسکٹوں کو کھانے سے آپ کو کوئی خوشی مل ہے تو میں یہ سارے کے سارے ہڑپ کر سکتا ہوں۔" میں نے راتے ہوئے کہا اور بسکٹوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ ں غریبوں کو دیکھ کر دل کی حالت واقعی عجیب سی ہو جاتی ہے۔ وہ خواہ فاقے سے ہوں مگر کسی کی تواضع کے لئے پڑوسی سے ادھار ں کر مٹھائی منگوا لیں گے۔ یہ جذبے اب دنیا سے رخصت تے جا رہے ہیں مگر جہاں نظر آتے ہیں دل کو پانی کر دیتے ہیں۔

میں نے چٹکا ہوا کپ اٹھا کر چائے کی چسکی لی اور مجھے حقیقتاً لطف آیا۔ اس چائے میں خلوص کی حرارت اور وضع داری کی ماس تھی۔ سجاد نسیم اپنا کپ تھامے افسردگی سے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "سارہ کی عمر پینتیس سال ہے اور کبھی کبھی رات کو چیخ مار کر سوتے سے اٹھ بیٹھتی ہے۔ اس کے ناخن ہتھیلیوں میں ڑ جاتے ہیں۔ بہت دیر تک وہ ہوش و حواس میں نہیں آتی اور ں کا جسم تختہ بنا رہتا ہے۔ ہوش و حواس بحال ہونے کے بعد بھی یک دو دن تک وہ گم صم سی رہتی ہے۔ اگر میں جاہل یا حد سے یادہ سادہ لوح آدمی ہوتا تو یہی سمجھتا کہ لڑکی پر کوئی سایہ وغیرہ ہے۔ تعویذ گنڈے والے پیروں فقیروں اور عاملوں کے پاس جاتا لیکن ی بھی بہت بڑا عذاب ہے۔ میں بھی عذاب آگہی میں گرفتار ہے۔ مجھے اصل مرض معلوم ہے علاج میری دسترس سے باہر ہے۔ میں اپنی معصوم بیٹی کا مجرم ہوں۔ وہ بیٹی جو خاموشی سے تیس برس کی عمر کو پہنچ گئی مگر جس نے کبھی گھر کی چھت پر چڑھ کر ڈیر کے پار نہیں جھانکا۔ جس نے کبھی چوری چھپے دروازے کی ری سے گلی میں نظر نہیں ڈالی۔ میں اس کا مجرم ہوں کہ اسے اس عمر نہیں بھیج سکا جہاں اسے ہونا چاہئے تھا۔ شہنائی کی گونج میں سے رخصت نہیں کر سکا۔ مگر وہ اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتی ہے رسوچتی ہے کہ وہ مجھ پر بوجھ بنی ہوئی ہے۔ اسی احساس سے اس ں پلکیں جھکی جھکی رہتی ہیں۔"

"لڑکی کی کہیں بات ہی نہیں چلی یا روپے پیسے کی وجہ سے.....؟"

"میں اپنی کہانی کے اسی اہم موڑ کے بارے میں آپ کو بتانے لگا تھا۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا "تقریباً دو سال پہلے ایک جگہ خدا خدا کر کے سارہ کی بات پکی ہوئی تھی۔ میں ایک باپ کی نظر سے دیکھتا تھا تو لڑکا مجھے کسی اعتبار سے بھی سارہ کے لائق نظر نہ آتا تھا لیکن سارہ کی بڑھتی ہوئی عمر نے مجھے وہ رشتہ قبول کرنے پر مجبور کر دیا مگر یہ بھی شاید قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ منگنی کے کچھ دن بعد لڑکے کو قطعی غیر متوقع طور پر دبئی جانے کا موقع مل گیا۔ دو سال کے کنٹریکٹ پر وہاں ملازمت کر کے وہ کچھ رقم کما لایا اور گھر کے حالات ذرا بدل گئے۔ آج کل بھی وہ دوبارہ باہر جانے کے لئے بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہے اور آثار بتاتے ہیں کہ وہ کامیاب ہو جائے گا۔ بجائے اس کے کہ حالات کی اس تبدیلی پر وہ قدرت کے شکر گزار ہوتے اور جلد از جلد لڑکے کی شادی کے فریضے سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتے' الٹا ان کی تو نظریں ہی بدل گئیں۔ لڑکے کے والدین صاف طور پر جتانے لگے کہ ان کے لڑکے کو رشتوں کی کیا کمی ہے' کئی اچھے گھروں کے رشتے موجود ہیں۔ فلاں گھرانہ جہیز میں یہ کچھ دینے کو تیار ہے اور فلاں نے وہ کچھ دینے کی بات کی ہے۔ کچھ عرصے اس قسم کی باتوں کے بعد آخر کار انہوں نے کھل کر دل کی بات کر دی کہ انہیں فلاں فلاں چیزوں پر مشتمل جہیز چاہئے۔ باقاعدہ فہرست بنا کر دے دی انہوں نے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر ہم ان کے مطالبات پورے نہ کر سکیں تو رشتہ ختم سمجھا جائے۔"

"اوہ..... گھٹیا قسم کی خود غرضی اور ہوس کی وہی پرانی کہانی!" میں نے تاسف سے کہا۔

"جی ہاں' وہی پرانی کہانی جو ہر روز نہ جانے کتنے والدین کے دلوں پر نئے زخم لگاتی ہے۔" وہ افسردگی سے بولا "بہرحال..... ان کے اس مطالبے کے بعد پہلی بار میں نے نصیر نواز سے اپنے لین دین سے بڑھ کر کچھ مانگنے کے لئے ہاتھ پھیلایا۔ میں نے پھر بھی اسے یہ احساس دلانے کی کوشش نہیں کی کہ میرا اس پر کچھ حق بنتا ہے۔ یا میری وجہ سے اس نے جو لاکھوں روپیہ' عزت اور شہرت کمائی ہے' میں اسی میں سے معمولی سا حصہ مانگ رہا ہوں۔ بلکہ میں نے تو اس سے قرض یا بھیک کی طرح رقم مانگی تھی۔"

"کتنی رقم؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"لڑکے والوں کے مطالبات پورے کرنے کے لئے مجھے کم از کم ایک لاکھ روپیہ درکار تھا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا "اور ایک لاکھ کا سن کر نصیر نواز کی آنکھیں یوں پھیل گئیں جیسے میں نے اس سے ہفت اقلیم کی دولت مانگ لی ہو۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ میں کوئی نشہ وغیرہ کر کے آگیا ہوں اور میرے ہوش و حواس ٹھکانے پر نہیں ہیں۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں نشے میں نہیں ہوں تو اس نے سمجھا کہ شاید میں اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کا آغاز کر رہا ہوں۔ یہ سمجھ کر وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے مجھے سنگین نتائج

جھگڑنے کی دھمکیاں دیں۔ مجھے معلوم ہے وہ اس قسم کی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت رکھتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک اٹھارہ سال کے لڑکے کو اس نے محض اس لئے قتل کرادیا تھا کہ نوجوانی کے جوش میں اس نے نصیر کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی تھی۔ ایک اور شخص پر اس نے رقابت کے کسی چکر میں پیشہ ور قاتلوں سے حملہ کرایا۔ وہ جان بچانے میں تو کسی طرح کامیاب ہوگیا لیکن عمر بھر کے لئے معذور ہوگیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ شخص یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس پر حملہ نصیر نواز نے کرایا ہے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔"

"اوہ... خاصی خطرناک چیز معلوم ہوتا ہے یہ شخص!" میں نے اس موقع پر قدرے حیرت کا اظہار کرنا مناسب سمجھا۔

"کم از کم مجھ جیسے مسکین آدمی کا اس سے دہشت زدہ رہنا بجا ہے۔ میری حیثیت ہی کیا ہے؟ ایک غلیظ بستی میں رہنے والا حقیر سا کیڑا جسے ذرا سا بھی طاقتور کوئی شخص کچل کر پھینک سکتا ہے۔ جس کے بعد میری بیوی اور بیٹی جو پہلے ہی ایک کربناک زندگی گزار رہی ہیں، بالکل ہی بے آسرا ہوجائیں گی۔ اس لئے میں نے نصیر نواز کے سامنے اکڑنے کی کوشش نہیں کی بلکہ منت سماجت کے انداز میں ہی اپنا مسئلہ اسے سمجھایا مگر اس نے میری ضرورت پوری کرنے سے صاف انکار کردیا۔ دوٹوک انداز میں کہہ دیا کہ وہ اتنی بڑی رقم ہرگز مجھے نہیں دے سکتا۔ جس نے میری دن رات کی محنت سے لاکھوں کما کر جیب میں ڈالے تھے اس کے لئے ایک لاکھ مجھے دینا بعید از تصور تھا۔ جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے ایک ایسی بات کہی کہ ایک باحیثیت باپ کی حیثیت سے مجھے اس کو وہیں قتل کردینا چاہئے تھا مگر میں بزدل... نالی کا کیڑا یہ بھی نہ کرسکا۔ صرف تلملا کر رہ گیا۔ اور آج تک اپنے آپ کو کوس رہا ہوں۔"

"اس نے کیا کہا؟" میں نے آہستگی سے پوچھا "اس سوال سے میرا مقصد آپ کے زخموں پر نمک چھڑکنا نہیں ہے بلکہ میں نصیر نواز کی تصویر اپنے ذہن میں بالکل واضح کرلینا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک لمحے اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں مروڑتا رہا پھر سرگوشی سے ذرا ہی بلند آواز میں بولا "وہ مجھے سمجھانے لگا، بڑے میاں! یہ کیا شرافت، عزت اور تقدس کے فرسودہ چکروں میں پڑے ہوئے ہو۔ اگر بیٹی کی شادی کرنا تمہارے خیال میں بہت ہی ضروری ہے اور اس کے لئے ایک لاکھ روپیہ حاصل کرنا بھی ضروری ہے تو میں ایک آسان سی ترکیب بتادیتا ہوں۔ میرا ایک بہت بڑا سیٹھ جاننے والا ہے۔ ایک ہفتے کے لئے بیٹی کو اس کے پاس بھیج دو۔ میں نے اسے دیکھا ہوا ہے۔ خوب صورت لڑکی ہے۔ سیٹھ ایسی لڑکیوں کا قدردان ہے۔ رنڈوا ہے۔ اپنے عالیشان بنگلے میں تنہا رہتا ہے۔ سارہ بہت عیش و عشرت سے آٹھ دس دن اس کے گھر مہمان رہے گی اور خاموشی سے ایک لاکھ روپیہ لے کر واپس آجائے گی۔ کسی کو کانوں کان بھی پتا نہیں چلے گا۔ فوراً ہی دھوم دھام سے اس کی شادی کردینا۔ کیا ز گا۔ اس نے یہ سب کچھ کہا اور میں نے سن لیا...!" رندھ سی گئی۔

غیر ارادی طور پر میرا سر جھک گیا۔ وہ ایک لمحے کے بعد پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا "میں نے کئی ایسی کہ ہیں جن میں لڑکیوں کے باپ یا پھر فلم کے ہیرو اس سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر ولن کو قتل کردیتے ہیں۔ گنڈاسے ٹکڑے کردیتے ہیں۔ لاٹھیوں سے اس کا کچومر نکال گولیوں سے اس کا جسم چھلنی کردیتے ہیں لیکن میں طمانچہ بھی رسید نہ کرسکا۔ آپ نے دیکھا، فلمی یا کتابی حقیقی زندگی میں کتنا فرق ہوتا ہے؟ خم و غصے کا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے اور اندر ہی اندر بس کھول رہا ہے نس میں زہر پھیل چکا ہے مگر شاید ابھی اس میں اتنی قو کہ یہ کسی اور کو مار سکے۔ فی الحال تو یہ صرف مجھے دھیرے دھیرے ہلاک کررہا ہے۔"

سارہ کی معصوم اور افسردہ صورت میری نگاہوں گئی۔ اگر یہ بات اسے معلوم ہوجاتی تو اسے نہ جا صدمہ پہنچتا، کتنی تذلیل کا احساس ہوتا۔ میں نے نیچے پوچھا "آپ نے غصے میں یا کسی جذباتی کیفیت میں اپنی ان باتوں کا تذکرہ نہیں کیا؟"

"توبہ کیجئے صاحب!" وہ طویل سانس لے کر بولا ایسی ذلت کی کہانی اسے کیوں کر سنا سکتا تھا۔ بلکہ آپ کو حیرت ہوگی کہ میری بیوی اور بیٹی کو تو یہ بھی علم نہیں کہ میں کو فلمی کہانیاں لکھ کر دیتا ہوں یا اس سے میرا کوئی معاملہ یہی سمجھتی ہیں کہ میں معمولی معاوضے پر مختلف اداروں اسکرپٹس کی تصحیح کا کام کرتا ہوں۔ برسوں گزر گئے مگر کامیابی سے اس معاملے کو راز رکھا ہوا ہے۔"

"میرے خیال میں یہ آپ نے اچھا ہی کیا ہے۔" قدرے طمانیت سے کہا۔

"میری بیوی کی تو حالت ہی ایسی نہیں کہ اسے کو کوئی اشتعال انگیز بات سنائی جاسکے۔ بیٹی کو بھی میں آ خوش خبری تو سنا نہیں سکا، اس لئے کوئی بری خبر بھی اسے حوصلہ نہیں پڑتا۔ میں باہر کی باتیں باہر ہی رکھتا ہوں انہیں بتائے بغیر ایک پرانے شناسا سے ملنے کا ارادہ ٹاؤن گیا تھا۔ کبھی وہ بھی میری ہی طرح مفلس تھے او خاصی گہری شناسائی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ قسمت ان پر گئی۔ ان کا چھوٹا سا کاروبار پھیلتا چلا گیا اور اسی رفتار سے دور ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ گارڈن ٹاؤن کی ایک بہ کوٹھی میں پہنچ گئے۔ بہت مدت سے ان سے ملاقات تھی۔ ایک آدھ مرتبہ سرِراہ ملے بھی تو انہوں نے بڑی

معروف مصنف

ایم اے راحت کے طلسماتی قلم سے

پُراسرار
ہولناک
اور ناقابلِ فراموش
کہانیوں
کا حسین
امتزاج

زندہ لاش
70/-

بدن قیدی
70/-

خون آرزو
70/-

کتابیں خوبصورت سرورق کے ساتھ پیپر بیک پر شائع کی گئی ہیں

اپنے آرڈر سے مطلع فرمائیں

کتاب اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں یا اندراج کے نام کل قیمت کا منی آرڈر ارسال فرمائیں
کتاب آپ کو بذریعہ رجسٹری ارسال کردی جائے گی

خط و کتابت کے لئے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور ۲، فون ۷۲۲۴۶۶۵

پہچانا۔ پھر بھی میں ایک موہوم سی امید کے سہارے ان کے پاس چلا گیا تھا کہ ..... شاید وہ بھولے بسرے' پرانے تعلق کے حوالے سے میری کچھ مدد کردیں۔ لیکن وہ ملک لے باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کی بیگم بھی پرانے وقتوں سے مجھے جانتی ہیں۔ وہ گھر پر تھیں۔ انہوں نے اتنی زحمت ضرور کی گیٹ تک آگئیں لیکن انہوں نے مجھے اندر بلانا گوارا نہیں کیا۔ گیٹ پر سے ہی یہ بتا کر رخصت کردیا کہ صاحب ملک سے باہر گئے ہیں۔ وہیں سے الٹے قدموں واپس آرہا تھا جب آپ نے مجھے لفٹ دی۔"

"دنیا اسی کا نام ہے سجاد صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور چائے کا کپ خالی کرکے پیالی پر رکھ دیا "اچھا یہ بتایئے' جہاں آپ اپنی بچی کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں' کیا آپ کو امید ہے کہ وہ وہاں خوش رہے گی؟"

"مستقبل کے بارے میں یقین سے تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خصوصاً انسان تو ایسی ناقابل اعتبار مخلوق ہے کہ اس کے بارے میں تو کہا ہی نہیں جاسکتا۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ کب کس کا رویہ کیا ہوجائے۔ بہرحال مجھے کافی حد تک یقین ہے کہ اگر ان لوگوں کے مطالبات پورے ہوجائیں تو وہ لڑکی کی قدر کریں گے۔ سارہ خود بھی بڑی صابر لڑکی ہے۔ وہ ان کے قریب رہے گی تو انہیں اس کی خوبیوں کا پتا چلے گا۔ دوسری بات یہ ہے جناب ... کہ سارہ کے سامنے کوئی چوائس نہیں ہے۔ لڑکی نوخیز ہو' اس کے سامنے رشتوں کی بہتات ہو تب تو سوباتیں سوچی جاسکتی ہیں۔ ایک سماجی ضرورت ہے' وہ پوری تو کرنی ہے۔ اور شادی تو کہیں بھی کی جائے' بہرحال ایک جوا ہے۔ آپ خوشیاں جیت بھی سکتے ہیں اور ہار بھی سکتے ہیں۔ رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔"

"درست کہا آپ نے۔" میں نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اثبات میں سرہلا کر کہا۔

"اگر آپ شادی شدہ ہیں تو میری بات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔" وہ بولا۔

"میں شادی شدہ نہیں ہوں پھر بھی آپ کی بات کو بہرحال بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور کوٹ کی جیب سے چیک بک اور قلم نکال کر ایک چیک لکھنے لگا۔

سجاد سمجھا کہ بیٹھے بٹھائے مجھے کوئی دفتری کام یاد آگیا ہے اور میں اسی سلسلے میں چیک لکھنے لگا ہوں لیکن جب میں نے چیک کاٹ کر اس کی طرف بڑھایا تو اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے "یہ کیا...؟"

"یہ سوا لاکھ کا چیک ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا "میرا خیال ہے لڑکے والوں کے مطالبات کے علاوہ شادی کے دیگر اخراجات بھی پورے ہوجائیں گے۔ آپ اطمینان سے شادی کی تیاری کریں اور باقی تمام باتوں کو بھول جائیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ نصیر نواز سے اگر ملاقات ہو تو تھوڑا سا کھنچاؤ ضرور رکھیں لیکن ہماری اس ملاقات کا یا اس چیک وغیرہ کا کوئی ذکر نہ کریں۔"

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا' پھر چیک لے کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر وہ خشک لب پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "سر! آپ مجھ سے مذاق تو کررہے؟"

"میں احساسات کو مجروح کرنے والے مذاق ہرگز پسند نہیں کرتا۔" میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "چند دن بعد آپ مجھ سے رابطہ قائم کیجئے گا۔ ہم وقت نکال کر کے چند ضروری باتیں کریں گے۔"

"سر...! مجھے یقین نہیں آرہا۔" وہ متوحش سے لہجے میں بولا۔

"قدرت بڑے عجیب عجیب انداز میں انسان سے کام لیتی ہے اور بڑے ناقابل یقین انداز میں بعض لوگوں کے مسائل حل کرتی ہے۔ آپ اس سلسلے میں اب ذہن نہ کھپائیں اور ایک مسئلے میں میری بھی تھوڑی سی مدد کریں۔ یہ بھی خدمتِ خلق ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔"

میں نے جیب سے رخشندہ عرف بے بی نشاط کی ایک تصویر نکالی اور سجاد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "آپ کی نصیر نواز سے بہت ملاقاتیں رہی ہیں۔ آپ نے کبھی اس لڑکی کو تو اس کے گھر نہیں دیکھا؟"

اس نے تصویر میرے ہاتھ سے لے کر ایک نظر دیکھی اور چونک کر بولا "یہ لڑکی کہاں ہے؟ اس کی تو مجھے تلاش ہے۔ صرف ایک بار مجھے ملی اور حیران کرگئی۔ کیا آپ اس کے متعلق جانتے ہیں؟ کچھ اتا پتا معلوم ہے اس کا؟ افسوس! مجھے تو اس کا بھی نہیں معلوم۔"

مجھے اس کا اشتیاق دیکھ کر قدرے حیرانی ہوئی۔ میں نے تاسف سے کہا "جی ہاں۔ اتا پتا تو معلوم ہے لیکن افسوس کہ کوئی اس سے ملنے نہیں جاسکتا اور نہ ہی اب یہ کسی سے ملنے آتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ گویا اس مفہوم کو قبول کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس تک پہنچانا چاہا تھا۔

"کیا آپ نے اخبار میں اس کے قتل کی خبر نہیں پڑھی؟" میں نے پوچھا۔

"میں اخبار باقاعدگی سے نہیں پڑھتا۔ کبھی کبھار کسی چائے خانے وغیرہ میں سامنے رکھا ہوا نظر آجائے تو پڑھ لیتا ہوں۔" وہ روانی میں بولا۔ پھر یکدم جیسے اسے جھٹکا سا لگا۔ اصل لفظ کی طرف اس کا ذہن ذرا تاخیر سے گیا تھا "آپ نے کیا کہا؟ قتل..." اس کے حلق سے سرسراتی سی آواز نکلی۔

"جی ہاں۔ اسے چند دن قبل بڑے پُراسرار سے انداز میں قتل کردیا گیا ہے۔ یوں تو ہر قاتل ہی سفاک ہوتا ہے لیکن اس کے قتل میں کچھ زیادہ ہی شقی القلبی کا مظاہرہ کیا گیا۔" میں

نے بوجھل لہجے میں کہا "بہرحال... اگر آپ اس کا نام نہیں جانتے تھے تب تو شاید اخبار میں اس کے قتل کی خبر دیکھ کر بھی اس کے بارے میں جان نہ پائے۔ کیوں کہ خبر کے ساتھ اس کی لاش کی جو سی تصویر چھپی تھی جو اس کے زندہ سراپا سے بہت مختلف تھی۔"

"اوہ... تو بے چاری ماری ہی گئی۔" وہ بڑبڑایا۔ اس کے لہجے کی درماندگی یک لخت بڑھ گئی۔ بوڑھا تو وہ تھا ہی لیکن اب مجبور نظر آنے لگا۔ چند لمحے پہلے اسے اپنا مسئلہ حل ہوجانے پر جو خوشی حاصل ہوئی تھی شاید وہ اسے بھی بھول گیا۔ سر جھکائے گم صم بیٹھا رہا۔ کسی گہری سوچ میں تھا۔

آخر کار میں نے کہا "آپ کو اس کے بارے میں جو کچھ بھی معلوم ہے بلا کم و کاست مجھے بتا دیجئے۔ اس لڑکی سے اپنی ہمدردی ثابت کرنے کا اب یہی ایک طریقہ ہے۔"

"کیسی معصوم' پُرعزم اور باحوصلہ نظر آئی تھی یہ مجھے... یہ کسی کے دل کا ٹکڑا ہوگی..... میری سارہ کی طرح!" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ وہ ایک ٹک اس تصویر کی طرف ہی دیکھے جارہا تھا جو میں نے اسے دی تھی۔ پھر وہ ایک طویل سانس لے کر سر اٹھاتے ہوئے بولا "بہت عجیب انداز میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ غالباً یہ بارہ تیرہ دن پہلے کی بات ہے' میں ایک اشد ضرورت کے تحت نصیر نواز سے ملنے اس کے گھر چلا گیا۔ اس نے مجھے اپنے گھر آنے سے منع کر رکھا تھا۔ میرے ہاں بھی وہ دو تین مرتبہ ہی آیا ہے۔ زیادہ تر میں اس سے فون پر ملاقات طے کرتا تھا اور ہم کسی بھی ایسی دور افتادہ جگہ پر ملتے تھے جہاں دونوں ہی کے کسی شناسا کے ملنے کا امکان نہ ہو۔ حالاں کہ میں تو مکمل طور پر اس کی مٹھی میں ہی تھا۔ اس کے حکم کے خلاف کچھ کرتا ہی نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت محتاط رہتا تھا۔ میرے ساتھ کسی بھی ایسے مقام پر دیکھے جانا پسند نہیں کرتا تھا جہاں اس کے کسی شناسا کے نظر آنے کا امکان ہو لیکن اس روز ضرورت کچھ ایسی تھی کہ میں اس سے پیشگی رابطہ قائم کئے بغیر اس کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ میں جس وقت گیٹ پر پہنچا' رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ نصیر کے ہاں کوئی چوکیدار وغیرہ نہیں ہے۔ وہ تنہا ہی رہتا ہے۔ ایک خانساماں اور چھوٹے موٹے کاموں کے لئے ایک نوکر رکھا ہوا ہے۔ گیٹ بند تھا لیکن آوازوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اندر سے نصیر کسی کو چھوڑنے گیٹ تک آرہا تھا۔ ساتھ ہی وہ اس کو سخت برہمی کے عالم میں ڈانٹ بھی رہا تھا۔ مجھے ابھی تک اس کے الفاظ یاد ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا "تمہیں مجھ کو بتائے بغیر یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ میں نے جب ملاقات کا طریقہ مقرر کر رکھا ہے تو تمہیں اس کی خلاف ورزی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ آئندہ اس طرح اطلاع دئے بغیر ہرگز مت آنا۔ اپنے سلسلے کے سلسلے میں اتنا ہڑبڑانے اور بوکھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا لیکن خدا کے لئے تم یہ بچکانہ طور طریقے چھوڑ دو۔" وہ جسے بھی ڈانٹ رہا تھا اس کی آواز مجھے سنائی نہیں دی۔ میں بہت دلبرداشتہ ہوا کہ یہاں تو پہلے ہی کسی کو جھاڑ پڑ رہی ہے۔ میرے ساتھ تو شاید اس سے بھی بدتر سلوک ہوگا۔ میں ابھی فیصلہ نہ کرپایا تھا کہ مجھے نصیر سے ملنا چاہئے یا واپس چلے جانا چاہئے کہ اچانک گیٹ کھل گیا اور چادر لپیٹے ایک لڑکی نے باہر قدم رکھا۔ وہ یہی لڑکی تھی۔ نصیر نواز کے خوف اور کچھ اپنی عادت کے باعث میں نے اس کی طرف زیادہ غور سے نہیں دیکھا۔ تاہم ایک نظر دیکھ کر ہی اتنا اندازہ ضرور ہوگیا کہ وہ بہت خوب صورت اور معصوم سی تھی۔ اس وقت بہت غصے میں نظر آتی تھی۔ اس کے چہرے پر صرف ایک لمحے کے لئے کھلے گیٹ سے روشنی پڑی تھی اور مجھے وہ لال بھبھوکا نظر آیا تھا۔ بہرحال یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ میں گو کہ نصیر کے گھر دو ایک مرتبہ ہی گیا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہاں لڑکیوں اور عورتوں کی آمدورفت رہتی ہے۔ ایک کامیاب فلمی مصنف کے ہاں ان کی آمدورفت کوئی ایسی تعجب خیز بھی نہیں تھی۔ اسی لمحے نصیر نواز کی نظر مجھ پر پڑی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ ارے... ! تمہیں بھی آج ہی مرنا تھا' لڑکی نے صرف ایک ثانئے میں سرتاپا میرا جائزہ لیا اور ایک لفظ بولے بغیر وہاں سے رخصت ہوگئی۔" سجاد خاموش ہوگیا۔

"بس یہی ملاقات تھی؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا کیوں کہ سجاد نے لڑکی کے بارے میں تبصرہ کچھ زیادہ کیا تھا۔

"نہیں... میں بتا رہا ہوں... بلاشبہ وہ میرے لئے ایک عجیب ملاقات تھی۔" وہ گویا اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے بولا "نصیر نواز طوعاً و کرہاً مجھے اندر لے گیا۔ اس وقت کی میری ضرورت معمولی تھی وہ تو اس نے پوری کردی لیکن یہ بڑا مسئلہ اپنی جگہ برقرار چلا آرہا تھا۔ اس رات بھی اس سے میری کسی حد تک تلخ کلامی ہوئی۔ میں نے اسے جتادیا کہ میں گمنام اور پس پردہ رہ کر اس کے لئے لکھتے لکھتے تنگ آچکا ہوں۔ تھک چکا ہوں کیوں کہ اس نے مجھے کوئی اچھا صلہ نہیں دیا۔ چناں چہ میں اب اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنے کے بارے میں سوچوں گا۔ وہ میری دھمکی سے قطعاً مرعوب نہیں ہوا۔ اس نے کہہ دیا کہ اسے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اس نے متبادل بندوبست کرلیا ہے' میرا جو جی چاہے کرتا پھروں' اور اگر میں نے اسے نقصان پہنچانے کا ارادہ بھی کیا تو وہ مجھے نکس اپ کردے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ کچھ دیر بعد میں اس کے گھر سے رخصت ہوا تو پہلے سے زیادہ دلبرداشتہ اور اندر ہی اندر خوفزدہ بھی تھا۔ گلبرگ کی گلیوں میں نیم تاریکی تھی۔ میں رکشے کی تلاش میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ عقب سے کسی کی نسوانی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو یہی لڑکی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی میرے برابر آگئی۔ چادر اب اس کے گلے میں مفلر کی طرح لپٹی ہوئی تھی اور ذرا دور سے وہ لڑکی کے بجائے کوئی نوخیز سا لڑکا نظر آرہی

تھی۔

وہ بلا تمہید بولی "آپ بہت پریشان نظر آتے ہیں۔ نصیر نواز سے آپ کا کیا چکر ہے؟"

میں خوفزدہ سا ہوگیا۔ میں نے کہا "کوئی چکر نہیں ہے۔ میں تو کام سے اس کے پاس آیا تھا۔"

وہ گویا مجھے سمجھاتے ہوئے بولی "آپ ڈریں نہیں' مجھے اپنے دوستوں میں ہی شمار کریں۔ میری ذات سے آپ کو کوئی فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے' نقصان نہیں۔ میں نے آپ کی اور نصیر نواز کی کچھ باتیں سنی ہیں' کچھ نہیں سن سکی۔ تاہم اتنا ضرور اندازہ ہوگیا ہے کہ آپ اسے کہانیاں لکھ کر دیتے رہے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا اسکینڈل ہے۔ اگر یہ منظرِ عام پر آجائے تو وہ تباہ ہو سکتا ہے اور میں اسے تباہ کرنے کے درپے ہوں۔"

میں سدا کا بزدل اس کمسن سی لڑکی کے لہجے سے خوفزدہ ہوگیا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور میں بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے شک زدہ لہجے میں پوچھا "تم نے ہماری باتیں کہاں سے سن لیں؟ نصیر جب مجھے اپنے ساتھ اندر لے کر گیا تو اس نے گیٹ اندر سے بند کرلیا تھا اور تم بھی وہاں سے رخصت ہوگئی تھیں؟"

وہ بے پروائی سے بولی "میں آج کل اس کی ٹوہ میں ہوں اس لئے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ میں چند لمحے بعد لوٹ کر آگئی تھی اور عقبی دیوار پھلانگ کر اندر پہنچ گئی تھی۔ گھر بہت اچھی طرح میرا دیکھا ہوا ہے۔ میں نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے لگ کر آپ کی باتیں سنی تھیں۔"

نصیر کے مکان کی دیوار خاصی اونچی تھی لیکن اس لڑکی کے انداز و اطوار بتاتے تھے کہ اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ وہ دیوار بھی پھلانگ سکتی تھی اور شاید اونچے اونچے درختوں پر بھی چڑھ سکتی تھی۔ پھر وہ گویا میرے خیالات کی تصدیق کرتے ہوئے بولی۔ "میں بہت ضدی لڑکی ہوں۔ جس کام کا تہیہ کرلیتی ہوں وہ کرکے چھوڑتی ہوں اور اب میں نے نصیر نواز کو تباہ کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو میرا خیال ہے میں اسے ضرور اس کے کرتوتوں کی سزا دے سکتی ہوں۔"

ضدی وہ یقیناً تھی۔ اس کا لہجہ گواہی دے رہا تھا۔ جتنی زیادہ وہ بات کررہی تھی اتنا ہی زیادہ میں اس سے خوفزدہ ہوتا جارہا تھا۔ میں نے پوچھا "تم نصیر نواز کو تباہ کرنے کے درپے کیوں ہو؟"

وہ بولی "یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گی کیوں کہ آپ بھی مجھے کچھ نہیں بتا رہے۔ بہرحال مناسب وقت پر سب کچھ بتادوں گی۔"

میں نے سنبھل کر کہا "لڑکی! تم ابھی کم عمر' نادان اور ناتجربے کار ہو۔ اپنی فکر کرو اور نصیر نواز کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم کون ہو اور کیا کچھ کرسکتی ہو لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ نصیر نواز کون ہے اور کیا کچھ کرسکتا ہے۔ اگر کچھ گنوا چکی ہو تو اس پر صبر کرو اور آئندہ کے لئے اپنی حفاظت کرو۔"

اپنی دانست میں' میں نے اسے درست ہی مشورہ دیا تھا لیکن وہ سخت خوفزدہ تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے سخت وحشت ہو رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ کسی معاملے میں ملوث نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اسی دوران مجھے ایک رکشا نظر آگیا اور میں لپک کر اس میں سوار ہوکر اسے وہیں چھوڑ کر روانہ ہوگیا۔ بعد میں مجھے بہت دیر تک اس کا خیال آتا رہا۔ کبھی میں سوچتا کہ شاید اس طرح اس کے انداز میں یکدم بھاگ کر میں نے غلطی کی ہے۔ مجھے اس سے کم بات تو کرنی چاہئے تھی۔ اس کے عزائم کے بارے میں اور معاملے کے بارے میں کچھ تفصیل جاننے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ خواہ میں اس کا ساتھ نہ دیتا' اس کی بات نہ مانتا لیکن کم از کم کچھ جان تو لیتا۔ مجھے اس پر رشک بھی آیا۔ وہ کمسن' نادان کچھ بھی تھی لیکن مجھ جیسے جامد بیدہ سے لاکھ درجے بہتر تھی کہ اس میں ردِعمل ظاہر کرنے کا حوصلہ تو تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے نہیں ملی۔ میں نے نصیر سے اشارتاً بھی اس کا ذکر نہیں کیا کہ کہیں وہ خفا نہ ہوجائے اور اس لڑکی کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ لیکن اب آپ کی باتوں سے تو کچھ ایسا ہی اندازہ ہوتا ہے کہ اسے نقصان سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا تھا وہ پہنچ چکا ہے۔ میری احتیاط کارگر ہوگئی۔" سجاد نسیم ایک سسکی سی لے کر خاموش ہوگیا۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "میں نے جب آپ کو بٹھایا تو نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے آپ سے لڑکی کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ معلوم ہوگا حالاں کہ بظاہر مجھے اس کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا لیکن میری الہامی سی قوت نے میری درست سمت میں ہی رہنمائی کی تھی۔ ارادے مثبت اور نیت میں خلوص شامل ہو تو کتھیاں خود بخود ہی سلجھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ کتھی بھی تقریباً سلجھ ہی گئی ہے۔ اب مجھے صرف چند چھوٹی چھوٹی جزئیات پر کام کرنا ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔" میں اس کے ہاتھ سے تصویر لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ مجھے چھوڑنے گاڑی تک آیا اور ایک بار پھر لمبے چوڑے الفاظ میں میرا شکریہ ادا کرنے لگا لیکن میں نے اسے اس موضوع پر بات کرنے سے روک دیا اور اس علاقے کے پیچ و خم کا نقشہ ذہن نشین کرنے کے بعد وہاں سے رخصت ہوگیا۔

گھر آکر میں نے شاور لیا اور لباس تبدیل کیا۔ اس دوران خنک رات نے اپنا سیاہ دامن پھیلا لیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آج رات کا کھانا مجھے ستارہ کے ساتھ اسی کے گھر کھانا تھا۔ پروگرام کے پہلے سے طے تھا پھر بھی میں نے بہتر سمجھا کہ فون کرکے تصدیق کرلوں' آیا ستارہ گھر پر موجود بھی ہے یا نہیں۔ ان فلمی ستاروں کا کچھ بھروسا نہیں ہوتا۔ دعویٰ تو ستارہ کا یہی تھا کہ میرے معاملے میں وہ بے نیازی برتنے کا سوچ بھی نہیں سکتی لیکن بہرحال وہ صرف نام کی ستارہ نہیں' سچ مچ کا فلمی ستارہ تھی اور اسٹارز کی مصروفیات

کبھی کبھی ایسی صورت اختیار کرجاتی ہیں کہ وہ بڑے بڑے اہم وعدے وفا نہیں کرپاتے۔

میں نے فون پر اس کا نمبر ڈائل کیا تو دوسری طرف دیر تک گھنٹی بجتی رہی مگر کسی نے ریسیور نہ اٹھایا۔ میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ آخر میرا اندیشہ درست ہی نکلا تھا۔ ستارہ چوں کہ تنہا رہتی تھی اس لئے موٹوکروں پر کچھ زیادہ بھروسا نہیں کرتی تھی۔ ایک چوکیدار اس نے مجبوراً رکھا ہوا تھا۔ باقی تمام کاموں کے لئے دو ادھیڑ عمر عورتیں تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان دونوں عورتوں میں سے بھی کسی نے فون نہیں اٹھایا تھا۔ شاید وہ ٹیلی فون سے دور کہیں اپنے کام کاج میں مصروف تھیں۔ میں مایوس ہوکر ریسیور رکھنے ہی لگا تھا کہ اچانک دوسری طرف سے ریسیور اٹھایا گیا۔

"ہیلو۔ ستارہ! کہاں تھیں بھئی؟ میں تو اب ریسیور رکھنے ہی والا تھا۔" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ صرف کسی کے سانس لینے کی ہلکی سی آواز سنائی دی پھر وہ بھی معدوم ہوگئی۔ یوں لگا جیسے ریسیور اٹھانے والے نے سانس روک لی ہو۔ پھر نہایت آہستگی سے ریسیور رکھ دیا گیا۔

میں چند لمحے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریسیور کو دیکھتا رہا۔ میری کھوپڑی کے کسی نیم تاریک گوشے میں الارم بجنا شروع ہوچکا تھا۔ میں نے کسی کو مطلع کرنے کے چکر میں بھی چند لمحے ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور گاڑی نکال کر آندھی اور طوفان کی طرح ستارہ کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ دیکھ کر سرِحال میں نے اطمینان کی سانس لی تھی کہ ٹوٹی اور شبیر کی گاڑی اب بھی میرے پیچھے تھی۔ یہ دونوں کبھی نہ تھکنے والے جنات قسم کے نوجوان تھے۔ بارہ گھنٹے کے لئے یہ میری نگرانی کے فرائض انجام دیتے تھے اور اس دوران سائے کی طرح پیچھے لگے رہتے تھے۔ اس کے بعد بارہ گھنٹے کے لئے یہ ذمے داری حنیف خان اور سردار علی سنبھال لیتے تھے۔ اگر میں اس دوران اطمینان سے گھر میں سو رہا ہوتا تھا تب بھی ان کی گاڑی گھر کے قریب موجود رہتی تھی۔ جب سے میرے گھر میں مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا تب سے میرے ساتھیوں نے ازخود ہی یہ انتظامات کرلئے تھے اور میری ایک نہیں سنی تھی حالاں کہ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔

ٹوٹی اور شبیر نے یقیناً محسوس کرلیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے کیوں کہ ان کی کار بھی تیزی سے حرکت میں آئی تھی اور چند ہی منٹ بعد مجھے ریڈیو کا سگنل سنائی دیا۔ میں نے کار کا خفیہ خانہ کھولا اور ایک ہاتھ سے مختصر سا ٹوکے ٹاکی نکالا۔

بٹن دبانے پر ٹوٹی کی آواز سنائی دی "سر۔؟" اس نے اور کچھ بھی نہیں کہا۔ سوال اس کے لہجے میں تھا۔

"ٹوٹی! ستارہ کی کوٹھی پر کوئی گڑبڑ ہے۔" میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے حتی الامکان پُرسکون لہجے میں کہا "اندر میں ہی جاؤں گا۔ تم دونوں باہر ہی ایسے زاویوں پر کھڑے ہونا کہ کوٹھی کی کسی بھی سمت سے کوئی نکل کر بھاگے تو تمہاری نظر میں آجائے اور بچ کر نہ جانے پائے۔ کوشش کی جائے کہ وہ زندہ ہاتھ آجائے ورنہ گولی ماردی جائے۔"

"ٹھیک ہے سر!" ٹوٹی نے ہموار لہجے میں جواب دیا۔

ستارہ کی گلی میں پہنچ کر میں نے گاڑی ستارہ کے گھر سے کچھ دور ہی چھوڑ دی اور عقبی گلی سے پیدل ہی آگے بڑھا۔ عقبی گلی میں تاریکی تھی۔ ستارہ کے گھر میں پچھلی طرف بھی لان تھا اور عشق پیچاں کی بیلیں دیواروں سے باہر کو لٹکی ہوئی تھیں۔ دیوار خاصی بلند تھی لیکن میرے لئے اسے پھلانگنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

دیوار پر ہاتھ جما کر میں نے نہایت آہستگی سے جسم کو اوپر اٹھایا اور پہلے صرف سر دیوار کی اوٹ سے نکال کر اندر جھانکا۔ میرا خیال تھا کہ شاید کسی طرف سے کوئی گولی سنسناتی ہوئی آئے گی مگر وہاں بدستور سکوت رہا۔ کوٹھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی اور یہ کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔ یکبارگی تو اس احساس سے میرا دل گویا دھڑکنا بھول گیا کہ کہیں مجھے تاخیر تو نہیں ہوگئی؟ گہری تاریکی اور سکوت میں نہ جانے کون سا بھید میرا منتظر تھا۔

نہایت آہستگی سے کچھ اور اونچا ہوکر آخر کار میں نے دیوار پھلانگ لی اور بے آواز طریقے سے اندر لان پر کود گیا۔ مشین پسٹل اب میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور میری آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہوچکی تھیں مگر دیکھنے کے لئے وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ بس وہی چیزیں تھیں جو کسی کشادہ اور خوب صورت لان پر نظر آسکتی ہیں۔ کہیں کوئی باڑھ' کہیں پھولوں بھرے پودے' دیوار کے ساتھ عشق پیچاں کی بیلیں اور پاپلر کے درختوں کی صرف ایک جوڑی۔

اچانک میرے کان کے عین قریب ایک پٹاخا سا پھٹا' کوئی ٹھنڈی سی چیز میری ناک کو چھوتی ہوئی گزری اور پھر شاید وہی چیز کچھ دور گھاس پر جاگری۔ محسوس کچھ یہی ہوا گویا وہ کسی سیال کی مختصر دھار تھی۔ دوسرے ہی لمحے گھاس پر شعلہ بھڑک اٹھا۔ میں سینے کے بل لیٹ چکا تھا لیکن میں نے اندھا دھند فائر نہیں کیا تھا۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ یہ حرکت کس طرف سے ہوئی تھی' پٹاخا کس طرح میرے قریب پھٹا تھا اور یہ سیال چیز کس طرح ایسی تیز رفتاری سے پھینکی گئی تھی اور کیوں کر گھاس پر گرتے ہی بھڑک اٹھی تھی۔ کسی بھی چیز کا اندازہ کئے بغیر فائر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں سینے کے بل گرنے کے بعد بھی ایک جگہ ٹکا نہیں تھا بلکہ دھیرے دھیرے ایک طرف کو کھسک رہا تھا۔ میری نظریں لان کے چپے چپے کا جائزہ لے رہی تھیں مگر کہیں خفیف سی حرکت کے بھی آثار نہیں تھے۔ بھڑکتا ہوا شعلہ بمشکل ایک بالشت اونچا تھا اور تقریباً تین انچ کے قطر میں پھیلا ہوا تھا تاہم تیزی سے سمٹتا جارہا تھا

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ معدوم ہوگیا۔ فضا میں گھاس جلنے کی معمولی سی بُو باقی رہ گئی۔

میں کھسکتے کھسکتے ایک باڑھ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ یہ باڑھ کچن کے عقبی دروازے کے سامنے تھی۔ ایک بار پھر کوئی چیز سنسناتی ہوئی میرے سامنے سے گزری۔ عین میرے چہرے کی سیدھ میں کچھ فاصلے پر پٹاخا سا پھٹا اور گھاس پر شعلہ بھڑک اٹھا۔ یہ چیز جو کچھ بھی تھی' باقاعدہ فائر کی جارہی تھی۔ تاہم اس بار مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ چیز کس طرف سے آئی تھی۔ کوئی پاپلر کے درخت پر چھپا ہوا تھا اور یہ میرے لئے مزید حیرت کی بات تھی کیوں کہ پاپلر کے درخت کی شاخیں ایسی نہیں ہوتیں کہ کوئی انسان ان پر پناہ لے سکے اور نہ ہی وہ اتنا گھنا ہوتا ہے کہ صحیح طور پر کسی کو چھپا سکے۔

میں نے سائیلنسر لگے مشین پسٹل سے فائر کیا۔ درخت میں پھڑپھڑاہٹ سی ہوئی۔ پھر تاریکی میں عجیب سی ہنسی ابھری۔ کافی حد تک یہ غیر انسانی ہی ہنسی تھی۔ اس میں بندر کی خوخیاہٹ سی شامل تھی مگر کچھ تاثر ایسا بھی تھا گویا کوئی نیم جنونی اور اذیت پرست انسان کسی کو تکلیف میں دیکھ کر محظوظ ہورہا ہو۔ اس تاریکی اور سکوت میں اس ہنسی نے مجھ جیسے فولادی اعصاب کے مالک کو بھی ایک بار جھرجھری سی لینے پر مجبور کردیا تھا۔

میں نے باڑھ کی طرف مزید تھوڑا سا کھسک کر درخت کی شاخوں پر فائر کیا۔ اس بار بہت سے پتوں کے ٹکڑے جھڑے اور ساتھ ہی کسی نے درخت سے چار دیواری پر چھلانگ لگائی۔ ملگجے اندھیرے میں اس کا صرف ہیولا نظر آیا اور وہ بے حد عجیب معلوم ہوا۔ شاید وہ عجیب سی جسمانی ساخت کا کوئی مجہول اور پستہ قد انسان تھا۔ وہ غالباً بلندی پر درخت کے تنے سے ہی پچھلی طرف لپٹا ہوا تھا۔ اس کے چھلانگ لگانے کا انداز بندروں کا سا ہی تھا اور پھرتی بندروں سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ میں نے ہوا میں اس کا ہیولا نمودار ہوتے ہی فائر کیا تھا مگر وہ نہ صرف اس سے بچ گیا تھا بلکہ دیوار پر پہنچتے ہی میرے پستول سے بلا تاخیر نکلی ہوئی ایک اور گولی سے بھی بچ کر باہر کود گیا۔ ایک بار پھر وہ مکروہ سی ہنسی ابھری لیکن فوراً ہی معدوم ہوگئی۔

میں فوری طور پر اس کے تعاقب میں لان عبور کرکے اور دیوار پھاند کر نہیں جاسکتا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ابھی کسی تاریک گوشے میں اس کے کتنے ساتھی چھپے ہوئے ہوں۔ اس کے علاوہ اس کی پھرتی کا لحاظ مظاہرہ دیکھنے کے بعد مجھے اندیشہ یہی تھا کہ میرے باہر پہنچنے تک وہ نہ جانے کہاں پہنچ چکا ہوگا۔ بس ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید ٹونی یا شبیر میں سے کوئی اسے پکڑنے میں کامیاب ہوگیا ہو۔ ان کے پاس گنیں بغیر سائیلنسر کی تھیں۔ ان گنوں پر سائیلنسر فٹ کرنے سے گن کے جام ہونے کا اندیشہ رہتا تھا۔ تاہم ان کی ساخت ہی ایسی تھی کہ فائر کی آواز بہت کم ہوتی تھی مگر میں نے فائر کی ہلکی سی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ پستہ قد شخص یا تو صحیح سلامت نکل گیا تھا یا پھر ٹونی اور شبیر میں سے کسی نے اسے قابو کرلیا تھا۔

میں چاروں ہاتھ پیروں کے بل چلتا ہوا کچن کے دروازے تک پہنچا۔ دروازہ کھلا ہی تھا۔ میں نے آہستگی سے اسے اندر دھکیلنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی باہر گھاس کے قطعے پر روشنی کا ایک مستطیل پھیلنے لگا۔ کچن کے اندر روشنی تھی جو دروازہ کھلنے کے ساتھ ساتھ باہر آرہی تھی مگر یہ روشنی بہت کم تھی۔

دروازہ کافی کھل چکا تب بھی اندر سے کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا۔ آخر کار میں نے سر نیچا رکھتے ہوئے اندر جھانکا۔ کوکنگ رینج پر ایک چولھا روشن تھا اور گیس کا شعلہ دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ اس کی وجہ سے کشادہ کچن میں تھوڑی سی روشنی تھی ورنہ وہاں لائٹ تو آف ہی تھی۔

ستارہ کی موٹی سی سانولی ملازمہ آڑی ترچھی فرش پر پڑی تھی۔ چولھا جلانے کا لائٹر اس کے ہاتھ میں ہی دبا ہوا تھا۔ باہر سے ہی اسے دیکھ کر مجھے کم از کم اتنا اندازہ ضرور ہوگیا کہ وہ زندہ تھی۔ اس کے بھاری بھرکم سراپا کا کہیں سے پھولنا پچکنا بتا رہا تھا کہ سانسوں کی آمدورفت جاری تھی۔ شاید اس وقت اس نے چولھا روشن کیا ہی تھا کہ جب اسے بے ہوش کردیا گیا۔

کچن میں اور کوئی نہیں تھا۔ اندر پہنچ کر سرسری طور پر دیکھنے سے ہی مجھے ملازمہ کی کھوپڑی پر بڑا سا گومڑ نظر آگیا۔ کچن سے ہی غالباً اسٹیل کا ایک ڈونگا اٹھا کر اس کے سر پر رسید کیا گیا تھا۔ چینی کے دو تین برتن بھی قریب ہی ٹوٹے پڑے تھے' روشنی کے لئے لگا ہوا گلوب بھی بلب سمیت ٹوٹا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کچن میں کسی نے تھوڑی سی اچھل کود مچائی تھی۔

میں ملازمہ کو وہیں چھوڑ کر اسی طرح محتاط انداز میں لاؤنج میں پہنچا۔ وہاں بھی تاریکی اور سکوت نے میرا استقبال کیا۔ لگتا یہی تھا کہ جن لوگوں نے بھی یہاں آکر کارروائی کی تھی ان میں سے اب کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ لاؤنج سے گزر کر میں ستارہ کے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے دروازے کے قریب ہی پڑی مل گئی۔ وہ بھی بے ہوش تھی۔ اس کی کنپٹی پر وار کیا گیا تھا۔ ضرب زیادہ خطرناک نہیں تھی۔

میں نے اطمینان کی سانس لی اور اسے اٹھا کر بیڈ پر ڈالا۔ اس وقت تک وہ خود بھی کسمسانے لگی تھی۔ میں نے لائٹ جلائی اور فریج سے پانی لاکر اس کے منہ پر چھینٹے مارے۔ ہلکی سی کراہ کے ساتھ وہ جلد ہی ہوش میں آگئی۔

میری صورت دیکھتے ہی اس نے مضبوطی سے میرا بازو تھام لیا اور اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "خدا کا شکر ہے تم آگئے انی!" ... پھر اس نے خوف زدہ سی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا اور تھوک نگل کر بولی "وہ کہاں ہے؟ کیا وہ چلا گیا؟"

"کون؟" میں نے اس کا سر سہلاتے ہوئے تحمل سے پوچھا۔

"وہ بندر..... وہ جسیم قسم کا چمپنزی ... اف خدایا! کیسا بھیانک اور مکروہ صورت تھا۔" اس نے جھرجھری سی لی اور مجھے اپنے کچھ اور زیادہ قریب کرلیا۔

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ تو وہ ہیولا اسی لئے مجھے کچھ غیر انسانی محسوس ہوا تھا کہ درحقیقت وہ انسان تھا ہی نہیں۔

ستارہ کمزور سی آواز میں بولی "میں نے زندگی میں خاصے جانور دیکھے ہیں اور خاصا طویل عرصہ جنگلوں میں بھی گزارا ہے۔ شہری زندگی اختیار کرنے کے بعد بھی بہت سے جانوروں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور اب جب سے "جنگل گرل" سائن کی ہے تب سے بھی بہت سے جانوروں سے واسطہ پڑ رہا ہے۔ بعض جانور چمپنزی سے بھی زیادہ بدشکل ہوتے ہیں لیکن کسی کی آنکھوں میں اور صورت پر آج تک میں نے خباثت اور شیطانیت کی یہ انتہا نہیں دیکھی جو اس منحوس میں دیکھی۔ میرا خیال ہے وہ گھر میں داخل تو پچھلی طرف سے ہوا تھا لیکن دونوں ملازماؤں کے علاوہ شاید گیٹ پر جاکر چوکیدار کو بھی کسی طرح بے ہوش کر آیا تھا۔ کیوں کہ میں ان تینوں کو پکارتی رہی مگر کسی کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ یہاں اس کمرے کے دروازے پر پہنچتے ہی وہ عجیب و غریب انداز میں اچھلنے کودنے لگا۔ وہ انسانوں کی طرح قہقہے لگانے کی کوشش کررہا تھا اور اس کی آوازیں کرونگنے کھڑے ہورہے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں عجیب سی گن تھی اور دوسرے ہاتھ ..... اب میں تمہیں کیا بتاؤں ... بہت شرمناک حرکتیں کررہا تھا وہ۔" ایک بے باک عورت ہونے کے باوجود ستارہ نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپالیا۔

میں نے اس کی کنپٹی کی چوٹ سہلاتے ہوئے کہا "وہ بس یکدم ..... اچانک تمہارے سامنے آگیا تھا؟"

"مجھے گھر میں کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔ پھر کچن کی طرف سے چھناکا سنائی دیا۔ میں سمجھی شاید ملازمہ نے کوئی برتن توڑ دیا ہے۔ میں تمہارے انتظار میں بیقرار ہوکر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی۔ ابھی میں یہ دیکھنے کے لئے اٹھی ہی تھی کہ کیا چکر ہے' اچانک وہ چھلانگ مار کر دروازے پر آگیا۔" ایک لمحے کے لئے وہ پھر خاموش ہوگئی۔ اس کے دلکش چہرے پر سرخی گہری ہوگئی "مجھے تو اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ وہ مجھ پر وہی حملہ نہ کردے جسے اخباری زبان میں مجرمانہ حملہ کہا جاتا ہے۔ مگر پھر اچانک ہی اس نے حیرت انگیز پھرتی سے اچھل کر اپنی اس عجیب سی گن کا دستہ میری کنپٹی پر رسید کردیا۔ میں چکرا کر گر پڑی۔ آخری منظر بس میں نے یہی دیکھا کہ وہ فاتحانہ انداز میں اچھلتا ہوا کمرے سے رخصت ہورہا تھا۔ اس کے جسم میں گویا بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔"

"تم اب کیسا محسوس کررہی ہو؟" میں نے ستارہ کو آرام سے لٹاتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہی ہوں۔ بس اس جگہ خاصا درد ہے۔" اس نے کنپٹی پر ذرا سا دباؤ ڈال کر دیکھا اور کراہ کر رہ گئی "میرا خیال ہے اس اچانک افتاد نے مجھے خوف زدہ زیادہ کردیا تھا۔ ویسے یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے؟ وہ چمپنزی خود تو ظاہر ہے نہیں آیا ہوگا ... وہ گن بھی عجیب تھی۔ اس نے اس سے لاؤنج میں فائر کیا تو ایک پٹاخا سا پھٹا اور لاؤنج کے فرش پر شعلہ بھڑک اٹھا۔ شکر ہے اس نے کمرے میں فائر نہیں کیا ورنہ قالین آگ پکڑ سکتا تھا اور یوں سارے گھر میں آگ لگ سکتی تھی۔ آخر ..... آخر اس کا مقصد کیا تھا؟"

"اس قسم کے بیسیوں سوالات تو اس وقت میرے ذہن میں بھی چکرا رہے ہیں لیکن کسی کا جواب میرے پاس بھی نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "فی الحال تم آرام سے لیٹو۔ میں ذرا بے چاری ملازماؤں اور چوکیدار کی بھی خبر لے لوں۔"

میں نے پوری کوٹھی کی بتیاں روشن کیں۔ دوسری ملازمہ مجھے لان پر ہی پڑی مل گئی۔ وہ شاید الگنی سے سوکھے ہوئے کپڑے اتارنے آئی تھی۔ چوکیدار گیٹ کے قریب ہی اندر کی طرف روش پر پڑا تھا۔ ہوش میں آنے پر اس نے بتایا کہ وہ آرام سے اپنی کرسی پر بیٹھا گپڑی اتار کر بالوں میں کنگھی کررہا تھا کہ دھم سے کوئی وزنی چیز اس کے سر پر آکر لگی۔ ساتھ ہی کسی جانور کی خوخیاہٹ سی سنائی دی اور وہ کرسی سے لڑھک کر بے ہوش ہوگیا۔ وہ وزنی سی چیز ایک گملا تھا جو قریب ہی روش پر گر کر ٹوٹ چکا تھا۔ چوکیدار کو یہی افسوس ہوئے جارہا تھا کہ اس نے پگڑی کیوں اتاری۔ سر پر دینز پگڑی ہوتی تو وہ اچھی خاصی چوٹ سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ وہ بزرگوں کی اس حکمت بھری نصیحت کو یاد کرکرکے سر دھن رہا تھا کہ ننگے سر نہیں رہنا چاہئے۔ شیطان ضرور کچھ نہ کچھ مار دیتا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا "خان صاحب! جب آپ پگڑی باندھتے ہیں تو پھر آپ کو بال سنوارنے اور ان میں کنگھی پنی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بال کون سا کسی کو نظر آنے تھے؟"

خان صاحب اپنی چوٹ سہلا کر قدرے شرما کر بولے "پگڑی اپنی جگہ اے صاب! بالوں میں کنگی اپنی جگہ اے ..... کنگی منگی کرکے ذرا دل پشوری ہوجاتا اے ..... اور کوئی امارے بالوں کو نئیں دیکھتا ..... مگر ام خود تو شیشے میں دیکھتا اے نا ..... اور ام سمجھتا اے کہ نورجان ام کو دیکھتی اے۔"

"یہ نورجان کون ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"وہ امارا گھر والی ہے اور بتوں میں اے۔ جب بیگم صاب اجازت دے گا تو ام نورجان کو بھی اور بلالے گا۔" خان صاحب کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ میں نے ان لوگوں کی تھوڑی بہت دوا دارو کرنے کے بعد انہیں ان کی جگہوں پر بھیج دیا۔ غنیمت تھا کہ کسی کو زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ کوئی فریکچر وغیرہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کسی کو زخم آیا تھا۔

حالات معمول پر آچکے تو ستارہ بولی "میں سمجھتی ہوں کہ یہ

اس خبیث چھچھوندر کی کچھ مہربانی ہی تھی جو اس نے ہاتھ ہلکا ہی رکھا ورنہ وہ مجھے ایسی ضرب لگانے کا بھی پوری طرح اہل نظر آرہا تھا جو انسانی کھوپڑی کو پاش پاش کردے۔ اور میرا خیال ہے اگر وہ کسی کو بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیتا تو ہڈیاں چکنا چور کرسکتا تھا۔ بظاہر بھی وہ پستہ قد کے کسی نہایت گٹھے ہوئے مضبوط جسم والے آدمی کے برابر تھا اور اس کے جثے سے کہیں زیادہ حیوانی طاقت اس میں مقید نظر آتی تھی۔"

"تم کسی انسان سے آج تک اتنی متاثر نہیں ہوئیں جتنی اس چھچھوندر سے متاثر نظر آرہی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں اصل میں پوری طرح سمجھ نہیں پارہی ہوں.... وہ ایک غیر معمولی چھچھوندر تھا۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔

"مجھے اندازہ ہوگیا ہے۔ لیکن کاش وہ میرے ہاتھ آجاتا۔" میں نے تاسف زدہ لہجے میں کہا۔

"وہ ہاتھ آنے والی چیز نہیں لگتا۔" ستارہ گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"میں ذرا اس کے بارے میں تھوڑی سی معلومات اور کر آؤں۔ دو منٹ میں آتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

باہر آکر میں نے دیکھا ٹونی اور شبیر کوٹھی کے دو مختلف کونوں پر تاریک اندھیرے میں مستعد کھڑے تھے۔ گئیں انہوں نے اپنے جسموں کی آڑ میں کی ہوئی تھیں۔

"تمہیں وہ چھچھوندر فرار ہوتا نظر آیا تھا؟" میں نے ٹونی سے پوچھا۔

"جی ہاں" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تم نے اسے پکڑنے یا شوٹ کرنے کی قطعاً کوشش نہیں کی؟" میں نے محض ایک موہوم امید کے سہارے پوچھا۔ حالاں کہ مجھے معلوم تھا' جواب مایوس کن ہی ہوگا۔

"چھچھوندر کو؟" ٹونی نے حیرت سے پوچھا۔ "ہم تو سمجھے تھے' کسی کا پالتو چھچھوندر ہوگا اور شرارتاً گھر سے نکل بھاگا ہوگا۔"

"پالتو تو وہ یقیناً تھا۔ مگر..... خیر۔ چھوڑو۔" میں نے سر جھٹکا اور واپس اندر جانے کے لئے مڑتے ہوئے کہا "تم چاہو تو اب ڈیوٹی تبدیل کرسکتے ہو۔ میں آج رات یہیں رہوں گا۔"

"بہت بہتر۔" ٹونی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تاکہ ریڈیو پر پیغام دے کر دوسرے دو ساتھیوں کو بلوا سکے۔

میں واپس ستارہ کے بیڈ روم میں آگیا۔ میری نظر سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ پر پڑی اور میں نے ستارہ کو بتایا کہ آنے سے قبل میں نے اسے فون کیا تھا تو کسی نے ریسیور اٹھا کر صرف ایک گہری سانس لے کر واپس رکھ دیا تھا۔

"یقیناً وہی چھچھوندر ہوگا۔" ستارہ فوراً بولی "اسے بالکل انسانوں کی طرح تمام باتوں کی سوجھ بوجھ تھی۔ شکر ہے اس کے ہاتھ میں سچ مچ کی گن نہیں تھی۔"

"اگر ہوتی تب بھی شاید وہ کسی کو ہلاک نہ کرتا۔ اگر کسی زیادہ نقصان پہنچانا مطلوب ہوتا تو وہ اپنی اس ظلیم گن سے بھی کام لے سکتا تھا۔ اسے شاید صرف ہڑبونگ مچانے اور خوف زدہ کرنے کے لئے ہی بھیجا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ ستارہ نے غالباً کوئی سوال کرنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ستارہ نے ریسیور اٹھایا لیکن پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھ کر بولی "تمہارے لئے فون ہے۔ کیا تم کسی کو بتا کر آئے تھے کہ تم اس نمبر پر ملو گے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ قدرے ناگواری سے بولی "جو کوئی بھی ہے وہ کمینہ بات بھی بڑی بدتمیزی سے کررہا ہے۔ کہہ رہا ہے ذرا اپنے یار سے بات کراؤ۔ سؤر کا بچہ کہیں کا۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا "فارسی میں یار' دوست کو ہی کہتے ہیں اور دوست تو میں ہر حال ہوں تمہارا۔"

میں نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "کس حرامی کو ضرورت آن پڑی ستارہ کے یار سے بات کرنے کی؟"

"یاروں کے یار کو" دوسری طرف سے ترکی بہ ترکی جواب ملا۔ آواز میرے لئے شناسا تھی لیکن لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ کچھ بار میں نے اس شخص کو فون پر ہی انگریزی میں بات کرتے سنا لیکن انگریزی اس کی اصل زبان معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اور اب بامحاورہ اردو میں بات کررہا تھا لیکن اردو بھی اس کی مادری زبان معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کا تعلق "ریڈ ڈاٹ" سے تھا۔ یہ واضح نہیں ہوسکا تھا کہ وہ تنظیم کا سربراہ تھا۔ کوئی عام کارکن یا کچھ موٹا عہدیدار۔ اور نہ ہی ریڈ ڈاٹ کے سربراہ کا کچھ پتا چلا تھا۔

"خاموش کیوں ہوگئے؟" اس بھاری اور گونجیلی سی آواز نے پوچھا۔

"یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ یہ جھینگر جیسی آواز اس سے پہلے کہاں سنی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"جس روز اس آواز نے تمہاری موت کے احکامات جاری کردئے اس روز اس جھینگر کی تلاش میں مارے مارے پھرو۔ تاکہ رحم کی بھیک مانگ سکو۔" وہ غرایا۔

"تو اتنی دیر کس بات کی ہے؟ جاری کرچکو نا احکامات۔ معاملہ کسی ایک طرف تو ہو جائے۔ میری اب یہ ظلمی لن ترانیاں سننے کی عمر نہیں رہی۔ میں کوئی ہائی اسکول کا لڑکا تو ہوں نہیں۔" میں نے بے زاری سے کہا "ویسے میرے عقیدے کے مطابق زندگی اور موت کے احکامات بہت بلندیوں سے جاری ہوتے ہیں۔ تم جیسے جھینگروں کے حکم پر اگر کسی کو موت آسکتی تو اس زمین پر صرف موت ہی موت کا راج ہوتا۔ زندگی تو کہیں نظر ہی نہ آتی۔"

"تمہاری یہی چکار' یہی دلیری اور بے خوفی تو ہمیں پسند ہے۔" اس بار وہ گاؤ کھائے بغیر بولا "کبھی کبھی تو ہم سنجیدگی سے سوچتے ہیں کہ تمہیں ہم لوگوں کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ خیر۔ یہ بات چھوڑو۔ ان باتوں کو سے بتاؤ ہمارا بلیک بڑ پسند آیا؟"

"بلیک بڑ۔؟" میں سمجھ تو گیا تھا کہ بلیک بڑ سے ان کی مراد ہوسکتی ہے لیکن یونہی تصدیق کے لئے ذرا انجان بن رہا تھا۔

"ہمارا چھچھوندر۔" وہ سرد سے لہجے میں بولا "ایک ماہر جنات کی کئی سال کی محنت کا شاہکار ہے وہ۔ وقتاً فوقتاً تمہیں اپنے کرتب دکھاتے آتا رہے گا۔"

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا "مجھے پہلے ہی شبہ سا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ بے تکی حرکت تم لوگوں کی نہ ہو۔ اگر تمہارا تجربہ آرٹ کا شاہکار ایک آدھ منٹ اور یہاں ٹھہر گیا ہوتا تو میں کا صرف فریم ہی تم تک پہنچتا۔ پینٹنگ غائب ہوچکی ہوتی۔"

"خوش فہمی ہے تمہاری۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ اس کا قہقہہ بھی گونجیلا سا تھا' جیسے کوئی تہ خانے میں ہنس رہا ہو "وہ تو گولی کی زد میں بھی نہیں آتا۔ بڑے کام کی چیز ہے۔"

"مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم لوگوں کا جو آدمی ہمارے ہاتھوں مارا گیا تھا اس کی صورت شکل اور شخصیت بھی بندر سے بہت ملتی جلتی تھی۔ تم لوگوں کی تنظیم کہیں بندروں پر ہی تو مشتمل نہیں ہے؟"

"اس اعتبار سے بھی ہم تمہارے آباؤ اجداد ہوئے۔" وہ آج بہت خوشگوار موڈ میں معلوم ہوتا تھا۔

"ہم لوگ ڈارون کی تھیوری کو نہیں مانتے۔ ہمارا نظریۂ حیات دوسرا ہے۔" میں نے کہا "تم چاہو تو خوشی سے اسے اپنا جداامجد قرار دیتے رہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"دو چار ملاقاتوں کے بعد تم بھی اسے اپنا جداامجد مان لو گے۔" وہ بولا۔

"یہ تو ملاقات کے بعد ہی پتا چلے گا۔" میں نے بے زاری سے کہا "لیکن یہ تو بتاؤ کہ آخر ان حرکتوں سے تمہارا مقصد کیا ہے؟"

"تمہیں صرف یہ بتانا کہ تم اور تمہاری عزیز ترین ہستیاں کس حد تک ہماری دسترس میں رہتی ہیں اور ہمیں تمہارے معمولات کا کس حد تک علم رہتا ہے۔" اس کے لہجے میں حقیقتاً فخر جھلک آیا۔

"چلو مان لیا کہ تم مجھ پر یہ سب کچھ جتانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے بعد....؟" میں نے ملائمت سے کہا "کیا فائدہ ہوگا تمہیں اس سے؟"

"تمہیں اوقات پر رکھنے میں مدد ملے گی۔ ورنہ ہمیں معلوم ہے تم ضرور ہمارے کچھ کاموں میں ٹانگ اڑاؤ گے۔" وہ بولا۔

"میری ٹانگیں اتنی فارغ نہیں ہیں کہ میں انہیں غیر متعلقہ کاموں میں اڑاتا پھروں۔ میں ایک مصروف آدمی ہوں اس لئے ظاہر ہے میری ٹانگیں بھی مصروف ہی رہتی ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"بات تمہارے موڈ کی ہے نا۔ تم جب چاہو کسی بھی غیر متعلقہ کام کو متعلقہ سمجھ لیتے ہو۔ خصوصاً دوستوں کے بارے میں بہت جذباتی ہوجاتے ہو۔ اب مثلاً آج اگر تمہاری اس ظلمی حسینہ ستارہ کو ہی کچھ ہوجاتا تو اسے تم اپنا مسئلہ سمجھ لیتے۔ حالاں کہ تم نے کوئی ستارہ کی سلامتی کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا۔"

"لے رکھا ہے نا" میں نے پہلے سے بھی زیادہ سنجیدگی سے کہا۔ "اس کے بارے میں کوئی خیال بھی دل میں مت لانا۔ ورنہ تمہارا اور تمہاری تنظیم کا انجام عبرت ناک ہوگا۔ ظاہر ہے تم لوگ ساری عمر تو مجھ سے چھپے نہیں رہ سکو گے۔"

"اس خیال کو تو دل سے نکال دو کہ تمہارے ہاتھ تنظیم تک پہنچ سکتے ہیں۔ یا اگر ہاتھ پہنچ بھی جائیں تو تم تنظیم کا کچھ بگاڑ سکتے ہو۔" وہ قہقہہ لگا کر بولا "ہنی کے سلسلے میں تم نے اب تک کیا کرلیا؟ لے دے کر ایک وہ بے چارہ اے ایس آئی شریف سیال ہے' اسے یاددہانی کے فون کرتے رہتے ہو۔ ایک معمولی اے ایس آئی بے چارہ ہمارے معاملات میں کیا کرے گا۔ اسے تو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں ہوتا۔"

"تو پھر آئی جی صاحب سے کہہ دوں؟" میں نے کہا "اگر تم محض عہدے کی وجہ سے اے ایس آئی کو حقیر سمجھ رہے ہو تو کوئی بات نہیں۔ آئی جی صاحب سے بھی تھوڑی بہت دوستی ہے۔"

"وہ تو ہمیں بھی معلوم ہے لیکن اتنا معصوم بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم میرا مطلب بخوبی سمجھ رہے ہو۔ یعنی یہ کہ ہم لوگوں کے معاملات میں پولیس بے چاری کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ ان کی ذہنیت ان کا طریقۂ کار سب کچھ سوڈیڑھ سو سال پرانا ہے۔"

"چلو پھر میں کسی ماڈرن ایجنسی کی خدمات حاصل کرلیتا ہوں۔ مثلاً اسکاٹ لینڈ یارڈ.... سی آئی اے.... سی بی ڈی وغیرہ۔ میں کوشش کروں گا تو امید ہے ان میں بھی کہیں نہ کہیں تعلق واسطہ' یاری دوستی نکل ہی آئے گی۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"فی الحال تو تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے نا۔ لیکن جلد ہی تم سنجیدگی سے ان خطوط پر سوچنے پر مجبور ہوجاؤ گے اور افسوس کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہوگی۔" وہ گویا میری حالت پر افسوس کرتے ہوئے بولا۔

"دیکھو یار.... ! میں بہت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ اگر تمہاری تنظیم اتنی ہی طاقتور ہے' اتنے وسائل ہیں تم لوگوں کے پاس۔ تو پھر ٹیلی فون پر اس قسم کی مکالے بازی میں وقت ضائع کرتے رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر مجھے موا سکتے ہو تو موا ڈالو۔ علی الاعلان مقابلہ مقصود ہے تو چیلنج دے کر سامنے آجاؤ۔ غرضیکہ جو بھی کرنا ہے خدا کے لئے کر گزرو۔ میں یہ چوہے بلی کا کھیل کھیلنے والا آدمی نہیں ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ کل ہونا ہے وہ آج ہی ہوجائے۔ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنا مجھے پسند نہیں۔ کب تک تم لوگ یونہی فون پر دھمکیاں دیتے رہو گے؟ بڑی بڑی باتیں کرتے رہو گے؟" میرے لہجے میں تندی آگئی۔

"دھیرج میری جان!" وہ نہایت ملائمت اور رسان سے بولا "ابھی تو تم دیکھتا کیا کچھ ہوگا۔ تمہارے ارمان بھی پورے ہوں گے۔ اتنی جلدی کس بات کی ہے۔ یہاں جو کچھ ہوگا اس سے تم جیسے لوگ بھی پناہ مانگنے لگیں گے۔ لیکن تمہارے ساتھ ہمارا رویہ ابھی تک دوستانہ اس لئے ہے کہ تم جیسے لوگوں کے ہم قدردان ہیں۔ کیا معلوم کب تم ہماری مشینری کا پرزہ بننے پر آمادہ ہو جاؤ۔ ہم جوہری ہیں۔ ہیرے کو بہت دور سے دیکھ لیتے ہیں۔ تم پر ہماری مہربانیاں بے سبب نہیں ہیں۔"

"ایک مہربانی مجھ پر اور کرو۔" میں نے التجائیہ سے لہجے میں کہا "کبھی آکر اپنی منحوس صورت دکھا جاؤ۔ یقیناً بندر سے مشابہ ہوگی۔ میں صرف اپنے اندازے کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔"

"چمکتے رہو پیارے!" وہ بدستور خوشگوار لہجے میں بولا "فی الحال تمہیں ہماری طرف سے چمکنے کا لائسنس ملا ہوا ہے۔"

"لائسنس کی تجدید کی فیس بتا دو۔ میں باقاعدگی سے جمع کراتا رہوں گا تاکہ لائسنس منسوخ نہ ہونے پائے۔" میں نے کہا۔

"فیس صرف یہی ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔" وہ ملائمت سے بولا۔

"بنی کی بازیابی کو بھی میں اپنا ہی کام سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تمہاری یہی سوچ تو غلط ہے۔ اسے بھول جاؤ۔ شہر میں اور بھی 'اس سے کہیں زیادہ حسین لڑکیاں موجود ہیں جو تمہارے التفات کی منتظر بھی رہتی ہیں۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"بات حسن کی نہیں تعلقِ خاطر کی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"کم از کم ستارہ کے پاس بیٹھ کر تو ایسی باتیں مت کرو۔ بے چاری کا دل ٹوٹ جائے گا۔" اس کے لہجے میں پھر شوخی جھلک آئی۔

"اچھا صرف یہ بتا دو' تم لوگ اس کے ساتھ کوئی برا سلوک تو نہیں کر رہے؟ اسے کوئی ذہنی یا جسمانی اذیت تو نہیں پہنچا رہے؟"

"نہیں۔ اس کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ ان اقدامات کی ضرورت پڑے۔ اب تو مطمئن ہو؟"

مجھے اس کے لہجے میں صداقت کی جھلک محسوس ہوئی اور دل کو قدرے اطمینان ہوا ورنہ میں اس لڑکی کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔

میں ایک لمحے خاموش رہا تو وہ بولا "میں نے تم سے جو باتیں کی ہیں وہ محض گپ شپ یا وقت گزاری نہیں تھی۔ ان میں خود غرض کے بہت سے پہلو ہیں اور میرا مشورہ ہے کہ خود غرض ضرور کرنا۔ اور ہاں۔۔۔ کراچی میں تمہارا جو فائیو اسٹار ہوٹل تقریباً مکمل ہو چکا ہے' بہت خوب صورت ہے۔ یونہی باتوں باتوں میں یاد آگیا تو سوچا کہ مبارکباد دے دوں۔ ویسے خیال رکھنا' کوئی ایسی حرکت نہ کرنا کہ عین افتتاح کے دن ہوٹل زمین بوس ہو جائے۔ اتنی حسین عمارت ملبے کا ڈھیر بن جائے اور کوئی بعید نہیں تقریبِ افتتاح پر آئے ہوئے سیکڑوں مہمان بھی اسی ملبے میں ہو جائیں۔ کیسی کیسی حسین' اہم اور معروف شخصیات شامل ہوں گی مہمانوں میں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے' جو لوگ کاروبار کی دنیا میں کوئی مقام رکھتے ہیں وہ دشمنیوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ خصوصاً ہم جیسے لوگوں سے۔"

میرے جسم میں ایک خفیف سی سرد لہر دوڑ گئی۔ اس میں شک نہیں تھا کہ وہ لوگ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ اگر وہ لوگ کراچی میں میرے کاروبار وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے تو کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھیوں کی اصل حیثیتوں سے بھی واقف رہے ہوں۔ گو کہ ہم لوگ ایک عرصے سے تمام زیرِ زمین دھندے ترک کر چکے تھے اور ہمارے تمام کاروبار اب کسی نہ کسی طرح جائز کاروباروں کی مد میں آچکے تھے۔ ہمارا قانونی طور پر کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔

میرے تمام ساتھی منظرِ عام پر ہی رہتے تھے لیکن اس کے باوجود اپنی اپنی جگہ ان کی ایک خفیہ حیثیت بھی تھی۔ جن معاملات میں ہمیں جلد شنوائی یا انصاف ملنے کی توقع نہیں ہوتی تھی' انہیں ہم خود ہی نمٹاتے تھے۔ کبھی کبھار کسی فرعون صفت کو سزا دینا بھی مقصود ہوتا تھا۔ کسی سے کوئی حساب بھی چکانا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے یہ سب کام خفیہ انداز میں انجام دیئے جاتے تھے۔ ان کے بارے میں کسی کا آگاہ ہو جانا ہمارے لئے الجھن کا باعث ہوتا تھا۔ خصوصاً ایسے لوگوں کا آگاہ ہونا تو بہت برا تھا جو خود ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔ ہوٹل کے بارے میں اس شخص کی دھمکی میرے لئے کچھ نہ کچھ تشویش کا باعث تھی۔ اس ہوٹل پر میرا کروڑ روپیہ لگ چکا تھا۔ روپے سے قطع نظر یہ نکتہ زیادہ توجہ طلب تھا کہ اگر عین افتتاح کے دن شہر کی' بلکہ ملک بھر کی کچھ چیدہ چیدہ شخصیتیں کسی حادثے کا شکار ہو جاتیں اور میں خود کسی طرح اس حادثے سے بچ جاتا تو کراچی یا لاہور میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔

تاہم میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "اس قسم کے خیالات میں نہ لانا۔ ورنہ یہ سرزمین تمہارے لئے جہنم بن جائے گی۔ آتشِ فشاں جب تک پھٹتا نہیں بہت بے ضرر نظر آتا ہے۔ میرے ضرر نظر آنے سے دھوکا مت کھاؤ۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بڑے مطمئن و مسرور لہجے میں "خالی گیدڑ بھبکیوں سے کیا ہوتا ہے۔ تم بھی یہیں ہو' ہم بھی یہیں ہیں۔ وقت بتا دے گا کس کی کیا حیثیت ہے۔ خدا حافظ۔" اس نے اچانک ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں چند لمحے ریسیور کو گھورتا رہا' پھر کارڈلیس پر رکھ دیا۔

اسی لمحے ستارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ میری اس گفتگو کے دوران ستارہ ہال میں چلی گئی تھی۔ دراصل اس شخص سے گفتگو

شروع ہوتے ہی میں نے ستارہ کو ایک چٹ لکھ کر دی تھی۔ اس پر میں نے ایک فون نمبر کے ساتھ لکھا تھا "اس نمبر پر ٹیلی فون ایکسچینج میں حفیظ نامی ایک شخص موجود ہوگا۔ اسے اپنا فون نمبر بتا کر کہو کہ کوئی شخص اس نمبر پر بات کر رہا ہے۔ فوری طور پر معلوم کیا جائے کہ وہ کس نمبر سے بات کر رہا ہے۔ یہ پیغام اسے میری طرف سے دینا۔ وہ فوراً جواب دے گا۔"

ستارہ کے ہاں دوسرا فون موجود تھا جو ہال میں رکھا تھا۔ ستارہ میری ہدایت پر عمل کرنے کے لئے اس فون پر چلی گئی تھی۔ میں نے اس دوران اسی لئے اس نامعلوم شخص سے فون پر اپنی گفتگو کو حتی الامکان طول دیا تھا۔ چٹ لکھتے وقت بھی میں نے اس سے بات جاری رکھی تھی۔

ستارہ میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں وہی چٹ تھی جو میں نے دی تھی۔ چہرے پر مایوسی تھی۔

"کیا حفیظ نہیں ملا؟" میں نے پوچھا۔

"حفیظ تو مل گیا تھا لیکن بات کرنے والے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔" ستارہ بولی "حفیظ نے بہت اچھی طرح چیک کیا اور وہ خود بھی یہ جان کر حیرت زدہ بلکہ کسی حد تک دہشت زدہ ہو گیا کہ وہ کال ایکسچینج کے تھرو نہیں آرہی تھی۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ستارہ؟ یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"یہ میں نہیں کہہ رہی' یہ تمہارا حفیظ کہہ رہا تھا اور یہ کیسے ممکن ہے' یہ خود اس کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اب یا تو تمہارا حفیظ جھوٹ بول رہا تھا' ہمیں ٹرخا رہا تھا۔ یا پھر حقیقتاً کوئی چکر تھا۔"

"حفیظ میرے معاملے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ بھروسے کا آدمی ہے۔" میں نے کہا۔ امید کی جو موہوم سی کرن میرے ذہن میں ابھری تھی وہ بھی معدوم ہو گئی۔ وہ آج سے کئی سال پہلے کا زمانہ تھا۔ جاپان الیکٹرانکس کی دنیا میں اس وقت بھی بہت آگے تھا مگر پھر بھی ترقی کی رفتار ویسی انقلابی نہیں تھی جیسی آج ہے۔ آج تو روزانہ ایک نئی دھماکا خیز ایجاد مارکیٹ میں آتی ہے اور کم سے کم وقت میں ہمارے ملک تک بھی اس کے اثرات پہنچ جاتے ہیں لیکن اس وقت یہ عالم نہیں تھا۔ ترقی کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی۔ میرے لئے بھی یہ بات خاصی حیرت کا باعث تھی کہ ایکسچینج کے توسط کے بغیر باقاعدہ گھنٹی بجنے کے بعد ایک ٹیلی فون سیٹ پر کال ریسیو ہوئی تھی۔

میں نے ابھی تک ریڈ ڈاٹ کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب مجھے کچھ کچھ یقین ہونے لگا تھا کہ یہ کوئی خاصی مضبوط تنظیم تھی اور اس کے مقاصد بھی یقیناً چھوٹے موٹے نہیں تھے۔ میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو چلا تھا کہ جلد از جلد مجھے کراچی اور لاہور میں پھیلے ہوئے اپنے تمام ساتھیوں کو بلا کر ایک خفیہ اور تفصیلی میٹنگ کرنی چاہئے اور اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل طے کر کے انہیں ضروری ہدایات دینی چاہئیں۔ اس معاملے میں اب ہوشیار ہو جانا ہی بہتر تھا۔

"میں پہلی بار تمہیں کچھ فکر مند سا دیکھ رہی ہوں۔ کیا یہ بہت خطرناک لوگ ہیں؟" ستارہ نے سادگی سے پوچھا۔

"نہیں' نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اصل میں میرے معاملے میں کئی سمتوں سے کئی مختلف طرح کے لوگ مصروفِ عمل ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ذرا کچھ عرصے کے لئے کاروبار سے توجہ کم کر کے ان سب کا ہی بندوبست کر دوں تاکہ سکون سے زندگی سے کچھ انجوائے کر سکوں۔ ہر جگہ ہی کوئی نہ کوئی' کسی نہ کسی قسم کی ٹانگ اڑانے آجاتا ہے۔ مثلاً آج ہی کی بات لے لو۔ دن بھر کسی نہ کسی قسم کا دردِ سری لاحق رہا۔ سوچا تھا شام کو بالکل ہلکا پھلکا ذہن لے کر تمہارے پاس آجاؤں گا اور اس آستانِ محبت سے گدگداتی یادوں کے کچھ خوش رنگ پھول دامن میں سمیٹ کر لے جاؤں گا مگر افسوس! یہاں بھی رنگ میں بھنگ۔۔۔" میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

"رنگ میں تو جتنی بھنگ پڑنی تھی پڑ چکی۔" ستارہ مسکراتے ہوئے بولی "باغباں تو تم پر اب بھی مہرباں ہے' گدگداتی یادوں کے خوش رنگ پھول چن کر لے جانے سے تمہیں کس نے روکا ہے؟"

"مجھے باغباں کی طبیعت کے بارے میں تشویش ہے۔ کیا باغباں اب واقعی بالکل ٹھیک ہے؟" میں نے اس کا سراپا جائزہ لیا۔ اس نے اپنے آپ کو سنوارنے کے لئے رنگ و بو کے امتزاج سے جو حشر آرائی کی تھی اس کے نقوش کچھ زیادہ نہیں بگڑے تھے۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہیں معلوم ہی ہے' میں کسی نہ کسی حد تک تو سخت جان ہوں۔" وہ دل آویزی سے مسکرائی۔ تکلیف دہ لمحے اس کی آنکھوں سے اپنی ناگواریاں لے کر رخصت ہو چکے تھے اور اب ان آنکھوں میں جذبوں کے جگنو جھلملا رہے تھے۔

"باغباں کو چاہئے کہ پہلے اس بھوکے کو کھانا کھلانے کا بندوبست کرے۔ بھوکے پیٹ تو پھول کلیوں کی باتیں بھی اچھی نہیں لگتیں۔" میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کراہ کر کہا۔

"کبھی کبھی تو تم بہت ہی غیر رومانی آدمی بن جاتے ہو۔ جذبات پر بریانی قورمہ انڈیل دیتے ہو۔" ستارہ آہ بھر کر بولی پھر اس نے ملازمہ کو بلا کر کھانا لگانے کی ہدایت کی۔

دوسری صبح میں اس کے ہاں سے رخصت ہونے لگا تو وہ عجیب سے لہجے میں بولی "انی! ایک فرمائش کروں پوری کرو گے؟"

"کوئی ہیرا نظر آگیا ہے جو تمہاری قوتِ خرید سے باہر ہے؟" میں نے موزے پہنتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے' روپیہ پیسہ' ہیرے جواہر اور اس قسم کی دوسری چیزیں اب میری کمزوریاں نہیں رہیں۔"

"تم کہتی ہو تو ان لیتا ہوں۔" میں نے کہا "اب اصل بات بتاؤ۔"

"آج دوپہر ہم لوگ "جنگل گرل" کی شوٹنگ کے سلسلے میں رائے ونڈ روڈ کے راستے ایک جنگل میں جائیں گے۔ بہت خوب صورت لوکیشن ڈھونڈی ہے راحیل بٹ نے۔ بہت ہی پیاری جگہ ہے۔ دو مرتبہ پہلے بھی وہاں شوٹنگ ہو چکی ہے اور دونوں مرتبہ وہاں مجھے تم بہت یاد آئے۔ بڑا ہی خوب صورت جنگل ہے۔ ہرے بھرے درخت ہیں۔ عجیب و غریب رنگا رنگ پھولوں سے لدے ہوئے جنگلی پودے ہیں۔ کچھ فاصلے سے ایک نہر گزر رہی ہے جس کے دونوں کناروں پر کچھ حصے میں بڑا خوب صورت گھاس کا فرش ہے۔ وہاں اتنا سکون' اتنی خاموشی اور اتنی خوب صورتی ہے کہ کئی بار میں نے سوچا' اگر تم میرے ساتھ ہوتے تو میں ہمیشہ کے لئے وہیں رہ پڑتی۔"

"نا بابا.....!" میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا "مانا کہ ہم تمہارے چاہنے والوں میں ہیں مگر اب میں تمہاری خاطر بن باس نہیں لے سکتا۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔ میں تم سے کب ایسی فرمائش کر رہی ہوں۔ پوری بات تو سن لو۔" وہ بدستور محمور سے لہجے میں بولی۔ "تمہیں یاد ہے جب میں سجاد اینڈ کمپنی میں مزدوری کرتی تھی اور تم وہاں سپروائزر تھے۔"

"تمہیں ابھی تک اس کمپنی کا نام بھی یاد ہے!" میں نے حیرت سے کہا "وہ ہمارا تقریباً لڑکپن کا ہی دور تھا۔ خاصے کم عمر تھے ہم دونوں۔"

"لیکن تھے پکے بدمعاش۔ مجھے تو اس زمانے کی ہر بات یاد ہے۔" اس کے رخساروں پر سرخی گہری ہو گئی۔

"تم زیادہ تیز تھیں۔ میں تو یونہی بدھو سا تھا۔" میں نے اس دور کی یادوں سے دل میں گدگدی سی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"اب میں اپنے آپ کو تمہارے سامنے بدھو محسوس کرتی ہوں۔" اس اعتراف میں بھی فخر کی جھلک نمایاں تھی۔

"یہ وقت وقت کی..... یا پھر شاید بخت بخت کی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"میں تمہیں یہ بتا رہی تھی کہ جہاں کمپنی سڑک اور پل بنا رہی تھی وہاں کچھ دور سائٹ سے ہٹ کر ایسا ہی منظر تھا جیسی لوکیشن پر آج میں شوٹنگ کے لئے جا رہی ہوں۔ تمہیں یاد ہے میں تمہارے لئے کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی چیز بنا کر لاتی تھی اور یہی ظاہر کرتی تھی کہ میں بابا سے چھپ کر آئی ہوں....."

"ہاں۔ تم اس وقت بھی ایک کامیاب اداکارہ تھیں۔" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔

"لیکن اب جبکہ میں اداکاری کا پیشہ اختیار کر چکی ہوں تو میں درحقیقت اداکارہ نہیں رہی۔" وہ فوراً بولی "اور میں نے اس دور کی خود غرضیوں کی بڑی حد تک تلافی بھی کر دی ہے۔ اب میں تمہارے لئے سلگتی ہوں اور تم اپنی راہوں پر سرپٹ جا رہے ہو۔ خیر..... میں بیتے دنوں کی بات کر رہی تھی۔ ہم کنارے گھاس پر بیٹھ کر وہ روکھی سوکھی چیزیں کھا کر کتنے خوش ہوا کرتے تھے۔"

"کبھی کبھی کپڑوں سمیت نہر میں کود کر پیراکی کا شوق بھی پورا کرتے تھے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"بعد میں کپڑے سکھانے کے لئے گھاس پر دوڑے پھرتے تھے۔" وہ بھینی بھینی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"بالکل الّو لگتے ہوں گے۔" میں نے چشم تصور میں اپنے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتی ہوں ہم ایک بار پھر الّو لگیں۔" جانے کیوں ہی اس کے لہجے میں افسردگی سی در آئی "یہ جو خوب صورت میں نے دیکھی ہے' وہاں میں تھوڑی دیر تنہا جا کر بیٹھی تو میرے میں درد سا ہونے لگا۔ ایک عجیب سی ٹیس بار بار اٹھ رہی تھی کسی کو بتائے بغیر وہاں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ یونٹ والے کافی دیر مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہوتے رہے اور میں بس گردوپیش سے بے نیاز بیٹھی رہی۔ بہت شدت سے دل چاہا کہ تم میرے ہوتے۔ ہم وہاں بیٹھ کر کچھ کھاتے پیتے' ایک دوسرے کے بھاگتے' بچوں جیسی حرکتیں کرتے۔"

"اور کپڑوں سمیت سوئمنگ بھی۔" میں نے لقمہ دیا۔

"وہ تو اب ہم سوئمنگ کاسٹیوم میں بھی کر سکتے ہیں۔ کون منع کر سکتا ہے۔" وہ افسردگی سے مسکرائی "اصل بات احساس کی ہے۔ کیا وہ معصوم سنسنی..... دلوں میں وہ مدہوش کر دینے والی محسوس کیا جا سکتا ہے؟ کیا ان گمشدہ لمحوں کا لمس ایک بار پھر مستعار مل سکتا ہے؟ کتنا اچھا لگے گا۔ گو یہ سب کچھ بھی عارضی' بالکل لمحاتی ہو مگر تھکی ہوئی روح کو کتنی تازگی ملے گی۔"

وہ ایسی باتیں کرتی تھی تو میرے دل پر چڑھے ہوئے پتھر خول میں بھی دھمک سی ہونے لگتی تھی۔ میں نے جلدی سے "بھئی جیسے تم کہتی ہو کر لیں گے۔ اس میں اتنی لفاظی اتنی تمہید کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کی صورت کیا ہو گی؟"

"تھینک یو" اس نے میری ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔ پھر ایک لمحے خاموش رہ کر بولی "میں تو یونٹ کے ساتھ جاؤں گی۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ تم بھی ساتھ چلے چلو۔ تم اپنی گاڑی لے لینا یا میں اپنی لے لوں گی اور ہم اسی گاڑی میں یونٹ کی گاڑیوں کے پیچھے پیچھے چلے چلیں گے۔"

"اور دوسرے دن اخباروں میں اسکینڈل چھپ جائے گا۔ اب تو میڈم ستارہ اپنے عاشقوں کو شوٹنگ پر بھی ساتھ لانے لگی ہیں۔" میں نے ٹکڑا لگایا۔

وہ گویا سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی "لیکن شوٹنگ ختم ہونے کا انتظار کرنا تمہارے لئے بڑی بوریت کا باعث ہو گا۔"

"ارے..... میں تو مذاق کر رہا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا "اس شہر میں تو مجھ جیسے نہ جانے کتنے پڑے ہوں گے جو تمہارے ساتھ "بدنام" ہونے کے لئے اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار ہوں گے۔"

اس کا موڈ دوبارہ مخمور سا ہو گیا تو میں نے کہا "لیکن یہ پروگرام آج شوٹنگ والے دن ہی رکھنا کیا ضروری ہے؟ اتنی بھیڑ بھاڑ کے ساتھ جانے کے بجائے کیا ہم کسی اور دن اکیلے وہاں نہیں جا سکتے؟"

"کل کس نے دیکھی ہے۔ ایک تو زندگی کا کچھ اعتبار نہیں۔ دوسرے تمہارا کوئی بھروسا نہیں کہ تمہاری مصروفیات کا کیا عالم ہو۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ کسی چیز کے لئے دل آج مچل رہا ہو اور اس کے میسر آنے کی امید ایک ماہ بعد ہو' اس کا کیا فائدہ؟ تمہیں معلوم ہے' خواہشوں کے معاملے میں' میں ایک عجیب عورت ہوں۔"

"میرا خیال ہے تم ہر معاملے میں ہی ایک عجیب عورت ہو۔ اسی لئے مجھ جیسا سیلانی تمہارا اسیر ہے۔" میں نے کہا "تمہاری رگ و پے میں کبھی ختم نہ ہونے والی رومانیت رچی ہوئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ شب رفتہ کے ساتھ ساتھ تمہاری شمع رومانویت کی لو بھی مدھم پڑ چکی ہو گی۔ میرا خیال ہے تم ان عورتوں میں سے ہو جن میں رومانویت کی حس کبھی ختم نہیں ہوتی۔"

"عورت میں اگر رومانویت کی حس ختم ہو جائے تو میرے خیال میں وہ عورت کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔" ستارہ سنجیدگی سے بولی۔

"میں فلسفے میں تم سے نہیں جیت سکتا۔" میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا "پروگرام کچھ یوں رکھتے ہیں کہ میں چار بجے ہی لوکیشن پر پہنچ جاؤں گا۔ اس دوران کچھ ضروری دفتری کام بھی انجام دے لوں گا۔ گھر جا کر لباس بھی تبدیل کر لوں گا اور تھرا کی کا لباس بھی ساتھ لے لوں گا۔ لگتا ہے تم نہر کے گندے سندے اور گدلے پانی میں غوطے کھلوا کر ہی چھوڑو گی۔"

"اب اپنی اوقات مت بھولو۔" وہ شوخی سے مسکرائی "سوئمنگ پول تو جمعہ جمعہ آٹھ دن سے نصیب ہوئے ہیں ورنہ تو ایسی ہی گدلی نہروں میں ڈبکیاں کھا کر پھولے نہیں سماتے تھے۔ بلکہ نہر تو خاصی معززانہ چیز ہے' تمہیں تو کہیں برساتی جوہڑ بھی نظر آ جاتا تھا تو فوراً ایک آدھ غوطہ لگانے پر مل جاتے تھے۔"

"کبھی شوٹنگ دیکھنے کے لئے مرے جاتے تھے۔" میں نے کہا "اب عالم یہ ہے کہ پندرہ منٹ کی شوٹنگ دیکھ کر بھاڑ کر جنگلوں کو نکل جانے کو جی چاہتا ہے۔"

"چنانچہ دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ تم شوٹنگ ختم ہونے پر تقریباً تین بجے شوٹنگ ختم کرنے کا ٹارگٹ ہے۔ میرا اندازہ چار بجے تک تو ہو ہی جائے گی۔ وہ بھی اس لئے کہ ہمارے میں سب وقت کے بہت پابند ہیں۔ ورنہ تو شوٹنگ اپنے سے گھنٹوں لیٹ ہوتی ہے۔" وہ بولی "یونٹ والے شوٹنگ کے واپس آ جائیں گے۔ ہم دونوں وہیں رک جائیں گے اور تھوڑی سی پکنک منا کر واپس آئیں گے۔ میں لوکیشن تمہیں سمجھا دوں۔ تم آسانی سے وہاں پہنچ جاؤ گے۔"

"اس صورت میں زیادہ بڑا اسکینڈل چھپے گا کہ یونٹ تو شوٹنگ کر کے واپس آ گیا مگر ہیروئن اپنے عاشق زاد کے ساتھ جنگل میں گل اور رنگ رلیاں وغیرہ وغیرہ مناتی رہی۔ مشہور لوگوں کے لئے تو انسان تفریح کے چند لمحے بھی نہیں گزار سکتا۔" میں نے ذکر کیا۔

"تم اسکینڈل سے ڈرتے ہو؟" اس نے مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا "حالاں کہ ڈرنا تو مجھے چاہئے۔"

"تم اب کہاں کسی چیز سے ڈرتی ہو۔ میں تو بے چارہ ایک سادا' معصوم سا نوجوان ہوں۔" میں نے منہ لٹکاتے ہوئے کہا۔

وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی "بس' بس۔ اب فیڈر یا چوسنی کے لئے ضد نہ شروع کر دینا۔ تم مطمئن رہو' کوئی اسکینڈل نہیں بنے گا۔ دراصل اسٹوڈیو کے جو چھوٹے موٹے کارکن یونہی اپنی اہمیت بنانے کے شوق میں دوڑے دوڑے اخبار نویسوں کے پاس جاتے ہیں یا کسی غرض کے تحت ان کے آلۂ کار بنے ہوتے ہیں اور چھوٹی سے چھوٹی بات بڑھا چڑھا کر انہیں بتاتے ہیں' وہ میرے معاملے میں ایسا نہیں کرتے۔ کیوں کہ میں ان سے حقارت کا سلوک نہیں کرتی۔ ایک انسان کی حیثیت سے انہیں برابر سمجھتی ہوں' عزت دیتی ہوں۔ آڑے وقت میں ان کے کام آتی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے اسکینڈل تو ہوتے ہوں گے مگر تم نے ان اخبار والوں سے چھپائے رکھنے کا بندوبست کیا ہوا ہے؟" میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے دلچسپی سے کہا۔

"میرا اسکینڈل تو بس تمہارے ساتھ ہی بن سکتا ہے اور کسی سے نہیں۔ تو ابھی دھیان ہی نہیں گیا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "یکدم ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے میرے کوٹ کا کالر مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکا دیتے ہوئے بولی "سچ سچ بتاؤ' کیا میرے ساتھ اسکینڈل بننے سے تم اتنا ہی ڈرتے ہو؟ اس معمولی ایکسٹرا ہنی کے ساتھ ہمارا اسکینڈل بنا تھا تب تو تمہیں غصہ نہیں آیا تھا۔" لگتا تھا وہ بات یاد آنے سے وہ یکدم سچ مچ ہی سنجیدہ ہو گئی تھی۔

کتاب
اسلم راہی ایم اے قیمت -/50

"ایک تو غربت کے زمانے کے شناساؤں میں یہ بڑی بری عادت ہوتی ہے۔ ایک منٹ میں سارا پول کھول کر رکھ دیتے ہیں۔" میں نے آہ بھر کے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا "اچھا میں چلتا ہوں۔ ارے ہاں... ذرا مجھے لوکیشن اچھی طرح سمجھا دو۔"

اس نے کاغذ قلم لے کر لوکیشن مجھے سمجھائی۔ مجھے فوراً اندازہ ہوگیا کہ میرا وہاں پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔

ستارہ کے ہاں سے میں سیدھا دفتر ہی چلا گیا۔ وہاں دوپہر کے کھانے تک مصروف رہنے کے بعد میں نے باہر سے آئے ہوئے ایک وفد کے ساتھ انٹرکان میں کھانا کھایا اور پھر انہیں اپنے منیجر کے ساتھ ائرپورٹ رخصت کرکے خود گھر آگیا۔ کچھ دیر بعد میں تیار ہوکر گھر سے نکلا تو ٹونی اور فیصل کی کار ایک بار پھر سائے کی طرح میرے پیچھے تھی۔

جنرل اسپتال سے آگے نکل آنے کے بعد میں نے ریڈیو پر ٹونی سے رابطہ قائم کیا اور بلا تمہید ایک شعر سنا دیا۔

بہتر ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ٹونی غالباً کچھ حیران سا ہوگیا۔ اٹک اٹک کر بولا "سر... آپ آج شعروں میں بات کر رہے ہیں؟"

"ہاں ٹونی ڈیئر!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یہی تو تمہیں معلوم نہیں کہ اندر سے میرا مزاج بڑا شاعرانہ ہے۔ سفاک بننے پر تو بعض لوگ مجھے مجبور کردیتے ہیں۔ اچھا سنو... دس بارہ میل بعد کاہنا نام کا جو گاؤں آئے گا نا... اس سے تقریباً ایک میل آگے میں کچے راستے پر مڑ جاؤں گا۔ بس وہاں سے تم واپس آجانا۔ سمجھے۔ آج میں ایک چھوٹی سی پکنک منانے جا رہا ہوں اور یہ خالصتاً ایک نجی سرگرمی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہاں بھی تمہاری آنکھیں میری نگراں رہیں۔"

"ایز یو وش سر!" ٹونی بولا "ویسے بہتر یہی ہے کہ گھر سے باہر آپ کسی بھی وقت ہماری نظر سے اوجھل نہ ہوا کریں۔"

"مطمئن رہو ٹونی! اگر خدا کو میری زندگی منظور ہے تو کوئی بھی مجھے نہیں مار سکتا۔ اور اگر اوپر والے کے ہی کھاتوں میں میری زندگی کے دن ختم ہو جائیں گے تو کوئی میری زندگی کا ایک پل بھی نہیں بڑھا سکتا۔" میرا لہجہ غیر ارادی طور پر درویشانہ ہوگیا۔

"وہ تو درست ہے سر!" ٹونی اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولا۔ "لیکن احتیاط کی تلقین بھی تو خدا نے کی ہے۔"

"اسی لئے تو تم لوگوں کو اس حد تک زحمت اٹھانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ ورنہ میں تو اتنی نگرانی کا قائل نہیں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے سر! اگر آپ اجازت دیں تو ہم لوگ ہائی وے پر رک جائیں گے۔ اگر ضرورت پڑی تو آپ ریڈیو پر رابطہ قائم کرکے اور لوکیشن بتا کر ہمیں طلب کرلیجئے گا۔"

"چلو یہ ٹھیک ہے۔" میں نے اس کی تجویز سے ا
یہ اس کی محبت اور خلوص تھا کہ میری حفاظت کے
میری خواہش سے زیادہ مستعد رہنا چاہتا تھا۔

مذکورہ موڑ پر پہنچ کر انہوں نے ایک سایہ دار جگ
گاڑی روک لی اور میری گاڑی کچے راستے پر دھول اڑا
گئی۔

لوکیشن تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہ
مین روڈ سے تقریباً چھ میل دور تھی۔ واقعی بہت خوب
تھی۔ کہنے کو جنگل تھا لیکن بہت سے باغات سے کہیں
صورت۔ یہاں جھاڑ جھنکاڑ بھی تھے اور پھولوں سے ل
بھی۔ اونچے نیچے درخت بھی تھے اور سانپوں کی طرح ز
ہوئی بیلیں بھی۔ بعض درخت تو اتنے بلند تھے کہ مجھ جیسے
بھی زندگی میں اتنے اونچے درخت نہیں دیکھے تھے۔
درختوں کے درمیان ایک صاف اور کشادہ قطعے پر یونٹ
ڈالے ہوئے تھے۔ مجھے ان کی موجودگی کے آثار دور
آگئے تھے۔

ڈائریکٹر راحیل بٹ سمیت یونٹ کے سبھی افراد ا
وہاں پاکر حیران رہ گئے۔ انہیں میری آمد کی اطلاع نہیں
ایک ہلچل سی مچ گئی "چوہدری صاحب آئے ہیں۔
صاحب آئے ہیں..." کوئی میرے لئے فولڈنگ چیئر جھا
لا رہا تھا۔ کوئی آئس بکس سے ٹھنڈی بوتل کپڑے سے
لئے چلا آرہا تھا۔ جبکہ میں ان سب کا شکریہ ادا کرکے
تکلفات سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ارشد موتی بھی وہاں موجود تھا اور اتنے لوگوں میں
شخص تھا جو خاموشی سے ایک طرف کھڑا تھا۔ اس
مصافحہ بھی نہیں کیا تاہم اس کی آنکھوں میں اب پہلے
نفرت، نحوست یا خونخواری نہیں تھی بلکہ مجھے دیکھ کر اس
پر ہلکے سے خوف کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ اس کا مط
میری طرف سے دوسری مرتبہ ذرا معقول ڈوز مل جانے
کافی حد تک سدھر چکا تھا۔ شاید اسے یہ دھڑکا لگ گیا
آمد خالی از علت نہیں ہے۔ وہ چیتے کی مصنوعی کھال کے
سے لباس میں تھا۔ گرامیک اپ کئے ہوئے تھا۔ اس
بھی کہیں کہیں میک اپ کا ہلکا لچھ دے کر رنگ پھیکے نمایاں
کوشش کی گئی تھی۔

وہاں سے کچھ دور بلند درختوں میں ایک دوسرے
فاصلے پر اونچی اور مضبوط شاخوں میں کچھ رسیاں بھی لٹکا
لیکن ان پر نمایاں کپڑا وغیرہ لپیٹ کر انہیں ان جڑوں کی شکل
کامیاب کوشش کی گئی تھی جو برگد کے پرانے درختوں
رہتی ہیں گو کہ درخت برگد کے نہیں تھے۔ ایک بہت او
چھلانگ میں مدد دینے کے لئے ارشد موتی کے لئے ایک

صحرا کا چاند

اِس کا معصوم حُسن صحرائی راتوں میں چمکنے والے چاند کو شرماتا تھا۔

دُوسری جنگِ عظیم ایک پاکستانی نوجوان کو صحرا کے اِس درخشاں چاندنی میں لے آئی تھی----

---- دونوں نے ایک دُوسرے کو دیکھا اور ایک دُوسرے کی رُوح میں مُحبت کی مہک بن کر سما گئے۔ لیکن زندگی صرف مُحبت کی خُوشبو ہی نہیں۔

زہریلے کانٹوں کا جنگل بھی ہے۔ اِنسانی مُحبت اور نفرت کے صحرا میں طلوع ہونے والے چاند کی سچی داستان جسے اے حمید کے رومان پرور قلم نے لکھا۔

ناشر: مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2 قیمت -/80 روپے

صاحب طرز ادیب قمر اجنالوی کا نام تاریخی ادب میں سند کا درجہ رکھتا ہے----

ولی عہد

اٹھارھویں صدی کے برصغیر کی لہو لہو تصویر

★ جب کمپنی سرکار والیان ریاست کا شکار کھیل رہی تھی۔

★ جب انگریز حکمران اعلیٰ کی زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔

★ ایک خانہ بدوش جو ولی عہد بن گیا۔

★ ایک شہزادی جو خانہ بدوش بن گئی۔

آزادی کی عجیب و غریب لرزہ خیز داستان---- جسے قمر اجنالوی کے تاریخ ساز قلم نے لکھا۔

ناشر: مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2 قیمت -/150 روپے

لمبی شاخوں میں مچان بھی لگائی گئی تھی۔ راحیل بٹ نے بتایا کہ ارشد موتی ان رسیوں کی مدد سے ادھر اُدھر جھول کر اپنے بیشتر کرتب شوٹ کروا چکا تھا۔ تاہم ابھی اس کے چند شاٹس باقی تھے۔ ستارہ کا کام ختم ہو چکا تھا۔

"بھئی میں تو یہاں ستارہ کا مہمان ہوں۔" میں نے ان لوگوں کی حیرانی کسی حد تک رفع کرنے کے لئے بتایا "اس نے اس علاقے کی اتنی تعریف کی کہ مجھے ضرور یہاں گھومنا پھرنا چاہئے' کچھ وقت گزارنا چاہئے۔ ہم جیسے زندگی کی مصروفیتوں کے مارے ہوئے لوگوں کو یہاں بڑا سکون مل سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں تو اس کی تعریفوں سے متاثر ہو کر چلا آیا۔ ویسے بھی ستارہ جیسی خاتون کسی کو دعوت دے تو انکار کر کے کفرانِ نعمت کا مرتکب نہیں ہونا چاہئے۔"

"ہاں یہ آپ نے لاکھ روپے کی بات کی۔" راحیل بٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ویسے ستارہ نے آپ سے غلط تعریف نہیں کی۔ ہم لوگ جتنی مرتبہ بھی یہاں آئے ہم نے کام بھی بہت خوب صورتی سے مکمل کیا اور انجوائے بھی بہت کیا۔ اعصاب کو بہت سکون ملا۔ خصوصاً نہر کے کنارے جا کر تو طبیعت میں بڑی فرحت آتی ہے ..... میں تو اس سارے ٹکڑے کو ہر زاویے سے اپنی فلموں میں استعمال کر چکا ہوں۔ ورنہ ابھی مزید دو چار مرتبہ آؤٹ ڈور شوٹنگ یہاں کی رکھتا۔"

"بٹ صاحب! ہم ابھی نہر کی طرف ہی جا رہے ہیں۔ جب آپ لوگ روانہ ہونے لگیں تو ہمیں بلوا لیجئے گا۔" ستارہ نے میرا ہاتھ تھام کر اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک خوب صورت ٹفن کیریئر تھا۔ یونٹ کے لوگوں نے ہمارے یوں جانے کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دو بے فکرے بچوں کی طرح گھومتے گھامتے درختوں کے درمیان سے گزرتے ایک طرف کو چل دیئے۔

ہم ان لوگوں سے کافی دور نکل آئے لیکن نہر ابھی نظر نہیں آئی تھی۔ یونٹ کے لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں معدوم ہو چکی تھیں۔

"تم نے آج میرے بلاوے پر یہاں آ کر میرا مان رکھ لیا ہے۔" ستارہ والہانہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ تو بہت خوب صورت جگہ ہے سرکار! آپ تو اگر صحرائے گوبی میں بھی بلائیں گی تو آپ کے اس خادم کو آنا پڑے گا۔" میں نے بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کرتے ہوئے کہا۔ اس کا گداز ہاتھ میرے ہاتھ پر تھا اور یوں ایک، دوسرے کے سہارے دھیرے دھیرے قدم بڑھانا بہت بھلا لگ رہا تھا۔ واقعی میرا دل چاہنے لگا کہ یہ سفر کچھ طویل ہو جائے۔

مگر ان خوب صورت اور پُرسکون لمحوں میں اچانک قریب ہی کہیں کوئی آٹومیٹک گن گرج اٹھی۔ گولیاں سنسناتی ہوئی عین قریب سے گزریں۔ ستارہ خود بخود ہی دہشت کے گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑی۔ میں نے خود بھی رکوع کی میں جاتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے الٹے قدموں کی کوشش کی تاکہ درختوں کی اوٹ میں ہو سکیں۔ لائن آف مجھے فوری طور پر اندازہ ہو گیا تھا۔

لیکن یکدم لگنے والے اعصابی جھٹکے نے ستارہ کو لحاظ ناکارہ سا بنا دیا تھا۔ وہ فوری طور پر اپنی جگہ سے حرکت کر قابل نہیں رہی تھی۔ ایک تناور درخت نے ہمیں گولیوں برسٹ سے محفوظ رکھا تھا۔

میں نے ستارہ کے اوسان خطا دیکھ کر اسے ایک بازو اور دوسرے ہاتھ سے کوٹ کی جیب سے اپنا مشین پسٹل ہوئے رکوع کی سی حالت میں ہی دوڑ پڑا۔ فائرنگ کا رخ بدا کوئی ہمارے تعاقب میں تھا۔ ستارہ کے تحفظ کی فکر نے فوری مجھے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ پوزیشن لے کر مقابلہ کر کوشش کرتا یا اندازہ کرتا کہ حملہ آور کہاں چھپا ہوا ہے۔

میں درختوں کے درمیان زگ زیگ کرتا دوڑتا چلا گیا مجھے اپنے سامنے لٹکی ہوئی ایک رسی نظر آئی جس کا دوسرا کہیں شاخوں میں گم تھا۔ میں نے اچھل کر اسے تھاما اور ایک ستارہ کو سنبھالے پورے جسم کی قوت دوسرے بازو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک لمبی زقند بھری۔ یہ ایک کام تھا۔ فلم کا کوئی شاٹ نہیں تھا جسے کیمرہ ٹرک کی مدد سے کچھ بنا کر دکھایا جا سکتا۔

میں نے اپنے اندازے سے بھی لمبی زقند بھری اور رسائی ختم ہونے پر جہاں میں نے چھلانگ لگائی وہاں عین سا کچھ فاصلے پر کیمرہ موجود تھا جو آن تھا اور ہلکی سی گھرر گھرر کی کے ساتھ چل رہا تھا لیکن اس کے عقب میں کوئی کیمرہ مین تھا۔ فائرنگ کی آواز سن کر یونٹ کے لوگ ادھر ادھر بھاگ تھے۔ کوئی سینے کے بل زمین پر لیٹ گیا تھا۔ کوئی درخت کے جا کر اٹھا۔ حتیٰ کہ ارشد موتی بھی وہاں نہیں تھا۔ فلمی تارزن کسی درخت کی آڑ میں پناہ لے چکا تھا اور اس کی جگہ کیمرہ شاید میری چھلانگ کا منظر فلبند کر لیا تھا۔ اگر یہ منظر کسی سینما میں چلتا تو یقیناً تماشائی بہت حیران ہوتے کہ یہ کیسا تارزن تھا کے ایک بازو پر ہیروئن تو موجود تھی مگر جو تھری پیس سوٹ میں فائرنگ ابھی جاری تھی اس لئے میں یہاں بھی رک نہیں تھا۔ میں نے ستارہ کو بازو پر اٹھائے رکھا اور مزید آگے دوڑ گیا۔

اچانک مجھے درختوں کے جھنڈ سے ذرا آگے، کھلے میں گاڑی کھڑی نظر آ گئی۔ میرے دل کو قدرے اطمینان ہوا۔

کسی چھوٹے موٹے کارخانہ عجائب سے کم نہیں تھی۔ فائرنگ کی آوازیں قدرے مدھم پڑ گئی تھیں۔ فائرنگ کرنے یقیناً کافی پیچھے رہ گئے تھے اور شاید میں ان کی نظر سے اوجھل تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ وقفے وقفے سے فائرنگ کئے جا رہے شاید مجھے خوفزدہ کرنے اور سہمائے رکھنے کے لئے۔

میں تیزی سے گھوم کر گاڑی کی دوسری طرف پہنچا۔ ستارہ کو نے بازو سے اتار دیا اور میرا اشارہ پا کر وہ گاڑی کی اوٹ میں کے بل لیٹ گئی۔ اب وہ خوفزدہ نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ اس تو میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا جب وہ میری طرف دیکھتے شریر سے انداز میں مسکرا دی۔ گویا یہ فائرنگ بھی اس کے ایڈونچر کا ایک حصہ رہی ہو۔

"بہت خوش ہو رہی ہو۔" میں نے سرگوشی میں کہا "قدرت بچا لیا ورنہ ابھی پرخچے اڑ گئے ہوتے۔"

"میں نے تو اب سوچ لیا ہے کہ تمہارے ساتھ رہنا ہے تو نہ ایک روز پرخچے ہی اڑنے ہیں۔ اس لئے اب پریشان اور گھبرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" اس نے سرگوشی میں ہی ب دیا۔

"اچھا بکواس مت کرو اور یہ سنبھالو۔" میں نے گھٹنوں کے جھکتے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب سے مشین پسٹل نکال کر اس طرف بڑھاتے ہوئے کہا "پستول چلانا تو آتا ہو گا تمہیں؟"

"تھوڑا بہت سیکھا ہے۔" وہ پستول سنبھالتے ہوئے بولی۔ اس پُرخطر زندگی گزاری ہے میں نے۔ اور اپنی حفاظت خود نے کا شوق بھی ہے' اس لئے اس قسم کی چیزوں کا استعمال سیکھنے کوشش کرتی رہتی ہوں۔ لیکن نشانے کے بارے میں کچھ نہیں سکتی۔" وہ گویا معذرت خواہ تھی۔

"نشانے کے بارے میں تمہیں کون کم بخت کچھ کہہ رہا ہے۔ کون سا یہاں ٹارگٹ شوٹنگ کے مقابلے میں ٹرافی جیتنے آئے ئے ہیں۔" میں نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ہی سیٹ کے نیچے ایک خفیہ بٹن دبا کر میں نے ایک لمبوترا سا خانہ کھولا۔ اسٹیل کی سیاہ پلیٹ سے ڈھکے ہوئے اس خانے کی موجودگی کسی کو احساس نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسرے ہی لمحے سیاہ رنگ کی سیون ایم ایم کی ایک خاص قسم آٹومیٹک رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ ستارہ کے چہرے پر شوخی کے آثار قدرے کم ہو گئے اور آنکھوں میں ہلکا سا خوف جھلک آیا۔

رائفل دیکھنے میں بہت خوب صورت تھی لیکن ہتھیاروں کی خوب صورتی عجیب ہوتی ہے۔ اس کی تہ میں موت کی خوف ناکی اور بد صورتی پنہاں ہوتی ہے۔

گن سنبھال کر میں دوسری طرف بڑھا تو عقب سے ستارہ میری میں کا کونا کھینچ کر خوفزدہ سی سرگوشی میں بولی "تم کیا کرنے جا رہے ہو؟"

"وہی جو دوسرے کر رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر تم میں اور دوسروں میں کیا فرق رہے گا؟"

"یہ میں بعد میں سوچوں گا۔"

"بعد میں سوچنے والے نقصان میں رہتے ہیں۔"

"یہ فلسفہ جھاڑنے کا وقت ہے کیا؟" میں نے نرمی سے اس سے قمیص چھڑاتے ہوئے کہا "تم صرف اتنا کرنا کہ جب میں تمہاری نظروں سے اوجھل ہو جاؤں تو دو چار ہوائی فائر کر دینا تاکہ ان لوگوں کو گمان گزرے کہ میں یہاں ہوں۔ انہیں صرف چند لمحے کے لئے غلط فہمی میں رکھنا تمہارا کام ہے۔ اس دوران میں ان سے نمٹ لوں گا۔"

"یہ امکان بھی تو ہے کہ ان چند لمحوں میں وہ یہاں آ کر میرا تیا پانچا کر دیں؟" اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔

"مت بھولو کہ چند لمحے پہلے ہی تم نے نڈر اور بے خوف رہنے کا عزم ظاہر کیا ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ وہ خاموش ہو گئی اور مشین پسٹل کو ہاتھ میں تولنے لگی۔

میں نے چلتے چلتے اسے بتا دینا بہتر سمجھا "یہ عام پستول یا ریوالور سے ذرا مختلف ہے۔ فائر کرو گی تو مسلسل جھٹکے لگیں گے۔ گرفت مضبوط رکھنا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میں درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ فائرنگ بند ہو چکی تھی لیکن آخری فائر جہاں سے ہوئے تھے اس جگہ کا مجھے اندازہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ حملہ آور ابھی اس جگہ کے آس پاس ہوں گے۔

درختوں کے درمیان میں نے حتی الامکان تیز رفتاری سے فاصلہ طے کیا اور وہاں جا پہنچا جہاں سے میری دانست میں آخری فائر کئے گئے تھے۔ وہاں مجھے ہلکی مشین گن کا ایک خالی میگزین بھی پڑا دکھائی دیا۔ گھاس بھی بری طرح مسلی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہاں چند لمحے پہلے تک انسانوں کی زبردست نقل و حرکت رہی ہو۔

میں کھلے میں نہیں آ رہا تھا بلکہ درختوں کی اوٹ میں رہتے ہوئے ہی چھلاوے کی طرح انتہائی تیزی سے اِدھر اُدھر حرکت کرتے ہوئے صورتِ حال کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

رومانی ناول

زیب	حمیدہ جبین	75/-
شاخ بریدہ	حمیدہ جبین	75/-
حنا اور پتھر	حمیدہ جبین	75/-
گیت یہ میرے	حمیدہ جبین	75/-

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور 2

فضا سے بارود کی بُو معدوم ہو چکی تھی۔ بُو سونگھنے کی مجھ میں درندوں کی سی جو صلاحیت موجود تھی' آخر کار اس نے میری مدد کی اور مجھے بتا دیا کہ انسان کس طرف تھے۔ انسانوں کی بُو لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ میں تیزی سے اس سمت میں بڑھا۔

آخر کار وہ مجھے نظر آ گئے۔ تعداد میں وہ صرف دو تھے اور نہایت اطمینان سے نیچی آواز میں باتیں کرتے جا رہے تھے۔ ان کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ صرف حرکات و سکنات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ باتیں کر رہے تھے۔

وہاں درخت چھدرے تھے اور وہ دونوں مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ غالباً وہ نہر کی طرف جا رہے تھے۔ اطمینان کا یہ عالم تھا کہ دونوں میں سے کوئی بھی سر اٹھا کر ارد گرد دیکھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ جس طرح انہوں نے مجھے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے دیکھا تھا' اس کے بعد انہیں غالباً ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ میں ان کے تعاقب میں واپس بھی آ سکتا ہوں۔

چند لمحے پہلے ستارہ میری ہدایت کے مطابق چند فائر کر چکی تھی لیکن انہوں نے شاید انہیں بھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ تو گویا کوئی کام نہایت عمدگی سے مکمل کرنے کے بعد پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ واپس جا رہے تھے۔

شکار پر نکلے ہوئے درندوں کی طرح کچھ دُور ان کا تعاقب کرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ ان کا کوئی اور ساتھی آس پاس موجود نہیں تھا۔ انہیں کسی کا انتظار بھی نہیں تھا۔

وہ دونوں ہی پستہ قد تھے مگر ایک خوب چوڑا چکلا اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ جبکہ دوسرا منحنی' مجہول اور مختصر الوجود دکھائی دیتا تھا۔ چوڑے چکلے شخص نے ہلکی مشین گن لٹھ کی طرح کندھے پر اٹھائی ہوئی تھی۔ مجہول آدمی کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا لیکن میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لئے تیار نہیں تھا کہ وہ واقعی نہتا تھا۔

وہ ڈھیلے ڈھالے سیاہ کوٹ اور خاکی پینٹ میں تھا۔ سر پر گہرے رنگ کی پی کیپ تھی۔ اس حلیے میں اسے عقب سے دیکھتے ہوئے کوئی اندازہ قائم کرنا مشکل تھا لیکن نہ جانے کیوں اس پر نظر پڑتے ہی مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ سراپا میرا شناسا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس شخص کو میں پہلے بھی کہیں اچھی طرح دیکھ چکا تھا لیکن یقین سے تبھی کچھ کہا جا سکتا تھا جب میں اس کے مزید قریب جاتا یا سامنے سے اسے دیکھتا۔

اس کی پی کیپ کے نیچے لمبے بالوں کی لٹیں جھول رہی تھیں۔ یہ لٹیں اور ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں چھپے ہوئے خدوخال کچھ جانے پہچانے سے لگ رہے تھے۔ لیکن یہ وہ شخص نہیں ہو سکتا تھا جس کا خیال میرے ذہن میں آ رہا تھا۔ وہ شخص اب اس دنیا میں نہیں تھا۔ میں اسے مرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

ہم جنگل میں اس جگہ پہنچ چکے تھے کہ اگر دائیں طرف مڑتے تو نہر کے کنارے کھلے میں جا پہنچتے اور اگر بائیں طرف مڑتے درختوں کا سلسلہ گھنا ہو جاتا۔

میری توقع کے مطابق وہ دائیں طرف ہی مڑے۔ میں بدر ایک خاموش درندے کی طرح اس جگہ تک ان کا تعاقب کر جہاں سے نہر نظر آنے لگتی تھی۔ یہاں سے سو ڈیڑھ سو قدم فاصلے پر نہر پر ایک چھوٹا سا پل موجود تھا اور اس پل کے قریب کے دوسری طرف کھلی چھت کی ایک سرخ شیورلیٹ اسپالا کھڑی ہوئی تھی۔ یہ گاڑی بھی میری دیکھی بھالی تھی۔ میری حیرت بڑھنے لگی۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ سرخ اسپالا اور لٹوں والا شخص مجھے زندگی میں دوبارہ بھی نظر آئیں گے۔ یہ موت میری سمجھ سے باہر تھا!

بہرحال اتنا میں ضرور سمجھ چکا تھا کہ وہ واقعی واپس جا رہے تھے۔ نہر کے دوسری طرف سے کچے راستے سے ہائی وے تک جا سکتا تھا۔ وہ یقیناً آئے بھی اسی طرف سے تھے۔ پل اور گاڑی ابھی بہت دور تھی لیکن میرے خیال میں اب انہیں روک لینا بہتر تھا۔

میں نے ان کے قدموں سے ذرا ہی آگے زمین پر ایک برسٹ مارا۔ گولیاں دھول اڑاتی ہوئی زمین میں پیوست ہو گئیں۔ وہ دونوں اپنی جگہ بت بن گئے۔ ماہر اور مشاق لوگ تھے' انہیں معلوم تھا کہ کس صورتِ حال میں کیا کرنا چاہئے۔ مشین گن والے نے مشین گن سیدھی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کوشش کا انجام اس کی موت کی صورت میں سامنے آ سکتا تھا۔

"گن ذرا دور پھینک دو چندا.....!" میں نے بہ آواز بلند کہا "اور میری طرف گھوم جاؤ۔ میں ذرا زلفوں والی سرکار کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔"

چوڑے چکلے آدمی کے ہاتھ میں گو کہ سب مشین گن تھی مگر وہ بھی اتنی ہلکی نہیں تھی۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے گن پھینک تو دی مگر وہ زیادہ دور جا کر نہیں گری۔ وہ دونوں آہستہ سے میری طرف گھومے۔ میری زیادہ توجہ صرف لمبے بالوں والے کی طرف تھی۔ اور اسے دیکھ کر واقعی میرا سر گھوم گیا۔ ایک کے لئے مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔

میرا شبہ درست ہی تھا۔ وہ وہی بندر نما شخص تھا جسے چند پہلے ملتان روڈ کے ایک باغ میں ٹونی نے میرے سامنے گولی مار دی تھی۔ وہ سب کچھ غیر ارادی طور پر اضطراری انداز میں ہوا تھا۔ میرا تعاقب کر رہا تھا اور جب ہم نے اسے روکنے کی کوشش کی اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔ ٹونی نے اس پر اس مہارت سے کیا کہ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا' اسے کوئی گزند نہیں مگر دوسرے ہی لمحے اس نے باغ کی دیوار پھلانگ کر فرار ہونے کی کوشش کی اور ٹونی نے اس پر دوسرا فائر کر دیا۔

ہم نے اسے باغ میں چت پڑے دیکھا تھا۔ اس کی قمیص سرخ تھی اور نبض ساکت تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے اس کے دل کی دھڑکنیں بھی سننے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے اس کا دل ساکت ہی محسوس ہوا تھا۔ وہ سارا منظر میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا لیکن وہ بدبخت زندہ سلامت میری آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے برسوں سے اسے خراش تک بھی نہ آئی ہو۔ اگر ہمیں اس کی موت کا محض دھوکا ہوا تھا اور وہ صرف زخمی ہی ہوا تھا تب بھی اتنی جلدی وہ دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور وہ تو صرف چل پھر ہی نہیں رہا تھا بلکہ مار دھاڑ میں بھرپور حصہ لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس طرح نیم وا تھیں اور چہرے پر کچھ ایسی بے نیازی و بے پروائی تھی جیسی دیکھنے والوں کو چڑا رہا ہو کہ اسے تو کسی بھی صورتِ حال کی ذرہ برابر پروا نہیں۔

میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی موقع پر حیرت کا اظہار نہ کروں لیکن اس وقت میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکا "تم زندہ ہو.....!"

"بے شک۔ اور امید ہے کہ ابھی غیر معینہ مدت تک زندہ رہوں گا۔" اس نے نہایت پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ اس کی آواز بھی کچھ ایسی ہی تھی جیسے کسی بندر نے کئی برس کی محنت کے بعد آخر کار خاصی کامیابی سے انسانوں کی طرح بولنا سیکھ لیا ہو۔

"لیکن میں نے خود تمہیں مردہ دیکھا تھا..... تمہاری قمیص خون میں تر تھی اور نبض ساکت تھی۔" میں نے کہا تاہم میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ میرے تاثرات سے حیرت کا اظہار نہ ہو۔

"اس قسم کے تو بہت سے شعبدے میری جیبوں میں پڑے رہتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا "کچھ دیر کے لئے دل کی دھڑکن روک لینا بھی میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔ میں میڈیکل سائنس کے لئے چلتا پھرتا چیلنج ہوں۔"

"میڈیکل سائنس کے لئے تو تم بے شک چیلنج بنے رہو' مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن تم میرے لئے بھی چیلنج بن گئے ہو۔ یہ میرے لئے بڑی تکلیف کی بات ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"اب میں کیا کروں..... میں تو خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ کر بھی نہیں مر سکتا۔ میری عمر ڈیڑھ سو سال ہے۔ میری چار بیویاں یکے بعد دیگرے میرے مرنے کے انتظار میں خود راہیٔ ملکِ عدم ہو چکی ہیں۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی افسردگی جھلک آئی جیسے وہ خود بھی اپنی درازیٔ عمر سے پریشان ہو۔

میں نے اس کے چہرے پر تمسخرانہ استہزا کی علامات تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں ہلکی سی غیر سنجیدگی کی بھی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ بالکل سنجیدہ تھا۔ مگر یہ کوئی قابلِ اعتبار نشانی نہیں تھی۔ بعض لوگ انتہائی سنجیدگی سے مذاق کرتے ہیں۔

میں نے بھی اسی سنجیدگی سے کہا "تمہیں یقیناً کسی نبیاسی بابا قسم کی شخصیت نے آبِ حیات قسم کی کوئی چیز پلا دی ہو گی۔"

"تم شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو۔" اس کے لہجے میں افسردگی ذرا گہری ہو گئی "مگر میں مذاق نہیں کر رہا۔ جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کے لئے کوئی سی بھی قسم کھانے کے لئے تیار ہوں۔ مدتوں پہلے کی بات ہے۔ میں افریقہ کے جنگلوں میں بھٹک رہا تھا۔ راستہ بھول گیا تھا۔ بالکل ویسی ہی پوزیشن تھی جیسی کہانیوں اور فلموں میں ہوتی ہے۔ میں اتنا بھوکا پیاسا تھا کہ اپنے سگے بھائی کا گوشت کھانے کے لئے تیار تھا۔ جنگلوں سے بھی کہیں دور نکل آیا تھا۔ لق و دق صحرا میں گھسٹ رہا تھا۔ وہاں مجھے ایک پودا نظر آیا۔ تا حدِ نظر پھیلے ہوئے صحرا میں وہ صرف ایک ہی پودا سر اٹھائے کھڑا تھا اور اس پر چھوٹے اناس جیسا بس ایک ہی پھل لگا ہوا تھا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے اسے توڑا اور ہڑپ کر گیا۔ اسے کھاتے ہی میرے جسم میں گویا آگ لگ گئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ میں سمجھا کہ کوئی زہریلا پھل کھا گیا ہوں اور مر رہا ہوں۔ بے ہوش ہونے سے پہلے یہ احساس بھی بڑا فرحت انگیز تھا کہ اب ساری تکلیفوں سے نجات ملنے والی ہے۔ لیکن جب مجھے ہوش آیا تو میں بالکل تازہ دم اور بھلا چنگا تھا۔ میں پھر بھی نہیں سمجھ سکا کہ یہ اسی پھل کا کمال تھا۔ اس وقت میری عمر چونتیس سال تھی۔ تب سے لے کر آج تک بھلا چنگا ہوں۔ ڈیڑھ سو سال عمر ہو چکی ہے لیکن کبھی بیمار بھی نہیں ہوا۔ چند سال پہلے میں نے پانچویں شادی کی ہے۔ چوالیس بچے ہیں میرے۔ دوبارہ کبھی اس مقام تک رسائی نہیں ہو سکی جہاں وہ پودا نظر آیا تھا اور نہ ہی ویسا پودا یا پھل دوبارہ کہیں نظر آیا۔ وہ یقیناً ثمرِ حیات قسم کی کوئی چیز تھا۔ فرق صرف یہ پڑا ہے کہ میرا خون سیاہ ہو گیا ہے۔"

"اصل میں دل کالا ہو گیا ہو گا۔" میں نے لقمہ دیا۔

وہ گویا اس صورتِ حال میں بھی اپنی کہانی سنانے کے لئے بہت بے قرار تھا کہ میں ایک آٹومیٹک رائفل کا رخ اس کی طرف کئے کھڑا تھا۔ وہ میرے الفاظ پر قطعاً توجہ دیئے بغیر بولا "بلڈ ٹسٹ سے پتا چلا ہے کہ میرے خون میں آئرن اتنا ہو گیا ہے کہ اگر کسی اور کے جسم میں ہوتا....."

"تو وہ فاؤنڈری کھول لیتا۔" میں نے لقمہ دیا۔

"نہیں۔ وہ فوراً مر جاتا۔" اس نے اپنا جملہ مکمل کیا۔ اس کی سنجیدگی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس کے علاوہ میرے خون میں ایک اور مادہ بھی پایا گیا تھا جسے لیبارٹری والے کوئی نام نہیں دے سکے۔ اس کے بعد میں گول ہو گیا کہ کہیں لیبارٹری والے زیادہ آگے نہ بڑھ جائیں۔ لمبے چکر شروع نہ ہو جائیں اور مجھے منظرِ عام پر نہ آنا پڑے۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "ذلت کی زندگی انسان جتنا بھی چھپ کر گزارے اتنا ہی اچھا ہے۔"

"کیا تم کبھی کسی کی بات سنجیدگی سے نہیں سنتے؟" اس نے گویا بڑے تاسف سے پوچھا۔

"کیا میں تمہیں غیر سنجیدہ نظر آ رہا ہوں؟" میں نے معصومیت

سے پوچھا۔ وہ منہ بنا کر کندھے اچکا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر دلی تکلیف کے آثار تھے۔

میں نے گہری سانس لے کر گویا مذاکرات کا یہ دور ختم کرتے ہوئے کہا "بہت ہو چکی اے بندر نما انسان ..... یا انسان نما بندر! تمہیں اتنا اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ میں کوئی داستان ہوشربا سننے کے لئے یہ رائفل لے کر تمہارے تعاقب میں نہیں آیا تھا۔ لیکن پھر بھی چونکہ میں مروت کا مارا انسان ہوں اس لئے میں نے اتنی دیر تمہاری لن ترانی سن لی۔ اب خاموشی سے اس طرف چل پڑو۔" میں نے انہیں اُدھر چلنے کا اشارہ کیا جدھر سے میں خود آیا تھا اور جدھر میری گاڑی کھڑی تھی۔

میں اب تک بظاہر صرف بندر نما انسان ہی کی طرف متوجہ رہا تھا۔ اس سے شاید اس کا ساتھی غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مگر یہ غلط فہمی اس کے حق میں مہلک ثابت ہوئی۔ میں نے اسے خبردار کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ مجھے اس پر دل ہی دل میں بہت خار آ رہی تھی۔ مجھ پر اور ستارہ پر اندھا دھند فائرنگ اسی نے کی تھی۔ مصلحت کا تقاضا تو یہی تھا کہ میں اسے زندہ پکڑ کر لے جانے کی کوشش کرتا تاکہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو سکتیں لیکن اس وقت میں نے مصلحت کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ ویسے بھی مجھے بندر نما انسان اس سے زیادہ اہم نظر آ رہا تھا۔ وہ تو محض ایک ماہر و مشاق اور پیشہ ور قاتل معلوم ہوتا تھا۔ سفاک' خون کا پیاسا اور زبان بند رکھنے والا۔ محض ایک جیتی جاگتی مشین۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ جب سے میں بندر نما انسان کی طرف متوجہ تھا' اس کا ساتھی کسی چیونٹی سے بھی کم رفتار کے ساتھ الٹے قدموں اپنی سب مشین گن کی طرف کھسک رہا تھا جو اس نے میرے حکم پر پھینک دی تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اس پر ترس بھی آیا۔ وہ یقیناً اس وقت اپنے آپ کو بہت چالاک محسوس کر رہا تھا۔

میں نے اسے گن تک پہنچنے کا موقع دیا لیکن اسے چھونا اسے نصیب نہ ہو سکا۔ جونہی وہ جھکا' میری رائفل نے اس کا جسم چھلنی کر دیا۔ ایک لمحے کے لئے وہ گولا سا بن کر لڑھکتا ہوا دور جا گرا' پھر چاروں خانے چت ہو گیا۔ اس کی کھلی آنکھیں اور کھلا منہ پتا دے رہا تھا کہ زندگی کے آخری لمحے میں اس نے شدید حیرت محسوس کی تھی جو اس کے چہرے پر منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید اس نے زندگی بھر صرف دوسروں کے جسموں میں گولیاں اتاری تھیں۔ وہ خود ان کی اذیت سے نا آشنا تھا۔ زندگی کے آخری لمحے میں شاید اس پر اسی حیرت نے حملہ کیا تھا کہ یہ کیسے انگارے ہیں جو اچانک اس کے جسم میں اتر گئے ہیں۔

بندر نما انسان بلاشبہ ایک عجیب مخلوق تھا۔ اس نے کمال بے نیازی سے گردن ذرا سی موڑ کر یوں اپنے ساتھی کی طرف دیکھا جیسے کسی شریر بچے کی گیند لڑھکتی ہوئی اس کے پیچھے جا گری ہو۔ رائفل کے اچانک گرج اٹھنے پر وہ اُچھلا تو درکنار اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔

اپنے مخصوص لہجے میں وہ بولا "اس کی کیا ضرورت تھی اسے خبردار کر کے گن اٹھانے سے روک بھی سکتے تھے۔"

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو "جناب! اس بچے کو لگانے کی کیا ضرورت تھی' آپ اسے صرف ڈانٹ کر بھی کام سکتے تھے۔"

"یہ میں نے خبردار ہی کیا ہے۔ اسے نہیں' تمہیں۔" میں خشک لہجے میں کہا "اب تم اس طرف چل دو۔" میں نے ایک پھر رائفل سے اشارہ کیا۔

اسی لمحے وہ اس طرح اچھلا جیسے اس کے جسم میں ہزار اسپرنگ فٹ ہوں۔ پچھلی بار جب اس سے سامنا ہوا تھا تب میں نے اسے اسی طرح اُچھلتے دیکھا تھا۔ اسی انداز میں اُچھل کر ایک باغ کی کافی اونچی دیوار پھلانگ کر اندر کود گیا تھا۔

فضا میں ہی وہ لٹو کی طرح گھوما' پھر دوسرے ہی لمحے وہ مجھ کافی فاصلے پر زمین پر تھا اور گولی کی سی رفتار سے نہر کی طرف تھا۔ اس کا دوڑنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ اسے نشانہ بنانا مشکل تھا تاہم میرے لئے ناممکن بھی نہیں تھا۔ لیکن اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اسے ہلاک کرنا نہیں چاہتا۔ زندہ ہی قابو کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے اس کے دائیں بائیں فائر کئے مگر وہ رکا نہیں۔ مختصر الوجود تھا' اتنا ہی بے خوف تھا۔ میں اس بندر نما شخص پر تن عاشق ہو چکا تھا۔ بہت عرصے بعد مجھے انسان کے جامے میں ا مجوبہ نظر آیا تھا۔ میں اسے ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے زندہ میں کرنے کے لئے اس کا تعاقب کرنا ضروری تھا اور یہ بلاشبہ ا بہت ہی مشکل کام تھا۔ اسے ہلاک کرنے سے بھی زیادہ مشـ کام۔ وہ حقیقتاً ایک چھلاوا تھا۔ اور اسے خود بھی اس کا ا طرح اندازہ تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ اسے بتا ہی دیا جا۔ مابدولت بھی چھلاوں کے جدِ امجد ہیں۔

میں نے گن پھینک دی۔ کیونکہ گن سمیت بھاگنے سے ر میں بڑا فرق پڑتا تھا۔ وہ گولے کی طرح دوڑا جا رہا تھا لیکن میں جلد ہی اسے جا لیا۔ اور یہ ایک کارنامے سے کم نہیں تھا۔ ممکن تھا کہ دو چار سیکنڈ بعد میں جھپٹ کر اس چھلاوے کو پکڑ لیکن اُسی لمحے میری آنکھوں نے ایک اور حیرت انگیز نظارہ دیکھ وہ بندر نما انسان ایک ہی زقند میں نہر کو پھلانگ گیا۔ لانگ جمپ کوئی چیمپئن بھی ایک زقند میں اس نہر کو نہیں پھلانگ سکتا تھا۔

میں اگر ایک ثانیے کے لئے بھی جھجک جاتا یا سوچ میں پڑ تو شاید میرے لئے بھی نہر کو پھلانگنا ممکن نہ رہتا۔ میں بھی آج مجوبۂ روزگار شخص کو سرپرائز دینے پر تلا ہوا تھا۔ اسی رفتار دوڑتے ہوئے میں بھی نہر پھلانگ گیا۔ وہ نہر کے دوسرے کنارے

پہنچ کر رک گیا تھا۔ شاید اسے قطعاً توقع نہیں تھی کہ کوئی اس کے تعاقب میں نہر کو بھی پھلانگ سکتا ہے۔

غالباً فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھنے کے لئے وہ گھوما اور اسی لمحے اس نے مجھے اپنے سر پر پایا۔ میں نے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتے دیکھیں لیکن اسے زیادہ دیر حیران ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں اسے لیتے ہوئے زمین پر گرا اور ہم دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ میں اس کے تعاقب میں جتنا دوڑ چکا تھا اتنا ہی کافی تھا۔ اب اس کی خاطر میں اپنی جان کو مزید زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میں اس شخص تک پہنچ گیا ہوں تو اب آسانی سے اس کو قابو میں کر لوں گا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کی صرف پھرتی ہی غیر معمولی ہو گی' طاقت اس میں کوئی خاص نہیں ہو گی اور ایک بار کسی طاقتور آدمی کی گرفت میں آنے کے بعد وہ جلد ہی بے بس ہو جاتا ہو گا۔

وہ مختصر الوجود تھا۔ میں نے ایک گٹھڑی کی طرح اسے بازوؤں میں سمیٹنے کی کوشش کی لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے بجلی کی سی تیزی سے ایک چیز کو حرکت میں آتے دیکھا۔ وہ اس کا استخوانی بازو تھا۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ اس استخوانی بازو کے ایک سرے پر ایک آہنی گھونسا بھی پایا جاتا ہے۔ یقین مجھے اس وقت آیا جب وہ گھونسا ایک ہتھوڑے کی طرح میری ٹھوڑی پر پڑا۔

میری آنکھوں کے سامنے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے یہی محسوس ہوا جیسے میرے سب دانت ایک دوسرے میں سیوشکر ہو گئے ہیں۔ جبڑا شاید دہرا ہو کر حلق میں پھنس گیا ہے اور ٹھوڑی ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی ہے۔ میرے نیچے دبا ہوا وہ پہلے ہی پارے کی طرح مچل رہا تھا۔ اس گھونسے کے بعد تو میری گرفت سے تقریباً نکل ہی گیا۔

یہ محض ایک اتفاق ہی تھا یا دوسرے لفظوں میں میری خوش قسمتی کہ اس کی ٹانگ میرے ہاتھ میں آ گئی ورنہ اس بار وہ نکل جاتا' توقعاً گاڑی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کی ٹانگ ہاتھ میں آتے ہی میں نے زور سے کھینچی۔ وہ دھب سے گرا لیکن گرتے ہی اس نے دوسرے پاؤں سے میرے سر پر ٹھوکر ماری۔ میری کھوپڑی دوبارہ جھنجھنا اٹھی۔

معلوم نہیں اس خبیث نے اس مخنی سے جسم میں اتنی طاقت کیونکر چھپائی ہوئی تھی۔ یہ اسرار اپنی جگہ تھا لیکن سر دست اس سے میرا عشق ہوا ہو گیا۔ وہ جو میرے ذہن کے کسی تاریک خانے میں ایک خوف ناک جھنجھلاہٹ خوابیدہ رہتی تھی' یکدم جاگ اٹھی۔ میرے دل میں اس کے لئے بے وجہ جو ایک نرم سا گوشہ تھا' وہ یک لخت ہی اجڑ گیا۔ میرے سارے جسم کا لہو گویا آتشیں لاوے میں ڈھل گیا اور صرف کنپٹیوں میں مرتکز ہو گیا۔

میں نے زور سے سر جھٹکا۔ دھندلاتے ہوئے منظر میری نظروں میں صاف ہو گئے۔ اس وقت تک وہ چھلاوا اٹھ چکا تھا اور گو کہ اس کی ایک ٹانگ اب بھی میری گرفت میں تھی لیکن وہ دوسری ٹانگ سے مجھے دوسری ٹھوکر رسید کرنے لگا تھا۔ اور یہ ٹھوکر شاید میری آہنی کھوپڑی کو بھی چٹخا دیتی۔

بروقت میرا دوسرا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس کی دوسری ٹانگ بھی کچھ اس طرح میری گرفت میں آ گئی جیسے کسی گول کیپر نے گولی کی رفتار سے آتی ہوئی بال کو بروقت ہاتھ سے روک لیا ہو اور فیصلہ کن گول بچا لیا ہو۔ دونوں ٹانگیں میری گرفت میں آ جانے کے باعث وہ دھپ سے پیٹھ کے بل زمین پر گرا اور میں اسی لمحے بالکل مشینی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اب وہ کسی بڑی سی مچھلی کی طرح میرے ہاتھوں میں اُلٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کا وزن محسوس کرتے ہوئے مجھے ایک بار پھر حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کم بخت ہڈیوں کا مجموعہ تھا مگر یہ ہڈیاں شاید خالص اور ٹھوس فولاد کی بنی ہوئی تھیں۔ جتنی طاقت صرف کر کے میں نے اس مخنی انسان کو اٹھایا تھا اتنی طاقت سے تو ایک صحت مند ریچھ کو جھولا جھلایا جا سکتا تھا۔

صرف یہی نہیں' اس کی فولادی ہڈیوں میں لچک ربڑ جیسی تھی۔ میرے ہاتھوں میں لٹکے لٹکے وہ سانپ کی طرح دہرا ہو کر اپنا سر اوپر لایا اور اپنے دونوں استخوانی ہاتھ بڑھا کر اس نے میری گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ اگر وہ میری گردن دبوچنے میں کامیاب ہو جاتا تو شاید میری زندگی کی کہانی اس ویرانے میں ہی نہایت احمقانہ انداز میں ختم ہو جاتی۔

اس کی صلاحیتوں کے بارے میں میری عاشقی تو ٹھنڈی ہو ہی چکی تھی۔ اور اب مجھے اس بات کی پروا نہیں رہی تھی کہ وہ زندہ رہتا ہے یا مرجاتا ہے' صحیح سالم میرے ہاتھ لگتا ہے یا محض اس کی باقیات ہی ہاتھ آتی ہیں۔ پہلے تو دل یہی چاہا کہ اسے اسی طرح زمین پر دے ماروں جس طرح دھوبی گھاٹ پر دھوبی کپڑوں کو پتھر کی سِل پر پٹختے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں غیر ارادی طور پر میں ایسا کرنے سے باز رہا۔

میں نے اسے محض کپڑوں کی طرح جھٹکنے پر اکتفا کیا۔ یہ ایک خاص ٹیکنک تھی۔ اگر میرے ہاتھ میں سانپ ہوتا اور میں اسے دم سے پکڑ کر اس انداز سے جھٹکا دیتا تو اس کے جسم کی اکلوتی ہڈی درمیان سے ٹوٹ جاتی۔ لیکن اس فتنے کے جسم میں شاید ریڑھ کی ہڈی کی جگہ بھی کوئی انتہائی لچک دار اسپرنگ فٹ تھا۔

اس جھٹکے کی بدولت میری گردن تو اس کی گرفت میں جانے سے بچ گئی لیکن اس کی کوئی ہڈی ٹوٹنے کا کڑاکا مجھے سنائی نہیں دیا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ ایک لمحے کے لئے وہ کچھ ڈھیلا سا پڑ گیا اور یوں میرے ہاتھوں میں جھول گیا جیسے اس کے حواس مختل ہو گئے ہوں۔ میں نے اس کی کمر میں ایک زوردار ٹھوکر رسید کی اور اسے

کافی اونچا ہوا میں اچھال دیا۔ ہم
وہ چاروں خانے چت زمین پر آ کر گرا۔ زمین وہاں کچی ضرور
تھی مگر اتنی بھی نہیں تھی کہ اس کے لئے گدے کا کام دیتی۔ اس
کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ اس نے اس جہانِ فانی
کو الوداع کہہ دیا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے آنکھیں کھول
دیں اور تھکے تھکے انداز میں انہیں پٹ پٹانے لگا۔

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ زندہ ضرور تھا لیکن اب اس
کے کس بل نکل چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ چستی پکڑتا' میں
نے ایک اور ٹھوکر رسید کر کے اسے اوندھا کیا اور اپنے گلے سے
ڈھیلے ڈھالے انداز میں جھولتی ہوئی ٹائی اتار کر تیزی سے اس کے
ہاتھ پشت پر باندھ دئے اس دوران مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی بغل
میں ہولسٹر موجود تھا۔

میں نے ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔ اس کی مختصر شخصیت
کے برعکس وہ اعشاریہ چار پانچ کا ایک بھاری بھرکم ریوالور تھا جو
دوسری جنگِ عظیم کے دوران سفید فام فوجیوں کا پسندیدہ ترین
ریوالور تھا۔ سرکاری ایجنسیوں میں اس کے استعمال کا بہت رواج
تھا۔ پرانا ماڈل ہونے کے باوجود وہ نئی ساخت کے بہت سے
ریوالوروں سے زیادہ مہلک اور دور مار تھا۔

حیرت کی بات تھی کہ اس ساری بھاگ دوڑ کے دوران اس
شخص نے ریوالور استعمال کرنا تو درکنار' اسے نکالنے کی بھی کوشش
نہیں کی تھی۔ میں تو اسے نہتا ہی سمجھا تھا۔ اور میں اس غلط فہمی
میں مارا بھی جا سکتا تھا۔ ریوالور میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا اور
اسے گریبان سے پکڑ کر اس کے پیروں پر کھڑا کیا۔

وہ ایک بار ذرا سا لڑکھڑایا مگر پھر جم کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے
چہرے پر تکلیف کے آثار اب بھی نہیں تھے۔ بس کچھ نڈھال نظر
آ رہا تھا۔ ایں ڈھیٹ اور سخت جان مخلوق سے مجھے شاید اس سے
پہلے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

اب کہ میں نے دیکھا کہ اس کے رخسار کی ابھری ہوئی ہڈی
کے قریب ایک چھوٹا سا زخم آ چکا تھا اور کھال تھوڑی سی پھٹ گئی
تھی۔ خون کی ایک پتلی سی لکیر اس کی ٹھوڑی کی طرف پھسلتی آ رہی
تھی۔ مگر نہیں ـــ وہ خون تو نہیں تھا۔ بلکہ بالکل تارکول تھا۔ یا پھر
کسی بہت ہی کھارا گاڑی سے رستا ہوا ایک عرصے سے زیرِ
استعمال موبل آئل۔ تو کیا واقعی اس کا خون سیاہ تھا؟ اس نے مجھے
جو کہانی سنائی تھی' وہ کہیں سچ ہی تو نہیں تھی؟ ان سوالوں کے جواب
اگر اثبات میں تھے تو مجھے ان کو تسلیم کرنے میں اب بھی تامل تھا۔

پچھلے جھڑپ کے موقعے پر جب میں نے اپنی دانست میں اسے
مردہ دیکھا تھا تو اس کی قمیص سرخ سیال میں لتھڑی ہوئی تھی۔ تو کیا
واقعی وہ اس کا خون نہیں تھا؟ اس نے کوئی شعبدہ دکھایا تھا؟ میں
اس کی نبض دیکھنے اور دھڑکن سننے میں ناکام رہنے کے باوجود دھوکا
کھا گیا تھا!

مخنی شخص نے بالکل میری ہی طرح سر جھٹکا گویا آنکھوں
کے سامنے پھیلی ہوئی دھندلاہٹ دور کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر
بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے تھکے تھکے سے لہجے میں بولا۔

"تم دنیا میں پہلے آدمی ہو جس نے مجھے قابو میں کیا ہے۔"

"اور تم دنیا میں پہلے آدمی ہو جسے قابو میں کرنے کے لئے
اتنی محنت کرنا پڑی۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا "ویسے
دادے ـــ تم نے اپنا یہ آثارِ قدیمہ قسم کا ریوالور استعمال کرنے
کوشش کیوں نہیں کی؟"

"حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے مجھے اس کے استعمال کی مہلت
ہی نہیں دی۔" وہ مغموم سے لہجے میں بولا "ایک آدھ لمحے
مہلت میسر آ جاتی تب بھی شاید میں اسے استعمال نہ کرتا۔ میں
امن پسند آدمی ہوں۔ ہتھیار شاذ و نادر ہی استعمال کرتا ہوں۔
اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ میں خود کسی ایٹمی ہتھیار سے
نہیں ہوں۔ لیکن تمہارے بارے میں میں اندازوں کی غلطی کی
سے مارا گیا۔ قد کاٹھ میں تو بہت سے لوگ تم جیسے ہوتے ہیں لیکن
ان میں وہ بات نہیں ہوتی جو تم میں ہے۔"

"میرا خیال ہے یہ موقع کھمن لگانے کے لئے کچھ زیادہ
مناسب نہیں ہے۔"

"میں مذاق نہیں کر رہا۔ اور نہ ہی میں بلا ضرورت جھوٹ بولتا
ہوں۔ میرا امریکا کے میڈیسن اسکوائر گارڈن میں لڑنے والے
بعض مشہور عالم ریسلرز سے بھی واسطہ پڑا ہے۔ ان میں سے
کبھی کوئی میرے لئے مسئلہ ثابت نہیں ہوا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی باتوں پر یقین کروں
محض ہنس دوں۔ میں نے متذبذب لہجے میں کہا "مجھے اعتراف ہے
کہ میں نے بھی تمہیں بہت انڈر ایسٹی میٹ کیا۔"

"تمہارا قصور نہیں ہے۔ میں شخصیت سے مار کھاتا ہوں۔"
وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"تم ابھی کہہ رہے تھے کہ تم بہت امن پسند آدمی ہو۔ لیکن
تھوڑی دیر پہلے جو تم لوگ سب مشین گن سے مجھ پر اور میرے
دوست پر فائرنگ کر رہے تھے' وہ کیا ثواب حاصل کرنے کے لئے
کر رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو نہیں کر رہا تھا نا۔" وہ معصومیت سے بولا "وہ تو اپنا بچہ
ٹائی کر رہا تھا۔ میں تو یونہی ذرا اس کا خیال رکھنے کے لئے ساتھ آ
ہوا تھا۔ کیا کریں' اب نوکری بھی کرنی ہے نا۔"

"ٹائی ـــ؟ یعنی شریر؟ اس کا اصل نام کیا تھا؟" میں نے اسے
گھورتے ہوئے پوچھا۔

"یہ اس کا اصل نام ہی ہے۔ کم از کم مجھے اس کے علاوہ اس
کا کوئی نام معلوم نہیں۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔

"اور نوکری تم کس کی کرتے ہو؟"

"ریڈ ڈاٹ کی"

"وہ کیا ہے؟"

"یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔

"اچھا ـــ ذرا پُل کی طرف چلو۔ ہمیں واپس چلنا ہے۔ اب
ہم دونوں ہی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ دوبارہ سر پھاٹنگ
سکیں۔"

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔ اس کے
لہجے میں خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"بھائی گیٹ۔" میں نے جواب دیا "وہاں میں تمہیں ٹھنڈے
میٹھے رس گلے کھلاؤں گا۔"

"مگر مجھے تو رس گلے بالکل پسند نہیں ہیں۔" وہ گہری سنجیدگی
سے بولا۔

"جو رس گلے میں کھلانا چاہتا ہوں وہ تمہیں بہت پسند آئیں
گے۔" میں نے کہا۔

اس نے کندھے اچکائے اور آگے آگے چل دیا۔ میں نے اس
کا ریوالور جیب سے نکال کر ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ اب اگر وہ بھاگنے
کی کوشش کرتا تو اسے گولی مارنے میں مجھے ایک لمحے کا بھی تامل نہ
ہوتا۔

پُل پار کر کے ہم واپس اسی جگہ آئے جہاں اس کے ساتھی کی
لاش پڑی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے وقت وہ جذبات سے
عاری لہجے میں بولا "اگر تم اجازت دو اور میرے ہاتھ کھول دو تو میں
اسے بھی اٹھا کر ساتھ لے چلوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ بھاگنے کی
کوشش نہیں کروں گا۔"

میں نے اسے چلتے رہنے کا اشارہ کیا اور ملائمت سے کہا "تم
وعدہ نہ کرو تب بھی مجھے تمہارا اعتبار ہے۔ تم اتنے ایماندار اور
سچے آدمی ہو کہ اگر پرانا زمانہ ہوتا تو یقیناً تم کسی عدالت کے قاضی
ہوتے۔ جہاں تک اس لاش کا تعلق ہے تو میں اسے اٹھا کر لے
جانے کی اجازت تم کو نہیں دے سکتا کیونکہ مجھے اپنے گھر میں کچرا
جمع کرنے کا بالکل شوق نہیں ہے۔ ویسے بھی اس قسم کی لاشیں
جنگل میں ہی پڑی زیادہ جچتی ہیں۔ اور پھر یہ بھی تو سوچو نا کہ کیڑے
مکوڑوں اور چیل کوؤں وغیرہ کے بھی آخر ہم پر کچھ حقوق ہیں۔
ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ کبھی کبھار انہیں بھی اپنی
وافر مقدار میں پروٹینز ملتے رہیں۔"

اس نے مڑ کر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا پھر
سیدھا ہو کر خاموشی سے چلنے لگا۔ ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں میری
گاڑی کھڑی تھی۔ شوٹنگ کی لوکیشن سے یہ جگہ کچھ فاصلے پر تھی۔
فلمی یونٹ کے لوگ لوکیشن پر واپس پہنچ چکے تھے لیکن ایک ٹولی کی
شکل میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ شاید میرے اور ستارہ کے
بارے میں ہی اندازے لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہم کہاں
ہیں۔ حالاں کہ ستارہ ان سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی لیکن کسی کو
ادھر اُدھر جا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

میں ان کی نظروں سے بچنے کے لئے تھوڑا سا چکر کاٹ کر
گاڑی تک پہنچا۔ ستارہ بڑے اطمینان سے پچھلی سیٹ پر سر ذرا نیچا
کئے بیٹھی تھی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا اور مشین پسٹل ڈھیلے
ڈھالے انداز میں اس کے ہاتھ میں لٹکا ہوا تھا۔ وہ گویا انتظار کرتے
کرتے بور ہو چکی تھی۔

"کہاں رہ گئے تھے تم؟" وہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔

"شکر کرو میں وہاں نہیں رہ گیا جہاں سے واپسی کبھی ممکن ہی
نہیں ہوتی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اتنی دیر غائب رہے اور پکڑ کر صرف یہ نمونہ لائے ہو؟
تمہیں کوئی ڈھنگ کا آدمی بھی نہیں ملا؟" اس نے شکوہ کیا۔

"یہ بھی آدمی ہی ہے۔ بس بقول خود اپنے ـــ ذرا شخصیت
سے مار کھاتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بندر نما انسان براہِ راست ستارہ سے مخاطب ہوا "بلکہ میں
بے شمار انسانوں سے بہتر ہوں' کبھی آزما کر دیکھنا۔"

ستارہ گاڑی سے اتر آئی۔ مشین پسٹل گاڑی کے ڈیش بورڈ پر
ہی چھوڑ کر اس نے دانت پیستے ہوئے بازو بلند کیے۔ وہ بندر نما انسان
کے منہ پر گھونسا رسید کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اس کا گھونسا ہاتھ
پر روکتے ہوئے کہا "اسے مت مارنا۔ عورت کے ہاتھوں مار کھا کر
اس کے جذبات مجروح نہ ہو جائیں۔"

وہ مجھ سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی "کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ وہ
بھی بندر سے ملتا جلتا۔ یہ تم کیا پکڑ لائے ہو؟ اتنے زوروں کی
فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں تو سمجھی تھی' تم نہ جانے کیسی خوف ناک
چیزوں کو قابو میں کر کے لاؤ گے۔"

"اسے چوہا کہہ کر تم اس کا ہی نہیں' میرا بھی دل توڑ رہی ہو۔
یہ بہت سی خوفناک چیزوں پر بھاری ہے۔ تم نے انگریزی کا وہ محاورہ
تو پڑھا ہی ہو گا جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ اچھی چیزیں ہمیشہ
چھوٹے پیکٹوں میں آتی ہیں۔ یہ شخص اس محاورے کی عملی تفسیر
ہے۔ میں اسے دوست بنانا چاہتا ہوں مگر یہ دشمنوں کی نوکری کئے
جا رہا ہے۔" میں نے آہ بھری۔

پھر میں نے براہِ راست اسے مخاطب کیا "بزرگوارم! میں نے
ابھی تک تمہارا نام نہیں پوچھا۔"

"کیا کرو گے نام پوچھ کر؟ تمہیں کون سا مجھ کو اسکول میں
داخل کرانا ہے۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ وہ اب دلچسپی آمیز
نظروں سے ستارہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اسکول میں نہ سہی۔ لیکن ہو سکتا ہے مجھے تم کو اسپتال میں
داخل کرانا پڑے۔" میں نے کہا۔

"انسان کے دل میں کیسی کیسی حسرتیں ہوتی ہیں۔" وہ ٹھنڈی
سانس لے کر بولا "تمہاری تسکینِ قلب کے لئے بتا دیتا ہوں ـــ
میرا نام این این ہے۔"

"میں نے مخفف نہیں' پورا نام پوچھا ہے۔"

"یہ مخفف نہیں ہے۔ میں این این نہیں کہہ رہا ہوں۔ اے نن کہہ رہا ہوں۔" اس نے تیکھے کرکے بتایا۔

"عجیب نام ہے!" میں نے اسے گھورا۔

"بعض اوقات عجیب آدمیوں کے نام بھی عجیب ہوتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ وہ ستارہ کو مسلسل گھورے جارہا تھا اور میں محسوس کررہا تھا کہ ستارہ کے چہرے پر سرخی بڑھتی جارہی تھی۔ میرے لئے اچھا ہی تھا کہ وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں نے اچانک ہی اس کے سر پر ریوالور کا دستہ زور سے رسید کیا۔ یہ ضرب کسی اور کے سر پر پڑی ہوتی تو شاید اسے اسٹریچر پر ڈال کر اسپتال لے جانا پڑتا۔ لیکن وہ صرف لڑکھڑا کر رہ گیا۔

سر جھٹکتے ہوئے اس نے خشمگیں سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے راہ چلتے کسی بزرگ کو کسی نوجوان نے کندھا مار دیا ہو۔

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے خفگی سے پوچھا۔

"میں تمہیں بے ہوش کرنا چاہتا ہوں اے نن ڈیئر! اور میرے پاس کلوروفارم نہیں ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"میں جب سعادت مندی سے تمہارے ہر حکم کی تعمیل کررہا ہوں تو پھر یہ بے ہوش کرنے کے کھڑاگ کی کیا ضرورت ہے؟ اگر تم پر میری غیر معمولی مضبوطی کا راز فاش ہو ہی گیا ہے تو تم میرے جسم میں اتنی توڑ پھوڑ پر کیوں تل گئے ہو؟" اس نے شکوہ کیا۔

"اچھا تو پھر خاموشی سے ٹانگیں بھی بند ہوالو اور ہونٹوں پر ٹیپ لگوالو۔" میں نے کہا۔ اس نے کندھے اچکا دئے۔ یہ گویا رضامندی کا اظہار تھا۔ میں نے اپنی بیش قیمت رائفل گاڑی کے خفیہ خانے میں فٹ کی اور گاڑی سے ہی نائیلون کی ڈوری اور چپکنے والی ٹیپ نکال کر اسے نن کی ٹانگیں باندھیں اور منہ بند کیا۔ اس نے یہ کام واقعی نہایت سعادت مندی سے کرالیا۔ اس کی یہ سعادت مندی مجھے کچھ عجیب سی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے اسے گاڑی کے عقبی حصے میں سیٹوں کے درمیان پھنسا کر لٹادیا۔

"یہاں سے اٹھنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ تمہارا آخری علاج یعنی گولی استعمال کرنے میں اب میں دریغ نہیں کروں گا۔" میں نے کہا اور گاڑی کے چاروں دروازے لاک کردئے۔

ستارہ باہر ہی کھڑی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "آؤ میں تمہیں لوکیشن پر واپس چھوڑ آؤں۔ اگر تمہارے ڈائریکٹر راحیل بٹ صاحب کے اعصاب نے ساتھ دیا تو شاید وہ باقی شوٹنگ مکمل کرلیں۔ تم انہی لوگوں کے ساتھ واپس آجانا۔ میں تو اب فوری طور پر اس تحفے کو لے کر روانہ ہورہا ہوں۔" میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا "میرے لئے یہ بندر نما انسان بہت اہم ثابت ہوسکتا ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا تم کن چکروں میں ہو۔" وہ سر جھٹک کر میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا اس کے رخسار گویا دہک اٹھے "تم نے ذرا دیکھا... اس منحوس آنکھوں میں کیسی بدمعاشی تھی؟ مجھ جیسی عورت بھی ایک بار تو پانی پانی ہوجاتی ہے۔ یہ شخص اور وہ چمپینزی جو ایک را میرے گھر میں گھس آیا تھا' یہ دونوں مجھے ایک ہی نسل کے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ اس کی ذرا ترقی یافتہ شکل لگتی ہے"

"نہیں خیر... نسل تو ایک نہیں ہے۔" میں نے ہنس کر "کم از کم ہم لوگوں کے نظریات کے مطابق تو نہیں ہے۔ اگر ڈارون کے نظریۂ حیات کو تسلیم کرلیں پھر تو ہمیں بھی ان دونوں اپنے آباؤ اجداد میں شمار کرنا پڑے گا۔ تاہم اتنا ضرور معلوم ہے کہ ان دونوں کا تعلق کسی ایک ہی گروہ یا تنظیم سے ہے۔"

"اب گروہوں اور تنظیموں میں اس قسم کی چیزیں بھی جانے لگیں؟" ستارہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"کار آمد ہونے کی بات ہے۔ یہ دونوں ان کے لئے نہ جا کتنے انسانوں سے زیادہ کار آمد ہوں گے۔ تمہیں ابھی ان صلاحیتوں اور افادیت کا اندازہ نہیں ہے' اس لئے تم ان کا حقارت سے کرتی ہو۔" میں نے کہا۔

"کچھ کچھ اندازہ ہوچلا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی اور ساتھ اس کے چہرے پر ایک بار پھر ہلکی سی سرخی آگئی۔ میں ہنس دیا۔

اس دوران ہم لوکیشن پر پہنچ گئے۔ یونٹ کے افراد شوٹ پیک اپ کرنے کی تیاریاں کررہے تھے۔ ڈائریکٹر راحیل بٹ دونوں کو دیکھتے ہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا "یہ لو... جن کی فکر ہمارا آدھا خون سوکھ گیا وہ ہنستے چلے آرہے ہیں۔"

سب نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمارا سرتاپا جائزہ لیا۔ ہمیں زندہ سلامت دیکھ کر انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا پھر راحیل بٹ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بولا "اللہ جی! کس مونہہ نال تہاڈا شکر ادا کراں... ساڈی ہیروئن تے چوہدری صاحب... دوہویں ٹھیک ٹھاک نیں۔"

"چوہدری صاحب! ایمہ کی تڑ تڑ شروع ہوگئی سی؟" کیمرا نے آگے آتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی جب آدمی کے کاروبار پھیلتے ہیں تو اس قسم کے جھگڑ رگڑے تو چلتے ہی رہتے ہیں۔" میں نے مسکرا کر بات گول کر ہوئے کہا "بہرحال میں آپ کی ہیروئن کو کسی قسم کی توڑ پھوڑ بغیر واپس آپ کے حوالے کررہا ہوں۔ آپ چاہیں تو اپنی با شوٹنگ مکمل کرلیں۔"

"شوٹنگ کہاں سے ہوگی چوہدری صاحب!" راحیل ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ہیرو ہی چلا گیا۔"

"کیا...؟" میں نے حیرت سے کہا "ارشد موتی چلا گیا؟"

"جی ہاں۔" راحیل بٹ مسکراتے ہوئے بولا "کہہ رہا وہ اپ سیٹ ہوگیا ہے۔ صحیح بھرفار منس نہیں دے سکے گا۔ درا

تھراہٹ میں اسی طرف بھاگ اٹھا جدھر سے فائرنگ ہورہی ی۔ وہ بال بال بچا۔ گولیاں اس کے عین قریب سے گزری ں۔ بچ تو گیا لیکن بے چارے کی حالت غیر تھی۔ اچھا ہی ہوا' چلا یا ہماری فلمی دنیا کا ٹارزن۔"

"ویسے بابو دولت کا بھی ٹارزن اسٹائل کا ایک شاٹ آپ کے لیرے میں محفوظ ہوگیا ہے۔ اسے ضائع کردیجئے گا۔" میں نے لما۔

"کیا واقعی؟" راحیل بٹ کی آنکھوں میں شرارت کی چمک بھر آئی "وہ تو دیکھنے کی چیز ہوگی۔ ہم تو اسے ڈیولپ کروا کر دیکھنے کے بعد ہی فیصلہ کریں گے کہ ضائع کرنا ہے یا کچھ اور کرنا ہے۔"

"وہ میرا شاٹ ہے۔ اس کے جملہ حقوق میرے نام محفوظ ں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے ستارہ کی طرف توجہ ہوتے ہوئے پوچھا "تم اپنے یونٹ کے ساتھ آؤ گی یا میرے ساتھ چلنا پسند کرو گی؟"

"میں یونٹ کے ساتھ ہی آجاؤں گی۔" وہ ایک لمحے سوچ کر ولی "ویسے میرے پاس اپنی گاڑی بھی ہے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" میں نے ان سب کو خدا حافظ کہا اور واپسی کے لئے مڑنے لگا تو راحیل بٹ بہ آواز بلند بولا "چوہدری صاحب! دعا کیجئے گا' یہ فلم تین مہینے میں مکمل ہوجائے ورنہ میں کنگال ہوجاؤں گا۔ فائنانسر سے میری شرط لگی ہوئی ہے۔ اگر تین ماہ میں فلم مکمل نہ ہوئی تو اس کا سارا پیسہ بھی واپس اور جتنی فلم بن چکی ہوگی وہ بھی مفت میں اس کی ملکیت ہوجائے گی۔ یہ باقاعدہ معاہدہ ہے۔"

میں نے جاتے جاتے مڑ کر اسی طرح بہ آواز بلند کہا "آپ بے فکر ہوکر کام کریں بٹ صاحب! ہم یاروں کے یار ہیں۔ آپ کا فائنانسر آپ کو لوٹ کر بھاگ گیا تب بھی ہم آپ کو کنگال نہیں ہونے دیں گے۔ آپ کا ہر نقصان ہم بھریں گے۔ جنگل گرل' ضرور مکمل ہوگی اور ضرور ریلیز ہوگی۔"

یونٹ کے تمام لوگ زور و شور سے تالیاں بجانے لگے اور میں تیز تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف واپس چل دیا۔ چند منٹ بعد جب میں اس مقام پر پہنچا جہاں میری گاڑی کھڑی تھی تو ایک لمحے کے لئے میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں گاڑی کے چاروں دروازے لاک کرکے گیا تھا لیکن اس وقت گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا نظر آرہا تھا۔

گاڑی میں جھانکے بغیر دور سے ہی مجھے احساس ہوگیا کہ اے نن گاڑی میں موجود نہیں تھا۔ ایک انجانے خطرے کے احساس سے میرے اعصاب تن گئے۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کے باوجود جس حالت میں' میں نے اسے چھوڑا تھا اس حالت میں وہ فرار نہیں ہوسکتا تھا۔ شہتیر کی طرح لڑھکتا ہوا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

وہ دور دور تک کہیں نظر نہیں آرہا تھا اور اس کے اس طرح فرار ہونے کا مطلب یہی تھا کہ کسی نے اس کی مدد کی تھی۔ اور وہ مددگار شاید آس پاس ہی کہیں موجود تھا۔ میری کوئی حس مجھے اس کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔

میں دوڑ کر ایک بار پھر گاڑی کی اوٹ میں ہوگیا اور اس دوران میرے اس خیال کی تصدیق ہوگئی کہ اے نن گاڑی میں موجود نہیں تھا۔ ستارہ سے واپس لیا ہوا مشین پسٹل میرے ہاتھ میں آچکا تھا اور میری نظریں درختوں کے گنجلک سلسلے میں بھٹک رہی تھیں۔

دفعتاً فضا میں ایسی ہنسی ابھری جیسے کوئی میری حالت دیکھ کر محظوظ ہورہا ہو۔ مگر یہ غیر انسانی ہنسی تھی۔ میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ مجھے نظر نہیں آیا تھا مگر اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کہاں تھا۔ میں نے پہچان لیا تھا کہ یہ ہنسی کس کی تھی۔ یہ وہی منحوس چمپینزی بلیک بڑ تھا جس سے مجھے ستارہ کے گھر واسطہ پڑ چکا تھا۔ اکثر خبیثوں کی طرح اس کی بھی عمر لمبی معلوم ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اس کا ذکر ہورہا تھا اور وہ آن موجود ہوا تھا۔ بلکہ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ اس وقت بھی آس پاس ہی کہیں موجود رہا ہو اور کسی پناہ گاہ سے ہماری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا ہو جس وقت ستارہ اس کا ذکر کررہی تھی۔

وہ ایک بہت اونچے اور گھنے درخت کی بالائی شاخوں پر پتوں کے درمیان چھپا ہوا تھا اور کسی جھری سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھ پر شاید ہلکی سی جھلاہٹ طاری تھی۔ میں نے اندازاً اس جگہ پر کئی فائر کرڈالے۔ بہت سے پتے ٹوٹ کر ہوا میں لہراتے ہوئے اِدھر اُدھر بکھر گئے لیکن شاخوں کے درمیان ہونے والی کھڑکھڑاہٹ سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ گولیوں سے بچ چکا تھا۔ شاخوں ہی شاخوں کے درمیان کسی اور درخت پر پہنچ چکا تھا۔

گولیاں ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے مشین پسٹل جیب میں رکھ لیا اور تن بہ تقدیر ہوکر گاڑی کی اوٹ سے نکل آیا۔ تب وہ بھی پتوں کی پناہ گاہ سے نکل آیا۔ ایک بار پھر وہی خوفناہٹ نما ہنسی ابھری اور میں نے دیکھا' وہ کافی دور ایک درخت کی اونچی شاخ پر ایک ہی بازو کے سہارے جھول رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ذرا مختلف ساخت کی ایک گن تھی۔ وہ یقیناً اس کی وہی فلیئر گن تھی جو میں اس رات تاریکی کی وجہ سے صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا تھا جب ستارہ کی کوٹھی پر اس سے سامنا ہوا تھا۔

لیکن آج بلیک بڑ کی شخصیت میں ایک بہت بڑی تبدیلی نظر آرہی تھی۔ اور وہ یہ کہ شاید انسداد فحاشی کے کسی پروگرام سے متاثر ہوکر اس نے خاکی رنگ کی ایک ڈنگری پہنی ہوئی تھی۔ آج وہ اپنے فطری لباس میں باہر نہیں آیا تھا۔ اس کے جسم پر صرف ڈنگری ہی نہیں تھی بلکہ کاؤبوائز والے اسٹائل میں باقاعدہ ہولسٹر میں گولیوں کی بیلٹ کے ساتھ ایک ریوالور بھی جھول رہا تھا۔ سینے پر

ایک بیج بھی ہوتا تو شاید وہ بندروں کا شیرف معلوم ہوتا۔

مجھے یقین ہوگیا کہ اے ٹن کو فرار ہونے میں اسی نے مدد دی تھی۔ میرا غصہ ایک بار پھر عود کر آیا اور گو کہ اس نے اپنی فلیٹر گن سے مجھ پر فائر نہیں کیا تھا لیکن میں نے انتہائی پھرتی سے جیب سے مشین پسٹل نکال کر اس پر فائر کئے۔ میں نے اسے چھلاوے کی طرح ہوا میں قلابازیاں کھاتے اور پتوں کے درمیان دوبارہ غائب ہوتے دیکھا۔

لائن آف فائر کا اندازہ کرتے ہوئے گولیوں سے بچنے کی ٹیکنک مجھے بھی آتی تھی اور میں نے بڑی محنت سے سیکھی تھی۔ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ شاید وہ بھی اس ٹیکنک کا مظاہرہ کرے گا اس لئے میں نے اس کا توڑ کرتے ہوئے فائر کئے تھے۔ لیکن اس حیوان کی ٹیکنک مجھ انسان سے بہتر تھی۔ اس نے انسانی نفسیات کو دھوکا دے دیا تھا۔ میرے خیال میں اسے گولیوں سے بچتے ہوئے جتنے فاصلے تک چھلانگ لگانی تھی میں نے وہیں فائر کیا تھا۔ انسان عموماً اس سمت میں چھلانگ لگاتا ہے جدھر اس کا چہرہ ہوتا ہے۔ لیکن اس نے اس نفسیاتی اصول کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور الٹی جست لگائی تھی۔

شاید چیپنیزی ہونے کی وجہ سے بھی اس کی صلاحیتیں اور نفسیات مختلف تھی یا پھر اسے تربیت میری نسبت بہتر ملی تھی۔ اس کا اسٹائل مجھے بہت پسند آیا تھا۔ یہ مزید کارآمد ٹیکنک تھی۔ میں نے اسی لمحے سوچ لیا تھا کہ میں اس کی بھی مشق کروں گا۔ انسان چاہے تو بندروں سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔

میں دل ہی دل میں چیپنیزی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تیزی سے دوبارہ گاڑی کی اوٹ میں ہوگیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی جواباً فلیٹر گن یا ریوالور سے فائر کرے گا۔ یا کوئی اور ردِ عمل تو یقیناً ظاہر کرے گا۔ مگر وہ کم بخت آج میرے سارے اندازے غلط ثابت کرنے اور میرے پورے علم نفسیات کو چکر دینے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں کیا اور ایک لمحے بعد مجھے بہت دور سے پتوں کی ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بدمعاش یقیناً درختوں ہی درختوں پر جنگل کے گھنے حصوں کی طرف نکلتا چلا گیا تھا۔ وہ غالباً مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلانے اور یہ جتانے آیا تھا کہ اے ٹن کو اس نے فرار کرایا ہے۔ شاید وہ مجھے یہ احساس بھی دلانا چاہتا تھا کہ میں انہیں قابو میں نہیں کر سکتا۔

میرے خیال میں اب اس کی تلاش میں اپنے آپ کو تھکانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اب اس طرف جانے کی کوشش نہیں کرے گا جدھر قلعی یونٹ کے افراد موجود تھے۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کہیں اور روانہ ہوگیا تھا۔ میں بھی گاڑی میں بیٹھا اور واپس شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔

راستے میں جہاں میں نے ٹونی اور شبیر کو چھوڑا تھا وہ وہیں درختوں کے جھنڈ کے عقب میں سڑک سے کچھ دور کچے میں موجود تھے۔ وہ دوبارہ میرے پیچھے آنے لگے۔ بڑے ہی مستقل مزاج نوجوان تھے۔

کچھ دور آنے کے بعد میں نے ریڈیو پر ٹونی سے رابطہ اور دورانِ سفری اسے نصیر نواز کا ایڈریس بتاتے ہوئے کہا دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگاؤ کہ آج رات یا کل کسی وقت ایسا کریں کہ یہ شخص مجھے گھر پر اکیلا ملے۔ مجھے اس سے اکیلے مذاکرات کرنے ہیں۔ جب بھی میٹنگ کے لئے ماحول تیار ہو مجھے فون کردو۔ میں پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے سر!" ٹونی حسبِ عادت دھیمے لہجے میں بولا مذاکرات زیادہ ضروری نہ ہوں تو ہمیں بریف کردیں۔ کرلیں گے۔" وہ میرا مطلب بخوبی سمجھتے تھے۔

"نہیں میں نے کسی سے وعدہ کیا تھا کہ میں خود مذاکرات گا۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کرکے ریڈیو کا مائیک خانے میں واپس رکھ دیا۔

گھر پہنچ کر میں نے غسل اور کھانے کے بعد باہر جانے تیار ہونا شروع کیا تو مجھے ایک اور کام یاد آگیا۔ میں نے گوجرانوالہ کا ایک نمبر ڈائل کیا اور رابطہ قائم ہونے پر سیٹھ وحید سے بات کرنا تھی۔"

چند لمحے کے انتظار کے بعد مجھے ایک جانی پہچانی اور آواز سنائی دی اور میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "سیٹھ صاحب افضل چوہدری بول رہا ہوں۔"

"اوہو۔۔۔" اس نے ایک طویل سانس لی اور دفعتاً

اے حمید کے ایڈونچر قلم سے

شیوسینا کے دہشت گرد

چار جلدوں میں مکمل سیٹ =/700 رو

اردو بازار لاہور

کی آواز کانپ گئی "چوہدری صاحب! مجھے یقین نہیں آرہا نے مجھے یاد فرمایا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے میرے کان مجھے ے رہے ہیں۔ چوہدری صاحب! کیا یہ واقعی آپ ہیں؟"

جی ہاں۔ یہ سو فیصد میں ہی ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا صاحب! میں نے آپ سے جس کام کا وعدہ کیا تھا' میرا خیال تکمیل کو پہنچنے والا ہے۔ اگر آپ اپنی آنکھوں سے آخری کھنا چاہتے ہیں تو آج ہی لاہور پہنچ جایئے اور مجھے اپنے فون مطلع کردیجئے۔"

بہت بہتر چوہدری صاحب!" اس نے سعادت مندی سے لیکن پھر گویا کچھ سوچ کر ہچکچاتے ہوئے بولا "اگر آپ نے ض کو تلاش کرلیا ہے تو اسے ہمارے حوالے کردیجئے۔۔۔۔ میرے اور میرے بیٹے نوید کے جذبات کی بھی کچھ تسکین ے کسمپرسی اور ذلت کے عالم میں بہن کا قتل ہونا نوید کے لئے بڑا دھچکا ثابت ہوا ہے۔ اس کے ذہن پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ گم صم رہنے لگا ہے۔ وہ بڑا جذباتی اور جوشیلا نوجوان ہے۔ ر جذباتیت میں ہم نے پہلے بچی کو ہاتھ سے کھو دیا۔ اب بچہ غلط قدم اٹھالے۔ وہ بھی اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتا ہے۔ خواہشات کو کچلنے میں اس وقت وہ بھی میرے شانہ بہ شانہ ب پچھتاوے کا زہر اسے مجھ سے زیادہ کھا رہا ہے۔ اگر اس کا ذرے دار ہمارے ہاتھوں میں آجائے تو شاید ہم اپنا پچھتاوا کرسکیں۔"

میں نے ایک لمحے سوچا پھر کہا "نہیں سیٹھ صاحب! جذباتیت کام بگاڑ دیتی ہے۔۔۔ اور پھر آپ لوگ ان معاملات میں کافی کتے ہیں۔ جو کچھ میں آپ کو دکھاؤں گا آپ کی جذباتیت کی ن کے لئے وہی کافی ہوگا۔"

"جیسے آپ کی مرضی چوہدری صاحب!" اس نے فوراً ہی اپنی ش واپس لے لی "ہمارے لئے تو یہی بہت بڑا احسان ہے کہ جیسے بڑے آدمی نے یہ نفس نفیس ہمارے لئے اتنی زحمت کی۔ آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔" اس کی آواز گلوگیر ے لگی تھی اس لئے میں نے جلدی سے اسے خدا حافظ کہہ کر لہ منقطع کردیا۔

مجھے ایک رنگا رنگ تقریب میں جانا تھا۔ وہاں جاکر میں نے ن ناگوار باتیں بھلانے کی کوشش کی اور اس میں کافی حد تک یاب رہا۔ وہاں ایک سے ایک بڑھ کر حسین چہرے تھے جن میں ے بیشتر میرے گرد منڈلاتے رہے اور یوں میری عزت افزائی ہوتی ل۔ سیاستوں کے قصے تھے' لہو کو گرمانے والی باتیں تھی' عمدہ باتیں تھے' اچھا کھانا تھا۔ سب کچھ میرے ذوق کے مطابق تھا۔ دیر کے لئے میں نے ساری الجھی الجھی باتیں بھلا کر خود کو اس ل میں ڈبو دیا۔ اس دوران دو تین سیٹھوں نے حسبِ عادت مجھ لہو کے بھاؤ' چھالیہ کے جہازوں' اسکریپ' کاٹن اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں ان سے دور ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ اس وقت میری نظر میں یہ سب فضولیات تھیں۔

بعض سیٹھوں پر مجھے حیرت ہوتی تھی کہ اگر وہ تقریبات کو انجوائے نہیں کرسکتے تھے تو ان میں آتے کیوں تھے۔ لیکن اس سوال کا جواب بھی مجھے معلوم تھا۔ وہ بے چارے یہاں بھی صرف کاروبار کو وسعت دینے آتے تھے۔ بہت سے کام کے لوگوں کو ایک ہی جگہ پر جمع دیکھ کر ان کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتی تھیں اور باچھیں کھل جاتی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ ملک الموت سے بھی منڈی کے بھاؤ ضرور ڈسکس کریں گے۔

اس پارٹی میں فلمی دنیا کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ فلمی دنیا کی پارٹیوں کا اپنا ایک الگ ہی مزہ تھا۔ بہرحال میں پارٹی سے واپس آیا تو خاصی ترنگ میں تھا۔ میری عدم موجودگی میں ٹیلی فون کا جواب دینے والی مشین پر دو ایسے ریکارڈ شدہ پیغامات موجود تھے جن کا مجھے انتظار تھا۔

ایک پیغام تو سیٹھ وحید کا تھا۔ وہ گوجرانوالہ سے لاہور آچکا تھا اور حسبِ معمول ہلٹن میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے اپنا فون نمبر اور کمرا نمبر وغیرہ ریکارڈ کرادیا تھا۔ دوسرا پیغام کوڈ ورڈز میں ایک کارکن کا تھا۔ ٹونی نے اس کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ نصیر نواز سے میری ملاقات کے لئے سازگار' ماحول تیار کرے۔ اس کارکن نے اطلاع دی تھی کہ میٹنگ کے لئے صبح آٹھ بجے کا وقت مناسب رہے گا۔ نصیر نواز رات کو دیر سے گھر آتا تھا اور صبح دیر تک سوتا تھا۔ اس بات کا بندوبست کرلیا گیا تھا کہ صبح اس کے ملازم بھی دیر تک سوتے رہیں۔ کوئی ہماری گفتگو میں مداخلت کرنے یا ہماری ملاقات کا چشم دید گواہ بننے نہ آئے۔ میرے آدمی کام جلدی کرتے تھے اور تسلی بخش کرتے تھے۔ میں مطمئن ہوکر لمبی تان کر سوگیا۔

رات کو تقریباً روزانہ میں بھی دیر سے ہی سوتا تھا لیکن صبح جلدی اٹھ جاتا تھا۔ میری ایک دیہاتی والی سحر خیزی کی عادت نہیں گئی تھی۔ علی الصباح میں نے ہلٹن فون کرکے سیٹھ وحید کو جگایا اور اسے اطلاع دی کہ فلاں وقت میرا ایک آدمی اسے لینے آئے گا۔ وہ اسے جہاں بھی لے چلے' سیٹھ کو بے چون وچرا چلے آنا چاہئے۔ اس نے بتایا کہ اس کا بیٹا نوید بھی اس کے ساتھ ہے۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر بے پروائی سے کہا "آپ اسے بھی ساتھ لاسکتے ہیں۔"

اس کے بعد میں نے ٹونی اور شبیر کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور خود معمول کے مطابق تیار ہونے لگا۔ تیار ہوکر میں نے ناشتا کیا اور بریف کیس اٹھا کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ گاڑی میں بیٹھتے وقت میں نے گھڑی دیکھی۔ پونے آٹھ بج رہے تھے۔ نصیر نواز کے گھر پہنچنے کے لئے پندرہ منٹ کافی تھے۔

گاڑی میں نے نصیر نواز کے گھر سے کافی دور ایک چھوٹی سی مارکیٹ کے قریب چھوڑ دی اور ٹہلتا ہوا آگے روانہ ہوا۔ اس کی گلی میں ویرانی ہی تھی۔ اِکا دُکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ اس علاقے کے بیشتر مکینوں کے نزدیک آٹھ بجے کا وقت تقریباً نہ اندھیرے ہی کا وقت تھا۔

چلتے چلتے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میں یکدم ہی نصیر نواز کے گھر میں داخل ہو گیا۔ گیٹ بظاہر بند تھا لیکن اندر سے بولٹ چڑھا ہوا نہیں تھا۔ میں نے اندر پہنچ کر بولٹ چڑھا دیا۔ نصیر نواز کی کوٹھی شاندار تھی اور اس کے ڈرائیوے میں دو بیش قیمت کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک کامیاب فلمی مصنف خاصا خوش حال ہوتا ہے مگر اتنا بھی نہیں جتنا نصیر نواز نظر آتا تھا۔ اور جتنا وہ نظر آتا تھا' مجھے یقین تھا کہ اس سے بھی زیادہ دولت مند تھا۔ وہ صرف فلمی مصنف کے طور پر ہی نہیں' اور بھی نہ جانے کن کن حیثیتوں میں کتنا کامیاب تھا۔

گھر کا لان شاندار تھا۔ ورانڈے سے امارت ٹپک رہی تھی۔ میں ایک ایک کمرے میں جھانکتا آگے بڑھتا گیا۔ اس گھر میں زیادہ رونق نوکروں ہی کے دم سے رہتی ہو گی جن میں سے کوئی بھی اس وقت مجھے روکنے ٹوکنے کے لئے موجود نہیں تھا۔

آخر کار مجھے نصیر نواز کا بیڈ روم مل گیا۔ اس کا دروازہ بھی غیر مقفل تھا۔ میرے آدمی کسی سے ملنے کے لئے جب میرا راستہ صاف کرتے تھے تو پھر راستے میں کوئی چھوٹی سی رکاوٹ بھی نہیں رہنے دیتے تھے۔

نصیر نواز اپنے شاندار بیڈ پر آڑا ترچھا بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ ہلکے ہلکے خراٹے بھی لے رہا تھا۔ میں بریف کیس اٹھائے یوں اس کے قریب جا کھڑا ہوا جیسے کوئی ڈاکٹر اپنے مریض کا معائنہ کرنے آیا ہو۔ بریف کیس سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے میں نے اس کا کندھا ہلا کر اسے جگایا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد آخر کار وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ بتا رہا تھا کہ پچھلی رات پینے پلانے کا عمل رہا تھا جس کا اثر ابھی تک باقی تھا لیکن پھر مجھے پہچان کر اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں اور وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"چوہدری صاحب! آپ یہاں.... اور اس وقت؟ میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟" اس نے ایک بار پھر آنکھیں ملیں۔

"نہیں' یہ خواب نہیں ہو سکتا۔" میں نے گویا اسے یقین دلایا۔ "کیوں کہ میں مردوں کے خوابوں میں آنا ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

"آپ کی آمد کی کوئی اطلاع.... میرا مطلب ہے آپ کو کسی نے...." اس نے جملے ادھورے چھوڑ دیئے۔

"غالباً تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں سیدھا تمہارے کمرے میں کیونکر پہنچ گیا؟ کیا مجھے کسی ملازم وغیرہ نے نہیں روکا؟ تو بات یہ ہے مسٹر نصیر نواز.... کہ میں جب کسی سے اپنے طور پر کرلیتا ہوں تو عام طور پر ملازموں وغیرہ کے تکلفات نکال دیتا ہوں۔" میں نے ڈریسنگ ٹیبل کا اسٹول کھینچ کر کہا۔

وہ قدرے سنبھل کر بولا "پھر بھی آپ نے کیوں آپ فون کر دیتے.... آفاق سے کہہ دیتے.... میں خود حاضر کیا کوئی نئی فلم شروع کر رہے ہیں؟ میرے لائق کوئی آئی ہے؟"

"میں جس فلم کے سلسلے میں آیا ہوں' وہ تم اپنی تقریباً پوری لکھ چکے ہو نصیر!" میں نے ملائمت سے کہا۔ "اس کا آخری سین لکھوانے آیا ہوں۔"

میں نے نشاط کی ایک تصویر اس کے سامنے کی۔ "زندگی سے بھرپور' ہنستی مسکراتی ایک خوب صورت لڑکی۔ پہچانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں خوف کی پرچھائیاں لیکن وہ کہانی کار نہ سہی' اداکار بہت اچھا تھا۔ بڑی کامیابی پرچھائیوں کو معصومیت کے پردوں میں چھپا گیا۔ اس کی شکنیں ابھر آئیں' گویا ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس لڑکی کو کہیں دیکھا تو نہیں؟

بغور میری طرف دیکھتے ہوئے وہ سادگی سے بولا "دیکھتی ہوئی سی تو لگ رہی ہے لیکن یاد نہیں آ رہا کہاں کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں جو سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں سوئمنگ پول میں مردہ پائی گئی تھی؟ اس کی شکل تو بہت تھی.... لیکن پھر بھی.... اس تصویر میں اس کی کچھ کچھ ہے۔"

"بہت خوب" میں نے ہلکی سی تالی بجا کر اسے داد دی۔ "بڑا غنیمت ہے کہ تمہیں اس تصویر میں مقتولہ نشاط عرف جھلک تو دکھائی دے گئی۔ ورنہ تم چاہتے تو اس جھلک سے انکار بھی کر سکتے تھے۔ بے شک نشاط کی صورت اس وقت کافی بگڑ گئی تھی جب اس کی لاش سوئمنگ پول کی تہ سے نکالی گئی۔ لیکن پرورش پانے والی ایک نازک اندام مگر ضدی لڑکی جس نے ان گنت تباہیوں کی بھینٹ چڑھ چکی ہو' جس کے ساتھ دھوکا ہوا ہو.... محبت اور شادی کے وعدوں کے نام پر جس نے صرف عیش و نشاط کی راتیں بسر کی گئی ہوں' جس کے ہاں بچے کو بچے کا باپ اپنا تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہو' مگر تنگی کے لمحات میں نائیلون کی ڈوری سے جس کا گلا ہلاک کر دیا گیا ہو' جس کی لاش کم از کم دو ڈھائی گھنٹے سوئمنگ پول کی تہ میں رہی ہو۔ اس کی شکل تو بگڑنی ہی تھی نصیر نواز!"

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بات روکتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے کہ وہ ایک نادان لڑکی تھی۔

مصنف
ایم اے راحت

تاریک وادی

سرزمین افریقہ کے پراسرار گوشوں کی داستان ہے جہاں آج بھی تہذیب کے قدم نہیں پہنچے، اور علم کی روشنی نہیں پھیلی۔ اسی وجہ سے وہاں توہمات، جادو اور دیوی دیوتاؤں کی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ اور ہزاروں سال سے وہ لوگ اپنے عقائد کے سہارے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

تاریک وادی بھی سرزمین افریقہ کے پراسرار گوشوں کی داستان ہے جس میں رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات اور ہمالیہ کے دامن میں بکھری ہوئی لاماؤں کی داستان اس کہانی میں ایک خوبصورت اضافہ کرتی ہے۔

خوبصورت سرورق ◎ بہترین کتابت وطباعت

دو جلدوں میں مکمل

جلد اول : ۱۵۰/- روپے
جلد دوم : ۱۵۰/-
مکمل سیٹ : ۳۰۰/-

کتاب اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں یا آدھے کے نام کل قیمت کا منی آرڈر اک سال فرمائیں
کتاب آپ کو بذریعہ رجسٹری اک سال کر دیجائے گی

خط وکتابت کے لئے
مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور ۲، فون ۷۲۲۴۶۶۵

حماقت کرتی چلی آئی تھی لیکن اس کی نادانیوں کی اسے اتنی بڑی سزا نہیں ملنی چاہئے تھی۔ اسے کم از کم زندہ رہنے کا حق تو حاصل رہنا چاہئے تھا۔ تمہیں اس حسین تصویر کو اتنی بے دردی سے مسخ نہیں کرنا چاہئے تھا نصیر!"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا آپ کس قسم کی باتیں کررہے ہیں!" نصیر نواز غیر محسوس طور پر تھوک نگل کر بولا۔

"یہ بہت گھسا پٹا مکالمہ ہے۔ عام طور پر ایسے موقعوں پر یہی بولا جاتا ہے۔ لیکن تم اتنے بڑے فلمی مصنف مشہور ہو' کم از کم تمہیں تو اس موقع کے لئے کچھ اور سوچ کر رکھنا چاہئے تھا۔ خود نہیں سوچ سکتے تھے تو سجاد نسیم سے ہی لکھوا لیتے۔"

اسے حیرت کا جو دھچکا لگا اسے بھی وہ بڑی صفائی سے چھپا گیا۔ بدستور معصوم بنا رہا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "چوہدری صاحب! آپ یقیناً آج صبح ہی صبح مجھے حیران کرنے کی مہم پر نکلے ہیں۔ آپ کی باتیں واقعی میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔ آج یکم اپریل بھی نہیں ہے۔ ورنہ میں یہی سمجھتا کہ آپ نے اپریل فول بنانے کے لئے میرا انتخاب کیا ہے۔"

"میرے لئے نہ اپریل فول کی رسم اتنی اہم ہے اور نہ تمہاری شخصیت' جس کے لئے میں اپنا اتنا وقت خراب کرنے آتا۔" میں نے حقارت سے کہا "میں نے تو ایک شریف باپ اور ایک معصوم روح سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے لئے اتنی زحمت اٹھائی ہے۔"

"چوہدری صاحب! میں آپ کو انتہائی سنجیدہ اور کافی حد تک غیر فلمی سا آدمی سمجھا تھا۔" وہ ذرا سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تم بالکل ٹھیک سمجھے تھے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے لقمہ دیا۔

"لیکن آج آپ کی باتوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ ڈرامائی سچویشن پیدا کرنے میں بھی اچھے خاصے ماہر ہیں۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "آپ نے مجھے واقعی خاصا حیران پریشان کردیا ہے۔ میں اس وقت ویسے بھی کافی پیا کرتا ہوں.... لیکن آپ کی باتوں کے بعد تو کافی کی ضرورت زیادہ شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ آپ بھی یقیناً کافی پینا پسند کریں گے۔ میرا شیف بہت عمدہ کافی بناتا ہے۔" اس کے بیڈ کے سرہانے کال بیل کا بٹن موجود تھا۔ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے بٹن دبایا اور دباتا ہی چلا گیا۔ کافی فاصلے پر غالباً کچن میں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ وہ امید بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتا رہا لیکن گھنٹی کے جواب میں کوئی نہ آیا۔ اب وہ اپنی آنکھوں میں تشویش کی پرچھائیوں کو چھپانے میں کچھ ناکام ہو رہا تھا۔

وہ اٹھنے کے لئے آگے کھسکتے ہوئے بولا "یہ ملازم پتا نہیں کہاں مر گئے۔ ٹھہرئے میں خود دیکھتا ہوں۔"

میں نے اس کی کلائی پکڑلی۔ یہ ایسی گرفت تھی جو ایک بیل کو بھی اس کی جگہ بیٹھے رہنے پر مجبور کرسکتی تھی۔ وہ تو محض ایک بھیش کوش انسان تھا۔

"چوہدری صاحب! کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟" اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"بہت زیادہ سنجیدہ ہوں۔" میں نے جواب دیا "میں کبھار ہی زیادہ سنجیدہ ہوتا ہوں اور جو لوگ کبھی کبھار سنجیدہ ہوتے ہیں' ان کی سنجیدگی کسی نہ کسی کو بہت بھاری پڑتی ہے۔"

"آپ بالکل صاف صاف اور سلیس انداز میں بات کیجئے۔ آپ کس لئے آئے ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" وہ گویا طور پر کچھ تیار ہوتے ہوئے بولا۔

"میں کیا اب تک فارسی میں گفتگو کررہا تھا؟" "میں ملائمت سے کہا "میری گفتگو تمہارے لئے بالکل صاف اور تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم سب کچھ بہت اچھی طرح سمجھ رہے لیکن جانتے بوجھتے بھی انجان بنے رہنے کا اگر تمہاری نظر میں فائدہ ہے تو بنے رہو۔ میں تو جو کچھ کرنے آیا ہوں وہ کرکے ہی گا۔ تمہاری فرد جرم میں تمہیں سنا چکا ہوں۔ تم جتنے خوش انسان ہو' اندر سے اتنے ہی گھناؤنے ہو۔ ایک غریب آدمی ہزار ہزار روپے پر فلمی کہانیاں لے کر تم چالیس پچاس ہزار میں بیچتے رہے اور سرہٹ مصنف بنے رہے۔ اس غریب آدمی اپنی بوڑھی ہوتی ہوئی بیٹی کی شادی کے لئے تم سے تھوڑی مدد طلب کی تو تم نے اسے کسی سیٹھ کے عشرت کدے کی بنانے کا مشورہ دیا...."

اب حقیقتاً اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے نمودار لگے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "پھر تم نے گھ بھاگی ہوئی اس نادان لڑکی نشاط کو محبت کے جھانسے دے ہیروئن بنوانے کا وعدہ کیا۔ اس سے شادی کا وعدہ کیا اور ا پھسلا کر اپنی راتیں رنگین کرتے رہے۔ وہ تمہارے کہانیوں راز سے بھی آگاہ ہوگئی۔ وہ تم سے فیصلہ کن جواب لینے پر کیونکہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس نے شاید کہانیوں والا راز بھی فاش کرنے کی دھمکی دی ہو۔ چنانچہ انتہائی سفاکی سے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ یہ تو تمہارے وہ جرا جو میرے علم میں آسکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے جر فہرست اس سے کہیں زیادہ لمبی ہوگی۔"

"فلمی دنیا میں اس قسم کے معاملے چلتے رہتے ہیں۔ چو صاحب! آپ کیوں اتنے سیریس ہو رہے ہیں؟ آپ مجھ چاہتے ہیں؟"

"گویا تم تسلیم کررہے ہو کہ ایسا ہوا ہے؟" میں پوچھا۔

"تسلیم تو میں کچھ بھی نہیں کررہا۔ میں تو آپ کو سمجھا رہا آدمی کو تمام پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑا کر خواہ مخواہ اپنا نہیں جلانا چاہئے۔" وہ اب سنبھل چکا تھا اور پراعتماد نظر

ا۔ غالباً اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ جو کچھ ہونا ہے' را جرات سے اس کا مقابلہ کیا جائے۔ لیکن اسے صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا کہ ہونا کیا ہے۔

"میں یہاں خون جلانے نہیں خون کا حساب لینے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ویسے نشاط واقعی تھی بہت بے وقوف۔ اگر وہ تمہیں نادانی کہ وہ کتنے دولت مند باپ کی بیٹی ہے تو تم اس کے ساتھ کبھی وہ سلوک نہ کرتے جو تم نے کیا۔ شاید تم اس کے ساتھ شادی کے ارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگتے۔ بشرطیکہ طاہرہ خانم کا پلہ بھاری نہ ہوتا۔ آج کل تمہاری نظر طاہرہ خانم کی دولت پر ہے۔ لیکن تم اس سے جتنا استفادہ کرچکے ہو اتنا ہی کافی ہے۔ زندگی اب تمہیں مزید مہلت نہیں دے گی۔"

اس کی آنکھوں میں ایک تلاطم سا آکر گزر گیا۔ شاید اسے یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ نشاط ایک دولت مند آدمی کی بیٹی تھی۔ شاید یہ بات بھی اس کے لئے حیرت کا باعث تھی کہ میں اس کے بارے میں اتنا کچھ جانتا تھا۔

"آخر آپ کرنا کیا چاہتے ہیں"؟ اس کی آنکھوں میں اب خوف کی پرچھائیاں واضح ہوچکی تھیں۔

میں نے ایک خوفناک سیاہ ریوالور نکال کر اس میں سائلنسر فٹ کرتے ہوئے کہا۔ "میری ذاتی عدالت انصاف نے تمہیں موت کی سزا سنائی ہے۔"

ریوالور دیکھ کر اس کی آنکھیں ذرا پھیلیں مگر دوسرے ہی لمحے وہ کچھ سنبھل گیا۔ اس نے اپنا خوف چھپانے کی کوشش کی اور تھوک نگل کر بولا۔ "چوہدری صاحب! بے شک آپ دولت مند آدمی ہیں۔ ممکن ہے آپ کے ہاتھ بھی لمبے ہوں۔ لیکن آپ کو اتنا احساس تو ضرور ہونا چاہئے کہ میں کوئی گھسیارا نتھو خیرا نہیں ہوں۔ میں انڈسٹری کا ایک اہم آدمی ہوں۔ میرا ایک نام ہے۔ مجھے قتل کرکے آپ کی راتوں کی نیندیں حرام ہوجائیں گی۔ آپ بچ نہیں سکیں گے۔"

میں مسکرا دیا۔ ریوالور سیدھا کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ تمہیں اس قسم کی باتیں کرنے کا حق حاصل ہے کیونکہ تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ تم میرے لئے کسی گھسیارے یا نتھو خیرے سے بھی کم اہم ہو۔"

اس نے یہ حربہ بھی ناکام ہوتے دیکھا تو اپنی دانست میں تھائی پھرتی سے کام لیتے ہوئے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور چھوٹا سا یک پستول نکالا۔ میں چاہتا تو پستول اس کے ہاتھ میں آنے تک ں کا جسم گولیوں سے چھلنی کرسکتا تھا لیکن میں نے اسے یہ امان ٹالنے کا موقع دیا..... اس کا خیال تھا کہ شاید میں اس کی طرف سے غافل ہوگیا ہوں یا پھر میں اس جتنی پھرتی کا مظاہرہ نہیں کر سکا۔

پستول ہاتھ میں آتے ہی اس نے بدحواسی میں اندھا دھند ٹریگر دبانا شروع کردیا۔ اگر پستول میں واقعی میگزین موجود ہوتا تب بھی آدھی سے زیادہ گولیاں تو ضائع ہی ہوتیں لیکن افسوس کے میگزین پستول میں نہیں تھا۔ میگزین میری جیب میں تھا۔ اسے جگانے سے پہلے میں نے احتیاطاً تکیے کے نیچے ہاتھ مار کر دیکھ لیا تھا۔ میرے اندیشے کے عین مطابق وہاں پستول موجود تھا۔ میں نے پستول غائب کرنے کے بجائے صرف اس کا میگزین نکال لینا ہی کافی سمجھا تھا۔

وہ کئی بار ٹریگر دبا چکا تب اسے احساس ہوا کہ ہوائیں سے گولیاں نہیں' صرف کلک کلک کی آوازیں برآمد ہورہی ہیں۔ اس کی حالت عجیب ہوگئی۔ وہ کبھی پستول کی طرف دیکھتا اور کبھی میری طرف۔ اس کے تاثرات دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔

اس نے وحشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اس کا ارادہ پڑھ لیا اور یک لخت ریوالور سیدھا کرتے ہوئے' بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اٹھ کر بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ زندگی مزید چند منٹ کم ہوجائے گی۔ ویسے بھی انسان موت سے کہاں بھاگ سکتا ہے؟ مجھے ابھی تم سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ہوسکتا ہے تمہاری موت کے ٹل جانے کی کوئی صورت نکل ہی آئے۔"

اس نے اٹھ کر بھاگنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ چہرے پر امید کی ایک لہر بھی آگئی۔ اس بار اس نے تھوک نگلا تو باقاعدہ (سچ) کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ وہ مرتعش آواز میں بولا۔ "چوہدری صاحب! آپ دولت مند آدمی ہیں.... روپیہ پیسہ آپ کا مسئلہ تو نہیں ہے.... لیکن پھر بھی.... روپے پیسے کی اہمیت تو کسی کے لئے بھی ختم نہیں ہوتی.... اگر اس طرح معاملہ رفع دفع ہوسکتا ہے تو میں اس کے لئے تیار ہوں.... میرا مطلب ہے کوئی جرمانہ.... تاوان وغیرہ.... میں خاصی بڑی رقم آپ کی خدمت میں پیش کرسکتا ہوں...." اس نے پرامید نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"مثلاً کتنی بڑی؟" میں نے اپنے لہجے سے دلچسپی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"پانچ لاکھ۔" اس نے بلا تامل کہا۔

"دولت عجیب چیز ہے اور انسان عجیب تر۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "سجاد نسیم ایک غریب آدمی ہے۔ اس کی بیٹی گھر بیٹھی بوڑھی ہورہی ہے۔ اس شخص کی وجہ سے تم نے لاکھوں روپے' عزت اور شہرت کمائی ہے۔ اس نے تم سے ایک لاکھ روپیہ مانگا تھا تو تم نے نہیں دیا۔ مجھے تم یکدم پانچ لاکھ روپے دینے کے لئے تیار ہوگئے ہو حالانکہ میں ضرورت مند نہیں ہوں۔ میں پہلے ہی بقول تمہارے دولت مند ہوں۔ اور میں نے زندگی میں کبھی تمہیں کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچایا۔ ہے نا عجیب بات؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"فلسفہ چھوڑیں چوہدری صاحب! کام کی بات کریں۔" وہ مضطربانہ لہجے میں بولا۔ "پانچ لاکھ کم ہیں تو میں سات لاکھ دے سکتا

ہوں۔" اس نے یک دم دو لاکھ بڑھا دیئے حالانکہ اس زمانے میں پانچ لاکھ بھی بہت بڑی رقم تھی۔

"میں تمہیں اس سے کہیں سستا چھوڑ سکتا ہوں" میں نے کہا "میرا پہلا مطالبہ صرف سچ کا ہے۔ سب سے پہلے تم مجھے سچ سچ بتا دو کہ تم نے سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں نشاط کو مارا کیسے تھا؟"

اس نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر غالباً اسی نتیجے پر پہنچا کہ بات تو اب کھل ہی چکی ہے' مجھے سب کچھ معلوم ہے اور وہ خود بھی بہ زبانِ خموشی اپنا جرم تسلیم کر چکا ہے اس لئے یہ ایک نکتہ بیان کرنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

وہ سر جھکا کر قدرے شرمندگی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "میں اسے ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سب کچھ بالکل غیر ارادی طور پر اور اچانک ہو گیا۔ میں سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں اتفاق سے سب سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ سعید صاحب نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور تواضع کے لئے میرے سامنے کچھ چیزیں رکھوا کر خود ادھر ادھر کہیں مصروف ہو گئے۔ سعید صاحب کے ڈرائنگ روم سے گیٹ ایک کھڑکی کے راستے نظر آتا ہے۔ اچانک میں نے بے بی کو..... میرا مطلب ہے نشاط کو اندر آتے دیکھا اور میں اچھل پڑا۔ مجھے معلوم تھا وہ بہت خاص خاص لوگوں کی پارٹی تھی۔ نشاط وہاں مدعو نہیں ہو سکتی تھی مگر اس کے ہاتھ میں آدھا

پھٹا ہوا کارڈ نظر آ رہا تھا۔ آدھا چوکیدار نے باہر ہی رکھ لیا تھا یقین تھا کہ وہ کسی اور کے کارڈ پر آئی ہو گی۔ اس پارٹی کا کا ازکم کسی ایکسٹرا گرل کو جاری نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ اتنا تردد کر کے آئی ہے تو کسی خاص وجہ آئی ہے اور اس مقصد کا تعلق میرے سوا کسی سے نہیں ہو تھا۔ وہ اندر آ کر ڈرائنگ روم کی دیوار کے قریب کھڑی ہو کر ح نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ سعید صاحب کا گھر میرا اچھی طرح دیکھا ہوا ہے۔ میں جلدی سے ڈرائنگ روم سے نکل کسی کی نظر میں آئے بغیر بغلی راستے سے اسے باغ میں لے سعید صاحب کا باغ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے کتابیا ہے۔

سوئمنگ پول کے قریب جہاں مصنوعی آبشار سا بنا ہوا وہاں کھڑے ہو کر میں اسے ڈانٹنے لگا کہ وہ وہاں کیوں آئی تھی بہت ضدی لڑکی تھی۔ اس وقت مجھ سے بھی زیادہ غصے میں اسے میرے کہانیوں والے چکر کا بھی پتا چل چکا تھا۔ ہونے وا بچے کے تصور سے بھی پریشان تھی۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ رات پارٹی میں سوسائٹی اور فلمی صنعت کے بہت بڑے بڑے ا جمع ہو رہے تھے۔ وہ پکا ارادہ کر کے آئی تھی کہ ان سب کے سا وہ ہر بات کھول کر رکھ دے گی۔ وہ میرے جھوٹے وعدوں سے تنگ آ چکی تھی کہ اس وقت میں اس کی ہر بات ماننے کے لئے

ایک نوجوان کی سنسنی خیز لہو رنگ خود نوشت

دہشت گرد

سلیم فاروقی

○ وہ محب وطن ہونے کے باوجود دہشت گرد کہلاتا تھا۔
○ وقت کی راسیں تھامتے اس کے ہاتھ لہولہان ہو گئے تھے۔
○ "سچی کہانیاں" کا ایک مقبول ترین ایڈونچر سلسلہ چار حصوں میں شائع ہو رہا ہے۔

ناشر: مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور 2 - 7224665

ر وہ اس پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

ان پر اس وقت کوئی نہیں تھا اور اس دور افتادہ گوشے سے ماری بحث و تمحیص کی آوازیں نہیں سن سکا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ کیسے خطرناک موڑ پر کھڑی تھی۔ ناچار میں نے ن کی ایک ڈوری اٹھائی اور اس کا کام تمام کر دیا۔ میرے میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ پودوں کو باندھنے کے اں نائیلون کی اور بھی کئی ڈوریاں پڑی تھیں۔ میں نے آبشار سے ایک بھاری پتھر اٹھایا اور اس کی لاش کے ساتھ ر سوئمنگ پول میں پھینک دیا۔ میرا خیال تھا کہ لاش بعد میں ہو گی اور سعید صاحب خود ہی بھگتتے پھریں گے۔ مجھے نہیں تھا کہ پارٹی میں سعید صاحب ترنگ میں آ کر تیراکی کے کا بھی اعلان کر دیں گے ..... اور ..... اور مجھے یہ بھی نہیں تھا کہ نشاط کی مٹھی میں کوئی کاغذ دبا رہ گیا ہے جس پر کے نام مدد کی درخواست تحریر ہے۔" وہ شرمندہ سے انداز میں ں ہو گیا۔

"اصل میں تمہیں بہت سی باتیں معلوم نہیں تھیں۔" میں ا "تمہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قدرت کی نہیں آنکھ بھی کچھ دیکھ رہی ہوتی ہے۔"

"اب تلافی کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟" اس نے رحم طلب ے میری طرف دیکھا۔

"دیکھو....." میرا لہجہ دوستانہ ہو گیا۔ ریوالور بھی میں نے ا۔ "میرا تمہیں ہلاک کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ میں جب آیا تو تم بے خبر سو رہے تھے۔ اگر تمہیں ہلاک کرنا ہی میرا ہوتا تو اسی وقت خاموشی سے گولی مار کر واپس جا سکتا تھا۔ ل دکھا کر کسی کو ہلاک کرنے کا مجھے کوئی خاص شوق نہیں

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ دلیل اس کے دل کو لگی تھی۔ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن میرا مقصد محض تمہارا سا خون خشک کرنا بھی نہیں تھا۔ میں اصل میں تمہاری ت چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ آئندہ تمہارے ہاتھوں کوئی نشاط جیسے انجام کو پہنچے۔ تمہیں ہلاک کرنے سے تو نشاط کو ا اس کے باپ کو کھوئی ہوئی عزت واپس نہیں مل جائے گی۔ مجھے ایک گارنٹی کمو کر دو، دو تو میں تمہیں کم از کم اس وقت صاف کرنے کے لئے تیار ہوں جب تک تم دوبارہ کوئی ایسی غلطی نہ کرو۔"

"میں آپ کو ہر طرح کا وعدہ لکھ کر دینے کے لئے تیار ہوں" ی سے بولا۔

"نہیں۔ گارنٹی میرے اپنے انداز کی ہو گی" میں نے کہا۔ "تم صاحت سے لکھو گے کہ سجاد قیم سے کس طرح کہانیاں لیتے کس طرح تم نے نشاط کو دھوکے دئے اور اسے ہلاک کیا۔ پھر تم لکھو گے کہ ضمیر کی خلش اب تمہیں ایک پل کے لئے بھی چین سے نہیں رہنے دیتی اس لئے تم خود کشی کر رہے ہو۔ میرا وعدہ ہے کہ یہ تحریر میرے پاس محفوظ رہے گی۔ اس کی صرف دو شرائط ہوں گی۔ ایک تو تم سجاد قیم کو آئندہ ہر کہانی سے ملنے والے معاوضے میں سے آدھا دیا کرو گے اور مصنف کے طور پر اپنے ساتھ اس کا نام بھی دیا کرو گے۔ کہانی بے شک پوری وہی لکھتا رہے گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تم کسی لڑکی کے ساتھ نشاط والا چکر نہیں چلاؤ گے۔ اگر کوئی تمہیں پسند آ ہی جاتی ہے تو سیدھی طرح اس سے شادی کرو' گھر بساؤ اور شریف آدمی کی طرح زندگی گزارو۔ عیاشی ہی کرنی ہے تو اس کے لئے آوارہ' نیم آوارہ عورتیں بہت ہیں۔ کسی معصوم لڑکی کو جھوٹے وعدوں کے سہارے مت لوٹنا۔ جس دن بھی تمہارا اس قسم کا کوئی اسکینڈل میرے علم میں آیا' اس دن تمہاری وہ تحریر میرے کام آئے گی اور میں سچ سچ تمہیں "خود کشی" کرا دوں گا۔"

"مجھے منظور ہے۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔

"بس تو پھر شروع ہو جاؤ۔" میں نے ریوالور سے اشارہ کیا۔

اس نے سائیڈ ٹیبل سے رائٹنگ پیڈ اور قلم نکالا اور تکیے سے ٹیک لگا کر لکھنے لگا۔ چند سطریں لکھ کر اس نے کاغذ پھاڑ دیا اور بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے لکھا نہیں جا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کیسے لکھوں۔ کوئی رہا ہی نہیں بن رہا۔"

"شرم کرو۔" میں نے ملامت سے کہا "تم فلم انڈسٹری کے سب سے بڑے مصنف ہو' تمہاری تحریر کی بڑی دھوم ہے۔"

اس کے چہرے پر ہلکی سی خجالت کے آثار نمودار ہوئے لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ اداکاری کر رہا تھا۔ وہ کسی بات پر شرمندہ ہونا نہیں جانتا تھا۔ اس دنیا میں بعض لوگ اپنی حد سے زیادہ ڈھٹائی' بے ضمیری اور بے حمیتی کی وجہ سے بھی بہت زیادہ کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن عموماً ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔

میں نے اس کا پھاڑ کر پھینکا ہوا کاغذ بھی اٹھا لیا تھا اور اس کے ٹکڑوں پر احتیاطاً نظر دوڑالی تھی کہ اس نے میری ہدایت کے خلاف تو کوئی بات نہیں لکھ ڈالی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس سے چند بے ربط الفاظ کے سوا کچھ لکھا ہی نہیں گیا تھا۔ میں نے کہا "لکھو..... میں لکھواتا ہوں۔"

میں نے لکھوانا شروع کیا اور وہ سعادت مندی سے لکھتا چلا گیا۔ خط مکمل کر کے وہ حیرت سے کبھی خط کی طرف اور کبھی میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ نے تو اچھا بھلا رائٹروں جیسا خط لکھوا دیا۔"

"کیا کریں' جب تم جیسے لوگ رائٹر ہوتے ہوئے چار جملے ڈھنگ سے نہ لکھ سکیں تو پھر مجھ جیسے بدذوق اور کم پڑھے لکھے لوگوں کو اس قسم کی خدمات انجام دینی پڑتی ہیں۔" میں نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر خط اس سے لے لیا۔ اس پر اس کے دستخط موجود تھے۔ مجھے

امید نہیں تھی کہ اتنا عیار آدمی اتنی آسانی سے میرے چکر میں آجائے گا۔

میں نے خط حفاظت سے تہ کرکے جیب میں رکھ لیا۔ اس دوران میں نے ریوالور بھی گود میں رکھ لیا تھا لیکن اس نے کوئی چالاکی دکھانے یا مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی۔ آدمی بہرحال عقل مند تھا۔ اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ اس قسم کی کسی کوشش سے بنی بنائی بات بگڑ سکتی ہے۔ لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی بات تو بگڑی ہی چکی تھی۔

میں نے حلق سے ایک مخصوص آواز نکالی۔ دوسرے ہی لمحے شبیر اور ٹونی بے آواز طریقے سے دروازہ کھول کر دو پُراسرار سایوں کی طرح اندر آگئے۔ ٹونی کے ہاتھ میں پرانی رسی کا ایک گچھا تھا۔ اس نے کمرے میں آتے ہی بولٹ چڑھا دیا اور رسی کا پھندا تیار کرنے لگا۔ شبیر نے بیڈ پر چڑھ کر نصیر نواز کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جاکر اسے اس طرح قابو میں کرلیا کہ وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کرسکتا تھا۔

یہ سب کچھ گویا چشم زدن میں ہوگیا۔ نصیر کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہورہا ہے اور جب اس کی سمجھ میں آیا تب تک وہ بے بس ہوچکا تھا۔ ٹونی نے اس وقت تک پھندا تیار کرکے پنکھے کے کنڈے میں لٹکا دیا تھا اور ڈرسنگ ٹیبل کا اسٹول بیڈ کے قریب عین پھندے کے نیچے رکھ رہا تھا۔

"یہ کیا ہورہا ہے چوہدری صاحب؟" نصیر نواز چیخا۔

"اپنا چیخنے کا شوق بھی پورا کرلو میری جان!" میں نے ملائمت سے کہا "میں دیکھ چکا ہوں کہ کمرا ائرکنڈیشنڈ اور ساؤنڈ پروف ہے۔ شاید تم نے احتیاطاً اسے ساؤنڈ پروف بنوایا ہوگا۔ شاید یہاں تمہارے جال میں پھنسنے والی وہ ایسی لڑکیاں بھی آئی ہوں گی جنہوں نے تمہاری خواہشات کی بھینٹ چڑھتے وقت تھوڑی بہت چوں چاں کی ہوگی مگر ان کی آواز اس کمرے سے باہر نہیں جاسکی ہوگی۔ تمہاری آواز بھی نہیں جاسکے گی۔ چل بھی جاتی تو ہم جیسے لوگوں کے لئے کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔"

وہ خاصے تن و توش کا آدمی تھا لیکن شبیر نے اسے بچوں کی طرح اچھال کر بیڈ پر کھڑا کیا پھر اسٹول پر لا ٹکایا۔ ٹونی نے اس وقت اسٹول پکڑا ہوا تھا۔ نصیر نواز کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑ چکا تھا۔ میں نے یک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے نشاط کے گلے میں نائیلون کی ڈوری کا پھندا ڈال کر اسے ہلاک کیا تھا۔ تمہیں اس سے ملتی جلتی موت کو سامنے دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے۔"

"لیکن میں نے تو آپ کی ہر شرط مان لی تھی چوہدری صاحب! آپ نے وعدہ کیا تھا۔" وہ پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔

"تم جیسے لوگوں کے منہ سے لفظ وعدہ' اچھا نہیں لگتا۔ اس لئے تمہارے سامنے آکر میں بھی بھول گیا ہوں کہ اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔"

ٹونی نے پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا اور اسٹول پیروں تلے سے نکال دیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہی لمحوں میں آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ جب تک ڈھیلا نہیں پڑ گیا' شبیر نے عقب سے اس کے ہاتھ نہیں چھوڑے۔ اس نے ہاتھ چھوڑ دئے تو نصیر کے جسم کو دو چار جھٹکے دیئے۔ پھر وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں رسی میں جھولنے لگا۔ کسی حد تک مسخ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے اس کا والٹ ڈرسنگ ٹیبل پر رکھ دیا جس میں اس نے اپنے دو جرائم کا اقرار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ ضمیر کی اذیت سے تنگ آکر خودکشی کر رہا ہے۔

میں نے ٹونی کو اشارہ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ ہمارا ساتھی وحید اور اس کے بیٹے کو اپنی گاڑی میں ساتھ لئے وہاں سے دور ایک مارکیٹ کے سامنے موجود تھا۔ میرے اشارے پر اس نے یہ تھا کہ اسے ریڈیو پر پیغام دے دیا جائے تاکہ وہ سیٹھ وحید کو یہاں آجائے۔ ہمارا وہ آدمی پیغام ہی کا منتظر تھا۔ ٹونی نے ریڈیو کے ذریعے پیغام دے کر چند لمحوں میں ہی واپس آگیا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں خود آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور سیٹھ وحید اپنے بیٹے کو لئے اندر آگیا۔ سامنے ہی چھت کے کنڈے میں رسی سے لٹکی ہوئی لاش کو دیکھ کر وہ نہیں' اس کا جذباتی اور جوشیلا بیٹا بھی خوفزدہ سا ہوگیا۔

"وحید صاحب! یہ ہے رخشندہ کا قاتل۔" میں نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور مجھے خود بھی عجیب سا ہوا۔ میرا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں کسی پارٹی میں کسی شخصیت سے سیٹھ وحید کا تعارف کرا رہا ہوں۔ ان کی اصل نام رخشندہ تھا۔ نشاط اس نے اپنا فلمی نام منتخب کیا تھا۔ اسٹوڈیوز میں مشہور وہ بے بی کے نام سے ہوگئی تھی۔ لڑکی کے نام تو تین تھے مگر فلمی دنیا میں وہ تین میں نہ تیرہ میں تھی۔

"آپ نے اسے تلاش بھی کرلیا اور اس کے انجام سے آگاہ بھی کردیا؟" سیٹھ وحید کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ کبھی لاش کو دیکھتا اور کبھی میری طرف۔ لاش کی گردن کچھ لمبی ہوگئی تھی۔

"ایسی باتیں نہیں کرتے وحید صاحب!" میں نے کہا "انسان خود اپنے اعمال کے ہاتھوں انجام تک پہنچتا ہے۔ اس بے چارے نے تو ضمیر کی خلش سے مجبور ہو کر خودکشی کی ہے۔" میں نے نصیر نواز کا نامۂ خودکشی اٹھا کر سیٹھ وحید کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے بڑی توجہ سے خط پڑھا۔ اس کا بیٹا بھی اس کے پیچھے گردن آگے کئے خط پر ہی جھکا رہا۔ کمرے میں گہرا سکوت تھا اور لاش بدستور کمرے کے وسط میں جھول رہی تھی۔ سیٹھ وحید نے خط پڑھ کر واپس ڈرسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ کچھ لمحے ہم سب نیم دائرے میں لاش کے گرد کھڑے رہے اور اس کے مسخ شدہ سے چہرے کو دیکھتے رہے۔ پھر میں نے سب کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیوے میں پہنچ کر سیٹھ وحید یکدم رک کر میرا ہاتھ تھام کر والہانہ انداز میں چومتے ہوئے بولا "میں آپ کو مان گیا چوہدری صاحب! آپ ہر لحاظ سے بہت بڑے آدمی ہیں۔ میرا آپ پر جان قربان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ مجھے کبھی خدمت کا موقع ضرور دیجئے گا۔"

"ضرور' ضرور۔ میں آپ کے جذبات کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔" میں نے مربیانہ انداز میں اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"میں اے ایس آئی شریف سیال کو معقول انعام دوں گا جس نے درحقیقت آپ سے متعارف کرایا۔" وہ بولا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "ویسے وہ بے چارہ واقعی انعام کا مستحق ہے۔ میرا بھی یونہی بلاوجہ اسے کچھ نوازنے کو دل چاہتا ہے۔ میں اس کے انداز و اطوار دیکھ کر اس کی باتیں سن کر بہت محظوظ ہوتا ہوں۔ پولیس میں ہے مگر شریف آدمی ہے۔"

"پولیس میں شرفا کی بھی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ مجھے تو اکثر شریف آفیسرز سے ہی پالا پڑا ہے۔" وہ بولا۔

"میں آپ کو خوش قسمت ہی کہوں گا۔ گو کہ اس سلسلے میں تجربہ میرا بھی کچھ ایسا برا نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر ہم وہاں سے رخصت ہوئے۔ سب گویا اپنا اپنا ضروری کام انجام دے کر مطمئن و مسرور واپس جارہے تھے۔

واپسی میں میں نے اپنی گاڑی اٹرکان کے عقب میں واقع کچی بستی کی طرف موڑلی۔ گاڑی ایک جگہ چھوڑ کر کچھ فاصلہ پیدل طے کرکے میں ایک گھر کے دروازے پر پہنچا۔ وہ سجاد نسیم کا گھر تھا جس کے کام سے نصیر نواز کا نام برسوں چمکا تھا۔ میری دستک کے جواب میں دروازہ تھوڑا سا کھلا اور انہی دو اداس آنکھوں نے باہر جھانکا جن میں بلا کی کشش تھی۔ ان آنکھوں میں اب ستارے جھلملا اٹھے تھے مگر اداسی کا رنگ پھر بھی اپنی جگہ برقرار تھا۔ یہ اداسی ان آنکھوں کا ایک حصہ تھی۔ اور یہی ان آنکھوں کا حسن بھی تھی۔ بعض آنکھوں میں اداسی اسی طرح بھلی لگتی ہے جس طرح اونچی چھتوں والی پرانی' عظیم اور پرشکوہ عمارتوں کی طاقوں میں رکھے ہوئے دھیمے دھیمے جھلملاتے ہوئے چراغ۔

مجھے دیکھ کر اس کی پلکوں کی جھالریں گر گئیں اور گھر کا دروازہ کھل گیا۔ رخساروں پر شفق اتر آئی۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دیا۔ ان کی بیٹھک میں جانے کے لئے صحن میں ہی داخل ہوکر انہیں ہاتھ مڑنا پڑتا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارے سے مجھے سلام کیا۔ ہونٹ لرزے مگر آواز برآمد نہ ہوئی۔ وہ شاید سلام کے علاوہ بھی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی۔ شاید شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ شاید اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اس کی شادی کے لئے میں نے اس کے باپ کو سوا لاکھ روپیہ دیا تھا۔ اچھا ہی ہوا اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ میں اس کے منہ سے شکریے کا کوئی لفظ سننا بھی نہیں چاہتا تھا۔

وہ واقعی ایک حد درجہ شریف اور شرمیلی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے رخساروں پر شفق اتر آئی تھی۔ اندر قدم رکھنے سے پہلے میں نے پوچھ لینا بہتر سمجھا "سجاد نسیم صاحب گھر پر موجود ہیں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھنسی پھنسی سی آواز میں بمشکل بول پائی "آپ بیٹھئے۔۔۔ میں ابھی انہیں بھیجتی ہوں۔" اس نے بیٹھک کی طرف اشارہ کیا۔

صحن سے گزرتے وقت میں نے دیکھا' وہاں چارپائیوں پر رنگ برنگے اور زرق برق جوڑے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ شاید اس وقت جوڑوں پر کچھ ٹانک رہی تھی جب میں نے دستک دی۔ بے چاری اکیلی خود ہی اپنا جہیز تیار کررہی تھی۔ وہ ایک اچھی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ اسے ایک خوشگوار ازدواجی زندگی دیکھنا نصیب ہو۔

میں بیٹھک میں جاکر بیٹھا ہی تھا کہ سجاد نسیم گویا ہانپتا کانپتا سا وہاں پہنچا اور مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے تقریباً دُہرا ہوگیا۔ انتہائی ممنونیت سے وہ بولا "آپ خود کیوں زحمت کرتے ہیں چوہدری صاحب! کسی ملازم کو بھیج کر مجھے بلوالیا کریں۔ میں حاضر ہوجایا کروں گا۔۔۔ فون میرے ہاں ہے نہیں' ورنہ آپ فون کرکے مجھے طلب فرماسکتے تھے۔ اب آپ خود تشریف لائے ہیں۔ کتنی بڑی زحمت کی ہے آپ نے!" وہ یوں ہاتھ ملنے لگا گویا اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ میری مدارت کے لئے کیا کرے۔

"ان باتوں کو چھوڑئے سجاد صاحب!" میں نے ملائمت سے کہا "میں آپ کو ایک ضروری اطلاع دینے آیا تھا۔ نصیر نواز نے خودکشی کرلی ہے۔۔۔"

میں اپنی بات جلد سے جلد کہہ کر وہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا لیکن سجاد تو اتنا ہی سن کر سناٹے میں آگیا۔ اس کے چہرے پر دہشت زدگی کے سے آثار نمایاں ہوگئے اور وہ یوں دھم سے ایک کرسی پر ڈھیر ہوگیا جیسے اس کی ٹانگوں کی جان نکل گئی ہو۔ اس لئے مجھے مزید کچھ کہنے کے لئے توقف کرنا پڑا۔

"اخبار میں تو نہیں آئی یہ خبر۔ خاصی بڑی اور اہم شخصیت تھا وہ۔۔۔" آخرکار سجاد کے حلق سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی۔

"اخبار میں تو کل یا پرسوں آئے گی یہ خبر۔" میں نے کہا "میں تو آپ کو اس سے پہلے خبردار کرنے آیا ہوں کہ اب آپ فلم انڈسٹری میں اس کی جگہ لینے کے لئے تیار رہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ کچھ اور چونکا۔

"مطلب یہ کہ پولیس کو اس کی لاش کے قریب اس کا آخری خط بھی ملے گا۔ اس میں اس کا یہ اعتراف بھی شامل ہوگا کہ وہ کس طرح آپ سے کہانیاں لے کر آپ کا استحصال کرتا رہا۔"

سجاد کریم نے ایک بار پھر خوف زدہ لہجے میں میری بات کاٹ دی۔ "کہیں پولیس مجھ پر تو اس کی موت کے سلسلے میں کوئی شبہ نہیں کرے گی؟"

"ایسا بھلا کیوں ہونے لگا؟" میں نے تیزی سے کہا۔ "اس کی اپنی تحریر میں اس کے دستخط کے ساتھ اعتراف نامہ موجود ہوگا کہ وہ خودکشی کر رہا ہے۔ آپ پر بھلا کوئی کیوں شبہ کرنے لگا؟ آپ تو بہت ہی ڈرپوک آدمی ہیں سجاد صاحب!"

"غریب اور کچلا ہوا آدمی عام طور پر ڈرپوک ہی ہوتا ہے چوہدری صاحب!" وہ بے چارگی سے بولا۔

"اپنے اندیشوں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیجئے۔ آپ کا خوف بالکل بے جا ہے۔ اگر کوئی بات ہو بھی تو بھلا میں کس لئے بیٹھا ہوں؟"

"اوہ۔۔۔ معاف کیجئے گا۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ اب مجھے آپ جیسی شخصیت کی سرپرستی حاصل ہے۔" اس نے طمانیت کی گہری سانس لی۔ اس کے چہرے سے یک لخت ہی خوف غائب ہوگیا۔ عجیب ہی آدمی تھا وہ بھی۔

میں نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا "میں اصل میں آپ کو یہ بتانے آیا تھا کہ جونہی یہ خبر سامنے آئے گی کافی ہلچل مچے گی اور جونہی ہلچل ذرا کم ہوگی، فلم انڈسٹری آپ کی تلاش میں دوڑے گی۔ یعنی نصیر نواز کے پس پردہ رہنے والی اصل شخصیت کو تلاش کیا جائے گا۔ ایک تو اس کام کی کوالٹی کی وجہ سے بھی جو آپ اب تک انڈسٹری کو دے چکے ہیں۔ دوسرے اس لئے بھی کہ انڈسٹری میں یک لخت ہی فلمی مصنفوں کے شعبے میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگا جسے فوری طور پر کوئی بھی دوسرا مصنف پر نہیں کرسکے گا۔ یہ کمی آپ کو خود ہی پوری کرنی ہوگی۔ آپ کی اپنی کمی۔ اس کے لئے تیار رہئے گا۔ نصیر نواز نے جن نئی فلموں کے لئے کنٹریکٹ کئے ہوں گے لیکن جن کے لئے آپ نے ابھی اسے کہانی نہیں دی ہوگی۔۔۔ یا جن کہانیوں کے صرف آئیڈیاز سنائے گئے ہوں گے، ان سب پر اب تیزی سے کام شروع کردیجئے۔ مایوسی اور دل گرفتگی کے دور سے نکل آیئے۔ آپ کا جتنا نقصان ہونا تھا ہوچکا۔ اب ایک ہنگامہ خیز مستقبل آپ کا منتظر ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اب آپ ہی نصیر نواز ہوں گے۔"

"کیا واقعی؟" اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں ان گنت سنہرے سپنے خواب جاگ اٹھے۔ "مجھے یقین نہیں آرہا۔ کیا واقعی فلمی دنیا کا اسٹار رائٹر ہوجاؤں گا؟"

"بے شک۔ اب آپ کو یقین کرہی لینا چاہئے۔" میں نے کہا "مجھے اصل میں اسی لئے تو آپ کے پاس احتیاطاً پہلے ہی آنا پڑا کہ لوگ آپ کو تلاش کرتے ہوئے آپ کے پاس پہنچیں اور آپ بوکھلاہٹ میں نہ جانے کیا کہہ دیں۔ عین ممکن ہے کہ آپ انکاری کردیں کہ نہیں صاحب، میں تو نصیر نواز کو کہانیاں لکھ کر نہیں دیتا تھا۔"

"ہاں۔ مجھ سے یہ بھی بعید نہیں تھا۔" اس نے تسلیم کیا۔

"یوں آپ اپنی دلدل سے نکلنے کا ایک اور موقع ضائع کردیتے۔ اور ایسے سنہری مواقع انسان کو بار بار نہیں ملتے۔" میں نے کہا "اب آپ ایسا کیجئے گا کہ نصیر نواز کی خودکشی کا معاملہ منظر عام پر آتے ہی اسٹوڈیو میں میرے فلم بزنس کے انچارج آفاق احمر سے مل لیجئے گا۔ وہ آپ کے لئے باقاعدہ کسی پریس کانفرنس وغیرہ کا اہتمام کرکے مناسب وقت پر آپ کو پریس کے تمام لوگوں اور پروڈیوسروں، ڈائریکٹروں وغیرہ سے متعارف کرادے گا اور اس اسکینڈل کا پس منظر بھی جس حد تک مناسب سمجھے گا بتادے گا۔ اب میں چلتا ہوں۔" میں گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے حضور!" وہ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا "آپ ہمیں شرف میزبانی بخشے بغیر کیسے جاسکتے ہیں۔۔۔ سارے چائے وغیرہ تیار کررہی ہوگی۔ آپ کے شایان شان تو نہیں ہوگی لیکن جس طرح آپ نے پہلے ہمارا مان رکھا تھا اسی طرح پھر عزت افزائی فرما کر ہی جایئے۔" اس کے لہجے میں ہزار التجائیں سمٹ آئیں۔

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے خوش دلی سے کہا۔ "ایک تو آپ اتنے انکسار سے بھرپور اور تکلف سے بوجھل الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ انسان شرمندہ ہوجاتا ہے۔ لیکن تمامتر شرمندگی کے باوجود اس وقت میں رکوں گا نہیں۔ میں آپ کی چائے سے ضرور لطف اندوز ہوتا لیکن میں نے آفس میں کچھ لوگوں کو ملنے کے لئے وقت دیا ہوا ہے۔ ویسے خواہ میں آفس کے لئے کتنا ہی لیٹ ہوجاؤں، کتنے ہی دنوں کے لئے غائب ہوجاؤں لیکن کسی کو وقت دے کر میں ایک منٹ لیٹ ہونا بھی پسند نہیں کرتا۔"

میں اس کے مزید اصرار پر معذرت کرتے ہوئے آخر کار وہاں سے نکل ہی آیا۔ آفس پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ہماری آفس بلڈنگ کے نچلے ہال میں ہمارا ایک سپروائزر اور چند کارکن کسی چیز کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ ذرا قریب جاکر اندازہ ہوا وہ تقریباً چھ فٹ لمبا اور دو ڈھائی فٹ چوڑا پارسل سا تھا۔ اس پر سفید کینوس چڑھا ہوا تھا۔ بڑی عمدگی سے پیک کیا گیا تھا۔

مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ ہماری آفس بلڈنگ میں اتنا بڑا پارسل کہاں سے آگیا تھا۔ مال وصول کرنے یا ارسال کرنے کے لئے شہر کے دوسرے مقامات پر ہمارے گودام اور ہال وغیرہ موجود تھے جو اس قسم کے کاموں کے لئے مخصوص تھے۔ آفس بلڈنگ میں ایسا کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے یہاں کبھی اس قسم کے پارسل یا کارٹن وغیرہ نظر نہیں آتے تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ سب لوگ مودبانہ انداز میں سلام کرکے ادھر

حسن بن صباح

★ شہنشاہ حشیش اور ابلیس وقت

جو چھتیس (36) سال تک قلعہ الموت میں ایک نظر فریب جنت ارضی بنا کر بیٹھا رہا اور مسلمانوں کے بڑے بڑے جید علماء کرام اور محدثین، مفسرین، مفکرین اور ارکان سلطنت کے خون سے ہولی کھیلتا رہا۔۔۔۔ مسلمان والیانِ ریاست اِس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔۔۔۔۔

اِسی ساحر اور مُرتد کی رنگین اور خوفناک داستان

الماس ایم۔اے کے سحر انگیز قلم سے۔۔۔۔

ناشر: مکتبہ القریش اُردو بازار۔لاہور 2

قیمت -/125 روپے

برصغیر کا سپوت۔۔۔۔ آزادی کا متوالا

مسلمانانِ ہند کا رکھوالا۔۔۔۔

شہید سلطان ٹیپو رح

جس کی دہشت سے انگریز سوتے سے جاگ پڑتے تھے

اور انگریز بچے سلطان ٹیپو کا نام سُن کر چُپ ہو جاتے تھے۔

★ ایک بہادر

★ ایک مجاہد

★ ایک شہید

ایک ناول۔۔۔۔۔۔۔ ایک تاریخ

الماس ایم۔اے کے ایمان افروز قلم سے۔۔۔۔۔۔۔

قیمت -/200 روپے

وقت کا حساب لینے پر آگیا تو آپ کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

"آپ ایک سرکاری آفیسر کو دھمکیاں دے رہے ہیں۔ اس پر بھی آپ کے خلاف مقدمہ درج ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔

"اس قسم کی بچکانہ باتوں کے جواب دینے کے لئے میرے گروپ آف کمپنیز کو وکیلوں کی ایک بہت بڑی سینڈیکٹ کی خدمات حاصل ہیں جس میں بڑے نامی گرامی وکیل اور ریٹائرڈ جج وغیرہ شامل ہیں۔" میں نے کہا "اس لئے اس بات کو تو ایک طرف اٹھا رکھیں۔ آپ سے میں جو اصل بات کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہے انسپکٹر صاحب.....!" میں نے ایک گہری سانس لی "کہ آپ سے میری پچھلی ملاقات بھی کچھ زیادہ خوشگوار حالات میں نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود میں نے آپ کے بارے میں بہت اچھا تاثر لیا تھا۔ میں آپ جیسے دیانتدار اور جرات مند پولیس آفیسروں کا قدردان ہوں۔ لیکن دیانتداری کو دیانتداروں ہی کے خلاف ہتھیار مت بنائیں نعیم صاحب! اگر آپ ایک دیانتدار آدمی ہیں تو میں بھی اصول پرست آدمی ہوں۔"

وہ خاموش تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میری عمر آپ سے زیادہ نہیں ہے انسپکٹر! لیکن تجربات شاید زیادہ ہوں۔ ہماری سوسائٹی بڑی عجیب ہے۔ اس میں آپ کو بہت سے لوگ ملیں گے جو بہت اچھے ہوں گے لیکن آپ کو کسی وجہ سے وہ مشکوک و شبہات کی دھند میں لپٹے دکھائی دیں گے۔ کچھ لوگ ہوں گے جو بہت برے ہوں گے لیکن وہ آپ کو کسی بہت اونچے سنگھاسن پر بیٹھے ملیں گے۔ لوگ ان کے ہاتھ چوم رہے ہوں گے، پاؤں چاٹ رہے ہوں گے۔ لیکن اگر آپ ان کا اصل روپ جان لیں تو آپ کو تے آجائے گی اور آپ کا دل چاہے گا کہ ان کی نکابوئی کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیں۔ اور یہ آپ کے بس کی بات نہیں ہوگی۔ لیکن کم از کم ان دونوں قسموں کے انسانوں میں امتیاز کرنا تو سیکھیں۔"

وہ بدستور خاموش تھا۔ میں تیزی سے بولتا چلا گیا "میری بڑی خواہش ہے کہ آپ جیسے آفیسروں کی نوکری لمبی ہو۔ لیکن اگر آپ غلط نمبر کی عینک لگا کر چلیں گے تو قدم قدم پر ٹھوکر کھائیں گے اور آخر کار آپ کا سفر مختصر ہو جائے گا۔ کسی موڑ پر تھک کر بیٹھنا پڑے گا۔ میں اس ملک کے چند بزنس ٹیکنیٹس میں سے ایک ہوں۔ اور اس وقت میرے آفس میں جاپان کی ایک بہت بڑی کمپنی کے نمائندے بیٹھے ہیں۔ میں نے اس بات کا بہت سخت برا منایا ہے کہ ایک پولیس انسپکٹر محض ایک گمنام اطلاع پر بغیر کسی سرچ وارنٹ کے بغیر یونیفارم کے، اس وقت میرے ہیڈ آفس کی تلاشی لینے کے ارادے سے چلا آیا۔ میں آپ کو صرف قانون کے احترام کے نام پر معاف کر رہا ہوں۔ اور وہ بھی صرف اس لئے کہ آپ ایک کرپٹ آفیسر نہیں ہیں۔ لیکن صرف آپ کے اپنے فائدے کے لئے کہہ رہا ہوں کہ پلیز آئندہ ایسی کوئی حماقت مت کیجئے گا۔"

میں اس بات کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ ا
نہایت تحمل سے میری تقریر سنی تھی۔ وہ اب بھی خاموش ا
اس نے ریسیور بھی نہیں رکھا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے
کہا "آپ سادہ لباس میں تھے۔ اگر مجھے بھی اپنی طرح ایک
آدمی سمجھ کر دوستانہ انداز میں آئے ہوتے تو میں محض
دل کی تسلی کے لئے آپ کو پوری بلڈنگ کا معائنہ کرا دیتا لیکن
انداز میں نہیں کہ کسی کو شبہ ہوتا" آپ تلاشی لے رہے ہیں
اب میں مروّت کے اس مظاہرے کی ضرورت محسوس نہیں
آپ جا سکتے ہیں۔ خدا حافظ۔"

"سنئے... سنئے۔" وہ جلدی سے بولا۔ اب اس کا لہجہ
تھا۔ اس میں افسرانہ تحکم نہیں تھا "میری ملازمت زیادہ
نہیں ہے۔ ناتجربہ کاری کی وجہ سے مجھ سے کبھی کبھار غلطیاں
ہو جاتی ہیں لیکن ان میں میری بدنیتی کا دخل نہیں ہوتا۔ اگر
میری آمد ناگوار گزری ہے تو اس کے لئے میں معذرت خواہ
لیکن فرض کر لیجئے، میں دوستانہ انداز میں آیا ہوں اور محض
تسلی دینا چاہتا ہوں۔ دل کی تسلی کے لئے مجھے اس عمارت
نظر ڈال لینے دیجئے۔"

وہ نوجوان تھا لیکن ضرورت پڑنے پر جذباتیت اور جو
سے گریز کرنے کا ہنر اسے خوب آتا تھا۔ وہ ہر جاں میں اپنا
پورا کر کے جانا چاہتا تھا۔ اس نے اب جو انداز اختیار کیا
میرے لئے قابل قبول تھا۔ میں نے ایک لمحے سوچا پھر محض

معروف مصنف

ایم اے راحت کا پراسرار ایڈونچر

ناول

طلسم زادی

جلد اول:-/150 جلد دوم:-/150

اردو بازار لاہور

طل رکھنے کے لئے اس کی فرمائش پوری کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ نوجوان اور دیانتدار تھا۔ معاشرے کے بارے میں یقیناً کچھ اچھے خواب دیکھتا تھا۔ ان خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے کے لئے گو کہ ابھی اسے مناسب راستہ نہیں مل رہا تھا لیکن پھر بھی... ایسے نوجوانوں کی دل شکنی کرنا مجھے زیادہ پسند نہیں تھا۔

"اگر یہ ایک دوستانہ درخواست ہے تو میں اسے مان لیتا ہوں۔" میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا "محض اس لئے کہ تمہیں احساس ہو جائے، تم اپنے ذہن میں میری جو تصویر تیار کر رہے ہو وہ صحیح نہیں ہے۔ تم میرے دفاتر پر ایک نظر ڈال سکتے ہو لیکن کسی کو قطعاً یہ احساس نہ ہونے پائے کہ تلاشی لے رہے ہو۔ خصوصاً میرے کمرے میں آتے وقت تمہارا رویہ ایسا ہونا چاہئے جیسے کوئی بے حد قریبی دوست ادھر سے گزرتے وقت بس یونہی دعا سلام کرنے آگیا ہے۔"

"آپ مطمئن رہئے۔ آپ کو قطعاً کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ یہ ایک درمیانی راستہ ہے۔ آپ کے ذہن میں بھی کوئی کشیدگی نہیں رہے گی اور میرا ضمیر بھی مطمئن ہو جائے گا۔" وہ اس حل سے بھی مطمئن معلوم ہوتا تھا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا اور واپس آکر بات چیت میں مصروف ہو گیا۔ انسپکٹر نعیم کافی دیر بعد میرے کمرے میں آیا۔ اس نے حرف بہ حرف میری ہدایات پر عمل کیا۔ کسی کو شبہ تک نہیں ہو سکا کہ اس کی آمد کا مقصد کیا تھا۔ چند سیکنڈ میں ہی وہ کھڑے پیروں واپس چلا گیا۔

خورشید جہاں کی لاش کے بارے میں میری ساتویں حس نے مجھے بروقت ہی خبردار کیا تھا اور اسے دفتر سے روانہ کر دینے کا میرا فیصلہ درست ہی ثابت ہوا تھا۔ گو کہ پارسل کی شکل میں اس کی موجودگی بھی میرے لئے کوئی ایسی خاص الجھن پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود میں نے اسے روانہ کرنے میں محض اس لئے عجلت کی تھی کہ ایک کاروباری آدمی کے دفتر میں کسی بھی لاش کا پایا جانا اس کے حق میں اچھا نہیں ہوتا۔

کچھ دیر بعد جاپانی پارٹی رخصت ہو گئی۔ ان سے دوسرے روز ہوٹل میں لنچ پر ملاقات کے لئے وقت مقرر ہوا تھا۔ اس ملاقات میں مزید تفصیلات طے ہونا تھیں۔ انہیں رخصت کر کے میں دوبارہ آفس میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ میرے ڈائریکٹ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ ٹیلی فون کیترین نہیں ملاتی تھی۔ اس کا اندراج ڈائریکٹری میں بھی نہیں تھا۔ اس کا نمبر چند خاص خاص لوگوں ہی کے پاس تھا۔

میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک شناسا آواز سنائی دی۔ وہی پراسرار اور گونجیلی سی آواز، جس کے بارے میں میں فیصلہ کرنے سے قاصر رہا تھا کہ کسی غیر ملکی کی ہے یا اپنے ہی کسی ہم وطن کی۔ بہرحال اردو وہ بالکل صحیح تلفظ کے ساتھ بولتا تھا۔ نام کی جگہ صرف ریڈ ڈاٹ کے الفاظ استعمال کرتا تھا۔

اس نے مجھ سے تصدیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ میں کون بول رہا ہوں۔ بلکہ میرے ریسیور اٹھاتے ہی کہا "ہمارا بھیجا ہوا تحفہ پسند نہیں آیا جو فوراً ہی غائب کر دیا؟"

"مجھے تمہارے ہی فون کا انتظار تھا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "مجھے معلوم تھا کہ کوئی بھی ٹٹ پونجیا حرکت کرنے کے بعد تم شیخی خوروں والے انداز میں فون ضرور کیا کرتے ہو۔"

"کیا کریں، ہم جیسے گھٹیا لوگ جب تک تم جیسے کسی اعلیٰ حضرت سے بات نہ کر لیں، چین سا نہیں آتا۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولا "کہاں بھیج دیا پارسل؟"

"جب تمہیں یہ معلوم ہے کہ میں نے اسے غائب کر دیا ہے تو پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ کہاں بھیجا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہم نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ اسے کہاں بھیجا جائے گا۔ ہم صرف یہ دیکھ رہے تھے کہ انسپکٹر نعیم اسے دریافت کر پاتا ہے یا نہیں۔ اور اسے ہم نے تمہاری بلڈنگ سے خالی جاتے دیکھا۔"

مجھے اس کی بات کا پوری طرح یقین نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے کسی آدمی نے ٹونی اور شبیر وغیرہ کا تعاقب کرنے کی کوشش کی ہو لیکن جب میں ٹونی کو ہدایت کر دیتا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب نہ کرنے پائے تو اس کا تعاقب کرنا موت کا تعاقب کرنے کے مترادف ہی ہوتا تھا۔

"کیا انسپکٹر نعیم تمہارا آدمی ہے؟" میں نے اچانک ہی پوچھا۔

"کاش وہ ہمارا آدمی ہو سکتا۔" وہ آہ بھر کر بولا "کم بخت بالکل بھی بکاؤ نہیں ہے۔ اب ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اسے اس کی ایمانداری سمیت ہی تمہاری دم میں پٹاخے کی طرح باندھ دیں تاکہ تم بلبلاتے پھرو، بھاگتے پھرو۔"

"اتنے چھوٹے موٹے پٹاخوں سے میں دوڑتا پھروں گا؟" میں نے گویا برا مناتے ہوئے کہا "مجھے دوڑانا ہی ہے تو میری دم میں کوئی بم وغیرہ باندھو۔"

"وہ بھی باندھ دیں گے۔ وقت تو آنے دو۔" اس نے بڑی شفقت سے کہا "ابھی تو تم سے تعارف کے ابتدائی مراحل چل رہے ہیں۔"

"یار... دیکھو... میری بات سنو۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "تم بہت باتیں کر چکے۔ میں بھی بہت مرعوب ہو چکا۔ کافی سسپنس بھی پیدا ہو چکا۔ اب بتا ہی دو، آخر تم کون ہو؟ یہ ریڈ ڈاٹ کیا ہے؟ تمہارے مقاصد کیا ہیں؟ میرے ساتھ یہ بے مقصد سی چھیڑ چھاڑ جاری رکھنے سے تمہیں کیا حاصل ہو رہا ہے؟ خدا کے لئے کسی سوال کا جواب تو دے دو۔ اب تو مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی ہے۔"

"یہی تو ہم چاہتے ہیں۔" وہ بڑے مسرور انداز میں ہنس کر بولا "تم جیسے آدمیوں کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنا آسان کام نہیں۔ اور تم جیسے لوگوں کی جھنجلاہٹ ہم جیسے غریبوں مسکینوں کے لئے بڑا قیمتی سرمایہ ہوتی ہے۔"

اس نے ایک بار پھر الجھا ہوا جواب دے کر مجھے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے کہا "اچھا تھوڑی سی سہولت کے لئے اتنا ہی بتا دو کہ تمہارا نام کیا ہے؟ ریڈ ذات تو تمہارا نام نہیں ہے نا؟"

"میرا نام ایڈم ہے جسے اردو میں آدم بولا جاتا ہے۔ تم مجھے صرف ایڈی کہہ سکتے ہو۔" اس نے کم از کم میرے ایک سوال کا جواب تو بلا تامل دے دیا۔

"غیر ملکی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کا کوئی ملک نہیں ہوتا۔ اور جس ملک جن کے اپنے ہوتے ہیں۔" وہ روانی سے بولا۔

"اوہ مائی گاڈ۔۔۔!" میں کراہ اٹھا "تم نے پھر میرے منہ پر منہ دے مارا۔ اچھا خیر۔۔۔ اصل بات تو بتا دو۔ تم نے اس بے چاری بے ضرر سی عورت خورشیدہ جہاں کو کیوں مار ڈالا؟"

"تنگ بہت کر رہی تھی۔ ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ ویسے وہ کچھ ایسی بے ضرر بھی نہیں تھی جتنی تم سمجھ رہے ہو۔ خاصی پہنچی ہوئی چیز تھی۔ اسے ہلاک کرنا اس لئے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ نائی کی لاش کے جواب میں تمہیں کوئی لاش بھجوانی تو ضروری تھی۔"

"نائی۔۔۔؟ تمہارا مطلب ہے وہ گورلا جس نے جنگل میں مجھ اور ستارہ پر فائرنگ کی تھی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں وہی۔ خاصا کام کا آدمی تھا ہمارے لئے۔ شکر کرو ہم نے اس کے جواب میں تمہیں خاصی ناکارہ سی عورت کی لاش بھجوائی ہے۔ صرف اس لئے کہ تمہارے دل میں ان ماں بیٹی کے لئے بڑا درد پایا جاتا ہے۔ ہم نے سوچا' دیکھیں تم اپنی دوستوں کے لئے کیا کرتے ہو۔" وہ گویا اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ مجھے کتنی ذہنی تکلیف ہوئی تھی۔ اور پھر اس احساس سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔

"کیا ہنی سے بھی تمہارا اسی قسم کا سلوک کرنے کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو نہیں۔ سروست تو وہ بڑے مزے سے روز و شب گزار رہی ہے۔ صرف کبھی کبھی تھوڑی سی اداس ہو جاتی ہے۔ شاید تمہاری یاد میں۔ اس کے علاوہ اسے کوئی تکلیف نہیں۔ لیکن اس کا داروغہ تمہارے طرز عمل پر ہے کہ اسے آئندہ بھی کوئی تکلیف ہو گی یا نہیں۔ اگر نائی کی طرح۔۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تم بار بار اس جھاڑ جھنکاڑ اور وحشت ناک قسم کی شخصیت کو نائی کہتے ہو تو مجھے بڑا عجیب محسوس ہوتا ہے۔ کم از کم اب تو تم اسے اس کے اصل نام سے یاد کر سکتے ہو۔ یہ بچکانہ سا نام اس کی شخصیت کے ساتھ کچھ میل نہیں کھاتا۔"

"ناموں میں کیا رکھا ہے۔ نام تو اکثر ہی لوگوں کی شخصیت کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے۔ اب تم اپنے نام کو ہی دیکھ لو۔ محمد افضل چوہدری۔ نام سن کر ذہن میں گاؤں کے کسی چھوٹے موٹے زمیندار کا تصور آتا ہے۔ گمان گزرتا ہے کہ شام کو اونچی سی پگڑی باندھ کر اپنی بیٹھک میں بڑی سی چارپائی پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتا ہو گا۔ پنڈ والوں کے مسائل سنتا ہو گا' سر ہلاتے ہوئے اور گو نجدار انداز میں کھانستے ہوئے انہیں تسلیاں دیتا ہو گا اور کسی مزارعے سے ناگیں دبواتا ہو گا۔ لیکن تم اس تصور سے کتنے مختلف ہو۔ پہلی بار تم سے ملنے والے کو اچھا خاصا جھٹکا لگتا ہو گا۔"

"ہو سکتا ہے۔ لیکن کم از کم میں نے کسی کو جھٹکا لگتے نہیں دیکھا۔"

"تمہاری کیا بات ہے۔ تمہاری شخصیت میں بے نیازی اور بے پروائی خطرناک حد تک پائی جاتی ہے۔ خیر' میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر آئندہ تمہاری طرف سے ہمارے پاس نائی کی طرح کوئی اور لاش آئی۔ اور ہمارے پاس جواب میں تمہیں بھجوانے کے لئے کسی بیکار سی لاش کا بندوبست نہ ہو سکا تو پھر شاید مجبوراً ہنی کو ہی لاش تبدیل کرنا پڑے۔ حالانکہ اسے لاش میں تبدیل کرتے وقت بہت افسوس ہو گا۔ وہ بہت کام کی چیز ہے۔ بڑے ہنر ہیں اس کے پاس۔ بڑے گن ہیں اس میں۔ اور پھر درحقیقت وہ اس سے زیادہ خوب صورت ہے جتنی باہر سے نظر آتی ہے۔"

"بس۔۔۔ اتنی بہت سی بکواس کرنے کے لئے ہی فون کیا تھا؟" میں نے بے زاری سے پوچھا۔

"تم ان باتوں کو بکواس کہتے ہو۔ تمہیں دراصل اندازہ نہیں ہے کہ جب میں تمہیں فون کرتا ہوں تو ہمارے درمیان اہم گفتگو ہوتی ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اس میں کم از کم یہ احساس تو ہوتا ہو گا کہ ہم تمہارے بارے میں کتنے باخبر ہیں۔"

"باخبر' بے خبر کا تو مجھے کچھ نہیں معلوم۔ لیکن اتنا ضرور۔ تم میرا وقت بہت ضائع کرتے ہو۔" میں نے بے زاری سے کہا۔

"شکر کرو کہ ابھی صرف وقت ہی ضائع کرتے ہیں۔ اگر وقت نہیں آیا کہ تمہیں ضائع کرنے کے بارے میں سوچنے لگیں۔"

"اگر تم مجھے ضائع کرنا نہیں چاہتے تو پھر یہ فائرنگ وغیرہ کس سلسلے میں کراتے ہو؟ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہو کہ اگر میں نے لاش بھجوائی تو جواباً تم ہنی کی لاش بھجوا دو گے۔ تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ آئندہ تمہارا کوئی آدمی مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کرے تو میں اسی طرح سعادت مندی سے سر جھکا کر بیٹھ جایا کروں جس طرح لوگ حجام کے سامنے بیٹھتے ہیں؟ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک ہی وقت میں تم کئی متضاد قسم کی باتیں کرتے ہو۔"

"آ جائے گا۔۔۔ آ جائے گا۔۔۔ رفتہ رفتہ سب سمجھ میں آ جائے گا۔" وہ مہربانہ انداز میں بولا۔ پھر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ریسیور رکھنے کے بعد بھی کافی دیر تک میں سوچتا رہا۔ اس شخص کے بارے میں' ان حالات کے بارے میں' اس تانے بانے کے بارے میں جو میرے گرد بنا جا رہا تھا۔ لیکن ان میں سے کسی کا بھی سر پیر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں کافی دیر انہی خیالات میں الجھا رہا۔

اچانک میرے قریب ہی رکھے ہوئے انٹرکام کے بزر نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ نیچے ریسپشن سے ٹونی بول رہا تھا۔ وہ اپنا کام کر کے واپس آ گیا تھا۔

"سر! ہم نے عقبی گیٹ سے پارسل لان میں پہنچا دیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"بس ٹھیک ہے۔ وہاں کوئی نہ کوئی اسے دریافت کر ہی لے گا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ گہری سانس لے کر میں چند فائلوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو دیر سے میری میز پر رکھی ہوئی تھیں۔

اس کے دو دن بعد کا ذکر ہے' میں گھر سے آفس آنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اے ایس آئی شریف سیال ہانپتا کانپتا آن پہنچا۔ وہ ایک بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا لیکن کچھ یوں ایک طرف کو جھکا جا رہا تھا جیسے وہ بریف کیس نہیں' سازوسامان سے بھرا ہوا بہت بڑا صندوق ہو۔

چوکیدار نے انٹرکام پر مجھ سے اجازت لے کر اسے اندر بھیجا تھا اور میں نے ڈائننگ روم کی کھڑکی سے اسے ڈرائیو وے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اسے ڈائننگ روم میں ہی بلوا لیا۔ وہ کچھ بوکھلایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ٹوپی الٹی پہنی ہوئی تھی۔

میں نے اسے ڈائننگ ٹیبل پر ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اسی کمرے پر بیٹھ گیا جو اس کے زیادہ قریب تھا لیکن پھر میز کی لمبائی نگاہوں سے ناپتے ہوئے بولا "اوہو' میں تو آپ سے کچھ زیادہ ہی دور ہو گیا۔ مجھے کچھ راز کی باتیں کرنی ہیں۔ مجھے تو آپ کے قریب بیٹھنا چاہئے۔"

اس نے بریف کیس بغل میں دبایا اور میرے برابر والی کرسی پر آ کر گہری سانس لیتے ہوئے بولا "ایک تو یہ آپ امیر لوگ کھانے کی میزیں بھی اتنی بڑی بڑی بنوا لیتے ہیں کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے کے لئے اچھا بھلا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔"

"کم از کم ٹوپی تو سیدھی کر لو۔ پولیس والے کے سر پر الٹی ٹوپی اچھی نہیں لگتی۔" میں نے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا کروں چوہدری صاحب۔۔۔!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر ٹوپی سیدھی کرتے ہوئے بولا "ایک کام سیدھا کرتا ہوں تو دوسرا الٹا ہو جاتا ہے۔ دوسرا سیدھا کرتا ہوں تو تیسرا الٹا ہو جاتا ہے۔"

"کیا ہو گیا؟ اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ جی۔۔۔ اللہ نے بڑا کرم کیا تھا۔ ایک کیس تو بیٹھے بٹھائے حل ہو گیا تھا۔" وہ ٹوپی اتار کر سر کھجاتے ہوئے بولا "وہی نشاط عرف بے بی والا۔ چوہدری صاحب! آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ بڑے معزز آدمی نے اس کو قتل کیا تھا۔ بڑا مشہور آدمی تھا جی۔ نصیر نواز نام تھا اس کا۔ فلمی اسٹوریاں وغیرہ لکھتا تھا۔"

"اچھا۔۔۔؟" میں نے آنکھیں تھوڑی سی پھیلائیں۔ اس موقعے پر تھوڑی سی حیرت ظاہر کرنا مجھے اپنا اخلاقی فریضہ محسوس ہوا تھا۔

"ویسے جی۔۔۔ آپس کی بات ہے۔ یہ ظلموں میں بھی بڑی کمائی ہے۔ کیا شاندار بنگلا تھا اس نصیر نواز کا۔" وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے کہا "لیکن خیر' آپ کے بنگلے جیسا شاندار نہیں تھا۔ کافی عرصے سے میری تقرری اُدھر گلبرگ میں ہی ہے۔ بڑے بڑے صاحب لوگوں کی کوٹھیاں دیکھی ہیں۔ لیکن آپ کی کوٹھی جیسی کوٹھی نہیں دیکھی' لگتا ہے آدمی کسی ماڈرن بادشاہ کے محل میں آ گیا ہے۔"

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا "چوہدری صاحب! یہ کوٹھی اور بنگلے میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم یار!" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "کوٹھی شاید زیادہ طویل و عریض مکان کو کہتے ہیں۔۔۔ یا ہو سکتا ہے کوٹھی' بنگلا ایک ہی چیز کو کہتے ہوں۔ میں نے کبھی اس پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ تم نصیر نواز کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔"

"ارے ہاں۔۔۔" اس نے جلدی سے ٹوپی ایک بار پھر الٹی سر پر رکھ لی "میں یہ بتا رہا تھا کہ اللہ نے بڑا کرم کیا۔ نصیر نواز کو اللہ نے توفیق دی۔ اس کی غیرت جاگی۔۔۔ نہیں۔۔۔ شاید اس موقعے پر یہ کہنا چاہئے کہ اس کا ضمیر جاگا اور اس نے خودکشی کر لی۔ مجھے زیادہ مغزماری نہیں کرنی پڑی۔ اس کے نوکروں نے ہمیں اطلاع دی۔ میں موقع پر پہنچا۔ اس کا رقعہ قبضے میں لیا۔ لاش مردہ خانے بھجوائی اور کیس دائر دفتر کیا۔ جان چھوٹی۔ لیکن صاحب! پولیس والے کی جان کہاں چھوٹ سکتی ہے۔۔۔!" وہ مغموم انداز میں سر جھکا کر ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ واقعی سیدھا آدمی تھا۔ جس کام میں اسے محنت نہیں کرنا پڑتی تھی اس کا کریڈٹ لینے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور پولیس والا ہوتا تو شاید نصیر نواز کی خودکشی کے ساتھ بھی کوئی اس قسم کی کہانی بنا دیتا کہ اس نے مجرم کے گرد تفتیش کا دائرہ روز بہ روز تنگ کر دیا۔ مجرم کو احساس ہو گیا کہ اس کی شخصیت بے نقاب ہو کر رہے گی۔ اس کے سامنے کوئی جائے فرار نہیں رہی تھی' اس لئے آخر کار اس نے خودکشی کر لی۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شریف سیال کے ذہن میں ایسا کوئی خیال

نہیں آیا تھا۔

میں مختصر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آخر کار وہ سر اٹھا کر بولا "لیکن میرے لئے دوسرا ملبہ تیار ہے جی۔ پہلے ہی میں کام کے ڈھیر تلے دبا رہتا ہوں۔ اوپر سے افسر لوگ سارے بیکار قسم کے کام میرے اوپر لاد دیتے ہیں۔ وہ جو کچھ دن پہلے میں اور آپ اس فلمی ایکٹرس قسم کی چیز کے گھر گئے تھے ـــ وہی جس کا نام ہنی تھا۔ آپ کو یاد ہے؟"

"ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے کہا۔ اس دوران خانساماں نے شریف سیال کے سامنے ناشتا لا سجایا تھا۔

"ناشتا تو میں کالو ماچھی کے ہوٹل سے کر کے آیا تھا۔ لیکن خیر ـــ اب اتنی اچھی اچھی چیزیں دیکھ کر انکار کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔" وہ آستینیں چڑھاتے ہوئے بولا۔

"وہ ـــ تم ہنی کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہنی کے بارے میں کہاں جی ـــ میں تو آپ کو اس کی ماں کے بارے میں بتانے لگا تھا۔" وہ سر جھٹک کر بولا "ہم جب ان کے ہاں پہنچے تو وہ دونوں ماں بیٹی اغوا ہو چکی تھیں نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کراہنے کے سے انداز میں بولا۔ "آج میں اس کی ماں کو دفن کرا کے آ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" مجھے ایک بار پھر حیرت زدہ ہونے کی اداکاری کرنی پڑی۔

"پتا نہیں کہاں سے اس کی لاش ٹپک پڑی۔ ایک نوکرانی کو اس کی لاش پیچھے والے لان پر رکھی ہوئی ملی تھی۔ باقاعدہ تابوت میں تھی۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم، کہاں سے آئی وہ لاش ـــ کب آئی وہ لاش ـــ کیوں آئی وہ لاش۔" وہ عجلت سے ناشتے کا صفایا کرتے ہوئے بولا "افسران کو اس قسم کے کاموں کے لئے میں ہی سب سے اچھا آدمی نظر آتا ہوں۔ ویسے بھی اس کیس کا تفتیشی افسر شروع سے میں ہی ہوں۔ حالاں کہ میرا عہدہ چھوٹا ہے۔ یہ قتل وغیرہ کے کیس میرے کھاتے میں آنے تو نہیں چاہئیں لیکن افسران بھی دیکھ لیتے ہیں کہ کس معاملے میں جان ماری زیادہ ہے۔ بس اُدھر شریف سیال کو لگا دیتے ہیں۔ اب مجھے معلوم کرنا ہے کہ مسماۃ خورشید جہاں کو کس نے مارا اور لاش اس کے گھر کیوں بھجوائی۔"

"پوسٹ مارٹم ہوا تھا لاش کا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ لاش اگر ہمارے ہاتھ آ جائے پھر کارروائی تو پوری ہوتی ہی ہے۔" وہ فرنچ ٹوسٹ چباتے ہوئے اور ساتھ ہی کافی کا بڑا سا گھونٹ بھر کر تیزی سے نگلنے کے بعد بولا "اپنے میڈیکل افسر کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ اس نے لکھا ہے کہ نشانیاں تو ہارٹ فیل والی ہیں ـــ اور ہارٹ فیل ہونے کی وجہ کوئی بڑا صدمہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے دماغ پر فالج گرا ہو۔ اب بتائیں بھلا، یہ بھی کوئی رپورٹ ہے؟ اس قسم کے ڈاکٹروں کی قابلیت دیکھ

سنگتراش

اقلیم علیم

دنیا سے الگ تھلگ روپوشی کی زندگی گذارنے والے اوہام پرستی کے نت نئے میں رنگے ہوئے جبرین قبیلے کی طلسماتی داستان

آتش کدے کا مقدس پروہت مانینی، پراسرار اور ماورائی طاقتیں اس کی غلام تھیں۔

جس سے جبرین کا سردار جوبا بھی خائف رہتا تھا۔

ایک سنگتراش کی محبت کا دلگداز فسانہ جس کی محبوبہ کی روح پروہت کے قبضے میں تھی۔

سحر اور اسرار کے پردوں میں لپٹی ہوئی ایک پراسرار داستان نیکی اور بدی کا خوفناک تصادم

دو جلدوں میں مکمل

قیمت: حصہ اول =/150

قیمت: حصہ دوئم =/150

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور

کر تو میں سوچتا ہوں کہ میں بھی تھوڑی بہت محنت کر لیتا اور ڈاکٹر بن جاتا تو زیادہ اچھا تھا۔"

"ڈاکٹر یا سرجن نے ٹھیک ہی لکھا ہے۔ بعض کیسوں میں علامت اسی طرح الجھی ہوتی ہیں۔ بہرحال ـــ اس عورت پر تشدد کی تو کوئی علامات نہیں پائی گئی؟"

"نہیں۔ ایسا تو کوئی ذکر نہیں ہے رپورٹ میں۔" وہ منہ چلاتے ہوئے بولا "رپورٹ میں دفتر میں ہی فائل میں لگا آیا ہوں ورنہ آپ کو دکھاتا۔"

ناشتا ختم کر کے اس نے ڈکاری اور ڈکار کے ساتھ ہی وہ یکدم اچھا خاصا اچھل پڑا "واہ چوہدری صاحب! میں بھی بالکل ہی پروفیسر ہوتا جا رہا ہوں۔ یادداشت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ جس مسئلے پر آپ سے سب سے پہلے بات کرنی تھی اسے بغل میں ہی دبائے بیٹھا ہوں۔"

وہ اپنا بریف کیس ناشتا کرتے وقت بھی اپنے پہلو میں رکھے بیٹھا تھا۔ اب اس نے اسے میز پر رکھ دیا اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ ہے ہی اصل مسئلہ جس کے بارے میں، میں آپ سے مشورہ کرنے آیا ہوں۔ شکر ہے آپ جیسا بڑا آدمی مجھ جیسے چھوٹے افسر کا دوست بن گیا ہے۔ ورنہ میری تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ مشورے کے لئے کس کے پاس جاؤں۔"

"اس میں کیا ہے؟" میں نے بریف کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "کوئی بم وغیرہ ہے؟"

"بم ہوتا تو شاید اتنی پریشانی نہ ہوتی چوہدری صاحب!" وہ ایک اور ڈکار لے کر بولا "اس میں بم سے زیادہ خطرناک چیز ہے۔ دنیا کے سارے فساد کی جڑ۔ وہ چیز جس سے بم بھی خریدے جا سکتے ہیں اور بم چلانے والے بھی۔"

"شریف سیال! تم تو اچھے خاصے فلسفی ہوتے جا رہے ہو۔" میں نے مصنوعی تشویش سے کہا "مجھے ڈر ہے، تمہیں پولیس کی نوکری سے نکال نہ دیا جائے۔ تمہارا مطلب ہے اس بریف کیس میں رقم ہے؟"

"ہاں جی۔ پورے دو لاکھ روپے ہیں۔ میں نے تقریباً دو ہزار مرتبہ گنے ہیں۔" اس نے بریف کیس کھول کر میرے سامنے کر دیا۔ اس میں سو سو کے نوٹوں کی گڈیاں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ان دنوں ہزار اور پانچ سو کے نوٹ جاری نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے سو کا نوٹ اتنا بے وقعت نہیں لگتا تھا اور دو لاکھ روپے خاصی بڑی رقم معلوم ہوتی تھی۔

"کیا پریشانی ہے ـــ اور اس رقم کی کیا کہانی ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"واہ چوہدری صاحب! آپ نے تو ردیف قافیے میں بات کر دی۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا "کہانی اس کی یہ ہے کہ کل میں تھانے سے نکل کر رکشے کی تلاش میں ٹہلتا ہوا مین مارکیٹ کی طرف جا رہا تھا کہ سائیکل پر ایک کم عمر سا لڑکا آیا اور یہ بریف کیس مجھے دے کر بولا کہ گاڑی میں کوئی دو آدمی سامنے والے موڑ پر موجود تھے، انہوں نے دیا ہے۔ میں نے اس طرف دیکھا جدھر لڑکے نے اشارہ کیا تھا۔ اُدھر ایک کار تو واقعی موجود تھی لیکن میرے دیکھنے تک وہ تیزی سے ایف سی کالج کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ فاصلہ کافی تھا، میں نہ تو یہ دیکھ سکا کہ کار میں کتنے لوگ تھے یا ان کی شکلیں کیسی تھیں اور نہ ہی کار کا نمبر دیکھ سکا۔ سائیکل والا لڑکا ایک طرف چلا گیا۔ کار دوسری طرف چلی گئی۔ میں بیچ میں ہونقوں کی طرح کھڑا رہ گیا۔"

وہ ابھی تک ہونق ہی معلوم ہو رہا تھا لیکن یہ بات میں نے اس سے نہیں کہی۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "بریف کیس کو تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ میں نے تھوڑا سا کھول کر دیکھا تو نوٹ بھرے ہوئے نظر آئے۔ قسم سے میرا تو دل بیٹھ گیا چوہدری صاحب! میں نے اپنے آپ سے کہا، لے بھئی شریف سیال! تیرے شاندار کیریئر کا تو خاتمہ ہو گیا۔ آج تو ذلیل کر کے محکمے سے نکالا جائے گا اور ڈی ایس پی بننے کی حسرت تیرے دل میں ہی رہ جائے گی۔ میں نے تو وہیں کھڑے کھڑے اپنی نوکری کو خدا حافظ کہہ دیا تھا۔"

"کیوں بھئی! اتنی پریشانی کی کیا بات تھی؟" میں نے اس کے انداز سے محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ظاہر ہے جی ـــ سڑک پر کھڑے آدمی کو کوئی راہ چلتا آدمی یونہی تو بریف کیس میں نوٹ بھر کر نہیں پکڑا جاتا۔" وہ مربیانہ لہجے میں بولا "پہلا خیال تو یہی آیا کہ کسی نے مجھے رشوت خوری کے کیس میں پھنسانے کا پکا بندوبست کیا ہے اور بس اب کسی بھی لمحے ایف آئی اے، سی آئی اے، ڈی آئی اے، پی آئی اے اور پتا نہیں کون کون سی آئی اے اور جائی اے قسم کی ایجنسیاں میری گردن ناپنے کے لئے چلی آ رہی ہوں گی۔ اینٹی کرپشن والے تو شاید فوٹو گرافروں کو ساتھ ہی لے کر آئے ہوں گے کہ بریف کیس سمیت میری تصویریں کھینچی جا سکیں۔ قریب ہی ایک گٹر کا منہ کھلا نظر آ رہا تھا۔ میں نے سوچا بریف کیس اس میں پھینک دوں۔ لیکن یہ کم بخت نوٹوں میں بڑی عجیب سی کشش ہوتی ہے۔ خواہ ان کی وجہ سے ہی آدمی کی جان پر بنی ہو مگر پھر بھی انہیں پھینکنے کو جی نہیں چاہتا۔ چنانچہ میں بھی خوفزدہ خرگوش کی طرح بھاگتا چلا گیا۔ بریف کیس بغل میں ہی دبائے رکھا۔ کل سے اس کو چھپاتا پھر رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں، کیا نہ کروں۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ بریف کیس اسے سیٹھ وحید نے بھجوایا تھا لیکن سیٹھ وحید چونکہ اندھیرے میں ہی رہ کر شریف سیال کو نوازنا چاہتا تھا اس لئے میرا اس ضمن میں زبان کھولنا مناسب نہیں تھا۔ شریف سیال نے ایسا کوئی کارنامہ بھی انجام نہیں دیا تھا لیکن سیٹھ وحید بس بطبعاً فیاض معلوم ہوتا تھا۔ چونکہ اس کی دلی تمنا پوری ہو گئی تھی۔ اس کی بیٹی کا قاتل کیفرِ کردار کو پہنچ گیا تھا، اس

لئے وہ اس باپ میں کسی نہ کسی کو ضرور نوازنا چاہتا تھا۔ مجھ سے تو روپے پیسے کی بات کرنے کا اس میں حوصلہ نہیں پڑ سکتا تھا۔ میں یقیناً اس قسم کی بات کا برا مناتا۔ چنانچہ اس نے شریف سیال کو منتخب کرلیا تھا جو اسے مجھ تک پہنچانے کا ذریعہ بنا تھا۔ ممکن ہے قدرت نے ہی یہ شریف سیال جیسے سیدھے آدمی کو نوازنے کا بہانہ بنایا ہو۔ اس نہتی ہاتھ کے کام بڑے عجیب ہوتے ہیں۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا "زندگی میں پہلی بار ایسا پولیس والا دیکھا ہے جو اس لئے پریشان ہے کہ اسے رقم دے دی گئی ہے۔ ورنہ پولیس والوں کو تو عموماً اسی بات پر پریشان دیکھا ہے کہ انہیں رقم کیوں نہیں دی گئی۔"

"چوہدری صاحب! اب آپ سے پردہ۔۔۔ بات اوقات کی بھی ہے نا۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا "بچپن سے جوانی تک میں نے غریبی ہی غریبی دیکھی ہے۔ پولیس کی نوکری میں آنے کے بعد بھی آج تک میں نے کسی کیس میں ہزار پانچ سو سے زیادہ کا معاملہ نہیں کیا۔ یہ ایک دم دو لاکھ روپے دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا یہ کہاں سے ٹپک پڑے۔"

"بھئی' ہو سکتا ہے کسی نے تمہاری کسی بات سے خوش ہو کر تمہیں انعام سے نوازا ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"لیکن اس طرح گمنام اور پُراسرار طریقے سے؟" اس نے بے یقینی سے سر ہلایا "چوہدری صاحب! آج کل تو کوئی کسی کو دس روپے بھی دیتا ہے تو دس مرتبہ جتا کر دیتا ہے۔ اور پھر میں نے تو ان دنوں کسی کا کوئی خاص کام بھی نہیں کیا۔ کسی کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا۔ سارے شکار تھانے کا دوسرا عملہ ہی مارے جارہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے تم سے لاعلمی میں کوئی ایسا چھوٹا موٹا کام سرزد ہو گیا ہو جو کسی کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہو۔"

"اگر کسی کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کے مفاد کا کام مجھ سے لاعلمی میں سرزد ہوا ہے تو بھلا وہ اتنی بڑی رقم ضائع کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کرتا؟ جب مطلب ہی نکل گیا تو ایسی کونسی مجبوری رہ گئی؟ مطلب نکل جانے کے بعد تو آج کل بھائی بھائی کو نہیں پوچھتا۔ اولاد ماں باپ کو نہیں پوچھتی۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو یا ماں باپ نے بیٹے کو خون پسینہ ایک کرکے پالا پوسا لیکن شادی ہوتے ہی وہ انہیں لات مار کر اس وقت الگ جا کر رہنے لگا جب انہیں سہارے کی ضرورت پڑی۔ مطلب نکل گیا نا اس لئے۔"

شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اور شاید اس کے پیچھے اس کا اپنا کوئی کمپلیکس بھی بول رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اگر کسی نے مجھے نوازنا ہی تھا تو وہ مجھ سے مل کر مجھے ساری بات بتا کر ہی تو رقم دے سکتا تھا۔ اس صورت میں مجھے اطمینان تو ہو جاتا۔ رقم مجھے ہضم تو ہو جاتی۔"

"ہو سکتا ہے وہ شخص دولت مند ہو طبیعت فیاضانہ پائی ہو۔ اور کسی مصلحت کی وجہ سے وہ خود سامنے آنے سے بچتا ہو۔" میں نے کہا۔

"چوہدری صاحب! آپ تو ہو سکتا ہے' کی آڑ میں ہی میرے سارے مسئلے حل کئے جارہے ہیں۔ آپ کی باتوں سے میرے دل کو حوصلہ و ہمت مل رہا ہے لیکن پھر بھی مجھے ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے مجھے پھانسنے کے لئے یہ جال پھینکا گیا ہے۔ کوئی ڈراما رچایا جارہا ہے۔ میں خود بھی اپنے آپ کو لعنت ملامت کررہا ہوں کہ ایک پولیس والے کو اتنا ڈرپوک بھی نہیں ہونا چاہئے۔ اس کی اوقات اتنی چھوٹی بھی نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن خود میرے سمجھانے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا' اس لئے آپ سے مشورہ کرنے چلا آیا ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"بھئی' میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے یہ روپیہ تو اب تمہاری ملکیت ہو ہی گئی ہے۔ تمہاری کچھ نہ کچھ ضروریات تو ہوں گی۔ وہ پوری کرلو اس رقم سے۔" میں نے کہا۔

"ضروریات کا کیا ہے چوہدری صاحب!" وہ طویل سانس لے کر بولا "انسان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تو قارون کا خزانہ بھی ناکافی ہے۔ کچھ پتا ہی نہیں چلتا کہ ضروریات کہاں ختم ہوتی ہیں اور خواہشات کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ شاید وہ اتنا سادہ لوح نہیں تھا جتنا میں سمجھتا تھا۔ وہ گہری بات بھی کر سکتا تھا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا "بھئی' اگر تمہارے پاس ذاتی مکان نہیں ہے تو کوئی اچھا سا مکان دیکھ کر خرید لو۔ اگر رقم کم پڑے گی تو میں دے دوں گا۔ بچوں کے حق میں یہی سب سے اچھا کام ہے۔"

"لگتا ہے قدرت مجھ پر بہت ہی زیادہ مہربان ہو رہی ہے۔" اس کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں "یہ رقم تو چھپر پھاڑ کر آئی ہی تھی' اب آپ اور بھی دینے کو تیار ہیں۔ اور آپ جو یہ مکان کی بات کررہے ہیں۔ یہ تو اس فدوی کی زندگی کی سب سے بڑی حسرت ہے۔ لیکن مسئلہ پھر وہی آن پڑتا ہے جی۔ اگر میں نے اس قسم کا کوئی کام کیا تو اینٹی کرپشن والے تو میرے پیچھے لگ جائیں گی۔ آپ کو معلوم ہے' اینٹی کرپشن میں ایک شعبہ ہوتا ہے جس کا کام سرکاری ملازموں کے رہن سہن کا سروے کرنا ہوتا ہے۔ اس کے کارندے یونہی دوستانہ سے انداز میں کسی سے ملنے آجاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں پتا چلاتے ہیں مکان ذاتی ہے یا کرائے کا۔ اگر کرائے کا ہے تو کرایہ کتنا ہے۔ دوستانہ انداز میں سگریٹ مانگ لیتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ فدوی کون سا برانڈ پیتا ہے۔ فرنیچر دیکھتے ہیں کس قسم کا ہے۔ گھر کی سجاوٹ وغیرہ کیسی ہے۔ کھانا پینا کیسا چلتا ہے۔ بظاہر یہ ایک دوستانہ سی اور اتفاقیہ سی ملاقات ہوتی ہے لیکن اس میں وہ سب کچھ نوٹ کرکے لے جاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ اس کا رہن سہن اس کی تنخواہ کے مطابق ہے یا نہیں۔ وہ اس کی رپورٹ کرتے ہیں۔"

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ کئی لمحے تک میں ہنستا رہا۔ شریف سیال حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں خاموش ہوا تو وہ تشویش زدہ سے لہجے میں بولا "چوہدری صاحب! اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی؟"

"تمہاری باتیں سن کر کبھی کبھی یقین نہیں آتا کہ تم پولیس میں ہو۔" میں نے کہا "بھئی' محکموں کا کیا ہے۔ مجھے تو ہمارے ملک میں دنیا کے ہر ملک سے زیادہ ہیں۔ کیا کسی محکمے نے آج تک وہ مسئلہ حل کیا ہے جس کے لئے وہ قائم کیا گیا تھا؟ اس نے تو اس مسئلے کو دگنا' چارگنا' دس گنا کیا ہے۔ حسب توفیق بڑھایا ہے۔ مجھے ہمارے ہاں مسائل کا پولٹری فارم ہیں۔ وہاں ان مسائل کی افزائش نسل ہوتی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں' اس وقت ہر چیز کی پرائس زیادہ کنٹرول میں تھی جب پرائس کنٹرول کمیٹی نہیں بنی تھی۔ اس وقت کرپشن کم تھی جب اینٹی کرپشن کا محکمہ نہیں تھا۔ اس وقت بجلی کی کمی کا شور سننے میں نہیں آتا تھا جب واپڈا نہیں تھا۔ اس وقت جرائم کم تھے جب پولیس کم تھی۔"

"دراصل۔۔۔ چوہدری صاحب! پہلے آبادیاں بھی تو کم تھیں' شرافتیں پہلے نہیں تھے۔ لوگوں کا معیار زندگی اتنا بلند نہیں تھا۔ ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ مسائل بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ پھیلتے چلے جاتے ہیں۔" اس نے دلیل دی۔

"تو میرے بھائی! محکمے اسی لئے تو قائم کئے جاتے ہیں کہ وہ آبادی کے پھیلاؤ' زمانے کی ترقی وغیرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ اپنے حصے کے مسائل کو حل کرنے کے لئے اقدامات کرتے رہیں۔ منصوبہ بندی کرتے رہیں اور جو اقدامات بھی ضروری سمجھیں وہ کرتے رہیں۔" میں نے کہا۔

"اس کے لئے وسائل کہاں ہوتے ہیں جی!" اس نے ایک بار پھر محکموں کا دفاع کیا "ہر محکمہ یتیم خانے کی طرح چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ اگر کوئی منصوبہ بناتا ہے تو اس کے لئے فنڈز نہیں ہوتے۔ وہ اگر کوئی تجاویز پیش کرتا ہے تو اوپر بیٹھا ہوا کوئی رنجیت سنگھ قسم کا بیوروکریٹ انہیں مسترد کردیتا ہے۔ اس لئے محکمے بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آرام سے لوٹ مار میں لگ جاتے ہیں۔"

"یہ سب تاویلیں ہیں۔ بے کار باتیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیوں کہ ہم سب نے مل کر فیصلہ دے دیا ہے کہ ہمارا ملک ایک غریب ملک ہے اس لئے ہر کام کے سلسلے میں ہمارے پاس بہترین عذر موجود ہوتا ہے کہ جی فنڈز نہیں ہیں۔ ہمارے پاس افسران کے لئے مالیشن بنگلے تعمیر کرنے کے' کاروں کے فلیٹ خریدنے اور سرکاری مشینری کی عیاشیوں پر خرچ کرنے کے لئے فنڈز ہوتے ہیں' تیل اور گیس کی تلاش کرنے کے لئے فنڈز نہیں ہوتے۔ جرائم کو کنٹرول کرنے کے لئے فنڈز نہیں ہوتے۔ پیاس سے مرتے ہوئے انسانوں کو پلانے کے لئے فنڈز نہیں ہوتے۔ اگر لوگوں کا خون چوس کر یا کچھ نئے ٹیکس لگا کر کسی منصوبے کے لئے فنڈز فراہم بھی کئے جاتے ہیں تو اس کا حشر کیا ہوتا ہے؟ دس کروڑ کا منصوبہ ہوتا ہے تو نو کروڑ غتربود ہو جاتے ہیں۔ ایک کروڑ اس پر لگتا ہے جس سے منصوبے کا ہاتھ وہیں پھنسا رہ جاتا ہے۔ صرف اس کی دم باہر آتی ہے جو ہمارے کسی کام کی نہیں ہوتی۔ فنڈز کی کمی کا رونا رو کر اپنی نااہلی کو چھپانا ہماری روایت بن چکی ہے۔ اصل بات یہ ہے بھائی کہ کوئی کام کرنا نہیں چاہتا' کوئی قربانی دینا نہیں چاہتا' کوئی یہ نہیں چاہتا کہ اس کی عیاشیوں میں فرق پڑے۔ دوسری بڑی وجہ ہمارے ہاں کا عدم استحکام ہے۔ آئے دن نت نئے انداز سے اقتدار کی رسا کشی' نت نئی حکومتیں' نت نئے قانون۔ اس مریض محبت کی ہر نس کا بے دردی سے آپریشن ہو چکا ہے'۔ اس کے باوجود جو سرجن آتا ہے وہ نئے سرے سے اس کی چیر پھاڑ شروع کردیتا ہے۔ پرانے آپریشن کو ٹانکے لگنے کی نوبت نہیں آتی کہ نیا آپریشن شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مریض کا یہ حشر تو ہونا ہی تھا جو ہو رہا ہے۔"

"واہ چوہدری صاحب۔۔۔ واہ!" وہ بہ آواز بلند بولا "آپ تو اچھی خاصی تقریر کرلیتے ہیں۔ آپ میں تو سیاسی لیڈر بننے کے جراثیم خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔"

"یہ ایک اور غلط فہمی ہے جو ہمارے ہاں لوگوں میں پائی جاتی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کہ قومی مسائل پر کسی نے ذرا دردمندی سے بات کی تو فوراً اسے سیاسی لیڈر سے تشبیہہ دے دی۔ حالاں کہ قومی درد جن کے دل میں سب سے کم پایا جاتا ہے وہ ہمارے لیڈر ہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ لیڈر کے کم از کم دو چہرے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اخباروں میں نظر آتا ہے اور ایک وہ جو اس کے صرف چند انتہائی قابل اعتماد رفقا کو نظر آتا ہے۔ ہمارے سادہ لوح لوگ صرف اخباری چہرے کی وجہ سے لیڈروں کو پوجتے ہیں۔ اگر وہ ان کے حقیقی چہرے دیکھ لیں تو خوابوں میں بھی چیخیں ماریں۔ لیکن دیکھوبات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ مجھے تمہاری سادہ لوحی پر ہنسی آئی تھی اور گفتگو کا رخ مڑ گیا رلانے والی باتوں کی طرف۔"

"بے کار ہیں جی یہ باتیں۔" وہ سر ہلا کر ناصحانہ انداز میں بولا۔ "ہمارے معاشرے میں روزانہ کروڑوں آدمی کمروں میں بند بیٹھے اسی قسم کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"یہی سوچ کر تو میں خاموش رہتا ہوں۔ یہ تو آج تم نے نادانستگی میں دکھتی رگ چھیڑ دی۔ میں اصل بات کیا کررہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ مجھے تسلیاں دے رہے تھے کہ محکموں وغیرہ سے کیا ہوتا ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"ہاں۔ تم بتا رہے تھے کہ سرکاری ملازموں کا سروے وغیرہ کرنے آتے ہیں لوگ۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے ہمیں اس شہر میں بہت سے ایسے پولیس افسروں کو

جانتا ہوں جن کے لاکھوں کے کاروبار ہیں کا کھوں کی کوٹھیاں ہیں۔ ابھی پرسوں ہی میں نے اسلام آباد میں منسٹری آف انڈسٹریز میں ایک شناسا پولیس آفیسر کو دیکھا وہ ٹیکنیکل ٹرنگانے کے لئے این او سی لینے آیا ہوا تھا۔ درخواست بے شک اس کے ایک رشتے دار کے نام سے دی گئی تھی لیکن مجھے معلوم ہے کہ رشتے دار کا اس کارخانے سے کتنا تعلق ہوگا۔ بنیادی سرمائے کا ذریعہ کیا ظاہر کیا گیا ہے اور اصل میں سرمایہ کہاں سے آیا ہے' یہ باتیں مجھ سے بھی پہلے منسٹری کو معلوم ہوں گی لیکن اسے بہرحال این او سی مل جائے گی۔ تمہارے اپنا کام کر رہے ہیں تم اپنا کام کئے جاؤ میرے دوست!"

"ٹھیک ہے جی۔" وہ قدرے طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے بولا "آپ جیسے بڑے آدمی نے اتنی تسلیاں دی ہیں تو میرا بھی دل بڑا ہو گیا ہے۔ میں کوئی مکان شکان خرید لیتا ہوں گھر والی کے نام سے۔ اب مجھے بھی یقین آگیا ہے کہ یہ رقم آپ جیسے کسی مہربان نے میری کسی چھوٹی موٹی بات سے خوش ہو کر انعام کے طور پر بھیجی ہے۔ آپ نے میرا اتنا بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ شکر ہے مجھ گدھے نے ڈر کے مارے یہ بریف کیس کہیں پھینک نہیں دیا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا اور وہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا "وہ جو آپ نے فرمایا تھا کہ مکان کی خریداری کے سلسلے میں اگر رقم کچھ کم پڑی تو آپ بھی عنایت کر دیں گے۔ تو مطلب یہ ہے کہ میں ذرا ڈھنگ کا مکان دیکھ لوں؟"

"بالکل دیکھ لو۔ میں تمہیں ذرا ڈھنگ کے مکان میں ہی رہتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اچھے آدمیوں کا سچا قدردان ہوں۔" میں نے اسے تسلی دی۔

رخصت ہوتے وقت اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور میرا ہاتھ تھام کر جھکتے ہوئے نہایت عقیدت مندانہ انداز میں چوم لیا اور دھیمی آواز میں بولا "آپ بہت ہی کمال آدمی ہیں چوہدری صاحب! میں سمجھتا تھا آپ جیسے آدمی دنیا میں ختم ہو چکے ہیں۔"

"دنیا میں کسی بھی قسم کے آدمی ختم نہیں ہوئے۔ صرف تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ دوسرے اس اتفاق کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب کس کو کس قسم کا آدمی ٹکرا جائے۔" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔

اس کے رخصت ہونے کے بعد وہ ہلکی سی افسردگی مجھ پر حملہ آور ہونے لگی جسے اب تک میں ذہن کے کسی تاریک گوشے میں دھکیلے بیٹھا تھا۔ یہ افسردگی خورشید جہاں کی موت کے باعث تھی۔ شریف سیال نے بتایا تھا کہ اس کے جسم پر تشدد کی کوئی علامت نہیں تھی اور نہ ہی اسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ نہ جانے خبیثوں نے اسے کیسے ہلاک کیا تھا اور اس سے انہیں کیا حاصل ہوا تھا۔ ان کی سبھی حرکتیں بے سود تھیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آج کے دور میں کس کے پاس بے سود حرکتیں کرنے کے لئے وقت اور انرجی موجود تھی۔ میری یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ریڈ ڈائری کے سلسلے میں مجھے کیا کرنا چاہئے جو ذرا کوئی سراغ ہاتھ آنے لگتا تو فوراً ہی وہ مچھلی کی طرح ہاتھ سے پھسل جاتا تھا۔

بہرحال میں نے اس افسردگی کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور تیار ہو کر آفس پہنچ گیا۔ ابھی میں نے اسٹینو گرافر کو چند ضروری خطوط کے لئے اہم پوائنٹس نوٹ کرائے تھے کہ اطلاع ملی کہ کرنل سے سینہ کرامت مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے اسے فوراً بلوایا اور اس کے استقبال کے لئے اٹھ کر اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچا۔ آخر وہ ہوٹل کے پروجیکٹ میں میرا پارٹنر تھا۔

وہ اندر آیا تو مجھ سے مصافحہ کرتے وقت یوں جھکا جا رہا تھا کہ مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا' کہیں میرے پیروں میں نہ گر پڑے۔ میں نے پہلی بار اسے تھری پیس سوٹ میں دیکھا تھا۔ وہ خاصا معقول آدمی لگ رہا تھا۔ چہرے پر کمینہ پن بھی کچھ کم تھا جانے کیوں منہ کچھ سوکھا سوکھا لگ رہا تھا اور مسکراہٹ بھی مصنوعی مصنوعی سی تھی۔

رسمیات ختم ہو چکیں اور کافی وغیرہ کا دور چل چکا تو میں نے پوچھا "سناؤ سینہ کیسے آنا ہوا؟"

کافی دیر سے آفس کی نشست گاہ میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا' اس کے باوجود اس نے ادھر ادھر دیکھ کر گویا اطمینان کیا کہ ہمیں تخلیہ میسر ہے یا نہیں۔ پھر وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "چوہدری صاحب! مجھے لاہور میں اور کوئی کام نہیں ہے صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔ لیکن اب آپ کے سامنے ہوں تو وہ بات کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی۔ جس کے لئے آیا ہوں۔"

"جو بات کرنی ہے کھل کر کرو سینہ کرامت! یہ احمقوں والا انداز اختیار کر کے اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو۔ اس قسم کے انداز گفتگو سے مجھے الجھن ہوتی ہے۔ آدمی کو جو بھی کہنا ہو سیدھی طرح کہہ دینا چاہئے۔" میں نے کہا۔

"آپ ناراض ہو جائیں گے اور میں آپ کی ناراضگی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میری آپ سے روح فنا ہوتی ہے۔" اس کے چہرے پر حقیقتاً زردی تھی۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' میں نے تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک تو کبھی نہیں کیا کہ تمہاری مجھ سے روح فنا ہونے لگے۔" میں نے ملائمت سے کہا "البتہ ایک بار ہمیں صرف ایک دوسرے کو سمجھنے کے سلسلے میں ہلکی سی غلط فہمی ضرور ہوئی تھی۔ بات ادا کی تھی اور میں اصول پرست آدمی ہوں۔ میں نے صرف اس غلط فہمی کو دور کیا تھا۔ اور شکر ہے وہ آسمانی سے دور ہو گئی تھی۔ اس کے بعد سے تم بھی سیدھے چل رہے ہو۔ اور امید ہے ہم سے تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوئی ہوگی۔"

"اسی لئے تو بات کرتے ہوئے زیادہ مشکل پیش آ رہی۔

برہمچاری

انوار صدیقی

ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو پراسرار علوم کے حصول میں تارک الدنیا تو نہیں ہوا لیکن اتنا طاقتور ہو گیا کہ خود کو سب سے زیادہ قدآور اور صرف آخر سمجھنے لگا۔

انسان جب غرور اور تکبر کے نشے میں سرشار ہو تو پھر دوسری قوتوں سے ٹکرانا بھی اپنا پیدائشی حق سمجھنے لگتا ہے۔ بڑائی کا دعویٰ کرنے والے فرعون ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن رحمانی قوتوں کے سامنے ان کی فرعونیت پانی کے بلبلے سے زیادہ ناپائیدار ثابت ہوئی ہے۔

انکا۔ اقابلہ۔ سوناگھاٹ کا پجاری، غلام روحیں۔ امربیل اور خبیث کے بعد انوار صدیقی کا ایک اور پراسرار ناول، نیکی اور بدی کا خوفناک تصادم

خوبصورت سرورق

بہترین طباعت

قیمت

-/۱۵۰ روپے

کتاب اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ادارے کے نام مکمل قیمت کا منی آرڈر ارسال فرمائیں کتاب آپ کو بذریعہ رجسٹری ارسال کر دی جائے گی

خط و کتابت کے لئے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور ۲، فون ۷۲۲۴۶۶۵

مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" وہ تھوک نگل کر بولا "آپ بھی سوچیں گے' کیسا آدمی ہے۔ بچوں کی طرح کبھی کوئی فرمائش لے کر آجاتا ہے' کبھی کوئی ارادہ کرلیتا ہے۔ لیکن میں آپ کو اپنا سمجھ کر آپ کی منت کرنے آیا ہوں۔ وعدہ کریں کہ آپ ناراض نہیں ہوں گے۔"

میں نے ایک لمحے سوچا پھر کہا "چلو وعدہ رہا میں ناراض نہیں ہوں گا۔"

وہ شیشے کی تپائی پر کچھ آگے کو جھک آیا۔ اس کی انگلیوں میں اچھی بھلی لرزش تھی۔ پھنسی پھنسی آواز میں وہ بولا "چوہدری صاحب! میں جو پچاس لاکھ روپیہ دے چکا ہوں وہ بے شک آپ رکھ لیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ ہوٹل میں میری پارٹنرشپ ختم کردیں۔"

اس سے آگے وہ کچھ نہ بول سکا۔ آواز گویا حلق میں ہی اٹک گئی۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ یوں وحشت زدہ سے انداز میں صوفے کے پشتے سے لگا جارہا تھا جیسے میں نظروں ہی نظروں میں اسے قتل کردوں گا۔ پھر وہ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "دیکھیں چوہدری صاحب! ناراض نہ ہوں۔ اگر آپ۔۔۔"

میں نے ایک طویل سانس لے کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں ناراض نہیں ہوں۔ میں تو صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ نیا خیال تمہیں کیوں آگیا؟ کسی طرف سے دباؤ پڑا ہے کیا؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں چوہدری صاحب!" وہ تیزی سے بولا "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دباؤ بھلا کس کی طرف سے پڑنا تھا۔ آپ کے خلاف کون مجھ پر دباؤ ڈال سکتا ہے؟ ایسی کوئی بات ہوتی تب تو میرے لئے آسانی ہوجاتی۔ میں آپ کو بتادیتا کہ فلاں مجھ پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ آپ خود ہی اس سے نمٹ لیتے۔"

"ہوسکتا ہے دباؤ ڈالنے والا ہم سے زیادہ طاقتور ہو۔" میں نے کہا۔

"میری نظر میں تو آپ ہی سب سے طاقتور ہیں جی۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مکھن لگانے کی چپ اور روایتی قسم کی کوششیں نہ کرو۔ بالکل سچی بات کرو۔ بعض اوقات صرف سچی بات کی وجہ سے میں اپنے دشمنوں کو بھی معاف کردیا کرتا ہوں۔ تم تو پھر بھی کم از کم فی الحال دوستوں میں شامل ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"میں زندگی بھر آپ کے دوستوں میں ہی شمار ہونا چاہتا ہوں۔ چاہے آپ مجھے اپنے قدموں میں ہی جگہ دیں۔" وہ بدستور پھنسی پھنسی اور مرتعش آواز میں بولا "اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ رقم بھی بے شک آپ رکھ لیں۔ بس میری پارٹنرشپ ختم کردیں۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ بلکہ میں آپ کا شکر گزار ہوں گا' آپ کو دعائیں دوں گا۔"

"کچھ وجہ تو بتاؤ۔" میں نے اس کے چہرے سے نظر ہٹاتے ہوئے ملائمت سے کہا کیونکہ اس کی طرف میرے دیکھنے سے اس کی جان نکلی جارہی تھی۔

"وجہ کوئی ایسی خاص نہیں ہے چوہدری صاحب!" ہمت کرکے بولا "بس۔۔۔ ویسے ہی میرے دل میں خوف سا ہے۔۔۔ جب سے پارٹنرشپ ہوئی ہے میرا دل ڈوبا ڈوبا سا رہتا ہے۔ آپ بڑے قوی ہیں اور خطرناک بھی ہیں۔۔۔ مجھے لگتا ہے آپ کے ساتھ نہیں چل سکوں گا۔۔۔ یہ خوف بھی لگا رہتا ہے کسی رگڑے میں نہ آجاؤں۔۔۔ میں اپنے خوف کی وضاحت نہیں کرسکتا۔ بس اس خیال سے آیا ہوں کہ شاید آپ میری بات سمجھ سکیں اور مجھے معاف کرسکیں۔" اس نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑے۔

"بار بار ہاتھ مت جوڑو۔ مجھے گڑگڑاتے ہوئے لوگ اچھے نہیں لگتے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا "تو میں یہ سمجھوں ہوں۔ اور خطرناک بھی۔ اس لئے تم میرے ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس سے پہلے کیا تمہارا تعلق واسطہ صرف حاجیوں سے رہا ہے اور نہایت نیک و پارسا لوگوں سے رہا ہے جیسا استاد لمبو۔ میں سے ایک تھا جس کی تمہیں پشت پناہی حاصل تھی؟"

"نہیں۔۔۔ سر! میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے۔" اس نے بمشکل ہنسنے کی کوشش کی' لیکن حلق سے صرف ایسی آواز برآمد ہوئی جیسے کسی پرندے کا گلا گھونٹا جارہا ہو۔

"استاد لمبو سے دوستی کو ہی تو میں اب تک بھگت رہا ہوں۔ ایف آئی اے اور کرائم برانچ میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ بڑی مشکل سے ان کا منہ بند رکھتا ہوں۔ اسی لئے میں آپ کو خفا ہوکر اٹھانا چاہتا ہوں۔ اپنے ہاتھ بالکل صاف رکھنا چاہتا ہوں۔"

"اور ہمارے ساتھ رہ کر تمہارے ہاتھ گندے ہوجائیں گے؟" میں نے اسے گھورا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ چوہدری صاحب!" وہ یکدم کچھ اور بوکھلا کر بولا "میں تو دراصل کاروبار سمیٹ رہا ہوں۔ میں اب ہاتھ پاؤں مزید پھیلانا نہیں۔۔۔ سر! آپ مجھ سے بدگمان نہ ہوں۔۔۔ میری بات کو کوشش کریں۔"

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر کار میں نے سانس لے کر صوفے کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "عجیب آدمی ہو سیٹھ کرامت! میرا خیال تھا کہ انسانوں کو میں مجھے کافی حد تک آچکا ہے لیکن تمہیں میں نہیں سمجھ سکا۔ تمہیں قائل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ میرا صاف ستھرا اور مستحکم ہے۔ نہ ہی میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کاروبار کی دنیا میں میری کیا ساکھ ہے۔ تم یہ سب کچھ دیکھ کر ہمارے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ میں تمہیں یہ یقین دلانا بھی نہیں چاہتا کہ آج تک کسی ایجنسی کو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔"

"مجھے یقین ہے سر! مجھے یقین ہے چوہدری صاحب!" وہ جلدی سے بولا۔

"ان سب باتوں کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن تمہارا ریکارڈ درست رکھنے کے لئے میں تمہیں ایک بات ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارے روپے کی مجھے اس وقت بھی ضرورت نہیں تھی جب میں نے ہوٹل کا پروجیکٹ شروع کیا تھا۔ اور اب بھی ضرورت نہیں ہے جب میرا ہوٹل مکمل ہونے والا ہے۔ مجھے اپنے دوست سیٹھ رمضان کے روپے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اور یہ بات اسے بھی معلوم ہے۔ میرے پاس پروجیکٹ شروع کرتے وقت بھی اتنا روپیہ تھا کہ سول پروپرائٹر کے طور پر ہوٹل بنوا سکتا تھا۔ اور اب تو یہ میرے لئے بالکل معمولی بات ہے۔ لیکن صرف کاروباری مصلحتوں کی وجہ سے میں نے پارٹنرشپ میں یہ پروجیکٹ شروع کیا تھا۔ میں ان مصلحتوں کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ تم کاروباری آدمی ہو' ان باتوں کو سمجھتے ہوگے۔ لیکن تمہاری حالت دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کاروباری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ دوں گا۔ مجھے اب سول پروپرائٹر بھی بننا پڑا تو بن جاؤں گا۔ تمہارے شیئرز میں خرید لوں گا۔ تمہاری رقم تمہیں واپس مل جائے گی۔"

اس کے چہرے پر ذرا رونق آگئی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میرا تیسرا پارٹنر سیٹھ رمضان حالاں کہ میرا جگری یار ہے اور ہوٹل میں روپیہ لگا کر بہت خوش ہے۔ اس نے تو آج تک پلٹ کر دیکھا بھی نہیں کہ ہوٹل کس مرحلے میں ہے۔ حالاں کہ وہ بھی کراچی میں ہی رہتا ہے اور ہوٹل کے سامنے سے اس کا سیکڑوں مرتبہ گزر ہوا ہے لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ اس نے کبھی آکر جھانکا تک نہیں کہ کنسٹرکشن کیسی ہورہی ہے۔ کام کی رفتار کیا جاری ہے۔ عجب قلندر سا آدمی ہے اور مجھ پر معلوم نہیں کیوں آنکھیں بند کرکے بھروسا کرتا رہتا ہے۔ اپنی ساری دولت میرے حوالے کرنے کے لئے تیار رہتا ہے اور اس کی طرف سے مجھے مستقبل بعید میں بھی کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں سوچ رہا ہوں کہ اس کی پارٹنرشپ بھی ختم کردوں گا۔ اس کے شیئرز بھی خرید لوں گا۔ حالاں کہ وہ یہی سمجھے گا کہ میں یہ حرکت کرکے اس پر بدگمانی کا مظاہرہ کررہا ہوں۔ اور اس بات پر وہ بہت واویلا کرے گا۔ جذباتی ہوجائے گا۔ خودکشی کی دھمکیاں دے گا۔ لیکن میں اسے منالوں گا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ پارٹنرشپ والا سلسلہ ٹھیک ہی نہیں ہے۔ ٹیکسوں میں بچت کے لئے اگر کبھی بہت ہی زیادہ ضرورت پڑے تو آدمی بس کاغذی قسم کی پارٹنرشپ کرلے۔ یہ سچ مچ کی پارٹنرشپ تو محض دردِ سر ہے۔ میں اس سے جان ہی چھڑالوں تو بہتر ہے۔"

"چوہدری صاحب! آپ تو ناراض ہوگئے۔ میرا مقصد آپ کو ناراض کرنا نہیں تھا۔ اسی لئے تو میں کہہ رہا تھا کہ رقم بے شک آپ رکھ لیں۔ بس میری پارٹنرشپ ختم کردیں۔" وہ تیزی سے بولا۔

"رقم آپ کی نذر ہے۔"

"سیٹھ کرامت! میں نذرانے نہیں لیتا۔ تمہارا خیال ہے کہ مفت میں پچاس لاکھ روپیہ ہاتھ آنے پر میری خوشی کا ٹھکانا نہیں رہے گا؟" میں نے سرد لہجے میں کہا "کوئی زمانہ تھا کہ روپیہ میری مجبوری تھا' اب نہیں رہا۔ مجھے روپیوں کی نہیں' آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تم ان آدمیوں میں سے نہیں ہو جن کی مجھے ضرورت ہوتی ہے۔ جب مجھے تمہاری ہی ضرورت نہیں تو تمہارے روپے کا میں کیا کروں گا۔ میں نہ تو ناخوش آدمی کو ساتھ رکھنا چاہتا ہوں اور نہ ہی اس کے روپے کو۔"

اس نے کچھ بولنے کے لئے منہ کھولا لیکن میں نے اسے اس کا موقع دیئے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میں ابھی اپنے ڈائریکٹر فائنانس اور اکاؤنٹس منیجر کو تم سے ملوا دیتا ہوں۔ انہیں بتادو کہ تم رقم کس اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرانا چاہتے ہو۔ وہ آج ہی ٹرانسفر کرادیں گے۔"

وہ ندامت آمیز سے انداز میں ایک لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "لیکن میں شیئر سرٹیفکیٹس تو ساتھ نہیں لایا ہوں۔ وہ تو میں آج واپس نہیں کرسکتا۔"

"کوئی بات نہیں' رقم اس کے باوجود آج تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوجائے گی۔ شیئر سرٹیفکیٹس تم کراچی واپس جاکر جب چاہو بھجوا دینا۔ مجھے معلوم ہے تم ہماری کوئی چیز دبا نہیں سکتے۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"میری یہ جرأت کہاں چوہدری صاحب!" وہ گھگھیائے ہوئے سے انداز میں بولا "وہ تو ایک بار غلطی ہوگئی سو ہوگئی۔ مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔ کل بائی ائر میں شیئر ارسال کردوں گا۔"

اس کے بعد کی کارروائی چند منٹ میں ہی طے پاگئی۔ وہ جب رخصت ہوا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہوگیا ہے۔ لیکن رخصت ہوتے وقت اس کے پاؤں زمین پر گڑے جارہے تھے۔ آخر کار وہ کہے بغیر نہ رہ سکا "میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی پر غلطی کی۔ آپ کی پارٹنرشپ کے اعزاز سے محروم ہوکر اس سے بھی بڑی غلطی کی۔ اب میں آپ کا ساتھی' آپ کا دوست۔۔۔ بلکہ آپ کا غلام بننا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہے آپ مجھے قبول نہیں کریں گے۔"

"تمہارا خیال بالکل درست ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

اس نے ایک نہایت سستے برانڈ کی تلخ سی سگریٹ نکال کر سلگائی تو اس کا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے تپائی سے سگریٹ باکس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا جس میں بیش قیمت

سگریٹیں بھری ہوئی تھیں "ان میں سے پی کر دیکھو۔" میں نے کہا۔

"شکریہ ..... شکریہ ....." وہ مضطرب لہجے میں بولا "میں کسی زمانے میں ردی کا بیوپاری تھا۔ اس زمانے سے یہی برانڈ پی رہا ہوں۔ اب میں کوئی سی بھی سگریٹ افورڈ کر سکتا ہوں لیکن یہ برانڈ چھوڑی نہیں سکا۔"

"میں یہی جواب سننا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا' تم یہی جواب دو گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے تمہیں اچھی سگریٹ اس لئے آفر نہیں کی تھی کہ تم افورڈ نہیں کر سکتے۔ مجھے تمہاری حیثیت معلوم ہے اور تمہاری حیثیت کے کئی لوگوں سے میں نے کسی نہ کسی چیز کے بارے میں اسی قسم کا جواب سنا ہے۔ اور مجھے حیرت ہوئی ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ تم ماضی کا ذکر کرنے اور اپنی پرانی حیثیت کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے لیکن میرا مشورہ یہی ہے کہ جہاں تم نے رہائش تبدیل کی ہے' پسنداوا تبدیل کیا ہے' اٹھنے بیٹھنے کے ٹھکانے تبدیل کئے ہیں' دوست تبدیل کئے ہیں' سواری تبدیل کی ہے' غرضیکہ ہر چیز تبدیل کی ہے۔ وہاں سگریٹ کا برانڈ بھی تبدیل کر لو۔ اب اگر تم اپنے سوٹ میں ایک پیوند لگا کر آجاؤ اور کہو کہ یہ میرے غربت کے زمانے کی یادگار ہے' تو کتنا برا لگے گا۔ اس لئے بہتر تو یہی ہے کہ یہ سگریٹ کا پیوند بھی ہٹا دو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہن کے کسی کونے میں ابھی تک گرد جمی ہوئی ہے۔ اور ذہن کے کسی ایسے ہی کونے کی وجہ سے تم میرے ساتھ نہیں چل سکے۔ خدا حافظ" میں اسے اپنے کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر واپس آگیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنا ذہن کچھ ہلکا محسوس کیا۔ لیکن آج کا دن شاید کراچی سے ناخوشگوار خبریں آنے کے لئے مخصوص ہو گیا تھا۔ اس وقت میں دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا جب میرے ڈائرکٹ فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھانے سے پہلے ہی نہ جانے کیوں میرے دل نے کہہ دیا کہ فون کراچی سے ہے۔

میرے دل کا کہا درست ہی نکلا۔ دوسری طرف کراچی سے شفیع شاہ تھا۔ نہایت مختصر رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ بولا۔

"سر! تھوڑی سی بری خبر ہے۔"

"سناؤ۔ میں آج ہر بری خبر سننے کے لئے تیار ہوں" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"ہمارا سب سے بڑا ٹرالر "وکٹری" ڈوب گیا ہے۔ اس پر ہمارے جو آدمی فشنگ کے لئے گئے ہوئے تھے ان میں سے ایک آدمی ارشد بھی ہلاک ہوا ہے اور بعد میں اس کی لاش ڈوب گئی" اس نے رک رک کر بتایا۔

"کس طرح؟ یہ سب کچھ؟" میں نے اپنے آپ کو خبر کے دھچکے سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "وکٹری" میرے تین سو ٹرالروں کے فلیٹ میں سب سے بڑا اور خوبصورت ٹرالر تھا۔ اس کا صرف انجن ہی نہیں بلکہ وہ پورا کا پورا امپورٹیڈ تھا۔ میں نے منگوایا تھا۔ اس کے ذریعے جدید ترین پیمانے پر فشنگ کی جا تھی۔ ٹرالر کیا تھا' چھوٹا موٹا بحری جہاز تھا۔ وہ گویا میرے ٹرالروں کے دستے کا سردار تھا۔

شفیع شاہ دھیمے لہجے میں بولا "وہ اٹھائیس دن کے فشنگ کے بعد واپس آرہا تھا....."

"پھر تو مچھلیوں سے بھی لدا ہوا ہوگا؟" میں نے اس کی کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔ کئی لاکھ کا مال تھا اس پر" شفیع شاہ نے جواب "ایک لانچ سے بغیر کسی وجہ کے اس پر گرنیڈ پھینکے گئے بری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا۔ انجن میں آگ لگ گئی۔ ہمارے آ نے پانی میں کود کر جان بچائی لیکن ارشد بھٹی ٹرالر کو بچا کوشش میں....." اس کی آواز ایک لمحے کے لئے مرتعش ہو گ

"معلوم نہیں ہو سکا لانچ کس کی تھی؟" میں نے ا پُرسکون رکھا۔

"سب کچھ معلوم ہو گیا ہے سر! ہمارے آدمیوں نے کر دیا۔ ٹریننگ کا حق ادا کر دیا" شفیع شاہ کی آواز سے ارتعاش ہو گیا "انہوں نے پانی میں غوطہ لگا کر یہی ظاہر کیا کہ وہ ڈوب ہیں لیکن نیچے ہی نیچے وہ لانچ کے قریب پہنچ کر اس طرح ا چڑھے کہ حملہ آوروں کو احساس ہی نہیں ہو سکا۔ وہ تعدا صرف دو تھے۔ ہمارے آدمیوں نے انہیں قابو میں کر لیا اور

ایم اے راحت

کے پراسرار اور ایڈونچر قلم سے

ایک شاہکار ناول

تاریک وادی

اردو بازار لاہور

ندانی لے گئے۔ لانچ کو ہم نے قبضے میں کر لیا ہے۔ وہ گڈانی سے کچھ دور ایک ویران مقام پر کھڑی ہے۔ ہمارے آدمی ان دونوں دمیوں کو قابو میں کر کے اپنے ٹھکانے پر لے آئے تھے۔ ہم نے ان سے "تفتیش" کی۔ پہلے تو انہوں نے زبان نہیں کھولی۔ کافی سخت ان تھے۔ لیکن آج صبح پھوٹ پڑے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سیٹھ عالم شیر کے آدمی ہیں اور اسی نے ان کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ ہمارے ٹرالر کو تو ہیں سمیت ڈبو دیں۔"

"سیٹھ عالم شیر....." میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پھر میں نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بہت دھیمے لہجے میں کہا "شفیع شاہ! ہمیں تو پتا ہی نہیں چلا اور لوگ اتنی ترقی کر گئے کہ وہ "ہم" پر حملے کرنے لگے۔"

"یس سر" وہ آہستگی سے بولا۔ "وہ سیٹھ عالم شیر کو اچھی طرح جانتا تھا۔ گو کہ عالم شیر لاہور میں رہتا تھا لیکن اس کے "کاروبار" کا زیادہ دارومدار کراچی پر تھا۔ وہ اب بھی اسی لائن کا آدمی تھا جسے ہم ایک عرصہ ہوا ترک کر چکے تھے۔ بارش آدمی تھا۔ دو مرتبہ حج کر چکا تھا۔ پنج وقتہ نمازی تھا۔ اسمگلنگ کو قطعی جائز "کاروبار" سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ پرانے زمانے میں۔ بلکہ عین اسلام کے دورِ عروج میں قافلے ہر طرح کا ساز و سامان لے کر جس ملک میں جاتے، لے جاتے رہتے تھے۔ اور جن چیزوں میں بھی فائدہ دیکھتے تھے ان کی خرید و فروخت کرتے رہتے تھے۔ یہ سب سے معزز تجارت تھی۔ یہ کسٹم' کوسٹ گارڈ' ٹیکس' ڈیوٹیاں' امپورٹ لائسنس' پابندیاں' کالے سفید قوانین' یہ سب تو بعد کی پیداوار تھیں۔ غیر مسلم' بدکرداری اور سود خور قوموں کی اختراعات تھیں جنہیں سب نے آنکھیں بند کر کے اپنا لیا تھا۔ وہ انہیں نہیں مانتا تھا۔ لیکن چوں کہ فی الحال اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ حکومتوں سے ٹکرا سکے اس لئے وہ بقول خود' چھپا چھپا کر یہ کاروبار کرنے پر مجبور تھا' لیکن اس کا ارادہ تھا کہ جب اس کے پاس خاطر خواہ وسائل ہو جائیں گے تو وہ ان بین الاقوامی قوانین کے خلاف تحریک چلائے گا کیوں کہ انہی کی وجہ سے دنیا کا معاشی نظام درہم برہم تھا' انہی کی وجہ سے دنیا میں کرپشن کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھی اور انہی کی وجہ سے امیر' امیر تر اور غریب' غریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی تھی۔ وہ بڑی دلیلوں اور اعداد و شمار کے ساتھ بات کرتا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ اگر پرانے زمانوں کی طرح پوری دنیا میں مال کی نقل و حرکت اور تجارت سے پابندیاں ہٹا لی جائیں تو رفتہ رفتہ دنیا کی معیشت خود بخود متوازن ہو جائے گی۔ کسی ملک میں حد سے زیادہ دولت اور کسی ملک میں حد سے زیادہ غربت نہیں رہے گی۔

مجھے اس کے نظریات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بلکہ اس کی ذات سے' اس کے کسی بھی کام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کے اور ہمارے راستے قطعی جدا تھے۔ اس کے باوجود اس نے ہمیں اتنا بڑا نقصان کیوں پہنچایا تھا؟

میں نے اس سوال پر غور کیا تو مجھے فوراً یاد آگیا کہ اس نے ایک بار اپنا اسمگلنگ کا مال منگوانے کے لئے مجھ سے ٹرالر مستعار لینا چاہا تھا لیکن میں نے اس قسم کے کام کے لئے ٹرالر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میرے ٹرالر باقاعدہ لائسنس کے تحت صاف ستھرے انداز میں فشنگ کا جائز کاروبار کر رہے تھے۔ پرانے دھندے میرے لئے قصۂ پارینہ ہو چکے تھے۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میرے پاس جائز طریقوں سے اس سے زیادہ دولت آرہی تھی۔ لیکن یہ بات سیٹھ عالم شیر کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ٹرالر نہ دینے پر وہ مجھ سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔ لیکن میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جرأت کرے گا اور اتنا کینہ پرور ثابت ہوگا۔

میں جو کچھ سن رہا تھا' میرا اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے تصدیق چاہی "شفیع شاہ! تم نے اچھی طرح یقین کر لیا ہے کہ وہ سچ بول رہے ہیں؟ کہیں جان بچانے کے لئے وہ خواہ مخواہ کسی پر ملبہ تو نہیں ڈال رہے؟"

"نہیں سر! میں نے اندازہ کر لیا ہے۔ ان کے بیان میں کچھ نشانیاں ہیں۔ کچھ حوالے ہیں۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ یہ عالم شیر ہی کی حرکت ہے" شفیع شاہ نے وثوق سے جواب دیا۔

"بہت ہی عجیب حرکت ہے" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے تو اب شبہ ہونے لگا ہے کہ عالم شیر کی کھوپڑی کا کوئی اہم پرزہ گرا ہوا ہے۔"

"سر! ان دونوں آدمیوں کا کیا کرنا ہے؟" شفیع نے پوچھا "میں نے سوچا کہ اس معاملے کا اصل تعلق لاہور سے نکل آیا ہے اس لئے آپ کے حکم کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاؤں۔"

"ان میں سے جو لانچ چلا رہا تھا اسے ابھی قبضے میں ہی رکھو۔" میں نے ایک سادہ کاغذ کو انگلیوں میں مسلتے ہوئے کہا۔ "دوسرا' جس نے گرنیڈ پھینکے ہوں گے اسے وہیں پہنچا دو جہاں ارشد بھٹی گیا ہے۔ مچھلیاں ابھی اور بھوکی ہوں گی۔ مزید ہدایات کا انتظار کرو۔ میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔"

"ٹھیک ہے سر!" اس نے مستعدی سے کہا۔

"خدا حافظ" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

کچھ دیر میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ سوچتا رہا۔ میری بھوک ختم ہو گئی تھی۔ میری انگلیوں میں کاغذ کی گولی سی بن گئی تھی۔ آخر کار میں نے اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

انٹرکام پر میں نے کیتھرین سے کہا "نیچے ریسپشن پر یا باہر گاڑی میں ٹونی اور شبیر شیخ ہوں گے۔ انہیں ذرا میرے پاس بھیج دو۔"

"یس سر!" کیترین نے جواب دیا۔

ایک منٹ سے بھی پہلے وہ دونوں میرے کمرے میں تھے۔ ٹونی ہمیشہ کی طرح ایک فیشن ایبل لاابالی اور غنودگی زدہ سا نوجوان نظر آرہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اندر سے وہ چیتے کی طرح مستعد رہتا تھا۔ میں نے انہیں اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"حاجی عالم شیر کو جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں سر!" ٹونی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "میری عمر بے شک کم ہے لیکن میں اسے اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ پڑوسی ملک سے گوٹا کناری کی بوریاں خود کمر پر لاد کر گھوڑوں اور اونٹوں پر لادا کرتا تھا۔ پھر انہیں سرحد پار لایا کرتا تھا لیکن دین کا وہ اس وقت بھی اچھا نہیں تھا۔ اپنے تقاضہ داروں کو ہر بار نئی کھیپ آنے کے وعدے پر ٹرخاتا رہتا تھا۔"

"ہاں.... اچھا یاد دلایا تم نے ٹونی!" میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "میں تو یہ باتیں بھول ہی گیا تھا۔ میں غیر اہم باتیں اپنے ذہن کے کمپیوٹر سے نکال پھینکتا ہوں۔ ڈی پروگرام کردیتا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ غیر اہم باتیں بھی یاد رکھنی چاہئیں۔ خیر.... تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ وہ عالم شیر بہت بڑا آدمی ہوگیا ہے۔ اس کے آدمیوں نے ہمارا ماہی گیری کا جائز اور قانونی کاروبار کرنے والا بہترین ٹرالر گرنیڈز پھینک کر ڈبو دیا ہے۔ ارشد بھٹی اس حملے میں کام آیا ہے۔"

"اوہ..." ٹونی کے ہونٹ سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکڑ گئے اور چمکیلی شربتی سی آنکھوں میں سفاکی کی ایک لہر آکر گزر گئی۔ شبیر شیخ نے بھی بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔

"بہرحال ہمارے آدمیوں نے ان کارندوں کو پکڑلیا ہے۔" میں نے گویا انہیں تسلی دی "یہ بتاؤ کہ تمہیں عالم شیر کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔"

"جی ہاں۔ تین آدمی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔" ٹونی بلا تامل بولا "ایک کے پاس لائسنس یافتہ گن ہوتی ہے۔ وہ باضابطہ گارڈ ہے، گارڈ ہی کی طرح عالم شیر کے ساتھ رہتا ہے۔ دوسرے دو عام لباسوں میں ہوتے ہیں۔ ان کے لباسوں میں ہی اسلحہ چھپا ہوتا ہے۔ ان کا اسلحہ بلا لائسنس ہوتا ہے۔ وہ دونوں پیشہ ور بدمعاش اور قاتل ہیں۔ باضابطہ گارڈ کے طور پر ساتھ رہنے والا ایک ریٹائرڈ کمانڈو ہے۔"

"بہت خوب ٹونی! مجھے خوشی ہے کہ تم آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہو۔" میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔

"سر! زندگی کی دوڑ بہت سخت ہے۔ یہ دنیا عالم شیروں سے بھری پڑی ہے۔ ذرا آنکھیں اور کان بند کرو.... یہ لوگ کچلتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔" ٹونی اپنے مخصوص دھیمے سے لہجے میں بولا۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "کرنا کیا ہے سر؟"

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

سنگتراش

اقلیم علیم

جلد اول:-/150 جلد دوم:-/

اردو بازار لاہور

"عالم شیر کو آج رات دو نمبر پر ہونا چاہئے۔ مجھے ا
مذاکرات کرنے ہیں۔" میں نے سرسری سے لہجے میں
سے میری مراد ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی ہوتی تھی اور میر
معلوم تھا کہ جب کسی کو وہاں بلوایا جاتا تھا تو اسے کس
تھا۔

"پہنچ جائے گا سر! آپ بالکل مطمئن رہیں۔" ٹونی
سے بولا۔

"تم چاہو تو میری حفاظت کی ذمے داری کم از کم
کے لئے تو چھوڑ ہی سکتے ہو۔" میں نے کہا "بلکہ بہتر تو
خواہ مخواہ کی مشقت چھوڑ ہی دو۔ میں اب خود اپنے
خاصا مستعد اور ہوشیار رہنے لگا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سر!" وہ سر جھکاتے ہوئے بولا "
اپنی حفاظت آپ خود ہی کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ
دل سے مجبور ہو کر، محض ایک اضافی احتیاطی تدبیر کے
ہیں۔ آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں کہ کس وقت
داری انجام دے رہا ہوگا۔ میں نے اس کا سب انتظام
اتنے بہت سے ساتھی ہیں ہمارے۔ ہم چاہیں تو آپ
ہجوم کردیں کہ آپ تک کسی کی نظر بھی نہ پہنچ سکے۔
کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ دوسرے ہمیں یہ اطمینان
خود کسی فولادی دیوار سے کم نہیں۔ یہ چار آنکھیں
تسلی کے لئے آپ کی نگرانی کرتی ہیں۔ آپ اس معا
چھوڑے رکھئے۔ میری آپ سے بس یہ ایک ہی تو

"اور میں ہمیشہ تمہاری ضد کے سامنے مجبور ہوجاتا ہوں۔"
نے گہری سانس لے کر کہا "اس بے فائدہ کام کی اجازت دے
ہوں۔"

"اس کا کوئی فائدہ بھی کبھی نہ کبھی سامنے آہی جائے گا سر!"
مسکراتے ہوئے بولا "اب ہم جائیں؟"

"ہاں" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "عالم شیر والے کام میں
جلد بازی یا جذباتیت کا مظاہرہ کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔
آج ہاتھ نہ پڑے تو یہ کام کل یا پرسوں بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس
لئے آج کی شام ڈیڈ لائن نہیں ہے۔ بس کام کچا نہیں ہونا
ہے۔" یہ میں نے محض احتیاطاً کہا تھا ورنہ مجھے معلوم تھا کہ ٹونی
سپرد کوئی کام کرنے کا مطلب یہی تھا کہ کام کچا نہیں ہوگا۔

وہ دونوں جاچکے تو میرے ذہن سے دھند سی چھٹ گئی اور میں
کھانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کھانے پر انٹرکان میں آفاق
منتظر تھا۔ اس سے میری ملاقات طے تھی اور میں چند منٹ
تھا۔ میں نے اس سے معذرت کی تو وہ شرمندہ سا ہوگیا۔
ری صاحب! آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔ مجھ جیسے اپنے چھوٹے
ے کارندوں سے اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر معذرت کرتے ہیں تو
م سے بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔ آپ کو ذرا بھی خطرہ محسوس نہیں
کہ ان باتوں سے آپ کی حاکمانہ شان میں فرق آسکتا ہے؟"

"میں اپنے کام حاکمانہ شان کے ذریعے نہیں بلکہ اپنے
یوں کی جاں نثاری کے ذریعے چلانا چاہتا ہوں۔ اور جاں نثاری
میں کبھی آئے گی جب انہیں مجھ سے محبت ہوگی۔ میں یہ ہرگز
ہیں چاہتا کہ میرے آدمی مجھ سے ڈریں، مرعوب ہوں، میرے
سامنے سراپا تعظیم بنے رہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھ
محبت کریں۔ مجھے ان کے وہ جذبات زیادہ اہم معلوم ہوتے ہیں
پیٹھ پیچھے میرے بارے میں رکھتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔
ے۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ جن معاملات پر بات کرنے کے لئے یہ
ت طے پائی تھی وہ شروع کرو، کھانے کے ساتھ ساتھ وہ نمٹ
یں تو بہتر ہے۔"

مجھے آج کل اسٹوڈیو جانے کا وقت نہیں مل رہا تھا اس لئے
نے اپنے فلم بزنس کے ضروری معاملات پر بات کرنے کے لئے
ائی کئی مرتبہ کی یاددہانیوں کے بعد اسے کھانے پر ہی بلالیا تھا۔
اس نے چند فائلیں بریف کیس سے نکال کر میز پر رکھ لیں۔
ا کوئی خاص نہیں تھیں۔ بس جب تک وہ اپنی کارگزاری
ے گوش گزار نہیں کردیتا تھا، اسے اطمینان نہیں ہوتا تھا۔
ئی دو فلمیں ابھی آدھی بھی نہیں ہوئی تھیں لیکن اس نے دو نئی
ں شروع کروادی تھیں۔ ان میں ہیروئن ستارہ نہیں تھی۔ اس
ایک نئی ہیروئن کو سائن کیا تھا جس کی آج کل انڈسٹری میں
دھوم تھی۔ سبھی ڈائریکٹر، پروڈیوسر اس کی طرف لپک رہے
تھے۔

وہ چھوٹے قد اور معمولی شکل و صورت کی لڑکی تھی مگر ایک دھماکے کے ساتھ انڈسٹری میں وارد ہوئی تھی۔ ہوا اس کے ساتھ بھی وہی تھا جو انڈسٹری میں اکثر ہوتا ہے۔ یعنی پہلی فلم ہٹ ہوگئی تھی۔ اس کے بعد فلموں کی لائن لگ گئی تھی۔ ورنہ میں نے سنا تھا، اس سے پہلے وہ خود کہا کرتی تھی کہ اسے شاید کوئی ایکسٹرا کے طور پر بھی کاسٹ نہ کرے۔ میں نے اس کی وہ پہلی فلم نہیں دیکھی تھی جس نے اسے راتوں رات سپر اسٹار بنایا تھا۔ آفاق بتا رہا تھا کہ اس کے حق میں سب سے اچھی بات یہ رہی تھی کہ وہ اس کردار میں نگینے کی طرح فٹ ہوگئی تھی۔ فلم، باہر کی ایک فلم کا اردو ایڈیشن تھی۔ اس میں ہیروئن کا کم عمر نظر آنا ضروری تھا۔ اور ہماری کوئی ہیروئن کمسن نظر نہیں آتی تھی۔ نئی لڑکی کمسن نظر آتی تھی۔ فلم بلک کر گئی تھی۔

میں اس کے حق میں نہیں تھا کہ اکیلا آفاق دو فلمیں کرتے کرتے دو اور شروع کردے۔ لیکن میں نے اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اس لائن کا آدمی تھا اور میں نے اسے اس شعبے کا مختارِ کل بنادیا تھا۔ بُرے بھلے کا اب وہی ذمے دار تھا اس لئے میں کچھ نہیں بولا۔ اس کے اکاؤنٹ میں رقم ختم ہوچکی تھی۔ میں نے اسے دس لاکھ کا چیک کاٹ دیا۔

میں نے نئی فلموں کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا، کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ خود ہی گویا وضاحت کرتے ہوئے بولا "آپ شاید حیران ہوں گے کہ دو فلمیں ابھی آدھی بھی نہیں ہوئیں اور میں نے دو نئی شروع کردیں۔"

"نہیں، میں بالکل حیران نہیں ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تم ٹریڈ کے آدمی ہو۔ کچھ سوچ سمجھ کر ہی ایسا کیا ہوگا۔"

"ویسے تو ہر کاروبار میں یہی ہوتا ہے کہ ہوا کا رخ پہچان کر جس نے بروقت صحیح سمت میں صحیح قدم اٹھالیا وہ کما گیا۔ لیکن فلم انڈسٹری میں تو یہ اصول کچھ زیادہ ہی لاگو ہوتا ہے۔ اس وقت جو بھی اس لڑکی کو صحیح کہانی کے ساتھ سائن کرکے جلد از جلد فلمیں مارکیٹ میں پھینک دے گا وہ کما جائے گا۔ بساط تو آپ نے مجھے بچھادی ہے، اب میں کوشش کررہا ہوں کہ مہرے ٹھیک ٹھیک چلتا رہوں۔"

"کمائی کی مجھے اتنی زیادہ فکر نہیں ہے۔" میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ ہمارا ادارہ ایک بہت بڑا، مستحکم اور باعزت ادارہ شمار ہو۔ سپر اسٹارز بھی ہمارے لئے کام کرنے میں فخر محسوس کریں۔"

"سال ڈیڑھ سال میں آپ سی اے فلمز کو اسی مقام پر پائیں گے۔ اور میرا خیال ہے اتنا بڑا مقام حاصل کرنے کے لئے یہ عرصہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"میں تم سے متفق ہوں۔" میں نے کہا "سی اے فلمز، سی

سے مُراد چوہدری اور اُے سے مراد آفاق تھی۔ یہ ادارہ میرے بھولے بسرے خوابوں کی تسکین کا ایک ذریعہ تھا۔ لیکن اب یہ مجھے اتنا اہم نہیں لگتا تھا۔ یہ میں نے یونہی محض شغل کے طور پر اور کچھ آفاق کو اکومودیٹ کرنے کے لئے قائم کرلیا تھا۔ اگر یہ بھی خوب پھل پھول جاتا تو یہ میری خوش قسمتی کا ایک اور ثبوت ہوتا۔ جب قسمت آدمی پر مہربان ہو تو زیادہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر بھی کام سیدھے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے آفاق کو خدا حافظ کہا اور ہم اپنی اپنی گاڑی میں الگ الگ سمتوں میں روانہ ہوگئے۔ میرا دفتر واپس جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن ابھی میں دفتر سے کچھ دور ہی تھا کہ کار کے خفیہ ریڈیو پر سگنل موصول ہوا۔ میں نے خفیہ خانے سے ریڈیو کا ننھا سا مائک نکال کر کالر کے نیچے لگالیا اور ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بات کرنے لگا۔

دوسری طرف ٹونی تھا۔ اس نے اپنے مخصوص غنودگی زدہ سے لہجے میں اطلاع دی "پارسل دو نمبر پر پہنچ گیا ہے سر!"

"کیا؟" حیرت کا اظہار نہ کرنا میری عادت تھی لیکن اس وقت غیر ارادی طور پر لہجے میں کچھ حیرت جھلک ہی آئی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ ٹونی اور شبیر نے اتنی جلدی عالم شیر کو اٹھالیا تھا اور دو نمبر پر پہنچا دیا تھا۔ عالم شیر ان بے ضرر لوگوں میں سے نہیں تھا کہ جنہیں گھڑے کی مچھلی کی طرح جب جی چاہا ہاتھ ڈال کر اٹھالیا۔ اس قبیل کے آدمی کو اٹھانے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کرنا پڑتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ٹونی اور شبیر ابھی تو اسے تلاش ہی کررہے ہوں گے۔

"ٹونی! تم مذاق تو نہیں کررہے؟" میں نے کار کی رفتار بالکل کم کرتے ہوئے پوچھا۔

"سر! ماتا کہ ہمیں آپ سے مذاق کرنے کی بھی آزادی حاصل ہے لیکن ان معاملات میں مذاق کیسا۔" ٹونی بولا "یہ محض اتفاق ہی ہے کہ جونہی ہم نے اسے تلاش کیا وہی موقع مناسب ترین نظر آیا۔ ہم نے سوچ بچار میں وقت ضائع نہیں کیا۔ ہاتھ سیدھا پڑ گیا' کوئی خون خرابہ نہیں ہوا۔ بس ذرا گارڈز کی کھوپڑیاں تھوڑی سی چٹخانی پڑیں۔ بڑی خاموشی اور صفائی سے کام ہوگیا۔ میں نے سوچا' آپ کو فوراً ہی اطلاع دے دوں۔"

"بہت اچھا کیا تم نے... ویل ڈن... مجھے تم پر فخر ہے ٹونی!"

"تھینک یو سر! سو کائنڈ آف یو۔" وہ یقیناً اپنی کارکردگی کی داد پاکر خوش تھا۔

میں نے سلسلہ منقطع کردیا اور گاڑی واپس موڑلی۔ میں جب ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پر پہنچا تو عالم شیر تہ خانے میں موجود تھا۔ ابھی اس کی آنکھوں سے پٹی بھی نہیں کھولی گئی تھی۔ مس ٹریپ اس کے پاس کھڑی تھی۔ اسے اطلاع مل چکی تھی کہ میں وہاں پہنچنے والا ہوں' وہ میری ہی منتظر تھی۔

عالم شیر ایک لحیم شحیم' قد آور اور باریش آدمی تھا۔ اسے ہمیشہ نہایت نفیس اور بیش قیمت کپڑے کی شلوار قمیص میں دیکھا تھا۔ شلوار قمیص اور واسکٹ کے سوا وہ کبھی کچھ نہیں پہنتا تھا۔ پیروں میں نہایت شاندار اور چم چم کرتی پشاوری چپلیں ہوتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی حلیے میں تھا۔ بس ذرا لباس شکن آلود تھا۔ چپلوں پر تھوڑی سی گرد لگی ہوئی تھی اور بال بکھرے تھے۔ وہ لکڑی کی ایک غیر آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ پُرسکون نظر آنے کی پوری پوری کوشش کررہا تھا تاہم اس کا ایک پاؤں دھیرے دھیرے فرش پر کررہا تھا جو اس کے اندرونی اضطراب کا مظہر تھا۔

"ارہ... مس ٹریپ! مہمان کے ساتھ اتنا برا سلوک!" اس نے متاسفانہ انداز میں کہا "فوراً کھولو ان کے ہاتھ... اور آنکھوں سے پٹی بھی ہٹاؤ۔"

عالم شیر کی چوڑی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ شاید اس کی آواز تو پہچان گیا تھا لیکن پھر بھی کسی الجھن میں تھا۔ مس ٹریپ نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ آنکھوں سے پٹی ہٹتے ہی اس کی نظر سب سے پہلے مجھ پر پڑی اور وہ اچھل پڑا۔ عام حالات میں بھی اس کے چہرے سے خون چھلکتا محسوس ہوتا تھا لیکن اب تو یکدم ہی اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا۔

"وہ... تو یہ تم تھے!" وہ غرایا "کل کے لونڈوں کے حوصلے کتنے بلند ہوگئے' کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر۔"

"ورنہ تم جیسے استادوں کے کردار کتنے پست ہوگئے... یہ حیرت ہوتا ہے مجھے یہ دیکھ کر۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

اچانک اس کی نظر مس ٹریپ پر پڑی اور وہ گویا اپنا غصہ بھول گیا۔ مس ٹریپ اس وقت نیلی جینز اور سفید شرٹ میں ملبوس تھی ویسے تو وہ ہر حلیے میں ہی غضب کی عورت تھی لیکن بعض لباس میں تو وہ اپنے سانولے سلونے وجود کے ساتھ قیامت ڈھاتی تھی۔ عالم شیر نے سر سے پاؤں تک ایک ایک انچ کے حساب سے بھوکی نظروں سے اسے یوں گھورا جیسے کوئی ترسا ہوا شرابی ایک گھونٹ کرکے جام حلق سے اتار رہا ہو اور اس اندیشے میں مبتلا ہو کہ اس ایک جام کے سوا اسے کچھ نہیں ملے گا۔ مس ٹریپ جیسی عورت بھی ایک لمحے کے لئے کسمسا کر رہ گئی۔ وہ ان میں سے تھی جو فوراً نظر جما کر کسی کی طرف دیکھ لیتی ہیں تو پانی ہو جاتا ہے۔

"کچھ شرم کرو عالم شیر!" میں نے تنبیہہ کے لہجے میں کہا۔ "حاجی نمازی اور باریش آدمی ہو لیکن اس وقت تاثرات دیکھ کر مجھ جیسے گناہ گار کو شرم آرہی ہے۔"

"وہ چیزیں اپنی جگہ ہیں اور یہ چیز اپنی جگہ' مرد کو مرد تو رہنا ہی چاہئے نا۔" وہ مس ٹریپ پر سے نظر ہٹائے بغیر موٹے سرخ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

"یہ اچھا فلسفہ گھڑ رکھا ہے۔ اس کی آڑ میں تم نے ہر گناہ اپنے لئے جائز کر رکھا ہے۔ چھوڑو تو کچھ بھی نہیں ہے تم نے' اللہ کو دھوکا دے رہے ہو اور اس کے بندوں کو بھی۔" میں نے کہا۔

"فضول لیکچر مت دو۔" وہ گویا کان پر سے کوئی نادیدہ مکھی اڑاتے ہوئے بولا "اپنے معاملات کو میں خود بہتر سمجھتا ہوں۔ یہ سانولی قیامت ہے کون؟ اتنا عرصہ تم سے میل ملاقات رہی' کبھی آتا جاتا نہیں لیکن اس کے تو کبھی درشن ہی نہیں ہوئے تھے۔ کیا ہے تمہاری؟"

اب معاملہ گویا مس ٹریپ کی برداشت سے باہر ہوگیا' بجلی کے جھٹکے کی طرح اس کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ عالم شیر کے چہرے پر اتنے زور کا گھونسہ پڑا کہ ایک لمحے کے لئے مجھے اندیشہ محسوس ہوا' اس کے چہرے کی کوئی ہڈی نہ ٹوٹ گئی ہو۔ وہ ہوا میں کم از کم ایک فٹ اچھلا اور یوں چاروں خانے چت گرا جیسے کسی مشین نے طاقت کا بھاری ہتھوڑا ہر کم تا اچھال کر کچھ دور پھینک دیا ہو۔

وہ چت پڑا' آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے چھت کو تک رہا تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوگیا ہے۔ اس جیسے تن و توش کے آدمی کا یوں اچھل کر دور جا گرنا خود اس کے لئے بھی ناقابل فہم تھا۔ اس کے رخسار پر گوشت پھٹ چکا تھا اور خون بہہ بہہ کر اس کی گھنی داڑھی میں جذب ہورہا تھا۔ بہرحال آدمی بہت جاندار تھا' سر جھٹکتے ہوئے جلد ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

اس بار اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے گویا ایک نئے زاویۂ نگاہ سے مس ٹریپ کا جائزہ لیا۔ وہ گویا اس کے ہاتھ سے لگی ہوئی ضرب سے بھی لذت کشید کررہا تھا۔

"کلی ہو کلی!" وہ اب ایک ٹک اسے گھورتے ہوئے بڑبڑایا۔ "تمہاری نامہربانیاں کسی کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اور مہربانیاں کسی کو نہ جانے کیا سے کیا بنا دیتی ہوں گی۔ خلوت میں۔"

اس بار اس نے شاید کسی حد تک اندازہ کرلیا تھا کہ مس ٹریپ کس زاویے سے حملہ کرے گی اور کیا داؤ آزمائے گی۔ اس نے نہ صرف بچنے بلکہ مس ٹریپ کو قابو میں کرنے کی بھی کوشش کی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک طاقتور اور مضبوط آدمی تھا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ اگر مس ٹریپ اس کی گرفت میں آجائے تو وہ چڑیا کی طرح اسے درمیان سے توڑ کر رکھ دے گا لیکن ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔ یہ بھی محض عالم شیر کی خوش خیالی تھی کہ وہ مس ٹریپ کے داؤ پیچ کو سمجھ سکتا ہے۔ اس کے داؤ پیچ کو سمجھنے میں تو مجھے ایک عرصہ لگ گیا تھا۔ اور اس کی خاطر مجھے مختصر عرصے کے لئے اس کی شاگردی بھی کرنی پڑی تھی۔

بلاشبہ ایک نئے اسٹائل کی موجد تھی جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ اس نے مارشل آرٹس اور مشرقی داؤ پیچ کو ایک دوسرے میں مہارت سے مدغم کردیا تھا اور اس کے لئے اس بے مثال عورت نے کسی کی شاگردی نہیں کی تھی۔ یہ خالصتاً اس کی اپنی محنت اور ذہانت تھی۔ وہ اگر چاہتی تو اس گوشۂ گمنامی سے نکل کر بڑا نام بڑی دولت کما سکتی تھی لیکن وہ عجیب بے نیاز عورت تھی۔ اپنی اس محدود دنیا میں مگن تھی۔ اور جب سے وہ میرے ساتھ وابستہ ہوئی تھی تب سے تو بہت ہی مطمئن رہتی تھی۔ اب تو گویا دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز رہتی تھی۔

عالم شیر کسی بن مانس کی طرح مس ٹریپ پر جھپٹا تھا لیکن وہ نہ صرف اپنی جھونک میں آگے گرا بلکہ اس کی پیٹھ پر ایک ایسی لات بھی پڑی جس نے اسے ایک بہت بڑے گولے کی طرح لڑھکا دیا۔ وہ طویل و عریض تہ خانے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ ٹھنڈا پڑ جائے گا لیکن اس کا ردِ عمل میری توقع کے بالکل برعکس تھا۔ وہ تو گویا غصے سے پاگل ہوگیا' سچ مچ اپنے بال نوچنے لگا۔

اس کے منہ سے گندی گالیوں کا ایک سیلاب امنڈ پڑا۔ اس کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اس قسم کی گالیاں دیتا ہوگا۔ آج اس کی فطرت کا اصل رخ میرے سامنے آیا تھا۔

وہ اب باقاعدہ بن مانس ہی کی طرح دونوں بازو پھیلا کر غصے سے شوں شوں کرتا مس ٹریپ کی طرف بڑھا۔ اپنی دانست میں وہ مس ٹریپ کو ٹریپ کررہا تھا۔ اسے گھیر کر تہ خانے کے ایک کونے میں لے جارہا تھا۔ میرے اور میرے آدمیوں کے لئے اس قسم کے لوگوں سے نمٹنا زیادہ آسان ہوجاتا تھا جو غیظ و غضب سے اندھے ہوجاتے تھے اور جنہیں اپنی طاقت کا بہت زعم ہوتا تھا۔

لازوال کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی

کا ایک پراسرار ایڈونچر ناول

برہمچاری

قیمت:-/150 روپے

[illegible] القریشی

اردو بازار لاہور

میں اطمینان سے ایک کونے میں کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ میرے خیال میں عالم شیر کو اس قسم کی کچھ خوراک مل جانا ہی مناسب تھا۔ اس کے بعد مجھ سے مذاکرات کرنے کے لئے آدمی زیادہ مناسب حالت میں آجاتا تھا۔

مس ٹرپ بظاہر بالکل پُرسکون تھی لیکن اسے اس شخص پر یقیناً بہت غصہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں شیرنی کی سی چمک تھی اور اس کی نظر ایک ثانیے کے لئے بھی عالم شیر پر سے نہیں ہٹی تھی۔ عالم شیر نے اس بار دھوکے سے مس ٹرپ کو لات رسید کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا ہاتھی جیسا پاؤں دیوار سے ٹکرایا اور ساتھ ہی مس ٹرپ نے ایسی بے رحمی سے اس کی گردن پر چاپ رسید کی کہ مجھے اندیشہ محسوس ہوا' اس کی سانڈ جیسی گردن ٹوٹ نہ گئی ہو۔

وہ لہرایا اور کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہونے لگا۔ اس لمحے مس ٹرپ نے ایک اور کمال دکھایا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے ڈھائی تین من وزنی اس وحشت زدہ بن مانس نما انسان کو بالکل اس طرح اٹھالیا جیسے ویٹ لفٹر اٹھاتے ہیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ اسے فرش پر پٹخ چکی ہوتی' اگر میں بروقت نہ چیختا "جولی اسٹاپ۔"

غنیمت رہا کہ مجھے یہ دو الفاظ ادا کرنے کی مہلت مل گئی۔ اگر عالم شیر فرش پر پٹخا جاچکا ہوتا تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہوتا۔ عین ممکن تھا کہ کھوپڑی کئی جگہ سے چٹخ جاتی اور یہ بھی ممکن تھا کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ باقی ٹوٹ پھوٹ تو شاید قابل مرمت ہوتی لیکن ان دو چیزوں کی ٹوٹ پھوٹ کا علاج ذرا مشکل تھا اور میں نے اسے مذاکرات کے لئے اٹھوایا تھا' علاج معالجے کے لئے نہیں۔

جولی عرف مس ٹرپ نے بہ مشکل اپنی روانی کو کنٹرول کیا اور پٹخنے کے بجائے ذرا آہستگی سے عالم شیر کو فرش پر ڈال دیا لیکن یہ بھی کچھ دیر کے لئے اس کے حواس مختل کرنے کو کافی تھا۔ وہ وہیں پڑا رہا' اٹھ نہیں سکا۔

مس ٹرپ نے قدرے ندامت سے میری طرف دیکھا "آئی ایم سوری سر! مجھ سے کافی سنگین غلطی ہوئی۔ میں تو سمجھی تھی ہم لوگ اپنے اس قسم کے معاملات میں جذباتی ہونا بھول چکے ہیں لیکن لگتا ہے ابھی کچھ جراثیم باقی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں' انہیں باقی ہی رہنے دو۔" میں نے ملائمت سے کہا "میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم لوگ انسانوں کے بجائے روبوٹ بن جاؤ۔ مجھے روبوٹس کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ اپنا لباس درست کرنے لگی۔ میں نے عالم شیر کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور لکڑی کی بھاری بھرکم کرسی پر پٹخ دیا۔ اس کے کس بل نکل چکے تھے۔ وہ اب بالکل پُرسکون تھا بلکہ تھکا تھکا سا نظر آنے لگا تھا۔ وہ اپنی لمبی سی قمیص کے دامن سے اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں ہیرو بننے کی یہ کوشش مہنگی پڑے گی۔"

"تمہارا روئے سخن کسی اور طرف ہونا چاہئے۔" میں نے تصحیح کی "تمہیں مس ٹرپ سے کہنا چاہئے کہ تمہیں ہیروئن بننے کی کوشش مہنگی پڑے گی۔ میں نے تو تمہیں ایک ہاتھ بھی نہیں کیا۔ میں ذاتی طور پر اس انداز میں مذاکرات کی ابتدا نہیں کرتا لیکن تم جیسے لوگ مجھے یا میرے ساتھیوں کو مجبور کرتے ہیں۔"

"مذاکرات؟" وہ قدرے چونکا "کیسے مذاکرات؟"

"اوہ... اب مجھے ایجنڈا بھی پڑھ کر سنانا پڑے گا۔" میں قدرے بے زاری سے کہا "خیر... قصہ کچھ یوں ہے کہ بجائے تمہیں کسی بد اطوار قسم کے کیڑے کے کاٹا اور تم نے میں اپنے آدمیوں کو میرا سب سے عمدہ ٹرالر ڈبو دینے کا حکم دیا۔ کوشش تو ان کی یہی رہی ہوگی کہ ٹرالر تمام آدمیوں سمیت ڈوب جائے لیکن میرے آدمی اتفاق سے محض مچھیرے نہیں تھے۔ ایک آدمی ضرور ٹرالر کو بچانے کی کوشش میں ڈوب گیا لیکن دوسرے نہ صرف بچ گئے بلکہ انہوں نے تمہاری لانچ اور تمہیں بھی قابو میں کرلیا۔ لیکن وہ ایک معمولی قسم کی لانچ ہے۔ ٹرالر کا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔ اب تمہیں انتہائی شرافت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹرالر اور مال کی قیمت کے علاوہ والے ساتھی کے لئے تھوڑے سے زرِ تلافی کی ادائیگی کرنی تاکہ یہ ناگواری یہیں ختم ہوجائے' معاملہ زیادہ آگے نہ بڑھے۔"

"بہت خوب!" اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا لیکن میں سمجھ چکا تھا کہ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر تغیر سا آگیا تھا۔ "اور یہ ساری رقم ملا جلا کر کتنی ہوگی؟"

"بارہ لاکھ روپے ٹرالر اور مال کے' دس لاکھ روپے مقتول کی بیوہ اور بچوں کو دینے کے لئے۔" میں نے بلا تامل حساب لگا دیا۔ "انسانی جان کا کوئی مول نہیں ہوتا... اور جاں نثار ساتھی کے خلوص اور جاں نثاری کی تو کوئی قیمت ہی نہیں لگائی جاسکتی لیکن بے چاری بیوہ اور اس کے بچوں کے زندگی بھر کے کئی مسائل حل کرنے کے لئے میں دس لاکھ میں مزید کچھ رقم ان کے لئے کوئی سلسلہ سیٹ کردوں گا۔ ان کی زندگی آرام سے کٹ جائے گی۔ یعنی تمہیں کل بائیس لاکھ روپے کی ادائیگی کرنی ہوگی۔"

"ماشاء اللہ!" وہ زہریلے لہجے میں بولا "تمہارا شجرہ نسب حاتم طائی سے ملتا ہے۔ تم ٹرالر پر کام کرنے والے ایک آدمی کے مرنے پر دس لاکھ میں مزید کچھ رقم ڈال کر اس کے گھر بھجوا دو۔"

"ہاں۔ رقم خاصی کم ہے لیکن فی الحال اتنی ہی گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔ میں تمہیں زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "میرے بعض ساتھی تو ایسے ہیں جن کے بارے میں سوچتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہوجائے تو میں ان کے لواحقین کو مالی طور پر بھی کس طرح تلافی بہم پہنچانے کی کوشش کروں گا؟ جذباتی تلافی کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"اچھا... ٹھیک ہے۔ ہم پھر کبھی بیٹھ کر یہ حاتم طائی اسٹائل

میں کریں گے۔ فی الحال مجھے جانے دو۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارے اس سلوک کو بھول سکوں۔" وہ سچ مچ کپڑے جھاڑ کر اٹھنے لگا۔ مس ٹرپ نے کچھ اس طرح اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا کہ وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔ تاہم اب وہ مس ٹرپ کی طرف بالکل نہیں دیکھ رہا تھا۔

"دیکھو... انی! برخوردار" وہ گویا تحمل سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "اگر تم کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوکر میرے ساتھ یہ مذاق کر بیٹھے ہو تو میں تمہیں معاف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اب تم مجھے جانے دو۔"

"معاف تو میں بھی تمہیں کر ہی دوں گا۔" میں نے گویا بادل نخواستہ کہا "لیکن اس معاملے کا کم از کم مالی پہلو سے تو تصفیہ ہوجائے۔"

"کون سا معاملہ؟ تم کیا باتیں کررہے ہو؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔" وہ بے پناہ حیرت کی کامیاب اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

"تمہارا خیال ہے کہ میں جو وہ ٹرالر وغیرہ کی بات کررہا تھا تو دراصل کسی ایڈونچر اسٹوری سے اقتباس سنا رہا تھا؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

"میں تو یہ بھی نہیں سمجھ سکتا۔" وہ منہ بنا کر بولا "معلوم تو یہی ہورہا تھا کہ تم مجھے کوئی کہانی سنا رہے ہو لیکن مجھے اس کا کوئی سرا نہیں نظر آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کیا چیز میرے سر تھوپنے کی کوشش کررہے ہو! کیسے آدمی... کیسا ٹرالر...؟ مجھے کچھ نہیں معلوم' کراچی میں تمہارے کتنے ٹرالر کیا کرتے پھر رہے ہیں..."

"وہ صرف نشانہ کرتے پھر رہے ہیں۔" میں نے اس کی بات اچکتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔" وہ ہاتھ جھٹک کر بولا۔ "میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے کسی ٹرالر کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا۔ مجھے بالکل نہیں معلوم آج کل کراچی میں کیا ہورہا ہے۔ وہاں میری تمام سرگرمیاں بالکل بند پڑی ہیں۔ میرے آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔"

"شاید اسی لئے تم نے سوچا ہو کہ فرصت کے ان لمحات سے فائدہ اٹھایا جائے اور اپنے جذبۂ کینہ پروری کی تسکین کرلی جائے۔ یا پھر شاید تم نے سوچا ہو کہ مجھ جیسے برخورداروں کو اس قسم کا ڈوز دیتے رہنا چاہئے تاکہ وہ سرکشی اختیار نہ کرپائیں۔" میں نے کہا۔

"بخدا مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔" وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا "آخر تم اپنی ہی کیوں ہانکے جارہے ہو؟ میری بات کو کیوں کوئی اہمیت نہیں دے رہے؟"

میرے لہجے میں غیر ارادی طور پر سرد مہری آگئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "عالم شیر! جب تم جیسے گرگِ باراں دیدہ' دودھ پیتا بچہ بننے کی کوشش کرتے ہیں تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔ تم اپنا اور میرا قیمتی وقت ضائع کررہے ہو۔ اپنی جان ہلکان کررہے ہو اور صورت حال کو مشکل سے مشکل تر بنا رہے ہو۔ اپنے لئے مزید الجھنیں مول لے رہے ہو۔ مسئلے کو مختصر کرو۔ بائیس لاکھ کی ادائیگی کا بندوبست کرو اور اپنے گھر جاؤ۔"

"بہت خوب!" وہ ایک بار پھر طنزیہ سے لہجے میں بولا "بائیس لاکھ روپے کی فرمائش تو تم اس طرح کررہے ہو جیسے بائیس ٹکے ہیں جو میں تمہارے سامنے پھینکوں اور گھر چلا جاؤں۔ بغیر کسی معقول وجہ کے تو میں بائیس ٹکے بھی اس طرح نہیں پھینکتا۔ مانا کہ تم نے بے اندازہ دولت کمائی ہے لیکن پھر بھی روپے پیسے کو اتنا حقیر سمجھنا مت شروع کردو ورنہ جلد کنگال ہوجاؤ گے۔"

"تم میری فکر میں دُبلا ہونا چھوڑو۔" میں نے رُکھائی سے کہا۔ "میں کنگال رہوں یا ارب پتی' ہر حال میں زندگی گزار لوں گا۔ تم اصل بات کا جواب دو۔ تمہیں بائیس لاکھ کی ادائیگی کرنی ہے۔ جتنی جلد کردو گے اتنی جلدی گھر جاسکو گے۔"

"بھئی یہ تو اچھی زبردستی ہے۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ یہ تو تم نے بہت اچھا دھندا شروع کردیا۔ خوامخواہ برائے تاوان۔ کہیں یہ بھی تمہارا سائیڈ بزنس تو نہیں ہے؟ راہ چلتے آدمی کو اٹھوالیا اور بیس تیس لاکھ کا مطالبہ۔ پہلے کے سر پر داغ دیا۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔

"اگر تمہاری پہلے ہی اتنی پٹائی نہ ہوچکی ہوتی تو اس بات پر میں تمہارے منہ پر کم از کم ایک تھپڑ ضرور رسید کرتا۔ لیکن اس وقت مجھے اندیشہ ہے کہ تم میرا تھپڑ برداشت نہیں کرسکو گے۔ مر جاؤ گے اور میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم بائیس لاکھ کی ادائیگی کرنے سے پہلے مرجاؤ۔ میرے باریش چاند! یہ اغوا برائے تاوان نہیں' بہ زورِ بازو اپنے نقصان کی تلافی کرانے کا ایک طریقہ ہے۔ اب بار بار یہ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ تم اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتے۔ تم نے حماقت کی ہے۔ جرمانہ تمہارے سر پڑ چکا ہے۔ رقم دئے بغیر اب تمہاری جان نہیں چھوٹ سکتی۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

"کیا کرو گے تم؟" اس نے مجھے گھورا۔

"تم عالم شیر ہو۔ یعنی عالم کے شیر۔ میں تمہیں عالم کا سگ بنادوں گا۔ تمہارے گلے میں زنجیر ڈال کر اس ستون سے باندھ دوں گا۔ پھر تم ساری زندگی یہیں بندھے رہو گے اور یہ زندگی بہت مختصر ہوگی۔ صرف چند دن کی۔ اس لئے کہ تمہیں کھانے پینے کو کچھ نہیں ملے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں چھڑا کر نہیں لے جاسکے گی کیونکہ کوئی تمہارا سراغ ہی نہیں پاسکے گا۔ ادائیگی کئے بغیر اب یہاں سے تمہارا ڈھانچا ہی باہر جاسکے گا۔ اور دولت و جائیداد ڈھانچوں کے کسی کام نہیں آتی۔ بہت دولت کمائی ہے تم نے بھی' بائیس لاکھ روپے کے لئے کیوں زندگی داؤ پر لگا رہے ہو؟"

اب شاید اسے یقین سا آنے لگا کہ وہ واقعی بری طرح پھنس گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر اداکاری کی جو دھول اُڑ رہی تھی' دھیرے دھیرے بیٹھنے لگی۔ اب تک وہ بڑی کامیابی سے انجان بنا ہوا تھا مگر اب اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اس سارے واقعے سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ مگر آدمی ضدی اور خسیس تھا۔ مزید ایک کوشش سے باز نہ رہ سکا۔

مُربیانہ انداز میں گویا مجھے سمجھاتے ہوئے بولا "تمہیں ضرور کسی نے بھڑکایا ہے یا پھر واقعہ اس طرح پیش آیا ہے کہ تمہیں میرے بارے میں غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

"مجھ تک کوئی رپورٹ صرف اس وقت ہی پہنچتی ہے جب اس میں سے افواہوں اور غلط فہمیوں کی ساری ملاوٹ چھان پھٹک کر نکال لی جاتی ہے۔ وہ سو فیصد خالص حقیقت رہ جاتی ہے کیونکہ مجھے فیصلہ کن قدم اٹھانا ہوتا ہے۔ اور میرے ساتھیوں کو معلوم ہے کہ میں کچا قدم اٹھانا بالکل پسند نہیں کرتا۔" میں اب بھی اسے تحمل سے سمجھا رہا تھا۔

"اگر میں تمہاری دھونس دھاندلی سے مجبور ہو کر تمہارے الزام کو درست تسلیم کرلوں تب بھی بائیس لاکھ بہت بڑی رقم ہے۔ اس میں کمی ہونی چاہئے۔ بائیس لاکھ تو میں نے پچھلے پورے سال میں بھی نہیں کمایا۔ یہ سال بھی مندا ہی جاتا دکھائی دے رہا ہے۔"

"سودے بازی بالکل نہیں ہوگی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "میں تمہارے ہاتھ اسکریپ فروخت نہیں کر رہا ہوں جس کے ریٹ اوپر نیچے کرلئے جائیں۔ تم نے میرا ایک نقصان کیا ہے جس کی تمہیں تلافی کرنی ہے۔ اور بس۔ تم سے پرانے مراسم تھے اس لئے تمہاری اتنی بکواس سن لی۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کے ساتھ میں اتنا وقت ضائع نہ کرتا۔"

"اچھا۔ تو بائیس لاکھ لے کر تم مجھے چھوڑ دو گے؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"بالکل۔ میری تم سے کوئی دشمنی تھوڑی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم واقعی بہت اونچی چیز ہو گئے ہو۔" اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے بے خوف ہو گئے ہو۔ عام طور پر تو زیادہ روپیہ پیسہ آدمی کو بزدل بنا دیتا ہے۔ تمہیں اس کا بھی خوف نہیں کہ میں باہر جا کر کوئی جوابی کارروائی شروع کر سکتا ہوں۔"

"مثلاً....؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"مثلاً۔" وہ نظر چراتے ہوئے بولا "میں حکومت کو مخبری کر سکتا ہوں کہ تم درحقیقت کیا ہو.... تمہارا اصل کاروبار کیا ہے۔ میں مختلف ایجنسیوں کو تمہارے پیچھے لگا سکتا ہوں۔"

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ وہ پیشانی پر شکنیں لئے میری طرف دیکھتا رہا۔ شاید اسے حیرت ہو رہی تھی کہ میں اس کی دھمکی سے خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کے خیال میں یہ اقدام تھا۔

میری ہنسی تھمی تو میں نے کہا "عالم شیر! تم واقعی آدمی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہیں انتہائی احمق یا انتہائی شاطر۔ ایک لمحے میں تم بے پناہ شاطر معلوم ہو اور دوسرے ہی لمحے انتہائی احمق۔ میرے بارے میں اطلاعات بہت ہی پرانی ہیں۔ یا پھر تمہارا ذہن بس کسی اور دور میں ہی اٹکا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟" اس نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

"میں نے پہلے بھی باتوں باتوں میں کئی بار اشارتاً تمہیں لیکن شاید تمہاری ازلی کوڑھ مغزی کی وجہ سے بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "میرے ساتھ ایسی کوئی کمزوری وابستہ نہیں جس کا سہارا لے کر تم اس دھمکیوں سے مجھے بلیک میل کر سکو۔ میرے تمام کاروبار قانونی ہیں۔ تمام متعلقہ محکموں میں رجسٹرڈ ہیں۔ میں تمام اقسام کے ٹیکس باقاعدگی سے ادا کرتا ہوں۔ میرے تمام آڈٹ ہوتے ہیں۔ میرا تمام سرمایہ ڈاکو سیٹلیشن کے تحت گرین ہے۔ میرے بارے میں کسی محکمے میں کوئی ایسی فائل کھلی ہوئی ہے جس کے خوف سے مجھے راتوں کو نیند نہ آتی ہو۔ اور نہ کوئی فائل کھل سکتی ہے۔"

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے پلکیں جھپکا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ورم سا آنے لگا تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "وہ میرا نادانی کا ایک مختصر سا دور تھا جو تمہارے ذہن میں ہے۔ تمہیں یہ بھی یاد نہیں.... یا شاید معلوم نہیں کہ میں نے جلد اس دورِ گمراہی سے پیچھا چھڑا لیا تھا۔ میں نے اپنی اصل اپنے جائز کاروباروں سے تعمیر کی ہے۔ میں کسی قسم کے خوف سائے میں زندگی نہیں گزار رہا ہوں۔ تمام ایجنسیوں سربراہوں' تمام محکموں کے سیکریٹریوں اور اکثر اہم وزیروں ان کے دفاتر میں' ہوٹلوں میں اور تقریبات میں ملاقاتیں رہتی وہ مجھے بھی جانتے ہیں اور میرے کاروباروں کو بھی۔ سب سے اچھے مراسم ہیں۔ کبھی کسی نے اشارتاً بھی مجھے کوئی دھمکی دی۔ میں بہت حساب کتاب سے چل رہا ہوں عالم شیر! مجھے تھا کہ ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ میں قدم قدم پر میلنگ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔"

"اور تم گینگ وار سے بھی نہیں ڈرتے؟" عالم شیر نے عجیب لہجے میں پوچھا۔ "جو کچھ تم میرے ساتھ کر رہے ہو اس کے ہمارے درمیان ایک خوفناک گینگ وار بھی چھڑ سکتی ہے۔"

"گینگ تمہارا ہوگا۔ میرا کوئی گینگ نہیں ہے۔" میں نے صحیح کی "بہت سے شریف اور معزز لوگ میرے ساتھی ہیں۔ میرے لئے کام کرتے ہیں۔ بس جب کہیں سیدھی انگلیوں سے گھی نہ

وہ انگلیاں ذرا ٹیڑھی کرلیتے ہیں۔ ہمارا نظریۂ حیات یہ ہے کہ کے ساتھ زیادتی مت کرو اور اپنے ساتھ کوئی زیادتی ہونے دو۔ بس اتنی سی بات ہے۔ اگر تمہیں ایسا کوئی سلسلہ شروع نے کا شوق ہے جسے تم گینگ وار کا نام دے رہے ہو تو وہ بھی ۔ تمہارا یہ ارمان بھی نکل جائے گا۔ لاشیں اٹھاتے اٹھاتے جاؤ گے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا تمہیں کیسے سمجھاؤں!" وہ بے بسی سے عالم میں سر ہلاتے ہوئے بولا "تم نے اپنے لئے بہت ک راستے منتخب کرلئے ہیں۔ ان قلمی طور طریقوں کے ساتھ زندگی میں گزارا نہیں ہوتا برخوردار! اب بھی وقت ہے' تم اپنی وقوفانہ تکرار چھوڑ دو اور مجھے رہا کردو۔"

"تمہیں یہ طور طریقے قلمی نظر آرہے ہیں؟" میں نے اری سے کہا "قلمی طور طریقے اتنے ٹھنڈے بیٹھے نہیں ہوتے۔ میں زیادہ ایکشن ہوتا ہے۔ میں چاہتا تو تمہیں قلمی طور طریقوں زہ بھی چکھا دیتا۔ میرے آدمی تمہارے گھر پر بھی چڑھائی کرسکتے ۔ گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے تھے۔ تمہارے گارڈز کو ہلاک کتے تھے۔ تمہارے گھر میں موجود تمام نقدی اور زیورات وغیرہ ن کرا سکتے تھے۔ شاید مجھے میرے مطالبے سے زیادہ ہی مل جاتا۔ مگلوں کے گھر میں کافی نقدی اور زیورات وغیرہ پائے جاتے ۔ لیکن میں ایسے گھٹیا طور طریقے اختیار کرنا پسند نہیں کرتا۔ ں ایک معزز اور امن پسند آدمی ہوں۔ اکثر معاملات میز پر بیٹھ رطے کرنا پسند کرتا ہوں۔ بس بعض آدمیوں کو میز تک لانے کے ے تھوڑا سا شارٹ کٹ مارنا پڑتا ہے۔ تم سے بھی نہایت آرام و ون سے تمام معاملہ طے پا سکتا تھا۔ یہ جو تھوڑی سی تمہاری توڑ وڑ ہوئی ہے یہ تمہاری اپنی بدنظری اور بدکلامی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اور مذاکرات میں تاخیر بھی تمہاری ہی وجہ سے ہو رہی ہے۔ تم اتے تو نہایت باعزت طور پر میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے' مختصر تفتگو کرتے' ادائیگی کا طریقہ طے کرتے اور ادائیگی ہوتے ہی اپنے گھر چلے جاتے۔ کتنا آسان تھا یہ سب کچھ۔ تم نے اسے مشکل بنایا ہے۔" میں نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چند لمحے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ شاید سے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہی میرا نظریۂ حیات ہے' ہمارے طور طریقے یہی ہیں۔ بہرحال اسے غالباً یہ یقین آگیا تھا کہ ادائیگی اسے کرنی ہی پڑے گی۔ اور یہ اس کے لئے بلاشبہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ شاید اسے اپنے جسم پر لگنے والی اچھی بھلی خطرناک ضربات سے اتنی تکلیف نہیں پہنچی تھی جتنی اس موضوع کی طرف آتے ہوئے پہنچ رہی تھی۔ اس کے کندھے یکدم بالکل ڈھیلے ڈھالے انداز میں جھک گئے۔

"میں رقم کا بندوبست کیسے کروں؟" اس نے شکست خوردہ لہجے میں پوچھا۔

امریکہ رے امریکہ	طارق اسمٰعیل ساگر -/150
صہونیت اور عالم اسلام	طارق اسمٰعیل ساگر -/125
کورٹ مارشل	طارق اسمٰعیل ساگر -/200
آخری گناہ کی مہلت	طارق اسمٰعیل ساگر -/150

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور 2

مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ مس ٹرپ نے آواز دی۔ تہ خانے میں ایک طرف چند چھوٹے چھوٹے کمرے بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور بدرو اس طرح باہر آیا جیسے کوئی ہاتھی اپنے آپ کو سکیڑتا سمیٹتا ہوا کسی ڈربے سے برآمد ہوا ہو۔

بدرو کسی ہاتھی سے کم نہیں تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہاتھی کو دیکھ کر کوئی اتنا خوف زدہ نہیں ہو سکتا تھا جتنا بدرو کو دیکھ کر ہو جاتا تھا۔ وہ بلاشبہ فلموں میں کسی کیریکٹر کے بغیر ہی جن بھوت کا کردار نہایت آسانی سے ادا کر سکتا تھا اور ڈائریکٹر کو بے پناہ داد دلوا سکتا تھا۔

وہ افریقیوں کی طرح سیاہ فام تھا لیکن موٹے موٹے ہونٹ یوں سرخ رہتے تھے گویا ان پر لپ اسٹک لگی ہو اور ان ہونٹوں کے عقب سے جھانکنے والے بڑے بڑے دانت نہایت سفید اور آبدار تھے۔ یہ دانت اس کی سیاہ رنگت کے ساتھ جو قدرتی کنٹراسٹ پیش کرتے تھے' وہ کوئی بڑا میک اپ مین بھی بڑی مشکل سے پیدا کر سکتا تھا۔

اس کا قد تقریباً سات فٹ تھا۔ بازو اور ٹانگیں شہتیروں سے مشابہ تھیں۔ عام طور پر اس جسامت کے آدمی چلتے ہیں تو تھل تھل کرتے ہیں لیکن بدرو کا جسم فولاد کی طرح گٹھا ہوا تھا۔ اس کی چندیا روشنی میں جھلملاتی تھی۔ اس کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں اور دائیں رخسار پر آنکھ سے لے کر ٹھوڑی تک زخم کا گہرا نشان تھا جس نے آدھے چہرے کو گویا دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ وہ چلتا تھا تو زمین میں ہلکی سی دھمک محسوس ہوتی تھی۔ اسے اچانک دیکھ لینے والا تو اپنی چیخ کو مشکل سے ہی روک پاتا تھا۔

عالم شیر جیسا نڈر اور جماندیدہ آدمی بھی اسے دیکھ کر سہم کر رہ گیا کیونکہ بدرو مسکراتا ہوا سیدھا اس کی طرف آرہا تھا۔ اور بدرو کی مسکراہٹ تو بہت ہی غضب ڈھاتی تھی۔ موسم خواہ کچھ بھی ہوتا' بدرو سال کے بارہ مہینے اسی قسم کی ڈھلی ڈھالی نیکر پہنتا تھا جیسی پرانے زمانے میں سپاہی پہنتے تھے لیکن اس نیکر پر عام آدمی کے سوٹ سے زیادہ کپڑا لگتا تھا' تب یہ بدرو کے لئے ڈھیلی ڈھالی اور بقول اس کے آرام دہ رہتی تھی۔ اگر کوئی ہاتھی تھوڑی سی بے

آرامی برداشت کرنا پسند کرتا تو وہ بھی اسے زیب تن کر سکتا تھا۔

بدرو اپنے بچلے نما ہاتھ پر ایک ٹیلی فون سیٹ اٹھائے ہوئے تھا جس کی تار پیچھے گھسٹتی آرہی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے عالم شیر کے سامنے رکا تو عالم شیر کرسی سمیت الٹتے الٹتے بچا۔ بدرو نے کچھ بولے بغیر بدستور مسکراتے ہوئے ٹیلی فون عالم شیر کی گود میں رکھ دیا۔

"بہت اچھے وقت پر تم نے معقولیت سے کام لینے کا فیصلہ کرلیا۔" میں نے عالم شیر سے کہا "ورنہ تمہاری ضد سے تنگ آکر اب میں تمہیں اس کے حوالے کرنے کا سوچ رہا تھا۔" میں نے بدرو کی طرف اشارہ کیا اور عالم شیر تھوک نگل کر رہ گیا۔ غالباً اسے خود بھی اپنے فیصلے پر خوشی ہوئی تھی۔ بدرو فوراً ہی کمرے میں واپس چلا گیا' تب عالم شیر کی جان میں جان آئی۔

"مجھے کیا کرنا ہے؟" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"فون کرو۔" میں نے اس کی گود میں رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کی طرف اشارہ کیا "کسی بھی ایسے آدمی کو جو تمہاری ہدایت پر بائیس لاکھ روپے کیش کا انتظام کرسکتا ہو۔ اس سے کہو رقم کل شام تک اپنے پاس تیار رکھے۔ کل اسے بتایا جائے گا کہ رقم کب اور کہاں کوئی اس سے وصول کرنے آئے گا۔"

ایک لمحے کے توقف سے میں نے ہدایت کی "کوئی فالتو بات مت کرنا۔ سمجھدار آدمی ہو۔ فی الحال یہ صرف روپے پیسے کا معاملہ ہے۔ اسے زندگی اور موت کی بازی مت بنانا۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پیشانی سہلاتے ہوئے چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ مجھے اس کی طرف سے تشویش نہیں تھی۔ مس ٹریپ اس کے سر پر کھڑی تھی۔ اس کی نظر اس کی انگلیوں پر اور کان یقیناً اس کی آواز پر تھے۔

عالم شیر نے نہایت شرافت سے فون کیا۔ بات اب اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کا مطلوبہ آدمی پہلے نمبر پر نہیں ملا تھا۔ اس نے ایک اور جگہ فون کیا تو وہ مل گیا۔ اس نے اپنی خیریت کی اطلاع دی' رقم کا انتظام کرنے کے لئے کہا اور کوئی غیر ضروری بات کئے بغیر خود ہی سلسلہ منقطع کردیا۔

"اب تم ہمارے مہمان ہو۔ اب تمہارے ساتھ باعزت سلوک ہوگا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور مس ٹریپ کو ایک طرف لے جاکر اس کے بارے میں ہدایات دیں اور کہا "رقم وصول کرنے کا معاملہ اب میں ٹونی کے سپرد کردوں گا۔ وہ خود ہی سارے انتظامات کرلے گا۔" اس نے تفہیمی انداز میں سرہلایا اور میں تہ خانے سے نکل آیا۔

دوسرے روز دوپہر کے قریب ہی ٹونی ایک بریف کیس اٹھائے میرے آفس میں پہنچا۔ نہایت سرسری سے لہجے میں اس نے مجھے اطلاع دی "رقم وصول ہوگئی ہے سر!"

"گڈ" میں نے چند کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے کہا "کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟"

"بالکل نہیں سر!" ٹونی نے جواب دیا "میں نے رقم والے کو پہلے ایک جگہ پہنچنے کی ہدایت کی۔ پھر فون پر اسے جگہ پہنچنے کا حکم دیا۔ پھر تیسری جگہ کھلے میدان میں بلایا۔ دوران میں نے اس پر نظر رکھی۔ اس کے ساتھ کوئی سادہ لباس یا کوئی مشکوک آدمی نہیں تھا۔ نہایت پرسکون انداز میں میں نے اس سے رقم وصول کرلی۔ اس نے ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کیا تھا۔ وہ عالم شیر کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس کے تمام کاروبار میں شریک ہے۔"

"کچھ پوچھا تو نہیں اس نے؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہ کافی خوف زدہ نظر آرہا تھا سر!" ٹونی نے جواب دیا "دیتے وقت اس نے صرف اتنا پوچھا کہ حاجی صاحب کو کب چھوڑ دیا جائے گا۔"

"تم نے کیا جواب دیا؟"

"یہی کہ رقم چیک ہونے کے صرف ایک یا دو گھنٹے بعد انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ رقم میں نے چیک کرلی ہے۔ پوری ہے۔ نوٹ بھی اصلی ہیں۔" ٹونی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے فائل سے نظر ہٹائے بغیر کہا "یہ جنرل منیجر کو دے دو اور بتادو کہ یہ کراچی ٹرانسفر ہوگی۔ تم دو نمبر جاؤ اور حاجی صاحب کو صحیح طریقے سے کسی مناسب جگہ پر پہنچا دو۔ آدمی سخت کینہ پرور ہے۔ اس کی طرف سے آئندہ بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوگی۔"

"میں کچھ عرصے کے لئے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں جو اس پر نظر رکھے گا۔" ٹونی نے جواب دیا۔

"خیر۔۔۔ اب اتنے بھی تردد کی ضرورت نہیں۔ اللہ مالک ہے۔" میں نے درویشانہ لہجے میں کہا "اگر اس نے آئندہ کوئی بدمعاشی کی تو اسے زیادہ سخت سزا دیں گے۔"

"ٹونی رخصت ہوگیا تو میں نے شفیع شاہ کو کراچی فون کیا اور ہدایت کی "عالم شیر کے آدمیوں اور لالچ کو چھوڑ دو۔ ارشد بھائی کے گھر دس لاکھ روپے پہنچا دو اور آئندہ بھی اس کی بیوہ اور بچوں کی خبر رکھنا۔ انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ جرمانہ وصول ہوگیا ہے۔ تم چاہو تو نے ٹرالر کا آڈر بھی دے سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے سر!" شفیع شاہ نے جواب دیا "آپ سے دو تین بہت ضروری باتیں کرنا تھیں۔ باتیں بہت اہم اور تفصیل طلب ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ لاہور کا ایک چکر ہی لگالوں۔ لیکن کام اتنے پھیلے ہوئے ہیں کہ ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں مل رہی۔"

"مختصراً فون پر ہی کرلو وہ باتیں۔" میں نے کہا "تفصیلات بعد میں بیٹھ کر طے کرلیں گے۔"

"سر! ایک تو ہوٹل کے بارے میں پوچھنا ہے۔ ہوٹل کے سب کام مکمل ہوچکے ہیں۔ اسٹاف تک رکھ لیا گیا ہے۔ اگلے ہفتے

اس کی تشہیری مہم شروع ہورہی ہے۔ اس کی اوپننگ کا پروگرام طے کرنا تھا۔" شفیع شاہ بولا "جس ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے ذمے ہماری پبلسٹی کیمپین ہے' افتتاح کی تقریب کے انتظامات کا ٹھیکا بھی اسی کو دے رہا ہوں۔ اس سلسلے میں اگر آپ کی کچھ خاص ہدایات ہوں۔۔۔"

"بھئی مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "ایسے کام تم مجھ سے بہتر طور پر آرگنائز کرلیتے ہو۔ جس طرح دل چاہے کرتے رہو۔ بس اوپننگ کی تاریخ طے کرکے مجھے اطلاع دے دینا۔ میں اس کے مطابق اپنا شیڈول بنالوں گا۔ بس میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اوپننگ ہو تو شہر میں دھوم مچ جائے۔ ہر شعبۂ زندگی کے مشہور ترین لوگ اس روز ڈنر میں موجود ہونے چاہئیں۔ ملک کے سب سے اونچے طبقے کے سب سے اونچے افراد کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے تمہیں جو بھی طریقہ اختیار کرنا پڑے کرو۔ جس کی بھی خدمات حاصل کرنی پڑیں کرو۔ روپیہ پانی کی طرح بہاؤ' کسی بات کی پروا مت کرو۔"

"روپیہ تو پانی کی طرح بہہ ہی رہا ہے سر!" شفیع شاہ بولا "ہوٹل کی دھوم تو شہر میں اس کے افتتاح سے پہلے ہی مچ چکی ہے۔ افتتاح کی تقریب کو بھی میں آپ کے خیالات کے عین مطابق بنانے کی کوشش کروں گا۔ اس پر کام تو شروع ہوچکا ہے۔ ہر بڑے شہر میں' ہر شعبۂ زندگی کی اہم ترین شخصیات سے رابطہ قائم کیا جارہا ہے۔ ایڈورٹائزنگ ایجنسی نے اس سلسلے میں مختلف کاموں کے لئے تھوڑے تھوڑے آدمیوں کی کئی کیٹیاں بنادی ہیں۔ فائنل رپورٹ تیار ہوتے ہی میں آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ جب آپ اس کی منظوری دے دیں گے تو صرف تاریخ طے کرنے کا کام رہ جائے گا۔ اس میں بہت اعلیٰ درجے کے ایک ورائٹی پروگرام کی تیاریاں بھی ہورہی ہیں جو ہم اپنے ہوٹل کے آڈیٹوریم میں پیش کریں گے۔ افتتاح کی تقریب پوری رات چلے گی۔ اگر پروگرام زیادہ پھیلا تو ہم ان تقریبات کو دو یا تین راتوں تک لے جائیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے تائید کی "یہ سب کچھ تمہیں ہی کرنا ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ بڑے پروجیکٹس میں عموماً مالکان بے چارے تو پس منظر میں ہی رہتے ہیں۔ ان کا کام تو روپیہ فراہم کرنا ہوتا ہے۔ بے شمار لوگ کام کرتے رہتے ہیں۔ تم بھی جتنے لوگوں کی چاہو خدمات حاصل کرو۔ بس ان کو گمان کرنا تمہارا کام ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم وہاں موجود ہو تو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ دوسرا کیا مسئلہ ہے؟"

"کل سیٹھ واحد نے مجھے اپنی کوٹھی پر ایک پرائیویٹ ڈنر پر بلایا تھا۔ بہت طویل گفتگو رہی اس سے۔" شفیع شاہ بولا "وہ کہہ رہا تھا' تم لوگوں کے پاس اتنی منی پاور ہے' اتنا روپیہ ہے۔ پھر یہ تم نے بڑے اور صاف ستھرے کاروباروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے اور گندے گندے کاروبار کیوں شروع کررکھے ہیں۔۔۔"

"کون سے کاروباروں کو چھوٹا اور گندا کہہ رہا تھا وہ؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا اشارہ ٹرالروں کے ذریعے ماہی گیری کے کاروبار کی طرف تھا۔" شفیع شاہ نے جواب دیا۔

"گدھا ہے وہ۔" میں نے کہا "اسے تو ہر شریفانہ کاروبار چھوٹا اور گندا نظر آتا ہے۔ یہی ٹرالر اگر آس پاس کے ملکوں سے دھڑا دھڑ مال اسمگل کررہے ہوتے تو وہ ان میں بڑی دلچسپی لیتا۔ اس نے اسی قسم کے کسی کام کی پیشکش تو نہیں کی؟"

"نہیں سر!" شفیع شاہ بولا "وہ سچ مچ بڑے کاروباروں کی بات کررہا تھا۔ اس نے مجھے حامد مصطفیٰ سے ملوایا۔ وہ بہت ہی خاص ڈنر تھا۔ اس میں صرف چار آدمی ہی مدعو تھے۔ مہمانِ خصوصی حامد مصطفیٰ ہی تھا۔ آپ اسے جانتے ہیں نا سر؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"کیوں نہیں۔ گو کہ وہ یہاں' یعنی اپنے ملک میں کم ہی جانا پہچانا جاتا ہے لیکن میں بہرحال اسے جانتا ہوں۔ لندن میں ایک بار اس سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ بہت بڑی شپنگ کمپنی ہے اس کی۔ غالباً چار سو بحری جہاز ہیں اس کے پاس۔ لیکن پاکستانی ہونے کے باوجود اس نے اپنی کمپنی اٹلی میں قائم کی تھی اور وہیں اس کا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا ہے۔ وہ یہاں کے نظام' بیوروکریسی اور اس قسم کی دوسری

مہاراجہ رنجیت سنگھ

اور ان کی عیاشیاں

★---- پروفیسر ایم اشرف

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے متعلق تحریر کی گئی ایک مکمل حوالہ جاتی کتاب جو قاری کے لئے دلچسپی کا باعث بنے گی۔

قیمت: -/75 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

چیزوں سے بہت بے زار تھا۔ اس نے یہاں پاؤں جمانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ آغاز ہی باہر سے کیا تھا۔"

"بالکل ٹھیک ہے سر! یہ وہی آدمی ہے۔" شفیع شاہ بولا "اس کے پاس چار سو نہیں پانچ سو بحری جہاز ہیں۔ ایک ائرلائن میں بھی اس کے شیئرز ہیں۔ ریئل اسٹیٹ کی اس کی ایک بین الاقوامی ایجنسی ہے جو دنیا کے مہنگے ترین مقامات پر جائیداد کی خرید و فروخت کا کام کرتی ہے۔ معزول اور برسرِ اقتدار' ہر طرح کے بادشاہ' شیوخ اور دنیا کے امیر ترین افراد اس ایجنسی کے توسط سے محلات' حویلیاں اور ولاز خریدتے ہیں لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس ایجنسی کے پیچھے اصل شخصیت کون ہے۔ اس کاروبار میں دنیا کا ایک بہت مشہور بینکر اس کا پارٹنر ہے۔ اور بھی بہت سے کاروبار ہیں ان کے۔"

"بہت خوب! یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ باتیں بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں سر!" شفیع شاہ بولا "اس نے گویا کمال مہربانی سے ہمیں اپنے دوستوں میں شمار کرتے ہوئے اور بھی کئی باتیں بڑے خوشگوار موڈ میں مجھے بتائیں۔ دنیا کی کئی بڑی مشہور اداکارائیں جائیداد کے کام میں اس کی مدد کرتی ہیں اور اس سے کمیشن لیتی ہیں۔ وہ تھوڑے عرصے کے لئے کوئی جائیداد خرید لیتی ہیں۔ بعد میں چھوڑ دیتی ہیں لیکن اس کی ویلیو بڑھ جاتی ہے۔ بات بن جاتی ہے۔ مثلاً یہ وہ کیسل ہے جس میں الزبتھ ٹیلر رہتی تھی۔ یا یہ وہ حویلی ہے جسے ایوا گارڈنر نے اپنا بڑھاپا گزارنے کے لئے خریدا تھا۔ ایجنسی اس کے علاوہ بھی کئی طرح کے تشہیری حربے استعمال کرتی ہے جس سے جائیداد کی قیمت میں لاکھوں ڈالر کا اضافہ ہو جاتا ہے۔"

"کون کہتا ہے کہ پاکستانی لوگ بین الاقوامی سطح پر کاروبار کرنا نہیں جانتے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "انہیں اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ملے تو یہ دنیا کے کان کتر دیں۔ خیر یہ بتاؤ کہ وہ ہم پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا ہے؟"

"میرا اپنا اندازہ ہے سر۔" شفیع شاہ محتاط سے انداز میں بولا۔ "کہ پاکستانی دنیا میں کہیں بھی چلا جائے' کتنا ہی بڑا آدمی بن جائے' اسے اپنے ملک سے اور یہاں کے نظام سے خواہ کتنی ہی شکایتیں ہوں لیکن اس کا دل یہاں ضرور اٹکا رہتا ہے۔ حامد مصطفیٰ کو بھی اب یہاں حالات ذرا سازگار نظر آ رہے ہیں تو وہ یہاں بھی پاؤں پھیلانا چاہتا ہے۔ وہ کسی ایسی پارٹی کو ساتھ ملانا چاہتا ہے جس کے پاس صرف روپیہ اور ساکھ ہی نہیں بلکہ بہت سی جرأت بھی ہو۔ جو ہر سیدھے یا ٹیڑھے طریقے سے اپنا کام کرا لینا جانتے ہوں' جن کا کوئی کام اٹکتا نہ ہو' جنہیں کوئی تنگ کرنے کی جرأت نہ کرتا ہو۔"

"شفیع! ہماری شہرت کیا بیرون ملک بھی پہنچنے لگی ہے؟" میں نے حیرت سے کہا "ٹھیک ہے کہ ہم بڑی پارٹیوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن اتنی بڑی پارٹی بھی نہیں ہیں۔ اس ملک میں بڑی بڑی چیزیں پڑی ہیں۔"

"میں نے جو اندازے قائم کئے ہیں سر۔" شفیع بولا "ان سے ایک یہ بھی ہے کہ ہماری سفارش سیٹھ واحد نے کی۔ آپ کی اصول پسندی اور دوسرے طور طریقوں وغیرہ سے متاثر ہے۔ وہی آپ کو زیادہ بہتر طور پر جانتا بھی ہے۔ وہ اس سے بہت زیادہ حیران بھی ہے کہ آپ نے کم سے کم عرصے میں سے زیادہ ترقی کرنے کا ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔"

"شفیع ڈیئر! میں اس میں اپنا کوئی خاص کمال محسوس کرتا۔ مجھے تو بس ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کچھ خود بخود ہوتا چلا ہے۔ اب تم یہی دیکھ لو کہ حامد مصطفیٰ کو ہم نے اپروچ نہیں کیا' نے ہمیں اپروچ کیا ہے۔ بڑا آدمی چل کر چھوٹے آدمیوں کے آ رہا ہے۔" میں نے کہا "بس اسی طرح میرے اکثر کام خود ہوتے چلے گئے ہیں۔ میں نے ان کے لئے دن رات ایک نہیں کیا۔ میں نے اگر شدید محنت کی ہے تو وہ صرف اپنی زندگی ابتدائی دور میں کی ہے۔"

"یہ آپ کی انکساری ہے سر!" شفیع بولا "ہم تو آج بھی دن رات کے کسی بھی لمحے میں آپ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں آپ کو مستعد و بیدار پاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ ہر وقت جگہ ہماری پشت پناہی کے لئے موجود ہوتے ہیں۔ کبھی آرام نہیں کرتے اور گویا کبھی سوتے بھی نہیں۔ آپ کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے ہمیں کبھی لاہور اور کراچی کے درمیان فاصلے کا احساس نہیں ہوا۔"

"یہ تو تمہاری محبت ہے کہ تم لوگ ایسا محسوس کرتے ہو۔ میری آنکھیں اور میرا دماغ تو دراصل تم لوگ ہو جو ہر وقت بیدار رہتا ہے۔" میں نے خلوصِ دل سے کہا "ورنہ میں تو آرام بھی کرتا ہوں۔ زندگی کی ہر تفریح' ہر آسائش سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ میں نے کاروبار اور اس کے تفکرات کو کبھی اپنے سر پر سوار نہیں ہونے دیا۔ میں کاروباری مسائل سے نمٹتا ضرور ہوں لیکن ان کی فکر میں ہلکان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں پچھلے کئی سال سے رسمی چیک اپ کے لئے بھی ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا۔ خیر' ان باتوں کو چھوڑو' یہ بتاؤ کہ حامد مصطفیٰ نے کھل کر کوئی بات کی؟"

"اصل باتیں تو وہ آپ سے ہی کرے گا سر!" شفیع بولا۔ "میرے ذریعے تو اس نے صرف تمہید باندھی ہے۔ صبح وہ دوبارہ واپس جا رہا ہے۔ کچھ عرصے بعد زیادہ وقت کے لئے آئے گا۔ میرا خیال ہے تب وہ آپ سے ملاقات طے کرے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ اسے ہوٹل کے افتتاح پر بھی مدعو کروں اور وہ واقعی آ سکے۔ شاید تبھی باتیں ہو جائیں۔ ویسے وہ بہت ہنگامہ خیز دن ہو گا۔ شاید اس قسم کے مذاکرات کے لیے وقت نہ نکل سکے۔"

"مجھے اگر کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو میں اس کے لئے ضرور وقت

لیتا ہوں۔ کوئی کام کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو تو بات دوسری ہے۔" میں نے کہا "یہ بتاؤ تمہیں وہ کیسا آدمی لگا؟"

"آدمی معقول ہے سر!" شفیع شاہ نے رائے دی۔ میں اس کی رائے اور جامع رائے کا مطلب سمجھتا تھا۔ یعنی وہ حامد مصطفیٰ کے کسی قسم کا اشتراک کرنے کے حق میں تھا۔

"اگر تمہاری رائے اس کے بارے میں اچھی ہے تو پھر اس کے ساتھ مل کر کام کرنے کے بارے میں ضرور کچھ سوچیں گے۔" میں نے کہا "ویسے سیٹھ واحد خود اس کے ساتھ کسی قسم کی پارٹنر شپ کیوں نہیں کر رہا؟ سیٹھ واحد ہم سے چھوٹی پارٹی تو نہیں ہے۔"

"میں ایک بار پھر اپنے اندازوں ہی کی بات کروں گا۔" شفیع ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"تم بلا جھجک اپنے اندازے سے بات کرو۔ مجھے معلوم ہے' ان کے معاملات میں تمہارے اندازے ہی درحقیقت بہترین رہنما ثابت ہوتے ہیں۔ وہ اندازے نہیں' ننانوے فیصد حقائق ہی ہوتے ہیں۔ تم محض ازراہِ انکساری انہیں اندازے کہتے ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اور یہ حقیقت تھی۔ کراچی میں ہمارے کاروباروں کو سنبھالنے کے سلسلے میں شفیع شاہ درست ترین رائے ثابت ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے سیٹھ واحد کی تو حامد مصطفیٰ کے ساتھ ملنے کی دلی خواہش تھی لیکن حامد مصطفیٰ ہی اس سلسلے میں کنی کترا گیا۔ اور میرے اندازے کے مطابق اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ سیٹھ واحد کا یہاں ساکھ کچھ اچھی نہیں ہے۔ حامد مصطفیٰ ایسے کسی آدمی سے بے پردہ تو تعارف کا طلب گار ہو سکتا ہے لیکن اس سے کوئی باضابطہ قسم کی پارٹنر شپ کرنا مصلحت کے خلاف سمجھتا ہے۔ حالانکہ ویسے میرے اندازے کے مطابق سیٹھ واحد کرنسی وغیرہ کے معاملے میں حامد مصطفیٰ کی مدد کرتا رہتا ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے بزنس مین کو بھی اس زمانے کی تمام تر سہولتوں کے باوجود کسی وقت بھی' دنیا کے کسی بھی حصے میں کرنسی کا کوئی مسئلہ پیش آ سکتا ہے اور سیٹھ واحد یہاں بیٹھے بیٹھے چٹکی بجاتے میں اس کا مسئلہ حل کر سکتا ہے۔ کرنسی اس کی خصوصی فیلڈ ہے۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" میں نے کہا "خود میری بھی اس نے ایک مرتبہ مدد کی تھی۔ اور بغیر کسی منافع یا لالچ کے کی تھی۔ ہانگ کانگ میں اس نے ایک پارٹی کو دو ملین ڈالر فراہم کئے تھے لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ میری مدد کر رہا ہے۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ ایک وزیر کی مدد کر رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہم پر براہِ راست مہربان نہیں۔ میرے ساتھ اس کا سلوک شروع سے اچھا رہا ہے۔ بلکہ جب ہم اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے تب مجھ سے اس کے معاملے میں دو ایک سنگین غلطیاں بھی ہوئیں لیکن اس نے بڑی فراخدلی سے ہمیں معاف کر دیا۔"

"مجھے یاد ہیں وہ سب باتیں سر!" شفیع شاہ بولا "اس وقت ہم لوگ بہت کم عمر اور اناڑی تھے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہم پر مہربان ہے۔ مہربان نہ ہوتا تو حامد مصطفیٰ سے ہمارا معاملہ کرانے میں یوں پیش پیش نہ رہتا۔"

"اور کون سے مسائل تھے جن کے بارے میں تم بات کرنا چاہ رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"بس ... اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔ باقی مسائل کے بارے میں' میں خود ہی فیصلہ کر لوں گا۔ میں نے آپ کا کافی وقت لے لیا ہے۔" شفیع بولا "شاید مجھے جلد کراچی سے لاہور کے درمیان شٹل کاک بننا پڑے۔ لگتا ہے' بہت سے کاموں کے سلسلے میں بہت آنا جانا رہے گا۔"

"میں بھی تم سے ملاقات کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے کہا "بزنس کے علاوہ بھی کچھ معاملات میں مشورے کرنے ہیں۔ اگر تم جلد نہ آ سکے تو شاید مجھے ہی کراچی کا چکر لگانا پڑے۔"

"کوئی خاص مسئلہ ہے تو ابھی حکم دے دیجئے سر!" وہ فوراً بولا۔

"نہیں۔ وہ فون پر کرنے والی باتیں نہیں ہیں۔ فون پر جتنی باتیں کر لی ہیں وہی کافی ہیں۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ سر!" اس نے کہا اور میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسی شام مجھے ملتان روڈ پر آٹھ دس میل آگے ایک جگہ زمین دیکھنے جانا تھا۔ میری کمپنی کے مالی مشیروں نے کمپنی کو چند ہزار ایکڑ یہ زمین خریدنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ کسی زوال پذیر زمیندار کی زمین تھی۔ کسی زمانے میں زرعی تھی۔ اب بنجر ہو چکی تھی اور بہت سستی مل رہی تھی۔

فی الحال اس کا کوئی استعمال نظر نہیں آ رہا تھا لیکن مشیروں کا کہنا تھا کہ کچھ ہی عرصے میں اس کے بہت سے استعمال نکل آئیں گے۔ اس پر کوئی ہاؤسنگ اسکیم بھی بن سکے گی' کوئی انڈسٹری بھی لگائی جا سکے گی یا فارمنگ کی جا سکے گی۔ اس دوران آہستہ آہستہ اس کے نقائص دور کرنے اور اس کو ڈیولپ کرنے کا کام بھی مکمل ہو جائے گا۔

کمپنی تمام معاملات طے کر چکی تھی۔ آج مجھے صرف ایک نظر زمین کو دیکھنے اور ایک طرح سے سودے کی حتمی منظوری دینے کے لئے جانا تھا۔ زمیندار کا نام افضال شاہ تھا اور اس سے میری ملاقات زمین پر ہی طے پائی تھی۔ نقشہ وغیرہ میں نے دیکھ لیا تھا' نشانیاں سمجھ لی تھیں۔ میرا ارادہ تھا کہ تنہا ہی جا کر ایک نظر دیکھ آؤں گا۔ زیادہ دیر کا کام نہیں تھا۔ رات کو مجھے چیمبر آف کامرس کے ایک ڈنر میں شرکت کرنی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ وہاں سے واپسی پر سیدھا ہوٹل ہی چلا جاؤں گا۔

آفس سے اٹھ کر میں اس کام کے لئے روانہ ہو گیا۔ ٹونی اور شبیر شیخ شاید ابھی عالم شیر کو محفوظ طریقے سے واپس پہنچانے کے

مشن سے فارغ نہیں ہوئے تھے لیکن میری نگرانی کے کام سے غافل نہیں ہوئے تھے۔ وہ سردار اور حنیف کی ڈیوٹی لگا گئے تھے۔ سفید گاڑی بدستور میرے تعاقب میں تھی۔ میں طوفانی رفتار سے روانہ ہوا۔ میرے پاس وقت زیادہ نہیں تھا اور مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ زمیندار جو میری اطلاعات کے مطابق خاصا شریف آدمی تھا، سڑک کے کنارے اپنی جیپ میں میرا انتظار کر رہا ہوگا۔

اسٹوڈیوز کا سلسلہ بھی بہت پیچھے چھوڑنے کے بعد ویران ہائی وے پر کئی میل کا فاصلہ میری طاقتور اور بھاری بھرکم مرسیڈیز نے گویا لمحوں میں طے کرلیا۔ مطلوبہ لوکیشن پر پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اندازاً اس جگہ کے قریب پہنچنے پر میں نے رفتار کم کی۔ دور ہی سے میں نے سڑک کے کنارے نشیب میں ایک کھلی جیپ کھڑی دیکھ لی تھی جس کے قریب تین دیہاتی قسم کے بندوق بردار کھڑے آنکھیں سکیڑے خنجر نگاہوں سے سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نے گاڑی، جیپ کے قریب لے جا روکی۔ اسٹیئرنگ وہیل پر تقریباً چالیس کی عمر کا ایک گورا چٹا اور ہینڈسم شخص موجود تھا۔ اس نے جیپ سے اتر کر نہایت گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ بلکہ معانقہ بھی کیا۔

"آپ یقیناً افضل چوہدری ہیں۔" اس نے شستہ انگریزی میں کہا "اس وقت، اس جگہ آکر رکنے والے کو افضل چوہدری ہی ہونا چاہئے، مجھے افضال شاہ کہتے ہیں۔" اس کا لہجہ آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے پاکستانیوں والا تھا۔ اب میں اس لہجے کو نہ صرف پہچاننے لگا تھا بلکہ اسے اپنانے پر بھی قادر تھا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ لیکن زیادہ خوشی اس وقت ہوگی جب زمین کا سودا طے پا جائے گا۔" میں نے اسی لہجے میں جواب دیا حالانکہ مجھے آکسفورڈ تو کیا اپنے ملک کی بھی کسی یونیورسٹی میں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

"چوہدری صاحب! سودا تو آپ کی کہنی کے ذمے دار لوگوں سے تقریباً طے ہی ہو چکا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو بھی اس میں اعتراض کی کوئی گنجائش نظر نہیں آئے گی۔" وہ اعتماد سے بولا۔ پھر اس نے سڑک پر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "آپ کے ساتھ کوئی نہیں ہے کیا؟"

حنیف اور سردار گاڑی آگے لے جا کر یقیناً کسی چیز کی آڑ میں چھپ چکے تھے۔ میرے آدمی کبھی کسی کو یہ محسوس ہونے کا موقع نہیں دیتے تھے کہ وہ میرے ساتھ ہیں یا میری نگرانی کر رہے ہیں۔

"یا میرے ساتھ کسی کو ہونا چاہئے تھا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"وہ دراصل آپ پہلی بار یہ زمین دیکھنے کے لئے آرہے تھے۔ اور پھر اتنے بڑے بزنس مین ہیں آپ تو۔ مجھے امید نہیں تھی کہ کالج کے لڑکوں کی طرح بے فکری سے سیٹی بجاتے ہوئے آپ اکیلے ہی آجائیں گے۔" وہ معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولا۔

"اب کام صرف میرا ہی رہ گیا ہے اس لئے میں اکیلا آگیا۔" میں نے ایک نظر اس کے بندوق برداروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی پرانی سی بندوقیں سنبھالے سپاٹ چہرے کھڑے تھے۔

پھر میں نے چاروں طرف دیکھا اور کہا "آپ بس مجھے اس نظر زمین دکھا دیجئے۔"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے چوہدری صاحب! آپ بیٹھ کر سکون کی سانس تو لیں۔ زمین بھی دکھا دیں گے۔" وہ میرا کندھا تھپک کر بولا۔ پھر وہ چاروں طرف ہاتھ گھماتے ہوئے گویا بر صغیر کا تذکرہ بولا "کسی زمانے میں یہ ساری زمینیں ہی ہماری ہوا کرتی تھیں۔"

اردگرد جو زمین نظر آرہی تھی اس میں سے بیشتر بنجر تھی۔ حالانہ اس میں معمولی سا تھور تھا جسے کلر کہا جاتا تھا۔ اس کا علاج کی کوئی نہ کوئی تدبیر کی جا سکتی تھی۔ پھر وہ سر جھٹک کر بولا "آپ میری جیپ کے پیچھے پیچھے آجایئے۔ ڈیرے پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ پھر زمین دیکھنے نکلیں گے۔"

میں نے گھڑی دیکھی، ابھی ڈنر میں خاصا وقت باقی تھا۔ میں گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس کے آدمی اس کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گئے اور جیپ ایک پگڈنڈی پر مڑ گئی۔ میں نے گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔ دھول اڑاتی جیپ کے پیچھے دو ڈھائی فرلانگ چلنے کے بعد مجھے اس ویرانے میں ایک طرف چند کچے پکے گھر نظر آئے، دو چار مویشی بھی درختوں کے نیچے بندھے ہوئے تھے۔ چند بچے ادھر اُدھر کھیل رہے تھے۔ وہ ہماری گاڑیوں کے پیچھے لگنے کے بجائے افضال شاہ کو دیکھ کر گھروں میں گھس گئے۔

افضال شاہ نے جیپ ایک بہت بڑے پختہ کمرے کے سامنے لے جا روکی جو سب سے الگ تھلگ چند گھنے درختوں کے درمیان کھڑا تھا۔ دروازہ کھلا ہی تھا اور وہاں بھی ایک بندوق بردار موجود تھا۔ ہم گاڑیوں سے اتر کر اندر پہنچے۔ کمرا اچھا بھلا آراستہ پیراستہ تھا۔ قالین اور صوفے تک موجود تھے۔ حالت بتا رہی تھی کہ ویسے تو مدتوں سے یہ کمرا استعمال نہیں ہوا تھا لیکن آج خاص طور پر اس کی جھاڑ پونچھ کی گئی تھی۔ چھت میں لکڑی کے تختوں اور بھاری کپڑوں سے بنے ہوئے وہ پنکھے بھی لٹکے ہوئے تھے جنہیں رسی کھینچ کر ہلایا جاتا تھا۔ یہ پنکھے میں نے ایک طویل عرصے کے بعد دیکھے تھے۔ شاید کسی زمانے میں اس ڈیرے پر خوب رونقیں رہی ہوں۔

آج نئے سرے سے کچھ رونقیں بیدار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کھلے میدان میں عارضی چولھے وغیرہ بنا کر دو تین آدمی مرغیاں روسٹ کر رہے تھے۔ اور بھی نہ جانے کیا کچھ پکا رہے تھے۔ پانی کا ایک بڑا سا لوہے کا کولر بھی ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ فضا میں بہت

لطف انداز کی اشتہا انگیز خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے کان سانسی ذرا کسمسایا لیکن میں نے اسے دو چار تھپکیاں دے

ہم صوفوں پر بیٹھ چکے تو میں نے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ سارا اہتمام کس کے لئے ہو رہا ہے؟"

"آپ ہی کے لئے ہو رہا تھا۔" افضال شاہ مسکراتے ہوئے "میں نے کہا نا، کہ مجھے اندازہ نہیں تھا، آپ اکیلے آئیں مجھے واضح طور پر کچھ بتایا نہیں گیا تھا۔"

"دراصل واضح طور پر میں نے ہی کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ت چاہتا ہوں۔ میں کچھ دوسرے معاملات میں غیر متوقع طور پر یا تھا۔" میں نے کہا۔

"بہرحال مجھے امید ہے کہ آپ اس ذرا مختلف قسم کے ڈنر لطف اندوز ہوں گے۔" وہ بولا "پکنک کے انداز میں کھانے کا کچھ ی لطف ہوتا ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو کھانے سے پہلے پینے نے کا بھی انتظام ہے۔ وسکی، وائن، بیئر سب کچھ موجود ہے۔ کچھ کریں گے آپ؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا "یہ شوق میں نے ں پالے۔ اور کھانے کے چکر میں پڑنے کے میرے پاس وقت نہیں ے۔ کو کہ خوشبوئیں سونگھ کر میرا شدت سے دل چاہ رہا ہے کہ ٹ ٹائی اتار کر، آستینیں چڑھا کر ان سب چیزوں پر ٹوٹ پڑوں ن وعدے کی مجبوری آن پڑی ہے۔ وعدہ کہیں اور کھانا کھانے کا یا پھر یہ کہنا چاہئے کہ اوپر والے نے مرکہیں اور کے رزق پر لکھی ہے۔"

اس کے چہرے پر مایوسی کی ایک لہر آکر گزر گئی، جیسے اسے پنے انتظامات ضائع جانے کا قدرے افسوس ہوا ہو۔ وہ بغور میری رف دیکھتے ہوئے بولا "آپ میرے اندازوں سے بہت مختلف دمی ہیں چوہدری صاحب! آپ کی عمر بھی میرے اندازے سے لیس کم ہے۔۔۔ اور میں چونکہ ایک طویل عرصے سے ملک سے باہر ں ہوں اس لئے یہاں کے بڑے لوگوں کے بارے میں میری طلعات اب ٹوٹ نہیں ہیں۔"

"اگر آپ کو مجھ سے مل کر مایوسی ہوئی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ مجھے خوشی ہوئی ہے۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر اسی خوشی میں زمین ایک نظر مجھے دکھا دیجئے۔" میں نے کہا۔

"سانس تو لیجئے، ابھی چلتے ہیں۔" وہ بولا۔ اس دوران اس کے آدمی صاف ستھرے برتنوں میں بڑی تمیز اور سلیقے سے کولڈ ڈرنکس لے آئے۔ یہ انہوں نے اچھا کام کیا تھا۔ موسم خاصا سرد ہونے کے باوجود میں کولڈ ڈرنک کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ کولڈ ڈرنک ختم کر کے ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر آگئے۔

"آپ میرے ساتھ جیپ میں بیٹھنا پسند کریں گے یا میں آپ کے ساتھ گاڑی میں آجاؤں؟" افضال شاہ نے پوچھا۔

"آپ ہی میرے ساتھ گاڑی میں آجائیں۔" میں نے کہا۔ اس نے جیپ کی چابی اپنے آدمیوں کو دے دی اور میرے ساتھ گاڑی میں آبیٹھا۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق اونچے نیچے راستوں پر گاڑی چلانا شروع کر دی۔ اس کے آدمی [illegible] میں پیچھے پیچھے آرہے تھے۔

وہ کچے پکے گھروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "ایک مدت ہوئی ہماری زمینیں اُجڑ چکی ہیں لیکن ہم نے اپنے کچھ مزارعوں کو ابھی تک فارغ نہیں کیا۔ یہ اسی طرح یہاں رہتے آرہے ہیں۔ اپنے اپنے کام کرتے ہیں لیکن ہماری طرف سے بھی انہیں مالی امداد ملتی ہے۔ بس یہ ایک طرح سے زمینوں کے محافظ ہیں۔ بہت اچھے، بہت جاں نثار لوگ ہیں۔ اگر آپ نے یہ زمین خریدلی تو خواہ اس کا کوئی بھی مصرف نکالیں لیکن کوشش کیجئے گا کہ ان لوگوں کو بھی اس میں ایڈجسٹ کر سکیں۔ یہ آپ کا مجھ پر ذاتی احسان ہوگا۔ ہمارے بے شمار مزارعوں میں سے بس یہ تھوڑے سے لوگ رہ گئے ہیں جنہیں نہ تو میں اُجڑتے دیکھنا چاہتا ہوں اور نہ ہی یہ خود اس زمین سے ناتا توڑ کر کہیں جانا چاہتے ہیں۔"

"آپ کو ان کے محسوسات کا تو اتنا خیال ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن آپ خود کیوں اس زمین سے ناتا توڑ کر جا رہے ہیں؟"

ایک لمحے کے لئے وہ چپ ہو گیا۔ اس کا ذہن جیسے کہیں دور بھٹکنے لگا۔ پھر بہت دھیمے لہجے میں وہ بولا "اس ملک میں رہنا میرے بس کی بات نہیں رہی۔ میں اس سوسائٹی میں مس فٹ ہوں۔" وہ اشاروں سے مجھے زمین بھی دکھاتا جا رہا تھا کہ فلاں جگہ سے شروع ہوتی ہے۔ فلاں مقام تک جا رہی ہے۔ وہاں سے یوں ختم کھا رہی ہے

تاریخی ناول

دنیا کے نامور فاتحین	قمر تسکین	100/-
شیر مصر	قمر تسکین	100/-
شمشیر اسلام	قمر تسکین	100/-
ترک مرد میدان	قمر تسکین	100/-

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور 2

لوریوں ادھر تک جاری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ میری باتوں کا جواب بھی دیئے جا رہا تھا۔

"کمال ہے!" میں نے قدرے حیرت سے کہا "کسی جاگیردار کے منہ سے پہلی بار سن رہا ہوں کہ اس ملک میں رہنا اس کے بس کی بات نہیں رہی اور وہ اس سوسائٹی میں مس فٹ ہے۔ فیوڈل لارڈز تو یہاں کا حاکم طبقہ ہیں۔"

"درست ہے۔" وہ طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "لیکن ہر طبقے میں کچھ نہ کچھ مجھ جیسی غلط سلط مثالیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ میں والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور ہمارے خاندان میں اعلیٰ تعلیم کی کچھ زیادہ روایت نہیں تھی۔ اس کے باوجود باپ نے بچپن ہی میں مجھے باہر بھیج دیا۔ میری عمر کا بیشتر حصہ لندن، پیرس اور سوئٹزر لینڈ میں گزرا ہے۔ میری بیوی بھی سوئس ہے۔ میں اب اپنی زمینوں کے سلسلے کی یہ آخری کڑی بھی بیچ کر سوئٹزر لینڈ میں ہی سیٹل ہو رہا ہوں۔"

"تو آپ کا خیال ہے کہ آپ ساری زندگی باہر رہنے کی وجہ سے اس سوسائٹی میں مس فٹ ہو گئے ہیں؟" میں نے اسے کریدا۔

"شاید یہی بات ہو، شاید میری اپنی ذات میں کچھ خامیاں ہوں۔ میں صحیح طور پر کچھ سمجھ نہیں پایا۔ بہرحال ایک بات میں نے اچھی طرح سمجھ لی ہے کہ یہاں کے نظام کے ساتھ چلنا، یہاں کے محکموں کے ساتھ چلنا اور یہاں کے دوسرے زمینداروں سے نمٹنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ شاید میں ایک کمزور آدمی ہوں اور زمینداری مضبوط لوگوں کا کام ہے۔ یا پھر شاید میں ایک شریف آدمی ہوں۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

گاڑی ڈھول اڑاتی اونچے نیچے راستوں پر آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے شیشے چڑھا رکھے تھے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "تو گویا وطن کی مٹی میں آپ کے لئے کوئی کشش نہیں رہی؟"

"چوہدری صاحب! معاف کیجئے گا، اپنے وطن میں مٹی کچھ زیادہ ہی ہے اور وہ لوگوں کے پھانکنے کے لئے چھوڑ دی گئی ہے۔" وہ گویا صاف گوئی سے کام لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے بولا "اس مٹی سے گل و گلزار کھلانے والا کوئی کام ہمارے ہاں نہیں ہو رہا ہے۔ جتنی کثرت سے ہمارے ہاں وطن کی محبت کے ترانے لکھے جاتے ہیں اور جس طرح دن رات ریڈیو ٹی وی سے الاپے جاتے ہیں، اتنی ہی ہمارے دل وطن کی محبت سے خالی ہیں۔ خصوصاً سرکاری مشینری کے بس لفظوں کی جگالی ہو رہی ہے۔ ویسے بھی یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ جہاں باتیں زیادہ ہوتی ہیں وہاں عملی طور پر کم ہی کچھ ہوتا ہے۔ یہ تو بڑا آسان طریقہ ہے۔ ڈھول تاشے بجائے، لک لک کر سال میں ڈیڑھ دو سو نغمے گائے اور سب اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گئے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا، جیسے منتظر ہو کہ میں کچھ کہوں گا لیکن میں خاموش رہا تو وہ بولا "وطن کو وطن بنانا پڑتا ہے۔ جوکھوں کا کام ہے چوہدری صاحب! بڑا خون جلانا پڑتا ہے۔ بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں، بڑا ایثار کرنا پڑتا ہے۔ اپنے میں بڑا مارنا پڑتا ہے۔ بڑے جرأت مندانہ قدم اٹھانے پڑتے ہیں۔ صدیوں کشٹ اٹھانا پڑتے ہیں تب کہیں جا کر وطن کوئی پاتا ہے، قوم کہیں منہ دکھانے کے قابل ہوتی ہے۔ ہمارے مسئلہ یہ ہے کہ حقوق تو سب نے اپنے لئے رکھ لئے ہیں۔ فرائض دوسروں کے لئے چھوڑ دیئے ہیں۔ نیچے سے اوپر تک مجھ سمیت جرم میں سب شریک ہیں۔"

اس کے لہجے میں ہلکا سا ارتعاش آ گیا "میں اس ملک کو اور دیکھنا چاہتا تھا چوہدری صاحب! لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ کسی اور ہی سمت میں جا رہا ہے۔ کئی بار میں یہاں سیٹل ہونے ارادے سے آیا لیکن ہر بار مایوس ہو کر واپس جانا پڑا۔ بیوی کے سامنے الگ شرمندگی ہوئی۔ ایک عمر باہر گزار کر جب میں واپس آتا ہوں تو لگتا ہے، میں کسی اور ہی سیارے میں پہنچ گیا ہوں۔ جہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ مجھے کہیں اور ہی ٹھکانا کرنا میں عافیت نظر آتی ہے۔"

"لیکن اگر آپ جیسے لوگ، جو اس ملک کو کچھ اور دیکھنا چاہتے ہیں ..... یونہی ایک ایک کر کے اس ملک سے رخصت ہوتے رہے تو پھر اس کی حالت بدلے گا کون؟" میں نے ملائمت سے پوچھا "اس کے علاوہ ایک بات اور سوچیں۔ آپ کے پاس کروڑوں کی جائیداد تھی، آپ کی بیوی سوئس ہے۔ آپ تو جا کر سوئٹزر لینڈ میں سیٹل ہو جائیں گے۔ لیکن اس ملک میں اور بھی لاکھوں ایسے لوگ موجود ہیں جو آپ ہی جیسے باشعور ہوں گے، آپ ہی کی طرح سوچتے ہوں گے لیکن وہ غریب ہیں۔ مایوسی انہیں بھی گھیرتی ہے لیکن وہ کہیں اور جا کر سیٹل نہیں ہو سکتے۔ ان کا قصور ہے؟ وہ بھی آپ کے ہم وطن ہیں۔ آپ انہیں کیوں پیچھے چھوڑے جا رہے ہیں؟ ہم خیال اور ہم وطن ہونے کے ناتے آپ کو ان سے بھی ہمدردی ہونی چاہئے؟"

"آپ درست کہہ رہے ہیں چوہدری صاحب! لیکن اکیلا چنا بھاڑ پھوڑے گا۔ میرے تو یہاں پاؤں جمنے نہیں پائے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے ..... اور اب تو تمام انتظامات بھی ہو چکے ہیں۔ صرف یہ چند ہزار ایکڑ زمین کا سودا ہونا رہ گیا ہے۔ مجھے جانے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا" وہ شاید اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں اس کے حالات کیا رہے تھے۔ وطن میں اسے کیسے لوگوں سے پالا پڑا تھا، کیا اتفاقات پیش آئے تھے۔ تاہم میں نے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

"میں آپ کو قائل کرنے کی یا آپ کا نقطۂ نظر بدلنے کی کوشش نہیں کر رہا" میں نے کہا "اپنے حالات کو ہر انسان خود بہتر طور پر سمجھتا ہے۔ میں تو آپ کو صرف یہ بتانے کی کوشش کر

رہا تھا کہ کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے جانا مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ ہمیں صبر کر مقدور بھر کوششیں کرتے رہنا ہے۔ اسی عجز سے پیوستہ امید بہار رکھنی ہے۔"

"ہر ایک کو اپنے اپنے حالات اور اپنے اپنے مزاج کے مطابق فیصلے کا حق حاصل ہے۔" وہ امریکیوں والے انداز میں کندھے اچکا کر بولا۔

جلد ہی اس کی زمین کے گرد ہمارا چکر پورا ہو گیا اور ہم واپس اس کے قریب آ رکے۔ گاڑی سے اتر کر ہم ایک درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ افضال شاہ طویل سانس لے کر بولا۔ "تو یہ زمین! آپ کی کمپنی کے لوگ اس کا ہر طرح سے جائزہ لے چکے ہیں۔ اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں سے میں نے انہیں آگاہ کیا ہے حالانکہ ہمارے ہاں اپنی چیز کی خامیاں بتانے کا رواج نہیں ہے۔ حتیٰ کہ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ زمین کے نیچے سطح تھوڑی سی بلند ہو چکی ہے جس کی وجہ سے یہ بعض فصلوں کے لئے موزوں نہیں رہی اور بعض فصلوں کے لئے بہت موزوں ہو گئی ہے۔ اور یہ مسئلہ ابھی زیادہ سنگین حد تک نہیں پہنچا ہے۔ بڑی آسانی سے اس کے کئی علاج ہو سکتے ہیں اور آپ اس زمین کو دوسرے مقاصد کے لئے بھی قابلِ استعمال بنا سکتے ہیں۔ کچھ پوچھنا چاہیں تو پوچھ لیجئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ میں آپ سے کچھ چھپاؤں گا نہیں۔"

"مجھے کچھ نہیں پوچھنا۔ مجھے معلوم ہے میرے آدمیوں نے کوئی ایسی بات چھوڑی نہیں ہو گی جو پوچھنا ضروری ہو۔ دو تین روز میں فائنل ہو جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔ زمین تا حدِ نظر پھیلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اور یہ سوچتے ہوئے ایک لاشعوری سی مسرت کا احساس ہو رہا تھا کہ دو تین روز بعد یہ زمین میری ہو گی۔ ایک عجیب سی فتح مندی اس احساس میں شامل تھی۔ شاید اس احساس سے لذت اندوز ہونے کے لئے انسان دن رات تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ بزنس کو پھیلاتا رہتا ہے۔ صنعتکار ایک کے بعد دوسری صنعت خریدتا چلا جاتا ہے۔ حکمران ایک ملک کے بعد دوسرے کو فتح کرنے کی منصوبہ بندیاں کرنے لگتے ہیں۔

میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "اب اجازت دیجئے شاہ صاحب! ہو سکے تو جانے سے پہلے ایک بار مجھ سے ضرور ملئے گا۔ کھانے پر ملاقات اور گپ شپ رہے تو بہت اچھا ہو گا۔ آپ جیسے لوگوں سے مل کر خوشی ہوتی ہے جن کے پاس صرف سرمی نہیں ہوتا، سر کے اندر بھی کچھ ہوتا ہے۔"

"خواہ دیوانگی کے جراثیم ہی سہی" وہ مسکرایا۔

"ہاں۔ خواہ دیوانگی کے ہی سہی۔" میں نے سر ہلایا "بعض دیوانے فرزانوں سے بہتر ہوتے ہیں۔"

"قدر افزائی کا بہت شکریہ۔ میں ضرور حاضر ہونے کی کوشش کروں گا چوہدری صاحب۔" پھر وہ جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکالتے ہوئے بولا "اگر آپ کا کبھی سوئٹزر لینڈ کی طرف چکر لگے تو مجھے ضرور میزبانی کا موقع دیجئے گا۔ اس کارڈ پر میرا وہاں کا ایڈریس موجود ہے۔"

"آپ کا وہاں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ میں بس اسٹاکس خریدتا اور بیچتا رہتا ہوں۔ اب بھی یہی کروں گا۔ زندگی بڑی مختصر ہے۔ میں تمام نعمتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ دنیا کے جھمیلوں سے آزاد رہ کر اس کی خوبصورتیوں سے محظوظ ہونا چاہتا ہوں۔ کچھ نہ کرنے کے باوجود میرے اثاثوں میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ میری آئندہ نسلیں بہت کچھ لٹا بھی دیں گی تب بھی انہیں پریشانی نہیں ہو گی۔"

میں نے اسے خدا حافظ کہا اور واپس روانہ ہو گیا۔ تاریکی اچھی خاصی گہری ہو چکی تھی۔ میں نے ابھی دو میل کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سڑک کے عین بیچوں بیچ ایک بڑا سا "گڑا" جاتے دکھائی دیا۔

یہ ایک مخصوص قسم کی بیل گاڑی ٹائپ کی چیز ہوتی ہے مگر اس میں بیلوں کی جگہ سانڈ جوتے جاتے ہیں اور نیچے فرش میں بیل گاڑی سے کہیں بڑی ہوتی ہے۔ گاڑی کیا اچھا بھلا بحری جہاز دکھائی دیتی ہے جو غلطی سے سڑک پر آ کر پھنسنے لگا ہو۔ گاڑی پر لکڑیوں کا ایک بڑا سا ڈھانچا چاروں طرف پھیلا کر اس پر ٹاٹ لپیٹ کر زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کی جاتی ہے۔

گڑے آج بھی پنجاب کے اکثر علاقوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ زیادہ تر یہ کپاس اور کٹی ہوئی خشک گھاس کی نقل و حمل کے لئے استعمال ہوتے ہیں جسے توڑی یا پرالی کہا جاتا ہے۔ جب ملک میں ٹرکوں کی کمی تھی تو یہ گویا ٹرکوں کا متبادل تھے۔ بعض گڑوں میں تو ٹرک سے زیادہ مال آ جاتا تھا۔

یہ عام طور پر کسی شہر یا دیہات سے مال لاد کر لمبے سفر پر چل پڑتے تھے۔ کئی کئی دن سفر کرتے تھے۔ زیادہ تر رات کو سفر کرتے تھے۔ دن میں سانڈ اور گڑے کو چلانے والے لوگ کہیں درختوں کے نیچے آرام کرتے تھے۔ قطار کی صورت میں یہ گڑے سڑک کے ایک طرف "کچے میں" دھیرے دھیرے اپنی منزلوں کی طرف گامزن

صحرا کا چاند	اے حمید	80/-
پہلی محبت کے آنسو	اے حمید	250/-
اداس جنگل کی خوشبو	اے حمید	100/-
چاند چہرے	اے حمید	200/-

مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2

رہتے تھے ٹریفک کو ڈسٹرب نہیں کرتے تھے۔

گڈے والا اکثر گڈے پر لیٹا سوتا رہتا۔ سانڈ سر جھکائے جگالی کرتے خود ہی ناک کی سیدھ میں چلتے رہتے تھے۔ راستے عموماً ان کے لئے مانوس ہوتے تھے کیونکہ ہر گڈے والے کا کوئی نہ کوئی لگا بندھا روٹ ہوتا تھا جس پر وہ ایک طرف سے کچھ لاد کر جاتا تھا' دوسری طرف سے ہفتے دو ہفتے بعد کچھ اور لاد کر واپس آجاتا تھا۔ گڈے کے نیچے لالٹین لٹکی جھولتی رہتی تھی اور سانڈوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی دھیمی دھیمی ٹن ٹن ویرانوں میں ایک عجیب سی روحانی انگیز موسیقی بکھیرتی رہتی تھی۔ ہائی ویز پر سفر کرنے والوں کے لئے یہ ایک مانوس سا نظارہ تھا جو دھیرے دھیرے معدوم ہوتا جارہا تھا۔ تیز رفتار گاڑیاں ان گڈوں کی جگہ لیتی جارہی تھیں۔

میں بھی کسی حد تک روایت پرست اور ماضی میں زندہ رہنے والا آدمی تھا۔ مجھے اس قسم کی چیزیں بھلی لگتی تھیں لیکن اس وقت نہ جانے کیوں وہ گڈا مجھے بھلا نہیں لگا۔ یہ بات کچھ عجیب سی تھی کہ گڈے پر کچھ لدا ہوا نہیں تھا اور وہ اکیلا ہی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے جان بوجھ کر سڑک کے بیچوں بیچ چلایا جارہا تھا اور گڈے والے کو پیچھے آنے والی گاڑیوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔

میری گاڑی اس کے قریب پہنچ گئی اور اس کا نچلا حصہ روشنی میں نہا گیا۔ پھر بھی ایسے آثار پیدا نہیں ہوئے کہ گڈے والا میرے لئے راستہ چھوڑ دے گا۔ وہ مجھے ہی کچے میں اتارنا چاہتا تھا۔ کہنے کو تو وہ ہائی وے تھا مگر سڑک تو محض چند گز ہی چوڑی تھی اور وہ بھی کناروں پر سے ٹوٹی پھوٹی تھی۔

اچانک مجھے گڈے کے پچھلی طرف دیوار کی طرح پھیلے ہوئے ٹاٹ کے پردے کے عقب میں کسی ہلچل کا احساس ہوا۔ میری چھٹی حس نے مجھے احساس دلایا کہ اس پردے کے عقب سے کوئی آنکھ میری گاڑی کا جائزہ لے رہی تھی۔ گاڑی اگر اندھیرے میں جارہی ہو اور اس کی ہیڈ لائٹس روشن ہوں تو وہ سامنے والی چیز کو تو روشنی میں نہلا دیتی ہے لیکن خود اندھیرے ہی میں رہتی ہے تاہم میری گاڑی کی نمبر پلیٹ تو دیکھی ہی جاسکتی تھی۔ اس پر ہیڈ لائٹس کی روشنی بھی پڑ رہی تھی اور نمبر پلیٹ کی اپنی لائٹ بھی موجود تھی۔

میری چھٹی حس نے تو مجھے صرف کسی گڑبڑ کا احساس دلایا تھا لیکن میری وہ حس جسے میں ساتویں حس کہتا تھا' زیادہ کارآمد ثابت ہوئی۔ اس نے مجھے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا اور میں نے گاڑی پوری قوت سے کچے میں موڑ دی۔

اگر مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوجاتی تو شاید اس ویرانے میں میری زندگی کی کہانی ختم ہوجاتی۔ سب مشین گن کا برسٹ عین میرے سامنے سے آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی گڈے کے پیچھے کی طرف کے ٹاٹ کا پردہ چھلنی ہوگیا تھا۔ اسی پردے کے عقب میں گڈے پر یقیناً کئی آدمی موجود تھے۔ یہ محض میرا اندازہ تھا۔ میں ان کی جھلک نہیں دیکھ سکا۔

میری گاڑی شاید کچے میں اتر کر الٹ گئی ہوتی کیونکہ
کے ساتھ ساتھ نہ جانے کیوں اچھا خاصا چوڑا نالا سا
تھا۔ اس میں پانی نہیں تھا۔ نالے کے بعد بھی زمین ہموا
تھی۔ مٹی کے تودے' جھاڑیاں' خبیب و فراز' کیچڑ سبھی
لیکن گاڑی بہرحال الٹنے سے بچ گئی اور تلاطم میں پھنسی ہو
کی طرح ہچکولے کھاتی آگے بڑھتی چلی گئی۔

سب مشین گن کا برسٹ ونڈ اسکرین پر پڑا ہوتا۔ ونڈ
بھی دیگر تمام شیشوں کی طرح بلٹ پروف تھی لیکن پھر
یقین نہیں تھا کہ اتنے قریب سے اور عین سامنے سے سب
گن کا برسٹ سہہ سکتی تھی۔ میں نے اپنے اوسان بحال ر
گاڑی کی ہیڈ لائٹس آف کردیں۔ یہ اپنے آپ کو تن
چھوڑنے والی بات تھی کیونکہ گاڑی کسی درخت سے بھی ٹ
تھی۔ کسی بڑے تودے میں بھی جاکر دھنس سکتی تھی اور کس
گڑھے میں بھی گر سکتی تھی۔ وہ علاقہ کچھ ایسا ہی تھا۔ تار
چھاؤں بھی اس وقت کوئی خاص مدد نہیں کررہی تھی۔ چلتی
میں ہر طرف اندھیرا ہی محسوس ہورہا تھا۔ گاڑی سے اتر
قدرے سکون کی سانس لے کر شاید منظر کچھ بہتر نظر آتا۔

میرے عقب میں بے مقصد انداز میں وقفے وقفے سے
مارے جارہے تھے لیکن آواز ہر بار سمت کے تھوڑے بہت
کے ساتھ آرہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ گڈے
اتر آئے تھے اور دیوانے کتوں کی طرح بہت تیزی سے میری
میں ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ اندھیرے میں گاڑی کی رفتار
خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔

میری گاڑی پٹرول اور ڈیزل دونوں سے چلتی تھی۔ اس
پٹرول پر تھی۔ اگر وہ لوگ بہت زیادہ ماہر و مشاق ہوتے تو دیر
میں چلتی ہوئی تیز ہوا کے باوجود پٹرول کی بُو اور انجن کی ہلکی
سرسراہٹ کا سراغ پکڑ کر بالکل صحیح سمت میں آسکتے تھے۔

اگر میری گاڑی کسی حادثے کا شکار نہ ہوتی تو میں ادھر
لمبا سا چکر کاٹ کر کافی آگے دوبارہ بھی سڑک پر پہنچ کر فرار ہو
تھا مگر اندھیرے میں رسک اتنا ہی تھا جتنا حملہ آوروں کا سامنا کر
میں۔ اور پھر کچھ دل نے گوارا نہیں کیا۔ یہ کوئی اچھی بات
تھی کہ کسی نے عین سامنے سے مجھ پر حملہ کیا تھا اور میں دُم د
بھاگ جاتا۔

میں نے گاڑی ایک جگہ روک دی لیکن انجن بند
کیا۔ دروازہ کھلا چھوڑ کر میں باہر رینگ آیا۔ میں نے گاڑی
خفیہ خانے سے رائفل بھی نہیں نکالی۔ وہ لوگ زیادہ دور
تھے۔ میں صرف اپنا نقرئی مشین پسٹل ہی سنبھال کر رکوع کی سی حال
میں دوڑتا چلا گیا۔

اس طرح گھات لگا کر ہونے والے حملوں کے سلسلے
تجربات نے مجھے سکھایا تھا کہ جیت اس کی ہوتی ہے جو انسا

اور دشمن کی توقعات کے خلاف عمل کرتا ہے۔ اضطراری
برا دشمن سے فوری طور پر کچھ دور نکل آنا درست تھا لیکن
مجھے چند لمحے کی مہلت مل چکی تھی' میں اس کی توقع کے
خلاف چل رہا تھا۔

ملہ آور جب یہ سمجھتا ہے کہ اس نے کسی پر اچانک حملہ کر
بدحواس کردیا ہے اور اس کا پلہ بھاری ہے تو وہ یہی توقع
ہے کہ اس کا بھاگ نکلنے والا شکار مزید آگے ہی بھاگا جارہا
یہ لمحہ حملہ آور سے زیادہ دور ہونے کی فکر میں ہوگا۔ لیکن
رحاحملہ آوروں ہی کی طرف جارہا تھا۔ واپس اسی سمت بڑھ
جدھر سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ ایک لمحے پہلے
ب مشین گن کی تڑتڑ کے علاوہ جی تھری رائفل کی گرج بھی
ی تھی۔ لیکن جونہی میں نے اس سمت بڑھنا شروع کیا' تمام
یں یکلخت خاموش ہوگئی تھیں۔ گویا کسی غیبی طاقت نے
بتادیا ہو کہ میں ان کی طرف آرہا ہوں اور انہوں نے میرے
مات لگائی ہو۔

یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ مجھے کچھ ہوشیار ہونا
بدستور رکوع کی سی حالت میں رہتے ہوئے میں پھونک پھونک
دم رکھنے لگا۔ کہیں کوئی جھاڑی' تودا یا ٹکڑ منڈ درخت نظر
تا تو ایک لمحے کو میں اس کی آڑ لے لیتا اور ہر بار نئے سرے
اردگرد پیش کا جائزہ لیتا۔

ہر طرف ایک ایسا سکوت طاری تھا جس کی تہ میں موت چھپی
تھی۔ اب میں کافی بہتر طور پر اور خاصا دور تک دیکھ سکتا تھا مگر
ا چیز متحرک نظر نہیں آرہی تھی۔ ایک بار پھر میرا وہی احساس
آیا کہ انسان بنیادی طور پر درندہ ہے۔ جب کسی کے لئے گھات
ہے تو بالکل درندہ معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے کے خون کا پیاسا'
رے کی زندگی کا دشمن۔

بار برداری کا گڈا ایک بہت ہی بے ضرر سی چیز تھی۔ بچپن میں
ں نے بہت ہی گڈے دیکھے تھے۔ ان پر چڑھ کر کھیل کود بھی کی
یہ ان کی آڑ میں' لکن میٹی' بھی کھیلی تھی لیکن آسودہ حالی کے دور
ا بھی میں نے بارہا انہیں سڑکوں پر دیکھا تھا اور بڑی بے نیازی
ے گاڑی ان کے قریب سے نکالتے گیا تھا۔ کبھی میں نے ان کے
ے میں کچھ سوچا تک نہیں تھا۔

لیکن آج ایسے ہی بظاہر بے ضرر نظر آنے والے ایک گڈے
ے موت مجھ پر جھپٹی تھی۔ عجیب چیز پر انہوں نے میرے لئے
مات لگائی تھی۔ اگر آج بھی میں بے نیازی سے ہی اس کے
قریب میں گاڑی رکھتا اور راستہ ملنے کا منتظر رہتا تو نہ جانے کیا ہوتا!
اس وقت درندہ درندوں کے وار سے محض اتفاقاً یا پھر خوش قسمتی
اور شیطنت ایزدی سے بچ نکلا تھا مگر اب درندے پھر ایک دوسرے
کی گھات میں تھے۔

میں تیزی سے کچھ اور آگے بڑھا۔ غنیمت تھا کہ دوسرے ہی
لمحے مجھے چوپائے کی طرح چاروں ہاتھ پیروں کے بل گر کر چھپنے کے
لئے مٹی کا ایک بڑا سا تودا میسر آگیا۔ کیونکہ اسی لمحے مجھے کافی فاصلے
پر نشیب سے ایک ہیولا سا نمودار ہوتا دکھائی دیا تھا۔ فرشتۂ اجل کی
طرح وہ گن لئے یوں گڑھے کے کنارے پر ابھرا جیسے زمین نے ہی
اسے اپنے شکم سے اگلا ہو۔ ایک کے بعد دوسرا' تیسرا اور پھر چوتھا
ہیولا بھی باہر آگیا۔ سب کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔

فاصلہ کافی تھا اور وہ مجھے محض ہیولوں کی طرح دکھائی دے
رہے تھے پھر بھی ان کے بارے میں بہت سی باتوں کا اندازہ ہورہا
تھا۔ وہ چاروں ڈھیلے ڈھالے سیاہ لباسوں میں تھے۔ غالباً شلوار
قمیصیں تھیں۔ کمر کے مقام پر وہ سب دبلے دبلے نظر آرہے تھے۔
یقیناً ان کی کمروں پر کچھ لپٹا ہوا تھا۔ غالباً گولیوں کی پیٹیاں
تھیں۔ انہوں نے یقیناً ڈھاٹے بھی باندھے ہوئے تھے۔ یہ انداز
ڈاکوؤں والا تھا مگر ان کا ڈاکو ہونا کچھ بعید از قیاس نظر آتا تھا۔

ڈاکو گڈے میں سوار ہو کر سست رفتاری سے عین سڑک کے
بیچوں بیچ سفر نہیں کرسکتے تھے۔ دوسرے اگر میں انہیں ایک معقول
شکاری دکھائی دیتا تو وہ یکدم مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے کے بجائے
مجھے روک کر لوٹنے کی کوشش کرتے۔ اگر انہیں صرف ایک اچھی
گاڑی ہی کی ضرورت تھی' مالک خواہ ان کی طرف سے جہنم میں ہی
جاتا تب بھی وہ اس طرح گاڑی پر برسٹ نہ مارتے۔ گاڑی کو کوئی
ایسا نقصان پہنچ سکتا تھا یا اس کا ٹائر برسٹ ہوسکتا تھا جس کی وجہ
سے وہ فوری طور پر کہیں لے جانے کے قابل نہ رہتی۔ اس طرح تو
ڈاکوؤں کا مقصد ہی فوت ہوجاتا۔ چکر کچھ اور ہی تھا۔

وہ چاروں اسی سمت میں بڑھ رہے تھے جدھر میں گاڑی چھوڑ
کر آیا تھا۔ گویا اس قسم کی آنکھ مچولی میں وہ ماہر تو تھے مگر ساتھ ہی
ان کے انداز میں ایک چھوٹا سا اناڑی پن بھی نظر آرہا تھا کہ سب
"باجماعت" میری تلاش میں بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے بکھر کر اور
زیادہ دور تک پھیل کر مجھے ایک طرح سے گھیرے میں لینے کی
کوشش نہیں کی تھی۔ ان کے اپنے حساب سے اس میں بھی کوئی
مصلحت رہی ہوگی۔ تاہم وہ ایک دوسرے سے کچھ دور دور تھے اور
چاروں کے چہرے مختلف سمتوں میں تھے۔ یعنی وہ چاروں طرف کا
جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

مشین پسٹل کی رینج کافی تھی۔ اس کے باوجود میں نے چند لمحے
انتظار کرنا مناسب سمجھا کہ وہ ذرا "محفوظ" فاصلے تک آجائیں
لیکن اس انتظار کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ وہ درحقیقت میری
طرف نہیں بڑھ رہے تھے بلکہ میرے سامنے سے گزرتے جارہے
تھے۔ مجھے ان چاروں کو تقریباً ایک ساتھ ہی نشانہ بنانا تھا ورنہ
میرے لئے الجھن پیدا ہوسکتی تھی۔ خواہ مخواہ زیادہ بھاگ دوڑ کرنا
پڑتی۔ اور میں اس وقت زیادہ لمبی آنکھ مچولی کے موڈ میں نہیں
تھا۔ شکار جب عین نشانے پر آیا ہوا تھا تو خواہ مخواہ اس موقع کو گنوا
کر اپنے آپ کو تھکانے کی کیا ضرورت تھی۔

جب میرے اور ان کے درمیان فاصلہ گھٹنے کے بجائے بڑھتا دکھائی دینے لگا تو میں نے سینے کے بل لیٹے لیٹے مشین پسٹل ذرا بلند کیا۔ وہ چاروں' شکار پر نکلے ہوئے درندوں کی طرح ذرا سی بھی آواز پیدا کئے بغیر حتی الامکان تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے اور بالکل صحیح سمت میں جا رہے تھے۔ صرف انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ میں وہاں سے واپس آگیا تھا۔

میں ٹریگر پر دباؤ بڑھانے ہی والا تھا کہ یکدم' شک شک' کی کئی تیز سی آوازیں ابھریں اور ان میں سے تین آدمی اچھل کر ادھر اُدھر جا گرے۔ ان میں سے کسی کی کرب ناک چیخ سے ماحول کا سکوت بھی چند لمحے کے لئے مرتعش ہوگیا۔ نامعلوم سمت سے گولیاں آئی تھیں جو یقیناً سائیلنسر لگی رائفلوں سے چلائی گئی تھیں۔ سائیلنسر بھی خاص قسم کے تھے جو مسلسل فائرنگ سے بھی جام نہیں ہوتے تھے۔

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ گولیاں چلانے والے یقیناً حنیف اور سردار تھے جو میرے پیچھے خاصا فاصلہ چھوڑ کر گاڑی میں آرہے تھے۔ انہوں نے دوربین سے صورت حال دیکھ لی ہوگی۔ بڑی عمدگی سے اور بڑے صحیح موقع پر آکر انہوں نے معاملے میں دخل دیا تھا۔ ان کی حکمتِ عملی کی خوب صورتی یہ تھی کہ نہ تو وہ مجھے ابھی تک کہیں نظر آئے تھے اور نہ ہی اندازہ ہوا تھا کہ وہ کس سمت میں موجود ہیں۔

چوتھے سیاہ پوش کی خوش قسمتی تھی کہ وہ گولیوں کی بوچھاڑ سے بچ گیا تھا اور اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے زمین پر قلابازی کھائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ غائب ہوگیا تھا۔ زمین اونچی نیچی تھی' کئی جگہ خاصے اونچے ابھار موجود تھے لیکن کوئی ابھار ذرا بھی متحرک نہیں تھا۔ وہ بدبخت سیاہ پوش گویا زمین سے چپک کر زمین میں ہی سما گیا تھا۔

میں ہلنل سیدھا کئے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا لیکن کوئی اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ کس طرف کو نکل گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ حنیف اور سردار جہاں بھی تھے' ان کی نظریں بھی اسی طرح پریشان ہوں گی۔ کچھ فاصلے پر جھاڑیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ان کی آڑ میں چلا گیا ہو۔ حنیف اور سردار نے بھی یقیناً یہی سوچا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے جھاڑیوں پر بہت سی گولیاں برسیں۔ کچھ شاخیں بھی ٹوٹ کر ہوا میں اڑتی نظر آئیں اور کچھ چھوٹے موٹے جنگلی جانوروں کی چوں چاں بھی سنائی دی جو شاید انہی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ مگر کوئی انسانی آواز سنائی نہیں دی اور نہ ہی جواباً کوئی فائر ہوا۔ میری حسیات یہی کہہ رہی تھیں کہ وہ جھاڑیوں کے عقب میں نہیں تھا۔ لیکن حسیات یہ رہنمائی نہیں کر پا رہی تھیں کہ وہ کدھر چلا گیا تھا۔

میں نے چاروں ہاتھ پیروں پر ہی دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس طرف نیم دائرے میں بڑھنا شروع کیا جہاں چوتھا سیاہ پوش زمین پر لڑھک کر غائب ہوا تھا۔ باقی تینوں سیاہ پوش ا جہاں گرے تھے وہیں ساکت تھے۔ ماحول پر ایک بار شکن سکوت چھا گیا تھا۔

مجھے آگے بڑھنے میں بہت زیادہ احتیاط کرنا پڑ رہی یہ تھا کہ میرا ہیولا دیکھ کر حنیف اور سردار مجھ پر دیں۔ اندھیرے میں ان کی نظر بھی عمدگی سے کام کرتی جتنی تیز بہرحال نہیں تھی۔ ادھر درمیان سے اس چو کے غائب ہونے سے بڑی گڑبڑ ہوگئی تھی۔

میں نے سوچا' حنیف اور سردار کو سگنل دے دیا ہے تاکہ وہ میری موجودگی سے تو باخبر رہیں اور گولی چلا احتیاط برتیں۔ میں نے حلق سے چکور کی آواز نکالی آسمان پر دور دور تک چاند کا نام و نشان تک نہیں تھا ایسی تشویش کی بات نہیں تھی۔ چکور ہر وقت چاند کے نہیں لگاتا رہتا' کبھی کبھی وہ کسی درخت وغیرہ پر آرام اور اپنے آس پاس فائرنگ کی آوازیں سن کر صدائے بلند کرسکتا ہے۔

حنیف اور سردار میں سے بھی کسی نے جواباً ا نکالی۔ وہ میرا مطلب سمجھ گئے تھے اور اب ہم تینوں کو ہوئے چوتھے نقاب پوش کو تلاش کرنا تھا۔ میں زمین فراز کی آڑ لیتے ہوئے اور حتی الامکان نیچا رہتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

اچانک میں سینے کے بل زمین سے چپک گیا۔ مجھے تھا کہ آس پاس کوئی موجود ہے اور وہ حنیف یا سردار نہیں ہے۔ میرے نتھنے خود بخود پھڑک اٹھے تھے۔ دشمن کہیں موجود تھا۔ میں بالکل ساکت ہوگیا' زمین کا ایک گیا۔ سانس بھی میں نے روک لی۔

چند لمحے اسی طرح گزرے۔ ان چند لمحوں کے دوران بھی ساکت ہوگئی تھی۔ پھر میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ کم گڑھے سے نہایت موٹے اژدہے کی طرح رینگ کر با اس کے جسم میں بالکل اژدہے ہی کی طرح بل بھی پڑ رہا تھا وہ سیاہ پوش ہی تھا۔ وہ میری طرف نہیں آرہا تھا طرف بڑھ رہا تھا جدھر میرا رخ تھا۔ اس کے پاؤں ب تھے۔ وہ بہت عمدگی سے اچھی خاصی رفتار سے مٹی میں تھا۔ اسے یقیناً اندازہ ہوگیا تھا کہ خاموش رائفلوں سے گ سمت سے آئی تھیں۔ وہ سردار اور حنیف کی تلاش تھا۔ اس کی سب مشین گن شاید کہیں گر چکی تھی۔ اس میں صرف ریوالور تھا۔ شاید اسی لئے وہ گولیاں ضائع تھا۔ کسی حکمتِ عملی کے تحت اپنے گمشدہ دشمن کو تلا ریوالور کو صحیح طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔

ایک جگہ رک کر اس نے سر ذرا اونچا کرکے ارد گ

اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ ڈھاٹا اس کے چہرے پر ابھی تک جما ہوا تھا۔ اس وقت وہ بالکل میرے نشانے پر تھا' اسے نہیں معلوم تھا کہ موت اس کے تعاقب میں تھی۔ میں چاہتا تو اس کی ردی میں گولیاں اتار سکتا تھا لیکن میں اسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ شاید اس طرح کچھ مفید معلومات ہوسکتیں۔

"ریوالور پھینک دو ورنہ گولی۔۔۔" میں نے اسے للکارا لیکن اس نے مجھے جملہ پورا کرنے کی مہلت نہیں دی۔ وہ کسی اژدہے کی طرح ہی تڑپ کر پلٹا اور اس نے یکدم تین گولیاں جھونک دیں۔ سمت کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ اس نے عین اس جگہ فائر کیا تھا جہاں سے اس نے میری آواز سنی تھی۔

اتنی پھرتی کے ساتھ گھومتے ہوئے عین اس مقام پر فائر کرنا اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ وہ ایک ماہر لڑاکا تھا۔ شاید بات صرف اتنی تھی کہ قسمت اس کے ساتھ نہیں تھی۔ میں محض احتیاطاً اسے للکارتے ہی پوزیشن تبدیل کرچکا تھا۔ گولیاں میرے قریب ہی زمین میں دھنسیں اور ان سے اڑنے والی دھول میں نے اپنے نتھنوں میں گھستی محسوس کی۔

اس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چوتھا فائر کرتا' مجھے گولی چلانا پڑی۔ دو گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ سانڈ کی طرح ڈکراتا ہوا دُہرا ہوگیا۔

میں اٹھ کر اس کے قریب پہنچا تو وہ نزع کے سے عالم میں جھٹکے لے رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ پسلیوں کے نیچے تھا۔ میں نے ٹھوکر مار کر اس کا ریوالور کچھ اور دور پھینکا پھر جھک کر اس کے چہرے سے ڈھاٹا کھینچا۔ وہاں تقریباً اندھیرا ہی تھا لیکن میں اسے پہچان سکتا تھا۔ اور اسے پہچان کر مجھے بلاشبہ حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ قیصر ملک تھا!

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ قیصر ملک میرے خون کا پیاسا تھا اور مجھے مروانے کے لئے ہر حربہ اختیار کرچکا تھا لیکن یہ بس اوپر والے کا کرم ہی تھا کہ ہر بار میں بچ نکلا تھا۔ مجھے قتل کرانے کے لئے اس نے اونچے سے اونچے درجے کے بدمعاشوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ راہ چلتے' سڑک پر' گھر پر' سوتے میں' جاگتے میں حتیٰ کہ دفتر میں بھی اس نے مجھ پر بڑے منظم انداز میں بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ حملے کرائے تھے۔ مجھے ٹھکانے لگانے کے لئے ایک خاصے خطرناک' دہشت گرد گروہ کی خدمات بھی حاصل کی تھیں اور اس وقت تو اپنے مقصد میں تقریباً کامیاب ہی ہوگیا تھا لیکن قدرت کی کتابوں میں ابھی میری زندگی کا کھاتہ بند نہیں ہوا تھا اس لئے میں اس رات بھی نکل آیا تھا۔

ایک بڑے اور عیاش زمیندار کے مختلف مزاج بیٹے کی حیثیت سے اس کی یہ کوششیں میرے لئے غیر متوقع نہیں تھیں لیکن مجھے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ خود کالے کپڑے پہن کر' ڈھاٹا منہ پر باندھ کر' تین آدمی ساتھ لے کر مجھے ٹھکانے لگانے کے لئے اس انداز میں نکل کھڑا ہوگا۔

وہ ہچکیاں سی لے رہا تھا اور ہر ہچکی کے ساتھ اس کے منہ سے بھل بھل کرکے خون آرہا تھا۔ شاید ایک یا دونوں ہی گولیاں اس کے پھیپھڑوں میں اتر گئی تھیں۔ اس کی آنکھیں بار بار اذیت ناک انداز میں کھل اور بند ہو رہی تھیں۔ وہ کڑیل جوان تھا۔ اس نے میرے ساتھ خواہ کچھ بھی کیا تھا پھر بھی میرا اسے ہلاک کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔

آخری بار اس سے میرا تصادم ہوا تھا تو میں نے اسے تلقین کی تھی کہ وہ اس سلسلے کو روک لے اور اگر آئندہ اس نے مجھ پر کوئی قاتلانہ حملہ کرایا تو وہ اس کی زندگی کی آخری کوشش ہوگی۔ اس کے باوجود کم از کم اس وقت تک میرا اسے ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں اس کی احمقانہ مختلف مزاجی کو معاف کئے جا رہا تھا۔ ہر بار میں اس سے نرمی برت جاتا تھا۔ اس بار بھی وہ غیر ارادی طور پر ہی میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ وہ قیصر ملک ہے تو شاید ایک بار پھر مجھے اس کی جوانی پر ترس آجاتا۔ میں اس کے ہاتھوں سے خود کو بچانے اور اسے زندہ چھوڑنے کی کوئی تدبیر کر ہی لیتا لیکن وہ احمق تو ایک عرصے سے گویا موت کو گھسیٹ گھسیٹ کر اپنے سر پر مسلط ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔

موت اس کی رگوں میں پنجے گاڑ چکی تھی اور ارد گرد اندھیرا بھی پھیلا ہوا تھا' اس کے باوجود اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا "گدھے کہیں کے! میرا تمہیں مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تم نے خود ہی اپنی قیمتی زندگی بے مقصد ضائع کی ہے۔" پھر میں نے چکور کی ایک آواز میں حنیف اور سردار کو سگنل دیا کہ سب ٹھیک ہوچکا ہے اور اب وہ سامنے آسکتے ہیں۔ جیب سے ایک ننھی اور چپٹی سی ٹارچ نکال کر میں نے اس کے چہرے پر روشنی ڈالی' وہ یقیناً چند لمحے کا مہمان تھا۔

اذیت کے ان لمحات میں بھی اس نے عجیب سے انداز میں مسکرانے کی کوشش کی اور لہو کے چھینٹے منہ سے اڑاتے ہوئے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا "تم بہت لگی آدمی ہو افضل چوہدری۔۔۔! اب۔۔۔ اب تو بتا دو تم نے میرے باپ کو کس طرح ہلاک کیا تھا۔۔۔ کہاں غائب کیا تھا۔۔۔ بتا دو پلیز۔۔۔ کہیں اس کی قبر ہے یا نہیں۔۔۔"

"اب جان کر کیا کرو گے احمق!" میں نے طویل سانس لے کر کہا "اب کون سا تم اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاسکو گے۔"

"پھر بھی۔۔۔ پھر بھی" وہ بڑی مشکل سے سرگوشی کے سے انداز میں بولا مگر اسے جملہ مکمل کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ اس کا منہ بھی کھلا رہ گیا اور آنکھیں بھی۔ اس دوران حنیف اور سردار بھی دوڑتے ہوئے قریب آگئے۔ رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ حنیف کے پاس ایک بڑی سی ٹارچ بھی تھی۔ اس نے ٹارچ روشن کی اور قیصر ملک تیز روشنی میں نہا گیا۔ وہ واقعی مرچکا تھا

ذرا سی دیر میں اس کے جسم سے بہت خون بہہ گیا تھا اور مٹی میں جذب ہو گیا تھا۔

"یہ تو قیصر ملک ہے..... لیکن اس حلیے میں؟" حنیف حیرت سے بولا۔ قیصر ملک واقعی ڈاکو لگ رہا تھا اور وہ بھی فلمی قسم کا۔ اس کی کمر سے سب مشین گن کی گولیوں کی بیلٹ بھی بندھی ہوئی تھی۔

میں نے اس کی کالی پگڑی سے دوبارہ اس کے چہرے پر ڈھاٹا باندھ دیا اور کپڑے اچھی طرح جھاڑ کر سیدھا ہوتے ہوئے کہا "آؤ چلیں۔"

حنیف اور سردار بھی یوں اطمینان سے سر ہلا کر میرے ساتھ چل دیے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ راستے میں ہم ان تین سیاہ پوشوں کے قریب بھی رُکے جو پہلے ہی مر چکے تھے اور ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصل پر ہی آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے۔ ہم نے ان کے چہرے بھی کھول کر دیکھے لیکن وہ تینوں ہمارے لئے اجنبی تھے۔ شاید کرائے کے بدمعاش یا پھر سچ مچ کے ڈاکو تھے۔ انہیں کئی کئی گولیاں لگی تھیں۔ مرنے کے بعد ان کے چہروں پر کرختگی اور خشونت نمایاں تھی۔ ان کے خدوخال بتاتے تھے کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ جنگلوں بیابانوں میں ہی گزرا تھا۔ ہم نے ان کے چہروں پر بھی دوبارہ ڈھاٹے باندھ دیے اور اس طرف چل دیے جدھر میری گاڑی کھڑی تھی۔

حنیف اور سردار اپنی گاڑی سڑک سے کچھ ہی دور چھوڑ کر آئے تھے۔ سیاہ پوش میرے تعاقب میں تھے لیکن انہیں نہیں معلوم تھا کہ حنیف اور سردار کی شکل میں موت ان کے تعاقب میں تھی۔ میری گاڑی میں بیٹھ کر ہم تینوں کچے ہی کچے میں اس طرف روانہ ہوئے جدھر حنیف اور سردار نے گاڑی چھوڑی تھی۔

"فائرنگ کی آوازیں سن کر سڑک سے گزرنے والی اِکا دُکا بسیں یا گاڑیاں رک نہ گئی ہوں؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"سر! ان ویرانوں میں فائرنگ کی آوازیں سن کر تو سڑک سے گزرتی گاڑیوں اور بسوں والے اپنی رفتار بڑھا دیتے ہیں۔" سردار بولا۔ اس کا خیال درست تھا' میں اس حقیقت کو بھول گیا تھا۔

ہم دوسری گاڑی تک پہنچنے سے پہلے گڑے تک پہنچ گئے جو سڑک سے اتر آیا تھا اور نشیب میں کھڑا تھا۔ دونوں سانڈ بڑے اطمینان سے کھڑے جگالی کر رہے تھے۔ ان کی گردنوں پر جہاں جُوا رکھا جاتا تھا وہاں بھاری وزن کی مسلسل رگڑ سے گوشت پھول پھول کر تھیلیوں کی طرح لٹک گیا تھا۔ زخم بھی پڑے ہوئے تھے۔ ان گڈوں میں جوتے جانے والے سانڈوں کی گردنوں کا یہی حال مستقل رہتا تھا مگر اسی طرح گردنوں پر جُوا رکھے وہ ستراتی بلکہ سو سو من وزنی گڈا کھینچتے رہتے تھے۔ گاڑی کی روشنی سانڈوں پڑی تو انہوں نے ایک عجیب درویشانہ بے نیازی سے سر اٹھا کر ایک نظر گاڑی کی طرف دیکھا اور اُداسی آمیز سے انداز میں کانوں کو حرکت دے کر دوبارہ سر جھکا لیا اور جگالی کا سلسلہ وہیں سے شروع کر دیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

میرا اشارہ پا کر سردار نے گاڑی سے اتر کر گڈے پر چڑھ ایک نظر اس کا جائزہ لیا اور واپس آ کر بولا "گڈا بالکل خالی ہے اس پر دو میلے گدوں اور ایک لحاف کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

میں نے اطمینان سے سر ہلایا اور حنیف کی رہنمائی میں آگے بڑھا دی۔ ان کی گاڑی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس بھی انجن اسٹارٹ تھا اور دروازہ کھلا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں ہو کر رائفلیں چھپا چکے تو میں نے تیزی سے گاڑی موڑی اور مناسب سی جگہ آنے کے بعد سڑک پر چڑھا دی۔

گھڑی ابھی تک میری کلائی پر موجود تھی اور میں نے اطمینان کر لیا تھا کہ میری کوئی اور چیز بھی اس ساری گڑبڑ کے دوران گم نہیں گری تھی۔ اس ساری کارروائی میں صرف اٹھائیس منٹ صرف ہوئے تھے۔ چار زندگیاں ختم ہو گئی تھیں اور میری زندگی کا ایک اہم باب ختم ہو گیا تھا۔ قیصر ملک کا باپ ملک اسلم میرے باپ کے قتل کا ذمے دار تھا اور میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ قیصر ملک اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور غیر شادی شدہ تھا۔ گویا ملک اسلم کا خاندان ختم ہو چکا تھا۔ اب وہاں کوئی مجھ سے انتقام لینے کی خواہش میں جھلسنے والا باقی نہیں رہا تھا۔ میں آج جب آشرم سے نکلا تھا تو مجھے گمان تک نہیں تھا کہ راہ چلتے یوں اچانک یہ سب ختم ہو جائے گا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ قیصر ملک کو کس طرح معلوم تھا' میں افضال شاہ سے مل کر اس وقت اس راستے سے واپس آ رہا ہوں گا۔ کبھی تو وہ گھات لگائے راستے میں موجود تھا۔ یہ محض ایک اتفاق تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے کس نے میرا پروگرام سے مطلع کیا تھا؟ میرے ساتھیوں اور کارکنوں میں تو کوئی غدار کی موجودگی بعید از امکان تھی۔ اس پہلو پر تو میرا ذہن سوچنے کے لئے آمادہ ہی نہیں تھا۔ تو پھر.....؟

اس سوال کو میں نے اپنے ذہن میں معلق چھوڑ دیا۔ بعض سوالوں کے جواب وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی سامنے آ جاتے ہیں۔ میں طوفانی رفتار سے گھر پہنچا' غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور چیمبر آف کامرس کے ڈنر میں ہوٹل جا پہنچا۔ میں نے اس واقعے کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

دو دن بعد افضال شاہ زمین کی قیمت کی ادائیگی کے سلسلے میں دفتر آیا تو مجھ سے بھی اس کی ملاقات ہوئی' وہ کچھ بجھا بجھا سا نظر آ رہا تھا۔ باتوں کے دوران بولا "میں شاید آج رقم ٹرانسفر کرانے کے سلسلے میں نہ آتا لیکن کمپنی والوں کا اصرار تھا کہ انہوں نے ساری کارروائی مکمل کر لی ہے۔ پھر میں آپ کے دفتر کے سامنے سے گزر بھی رہا تھا۔ سوچا چلو دستخط کرتا ہی چلوں۔ آپ جیسے آدمی کے ساتھ یہ ڈیل مکمل ہونے پر مجھے بہت خوشی ہوتی لیکن ایک افسوسناک واقعے نے ساری خوشی کرکری کر دی۔"

"کیا ہوا؟" میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"ہمارا ایک پرانا جاننے والا زمیندار تھا' قیصر ملک۔ نوجوان ہے۔ باپ کی اس کے باپ سے شناسائی رہی تھی۔" وہ مغموم لہجے میں بولا۔ میرے کان کھڑے ہوئے۔

"بات جاری رکھتے ہوئے بولا "شاید آپ اسے جانتے بھی ہیں۔ میں نے سنا ہے' آپ کا قلم بزنس سے بھی تھوڑا بہت تعلق ہے۔ اس کا بھی باپ کے زمانے سے فلمی دنیا سے تعلق چلا آ رہا ہے۔ بہت سی فلمیں پروڈیوس کی تھیں انہوں نے۔ جن میں کامیاب بھی رہی تھیں۔"

"ہاں۔ کچھ یاد تو پڑتا ہے۔ نام تو کچھ مانوس سا ہے۔" میں نے زور دینے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "اصل میں قلم بزنس میں توجہ دینے کا مجھے کچھ زیادہ وقت نہیں ملتا۔ میرا ایک آدمی اشفاق احمد۔ وہ سارے معاملات ہینڈل کرتا ہے' وہی سب کو دیکھتا ہے۔ بہرحال آپ کیا بتانے جا رہے تھے؟"

"آپ نے شاید اخبار میں چھوٹی سی خبر پڑھی ہو۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "پولیس کو ویرانے میں تین بدنام ڈاکوؤں کے اس کی لاش ملی ہے۔ تینوں ڈاکو قتل اور ڈکیتیوں کی کئی وارداتوں میں پولیس کو مطلوب تھے۔ زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ قیصر ملک بھی ڈاکوؤں والے حلیے میں تھا۔ پولیس کو کافی حد تک یقین ہو چکا ہے کہ وہ نہ صرف ڈاکوؤں کی سرپرستی کرتا تھا بلکہ کسی موقع پر خود بھی وارداتوں میں حصہ لیتا تھا اور وہ چاروں مخالف گروہ کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔"

"اچھا!" میں نے آنکھیں تھوڑی سی پھیلا کر ذرا حیرت کا اظہار کیا "اس قسم کی افواہیں تو خیر اکثر سننے میں آتی ہیں کہ بعض زمیندار ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں سنا کہ زمیندار خود بھی انہی کے سے حلیے میں ان کے ساتھ واردات میں حصہ لینے چل پڑا ہو۔ جب اشاروں پر عمدگی سے ناچنے والی کٹھ پتلیاں موجود ہوں تو اتنی زحمت کرنے اور اتنا خطرہ مول لینے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔"

"جی ہاں۔ یہی میں نے بھی پولیس کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "لیکن پولیس تو پولیس ہے نا' جانے جو رائے قائم کر لی سو کر لی۔ میں نے زیادہ زور اس لئے نہیں دیا کہ کہیں وہ مجھے ہی شاملِ تفتیش نہ کر لیں۔ ان کے تیور کچھ ایسے ہی ہو چلے تھے۔"

"اوہ!" میں نے متاسفانہ انداز میں سر ہلایا "یہ تو آپ نے اصل بری خبر سنائی۔ میں نے اخبار میں نہیں پڑھی۔ مجھے اخبارات زیادہ تفصیل سے پڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ خاصا گہرا دوست تھا آپ کا؟"

"نہیں۔ اسے گہرا دوست تو نہیں کہا جا سکتا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا "عمر میں وہ مجھ سے کافی چھوٹا تھا لیکن بہرحال پرانی شناسائی تھی۔ ملاقاتیں کم ہی رہیں۔ کبھی کبھار وہ لندن آتا تو خاصی لمبی ملاقاتیں رہتی تھیں لیکن پھر میں پیرس چلا گیا تھا تو ملاقاتوں کا سلسلہ کافی عرصہ منقطع رہا تھا۔ ذرا عیاش سا نوجوان تھا لیکن میرے خیال میں اتنا برا نہیں تھا جتنی بری اس کی تصویر اب سامنے آئی ہے۔"

میں ہمدردانہ انداز میں سر ہلاتا رہا۔ وہ بولا "جس روز آپ کو میرے پاس آنا تھا اس روز بھی اس بدنصیب سے میری ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔ میں نے اس سے آپ کا ذکر بھی کیا تھا کہ آپ سے میری زمین کا سودا فائنل ہو رہا ہے اور آج آپ زمین دیکھنے آئیں گے بلکہ اس نے پوچھا بھی تھا کہ میں کس وقت تک اس چکر سے فارغ ہو جاؤں گا۔ وہ مجھے اپنے ہاں بلانا چاہتا تھا۔"

میرا خیال درست تھا کہ بعض سوالوں کا جواب وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی مل جاتا ہے۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میرا پروگرام قیصر ملک کے علم میں کس طرح تھا۔ اس کے سازشی ذہن نے نہ جانے کیوں اس انداز میں ایک بار پھر میری جان لینے کی تدبیر کی تھی اور خود جان گنوا بیٹھا تھا۔ مجھے اس کی جواں مرگی کا افسوس تھا۔ لیکن ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ یہ باب بند ہو گیا تھا۔ میرے پاؤں سے گویا پھانس سی نکل گئی تھی۔ کبھی کبھار یہ پھانس خواہ مخواہ ہی زیادہ تکلیف دینے لگتی تھی۔

ادائیگی کی کارروائی مکمل ہو چکی تو افضال شاہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی کیترین نے انٹرکام پر بتایا کہ سیٹھ عالم شیر مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔

عظیم جرنیل بونا پارٹ کی زندگی
اور کارناموں پر مشتمل
ایک دلچسپ کتاب-----

نپولین بونا پارٹ

قیمت: -/75 روپے

★---- پروفیسر ایم اشرف

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

"اسے بتادو کہ اس وقت میں مصروف ہوں' پھر کسی وقت بات کرے۔" میں نے ریسیور رکھ دیا اور فائلیں دیکھنے لگا۔ ان میں زیادہ تر باہر سے آئی ہوئی ڈاک تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد کیترین خود دستک دے کر کمرے میں آئی اور ہچکچاتے ہوئے بولی "سر! وہ عالم شیر نے بڑا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ پہلے آرام سے بات کر رہا تھا' پھر رعب ڈالنے لگا' اب منت سماجت کر رہا ہے۔ وہ صرف چند سیکنڈ بات کرنا چاہتا ہے۔"

"اسے ڈانٹ پلائی ہوتی۔" میں نے کہا۔

"ڈانٹ تو بہت پلائی ہے سر!" وہ انگلیوں میں پینسل گھماتے ہوئے بولی "اس کے بعد ہی تو منت سماجت کرنے لگا ہے۔"

"اچھا ملاؤ۔" میں نے بے زاری سے کہا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں نے ریسیور اٹھالیا۔

لائن ملتے ہی دوسری طرف سے عالم شیر بلا تمہید چیخا "تم نے اچھا نہیں کیا چوہدری!"

"کیا بدتمیزی ہے۔" میں نے اسے ڈانٹا "اگر اتنے زور سے ہی چیخنا تھا تو فون استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ویسے ہی اپنے آفس کی کھڑکی سے سر نکال کر گلا پھاڑتے تو آواز مجھ تک پہنچ جاتی۔"

"باتیں کرنی بہت آگئی ہیں تمہیں۔" اس کا والیوم کم نہیں ہوا "لیکن میں تمہیں بتا رہا ہوں تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں تمہیں پچھتانے پر مجبور کردوں گا۔"

"کیا اچھا نہیں کیا؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"یہ جو تم نے مجھے اغوا کروا کے بائیس لاکھ روپیہ تاوان وصول کیا ہے' یہ میں تمہیں ہضم نہیں ہونے دوں گا۔" غصے کی شدت سے اس کی آواز پھٹی جارہی تھی۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" میں نے برہمی سے کہا "میں اس قسم کا بے ہودہ مذاق پسند نہیں کرتا۔"

"مذاق؟ تمہارے خیال میں' میں مذاق کر رہا ہوں؟ جس کی تم نے اتنی بے عزتی کی۔۔۔ جس سے بائیس لاکھ روپیہ چھینا اسے مذاق سوجھے گا؟" اس کے لہجے سے محسوس ہو رہا تھا کہ شاید اس وقت اس کی باچھوں سے کف بہہ رہا تھا۔

"شیر عالم!" میں نے بدستور ملائمت سے کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں کسی قسم کا دورہ پڑا ہے۔ تمہیں شاید کسی نے نہیں بتایا کہ اس حالت میں شہر کے معزز لوگوں کو فون کرکے ادھر اُدھر کی بکواس کرنے اور اول فول بکنے کے بجائے کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کیا کرتے ہیں؟"

"ڈاکٹر سے تو میں رجوع کرچکا ہوں' اپنے زخموں اور چوٹوں کا اعلان کروا رہا ہوں۔ لیکن تمہیں عنقریب گورکن سے رجوع کرنا پڑے گا۔ تھوک کے حساب سے لاشیں اٹھیں گی تمہارے ساتھیوں کی۔ اور تم خود بھی محافظوں کے گھیرے میں کب تک بچو گے؟ کسی نہ کسی روز کوئی گولی تم تک پہنچنے کے لئے محافظوں کے حلقے میں بھی راستہ تلاش کرلے گی۔" پہنچتے پہنچتے اب خود ہی کی آواز کچھ کم ہوگئی تھی۔

"اب مجھے پورا یقین ہوگیا ہے کہ تمہارا ذہنی توازن خراب ہوچکا ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا "میں پاگل خانے والوں کو فون کرتا ہوں۔ پتا نہیں تم کن کی لاشوں اور کن محافظوں کی بات کر رہے ہو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم زیادہ خطرناک پاگل نہ بن جاؤ۔ میں تمہیں ابھی پاگل خانے بھجوانے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"اب تم مجھے کہیں بلوانے اور کہیں بھجوانے کا بندوبست نہیں کرسکو گے بچے!" وہ زہریلے لہجے میں بولا "اب تو سارا بندوبست میں ہی کروں گا۔ خیریت چاہتے ہو تو میرا بائیس لاکھ واپس کردو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا وہ کون سی بائیس لاکھ کی رقم جس کے صدمے سے تم ذہنی توازن کھو بیٹھے ہو۔ میرا تو تم سے قسم کا کوئی لین دین بھی نہیں ہے۔" میں نے بے زاری سے کہا

"سب سمجھ میں آجائے گا بچے! سب سمجھ میں آجائے گا" وہ گویا پھنکارتے ہوئے بولا "تم نے ابھی صرف اپنا ہاتھ دکھایا۔ ابھی تم نے عالم شیر کا ہاتھ نہیں دیکھا۔"

"حاجی صاحب!" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "معلوم ہے تم اُدھر اپنے فون کے ساتھ ریکارڈنگ سسٹم منسلک کرکے میری گفتگو ریکارڈ کررہے ہو لیکن تمہاری اطلاع کے لئے عرض کہ اِدھر میرے فون سے بھی گفتگو ریکارڈ ہوتی ہے۔ اور تم نے اب تک جو بھی بکواس کی ہے وہ ساری کی ساری دھمکی اور ہراس پھیلانے کی کوشش ہے۔ اگر یہ کیسٹ میں آئی جی صاحب کو بھجوادوں تو فوری طور پر تمہارے خلاف سخت قانونی کارروائی ہوسکتی ہے۔ تمہارے وارنٹ بھی نکل سکتے ہیں۔"

"یہ ریکارڈنگ شکارڈنگ۔۔۔ یہ کیسٹ۔۔۔ یہ وارنٹ۔۔۔ قانونی کارروائیاں' یہ سب تمہارے مشغلے ہیں برخوردار!" وہ پھنکارا۔ "ہمارے طور طریقے تو بالکل سیدھے سادے اور ٹو پوائنٹ ہوتے ہیں۔ اب تمہیں واسطہ پڑے گا تو سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔ اب تم یہ نہیں کہہ سکو گے کہ کسی نے تمہیں للکارا بغیر مارا تھا۔ اب ہماری تمہاری کھلی جنگ ہے' جو بندوبست چاہے کرلینا۔"

"ایک بندوبست تو میں فوری طور پر کررہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا؟" اس نے غالباً غیر ارادی طور پر پوچھا۔

"یہی کہ میں فون بند کررہا ہوں۔" میں نے کہا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ اس وقت دوسری طرف اس کی حالت یقیناً دیدنی ہوگی۔ ایسے نازک موقعوں پر باتصویر ٹیلی فون کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ میں نے شیر عالم کی گفتگو کی ریکارڈنگ سے زیادہ

نہیں دی تھی تاہم کچھ دیر بعد میں نے محض احتیاطاً اپنے ساتھیوں کو معمول سے ذرا زیادہ ہوشیار رہنے کا سگنل دے دیا۔

دوسرے روز سے میری کاروباری مصروفیات بہت بڑھ گئیں۔ دس بارہ روز کے لئے لندن بھی جانا پڑا۔ وہاں بھی مصروفیات زیادہ رہیں۔ کئی پارٹیوں سے ملاقاتیں' لنچ اور ڈنر طے تھے۔ بے مسائل طے کرنا تھے۔ اور ان پارٹیوں میں ایک کروڑپتی انگریز جوڈی فوسٹر بھی شامل تھی جو پہلی بار مجھ سے ملی تھی۔ اس سے اس نے صرف کمپنی کی طرف سے آنے والے خطوں پر میرے دستخط دیکھے تھے' مجھے نہیں دیکھا تھا۔

میرے بارے میں اس کے ذہن میں یہی تاثر تھا کہ موٹی سی توند والا کوئی امیر بڈھا ہوگا جو پنجابی لہجے میں انگریزی بولتا ہوگا۔ یہ اس نے مجھے بعد میں بتایا۔

میں نے تو خیر اس کے بارے میں کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا بلکہ صحیح طور پر معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ ہماری پارٹیوں میں شامل ہے۔ مجھے تو بس لندن روانہ ہوتے وقت میرے ایکسپورٹ منیجر نے فائل تھمادی تھی جس میں کچھ لوگوں کے ناموں کی فہرست تھی کہ مجھے ان سے ملنا ہے۔ کچھ کاغذات پر اہم نکات اور ملاقات کی تاریخیں وغیرہ درج تھی۔ ان سب سے ملاقاتیں پہلے ہی طے ہوچکی تھیں۔

جوڈی فوسٹر ایک نوخیز اداکارہ کا نام بھی تھا لیکن ایک بہت بڑی کمپنی کی مالکن کا یہ نام پڑھ کر میرے ذہن میں بھی کچھ ایسا ہی تاثر آیا تھا کہ وہ کوئی بڑی خراٹ اور قدرے سنکی قسم کی بڑھیا ہوگی۔ عام طور پر کسی بہت بڑی کمپنی کی مالک بننے کی نوبت آتے آتے عورت عمر کی اسی منزل کو پہنچ چکی ہوتی ہے تب ہی اسے کاروبار کو چلانے کا سلیقہ آتا ہے۔

لیکن ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں بزنس لنچ پر اس سے ملاقات ہوئی تو ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ وہ سنہرے بالوں والی ایک دراز قد عورت تھی جس کی عمر شاید تیس کے قریب رہی ہو لیکن وہ بمشکل بائیس چوبیس کی لڑکی نظر آتی تھی۔ وہ بے پناہ حسین تھی لیکن روسی لڑکیوں کی طرح اس کے حسن میں وہی پھیکا پن اور وہی ٹھنڈک تھی جو شفاف برف پوش چوٹیوں میں ہوتی ہے۔

ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر اچھی طرح حیران ہوچکے تو دونوں نے ہی کوبے اختیار ہنسی آگئی۔ ہم اپنا اپنا کاروباری رکھ رکھاؤ اور سرد مہری بالکل بھول گئے۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی اونچے طبقے کے انگریزوں والی وضع داری بھی بالائے طاق رکھ دی۔ چند منٹ بعد ہی ہم دو بے تکلف پرانے نوجوان دوست نظر آنے لگے۔ مجھے تو کاروبار پھر بھی کچھ یاد رہا لیکن اس نے شاید ہر چیز بالکل ہی بھلا دی۔

ہم نے ایک دوسرے کو صاف گوئی سے وہ رائے بھی بتادی جو ہم نے ایک دوسرے کے بارے میں قائم کر رکھی تھی۔ ہنسی مذاق کی باتوں کے دوران میں بار بار کوئی کاروباری نکتہ اٹھاتا تو وہ بے زاری سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہتی "اوہ۔۔۔ مسٹر شوڈری (چوہدری) اٹ از آل رائٹ۔۔۔ یور رائٹ اپنی تھنگ' آئی ول سائن اٹ۔"

اس سے میری ایک رپورٹ کمپنی کا کئی ملین پاؤنڈ سالانہ کا لین دین تھا' وہ ہماری دی آئی پی لسٹ میں تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس سے ملتے وقت مجھے خواہ مخواہ مصنوعی خوش اخلاقی سے مسکرانا اور اس کی ہر بات کی تائید میں سر ہلانا پڑے گا جو میرے لئے ایک مشکل کام تھا لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہوگیا تھا' اس کے التفات کو سنبھالنا میرے لئے مشکل ہو رہا تھا۔

دوسرے روز وہ بغیر کسی اپائنٹمنٹ کے میرے ہوٹل کے سوئٹ میں آگئی۔ کاروبار کی تو اب کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی' اب تو اسے صرف یہ جاننے کی فکر رہتی تھی کہ میں کب فارغ ہوں گا' کب ہم ڈانس کے لئے جاسکتے ہیں' کب ہم تھیٹر جاسکتے ہیں اور کب مضافات میں لمبی ڈرائیو کے لئے نکل سکتے ہیں۔

میں نے اسے اشاروں کنایوں میں بتانے کی کوشش کی کہ میں ان کاموں کے لئے لندن نہیں آیا تھا۔ سوئٹ کے اندر تک کی دوستی تو ٹھیک تھی لیکن اب میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دنیا جہان کی خاک چھاننا نہیں پھر سکتا تھا۔ ادھر اس کے اندر کی تنہائی' اور روح کی افسردگی' وغیرہ ختم ہی ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

اس نے مجھے یہ بھی بتادیا کہ اسے ساری دولت وراثتاً اور جمی جمائی کمپنی اس کے آنجہانی شوہر سے ترکے میں ملی تھی۔ جوڈی کی وہ پہلی اور اس کے شوہر کی تیسری شادی تھی۔ جوڈی کی عمر اس وقت چوبیس سال اور اس کے شوہر کی بیاسی سال تھی۔ شادی کے صرف دو سال بعد اس کا انتقال ہوگیا تھا۔

یہ سب کچھ سن کر میرے ذہن میں نوجوانی کی پڑھی ہوئی جرم و سزا کی وہ ساری کہانیاں تازہ ہوگئی تھیں جن میں نوجوان بیویاں عمر رسیدہ دولت مند شوہروں کے قتل کی سازش کرتی تھیں۔

اس نے گویا میرے خیالات پڑھ لئے اور مجھے جھنجوڑ کر میرے بال بکھیرتے ہوئے بے تحاشہ ہنستے ہوئے بولی "مجھے کوئی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ مجھے صرف دو سال دلجمعی سے انتظار کرنا پڑا تھا۔ وہ انجائنا کا مریض تھا۔ بلڈ پریشر تقریباً ہر وقت ہائی رہتا تھا۔ شراب پی پی کر اس کے گردے ناکارہ ہوچکے تھے۔ مٹھی بھر سلیپنگ پلز کھائے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔ اعصاب ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے تو حیرت تھی کہ میرا انتظار اتنا طویل کیوں ثابت ہوا۔"

مجھے ان لوگوں کے حوصلے پر بڑا رشک آتا تھا جو بلڈ پریشر اور امراض قلب وغیرہ میں مبتلا ہوتے تھے۔ جن کے گردے اور پھیپھڑے وغیرہ تقریباً ناکارہ ہوتے تھے مگر جو اسی نوے سال کی عمر میں پچپن تیس سال کی لڑکی سے شادی کرلیتے تھے۔ انتہائی بلند

حوصلے کے بغیر اس قسم کے کارنامے انجام نہیں دیے جاسکتے۔

لندن سے میں واپس آنے لگا تو یہ جان کر میرے ہوش اڑ گئے کہ جوڈی فوسٹر میرے ساتھ پاکستان آنے کے لئے تلی بیٹھی تھی۔ اس کا حسن' اس کی نوازشات اور اس کی شخصیت کی کشش اپنی جگہ تھی اور لندن کی حد تک ساتھ عمدگی سے نبھ گیا تھا لیکن میرا دل کہتا تھا کہ میں اسے پاکستان لے جانے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ ادھر اُدھر کے بہانے بنا کر بڑی مشکل سے میں نے اسے اپنے ساتھ چلنے سے باز رکھا۔

میں واپس پہنچا تب بھی بے شمار مصروفیات میری منتظر تھیں۔ انہی مصروفیات کے دوران آفاق مجھ سے ملنے آیا۔ وہ خاصا خوش اور پُرجوش نظر آرہا تھا۔ آفس میں داخل ہوتے ہی بولا "آپ ملک سے باہر تھے۔ آپ کی عدم موجودگی میں فلم انڈسٹری میں تو پے در پے کئی انقلابات آگئے۔ قیصر ملک مارا گیا اور پولیس اس کے ڈاکو ہونے کے بارے میں تفتیش کررہی ہے۔ نصیر نواز نے خودکشی کرلی اور نسیم سجاد نے راتوں رات اس کی جگہ لے لی۔ آپ کے حوالے سے وہ میرے پاس آیا تھا۔ میں نے اس کے لئے پریس کانفرنس کا اہتمام کردیا تھا۔ اچھا خاصا اسکینڈل تھا۔ اخباروں کے فلمی ایڈیشنوں میں تو بڑی بڑی سرخیاں لگی تھیں۔ آپ کو تو کچھ پتا نہیں ہوگا' آپ تو شاید اس وقت روانہ ہوچکے تھے۔"

"نہیں۔ نصر نواز کی خودکشی اور قیصر ملک کی ہلاکت کی خبریں نے جب اخبارات میں پڑھی تو میں یہیں تھا۔ تفصیلات کا بہرحال علم نہیں ہوسکا اور تفصیلات سے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی بھی نہیں۔ میرے لئے یہ کوئی اہم واقعات نہیں ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ اس طرح کے لوگوں کا انجام ایک نہ ایک روز ایسا ہی ہوتا ہے۔" میں نے ملامت سے کہا "تم یہ سناؤ کہ اپنا فلمی کاروبار کیسا جارہا ہے؟"

اس کا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑگیا تاہم مسرور لہجے میں ہی بولا "بہت اچھا جارہا ہے۔ لگتا ہے ہمارا ستارہ بہت صحیح راستے پر چل پڑا ہے۔ تمام رکاوٹیں گویا خود بخود دور ہوتی جارہی ہیں۔ مصروف سے مصروف اسٹارز سے بھی ڈیٹس دھڑا دھڑ ملتی جارہی ہیں۔ ہر شخص تعاون پر تُلا بیٹھا ہے۔ ڈسٹری بیوٹرز رقمیں لئے چلے آرہے ہیں۔ سلیم سید کہتا ہے کہ وہ اپنے بہترین اسکرپٹ صرف ہمارے لئے مخصوص رکھے گا۔ ادھر نسیم سجاد کو سارے پروڈیوسروں نے گھیر لیا ہے۔ اسے زبردستی رقمیں بھی تھمادی ہیں' اس کے لئے سب کچھ کررہے ہیں تاکہ وہ ان کے لئے کہانیاں لکھنی شروع کردے۔ لیکن وہ تو بس جیسے آپ کا مُرید ہے' آپ ہی کے نام کی گردان کرتا رہتا ہے۔ کہتا ہے چوہدری صاحب کے حکم کے بغیر کسی کے لئے کچھ نہیں لکھوں گا۔ وہ اس وقت بھی آپ سے ملنے کی خواہش لئے میرے ساتھ آیا ہوا ہے۔ کیتھرین نے اسے باہر بٹھا رکھا ہے۔ میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ پہلے میں تنہائی میں چوہدری صاحب سے مل لوں' شاید انہیں علیحدگی میں مجھ سے کوئی بات کرنی ہو۔ کوئی ہدایت دینی ہو۔"

"ارے بھئی ایسی کوئی بات نہیں۔ ہدایت کار تم ہو' ہدایت بس اب تم ہی دیتے رہا کرو۔" میں نے انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "ابھی بلوا لیتے ہیں اسے بھی اندر۔ مجھے یہ اچھا لگا ہے۔ شریف آدمی ہے۔"

"جی ہاں۔ لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے۔" آفاق نے تائید میں نے کیتھرین سے کہہ کر نسیم سجاد کو اندر بلوایا اور اس استقبال کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کچھ اس انداز سے اندر آ آنکھیں نم تھیں اور وہ میرے پیروں میں گرا جارہا تھا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ کسی کی حد سے زیادہ انکساری اور عمومیت مجھے شر کردیتی تھی۔

اس کے انداز نے بھی مجھے کھسیانا سا کردیا۔ میں نے اسے سے پکڑ کر سیدھا کرتے ہوئے کہا "یہ آپ کیا کررہے ہیں صاحب؟ خدا کے لئے اپنے پیروں پر ذرا تن کر کھڑے ہونا سیکھیے۔"

وہ گلوگیری آواز میں بولا "بس اب آپ کی نظرِ کرم میر ہے چوہدری صاحب! اب میں سب کچھ سیکھ جاؤں گا۔ میں مٹی آپ نے مجھے سونا بنادیا ہے۔"

میں نے بدستور شرمندگی سے کہا "بنانے والی ذات تو صر اوپر والے کی ہے نسیم صاحب! ہم تو کسی کو بھی کچھ بنانے کی قدر نہیں رکھتے۔ ہم انسان تو زیادہ تر ایک دوسرے کا کچھ بگاڑتے ہیں' بناتے ذرا کم ہی ہیں۔"

"مجھے لگتا ہے' آپ کی یہ انکساری اور اوپر والے پر آپ کا زبردست اعتقاد ہی آپ کو دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی دے ہے۔" وہ میرا اشارہ پاکر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں تو اس بارے میں کوئی رائے دینے سے بھی قاصر ہوں میں بہت گناہ گار انسان ہوں' اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر مہربان ہے تو صرف اس کی صفت ہے ورنہ مجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں کہ وہ پر مہربان ہو۔" میں نے حقیقتاً اپنے دل میں عاجزی کا ایک عجیب سوز محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"سبحان اللہ!" وہ گویا جھوم کر بولا۔ آفاق خاموش اور بخود بیٹھا تھا' وہ جیسے کہیں کھو سا گیا تھا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو آفاق؟" میں نے پوچھا۔

وہ جیسے چونکتے ہوئے بولا "سر! میں سوچ رہا تھا کہ دنیا آپ جیسے دولت والوں کو اور ہم جیسے فلم والوں کو بہت برا سمجھتی ہے یہی سمجھتی ہے کہ ہم تو گناہوں کی دلدل میں گردن تک غرق رہتے ہیں اور شاید کبھی بھول کر بھی خدا کو یاد نہیں کرتے۔ ہم شاید دنیا میں فرعون کے پیروکار ہیں لیکن کوئی اندازہ نہیں کرسکتا کہ ہمارے دلوں میں کتنا گداز اور کتنا خوفِ خدا ہے۔ ہمارے ارادے کمزور ہیں' ہم گناہ گار ہیں۔ ہر قدم پر ہم سے کوئی نہ کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے لیکن ہمیں کم از کم اس کا احساس تو ہے۔ اس دنیا میں بے شمار

تو ایسے ہیں جو گناہوں اور خباثتوں کو بھی نیکیوں کی طرح فخر سے انجام دیتے ہیں اور دنیا میں معزز و سربلند بنے بیٹھے ہیں۔"

"یہ تم سے مزید ایک گناہ سرزد ہورہا ہے آفاق؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا "دوسروں سے اپنا موازنہ کرنا اور اپنے آپ کو اس قسم کی سوچ خودپرستی کی طرف لے جاتی ہے۔ دنیا میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ انہیں اپنا کام کئے جانے دو' ہم اپنا کام کرتے جائیں گے۔"

پھر میں نے نسیم سجاد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "آپ سنائیے نسیم صاحب! کیسی گزر رہی ہے؟"

"بس کیا بتاؤں چوہدری صاحب!" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ہر لمحے دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ کل تک فلم انڈسٹری میں کوئی مجھے جانتا نہیں تھا۔ آج سب میرے گھر حاضری دے رہے ہیں۔ کل تک میں کسی سے ملنے کی کوشش کرتا تو شاید وہ دو منٹ کے لئے مجھے ملاقات کا وقت دیتے۔ دفتر میں بھی نہ بلاتا' آج ایک فلم ساز نے مجھے اپنے بنگلے میں گیسٹ روم کا بڑا پیارا اور سجا سجایا پورشن دے دیا ہے۔ ایک ڈسٹری بیوٹر نے اپنی پرانی گاڑی میرے حوالے کردی ہے۔ ایک نے اپنے خرچ پر ڈرائیور میرے ہمراہ کردیا ہے۔ اور یہ سب اس لئے ہورہا ہے کہ میں نے کسی کے لئے کام کی ہامی نہیں بھری۔ سب نے تو سب سے کہہ دیا کہ بھئی میں تو چوہدری صاحب کا ادنیٰ سا ملازم ہوں۔ میرا فلم تو بس انہی کے لئے وقف رہے گا جنہوں نے مجھے نفرت اور گمنامی میں عزت دی' میرا ہاتھ تھاما اور ہر طرح سے میری مدد کی جبکہ انہیں مجھ سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میری خدمات کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں آج بھی میری خدمات کی ضرورت نہیں ہے۔ میری خدمات کے بغیر بھی ان کا سفر بلند سے بلند تر مقام کی طرف جاری رہے گا۔ لیکن خود مجھے ممونیت کے اظہار کا اس کے سوا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا کہ میں جس قابل بھی ہوں' اپنی صلاحیتیں ان کے لئے وقف کردوں۔ لیکن میری اس تقریر سے بھی کوئی مایوس نہیں ہوا۔ سب کی نوازشات کا سلسلہ جاری ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا' انہیں کیسے روکوں۔ ویسے خوشی بھی ہورہی ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ خوشی کے مارے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے۔"

"نسیم صاحب! آپ جو کچھ کررہے ہیں بالکل غلط کررہے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "میں نے اگر آپ کے لئے کچھ کیا ہے تو وہ اس لئے نہیں کیا کہ میں آپ کو احسان کی زنجیر سے باندھ کر رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ اپنے فیصلوں میں بالکل آزاد رہئے اور ہر وہ معقول کام کیجئے جس سے آپ کی بھلائی کی کوئی صورت نکلتی ہو۔ آپ کسی کے لئے بھی خواہ کتنا ہی کام کریں' کسی کو کتنی ہی ترجیح دیں' اس سے ہمارے آپ کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ آپ نے اپنی عمر کے سنہرے سال پہلے ہی احمقانہ قسم کی غلامی میں گزار دیئے۔ بلکہ گنوا دیئے۔ میں نہیں چاہتا کہ باقی عمر آپ غیر ضروری ممونیت میں ضائع کردیں۔ جس کے لئے دل چاہے کام کیجئے اور اپنی پوری توانائی سے کام کیجئے۔ زیادہ سے زیادہ کام کیجئے' جتنے کنٹریکٹ پورے کرسکتے ہیں اتنے ضرور سائن کیجئے۔ آپ کے حصے کا جتنا بھی عروج کا دور رہ گیا ہے اس سے ضرور استفادہ کیجئے۔ یہی میری خواہش ہے اور یہی میرا مشورہ۔"

"ہمیں تو آپ کے حکم پر چلنا ہے چوہدری صاحب!" وہ دو ٹوک لہجے میں بولا "آپ اجازت دے رہے ہیں تو دوسروں کے لئے بھی کام شروع کردیں گے۔ آپ منع کریں گے تو وہیں ہاتھ روک لیں گے۔"

"نہیں' میں آپ کو منع نہیں کروں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے نسیم سجاد کو دیکھ کر واقعی خوشی ہورہی تھی۔ وہ عمدہ قسم کی سیاہ شیروانی اور سفید پاجامے میں تھا۔ خوشحالی کی چھاؤں میں قدم رکھے اسے چند ہی دن ہوئے تھے لیکن پہلے سے بہت مختلف آدمی دکھائی دینے لگا تھا۔ صاف ستھرا اور نکھرا نکھرا سا۔ چہرے پر عجیب سی چمک آگئی تھی۔ خدوخال سے خود اعتمادی جھلکنے لگی تھی۔ یہ تغیر مجھے بارہا دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اور ہر بار میں حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

غربت میں آدمی زنگ لگے برتن کی طرح ہوتا ہے' گھر کے کونے میں پڑا رہتا ہے۔ نظروں کو بھلا نہیں لگتا۔ گرہن لگا چاند ہوتا ہے جسے دیکھنے کے لئے لوگ گردنیں اونچی نہیں کرتے' نظر چُراتے ہیں۔ خوشحالی اس زنگ آلود برتن پر پالش کردیتی ہے۔ اس میں چمک دمک آجاتی ہے۔ چاند کا گرہن دور ہوجاتا ہے۔ خوشحالی اور عروج زیادہ ہی آجائے تو آدمی عید کے چاند کی طرح ہوجاتا ہے۔ لوگ چھتوں پر چڑھ چڑھ کر دیکھتے ہیں اور بڑے اہتمام سے دیکھتے ہیں۔

آفاق مجھ سے مخاطب ہوا "بہرحال نسیم صاحب دو فلمیں تو ہمارے لئے بھی لکھ رہے ہیں' دونوں ایکشن فلمیں ہوں گی۔"

"نسیم صاحب سے ایکشن فلمیں لکھواؤ گے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بھئی یہ دھیمے اور مرنجاں مرنج قسم کے آدمی ہیں۔ ان سے تو سوشل' میوزیکل اور روینٹک قسم کی فلمیں لکھواؤ۔"

"یہی تو آپ کو معلوم نہیں ہے چوہدری صاحب" آفاق جلدی سے بولا "دھیمے اور مرنجاں مرنج قسم کے آدمی ایکشن فلمیں بہت اچھی لکھ سکتے ہیں۔ نسیم صاحب تو کئی کامیاب ایکشن فلمیں لکھ چکے ہیں لیکن وہ بھی اسی دور میں ریلیز ہوئی ہیں جب ان کی جگہ نصیر نواز کا نام چل رہا تھا۔ ویسے بھی شاید آپ ہماری انڈسٹری کے سب سے بڑے ایکشن رائٹر سے نہیں ملے ہیں جن کا ہیرو سب سے اونچا بولتا ہے۔ ہمیشہ ناقابلِ شکست رہا ہے اور جس نے لاٹھی اور گنڈاسے سے کشتوں کے پشتے لگادیئے ہیں؟"

"نہیں میرا خیال ہے مجھے ان سے ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا۔" میں نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی بڑے دھیمے' مرنجاں مرنج اور دھان پان سے آدمی ہیں۔" آفاق نے بتایا۔ پھر وہ فلسفیانہ سے لہجے میں بولا "لکھنے والے اپنے ادھورے خواب لکھتے ہیں چوہدری صاحب! وہی کچھ زیادہ لکھتے ہیں اور اچھا لکھتے ہیں جس کی ان کی اپنی زندگی میں کمی ہوتی ہے۔ فلموں میں تو خیر بھیڑ چال کا مسئلہ بھی آجاتا ہے۔ پروڈیوسر کے حکم اور پبلک کی ڈیمانڈ کے مطابق بھی لکھنا پڑتا ہے لیکن افسانوں اور کہانیوں کی دنیا میں تو آپ کو میرے نظریئے کے بہت سے ثبوت ملیں گے۔ اگر آپ نے بہت پڑھا ہو اور آپ کو لکھنے والوں سے ملاقات کا موقع بھی ملا ہو تو شاید آپ کو معلوم ہو کہ لکھنے والوں کی زندگی میں جس چیز کی کمی ہوتی ہے اسی کے متعلق وہ خوب لکھ لکھ کر اپنے دل کو غیر شعوری طور پر تسکین پہنچاتے ہیں۔ لیکن بہرحال یہ کوئی معیوب بات نہیں' کسی قسم کا احساسِ محرومیت ہی انسان کو فنکار بناتا ہے۔ بدصورت قلم کار کی تحریر میں بڑا حسن ہوتا ہے اور محبت سے محروم مصنف کی تحریروں میں محبت ہی محبت بکھری ہوتی ہے۔ جن کی تحریروں میں انسانی قدروں کا بڑا پرچار ہوتا ہے اور معاشرے کی بڑی دُہائی دی جاتی ہے' وہ عملی زندگی میں انسانی قدروں کے کچھ ایسے زیادہ امین نہیں ہوتے۔ جن کا ہیرو بڑا شوخ' چنچل اور سوشل ہوتا ہے' وہ خود عام طور پر بڑے شرمیلے اور گوشہ نشین ہوتے ہیں۔ میں اس خیال سے کچھ زیادہ متفق نہیں ہوں کہ تحریر میں لکھنے والے کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔ میرے خیال میں اس بیان میں تصحیح کرکے کچھ یوں کہنا چاہئے کہ اکثر تحریروں میں ان کے لکھنے والوں کی تشنہ تکمیل تمناؤں کا عکس نظر آتا ہے۔"

"بھئی میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ میں نے بہت پڑھا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا "لیکن مجھے یاد ہے' نوجوانی میں' میں دنیائے ادب کے ایک بہت بڑے مزاح نگار کی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ لگے بندھے ان کے کردار تھے جن کا تعلق آسودہ حال گھرانوں سے تھا۔ ان کا ہیرو ہمیشہ دراز قد' کھلنڈرا' خوبرو اور رومینٹک ہوتا تھا۔ بہت لطف آتا تھا ان کی کہانیاں پڑھ کر۔ کچھ عرصہ پہلے اسلام آباد میں ایک پارٹی میں اتفاقاً ان سے ملاقات ہوئی تو مجھے لگا کہ نوجوانی میں وہ بالکل ویسے ہی رہے ہوں گے جیسا ان کا ہیرو ہوتا تھا۔"

"ایسی مثالیں بھی ہوتی ہیں لیکن بہت کم ہوتی ہیں۔ اکا دُکا لکھنے والوں کی شخصیت ان کی تحریروں سے مشابہ نظر آتی ہے۔" آفاق احمد بولا "ویسے میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ کس مزاح نگار کا ذکر کر رہے ہیں۔ میں انہیں تھوڑا بہت جانتا ہوں' ان کے افسانوں اور شخصیت میں صرف یہی مماثلت ہے کہ ان کا ہیرو دراز قد' کھلنڈرا اور خوبرو ہوتا ہے اور وہ خود بھی اسمارٹ ہیں۔ لیکن اور بہت سے تضادات موجود ہیں۔ مثلاً ان کی کہانیاں پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ دل میں پھلجڑیاں سی چھوٹنے لگتی ہیں لیکن وہ خود نہایت بے حد سنجیدہ رہتے ہیں۔ اور جہاں تک ان کے افسانوں کا تعلق ہے بکھرے ہوئے رومینس کا تعلق ہے تو مجھے یقین ہے کہ انہوں نے زندگی میں ایک ہی لڑکی سے رومینس کیا ہوگا جو آج کل ان کی بیوی اور ان کے جوان بچوں کی والدہ ہوں گی۔"

سجاد نسیم بولا "چوہدری صاحب! گستاخی معاف' میں بھی اس حد تک آفاق صاحب کے خیالات سے متفق ہوں۔ اصل میں تخلیق کار لوگ اپنے پیاسے خوابوں کے بیوپاری ہوتے ہیں لیکن پیاسے خواب صرف ہمارے ہی نہیں ہوتے۔ وہ اس ملک کے نوے فیصد لوگوں کے خواب ہوتے ہیں۔ لوگ مافوق الفطرت ہیروز کی کہانیوں پر بڑی ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن آپ نے کبھی سوچا کہ لوگوں کی ایک بہت بڑی اکثریت انہیں ذوق و شوق سے کیوں پڑھتی ہے؟ ہمارے ہاں بیشتر محفلوں میں لاٹھی اور گنڈاسے کی کشتوں کے پشتے لگانے والے فلمی ہیرو کا بڑا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ لیکن آپ نے کبھی سوچا کہ ایک بڑی اکثریت اس کی فلمیں ذوق و شوق سے کیوں دیکھتی ہے؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "یہ سب دراصل کچلے ہوئے اور محروم لوگوں کے ہیروز ہیں۔ اور ہماری سوسائٹی میں کچلے ہوئے اور محروم لوگوں کی اکثریت ہے۔ کم لوگوں کی اکثریت ہے۔ ان کے ان گنت خواب ہیں مگر وہ ایک بھی تعبیر نہیں پا سکتے۔ ان کے ساتھ قدم قدم پر زیادتیاں ہوتی ہیں مگر وہ ایک کا بھی بدلہ نہیں لے سکتے چنانچہ وہ اپنے ہیرو کو سارے کارنامے انجام دیتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ لاشعوری تسکین محسوس کرتے ہیں' ہیرو کی شخصیت میں انہیں اپنی تمناؤں کا عکس نظر آتا ہے۔"

"بالکل ـــــ یہی بات ہے۔ آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔" سجاد جوش میں بولا۔ "اور یہ صرف ہماری ہی سوسائٹی کی کہانی نہیں۔ تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ یہ تقریباً ہر سوسائٹی کی کہانی ہے۔ امریکا میں بھی کشتوں کے پشتے لگا دینے والے ہیرو بہت مقبول ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ یہ کام لاٹھی اور گنڈاسے کے بجائے ہولناک قسم کی گنوں اور دوسرے آٹومیٹک ہتھیاروں سے انجام دیتے ہیں۔ بلکہ وہاں تو اگر ڈائرکٹر کا بس چلے تو وہ ہیرو کے کندھے پر ایک عدد توپ رکھ دے۔"

"ویسے بھی دراصل کہانی یا فلم کے ہیرو کا تصور ہی کچھ ایسا ہے کہ لوگ اسے مار کھاتے دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔" میں نے کہا۔ "وہ لاشعوری طور پر محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہیرو ہی کیا جو مار کھائے۔ لفظ ہیرو ذہن میں آتے ہی ایک ایسے آدمی کا تصور آتا ہے جو ہر مسئلہ حل کر سکتا ہے' ہر مشکل پر قابو پا سکتا ہے' اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتا ہے اور ہیروئن جس کے آگے پیچھے پھرتی ہے۔"

"لیکن سمجھدار لوگ ان باتوں میں یقین نہیں رکھتے۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کہاں ختم ہوتی ہے اور فسانہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔" آفاق بولا۔

"لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کے سر پر کوئی چیز سوار نہیں ہو سکتی۔" سجاد نسیم بولا۔

"بہرحال ہمارے ادارے سے ہر قسم کی فلمیں بنی چاہئیں۔" آفاق نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ خواہ کسی بھی طبقے کی فلم بنائیں' وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک شاندار فلم ہو۔ پبلک کی پروانہ کریں۔ ویسے تو خیر محض زیادہ روپیہ خرچ کرنا فلم کی کامیابی کی ضمانت نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ زیادہ روپیہ کے ساتھ ساتھ اگر ذہانت' محنت اور بے پناہ لگن بھی شامل ہو تو زیادہ آمدنی بھی ہوگی۔ وہ فلم بنانے کا سودا نہیں ہوگی۔"

"میں سی۔اے فلمز کو انہی خطوط پر چلا رہا ہوں چوہدری صاحب۔" آفاق بولا۔ "اور اگر حالات اسی طرح موافق اور سازگار رہے جس طرح اس وقت ہیں تو اس سال کے آخر تک ہم یکے بعد دیگرے چار فلمیں ریلیز کر دیں گے۔ چاروں ایک دوسرے سے بے حد مختلف۔ یہ خاصی اچھی کارکردگی ہوگی۔ ایک سال میں' ایک ہی ادارے سے' ایک ہی ڈائرکٹر کی ڈائرکشن میں یکے بعد دیگرے بڑی فلموں کی چار فلموں کا ریلیز ہو جانا بہت اچھا آغاز ہے۔ جبکہ اس کے بعد ہماری مزید چار فلمیں سیٹ پر ہوں گی۔"

"یہ تو آپ تمہارا شعبہ ہے بھئی۔ تم اچھا کرو یا برا۔ میں تو اس سے بے فکر ہوں۔" میں نے کہا۔ "فلمنے اور فلمیات پر تو تم باتیں کر چکے۔ اب اگر کام کے سلسلے میں کوئی مسئلہ درپیش ہے میرے ذریعے سے حل ہو سکتا ہے تو وہ مجھے بتا دو۔"

ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لئے تھوڑی دیر بعد وہ رخصت ہوئے۔ اس کے بعد خالصتاً کاروباری لوگوں سے انتہائی خشک قسم کی باتیں اور میٹنگیں شروع ہو گئیں۔

کچھ اسی قسم کی ملی جلی سی مصروفیات میں تقریباً ایک ماہ گزر گیا۔ احساس تک نہیں ہو سکا۔ مصروف لوگوں کے لیے وقت واقعی پر لگا کر اڑتا ہے۔ پھر ایک روز ستارہ کا فون آیا۔ اس سے بھی بالکل صرف فون پر ہی گفتگو ہوتی تھی۔ ملاقات کی نوبت نہیں آ رہی تھی۔ مجھے تھوڑی بہت فرصت میسر آتی تھی تو وہ مصروف ہو جاتی تھی۔ وہ بلانے کے لئے فون کرتی تھی تو اتفاق کچھ ایسا ہوتا تھا کہ میں کہیں اور جا رہا ہوتا تھا۔

اپنے مخصوص گلے شکووں کے بعد وہ بولی۔ "تمہیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ کراچی میں تمہارا ہوٹل مکمل ہو گیا ہے اور نسلسوالی کیم کو اس کا افتتاح ہے؟"

"نہیں۔ مجھے واقعی معلوم نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب' لوگوں کو دعوت نامے موصول ہونا شروع ہو گئے ہیں اور مالک کو معلوم ہی نہیں۔" وہ بے یقینی سے بولی۔

"تمہیں معلوم ہے میں جھوٹ نہیں بولتا۔ کم از کم تمہارے سامنے نہیں بولتا۔ اور اس قسم کے معاملات میں نہیں بولتا۔" میں نے کہا۔ "مجھے واقعی معلوم نہیں۔ بس اخبارات میں اشتہارات دیکھ رہا ہوں جن میں عنقریب شاندار افتتاح کی خوشخبری سنائی جا رہی ہے۔"

"بہرحال یہاں تو تمام سپر اسٹارز کو دعوت نامے مل چکے ہیں۔ آنے جانے کا فرسٹ کلاس کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ' وی آئی پی یا لگژری سوئٹ میں جب تک دل چاہے تب تک قیام اور خاصے بیش قیمت تحائف کی پیشکش کی گئی ہے۔ بہت روپیہ خرچ کر رہے ہو۔" وہ بولی۔

"مجھے نہیں معلوم۔ شفیع شاہ کر رہا ہے۔ اور وہ کر رہا ہے تو پھر ٹھیک ہی کر رہا ہوگا۔" میں نے جواب دیا "روپیہ کمانے کے لیے پہلے روپیہ خرچ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"تمہاری بے نیازی دیکھ کر بڑا رشک آتا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ لوگ ان پیش کشوں کی وجہ سے نہیں جا رہے۔ بلکہ اس وجہ سے جا رہے ہیں کہ دعوت نامے تمہاری اور آفاق کی طرف سے ہیں۔ اور تم دونوں کے نام اب انڈسٹری میں ایسے ہو گئے ہیں کہ ان کی طرف سے ملنے والی دعوت کو تو کوئی رد کر ہی نہیں سکتا۔"

"چلو یہ تو اچھی خبر سنائی تم نے۔ اس کا مطلب ہے افتتاح کے موقعے پر گلبرگ والا خانہ خالی نہیں رہے گا۔" میں نے کہا۔

"خانہ تو تمہارا صرف ایک ہی خالی رہے گا۔" وہ بولی۔

"کونسا؟ اوپر والا؟ یعنی کھوپڑی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ خانۂ دل۔" وہ بولی۔

"بددعائیں تو مت دو۔ خانۂ دل میں تو ایسے ایسے حسین آباد ہیں کہ اگر دیکھ لوگی تو جل کر کباب ہو جاؤ گی۔ اور کباب بھی ایسا جس نے لپ اسٹک لگا رکھی ہوگی۔"

"جن کے دلوں میں زیادہ حسین آباد ہوتے ہیں' آخر میں انہی کے دل سب سے زیادہ ویران رہ جاتے ہیں۔" وہ بولی۔

"بکواس چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم کب کراچی جا رہی ہو؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں تو تمہارے ساتھ جانا چاہتی تھی۔" وہ بولی۔

"تم میرے چکر میں مت رہنا۔ میرا کچھ پتا نہیں ہے۔ میں تو شاید ائرپورٹ سے سیدھا عین افتتاح کے وقت پر ہی ہوٹل پہنچوں۔ اسی لئے تو شفیع شاہ مجھے ہر روز کے پروگرام سے آگاہ نہیں کر رہا۔ میں نے ہی اسے منع کر رکھا ہے کہ اس تردد کی ضرورت نہیں۔ بس مجھے تو افتتاح سے صرف ایک آدھ دن پہلے اطلاع دے دی جائے۔ میں تو اسی طرح بھگدڑ میں جاؤں گا۔ جبکہ تم فلم اسٹارز کے سوتخرے ہوتے ہیں۔ تم اپنے فلمی لوگوں کی پلٹن میں سے ہی کسی کے ساتھ پروگرام بنا لینا۔ وہیں کراچی میں ہی ملاقات

ہوگی۔"

"ہاں بھئی..... بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "تمہارے پاس فلم انڈسٹری کی صف اول کی ہیروئن کے ساتھ سفر کرنے کا وقت کہاں ہے۔ ہم تو اب تمہارے لیے کمتری چیز ہوگئے ہیں"۔

"بات کمتری اور برتری کی نہیں ہے اُلو کی دُم"! میں نے اسے ڈانٹا۔ "بات موقع محل کی ہے۔ میرا یہ پورا مہینہ بہت زیادہ مصروفیت کا ہے۔"

"خیر..... ٹھیک ہے۔ تو پھر میں کسی ہینڈسم سے ہیرو کے ساتھ جانے کا پروگرام بناتی ہوں۔ اسی کے سوئٹ میں ٹھہر جاؤں گی۔" اپنی دانست میں وہ مجھے چڑانے کے لئے بولی۔ "تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"ہرگز نہیں۔ مجھے تو بہت خوشی ہوگی۔" میں نے بلا تامل جواب دیا۔

وہ گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "لیکن انڈسٹری میں ہینڈسم ہیرو ہے ہی کون؟ جو مجھے سب سے زیادہ پسند تھا اور ہینڈسم لگتا تھا' وہ اب پچاس کی عمر کو پہنچ رہا ہے۔ ایک فلم میں اسے میرے ابا جان کے رول میں کاسٹ کیا گیا ہے۔ دوسرا جو مجھے تھوڑا سا پسند ہے اس کی بیوی اتنی خونخوار ہے کہ اگر میں اس کے شوہر کے ساتھ چلی گئی تو وہ اپنے شوہر کو جان سے مار دے گی۔ تیسرا بھی مجھے تھوڑا سا پسند تھا لیکن اس کی تو پہلے ہی تین بیویاں ہیں یعنی کُل ڈھائی تین ہیرو ہیں انڈسٹری میں۔ کیسی تنگ دستی کا عالم ہے۔ انسان کسی کو سفر میں ساتھ بھی نہیں لے جاسکتا۔ اور یہ تو ابھی چار قدم کے سفر کی بات ہو رہی ہے۔ زندگی کے سفر کی نہیں۔"

"چہ۔ چہ۔ چہ۔ مجھے بھی ترس آرہا ہے تم پر۔" میں نے کہا۔ "بالکل ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کشکول لے کر لکشمی چوک میں کھڑی ہو اور صدا لگا رہی ہو۔ ایک ہینڈسم سے ہیرو کا سوال ہے بابا' کیسی کیسی غضب کی لڑکیوں کو کیا دن دیکھنا پڑتے ہیں۔"

"بس۔ بس۔ زیادہ غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں"۔ وہ جلدی سے بولی۔ "تمہیں کیا معلوم یہاں کیسے کیسے لوگ صرف ایک نگاہِ التفات کے انتظار میں عمر گنوا رہے ہیں۔ یہ تو میں ایسے ہی ذرا تمہیں بانس پر چڑھانے کے لیے بکواس کر رہی تھی۔"

"بکواس نہیں' اس وقت تم اس محاورے کی تفسیر پیش کر رہی ہو' تربوز کھٹے ہیں۔ یہ محاورہ بالکل ایسے ہی موقعوں کے لئے تخلیق ہوا تھا۔" میں نے کہا۔

"اپنے اس انجام پر تو محاورہ بھی زار و قطار رو رہا ہوگا۔" وہ بولی۔

"دراصل مجھے انگور جیسی چھوٹی چیز سے اپنے آپ کو تشبیہ دینا اچھا نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔ "خیر۔ تو طے پایا کہ تم سے کراچی میں ہی ملاقات ہوگی۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم۔" وہ جل کر بولی۔

"ملاقات کے لیے بھاڑ کوئی مناسب جگہ تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز سے اندازہ ہوا اس نے ریسیور پٹخ دیا تھا لیکن مجھے معلوم تھا یہ مصنوعی غصہ ہے۔ میں مسکرا دیا۔ ستارہ جیسے دوست واقعی خوش نصیبوں کو ہی آتے تھے۔

کچھ دن بعد شفیع شاہ کا فون آیا۔ اس نے تمام حالات کے بارے میں رپورٹ دی۔ تمام کاروباری معاملات ٹھیک ٹھاک تھے۔ ہوٹل کے سلسلے میں بھی انتظامات ٹھیک ٹھاک جا رہے تھے۔

"آپ کا کیا پروگرام ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں عین افتتاح کے دن ہی پہنچوں گا۔ فون کردوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے سر! گاڑی آپ کو لینے کے لیے موجود ہوگی۔ خود شاید ائرپورٹ حاضر نہ ہوسکوں۔" وہ بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے تمہارے لیے کیسا مصروفیت کا دن ہوگا" میں نے ملائمت سے کہا۔

○☆○

یکم کی شام جب میں کراچی ائرپورٹ پر اترا تو موسم بے حد خوشگوار تھا۔ میں لاہور سے چلا تھا تو وہاں خنکی تھی لیکن کراچی کی خوشگوار ہوا کے تیز جھونکوں میں ذرا بھی خنکی نہیں تھی۔ ائرپورٹ پر سلیم نامی ایک آفس مینجر مجھے ریسیو کرنے کے لیے موجود تھا۔ پارکنگ لاٹ میں نیلی مرسیڈیز کے قریب دو مسلح گارڈز بھی موجود تھے۔ شاید شفیع شاہ نے محض احتیاطاً بھیج دئے تھے۔

کئی سال پہلے میں پہلی بار اس ائرپورٹ پر اترا تھا تو اسی مرسیڈیز کی ایک مرسیڈیز مجھے لینے آئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ مرسیڈیز میری ملکیت نہیں تھی لیکن اس میں آنے والے لوگ مجھے اپنے سے لگے تھے۔ اس وقت دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا اور میرا سادہ و معصوم سے دل میں بھی اچھوتی محبت کی کرنیں سی پھیلی تھیں۔ آج شام کا سرمئی اندھیرا گہرا ہو رہا تھا اور زندگی کی تمام ہنگامہ خیزیوں' مسرتوں اور کامیابیوں کے باوجود دل کے کسی گوشے میں یاس آمیز سی تاریکی پر پھیلائے بیٹھی تھی جو بھری محفلوں میں بھی مجھے تنہا کر دیتی تھی۔

اس سے پہلے کہ یادیں میرے رگ و پے میں اداسی کا زہر پھیلاتیں' میں نے انہیں ذہن سے جھٹک دیا۔ سوچنے کے لیے اور بہت سی باتیں تھیں۔ ہوٹل کے افتتاح کے علاوہ بھی بہت سے کاروباری مصروفیات میری منتظر تھیں۔ شفیع شاہ نے بلاشبہ کراچی میں کاروبار کو بہت پھیلا دیا تھا۔ بیشتر معاملات میں وہ بے پناہ باصلاحیت نوجوان تھا لیکن پھر بھی مجھے اس سے کاروبار کے میدان میں اتنی اچھی کارکردگی کی امید نہیں تھی۔ میں اگر خود بھی کراچی میں رہتا تو شاید اتنے کم وقت میں اتنی عمدگی سے کاروبار کو پھیلا

یونکہ میں سر جھکا کر ایک ہی دُھن میں لگ جانے والا آدمی تھا۔ میں محفلیں بھی جماتا تھا' گپ شپ بھی کرتا تھا' تھوڑی سماجی تقریبات میں بھی جاتا تھا۔ مہ رخوں سے رسم و راہ بھی تھی۔ اور اگر کسی کام سے دل اُچاٹ ہو جاتا تھا تو میں اسے چھوڑ بھی دیتا تھا۔ لیکن شفیع شاہ میں یہ خصوصیات بہت ہی کم تھیں۔ وہ تو کسی کام کو پکڑتا تھا تو اسے جن کی طرح چمٹ جاتا تھا۔

گاڑی نے بہت تیز رفتاری سے فاصلہ طے کیا اور آخر کار بلند بالا عمارت کے سامنے جا رُکی جو رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ ایک چوڑی چکلی مصروف شاہراہ کے کنارے وہ نئی عمارت گویا نخوت سے سر اٹھائے کھڑی تھی اور اس کے سر پر "گرین لینڈ ہوٹلز" کا ایک بہت بڑا نیون سائن تاج کی طرح جھلملا رہا تھا۔

ہوٹل کی یہ خوبصورت اور پُرشکوہ عمارت گویا راتوں رات ہی زمین کے سینے سے سر ابھار کر میرے سامنے آگئی تھی۔ کم از کم مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ درحقیقت میں اسی احساس سے لذت اندوز ہونے کے لیے عین اس کے افتتاح کے موقع پر آنا چاہتا تھا۔ میں اس کی تعمیر کے دوران کبھی اسے دیکھنے نہیں آیا تھا۔ میں نے اپنے اوپر بڑا جبر اور ضبط رکھتے ہوئے اسے دیکھنے سے خود کو باز رکھا تھا۔ میں اسے بالکل اسی طرح مکمل حالت میں سجا سجایا دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ بھی میرے خوبصورت خوابوں میں سے ایک خواب تھا۔ میں اسے نقشۂ تکمیل حالت میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

یہ میرا ہوٹل تھا۔ اس احساس کی لذت ہی عجیب تھی۔ اس کی تکمیل کچھ اسی طرح ہوئی تھی جیسے کسی مصور نے بے خبری اور شعوری کے علم میں کوئی شاہکار تخلیق کر ڈالا ہو اور صحیح طور پر بیدار ہونے کے بعد جب وہ تصویر اس کے ہاتھوں میں تھمائی گئی ہو اسے یقین نہ آرہا ہو کہ وہ شاہکار اسی سے سرزد ہوا ہے۔

ڈرائیو اور پارکنگ لاٹ میں چم چم کرتی بیش قیمت گاڑیاں کھڑی نظر آرہی تھیں۔ سبزہ زار پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ کچھ فاصلے پر مرکزی دروازے کے آس پاس بھی کھڑے تھے جو گہرے رنگ کے شیشے کی ایک اونچی سی دیواری مشابہ تھا۔ دروازے کے سامنے سرخ رنگ کا ایک خوبصورت فیتہ تنا ہوا تھا۔ یہ محض رسم نبھانے کے لیے تھا۔ ورنہ مجھے معلوم تھا کہ عملی طور پر تو ہوٹل کا افتتاح ہو چکا تھا۔ دوسرے شہروں سے آئے ہوئے اہم مہمانوں کو حسبِ مراتب کمروں میں ٹھہرایا جا چکا تھا۔ ہوٹل کے تمام کچن مصروف تھے۔ تمام اسٹاف مصروف تھا۔ عمارت کا ہر طرح کا مشینی نظام کام کر رہا تھا۔ آمد و رفت دوہرے دروازوں سے جاری تھی۔ صرف روایت پوری کرنے کے لیے مرکزی دروازے پر فیتہ کٹنا باقی تھا جس کے لیے مرکزی وزیرِ صنعت و تجارت کو آنا تھا۔ دروازے سے لے کر سڑک تک سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ اخباری فوٹوگرافر ادھر اُدھر منڈلا رہے تھے۔

گاڑی سے اتر کر چند لمحے تک میں سر اٹھائے مبہوت سا اس عمارت کو دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ میری آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے دُھندلانے لگیں۔ بہت سے لوگ مجھے ریسیو کرنے کے لیے آگے آچکے تھے۔ ان میں سب سے آگے شفیع شاہ تھا۔ جدید تراش خراش کے سوٹ میں وہ نہایت اسمارٹ اور ہینڈسم لگ رہا تھا۔

"سر! پسند آیا آپ کو اپنا ہوٹل؟" اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے سینے سے لگا لیا اور اس کی کمر تھپکتے ہوئے کہا۔ "بہت پسند آیا۔ لیکن یہ میرا نہیں تم لوگوں کا ہوٹل ہے۔ میرے دوستوں' ساتھیوں اور جاں نثاروں کا۔"

شفیع شاہ کے چہرے پر طمانیت پھیل گئی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لان پر لے گیا اور مہمانوں سے ملوانے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مہمانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان میں ہر شعبۂ زندگی کے اعلیٰ ترین طبقے کے لوگ موجود تھے۔ شوبزنس کے لوگ تھے' سیاست داں تھے' سفارت کار تھے' بزنس میگنیٹس تھے۔ ہر طرح کے لوگ تھے۔ دلکش چہروں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ رنگین پیرہن تھے۔ ترنم قہقہے تھے۔ خوشبوؤں کا ایک سیلاب تھا۔

مہمانوں میں سے بہت سے ذاتی طور پر میرے شناسا تھے۔ بہت سے مجھے غائبانہ طور پر جانتے تھے اور بہت سوں کو میں غائبانہ طور پر جانتا تھا۔ بہت سے لوگوں کو میں جاننے کا خواہشمند رہا تھا اور بہت سے مجھے جاننے کے مشتاق رہے تھے۔ مجھ سے ملنے کے بعد ان سب کا ردِ عمل مشترک تھا۔ سب کو میری نوجوانی پر حیرت تھی۔ ان سب کے ذہنوں میں نہ جانے کیوں میری شخصیت کا تصور یہی تھا کہ میں اگر عمر رسیدہ نہیں تو کم از کم ادھیڑ عمر تو ضرور ہوں گا۔ کیونکہ سب کو معلوم تھا' میں کوئی خاندانی دولت مند نہیں تھا۔ اور اگر آدمی کو ورثے میں دولت نہ ملے تو پھر ڈھیروں دولت کماتے کماتے کافی عمر گزر ہی جاتی ہے۔

آخر کار وقتِ مقررہ سے ایک گھنٹا تاخیر کے ساتھ وزیرِ صنعت و تجارت بھی آہی گئے۔ اصل عمارت کے ارد گرد کی کھلی جگہ ساری کی ساری مہمانوں سے بھر گئی تھی۔ ان میں ستارہ بھی تھی۔ وہ ابھرتی ہوئی ایک ہیروئن کے ساتھ آئی تھی۔ دونوں میں اس مخصوص نفاست و نزاکت کی کمی تھی جو اونچے درجے کی پڑھی لکھی لڑکیوں میں دور سے نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود دونوں قیامت ڈھا رہی تھیں۔ ان کی شخصیت کی اپنی ایک الگ طرح کی کشش تھی۔ اس سے میری ملاقات مختصر اور رسمی سی رہی۔ ہم دونوں ہی کو بہت سے لوگوں سے ملنا پڑ رہا تھا۔ بار بار مجھے بھی کچھ نہ کچھ لوگ گھیر لیتے تھے اور اسے بھی۔ فوٹوگرافرز تو غلمی لوگوں کی طرف زیادہ ہی متوجہ تھے۔

ایک مولانا نے نہایت خوش الحانی سے تلاوت کی اور وزیر

صاحب نے مختصر سی رسمی تقریر کے بعد فیتہ کاٹ دیا۔ ہوٹل کے دروازے مہمانوں کے لئے کھول دئے گئے۔ بیشتر مہمان طویل و عریض لابی میں پہنچ چکے تو یک دم لائٹس آف ہو گئیں۔ کئی خواتین کی تو چیخیں ہی نکل گئیں۔ لیکن ایک لمحے بعد سب کو احساس ہوا کہ بجلی کے نظام نے عین موقعے پر قیامت نہیں ڈھائی تھی بلکہ انہیں تھوڑا سا سرپرائز دینے کے لئے یہ حرکت کی گئی تھی۔

فوراً ہی لابی میں دھیمی دھیمی موسیقی بکھرنے لگی تھی جو نہایت آہستگی سے لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ پھر کاؤنٹرز کے سامنے جلتے اندھیرے میں نہ جانے کہاں سے ایک چھوٹا سا اسٹیج دھیرے دھیرے نمودار ہوا۔ اس پر رنگا رنگ اسپاٹ لائٹس کچھ اس طرح تیزی سے حرکت کر رہی تھیں کہ رقص کا سا انداز بن گیا تھا۔ یہ صرف روشنیوں کا رقص تھا۔

لیکن پھر جیسے ہر روشنی ایک خوبصورت لڑکی کا روپ دھارنے لگی۔ اندھیرے کی کوکھ سے نہ جانے کس طرف سے ایک ایک لڑکی نمودار ہو کر ہر رنگ کی روشنی کے دائرے میں آ گئی تھی اور روشنی ہی کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے لگی تھی۔ وہ دس بارہ لڑکیاں تھیں اور نہایت ہی انوکھے اور اچھوتے انداز میں رقص کر رہی تھیں۔ وہ روایتی اور فرسودہ قسم کا رقص نہیں تھا۔ ان کے لباس بھی ایک دوسرے سے مختلف اور انوکھے قسم کے تھے۔ وہ رقص نہیں کر رہی تھیں گویا موسیقی کے دھیمے سُروں کے ساتھ دھیرے دھیرے ہوا میں ہلکورے لے رہی تھیں۔ اور ان کے ہونٹ خوابناک انداز میں ہل رہے تھے، آنکھیں نیم وا تھیں۔

روشنیوں سے بہت ہی خوبصورت تاثر دیا جا رہا تھا۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے لڑکیاں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئی ہیں اور کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ تعداد میں بڑھ گئی ہو گئی ہیں۔

رقص اور موسیقی جوبن پر آئی تو لوگوں کو اندازہ ہوا کہ وہ ایک غیر روایتی قسم کا ویلکم ڈانس تھا۔ لڑکیوں کے ہاتھوں میں رنگا رنگ قسم کے پھولوں کے ہار تھے۔ جو اُن کے کھلے بالوں کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ لوگ دم بخود کھڑے تھے۔ جو لوگ لابی میں داخل نہیں ہو سکے تھے وہ شیشے کی دیواروں کے پار سے اسی طرح مبہوت سے ہو کر یہ ویلکم ڈانس دیکھ رہے تھے۔ اب میں نے رقص کرنے والی بیشتر لڑکیوں کو پہچان لیا تھا۔ وہ ملک کی ٹاپ کی ماڈلز تھیں۔

اپنی سوسائٹی کے اس رواج کو دیکھ کر مجھے ایک عجیب سا احساس ہوتا تھا کہ ٹی وی پر 'سماجی تقریبات میں ہمارے ہاں پہلے تلاوت کی جاتی تھی اور اس کے بعد رقص و موسیقی یا اسی قسم کے دوسرے سلسلے شروع ہو جاتے تھے۔ یعنی ہم ان چیزوں کا آغاز بھی اللہ ہی کے نام سے کرتے تھے جنہیں اللہ نے ممنوعات قرار دے رکھا تھا۔ بہرحال یہ ایک رواج تھا اور میں بھی رواج کے اس سیلاب میں ایک تنکا تھا۔

رقص خاصا طویل تھا لیکن میرا خیال [illegible] سی طرح دو سو

کو بھی وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا تھا۔ آخر کار موسیقی مدھم ہونے لگی۔ اسپاٹ لائٹس دھیمی پڑتے پڑتے غائب ہونے لگیں اور کے ساتھ ساتھ لڑکیاں بھی ایک ایک کر کے غائب ہونے لگیں حتیٰ کہ اندھیرا پھیلا تو اسٹیج بھی دھیرے دھیرے ایک طرف کو ہوا غائب ہو گیا۔

یک دم چاروں طرف پہلے ہی کی طرح تیز روشنیاں پھیل اور لوگوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اب سامنے کچھ بھی نہیں صرف مختلف قسم کے کاؤنٹرز تھے۔ تب لوگوں کو تالیاں بجانا خیال آیا اور وہ دیر تک تالیاں بجاتے ہی چلے گئے۔ میں بھی شاہ کے انتظامات کی داد دئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس کے بعد مختلفین کی ٹولیاں مہمانوں کو مختلف حصے دکھانے لگیں۔ پورے ہوٹل میں گہما گہمی ہو گئی۔ کچھ لوگ سوئمنگ پول دیکھ رہے تھے تو کچھ بینکوئٹ ہال کا جائزہ لے رہے تھے۔ آڈیٹوریم دیکھ رہے تھے تو کچھ مختلف حصوں پر مختلف ہال دیکھ رہے تھے۔ کچھ لوگ ہوٹل کی فرنشنگ اور آرائش وغیرہ کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔ انہیں ہوٹل میں ہونے والی سہولیات وغیرہ کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔

مہمان چونکہ بہت زیادہ تھے اس لئے ہوٹل میں ہر ہال کے علاوہ سوئمنگ پول پر بھی کھانے کا انتظام تھا۔ کھانے کے آڈیٹوریم میں ایک ورائٹی پروگرام بھی تھا جو ساری رات چلتا اس میں خاص خاص مہمانوں کو تحائف بھی دئے جانے تھے اسٹیج پر پیش کئے جانے والے بعض آئٹمز میں انہیں بھی شریک جانا تھا۔ اس موقعے پر مہمانوں میں تقسیم کرنے کے لئے انتہائی خوبصورت اور ضخیم سوونیئر بھی چھاپا گیا تھا جس میں ہوٹل کے بارے میں ہر تفصیل اور مختلف حصوں کی خوبصورت تصویریں بھی شامل تھیں۔ شفیع شاہ نے بے شمار کمپنیوں اور اداروں کو دفاتر میں یہ سوونیئر بذریعہ ڈاک بھجوانے کا بھی بندوبست کیا تھا۔ اس کی زبانی تمام تفصیلات سن کر مجھے اطمینان ہو رہا تھا کہ وہ انداز میں مطلوبہ حلقے میں ہوٹل کا تعارف کرانے میں تقریباً کامیاب ہو چکا تھا۔

اسی دوران میں نے ایک دُبلے پتلے اور خوب صورت نوجوان کو دیکھا، وہ عمدہ سوٹ میں تھا۔ بوکائے ہوئے تھا۔ اس کے کوٹ کے کالر پر ہوٹل کی انتظامیہ کا مخصوص بیج لگا ہوا تھا۔ کبھی وہ کہیں اس کی جھلک نظر آتی اور کبھی وہ کہیں اور دکھائی دیتا۔ شستہ انگریزی میں مہمانوں کو ہوٹل کے بارے میں کچھ بتاتے تھے کبھی ان کی رہنمائی کرتا۔ کبھی جا کر شیف کو ہدایات دیتے تھے کبھی ویٹرز کو احکامات دیتا۔

مجھے ابھی تک پوری طرح اس کی شکل نظر نہیں آئی تھی جس حد تک بھی اوھر اُدھر سے جھلک نظر آ رہی تھی اس سے مجھے شناسا لگ رہا تھا۔ پھر جب ڈنر شروع ہوا تو ایک مرحلے پر

کا سامنا ہو گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بالکل سامنے ر ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔

راشد تھا۔ میں نے جب آخری بار اسے دیکھا تھا تو اس کی یں رہی تھیں اور میں بھی کچھ ایسا پختہ کار نہیں تھا۔ وہ مجھ سا چھوٹا تھا۔ لیکن بہرحال اب ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ وہ میں ہی بے حد سنجیدہ لڑکا تھا لیکن اب تو اس کے چہرے پر بہت ہی گہری ہو گئی تھی۔ جیسے اسے اپنی عمر سے کچھ زیادہ ابوجھ اٹھانا پڑ گیا ہو۔

یری نظر اس کے چہرے سے ہٹ کر اس کے کالر پر لگے بیج پر گئی اور میں نے نہایت آہستگی سے پوچھا "راشد! تم یاں کر رہے ہو؟"

میں ___" وہ جیسے چونک کر خیالات کی دنیا سے باہر آیا۔ یاں پرسنل منیجر ہوں افضل بھائی!" پھر ایک لمحے کے توقف ہ بولا "آپ یقیناً یہاں مدعو ہوں گے۔ میرے لائق کوئی ت ہو تو حکم فرمایئے۔ سروس میں یہاں مہمانوں ہی کی ت پر مامور ہوں۔"

"مسٹر راشد ___!" اچانک کوئی میرے قریب سے ہی نیم ہ اور خشک لہجے میں بولا "یہ مہمان نہیں ہیں۔ یہ ہماری پ آف کمپنیز کے منیجنگ ڈائریکٹر ___ ہمارے تمام کاروباروں ور اس ہوٹل کے مالک ___ ہمارے باس افضل چوہدری میں نے مڑ کر دیکھا، وہ شفیع شاہ تھا جو راشد کو میرے بارے نا رہا تھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اسے خبردار کر رہا ہو کہ ان حضور میں کوئی گستاخی نہ کر دینا۔ انجانے میں کوئی غلطی نہ ہو۔

پھر وہ میری طرف دیکھ کر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "آپ اس نوجوان کی کم عمری پر نہ جایئے گا۔ بہت محنتی اور احیت نوجوان ہے۔ میں نے اس کا تعلیمی اور خاندانی پس منظر کرا رکھا ہے۔ اس عہدے کے اڑتالیس امیدواروں میں اس کا انتخاب کیا ہے۔ میں نے خود اپنے پورے دو دن صرف کے ذاتی طور پر امیدواروں کے انٹرویو کئے تھے۔" وہ گویا مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس کے انتخاب کی طرف سے کسی بدگمانی کا شکار نہ ہوں۔

"تم نے بہت اچھا کیا جو ان کا انتخاب کر لیا شفیع" میں نے ثنا کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "تمہارا انتخاب ہر معاملے میں بے ل ہوتا ہے۔ اب تم دوسرے مہمانوں کی طرف توجہ دو اور مجھے پنے ہوٹل کے پرسنل منیجر سے کچھ پرسنل سی باتیں کرنے دو۔"

شفیع شاہ کے چہرے پر طمانیت کی مسکراہٹ آ گئی اور وہ آگے ہو گیا۔ میں اور راشد ایک ٹک ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ان ہی کی آنکھوں میں ان گنت سوال تھے۔ میری آنکھوں میں ایک بھولے بسرے روز و شب کی یادوں کا دھواں بھی تھا اور ناتمام حسرتوں کی راکھ بھی۔

بالآخر اسی نے سکوت توڑا۔ عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "زندگی کے اس موڑ پر بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی افضل بھائی! آپ واقعی لوگوں کو حیران کر دینے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ آپ نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ بہت دل خوش ہوا ہے سب کچھ جان کر۔ مجھے یہاں نوکری شروع کئے دو ماہ ہو چکے ہیں۔ بعض فائلوں میں مجھے ٹائپ شدہ 'خالص دفتری خطوط پڑھنے کا اتفاق ہوا جو لاہور سے 'ہیڈ آفس' سے آتے تھے۔ ان میں سے بعض پر 'ایم اے چوہدری' کے دستخط ہوتے تھے۔ لیکن میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایم اے چوہدری ___ محمد افضل چوہدری آپ ہوں گے۔"

"چلو ___ یہ تو ہوا۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "مگر یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں نوکری کرنے کیسے چلے آئے؟ تم اچھے بھلے دولت

پروفیسر ایم اشرف ایم - اے

شاہ فاروق حاکم مصر	50/-
شاہ فیصل شہید	50/-
ہٹلر کی حیات معاشقہ	90/-
ہٹلر کے آخری دس دن	75/-
ہٹلر اور نازی جرمنی	75/-
سکندر اعظم	90/-
نپولین بونا پارٹ	75/-
رومانی شاعر لارڈ بائرن کی حیات معاشقہ	60/-
مہاراجہ رنجیت سنگھ اور ان کی عیاشیاں	75/-
ہر دور ہٹلر کی کہانی	100/-

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

مند اور صنعت کار باپ کے بیٹے ہو..... تم تو خود بہت سوں کو پرسنل منیجر رکھ سکتے تھے۔ تمہیں نوکری کی کیا ضرورت آن پڑی؟ گھر سے ناراض ہو کر نکلے ہوئے ہو کیا آجکل؟"

"جی نہیں۔" وہ افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "ہم کسی سے کیا ناراض ہوں گے۔ ہم سے تو ایک مدت ہوئی تقدیر ہی ناراض ہو چکی ہے۔ جتنے انقلابات آپ کی طرف آئے ہیں اتنے ہی ہماری طرف بھی آئے ہیں۔ فرق صرف نوعیت کا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"آپ نیچے سے اوپر آئے۔ ہم اوپر سے نیچے چلے گئے۔ دنیا اسی کا نام ہے۔"

"لیکن پھر بھی کیسے.....؟ کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔" میں شاذو نادر ہی بے تابی کا اظہار کرتا تھا لیکن اس وقت میں اپنے لہجے کی بے تابی پر قابو نہ رکھ سکا۔

"یہ لمبی باتوں کا موقع نہیں۔" وہ اردگرد مہمانوں کے ہجوم پر ایک بے چین سی نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کا ملازم ہوں اور آج خاص طور پر میری بڑی ذمے داریاں ہیں۔"

"بھاڑ میں گئی نوکری..... اور تمہاری یہ فرض شناسی۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔"

"ٹھیک ہے سر! میں آپ کو جواب دہ ہوں۔ آپ کی ہر بات کا جواب دینا میرے فرائض میں شامل ہے۔ آپ میرے ہر باس کے باس ہیں۔ بگ باس۔ اس لئے....."

"یہ تم طنز کر رہے ہو یا حالات نے واقعی اتنا فرماں بردار بنا دیا ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"آپ پر طنز کرنے کی تو مجھ میں پہلے بھی کبھی جرأت نہیں تھی۔ آپ میرے محسن ہیں۔ اور اب تو میں طنز وغیرہ کرنے کے بارے میں بھی سوچ نہیں سکتا۔ اب تو صورتِ حال بہت ہی مختلف ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

اس کی نگاہیں چھت میں آویزاں فانوسوں میں الجھ گئیں۔ ایک لمحے وہ بالکل خاموش رہا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ لفظوں کی ڈور کا سرا کہاں تلاش کرے۔ آخرکار وہ نظر جھکاتے ہوئے بولا "آپ کو شاید یہ اندازہ تو ہمارے گھر میں قیام کے دوران ہی ہو گیا ہو گا کہ ڈیڈی جو کچھ بھی بنے تھے ممی کے پیسے سے ہی بنے تھے۔ ڈیڈی خود خاندانی طور پر خوشحال آدمی نہیں تھے۔ ممی ہی اس خاندان میں ورثے کی دولت لے کر آئی تھیں۔ میں اب مقدر پر یقین رکھنے لگا ہوں۔ ہر فرد کا یقیناً کوئی مقدر ضرور ہوتا ہے۔ ممی یقیناً خوش بخت تھیں۔ جب تک زندہ رہیں ڈیڈی کو کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچا....."

"تو کیا اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر بولا "آپ جن دنوں ہمارے گھر آئے تھے، آپ نے دیکھا ہو گا ان دنوں بھی وہ مستقل بیمار رہتی تھیں۔ راحیلہ کی شادی کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔"

ایک تو یہ اطلاع افسوس ناک تھی۔ دوسرے یہ نام ذہن کرول پر جیسے برچھی سی لگی تھی۔ راشد سے سامنا ہونے سے وہی چہرہ بار بار ذہن کی لوح پر ابھر رہا تھا جسے میں نے بہت ذہن کے تاریک نہاں خانوں میں دھکیل رکھا تھا۔ نوجوانی کی ناکامیاں بڑی دل خراش ہوتی ہیں، خصوصاً محبت کی ناکامیاں۔ اپنے خوابیدہ زخموں کو کھرچنا نہیں چاہتا تھا لیکن اب یہ سامنے ہی آگیا تھا۔ اب اور نہ جانے کیا کچھ سامنے آنا تھا۔

میں زبان سے اظہارِ افسوس نہ کر سکا۔ تاسف شاید چہرے پر لکھا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد راشد سلسلۂ جوڑتے ہوئے بولا "ممی دنیا سے گئیں تو گویا اپنا مقدر بھی ساتھ گئیں۔ ویسے تو پوری ٹیکسٹائل انڈسٹری ہی بحران کا شکار تھی۔ ڈیڈی کو تو کچھ زیادہ ہی مشکلات نے آن گھیرا۔ انہوں نے کچھ کے بعد دیگرے کئی بڑے کاروباروں میں ہاتھ ڈالا لیکن ہر ایک اس بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کہ تقریباً ساری پراپرٹی گروی رکھی گئی....."

مجھے شاید مہمان زیادہ ہونے کے باعث ہال میں گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ اس لئے میں نے راشد کی بات کاٹتے ہوئے کہا "آؤ باہر چلتے ہیں۔"

وہ میرے ساتھ چل تو پڑا لیکن نہایت سنجیدگی سے بولا "میں آپ کے حکم کی تعمیل میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اس سے ملازمت پر حرف نہیں آنا چاہئے۔ یہ ملازمت مجھے بڑی محنت سے ملی ہے۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔ اچھی ملازمتیں آج کل آسانی سے نہیں ملتیں۔"

"یہ جو تم نے ملازمت ملازمت کی رٹ لگا رکھی ہے..... مجھے اپنے ہوٹل کی ریپوٹیشن کا خیال نہ ہوتا تو گھونسا مار کر تمہارے دانت باہر نکال دیتا۔ ویسے میں اس خیال سے بھی اپنے آپ کو روکے ہوئے ہوں کہ مجھے پوری بات سننی ہے۔ میرا گھونسا کھانے کے بعد تم جیسا دھان پان اور نحیف نوجوان کئی دن تک بات کرنے کے قابل نہیں رہے گا" میں نے کہا۔ وہ ہنس دیا۔ شاید کئی دن ہنسا تھا مگر فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا جیسے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔

ہم باہر سوئمنگ پول کے کنارے آن کھڑے ہوئے۔ سوئمنگ پول کے کنارے بھی مہمانوں کے لئے کھانے کا انتظام تھا اور وہاں بھی بھیڑ بھاڑ تھی۔ لیکن وہاں گھٹن نہیں تھی اور ایک نسبتاً پرسکون گوشہ بھی میسر آگیا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد راشد بولا "ڈیڈی ایک پیچیدہ کے مریض بن کر رہ گئے تھے۔ نہ جانے کون کون سی بیماریاں انہیں لاحق ہو گئی تھیں۔ ہر وقت ان پر جھنجلاہٹ سوار رہتی تھی

نفع نقصان کو انہوں نے اپنی روح پر مسلط کر لیا تھا۔ زیادہ نفرت انہیں اس بات سے تھی کہ کبھی کبھار کوئی لے سے یہ تاثر دیتا تھا کہ ان کی مرحومہ بیوی بڑی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید لوگ انہیں احساس دلانے کی رہے ہیں کہ وہ جو کچھ بھی تھے، بیوی کے مقدروں کی وجہ اور خود ان میں ذاتی طور پر کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ کر دینے والا کمپلیکس تھا۔"

سان کی سوچیں بھی عجیب گورکھ دھندا ہوتی ہیں" میں نے کہا۔

ند ہوٹل کی جگمگاتی عمارت پر ایک نظر ڈال کر بولا "میں امراض کی کوئی فہرست بناؤں تو اس میں 'کاروبار' کا نام دوں گا۔ کاروباری لوگوں کے لئے کاروبار بھی بڑا مہلک ہے۔ سیاست اور اقتدار کی طرح یہ بھی شیر کی سواری کے ہے۔ جب تک آپ اس پر سوار رہتے ہیں اور یہ سیدھا ہے تب تک ہی آپ ٹھیک رہتے ہیں۔ جونہی یہ آپ کے باہر ہوتا ہے، فوراً آپ کے سینے پر سوار ہو جاتا ہے۔ آپ دماغ کو ماؤف کر دیتا ہے۔ حواس کو چیر پھاڑ ڈالتا ہے اور کو چبا جاتا ہے۔ نفع و نقصان کو زندگی موت کا مسئلہ بنا لینے برے خیال میں بڑے گھاٹے میں رہتے ہیں۔ وہ بہت کچھ ہوئے بھی زندگی کی کسی نعمت سے لطف اندوز نہیں

نوجوانی اور ناتجربے کاری کے دور میں بھی بڑے پتے کی ہا تھا۔ مجھے اس نظریے کا قائل ہونا پڑا کہ تجربہ اور عقل و عمر کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ نے اپنا سب کچھ بیچ باچ کر، ادھر اُدھر سے ایک ایک پائی کے اپنی دانست میں ایک آخری داؤ کے طور پر اسی سڑک پر آپ کا یہ ہوٹل تعمیر ہوا ہے..... یہاں سے ڈیڑھ دو میل لے پر ایک بیس منزلہ کمرشل بلڈنگ تعمیر کرنی شروع کی۔ اس ٹ پر لایا تھا، سرمایہ ڈیڈی کا تھا۔ انہوں نے کوئی بینک نہیں میں کہیں سے لون نہیں ملا۔ حالانکہ وہ ایک بے پناہ منافع دینگ نظر آرہا تھا لیکن ان کی ساکھ خراب ہو چکی تھی۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ انہوں نے بینک کے ذریعے یا لون کی میں کوئی مدد نہیں لی ورنہ شاید الجھنیں اور بڑھ جاتیں۔ نے اپنے وسائل سے ہی تعمیر شروع کی۔ انہیں یقین تھا کہ ر بلڈنگ مکمل ہو گئی تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ وہ سے نکل آئیں گے....." وہ خاموش ہو گیا۔

"لیکن ایسا بھی نہیں ہو سکا؟" میں نے طویل سانس لے کر

"ظاہر ہے۔ ورنہ میں یہاں اس حیثیت میں کیوں نہیں آتا؟" کرایا "بلڈنگ کی تیرھویں منزل کی چھت ڈالی جا رہی تھی کہ پوری بلڈنگ گر گئی۔ ریت کے گھروندے کی طرح بیٹھ گئی۔ ایک انجینئر کی ذرا سی غلطی سے ایک ہارے ہوئے سالارِ جنگ کا آخری جہاز بھی ڈوب گیا۔ دسیوں مزدور مر گئے۔ بیسیوں زخمی اور معذور ہو گئے۔ ڈیڈی کے..... اور کمپنی کے نہ جانے کتنے لوگوں کے وارنٹ نکل آئے۔ ڈیڈی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا..... اور یوں سود و زیاں کی ایک کہانی ختم ہو گئی۔"

"اوہ..... یعنی زاہد انکل بھی.....!" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ زاہد انکل کی شبیہہ میری آنکھوں میں گھوم گئی۔ کیسے ہینڈسم آدمی تھے!

راشد خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اردگرد خاصا شور شرابا تھا لیکن میرے اندر ایک لمحے کے لئے گہرا سناٹا چھا گیا۔ راشد بہت دھیمی آواز میں بولا "وہ تو اچھا ہوا میں نے ڈیڈی کے زوال کے آخری دنوں میں یونہی نہ جانے کیوں..... شاید کسی لاشعوری احتیاط کے تحت امریکا جا کر ہوٹل مینجمنٹ کا ایک کورس کر لیا تھا جو یہ نوکری حاصل کرنے کے سلسلے میں میرے کام آگیا۔ ورنہ ڈیڈی کے جاننے والے صنعت کاروں کے ہاں تو شاید مجھے کلرکی بھی نہ ملتی۔ وہ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ امیرزادوں سے نوکری نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے کاروبار میں تو انتھک محنت کر سکتے ہیں لیکن دوسرے کی نوکری میں محنت نہیں کر سکتے۔" وہ خود استہزائی کے سے انداز میں مسکرا دیا "آپ بھی اسی نظریئے کے قائل ہو کر مجھے نوکری سے مت نکال دیجئے گا۔"

"بکواس مت کرو" میں نے دھیمی آواز میں اسے ڈانٹا۔ ایک سوال دیر سے میری زبان پر مچل رہا تھا۔ جب وہ ہونٹوں تک آیا تو میری دھڑکنیں قدرے تیز ہو گئیں۔ "راحیلہ آج کل کہاں ہے؟ کیسی ہے؟"

"اس کی زندگی پر تو تباہی کے سائے ڈیڈی کے زوال سے پہلے ہی پڑنا شروع ہو گئے تھے" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا "دولت کی ہوس عجیب چیز ہے۔ یہ ہوس آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ کیوں کر انسان کو ایسا دیوانہ بنا دیتی ہے۔ راحیلہ کے شوہر جمیل کا خاندان، آپ کو معلوم ہی ہو گا، لکھ پتیوں کا خاندان تھا۔ لیکن شادی کے کچھ عرصے بعد ہی راحیلہ کو اور ہمیں احساس ہوا کہ انہوں نے مزید دولت کے لالچ میں ہم سے رشتہ جوڑا تھا۔ شادی پر بھی ہم سے جو ہو سکا تھا، کیا تھا لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد جمیل کی بڑی بڑی فرمائشیں شروع ہو گئی تھیں۔ اس وقت تک تو ڈیڈی کا باقاعدہ زوال بھی شروع نہیں ہوا تھا اس لئے انہوں نے اس کی کئی فرمائشیں پوری بھی کیں لیکن اس کے بعد ایک تو وہ خود الجھنوں میں پھنسے رہنے لگے، دوسرے خود راحیلہ کو یہ سلسلہ بہت برا محسوس ہونے لگا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کی محبت، اس کی شخصیت اور اس کے خلوص کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ سارا سلسلہ

بس لین دین کا ـــــ بلکہ یوں کہئے کہ صرف لین ہی لین کا تھا۔ اسے راحیلہ نے صریحاً اپنی توہین محسوس کیا۔ اس نے ڈیڈی کو سختی سے منع کردیا کہ وہ جمیل کی کوئی خواہش پوری نہ کریں۔ اس کے بعد ہی ہم پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ کتنا بدباد معاش تھا۔ اس نے محض ہم لوگوں کو پھانسنے کی حد تک اپنے اوپر تہذیب و شائستگی کا خول چڑھایا ہوا تھا۔ راحیلہ سے اس کا رویّہ تو شادی کے چند دن بعد ہی بدل گیا تھا۔ اس کا اصل روپ سامنے آنے لگا تھا جو بے حد مکروہ تھا۔ لیکن جب اس کی بڑی بڑی فرمائشیں پوری کرنے کا سلسلہ بند ہوا تب تو اس نے راحیلہ کو باقاعدہ اذیتیں دینا شروع کردیں۔ شرابی' عیاش اور بدکردار تو وہ پہلے ہی تھا' اس کے بعد تو اس نے بہت ہی نچلے طبقے کے جاہلوں کی طرح راحیلہ کو مارنا پیٹنا بھی شروع کردیا۔ وہ جسم پر اذیت رسانی اور زخموں کے نشانات لے کر واپس آتی۔ شوہر کے ہاں اس کے دن کم گزرتے اور میکے میں زیادہ۔ معلوم نہیں جمیل ذہنی طور پر بیمار تھا یا کیا بات تھی ـــــ میں آپ کو اس کی اذیت پرستی کی ایک مثال بتاؤں ـــــ"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگیا۔ گویا اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ وہ مثال بیان کرنا مناسب رہے گا یا نہیں۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر کار وہ بولا "وہ جب شیو بناتا تھا تو واش بیسن میں شیو کا جو جھاگ اور بالوں والا پانی جمع ہوتا تھا' راحیلہ کو وہ پینے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ نہیں مانتی تھی تو اس کی گردن پکڑ کر زبردستی اس کا منہ اس پانی میں ڈبوتا تھا۔ بلیڈوں سے چرکے لگاتا تھا۔ آخری دنوں میں تو کچھ ایسا ہونے لگا تھا جیسے راحیلہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے کی اتحادی فوجی ہے اور نازی کیمپ میں پہنچی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے اس کا انجام طلاق ہی ہوسکتا تھا۔ صرف ڈیڑھ سال میں یہ کہانی بھی ختم ہوگئی۔ شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد وہ طلاق لے کر گھر آگئی۔"

اس نے ایک طویل سانس لی اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا "ہم دونوں بہن بھائی آج کل ساتھ ہی تو رہتے ہیں۔ کلفٹن پر دو بیڈ روم کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں ہم رہ رہے ہیں' جو کرائے کا ہے۔ راحیلہ مجھ سے بھی پہلے سے جاب کررہی ہے۔ وہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں آرٹسٹ ہے۔ آپ کا یہ ہوٹل بھی اسی ایجنسی کا کلائنٹ ہے۔ لیکن شاید آپ کو یہ بات معلوم نہ ہو۔ اسی لئے تو راحیلہ کی زبانی مجھے پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ ہوٹل کے لئے فلاں فلاں اسامیوں کا اشتہار اخبارات میں آنے والا ہے' اور میں نے پہلے ہی اپنے آپ کو انٹرویو کے لئے تیار کرنا شروع کردیا تھا۔ اب ہم دونوں ملازمت کررہے ہیں۔ پرانے وقتوں کو یاد کرکے آہیں نہیں بھرتے۔ روتے پیٹتے نہیں۔ کسی کو پُدرم سلطان بود' کے قصے نہیں سناتے۔ زمانے کو اور فلک کج رفتار کو برا بھلا نہیں کہتے۔ اس لئے سکون اور خاموشی کا احساس ہوتا ہے۔ ٹھک ٹھاک ہی گزر بسر ہورہی ہے۔ آدمی مطمئن نہ رہنا چاہے تو کسی بھی حال میں مطمئن نہیں رہ سکتا۔ لیکن ہم دونوں بہن بھائیوں نے بہر حال مطمئن رہنا سیکھ لیا ہے۔"

ایک طویل لمحے تک ہم دونوں خاموش رہے۔ آخر کار میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔ "راشد! مجھے اپنا ایڈریس دے دو۔ میں راحیلہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیا ابھی ـــــ اسی وقت؟" اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ـــــ اسی وقت۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن ـــــ یہاں آپ کی ایک اہم تقریب جاری ہے۔" اس نے گردوپیش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"میری نظر میں اب یہ کوئی خاص اہم نہیں رہی۔" میں نے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر مجھے دیا جس پر اس کے فلیٹ کا پتا بھی درج تھا۔ پھر بولا "میں نہیں کہہ سکتا کہ راحیلہ سے آپ کی ملاقات مناسب رہے گی یا نہیں۔ بہرحال اگر اس کا رویّہ آپ کے ساتھ مناسب ہوا تو اس کی میں پیشگی معذرت چاہتا ہوں۔ وہ سرپھری لڑکی ہے۔ میں اس کے معاملات میں بھی دخل نہیں دے سکتا اور آپ کے معاملات میں بھی۔ ہم سب اپنے اپنے معاملات میں خود مختار ہیں۔ میں دوسروں کے حصے کی معذرت ضرور کرلیتا ہوں لیکن دوسروں کی زندگی میں دخل نہیں دیتا۔ کم از کم اس وقت تک نہیں دیتا جب تک میری زندگی اس سے متاثر نہ ہونے لگے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے وہاں سے اٹھ آیا۔ میں نے شفیع شاہ سے اس مرسڈیز کی چابیاں لیں جو اس نے میرے لئے ائرپورٹ بھیجی تھی۔ وہ پوچھتا ہی رہ گیا کہ میں کہاں جارہا ہوں لیکن میں نے اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں نے کوئی آدمی بھی اپنے ساتھ نہیں لیا اور کلفٹن روانہ ہوگیا۔

اس چھوٹی سی عمارت میں واقع اس چوتھی منزل کے فلیٹ تک پہنچنا ذرا دشوار ثابت ہوا لیکن جب دل میں طلب کا شعلہ روشن ہو تو سودائی منزل تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ میں بھی اس کے در تک پہنچ ہی گیا جس نے کئی برس پہلے کاسۂ دل کو ٹھوکر ماری تھی اور تانگی مسرتوں کا ہر پھول اس کے قدموں کی دھول ہوگیا تھا۔

میں نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ اندر کہیں گھنٹی یوں گونجی جیسے برسوں کے سکوت کے بعد کسی نے آرزوؤں کے کھنڈر میں قدم رکھا ہو اور کسی خنجر روح کی نقرئی پائل کھنک اٹھی ہو!

میری دھڑکنیں شاذ و نادر ہی تیز ہوتی تھیں لیکن اس لمحے سینے میں دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ بڑے بڑے بدمعاشوں کا سامنا کرتے ہوئے بھی ارتعاش پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اس نرم و نازک لڑکی کا سامنا کرنے کے تصور سے رگ و پے میں ایک عجیب سا ہیجان برپا تھا۔ مسامِ جاں سے شرارے سے پھوٹ رہے تھے۔ اپنے آپ پر اختیار دشوار ہورہا تھا۔

ایک بار تو شدت سے دل چاہا کہ واپس بھاگ جاؤں۔ آخر میں کس لئے آیا تھا؟ مجھ سے تو کبھی بھی اس سنگدل کا کوئی کام نہیں رہا تھا۔ مجھے تو اس نے کبھی اچھا نہیں سمجھا تھا۔ ریاکار اور سادہ دل شخص کی محبت تو کبھی بھی اس کے لئے دلفریب نہیں رہی تھی۔ اس نے تو نہ صرف میرا دل توڑا تھا بلکہ محبت کا مذاق بھی اڑایا تھا۔ وہ محبت جو منافقت اور ریاکاری سے پاک تھی۔

میں ایک بار پھر اپنی محبت کو ذلت سے دوچار ہوتے دیکھنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ میرے دل پر تو کسی کی چھوٹی سی بات' کسی کا چھوٹا سا عمل' اس طرح ہرا رہتا تھا۔ کیا محبت میں انسان کی یہ صفت برقرار رہتی ہے؟ کیا محبت انسان کی خودداری اور انا کو کھا جاتی ہے؟

میرا دل کہہ رہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میری انا کی محبت اپنی جگہ صحیح سلامت تھی۔ مجھے ایک بے عنوان سی متلاشی یہاں کھینچ کر لائی تھی۔ میں جیسے خود نہیں' کسی کی پکار پر آیا تھا۔ جیسے کسی دست غیبی نے محبت پر راشد سے میری ملاقات کرائی تھی' اس کا ایڈریس مجھے عطا اور یہاں بھجوایا تھا۔

مگر اپنے اس خیال پر مجھے خود ہی ہنسی آگئی۔ یہ یقیناً میری خوش فہمی تھی۔ یہ کمبخت محبت بڑی ہی خوش گمان ہوتی ہے۔ اپنی ہر بات کے لئے جواز گھڑ لیتی ہے' اپنے ہر فیصلے کا ایک خوشنما پس منظر بنا لیتی ہے۔ بھلا یہاں کس کے دل میں میرے لئے ایسی چاہ تھی کہ میں محبت میں دھل جاتی؟ یہاں کون بیٹھا تھا جس کی روح مجھے پکارتی؟ جو یہاں رہتی تھی اس ہرجائی نے تو برسوں پہلے ہمیں اس قابل نہیں سمجھا تھا۔

میں نے بھی اس کی یاد کو ذہن کے کسی تاریک گوشے میں دفن کی اپنی سی سعی کی تھی اور میرا خیال تھا کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا ہوں لیکن آج راشد سے ملاقات ہوتے ہی راحیلہ کا ذکر آتے ہی جیسے سارے خوابیدہ زخم بیدار ہوگئے۔ ہر دھندلایا ہوا نقش پھر سے روشن ہوگیا تھا۔ اسی تیکھی خلش' اسی میٹھی ٹیس کو ایک بار پھر محسوس کرنے کے لئے دل بے چین ہوگیا تھا۔

اندر چند لمحے کے لئے سکوت رہا اور یہ چند لمحے مجھے اپنی زندگی سے بڑھ کر محسوس ہوئے۔ مجھے ایسا لگا کہ میں وہیں کھڑے کھڑے پتھر کا ہوجاؤں گا مگر آنے والا نہیں آئے گا۔ آرزوؤں کی محل سرا کا

دروازہ میرے سامنے یونہی بند رہے گا۔ وہ پلائی وُڈ کا ایک عام' سادہ اور کمزور سا دروازہ تھا۔ جیسے عموماً فلیٹوں میں ہوتے ہیں۔ میں کندھے کی ایک ضرب سے اسے توڑ سکتا تھا لیکن بے التفاتی کی اس غیر مرئی دیوار کو نہیں ڈھا سکتا تھا جو شاید اس کے عقب میں بھی میری منتظر تھی۔

راحیلہ آج کل ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں آرٹسٹ تھی۔ اپنے آرٹسٹ ہونے کا ثبوت اس نے دروازے پر ہی چسپاں کیا ہوا تھا۔ کارڈ بورڈ پر بنا ہوا ایک بڑا سا رنگین کارٹون دروازے پر چسپاں تھا۔ ایک بچہ تالاب میں گرا ہوا تھا۔ اس کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ وہ مدد کے لئے دونوں ہاتھ پھیلا رہا تھا۔ ایک بچی پھولوں کی ٹوکری لئے' پھولدار ٹوپی پہنے کنارے پر کھڑی تھی اور اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ کارٹون پر آرٹسٹ کا نام نہیں تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ راحیلہ ہی کا بنایا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے یہی لگا کہ حسرتوں کے تالاب میں گرا ہوا وہ بچہ میں تھا اور کنارے پر کھڑی ہوئی وہ شریر اور سنگدل بچی راحیلہ تھی۔

سکوت سے گھبرا کر میں نے دوبارہ بیل دی۔ تب چند لمحے بعد دروازے کے عقب سے وہی جانی پہچانی کھنکتی آواز سنائی دی۔ "کون؟" لفظ ایک تھا لیکن اس میں جانی پہچانی بیسیوں نشانیاں پنہاں تھیں۔ وہی ہلکی سی سرکشی' وہی دھیما سا تحکم۔ جھجک نہ سکنے

شاہ فیصل شہید

★---- پروفیسر ایم اشرف

شاہ فیصل شہید کے کارناموں اور ان کی ذاتی زندگی کے متعلق ایک دلچسپ کتاب----

قیمت: -/50 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

والی شاخوں کا سا وہی کرارا پن۔

میں نے دیکھا دروازے میں بجلی آئی نہیں تھی۔ وہ اندر سے مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ وہ فلیٹ میں تنہا تھی۔ گو کراچی ان دنوں شہر آشوب نہیں تھا' گلی کوچوں میں درندوں کا راج نہیں تھا۔ پھر بھی میرا خیال تھا کہ رات کے اس سناٹے میں' اس آباد "بیابان" میں کسی خاموش اجنبی کی دستک پر کوئی تنہا لڑکی دروازہ نہیں کھول سکتی تھی۔

ادھر میں بولنا چاہتا تھا مگر زبان جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ شاید لاشعوری طور پر مجھے ڈر تھا کہ میری آواز سن کر وہ دروازہ کھولنے کا ارادہ ہی ترک نہ کر دے۔

"کون ہے؟" اس نے دوبارہ قدرے تیزی سے پوچھا "بولتے کیوں نہیں؟" لہجے میں وہی تندی' وہی برہمی' وہی تحکم' جو اس کے پھول جیسے سراپا کے ساتھ مجھے بہت بھلا لگتا تھا۔ وہ دیکھنے میں جتنی نازک اندام' نفیس اور روئی کا گالا سی نظر آتی تھی' خصوصیات میں اس کے کافی برعکس تھی۔ اس کی شخصیت کے اسی تضاد میں میرے لئے ایک انوکھی کشش تھی مگر پچھلے چند برسوں میں اس میں نہ جانے کیا کیا تبدیلیاں آ گئی ہوں؟ میں نے سوچا۔ خصوصاً جبکہ یہ برس خوشگوار نہیں گزرے تھے۔

"یہ میں ہوں....." غیر ارادی طور پر میرے حلق سے عجیب بیٹھی بیٹھی سی آواز نکلی جو خود میرے لئے بھی ناقابل شناخت تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اس نے آواز پہچانی ہو گی مگر شاید یہ لہجے کی مسکینی کا اثر تھا کہ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

ایک مدت بعد وہ چاند چہرہ' ستارہ آنکھیں سامنے تھیں۔ میں مبہوت سا ہو گیا۔ وہ سفید' ریشمی' سلیپنگ سوٹ میں تھی' اس کے بھورے بال جن میں ہلکا سا سنہرا پن بھی تھا' اس وقت بے ترتیب تھے مگر اس بے ترتیبی میں بھی ایک حسن تھا۔ اس کی رنگت آج بھی چاندنی کی طرح تھی۔ وقت کی ناگواریاں اسے دھندلا نہیں سکی تھیں' بلکہ وہ سر سے پاؤں تک ویسی ہی تھی جیسی میری یادوں کے صنم خانے میں اس کی تصویر آویزاں تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ پہلے نوخیز تھی' کچی کچی دکھائی دیتی تھی' اب میچیور ہو چکی تھی۔ نخل جاں نے بہار بھی دیکھ لی تھی' خزاں بھی۔ وجود کا ثمر پک چکا تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس کی شفاف بلوری آنکھوں میں گلابی ڈورے تھے اور یہ ڈورے نیند کے یقیناً نہیں تھے کیوں کہ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں کوئی موٹا کاغذ سا تھا۔ میرے لئے اس کا ردعمل قدرے غیر متوقع سا تھا۔

میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ لڑکھڑا سی گئی۔ اس کے ہاتھ میں موجود موٹا سا کاغذ یا کارڈ چرمر ہو کر اس کی مٹھی میں دب گیا۔

"اوہ..... نو....." بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا اور اس نے

رومانی ناول

زیب	حمیدہ جبین	-/
شاخ بریدہ	حمیدہ جبین	-/
حنا اور پتھر	حمیدہ جبین	-/
گیت یہ میرے	حمیدہ جبین	-/

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

دوسرے ہاتھ سے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھنے کی کوشش کی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کے آنسو دیکھوں۔ شاید وہ اس اپنی زندگی کے تشنہ و ناگوار باب کا کوئی ورق پلٹ رہی تھی جب نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ شاید اس کے ہاتھ میں جمیل کی تھی۔ مجھے اس کی صرف سفید سائڈ نظر آئی تھی۔ بعض لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں۔ وہ اپنے چاہنے والوں کو ہر اذیت دے مگر تنہائیوں میں چھپ چھپ کر انہی کی تصویریں دیکھ کر ہیں' اشکوں کے موتی پروتے ہیں۔

ایک لمحے کے لئے وہ مبہوت سی ہو گئی پھر سرسراتی سی میں بولی "مجھے یقین نہیں آ رہا....."

"کہ کوئی اتنا ڈھیٹ بھی ہو سکتا ہے" میں نے جملہ مکمل کر

"نہیں..... نہیں..... یہ بات نہیں ہے" وہ ملامت بولی۔ جس سرد مہری' سفاکی اور درشتی کی میں توقع لے کر آیا اس کے لہجے میں نہیں تھی۔ شاید حیرت نے ان جذبوں کو دبا دیا تھا۔ میرا دل کچھ سنبھلنے لگا۔

"تم..... تم یہاں ایک دم کیسے پہنچ گئے؟ تمہاری یقیناً سے ملاقات ہوئی ہو گی" اس کی آواز اب بھی سرگوشی نہیں تھی۔ شاید کچھ آنسو ابھی اس کے حلق میں اٹکے ہوئے

"ہاں" میں نے اثبات میں سر ہلایا "راشد سے ملاقات تھی" پھر میں نے ایک طویل سانس لے کر اپنا حوصلہ مجتمع اندر آنے کے لئے بھی نہیں کہو گی؟ بڑے لوگ تو دروازے ہوئے دشمن کو بھی ایک بار تو خوش خلقی سے اندر آنے کی دے دیتے ہیں۔ ہمارے درمیان دوستی نہ سہی..... لیکن کچھ دشمنی بھی تو نہیں۔"

اس نے ایک طرف ہٹ کر میرے لئے راستہ چھوڑ دیا اس کے قریب سے گزر کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے

دیوانہ بنا دینے والی پُراسرار خوشبو آج بھی برقرار تھی۔

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی "بڑے لوگ کا صیغہ استعمال تم نے طنز گوئی کا آغاز کر دیا ہے۔ راشد نے یقیناً تمہیں اپنے کی داستان سنا دی ہو گی۔ تم سے تو وہ کوئی بات چھپا ہی نہیں تمہیں موقع مناسب دکھائی دیا ہو گا۔ آ گئے ہو گے مذاق نے۔"

"خرابی یہی ہے کہ تم نے مجھے ہمیشہ انڈر ایسٹی میٹ کیا!" میں نے تاسف سے کہا "میرے خیال میں تو تمہاری فیملی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا ہے جس کا مذاق اڑایا جا سکے۔ سالی کا اوپر نیچے ہو جانا میری نظر میں کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں ہے اتنی نفع نقصان البتہ قابل ذکر چیز ہے۔"

وہ خاموشی سے وہیں کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ میری آواز اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں نے کہا "راشد نے مجھے سے آگاہ کر دیا تو کوئی برا نہیں کیا۔ بات عروج و زوال کی ہوتی۔ دوست ملتے ہیں تو ایک دوسرے کا حال تو پوچھتے ہی ہیں' ہمارے ہاں تو تکیۂ کلام یہی ہے "اور سناؤ کیا حال چال ہیں؟" تعلق' کوئی واسطہ ہوتا ہے تبھی انسان دوسرے کا احوال جاننا ہے اور جسے تم عروج و زوال کہہ رہی ہو' یہ عروج و زوال زندگی کے نشیب و فراز ہیں۔ آتے رہتے ہیں۔ ان کے لئے رہنا چاہئے۔"

ہم ایک تنگ سی راہداری میں کھڑے تھے۔ میں نے ایک بعد شناسا آنکھوں کی ان شفاف جھیلوں میں جھانکتے ہوئے اکر کہا "کیا مجھے اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے؟"

اس کا ذہن گویا اب بھی کہیں اور تھا۔ قدرے چونکتے ہوئے "دراصل مجھے حیرت کا جو جھٹکا لگا ہے اس سے میں ابھی تک ل نہیں پائی..... اس کے علاوہ تمہارے وجود سے دولت کی بو آ رہی ہے..... تمہارے ہاتھ میں مرسڈیز کی چابیاں ہیں۔ یقیناً نے مزید ترقی کر لی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا' تمہیں کہاں اس مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ جگہ تمہارے شایان شان ہے" اب اس کی بھیگی آنکھوں میں دھیرے دھیرے راہٹ طلوع ہو رہی تھی۔ بارش کے بعد بادلوں کے عقب سے میں پھوٹ رہی تھیں۔

"طنز کے تیر تو اصل میں تم چلا رہی ہو۔ الزام مجھ پر دھر رہی ہو" میں نے کہا۔ وہ مجھے چھوٹے سے ایک صاف ستھرے تنگ لام میں لے آئی۔ اس کے رہن سہن کو غریبانہ یا عسرت آلود ہرحال نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن جو وقت وہ دیکھ چکی تھی اس کے پہلے میں یہ غربت ہی تھی۔ شروع شروع میں شاید اسے یہاں اپنا تنہا محسوس ہوا ہو۔

اس کا اشارہ پا کر میں نے ایک صوفے پر بیٹھ کر ادھر اُدھر تے ہوئے کہا "یہ جگہ تو میری اوقات سے بہت اونچی ہے۔ میرا تو اب بھی کبھار کسی تھڑے پر بیٹھ کر بچپن کے کسی دوست کے ساتھ آلو چھولے کھانے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن کمبخت بچپن کا کوئی دوست کبھی کہیں نظر ہی نہیں آیا۔ حالاں کہ میں نے سنا ہے انسان کے پاس چار پیسے آ جائیں تو ادھر اُدھر سے' کونے کھدروں سے بچپن کے دوست..... بلکہ معمولی شناسا بھی امڈ پڑتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی کام' تعاون کی کوئی نہ کوئی درخواست لے کر آ جاتے ہیں اور اگر کسی وجہ سے ان کی غرض پوری نہ ہو سکے تو تڑپ تڑپ کر لوگوں سے کہتے ہیں ذرا دیکھو تو سہی' کیسے دماغ آسمان پر پہنچ گئے ہیں۔ کل تک پاؤں میں ڈھنگ کی جوتی نہیں تھی۔ ہمیں سات سات سلام کرتا تھا۔ آج سیدھے منہ بات نہیں کی۔ ذرا سا کام نہیں ہو سکا ہمارا' مجھے تو کوئی یہ کہنے بھی نہیں آیا۔ کوئی طعنہ دینے بھی نہیں آیا۔ پتا نہیں کہاں مر گئے کمینے۔"

اس کی آنکھوں میں دھیرے دھیرے مسکراہٹ روشن تر ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اعصاب کا تناؤ کم ہو رہا تھا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ وہ کچھ ایزی نظر آتی تو میرے اعصاب سے بھی بوجھ کم ہوتا۔

"تم نے اپنے گاؤں جا کر انہیں تلاش کیا ہوتا" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"کیا تھا ایک مرتبہ گاؤں بھی" میں نے کہا "کل دو تین ہی دوست تھے۔ وہ بھی غائب ہو چکے تھے۔ وہ گلی ہی اُجڑ چکی تھی جس میں ہم رہتے تھے۔ شہر کی کشش سب کو نگل گئی تھی۔ سب مختلف شہروں کو کوچ کر گئے تھے۔ کسی کو پتا نہیں تھا کون کہاں گیا۔"

"دکھائی تو یہی دیتا ہے کہ ابھی اک عمر باقی پڑی ہے" وہ اچٹتی سی نظر سے میری طرف دیکھ کر بولی "زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔"

"جیسے تم مل گئی ہو؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ انگوٹھے کے ناخن سے دوسرے ناخن کی پالش کھرچتے ہوئے بولی "راشد تمہیں کہاں ملا تھا؟" اس نے سوال سے سوال کا رخ پھیر دیا تھا۔

"ہوٹل میں" میں نے جواب دیا۔

"ہاں..... آج اس ہوٹل کا افتتاح تھا جس میں اسے پرسنل منیجر کے طور پر نوکری ملی ہے" وہ دھیمے لہجے میں بولی "نئی نئی نوکری ہے۔ بڑی مشکل سے ملی ہے۔ بہت محنت کر رہا ہے وہ..... تم بھی شاید اسی افتتاحی تقریب میں آئے ہو گے۔ میں نے راشد سے کہا تھا کہ ایک کارڈ مجھے بھی لا دو۔ اس نے صاف منع کر دیا۔ کہنے لگا' کارڈ بہت ہی خاص الخاص لوگوں کو دیئے جا رہے ہیں جن کی آمد پبلسٹی کے نقطۂ نظر سے مفید ہو' خواہ ان پر پلے سے بہت کچھ خرچ کرنا پڑے۔ غیر اہم لوگوں کو' اور خصوصاً ملازمین کے اہل و عیال اور رشتے داروں کے لئے تو کارڈ بالکل جاری نہیں کئے جا رہے۔"

وہ میری طرف دیکھ کر مبہم سے انداز میں مسکرائی اور طویل

سانس لے کر بولی "چناں چہ ہم گھر بیٹھے ہیں۔ ہم غیر اہم بھی ہیں اور ہوٹل کے ملازم کے رشتے دار بھی۔"

"اوہ..... " میں نے حقیقی تاسف سے کہا "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اس تقریب میں جانے کی خواہش مند ہو تو کوئی ایسا بندوبست کر دیتا کہ افتتاح ہی تمہارے ہاتھوں سے ہوتا۔"

"میرے ہاتھوں سے؟" وہ خود استہزائی کے سے انداز میں ہنسی۔ گو کہ ہنسی میں تلخی کی آمیزش تھی لیکن ایک عرصے بعد اس کی ہنسی سننا ساعت کے لئے ایک بڑا ہی دلکش تجربہ تھا۔ اجنبیت کے دبیز پردوں کے عقب سے دھیرے دھیرے اس کی اصل شخصیت طلوع ہو رہی تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "تمہارے ہاتھوں سے تو اب کوئی یتیم خانے کا افتتاح کرانا بھی پسند نہیں کرے گا۔ یہ تو فائیو اسٹار ہوٹل کا معاملہ ہے۔ ویسے جس انداز سے تم بات کر رہے ہو اس سے لگتا ہے کہ کافی اثر و رسوخ ہے تمہارا اس ہوٹل کے مالک پر؟"

"ہاں..... بس کچھ تھوڑی بہت شناسائی ہے۔ سر حال بات مان لیتے ہیں بے چارے" میں نے مبہم سے لہجے میں کہا "خصوصاً جذباتی رشتوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔"

"حیرت ہے!" وہ جمیل سی آنکھوں کو مصنوعی حیرت سے پھیلاتے ہوئے بولی "دولت مندوں کے ہاں جذبات کا احترام کہاں سے آگیا؟"

"سب دولت مند تم جیسے یا جمیل جیسے تو نہیں ہوتے نا۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

اس کی چاندنی جیسی رنگت میں شفق کی سرخی جھلک آئی۔ "تمہیں ایسی باتیں کرنے کا ..... دل کا غبار نکالنے کا حق حاصل ہے۔ میں تمہیں اس سے نہیں روکوں گی لیکن خدارا میرا اور جمیل کا موازنہ مت کرو۔ وہ میرا انتخاب نہیں' میرے لڑکپن کی ایک بھول تھی۔ نو عمر لوگ جب زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کرتے ہیں تو عموماً کیچڑ میں ہاتھ مار لیتے ہیں۔ میرے دامن میں بہت سے پچھتاوے ہیں لیکن میں ان کا اعتراف نہیں کروں گی۔ اب یہ خود غرضی اور مصلحت کوشی محسوس ہوگی۔ اب تو یہ سوچنا بھی اچھا محسوس نہیں ہوتا کہ زندگی کا ایک تجربہ ناکام ہوگیا' اپنا انتخاب غلط ثابت ہوگیا تو اس کی طرف لوٹ آئے جس کا کبھی مذاق اڑایا تھا۔ جس کا کبھی دل توڑا تھا۔"

اس کا سر بہت جھک گیا۔ اس کے ریشمی بالوں نے اس کا چہرہ تقریباً ڈھانپ لیا۔ اس کی آواز جیسے بہت دور سے آنے لگی "میں ..... میں تم سے شرمندہ ہوں ..... لیکن میں اس کا باقاعدہ اعتراف نہیں کر سکتی۔ میں تم سے معذرت نہیں چاہوں گی....."

"وہی تمہاری ازلی ضدی طبیعت.....!" میں گہری سانس لیتے ہوئے مسکرایا۔

رومانی ناول

دل کا آنگن — سلمیٰ رعنا

کالے کنول — سلمیٰ رعنا

اور دیا جلتا رہا — سلمیٰ رعنا

موج گرداب — سلمیٰ رعنا

مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2

"نہیں..... میں نے کہا نا کہ اب یہ اچھا محسوس نہیں ہو سر اٹھائے بغیر بولی "تم خواہ زبان سے نہ کہو..... شعوری طور محسوس نہ کرو..... لیکن لاشعوری طور پر ضرور محسوس کرو گے لڑکی اب ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ بلندیوں کی طرف پرواز کرنے شوق میں دھڑام سے نیچے آگری ہے..... اور میں اب بہت ہوگیا ہوں اس لئے اس نے اب مجھے ترجیح دینے کا فیصلہ کر لیا اب میں اس کی نظر میں اچھا ہوگیا ہوں۔ بولو تم سوچو گے یا نہیں بالوں کی چلمن سے آنکھوں کے ستارے جھلملائے۔

"تم کیوں خواہ مخواہ فیصلے دیتی ہو کہ کون کیا سوچے گا نہیں؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

"انسان کو اندازہ تو ہوتا ہے نا۔"

"انسان کے اکثر اندازے غلط ہوتے ہیں۔ جذبات اور کی ڈوریاں کہیں اور سے ہلتی ہیں" میں نے کہا "مثلاً اس وقت اندازہ غلط تھا جب میں سمجھ رہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ..... تمہارا اندازہ اس وقت غلط تھا جب تم نے سوچا تھا کہ تمہارے عشق میں دیوانہ ہے اور تمہارے لئے زندگی کا بہتر ثابت ہوگا۔ اندازوں کی تو بات ہی مت کرو۔ محض اندازہ زندگی کے بڑے فیصلے نہیں کرنے چاہئیں۔"

"شاید تم درست کہہ رہے ہو" وہ اٹک اٹک کر بولی' اس وقت بھی میرا اندازہ غلط تھا جب میں سمجھ رہی تھی کہ تمہیں دھوکا دے رہی ہوں۔ تم سے شغل یا دل لگی کر ہوں۔ میں اس وقت تمہیں نہیں' شاید اپنے آپ کو دھوکا رہی تھی۔ دل کو شاید اس وقت بھی تمہاری طلب تھی..... تم چاہ تھی..... لیکن میں اسے مس گائیڈ کر رہی تھی۔ اسے غلط دکھا رہی تھی۔"

یہ سب کچھ سننا بہت بھلا لگ رہا تھا۔ رگ و پے میں شبنمی سی ٹھنڈک پھیلتی جا رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس چہرے سے بالوں کی چلمن ہٹا دی۔ میں اس چہرے پر سچ کا پرتو

سچ وہاں آنسوؤں کی صورت میں موجود تھا۔ میں یہ دیکھ کر بغیر نہ رہ سکا کہ وہ ایک بار پھر رو رہی تھی۔ آنسوؤں کی کے رخساروں پر سے پھسلتی ہوئی ریشمی بش شرٹ میں رہی تھیں۔

نے اس کے آنسو پونچھ دیئے مگر وہ تو اک سیل رواں تھا جو آ رہا تھا۔ وہ میرے بازوؤں میں سمٹ کر بلک بلک کر رونے آنسوؤں کے اس سیلاب کو روکنا میرے بس کی بات نہیں نے اسے بہنے دیا۔ خود میرے دل کے تپتے صحرا میں نمی سی آخر کار وہ تھکی ہوئی فاختہ کی طرح ہانپنے لگی۔ جھوٹ لے اس طرح نہیں رو سکتے تھے۔

میں حیران ہوں....." میں نے اس کی بھیگی آنکھوں کی طرف رتے ہوئے بھیگی بھیگی سی آواز میں کہا "اگر یہ حقیقت ہے تو پہلے کی وہ سنگدلی کیا تھی؟"

میں نے کہا تو ہے..... وہ ایک خود فریبی تھی..... شاید میرے اور غیر حقیقت پسند ذہن کا ایک ایڈونچر تھا۔ بہت مہم پسند پائی تھی نا میں نے۔ عشق کو بھی ایک مہم بنا لیا تھا اور راستہ منتخب کیا تھا....." پھر یکدم جھجکنے سے اپنے آپ کو علیحدہ ہوئے بولی "لیکن تم بتاؤ..... تم کس لئے آئے ہو؟ میری کا تماشا دیکھنے؟ میری تمنائیوں کا مذاق اڑانے؟"

"میں تمہارا مذاق کیسے اڑا سکتا ہوں؟ کیا میں برباد نہیں ہوا؟ آج بھی ایک برباد کھنڈر ہے۔ پہلی شکست کا صدمہ بہت تھا۔ بھلائے نہیں بھولا۔ اور یہ دل پھر کبھی آباد نہیں ہو سکا" نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم مرد اسی طرح کہتے ہو" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے

"مرد اور عورت کی یہ ازلی بحث مت چھیڑو۔ عورت یہ کہتی اور مرد یہ کہتا ہے..... ہر عورت اور ہر مرد کی کہانی الگ کہانیاں ایک جیسی نظر آنے کے باوجود الگ الگ محسوسات الگ الگ ہیں" میں نے تیزی سے کہا۔ اس کے ہاتھ کی مٹھی ابھی تک بند تھی جس میں اس نے تصویر چھپانے کوشش کی تھی۔

میں نے مٹھی کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اب اگر تاخیر سے سچ بول ہی دیا ہے تو کم از کم اب تو اس منحوس کی تصویر کر پھینک دو۔"

"کس منحوس کی؟" اس نے مٹھی زیادہ سختی سے بھینچتے ہوئے کہا۔

"جمیل ہی کی ہوگی۔ تنہائی میں بیٹھ کر انسان اپنی ناکامیوں اور ناآسودگیوں کی تصویریں ہی دیکھتا ہے اور روتا ہے" میں اس کی بھی طاقت صرف کئے بغیر اس کی مٹھی کھولنے کی کوشش رہا تھا۔

"بات تم نے بالکل ٹھیک کی ہے" وہ مٹھی کھولتے ہوئے بولی۔ "لیکن تصویر جمیل کی نہیں ہے۔"

وہ چڑمڑی تصویر اس کی ہتھیلی پر تھی۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھا کر سیدھا کیا' اس کی شکنیں نکالیں اور دوسرے ہی لمحے جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ میری اپنی تصویر تھی۔ راحیلہ اس میں میرے ساتھ تھی۔ یہ اس وقت کی تصویر تھی جب میں پہلی اور آخری بار ان کے گھر آیا تھا اور ہم پکنک منانے ساحل سمندر پر گئے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ ہم دونوں کی اکٹھے ایک ہی تصویر تھی اور راحیلہ کی امریکی دوست نے کھینچی تھی۔ اس وقت ساحل سمندر پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ تصویر بھی دھندلائی ہوئی سی تھی۔ ایک عجیب سی معصومیت تھی اس تصویر میں۔ چند برسوں میں ہماری شخصیتوں میں ظاہری طور پر کچھ ایسا زیادہ فرق نہیں پڑا تھا لیکن روح پر تجربات کچھ ایسی تیز رفتاری سے گزرے تھے کہ تصویر بھی پرانی محسوس ہو رہی تھی۔ تقریباً بچپن کی سی لگ رہی تھی۔ یادوں کے سارے گرد آلود موتی ادھر اُدھر بکھرنے لگے۔

"تم نے..... تم نے اس تصویر کو اب تک سنبھال کر رکھا ہوا تھا؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ اپنی آواز میں خود بھی بڑی مشکل سے سن پایا۔

"ہاں..... اور آج جب میں تنہائی میں اسے نکال کر بیٹھی تو پہلی بار اس شدت سے مجھے رونا آیا۔ شاید یہ پچھتاوے اور ندامت کے آنسو تھے۔ پچھتاوا اس بات کا تھا کہ میں تو تمہیں تلاش کرنے' تم سے معذرت کرنے بھی نہیں جا سکتی تھی لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ قیولت کی گھڑی ہے۔ اسی دوران بیل بجی ..... اور میں نے دروازہ کھولا تو تمہیں سامنے کھڑا پایا۔ اسی لئے تو میں اتنی زیادہ حیران ہوگئی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بالکل یقین نہیں آ رہا تھا۔ خواب لگ رہا تھا یہ سب کچھ۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں قدرت کی اتنی بڑی نوازش کی مستحق بھی ہو سکتی ہوں۔"

"اب تو تمہیں جذبوں کی صداقت کو مان لینا چاہئے" میں نے کہا۔

"مانتی تو میں پہلے بھی تھی لیکن اب کچھ اور ہی طرح کا یقین ہوا ہے۔"

ایک لمحے گہری خاموشی رہی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے ساکت بیٹھی تھی۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "کیا سکوت ہے یہاں۔ راشد نے مجھے بتایا ہے کہ جمیل سے تمہاری رفاقت ڈیڑھ سال رہی..... مجھے یہاں کسی بچے کی موجودگی کا احساس نہیں ہو رہا۔"

"وہ رفاقت نہیں' میری حماقت اور جمیل کی خباثت تھی" اس کی نم آنکھوں میں ایک بار پھر چنگاریاں سی تیر گئیں "وہ شادی شاید اس کا پہلے سے سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ اس لئے وہ ہر معاملے

میں طے شدہ سی حدود میں چل رہا تھا۔ بقول اس کے "وہ اتنی جلدی زیادہ الجھنوں میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ احتیاط اسی کی طرف سے تھی۔ مجھے ماں بننے میں کوئی عذر نہیں تھا۔ وہی باپ بننا نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اولاد ازدواجی زندگی کی زنجیر ہوتی ہے۔ ... میاں بیوی رشتہ توڑنا بھی چاہیں تو بعض اوقات صرف اولاد ہی کی وجہ سے بادل ناخواستہ بھی اس بندھن میں بندھے رہتے ہیں۔ وہ ایسی کوئی جذباتی کمزوری پالنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے شروع سے ہی معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ جو کچھ ہوا وہ محض اتفاقیہ یا غیر ارادی نہیں تھا۔"

میں نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "تم نے اس کے اتنے ظلم و ستم کس طرح سہہ لئے؟ تم تو جوڈو کراٹے بھی جانتی تھیں؟"

"بیوی بننے کے بعد جوڈو کراٹے دھرا رہ جاتا ہے۔ اگر براہِ راست صرف مرد اور عورت کا مسئلہ ہو تب بھی کوئی بات نہیں۔ شاید عورت نمٹ لے۔ لیکن عورت بہت سے رشتوں کے جال میں پھنس جاتی ہے' بندھ جاتی ہے' بے دست و پا ہو جاتی ہے" ... وہ اپنے ہاتھ پھیلا کر گلابی ہتھیلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "جوڈو ازدواجی بندھن کو توڑنے میں تو مددگار ہو سکتی ہے' جوڑنے میں نہیں۔ پھر بھی جتنی میں نے مزاحمت کی' اتنی شاید کوئی اور لڑکی نہ کر سکتی۔ یہ بات نہیں ہے کہ شادی کے نبھ جانے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ نبھ بھی سکتی تھی' اگر میں بالکل بھیڑ بکری بن کر سب کچھ سہتی چلی جاتی۔ ہر مطالبہ پورا کرتی چلی جاتی اور اپنے والدین کو بھی مرتے دم تک بلیک میل ہونے دیتی تب شاید نبھ جاتی۔ لیکن میں نے ذلت کی آخری حدوں تک سمجھوتا نہیں کیا اور اچھا ہی کیا۔ کچھ تو عزت رہ گئی۔ ورنہ ڈیڈی کے مفلس ہونے کے بعد بھی بہرحال یہ بندھن ٹوٹ ہی جانا تھا۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ قدرے شرمیلے سے انداز میں بولی "لیکن جب بندھن کا ٹوٹنا سو فیصد یقینی ہو گیا تھا تب تو ایک بار میں نے اس کے والدین اور بھائی بہنوں کے سامنے اس کی ٹھیک ٹھاک پٹائی کی تھی۔ اٹھا اٹھا کر پٹخا تھا۔ دو دانت توڑ دیئے تھے۔ ایک ہنگامہ ہو گیا تھا۔ ان کے گھر میں تو صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔ جمیل کے ابا نے میرے خلاف قاتلانہ حملے کی رپٹ درج کرا دی تھی۔ تھانہ کچہری بھی ہوئی تھی۔ اخباروں میں خبریں بھی آ گئی تھیں۔ بیوی نے عبرت ناک انداز میں شوہر کی پٹائی کر دی اور اسے اسپتال پہنچا دیا۔ اس پر بڑی لے دے ہوئی تھی۔ بیانات کا ایک سلسلہ چل پڑا تھا۔ چھوٹی سی ایک سیاسی پارٹی جسے مذہبی ہونے کا دعویٰ ہے' اس کے سربراہ نے تو فتویٰ دے دیا تھا کہ ایسی نابکار بیوی کو پھانسی دے دینی چاہئے۔"

"اوہ ..." میں نے قدرے حیرت سے کہا "افسوس ... مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس قسم کی کوئی بحث اخباروں میں پڑھی ہو۔ شاید لاہور کے اخباروں نے لفٹ نہیں کی تھی یہ خبر! بھی ہو تو شاید غیر نمایاں انداز میں لفٹ کی ہو۔ اس کا م کافی شہرت پائی ہو گی تم نے؟" میں نے مسکراتے ہوئے صبیح چہرے کی طرف دیکھا جس پر اب بھی نوخیزی کی معصو تھی۔

"ہاں۔ لیکن کافی منفی قسم کی شہرت تھی" وہ بھی ہوئے بولی "تو کہری ملنی بھی مشکل ہو گئی تھی بعد میں مجھے اسی لئے بعد میں کبھی کوئی رشتہ بھی نہیں آیا۔"

"مجھے جو یہاں آنا تھا۔ قدرت جو کرتی ہے' بہتری کر میں نے کہا۔

اس کے چہرے پر یک لخت گہری سنجیدگی ... بلکہ عجیب سا چھا گیا۔ خوبصورت آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔ سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے مُرتعش سے لہجے میں بولی کے لئے تم مجھ سے شادی کی درخواست نہ کرنا۔ پلیز ...!"

اس کے تاثرات میرے لئے حیرت کا باعث تھے۔ ملامت سے کہا "مجھے ایسی جلدی نہیں ہے۔"

"نہیں۔ آج بھی نہیں۔ کل بھی نہیں۔ کبھی نہیں۔ تم کبھی بھی شادی کے لئے نہ کہنا" وہ بدستور وحشت زدہ نظ تھی۔

"تم تو کچھ اس طرح خوف زدہ ہو گئی ہو جیسے مجھ سے شا کسی ریچھ' بن مانس یا لنگور جھگے سے شادی کا تصور تمہارے ذ آ گیا ہے" میں نے ہلکی سی خفت سے کہا۔ ایک طرف ایسی لا محبتوں کی باتیں ہوں' دوسری طرف شادی کے نام سے ایسا اور وحشت ہو تو انسان کو خفت تو ہوتی ہی ہے۔

"نہیں ... نہیں ... تم غلط سمجھ رہے ہو" وہ بے ا میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی بھیگی بھیگی آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولی ویسے بھی تمہارے قدموں میں بیٹھ کر زندگی گزار سکتی ہوں۔ اس طرح ندامت کے داغ دُھل سکیں لیکن بس تم مجھ سے شا خیال دل میں نہ لانا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے حیرت سے کہا "کیا تمہیں کیسے کیس ہو گیا ہے؟ ایک شادی کی ناکامی کے بعد شادی سے بیٹھ گیا ہے دل میں؟"

"نہیں ... یہ بات بھی نہیں ہے ..." وہ میری الا سے کھلتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولی "بس ... تم سے شا میں تصور نہیں کر سکتی۔ شاید یہ ندامت کی انتہا ہے۔ میں آپ کو تمہارے قابل محسوس نہیں کرتی۔ میں اب وہ راجیلہ ہوں جس پر تم فدا تھے۔ خود غرضی سی لگتی ہے کہ آج جب ک ایک ٹھکرائی گئی ... مسترد شدہ سی چیز ہوں ... اور تم عروج کی جا رہے ہو تو میں تمہارے پلے بندھ جاؤں۔ محض اس لئے تمہارے دل میں لڑکپن کے اس عشق کی چنگاری آج بھی

"چنگاری نہیں' وہ شعلہ ہے جسے میں نہ جانے کس طرح بجھا بیٹھا تھا" میں نے تصحیح کی "ایک تو میں تم جیسے پیچیدہ سوچوں والے انسانوں سے بڑا تنگ ہوتا ہوں جو کبھی کوئی فلسفہ گھڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور کبھی کوئی۔ ان کی زندگی کا بس ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ خوشیاں آ کر ان کے دروازے پر دستک دیں تو وہ دھکے دے کر انہیں واپس کر دیں۔ تم لوگ زندگی کو سیدھے سادے طریقے سے کیوں نہیں لیتے؟ بھئی جو ہوا سو ہوا۔ اب اسے بھولنے کی کوشش کرو اور زندگی کا جو نیا موڑ سامنے منتظر ہے اس سے از سرِ نو آغاز کرو" میں نے اسے ڈانٹ سی پلائی۔

"یہ اتنا آسان نہیں ہوتا" وہ بھیگی بھیگی آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی "اور یہ تم جمع کے صیغے میں بات کر رہے ہو ... تو کیا اور لوگ بھی ہیں جیسے؟ اور بھی ہیں تمہارا دل جلانے والے؟"

"ہاں۔ ہیں تو سہی" میں نے جواب دیا "لیکن مقامِ شکر ہے کہ ان سے عشق کا رشتہ نہیں ہے" پھر میں نے ایک طویل جماہی لیتے ہوئے کہا "کیا تمہارے ہاں اتنی دور سے آئے ہوئے دن بھر کے ہمارے مہمان کو کچھ کھلانے پلانے کا رواج نہیں ہے؟"

"آئی ایم سوری" وہ یکدم اٹھتے ہوئے بولی "تمہارا آنا میرے لئے اتنا حیرت انگیز واقعہ ہے کہ میں سب کچھ بھول گئی تھی۔"

وہ کچن میں چلی گئی۔ مجھے بھی آواز دے کر اس نے وہیں بلا لیا بولی "تمہیں وہاں اکیلے چھوڑ کر آنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ میں کھانے پینے کے لئے کچھ بناتی ہوں۔ تم کھڑے باتیں بناتے رہو۔"

چھوٹا سا کچن ڈربے سے مشابہ تھا لیکن صاف ستھرا اور چمکتا تھا۔ اس میں کام کرتی ہوئی وہ مجھے اور بھی زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ وہ میرے لئے کافی اور سینڈوچ تیار کر رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں حالات کے اس دلچسپ پہلو سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ صبح سے لاہور میں دفتری اور دیگر کاموں میں مصروف رہا تھا اور وہ کوہیں سے سیدھا ہوٹل کے افتتاح میں پہنچا تھا۔ آج اتفاق سے مجھے دوپہر کا کھانا کھانے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ کراچی آ کر ہوٹل میں بھی میرے کچھ کھانے پینے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ تو رونق' گہما گہمی اور عمدہ انتظامات دیکھ کر پانی کا گلاس بھی بھول گیا تھا۔ ہزاروں افراد وہاں بہترین ڈنر کے لوازمات سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور میں خود اس چھوٹے سے فلیٹ کے کچن میں کافی کی ایک پیالی اور ایک سینڈوچ کا منتظر تھا۔

راجیلہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر ایپرن پر ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی "آج کل کیا کر رہے ہو؟ وہی پرانا دھندا ... یا کوئی کاروبار وغیرہ کیا ہے؟"

"اس دھندے کا تو تمہیں خواہ مخواہ ہی شبہ ہو گیا تھا مجھ پر" میں نے جلدی سے تھوک نگل کر کہا "اس زمانے میں لاعلمی میں ایسے کچھ لوگوں سے میرے مراسم ضرور ہو گئے تھے لیکن میں خود کبھی اس دھندے میں نہیں پڑا۔"

"تو پھر کیا کر رہے ہو؟"

"کئی چھوٹے موٹے کاروبار ہیں۔ قسمت نے کچھ ہاتھ پکڑ لیا ہے" میں نے جواب دیا۔

"خیر ... ان باتوں سے مجھے اب کوئی دلچسپی بھی نہیں رہی۔ میں اب خواہ مخواہ ولی بننے کی کوشش نہیں کرتی۔ تھوڑی بہت ہیرا پھیریاں اور چالاکیاں تو ہر کاروبار میں چلتی ہیں۔ آدمی کو تھوڑا بہت چالاک تو ضرور ہونا چاہئے ورنہ وہ زندگی کی دوڑ میں تھوڑا بہت آگے تو بڑھ سکتا ہے' بہت زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ خالص سونے سے تو زیور بھی نہیں بنتا۔ اسے زیور کے قابل بنانے کے لئے اس میں بھی تھوڑی بہت ملاوٹ کرنی پڑتی ہے" وہ بے پروائی سے بولی۔

"یہ بات نہیں ہے" میں نے ملامت سے کہا "یہ دنیاوی ترقی کے چکر کچھ عجیب ہی ہیں۔ خود میری سمجھ میں آج تک نہیں آئے۔ بس تقدیر جس کا ہاتھ تھام لے' وہ خواہ بالکل سیدھا ہو' تھوڑا بہت چالاک ہو یا عمرو عیار ہو' باصلاحیت ہو' خواہ چغد ہو۔ بس وہ کچھ نہ کچھ بن جاتا ہے۔ میرا تو اب تقدیر پر ایمان ہو گیا ہے۔"

"یعنی صلاحیت تمہاری نظر میں کوئی چیز نہیں؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"صلاحیت ثمنی چیز ہے۔ اس کا کردار ثانوی ہے۔ تقدیر ساتھ نہ دے تو صلاحیتیں وغیرہ سب دھری رہ جاتی ہیں" میں نے کہا۔

وہ مبہم سے انداز میں کندھے اچکا کر رہ گئی گویا اس موضوع پر بحث سے بچنا چاہتی ہو۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ "بہرحال ... اب تم اپنی حرکات و سکنات اور خود اعتمادی سے خاندانی دولت مند لگنے ہو۔ ایک خاص نفاست آ گئی ہے تمہاری شخصیت میں۔ وجیہہ بھی پہلے سے زیادہ لگنے لگے ہو۔ لڑکیاں تو بہت منڈلاتی ہوں گی ارد گرد؟" اس نے شریر سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ شخصیت کا پرانا رنگ دھیرے دھیرے مزید نمایاں ہو رہا تھا۔

"ایسی کچھ زیادہ تو نہیں منڈلاتیں" میں نے جواب دیا "اپنا تو وہ عالم ہے کہ ... وہ جو شاعر نے کہا ہے نا۔ شعر

کسی کو کچھ بھی یہاں حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

اپنے ساتھ تو بس یہی معاملہ چل رہا ہے۔"

"اوہو ... دردناک قسم کے شعر پڑھنے بھی آ گئے ہیں اب تو" وہ ہولے سے ہنسی۔

"آ گئے ہیں ...؟ کیا مطلب؟ پہلے زیادہ آتے تھے۔ اب بھولتا جا رہا ہوں۔ کوئی کوئی شعر ہی یاد رہ گیا ہے لیکن جب زیادہ آتے تھے اس وقت تمہیں سنانے کا موقع ہی نہیں ملا" میں نے اس کے

قریب آکر اس کے وجود اور کافی کی خوشبو ایک ساتھ سونگھتے ہوئے کہا۔

"اب بھی مت سنانا" وہ یکدم سنجیدگی سے بولی "میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔ میرا دل بہت نازک ہوگیا ہے۔"

"دل کو نازک ہی رہنا چاہئے" میں نے کہا "ورنہ بہتر ہے انسان دل کی جگہ سنگِ مرمر کا کوئی اچھا سا کتبہ فٹ کرالے۔"

کافی اور سینڈوچز لے کر ہم واپس ڈرائنگ روم میں ہی کھڑکی کے قریب آبیٹھے۔ راحیلہ نے کمرے میں مدھم روشنی رہنے دی اور پردے ہٹادیئے۔ اس کھڑکی سے سڑک نظر آتی تھی جس پر دونوں طرف کہیں کہیں درخت لہرا رہے تھے۔ گرین بیلٹ پر اوس چمک رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی ویران سڑک سے گزر جاتی۔ بلندی پر اس چھوٹے سے کمرے میں، ملگجے اندھیرے میں ایک ہم دم دیرینہ کے ساتھ بیٹھ کر ہلکی سی خنکی میں باتیں کرتے ہوئے اس سڑک کا نظارہ کرنا دل کو بہت ہی خوشی دے رہا تھا۔ روح جیسے آج ہلکی پھلکی سی ہوگئی تھی۔ زندگی میں جیسے اصل دلکشی ہی آج پیدا ہوئی تھی۔

ہم دیر تک نو عمرو نوخیز، محبت کرنے والوں کی طرح باتیں کرتے رہے اور وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ وہی باتیں جو برسوں پہلے تشنہ ہی رہ گئی تھیں۔ آج ہم مل بیٹھے تھے تو جیسے درمیان سے برسوں کی خلیج غائب ہوگئی تھی اور سلسلہ وہیں سے مل گیا تھا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ محبت عجیب چیز ہے اور انسان عجیب تر۔

ہم اس وقت چونکے جب کال بیل بجی۔ اس وقت شاید سپیدۂ سحر نمودار ہونے کو ہی تھا۔ راشد لوٹ آیا تھا۔ وہ تھکا ہوا بھی تھا لیکن پُرجوش بھی نظر آرہا تھا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں چند لمحے پہلے آئے ہوئے مہمان کی طرح تازہ دم بیٹھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

"آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟" وہ حیرت سے بولا۔ پھر راحیلہ سے مخاطب ہوا "تم انہیں میرے بیڈ روم میں ہی سُلا دیتیں ..... میرا کوئی سلیپنگ سوٹ ہی دے دیتیں۔"

"تمہارا سلیپنگ سوٹ؟" راحیلہ نے اسے گھورا "تم جیسے نازک اندام اور مختصر الوجود نوجوان کا سلیپنگ سوٹ انہیں دے کر میں ان کا دم گھٹنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔"

راشد میری طرف دیکھ کر بڑی شرمندگی سے بولا "معاف کیجئے گا افضل بھائی! یہ جگہ ..... اور ہمارے حالات ..... آپ کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ آپ کو کافی بے آرامی اٹھانی پڑی۔"

"فار گاڈ سیک راشد .....!" میں نے جلدی سے کہا "یہ حالات ..... اور شایانِ شان قسم کی اصطلاحیں میرے سامنے مت استعمال کیا کرو۔ مجھے اگر سونا ہوتا تو میں یہیں کہیں صوفے پر ..... قالین پر ..... تپائی پر ..... کہیں بھی سو جاتا۔ لیکن میں تو تم لوگوں سے تجدیدِ مراسم کی خوشی میں رت جگا منا رہا تھا۔"

"یعنی آپ کو اپنے ہوٹل کے افتتاح سے زیادہ ہم سے مل بیٹھنے کی خوشی ہے؟" راشد نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، راحیلہ نے کراس کی طرف دیکھا "کیا کہا؟ ان کا ہوٹل؟"

"ہاں" راشد نے سر ہلایا "کیا انہوں نے تمہیں نہیں جس ہوٹل میں، میں ملازم ہوا ہوں وہ انہی کا ہے؟"

"نہیں۔ انہوں نے تو مجھے نہیں بتایا" راحیلہ نے مجھے گھ

"ارے بھئی ..... افضل بھائی تو بہت بڑے آدمی ہو گئے" راشد تھکے تھکے انداز میں صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولا "معلوم ہی نہیں تھا کہ میں درحقیقت کس کا ملازم ہونے جا رہا اور اب ان کے بارے میں مزید معلومات کرکے آیا ہوں۔ کاروبار تو لاہور اور کراچی دونوں جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ ٹیکسٹائل ٹرانسپورٹ ..... امپورٹ ایکسپورٹ ..... فلم میکنگ ..... اسٹیٹ ..... کنسٹرکشن ..... فشنگ ..... اب فائیو اسٹار بھی ..... اور نہ جانے کیا کچھ، کہاں کہاں پھیلا ہوا ہے۔ یہ تو وہ چیزیں ہیں جو ایک صاحب مجلت میں ایک طرف کو جاتے مجھے بتا سکے ہیں۔ انہوں نے خود تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں۔ کہہ رہے تھے میں بھی ذرا افتتاح میں مدعو تو نے پوچھا، آج کل آپ کیا کر رہے ہیں۔ تو شرماتے ہوئے بس ایسے ہی دو چار چھوٹے موٹے کاروبار ہیں" راحیلہ نقل اتارتے ہوئے مجھے گھورا۔

"آخر اکساری بھی کوئی چیز ہے" میں نے ٹھنڈی سانس کر کہا، پھر سادگی سے پوچھا "ویسے بائی دا وے ..... آپ لوگ ہاں کیا بڑا آدمی صرف اسی کو سمجھا جاتا ہے جس کے بڑے کاروبار ہوں؟"

"طنز فرمانے کی ضرورت نہیں ہے" راحیلہ مسکراتے بولی "تمہیں معلوم ہے ہمارا یہ کمپلیکس نہیں ہے۔ بے شک تم جیسا عروج نہیں دیکھا لیکن زندگی کی ہر آسائش تو ہے۔ اور نہ بھی دیکھی ہوتی تب بھی شاید ہم میں مرعوب کمپلیکس نہ ہوتا کیوں کہ ہر انسان کی اپنی اپنی سائیکالوجی ہے۔ ہماری سائیکالوجی ایسی نہیں ہے۔ میں تو صرف مکمل جاننے کے لئے پوچھ رہی تھی۔ تم خود بھی کہہ چکے ہو بات زوال کی نہیں ہوتی، ایک دوسرے کا حال جاننے کی ہوتی ہے"

"اف ..... اتنی لمبی تقریر کی کیا ضرورت تھی" میں تھامتے ہوئے کہا "میں طنز کب کر رہا تھا۔ یونہی ذرا تم لوگوں رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے تم دونوں میں کوئی کمپلیکس نہیں پایا جا"

"خیر ..... اب تم جان چھڑانے کے لئے ایسا بھی مت" راحیلہ فوراً بولی "ہر انسان میں کمپلیکس تو کوئی نہ کوئی ضرور ہے۔ لیکن اب ہم تم سے بحث نہیں کریں گے۔ اب تم رات بگ باس ہوگئے ہو بلکہ ہماری چھوٹی سی ایڈورٹائزنگ کمپنی سب سے بڑے کلائنٹ بھی تم ہی ہو۔ ہم تمہیں ناراض کر

سکتے نہیں لے سکتے۔ اور بگ باس کا کوئی پتا نہیں ہوتا کہ وہ کس بات پر ناراض ہو جائے۔"

"ہاں ..... یہ تو ٹھیک ہے" میں نے مصنوعی سنجیدگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا "میرے خیال میں ناراض ہونے کے لئے یہی موقع سب سے زیادہ مناسب ہے۔ میں ابھی اور اسی وقت ناراض ہو جاتا ہوں۔ راشد کو نوکری سے برخاست کر دیتا ہوں۔"

کمرے میں ایک لمحے کے لئے سکوت چھا گیا۔ دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میں نے مناسب وقفے کے بعد کہا "تاکہ یہ کوئی ڈھنگ کا کام کر سکے۔"

وہ دونوں مسکرا دیئے۔ میں نے براہِ راست راشد کو مخاطب کیا۔ "بھائی میں میرا کنسٹرکشن کا کاروبار زیادہ اچھا نہیں جا رہا۔ شفٹنگ کے کام کا بوجھ بہت زیادہ ہے۔ وہ بہت سے شعبوں کی نگرانی کر رہا ہے۔ کنسٹرکشن کا شعبہ محض اوپری نگرانی کے لئے بھی بہت وقت مانگتا ہے۔ کنسٹرکشن کمپنی چل تو رہی ہے لیکن اس طرح نہیں چل سکتی جس طرح میں چاہتا ہوں۔ اس کے لئے سپریم اتھارٹی کے طور پر کام کرنے والے ایک ایسے شخص کی مجھے بہت دنوں سے ضرورت ہے جس پر میں آنکھیں بند کرکے اعتماد کر سکوں۔"

"ہوگی تو وہ بھی نوکری" راشد ہنس کر بولا۔

"ہاں۔ تمہاری حیثیت ملازم ڈائریکٹر کی ہوگی لیکن تم تقریباً خود مختار ہی ہوگے۔ صرف مجھے جواب دہ ہوگے۔ اور میں لاہور میں ہوں گا۔"

"لیکن مجھے تو کنسٹرکشن کا کوئی تجربہ نہیں ہے" وہ بولا۔

"جس مقام پر میں تمہیں متعین کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے تجربے کی ضرورت نہیں۔ کام کرنے والی تو ساری مشینری موجود ہے۔ تمہیں صرف اس مشینری کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ اسے چالو رکھنا ہوگا۔ تمہاری زیادہ بڑی ذمے داریاں صرف دو ہوں گی۔ باقی سب باتیں ضمنی ہوں گی۔ ایک تو تمہیں صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ کہیں کوئی گھپلا نہ ہونے پائے۔ دوسرے کہیں کام رکنے نہ پائے۔ اصل میں تم صرف مالک کے نمائندے ہوگے۔"

"مجھے کنسٹرکشن سے خوف بھی آنے لگا ہے" راشد کمزور سے لہجے میں بولا "ڈیڈی آخری داؤ کے طور پر جس بلڈنگ کو اپنی ایمپائر کا کھ کر تعمیر کر رہے تھے، وہی ان کی قبر بن گئی۔ تب سے میرے ذہن میں خوف بیٹھ گیا ہے۔"

"خیر ..... اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے" میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ان کے والد مرحوم کا ذکر آنے پر ماحول بوجھل نہ ہو جائے۔ میں نے راحیلہ کو مخاطب کیا "تمہیں ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا؟"

"دو سال" اس نے جواب دیا۔

"اتنا اعتماد تو آہی گیا ہوگا کہ اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی چلا سکو؟"

"ہاں ..... اعتماد تو نوکری شروع کرنے سے پہلے بھی تھا" وہ قدرے مضطرب سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"بس تو پھر تم اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھول لو۔ ابتدائی طور پر اسے چلانے کے لئے ہمارے اپنے کاروباروں کی پبلسٹی کا کام ہی کافی ہوگا۔ شروع میں یہ گویا ایک ہوم ایجنسی ہی ہوگی لیکن تم اسے جتنی بھی وسعت دے سکو، دے دینا۔ یہ تمہاری اپنی ہمت اور صلاحیت پر منحصر ہوگا۔ مالی مسئلہ تمہیں کوئی نہ ہوگا۔"

راحیلہ نے ایک بار پھر بھائی کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے کہا "ابھی! ہمیں ہماری اوقات ہی رہنے دو۔ ہم بہت سکون میں ہیں۔ ہمیں بڑی بڑی چھلانگیں لگانے کا بالکل شوق نہیں ہے۔"

"تمہیں اس میں اعتراض کیا ہے؟ تکلف کیا ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"بس ..... کچھ اچھا نہیں لگتا ....." وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "کچھ ایسا محسوس ہوگا جیسے ہم پرانی شناسائیوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

"کیا اس "جرم" پر تمہارے خلاف تفتیش ہوگی کہ تم شناسائیوں سے فائدہ اٹھا رہے ہو؟" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"بات اپنے احساس کی ہوتی ہے" راحیلہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔

"تمہاری تسلی کے لئے بتا دوں کہ اس میں شناسائیوں سے فائدہ اٹھانے والی کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں اس ایجنسی میں سلیپنگ پارٹنر ہوں گا۔ محنت تمہاری ہوگی، رقم میری۔ نفع نقصان فٹی فٹی۔ کوشش کرنا کہ وہ نقصان میں نہ جائے تاکہ تمہارے حضرتِ ضمیر مطمئن رہ سکیں۔ ہم مہربانیوں اور نوازشات کی بات نہیں کر رہے۔ دو کاروباری افراد کی طرح ایک کاروباری منصوبے کی بات کر رہے ہیں، جس میں میں منافع کی امید پر سرمایہ کاری کر رہا ہوں۔ ایک نیا پروجیکٹ ہے اور مخدوش بزنس ہے۔ تمہیں اس میں جان توڑ محنت کرنا پڑے گی۔ کوئی احسان نہیں ہوگا تم پر۔"

"اب ہم بار بار انکار کرتے رہیں گے تو تم کہو گے کہ نخرے دکھا رہے ہیں۔ لیکن فی الحال ہمیں انکار کے سوا کچھ سوجھ بھی نہیں رہا۔ کمزوری ہے کہ ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو۔ یقین کرو ہم اپنے موجودہ حالات سے بہت مطمئن ہیں۔ ہمیں کوئی حسرت یا پریشانی نہیں ہے۔ لیکن اگر تم بضد ہو تب بھی ہمیں کچھ عرصہ سوچنے سمجھنے کا موقع ضرور دو۔ ابھی تو ہم اس اچانک ملاقات سے ہی بوکھلائے ہوئے ہیں" راحیلہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

"یہ جواب مناسب ہے" میں نے طمانیت سے سر ہلایا "اچھی طرح سوچو، سمجھو۔ اگر کچھ بقراط سقراط قسم کے دوست مبشر ہوں تو ان سے بھی مشورہ کرلو۔ ویسے مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا ساتھی

بننے کے لئے بھی تمہیں اتنی سوچوں میں الجھنا پڑے گا۔"

"ہم سمجھے ہوئے لوگ ہیں۔ سمجھے ہوئے بھی اور قناعت پسند بھی" راشد بولا۔

"چلو خیر۔ میں نے جو تجویزیں پیش کی ہیں ان پر عمل درآمد کا فیصلہ اگلی ملاقات کے لئے اٹھا رکھتے ہیں" میں نے کہا "جلدی میں خود دوبارہ کراچی آؤں گا یا تم دونوں کو لاہور بلاؤں گا پھر ہم تفصیلات طے کریں گے۔ یہ بات بہرحال طے ہے کہ تمہارا جواب انکار میں نہیں ہونا چاہئے۔"

راشد بولا "آپ نے افتتاح کے بارے میں تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔"

"تم لوگوں سے تجدید مراسم کی جس محل سرا کا افتتاح ہوا ہے اس کے بعد میں ہوٹل کے افتتاح کو بھول گیا ہوں" میں نے کہا۔ "بتانا ہے تو خود ہی بتا دو کہ کیسا رہا؟"

"بہت شاندار" راشد جوش و خروش سے بولا "اس انداز میں آج تک کسی ہوٹل کا افتتاح نہیں ہوا۔ شفیع شاہ نے روپیہ پانی کی طرح بہایا ہے۔ اور اس کا ریٹرن ضرور ملے گا۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے بولا "لیکن آپ کی بہت کمی محسوس ہو رہی تھی۔ خصوصاً ورائٹی پروگرام کے ساتھ ساتھ جو تعارفی سلسلے چل رہے تھے ان میں آپ کا کئی بار ذکر آیا۔ بہت سے لوگ جو آپ سے غائبانہ واقف تھے وہ آپ سے ملنے کے مشتاق رہے اور جو آپ کو جانتے تھے وہ آپ کو تلاش کرتے رہے۔ کیوں کہ وہاں یہ خبر تو پھیل چکی تھی کہ آپ آئے ہوئے ہیں۔ ہر کوئی پریشان تھا کہ آپ اس موقعے پر کہاں غائب ہو گئے۔ خصوصاً فلم اسٹار ستارہ آپ کو بہت پوچھ رہی تھی اور تلاش کر رہی تھی۔"

راحیلہ نے فوراً ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ راشد اپنی دُھن میں سادگی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولا "بلکہ ایک ستارہ ہی کیا تینوں چاروں ہیروئنیں جو آئی ہوئی ہیں، سبھی آپ کے بارے میں بڑی گرم جوشی سے پوچھ رہی تھیں۔"

راحیلہ نے معنی خیز انداز میں آہستگی سے یوں سر ہلایا کہ راشد دیکھ نہیں پایا۔ میں نے صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں جلدی سے کہا "ستارہ کے سوا میری تو کسی سے شناسائی نہیں۔ ستارہ سے بھی اس لئے ہو گئی ہے کہ وہ کئی ایسی فلموں کی ہیروئن ہے جنہیں میں فائنانس کر رہا ہوں۔ ورنہ میں تو اسٹوڈیو آنا جانا بھی نہیں۔ بس آپ غائبانہ طور پر لوگ ذرا جاننے لگے ہیں اور تم جیسے کچھ دوستوں کی مہربانیاں ہیں کہ اچھے انداز میں جاننے لگے ہیں۔"

راشد سادگی آمیز شریر لہجے میں بولا "لیکن آپ خاص طور پر خواتین میں کافی پاپولر معلوم ہوتے ہیں۔"

میں نے طویل سانس لے کر کہا "بھائی! اگر تم فلمی خواتین میں پاپولر ہونے کی بات کر رہے ہو تو وہاں ہر وہ شخص پاپولر ہوتا ہے جس کے پاس پیسہ ہو۔ اگر وہاں کسی کی دولت مندی کے قصے ہو جائیں تو وہ کسی سے ملنے سے پہلے ہی پاپولر ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ صفات کو جانچنے کا پیمانہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ اس نے ہیروئن کو کوٹھی لے کر دی ہے، کس چھوٹی موٹی مگر خوش ادا کار کو بیش قیمت گاڑی لے کر دی ہے۔ کس کی خدمت ڈائمنڈ کا کوئی سیٹ وغیرہ پیش کیا ہے۔"

"ایک بے چاری فلم انڈسٹری کا کیا ذکر ہے۔" راشد سر جھٹک کر بولی "آج کل تو پوری دنیا کا تقریباً یہی چلن ہے۔ ذرا مراسم کی نوعیت کا فرق آ جاتا ہے ورنہ پیمانے تو یہی ہیں۔"

"یہ بھی تم نے ٹھیک ہی کہا" میں نے سر ہلایا پھر گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "اب میں چلتا ہوں۔ شفیع شاہ حیران ہو گا کہ کہاں غائب ہو گیا ہوں۔"

"اب آپ کہاں جائیں گے؟" راشد نے پوچھا۔

"میں سوچ رہا ہوں اب جا کر ذرا اپنے ہوٹل میں بھی ہو دیکھ لوں۔ آرام بھی ہو جائے گا اور ہوٹل کے معیار و سہولتوں کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

راشد مسکراتے ہوئے بولا "وہاں کوئی کمرا خالی ہے۔ ایمرجنسی کے لئے بھی جو چار پانچ کمرے رکھے جاتے ہیں بھی مجبوراً کسی نہ کسی کو دینے پڑے ہیں۔ آج ہی سے آمدنی شروع ہو گئی ہے۔ اسی فیصد تو دوسرے شہروں سے آئے ہوئے اعزازی مہمان ہیں۔ میں فیصد کمرے کرائے پر بھی گئے ہیں۔ کو وہاں جگہ ملنی مشکل ہے۔ اگر آپ واقعی آرام کرنا چاہتے ہیں آپ کے حق میں بہتر یہی ہے کہ جہیں ٹھہرے رہیں۔"

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ راحیلہ کو بھی وہی خیال تھا ایک لمحہ پہلے مجھے آ چکا تھا۔ ہنس کر بولی "انسان عبرت پکڑنا چاہے اس قسم کے واقعات سے کافی تسلی بخش طور پر پکڑ سکتا ہے۔ ہوٹل کے مالک کو نہ تو ہوٹل میں کھانا نصیب ہوا اور نہ ہی رہنا۔"

"اسی لئے تو میں اپنی املاک کو کبھی اپنی املاک نہیں سمجھتا۔ ہر وقت دونوں ہاتھ جھاڑ کر ایک مفلس کی طرح از سر نو زندگی کے میدان میں کودنے کو تیار رہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یعنی تم نے پہلے ہی زبردست عبرت پکڑی ہوئی ہے۔ جیسوں کو دیکھ کر" راحیلہ بولی۔

"تم بات پھر اپنی طرف لے آئیں۔ میں اب واقعی چلتا ہوں" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے مجھے مدد کی بہت کوشش کی لیکن مجھے اب واقعی شفیع سے ملنے، ہوٹل کا جائزہ لینے اور بہت سے کاروباری معاملات پر تبادلۂ خیال کرنے کے لئے جانا تھا اس لئے میں نے اجازت لے ہی لی۔

دوسرے روز شام کو کراچی سے میری واپسی ممکن ہو سکی۔ اس دوران مجھے ایک لمحے کی فرصت نہیں ملی۔ ائرپورٹ پر شاہ کے علاوہ راحیلہ، راشد اور سیٹھ رمضان بھی مجھے چھوڑنے

آئے تھے۔ فلمی لوگوں کا قافلہ مجھ سے پہلے ہی واپس روانہ ہو چکا تھا اور ستارہ انہی کے ساتھ چلی گئی تھی۔

شفیع شاہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ راشد اور راحیلہ سے میرا پرانا تعلق خاطر نکل آیا ہے۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ راشد بھی ویسے کامیاب لوگوں میں سے ایک تھا جن کی ہمیں تلاش رہتی ہے۔ جن پر ہم آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتے تھے اور جو ہمارے معیار پر ثابت ہو سکتے تھے۔ میں نے شفیع کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ راشد ہماری ایمپائر کا ایک ستون ثابت ہو سکتا تھا اور میں کنسٹرکشن کا کام اس کے سپرد کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ میں نے شفیع شاہ کو ہدایت کر دی تھی کہ اس سلسلے میں ابھی سے اسے ضروری رہنمائی فراہم کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ شفیع شاہ نے ہمیشہ کی طرح ذہانت مندی سے سر ہلا دیا تھا۔ کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

میں گھر پہنچا تو خاصا تھکا ہوا تھا۔ نہا کر میں سونے کا ارادہ کر رہا تھا کہ انٹرکام پر طارق خان اجازت لے کر اندر آ گیا۔ طارق خان ایک لمبا تڑنگا، ادھیڑ عمر، سرخ و سفید آدمی تھا۔ وہ زیادہ تر ہمارے پرائیویٹ ہاؤس میں بیٹھتا تھا۔ ملنے سے ایک عام، سیدھا سادا، پڑھا لکھا سا دیہاتی چوکیدار نظر آتا تھا جیسے عام طور پر کوٹھیوں کے گیٹ پر بیٹھے نظر آتے ہیں مگر درحقیقت وہ ایسا عام سا آدمی نہیں تھا۔

وہ ایک سابق کمانڈو تھا۔ گیٹ پر بھی وہ گیٹ کی آڑ میں ایک جدید وائرلیس ورتھ رائفل رکھ کر بیٹھتا تھا جو انتہائی قریب سے لے کر تقریباً پندرہ سو گز کے فاصلے تک یکساں خطرناک تھا۔ اس کے علاوہ گیٹ ہاؤس میں اس کے پاس ہلکی مشین گن بھی رکھی رہتی تھی۔ انٹرکام پر اس کا کوٹھی کے دوسرے حصوں سے اور ٹرانسمٹر پر باقی تمام ساتھیوں سے رابطہ رہتا تھا۔ ضرورت کے وقت وہ قریب ترین لوگوں کو فوری طور پر طلب کر سکتا تھا۔

اسی طرح کا دوسرا آدمی ظاہر علی تھا۔ وہ دونوں جڑواں بھائی تھے لیکن درحقیقت وہ صرف گہرے دوست تھے۔ ظاہر علی بھی شفٹ پر ڈیوٹی دیتا تھا۔ ایک دن میں رہتا تھا اور دوسرا رات میں۔ ان دونوں کا بندوبست میں نے اس دن کے بعد سے کیا تھا جب بدمعاشوں کے ایک بڑے خطرناک گروہ کا سردار اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میرے کتوں کو زہر آلود گوشت کھلانے اور چوکیدار کو ہلاک کرنے کے بعد گھر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ قیصر ملک نے بہت بھاری معاوضہ دے کر اس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اتفاق سے اس کا نام محمد طارق تھا۔ اور اس کے مجھے طارق خان نامی یہ کام کا آدمی مل گیا تھا۔ ظاہر علی کو وہی لے کر آیا تھا۔

طارق خان کو میں نے اسٹڈی میں بلا لیا۔ وہ ایک چھوٹا سا پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا "سر! یہ آپ کی غیر موجودگی میں ایک شخص آپ کے لئے دے گیا تھا۔ سیکیورٹی چیک اپ میں نے کر لیا ہے۔ اس میں کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔ صرف ایک ویڈیو کیسٹ ہے۔"

"کون تھا وہ؟" میں نے پیکٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"اے ٹن یا ٹین..... کچھ اس قسم کا نام بتایا تھا" طارق خان نے جواب دیا۔

"اوہ....." میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس بندر نما، مختصر الوجود اور پُراسرار انسان کی صورت میرے ذہن میں ابھر آئی۔

"اس کی تصویر ریکارڈ میں آ گئی ہے۔ گو کہ وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی یہ پیکٹ دے کر آگے بڑھ گیا تھا" طارق خان بولا اور اس نے جیب سے ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

کوٹھی کے گیٹ میں دونوں طرف دو کیمرے فٹ تھے جن کے لینس گیٹ کے آرائشی دائروں میں نظر نہیں آتے تھے۔ وہ بے آواز مووی کیمرے تھے۔ گیٹ ہی میں لگے ہوئے ایک ننھے سے پش بٹن کو چھوتے ہی کام شروع کر دیتے تھے۔ کوئی بھی شخص جو طارق خان کے لئے اجنبی ہوتا، کسی سلسلے میں استفسار کرتا ہوا گیٹ تک آتا یا کوٹھی کے آس پاس منڈلاتا نظر آتا، کوئی چیز دینے آتا یا مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتا، مووی کیمرے میں کسی نہ کسی زاویے سے اس کی تصویر اور کچھ نہ کچھ نقل و حرکت محفوظ ہو جاتی تھی۔ طارق خان اسی کے ذریعے تیار کیا گیا ایک پرنٹ میری طرف بڑھا رہا تھا۔ مجھے تصویر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے لئے نام ہی کافی تھا۔

تاہم میں نے طارق خان سے تصویر لے لی۔ وہ اے ٹن ہی تھا۔ ایک کیڈلک کی کھڑکی سے سر نکال کر وہ پیکٹ طارق خان کی طرف بڑھا رہا تھا اور اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے یوں استہزائیہ سے انداز میں مسکرا رہا تھا جیسے اسے علم ہو کہ کیمرا اس کا عکس محفوظ کر رہا ہے اور یہ اس کے لئے ایک بچکانہ سی حرکت ہو۔

"کوئی پیغام تو نہیں دیا اس نے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں سر!" طارق خان بولا "بس یہ پیکٹ دیا اور کہا کہ اپنے صاحب کو دے دینا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میرے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا۔"

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "طارق خان! تم نے اس شخص کی تصویر غور سے دیکھ لی ہے نا؟"

"یس سر!"

"اس کی شکل ذہن میں رکھنا۔ آئندہ یہ تمہیں یہاں کہیں آس پاس بھی نظر آئے تو اسے قابو میں کر کے گھر میں لانا ہے۔ خواہ اس مقصد کے لئے ٹانگ وانگ میں گولی ہی مارنی پڑے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ اسے جان سے نہیں مارنا ہے۔ زندہ پکڑنا ہے اور یہ بھی خیال رہے کہ یہ جتنا حقیر، کمزور اور مختصر الوجود نظر آتا ہے،

حقیقت میں ویسا ہرگز نہیں ہے۔ بہت ہی پُراسرار سی چیز ہے اور حیرت انگیز طور پر طاقتور اور پھرتیلا ہے۔ اس کے بارے میں قطعاً کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ رہنا اور اسے بالکل اسی طرح قابو میں کرنے کی کوشش کرنا جس طرح شیر' چیتے یا کسی اور خطرناک درندے کو قابو میں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سمجھ گئے نا؟"

"بالکل سمجھ گیا سر!" طارق خان نے جواب دیا اور میرا اشارہ پاکر مستعدی سے خالصتاً فوجی انداز میں سیلوٹ کرکے رخصت ہوگیا۔

میں گو کہ بہت تھکا ہوا تھا۔ دو رات سے سو نہیں سکا تھا اور اب تیسری رات بھی جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے باوجود محض تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں وہ کیسٹ وی سی آر میں لگا کر بیٹھ گیا۔

وہ کیسٹ کیا تھی' لرزہ خیزی کا ایک ایسا عجیب ذریعہ تھی جس کے تاثر کو الفاظ میں صحیح طور پر بیان کرنا ممکن نہیں۔ وہ ایک انسان پر تشدد کی بڑی صاف اور تفصیلی فلبندی تھی جس میں اس کی اذیت ناک آوازیں بھی تمام تر جزئیات کے ساتھ ریکارڈ کی گئی تھیں۔

تشدد کے بہت سے مظاہرے میں نے بھی دیکھے تھے۔ شاید آپ نے بھی دیکھے ہوں۔ تھانوں' زیرِ زمین عقوبت خانوں اور دنیا بھر کی خفیہ پولیس کے مراکز میں انسانوں پر ہونے والے تشدد اور اذیت رسانی کے قصے بھی منظرِ عام پر آتے رہتے ہیں لیکن اس قسم کے واقعات گول مول انداز میں پڑھ لینا اور بات ہے' نہایت اہتمام سے تیار کی گئی ایک فلم دیکھنا اور بات۔

فلم میں ماہرانہ فلبندی کی تمام تیکنیک استعمال کی گئی تھی۔ تمام زاویے کور کئے گئے تھے۔ لائٹ اور ساؤنڈ کے تمام تاثرات سے پورا پورا کام لیا گیا تھا۔ جس طرح اس شخص کے جسم کے ایک ایک ریشے کو مرحلہ وار اذیت دی جارہی تھی' وہ منظر گویا میں حقیقت میں دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ جیسے میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔

وہ ایک جوان رعنا تھا جس کے بدن سے ایک ایک بال نوچا گیا۔ اس کے ناخن کھینچے گئے۔ اسے بجلی کے جھٹکے دئے گئے۔ اس کا جسم دہکتے تاروں سے چھیدا گیا۔ اس کی ہڈیوں کے جوڑ توڑے گئے۔ اس کے اعضا کو ہتھوڑیوں سے آہستہ آہستہ کچل کر گودے میں تبدیل کیا گیا۔ اس کے بچے کھچے بدن میں میخیں گاڑی گئیں۔ آنکھوں میں سلائیاں گھونپی گئیں۔ پھر تشدد کے کچھ ایسے شرمناک طریقے اختیار کئے گئے کہ اگر کسی معجزے کے تحت اس کے سارے زخم بھر جاتے اور وہ زندہ بچ جاتا تب بھی شاید وہ دنیا کو منہ دکھانا اور باقی زندگی گزارنا پسند نہ کرتا۔ پھر اس کے چہرے پر بلیڈ سے چرکے لگا کر ان میں مرچیں بھر دی گئیں۔ آخر کار وہ سسک سسک کر مر گیا اور اس کے ساتھ ہی فلم ختم ہوگئی۔ ان دنوں کیسٹ ایک گھنٹے کی ہوتی تھی۔ فلم ایڈیٹنگ کے ساتھ تیار کی گئی تھی۔ اس نوجوان نے یقیناً کئی گھنٹے اس عذاب میں گزارے تھے۔ تب اس کی جان کو زندگی سے چھٹکارا ملا تھا۔

اس قسم کی اذیت کے تو چند لمحے گزارنے کا تصور ہی روح فنا ہوتا ہے۔ اس نوجوان پر وہ چند گھنٹے کس طرح گزرے ہوں۔ اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ شاید ہر پل اس نے موت کی دعا کی ہوگی لیکن موت اسے صدیوں کے فاصلے پر کھڑی نظر آتی ہوگی۔ موت اس وقت اس کے لئے ایک حسین نعمت ہوگی جس سے ہم زندگی بھر بھاگتے رہتے ہیں' جس سے بچنے کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں۔

میں اپنے آپ کو بہت مضبوط اعصاب کا مالک سمجھتا تھا۔ اپنے خود میرے اشارے پر کئی درندہ صفت اور سفاک انسانوں کو سیدھا کرنے کے لئے ان کی پٹائی کی گئی تھی لیکن تشدد اور اذیت رسانی کے اس انداز اور ان ہتھکنڈوں کی میں نے اپنے کسی آدمی کو کبھی اجازت نہیں دی تھی حالانکہ جو لوگ اس ضمن میں پکڑ کر میرے ہاں لائے گئے تھے وہ تو اپنے اعمال کے پیشِ نظر اس سلوک کے مستحق بھی قرار پاسکتے تھے۔ پھر بھی میں نے اپنے کسی آدمی کو ان کے ساتھ اس قسم کے سلوک کی ابتدا بھی کرنے کی اجازت نہیں دی تھی اور اس کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ ہمیشہ اس حد تک جائے بغیر ہی کام چل گیا تھا۔

درندہ اپنے شکار کو اذیت نہیں دیتا۔ فطرت نے اسے جو طریقہ سکھایا ہے' اسی سیدھے سادے انداز میں وہ اسے ہلاک کرتا ہے اور اگر وہ اس کی خوراک ہے تو اسے کھالیتا ہے۔ وہ اذیت رسانی کے نت نئے' زیادہ سے زیادہ کرب انگیز طریقے نہیں سوچتا اور انہیں اپنے ہم جنسوں پر نہیں آزماتا۔ انہیں بے بس کرکے ان طریقوں سے لذت اندوز نہیں ہوتا۔ یہ صفات صرف انسانوں میں ہی پائی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود درندہ خواہ مخواہ بدنام ہے۔ ہمیں جہاں کہیں بھی ظلم و تشدد اور بربریت و سفاکی کی مثال ملتی ہوتی ہے ہم عموماً درندگی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

میں نے اپنے آدمیوں کو اس لئے بھی کبھی اس طرف مائل ہونے کا موقع نہیں دیا تھا کہ اکثر انسانوں میں اذیت رسانی کی آرزو مبہم سی پیاس چھپی ہوتی ہے۔ اگر انہیں اکثر و بیشتر کسی کو اذیت دینے کے مواقع میسر آنے لگیں تو ان میں یہ پیاس باقاعدہ طور پر جاگ اٹھتی ہے۔ ان کی طلب اور ضرورت بن جاتی ہے۔ اس عمل میں انہیں تسکین ملتی ہے۔ اگر انہیں اس کا موقع نہ ملے تو جھنجلائے ہوئے اور بے چین رہتے ہیں۔ شکار کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک غیر انسانی قسم کی خونخواری ان کی فطرت کا حصہ بن جاتی ہے۔

فلم ختم ہوئی تب بھی میں دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ میرے ہتھیلیاں پسینے میں تر تھیں اور کنپٹیاں سنسنا رہی تھیں۔ اذیت

رسانی کی وہ ہولناک کارروائی پانچ لحیم شحیم آدمیوں نے انجام دی تھی۔ جن کے چہروں پر اُلٹے تھیلوں کی طرح کے سیاہ نقاب چڑھے ہوئے تھے۔ صرف آنکھوں کی جگہ سوراخ تھے۔ ان کے چہروں کی کوئی بھی جھلک نظر نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں انہیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ انسانی صفات سے عاری' شقی القلب قسم کے جلاد تھے اور ان کے لئے یہ ساری کارروائی ایک روٹین کا حصہ تھی۔ نوجوان کو بے بس کرکے جس سکون اور انہماک سے انہوں نے سب کچھ کیا تھا' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے لئے یہ کوئی نیا کام نہیں تھا۔ انہیں اس کا طویل تجربہ تھا۔ کسی جگہ یہ سارا عمل کیا گیا تھا وہ کوئی طویل و عریض ہال معلوم ہوتا تھا جس کی چھت بہت نیچی تھی۔ وہ ایک زیرِ دست قسم کا عقوبت خانہ معلوم ہوتا تھا۔ وہاں اذیت رسانی کے نہ جانے کتنے آلات اور سامان موجود تھے۔ فلم میں بہت سی ایسی چیزوں کی جھلک بھی دکھائی دی تھی جن کی اس نوجوان پر آزمائے جانے کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی۔ صرف یہی نہیں' وہاں شاید فلبندی کے بھی مکمل انتظامات موجود تھے۔

لیکن میری ہتھیلیوں سے پسینہ چھوٹنے یا کنپٹیاں سنسنانے کی محض یہی سوچیں نہیں تھیں۔ میں تو اس لئے بھی دم بخود رہ گیا تھا کہ وہ نوجوان ایک جانی پہچانی سیاسی شخصیت تھا۔ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں سیاستدانوں کے بیانات وغیرہ بھی کسی خاص توجہ سے نہیں پڑھتا تھا۔ میرا ان لوگوں پر سے اعتبار اٹھ چکا تھا لیکن اس نوجوان کو میں نے اس لئے پہچان لیا تھا کہ چند پہلے کچھ دن کے لئے اخبارات اس کے تذکرے سے بھر گئے تھے۔

ایک روز منہ اندھیرے اس کی مسخ شدہ لاش شہر کی ایک ویران نواحی سڑک پر پائی گئی تھی اور اس کے بعد ملک کے کئی چھوٹے بڑے شہروں میں ہنگامے شروع ہوگئے تھے' جن پر بڑی مشکل سے قابو پایا جاسکا تھا۔ وہ دولت مند والدین کا بیٹا تھا۔ ایک رات اپنے شاندار مکان میں اپنے بیڈ روم میں سونے گیا اور صبح غائب ہوگیا۔ اس کے دو دن بعد ہی سڑک پر اس کی مسخ شدہ لاش ملی۔

اس کا نام شاہد شوکت تھا۔ وہ ایک ابھرتا ہوا نوجوان سیاستدان تھا۔ تعلیمی اداروں میں ہر سیاسی جماعت کی ذیلی تنظیم موجود ہوتی ہے۔ کالج کے زمانے میں شاہد شوکت بھی ایسی ہی تنظیم کا سرگرم لیڈر تھا۔ بعد میں اس کے اپنے سیاسی بزرگوں سے کچھ اختلافات ہوگئے اور اس نے اپنی ایک الگ سیاسی پارٹی بنالی۔

یہ کئی سال پہلے کی بات تھی۔ تب سے وہ تندہی سے اپنے کام میں لگا ہوا تھا اور اس نے اپنی نوخیز سیاسی پارٹی کو کافی منظم اور مضبوط بنالیا تھا۔ نوجوان تیزی سے اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ اس کی شخصیت میں وہ کشش اور تمام خوبیاں موجود تھیں جو ہمارے ہاں عموماً کسی کو کامیاب سیاستداں بناتی ہیں۔ لیکن وہ نہ تو اپوزیشن میں شمار ہوتا تھا اور نہ ہی صحیح معنوں میں اسے حکومت کا حامی کہا جاسکتا تھا۔ شاید وہ اپنی کوئی الگ ہی لائن بنا رہا تھا۔

اس طرح بظاہر ناوابستگی کی سیاست کرنے والے کا ہماری سیاست میں کیا مستقبل تھا' اس کا تو مجھے اندازہ نہیں تھا۔ تاہم ایک امکان یہ نظر آتا تھا کہ شاید پہلے وہ اپنا وزن بنا رہا تھا تاکہ پھر جس پلڑے میں بھی گرے وہاں اس کی نمایاں حیثیت اور اہمیت ہو۔ شاید وہ مرحلہ زیادہ دور نہیں تھا جب اسے قتل کردیا گیا۔

اس کا قتل ایک معمہ بن کر رہ گیا تھا۔ تاسف اور گہرے رنج کا اظہار سبھی نے کیا تھا۔ کوئی اس کے قتل کا الزام کسی پر رکھ رہا تھا اور کوئی کسی پر۔ کسی کا خیال تھا کہ اسے حکومتی پارٹی نے قتل کرایا تھا کیونکہ مستقبل میں وہ سیاسی میدان میں اس کے لئے بڑا خطرہ بننے والا تھا جبکہ وزیروں کے بیانات آئے تھے کہ مقتول کا تو ذہنی جھکاؤ حکومتی پارٹی ہی کی طرف تھا لیکن وہ اس کے اظہار کے لئے مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔

بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر اسے حکومتی پارٹی نے قتل نہیں کرایا تھا تب بھی ذمے داری اسی پر آتی تھی۔ یہ اس حکومت کی نااہلی تھی کہ ایک ایسے ابھرتے ہوئے باصلاحیت نوجوان کو اس پُراسرار اور بہیمانہ انداز میں قتل کردیا گیا تھا۔ بعض لوگوں کا شک اس پارٹی پر جارہا تھا جس سے وہ ماضی میں علیحدہ ہوا تھا۔ حکومتی حلقوں کا رویہ سخت معذرت خواہانہ تھا۔ شاید شوکت کے قتل کی تحقیقات کے لئے ایک خصوصی ٹریبونل بھی تشکیل دیا گیا تھا۔ چند گرفتاریاں بھی عمل میں آئی تھیں لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلا تھا۔

پھر وہی ہوا تھا جو ہمارے ہاں اکثر ہوتا ہے۔ بڑے بڑے واقعات پر رفتہ رفتہ وقت کی دُھول جم جاتی ہے۔ اس پر بھی جم گئی۔ لوگ اسے بھی جلد ہی بھول گئے۔ ہنگامے ٹھنڈے ہوگئے۔ زندگی اسی طرح رواں دواں رہی۔ گلشن کا کاروبار چلتا رہا۔ ہمارے ہاں اکثر کہا جاتا ہے کہ فلاں کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پُر نہیں ہوسکے گا۔ معلوم نہیں خلا واقعی پیدا بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اور اگر پیدا ہوتا ہے تو وہ یقیناً کسی نہ کسی طرح پُر ہو جاتا ہے جبھی تو رفتہ رفتہ سب کچھ معمول پر آجاتا ہے۔ دنیا شاید ایک سمندر ہے۔ جب اس میں ہلچل مچتی ہے تو لگتا ہے سب کچھ اس میں بہہ جائے گا لیکن رفتہ رفتہ یہ مغربت پُرسکون ہوجاتا ہے۔ سہمے ہوئے سفینے کونے کھدروں سے نکل کر اپنی منزلوں کی طرف رواں ہوجاتے ہیں۔

چند ماہ میں ہی لوگ اس واقعے کو تقریباً بھول گئے تھے لیکن اب یہ کیسٹ مجھے بھجوادی گئی تھی۔ وہ بھی اے نن کے ہاتھ' جو پہلے ہی میرے لئے ایک معما بنا ہوا تھا۔ میرے لئے پریشان کن سوال یہ تھا کہ یہ کیسٹ مجھے کیوں بھیجی گئی تھی؟ میرا تو سیاست سے

کوئی تعلق نہیں تھا۔ شاہد شوکت سے میری دور کی بھی شناسائی نہیں تھی۔ مجھے اس کی سیاست' اس کے نظریات سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے نہ تو اس سے کوئی ہمدردی رہی تھی اور نہ ہی پرخاش۔ البتہ یہ کیسٹ دیکھنے کے بعد مجھے انسانی بنیادوں پر اس سے ضرور ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی کیا گیا وہ کسی بھی اعتبار سے قابلِ معافی نہیں تھا۔ خواہ اس کا جواز کچھ بھی رہا ہو۔ اسے سیدھے سادے انداز میں گولی مار دی گئی ہوتی تو شاید یہ میری نظر میں ایسا غیر معمولی واقعہ نہ ہوتا۔ ہر درجے کے انسانوں کی جانیں اس دنیا میں آئے دن کسی نہ کسی رقابت کی بھینٹ چڑھتی ہی رہتی ہیں۔

میں نے اس سلسلے میں جتنا بھی سوچا' الجھن بڑھتی ہی گئی۔ تھکا ہوا ذہن مزید تھکتا چلا گیا۔ آخر کار میں نے سوالوں کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور سونے کے لئے بیڈ روم میں چلا گیا۔ ریڈ ڈاٹ کی طرف سے اس قسم کی کوئی حرکت ہوتی تھی تو عموماً اس کے فوراً بعد میرا ردِ عمل جاننے کے لئے ایڈم عرف ایڈی کا فون آجاتا تھا اور وہ مجھے کریدنے کے لئے مکالمے بازی شروع کر دیتا تھا۔ لیکن آج اس کا بھی فون نہیں آیا۔

عین اس وقت جب نیند کی دیوی نے میری طرف ایک آدھ قدم ہی بڑھایا تھا' فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ایڈم عرف ایڈی کی عمر شاید بہت لمبی تھی۔ شیطان کی عمر لمبی ہی ہوتی ہے۔ اور ایڈم کسی شیطان سے کم نہیں تھا۔ مگر میں نے ریسیور اٹھایا تو رگ و پے میں ایک اور ہی طرح کی سنسنی پھیل گئی۔ دوسری طرف راحیلہ تھی۔

"میں بہت دیر سے سوچ رہی تھی ـــ" اس کے لہجے میں شرمیلا پن بھی تھا اور ہچکچاہٹ بھی "کہ اب تم لاہور پہنچ گئے ہوگے ـــ اب تم نے شاور لیا ہوگا ـــ اب کھانا کھایا ہوگا ـــ اب سونے کے لئے لیٹ گئے ہوگے۔ ہر لمحے دل چاہتا رہا کہ تمہیں فون کروں لیکن ایک عجیب سی ہچکچاہٹ مانع رہی کہ کہیں تم جاتے ہی سو نہ گئے ہو۔ تم تھکے ہوئے ہوگے۔ کہیں میں تمہارے لئے مزید بے آرامی کا سبب نہ بنوں۔"

"اوہو ـــ مجھے تو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ تم اتنی باتکلف قسم کی چیز بن گئی ہو" میں نے خوش دلی سے چہکنے کی کوشش کی "تم تو کہا کرتی تھیں کہ محبت میں ایک دوسرے کو قبر سے بھی کھینچ کر نکال لینا چاہئے۔"

"میں تو نہ جانے کیا کچھ کہا کرتی تھی۔ بکواس کرتی تھی میں" وہ ہولے سے ہنسی "ویسے تمہاری بے آرامی کے علاوہ اپنی اوقات کا بھی خیال تھا نا۔ ایک ملازمت پیشہ لڑکی کو ڈائرکٹ ڈائلنگ پر ٹرنک کال کرتے ہوئے ذرا سوچنا پڑتا ہے نا۔ خصوصاً جب کہ یہ بھی اندیشہ ہو کہ لائن ملنے کے بعد فون بند کرنے کو دل نہیں چاہے گا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی خیال آجاتا ہے کہ جب بل آئے گا تو آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگیں گے۔"

"چہ ـــ چہ ـــ" میں نے مصنوعی تاسف کا اظہار کیا "کیا محبت اور مہنگائی کی جنگ میں ہمیشہ مہنگائی جیت جاتی ہے۔ اسی لئے میں نے تمہیں پارٹنر شپ میں اپنی ایجنسی کھولنے کا مشورہ دیا۔ حالات کچھ تو بہتر ہو جائیں گے۔ محبت میں انسان کو دن میں کم از کم دو چار ٹرنک کالز افورڈ کرنے کے قابل تو ہونا چاہئے۔"

"اور جو دو چار ٹرنک کالز افورڈ نہ کر سکے اسے محبت کرنے کا حق نہیں؟"

"حق تو اسے بھی حاصل ہے لیکن اسے چاہئے کہ لوگوں کی نظروں سے بار بار ٹیلیفون کی طرف نہ دیکھے بلکہ صرف ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنے پر اکتفا کرے۔ غم ناک قسم کے افسانے پڑھے۔ دردناک قسم کے اشعار جمع کرے۔ سلائی کڑھائی کرے۔ تکیے پر بڑے بڑے پھول کاڑھے جن کے درمیان "تو کم" لکھا ہو" میں نے مشورہ دیا۔

"اچھا اب زیادہ مت چہکو اور سو جاؤ۔ تمہاری آواز میں بول رہی ہے۔ میں نے خواہ مخواہ ہی تمہیں ڈسٹرب کیا" وہ بولی۔

"اگر دن میں دو تین مرتبہ اسی طرح باقاعدگی سے ڈسٹرب کیا کرو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی" میں نے درخواست کی۔

"گھر کا سارا ساز و سامان بک جائے گا فون کا بل ادا کرنے میں۔"

"کوئی بات نہیں۔ اس کے بعد میرے ہوٹل کے کسی دری پی سوئٹ میں منتقل ہو جانا۔ وہاں ہر چیز نئی بنائی اور مفت ملے گی۔ ٹیلیفون بھی خواہ دن بھر کرتی رہنا۔"

"جی نہیں۔ اپنے پاس ہی رکھو اپنا ہوٹل۔ ہم اپنے گھر کے فلیٹ میں ہی اچھے ہیں" وہ فوراً ہی بولی "اچھا خدا حافظ۔"

"ارے سنو تو سہی ـــ" میں نے تیزی سے کہا "تھوڑی دیر اور باتیں کرو۔ میرا دل بہت اداس ہے۔"

"اسی لئے اتنا چہک رہے ہو؟"

"بعض لوگ اداسی کو دبانے کے لئے بہت زیادہ بولتے ہیں۔ بعض لوگ بہت زیادہ بولنے کی وجہ سے اداس ہو جاتے ہیں" میں نے کہا۔

"یعنی یہ بات طے ہے کہ بیشتر لوگ بہت زیادہ ہی بولتے ہیں۔ کسی بھی بہانے۔"

"ہاں۔ اور میرا مشورہ ہے کہ تم بھی زیادہ بولا کرو۔ کم از کم میرے ساتھ۔"

"جی نہیں۔ میرے پاس کھوپڑی فالتو نہیں ہے۔ میں فون کر رہی ہوں۔ تم بھی واقعی اب سو جاؤ۔"

"بولنے کے لئے کھوپڑی کی ضرورت کہاں پڑتی ہے؟ بس زبان ہلاتے رہنا چاہئے۔" میں نے مشورہ دیا۔

"ہر ایک کو اپنے طور طریقے مت بتایا کرو" وہ ترش سی لہجے کے ساتھ بولی۔ "اچھا خدا حافظ۔ اگر تمہیں توفیق ہو تو کبھی کبھار

فون کر لیا کرو" اس نے میری مزید کوئی بات سنے بغیر فون بند کر دیا۔ میں نے فوراً ہی اس کا نمبر ڈائل کرنے کا ارادہ کیا مگر پھر ملتوی کر دیا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔

میرے دل میں واقعی اداسی اور خوشی کی گنگا جمنا گلے مل رہی تھی۔ خوشی راحیلہ کے مل جانے کی تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر وہ یوں اچانک دوبارہ سامنے آجائے گی اور اس بار اس کے دل کی کائنات ہی بدلی ہوئی ملے گی۔ کئی بار میرے دل کے کسی اندھیرے گوشے سے شک کے سپولیے نے سر ابھارا کہ کہیں اس بار بھی وہ کسی نئے زاویے سے آزمائش تو نہیں کر رہی؟ جذبات سے کھیلنے کا کوئی نیا ہنر تو نہیں آزما رہی؟ لیکن دل سے ہی اس کا جواب نفی میں ملا۔ شاید حقیقت یہی ہو۔ یا پھر محبت بے چاری ہمیشہ ہی خوش گمان رہتی ہے۔

اداسی میرے دل میں کیسٹ دیکھنے کی وجہ سے جاگزیں تھی۔ اس کے بارے میں الجھن ذہن میں اٹک گئی تھی۔ کیا میں اسے نام کے بھروکروں اور بتادوں کہ وہ کس شخص کے ہاتھ میرے گھر پہنچی تھی؟ اس ٹیپ کا بھی کچھ پتا نہیں تھا جو اس سلسلے میں تیار کیا گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ ابھی تک قائم تھا یا ختم کر دیا گیا تھا۔ یا میں اس کے بارے میں معلومات کروں؟

لیکن محض کیسٹ کسی کے حوالے کرنے کا کیا فائدہ تھا؟ اپنی ایجنسیوں کی کارکردگی کا مجھے اچھی طرح اندازہ تھا۔ یہ ایک حساس معاملہ تھا۔ کیسٹ کی بات منظرِ عام پر آجاتی تو ان پر نئے سرے سے الزام پڑ سکتا تھا اور ان سے اگر کچھ نہ ہو پاتا تو ان کے شکوک و شبہات کے سائے میری طرف بھی پھیل سکتے تھے۔ میری اس بات پر بھلا کون یقین کرتا کہ مجھے خود اندازہ نہیں تھا وہ کیسٹ مجھے کیوں بھیجی گئی تھی؟ ہو سکتا تھا کوئی ایجنسی کوئی نہ کوئی تعلق' کوئی نہ کوئی رابطہ دریافت کرنے کی تگ و دو میں لگ جاتی۔ ایسے معاملات میں تو بعض اوقات اونچے پیمانے کی شناسائی اور اثر و رسوخ بھی دھرا رہ جاتا ہے۔ جن میں عوامی سطح پر کوئی ابال اٹھ جانے کا اندیشہ ہو۔ پریس بھی کبھی کبھی ایسے معاملات کو سلجھانے کے بجائے الجھنوں میں الجھا دیتا ہے۔

آخر کار میں نے خاموش رہنے اور انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد مجھے قرار سا آگیا اور میں اطمینان سے سو گیا۔

دوسرے روز میں دفتر میں شام ڈھلے تک مصروف رہا۔ جب گھر جانے کا ارادہ کر رہا تھا تب ستارہ کا فون آگیا۔ میری آواز سننے کے بعد نہایت سنجیدگی سے بولی "وہ جو ایک بہت بڑے سیٹھ صاحب تھے نا ـــ محمد افضل چوہدری صاحب ـــ مجھے ان سے بات کرنا ہے۔ آج کل وہ بہت مصروف ہیں۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ اگر آپ چند منٹ کے لئے ان سے بات کرا دیں تو آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا۔ یہ بندی زندگی بھر آپ کی کنیز رہے گی۔ کیا آپ اس گناہ گار پر یہ احسان فرما سکتے ہیں؟"

کمبخت واقعی اچھی اداکارہ ہو گئی تھی۔ لہجے کو برتنے کا بڑا سلیقہ آگیا تھا۔ ایسا زبردست طنز سو لیا تھا لہجے میں کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید شرم سے پانی پانی ہو جاتا۔

میں نے آواز بدل کر کہا "اے گناہ گار فریادی! تم نے اب ٹیلیفون پر زنجیر ہلا ہی دی ہے تو ہم تمہاری فریاد ضرور ظلِ الٰہی تک پہنچا دیں گے۔ تمہیں ازراہِ نوازش بہت جلد ملاقات کا موقع عطا کیا جائے گا۔ ایسا کرو کہ ڈیڑھ سو سال بعد آجاؤ۔"

"کہاں؟ ظلِ الٰہی کے مزار پر؟" اس نے سکون سے پوچھا۔

"کیا بکتی ہو گناہ گار فریادی!" میں نے بدستور بارُعب لہجے میں کہا "ظلِ الٰہی ہزاروں سال سے زندہ ہیں۔ اور ہر دور میں زندہ رہیں گے۔ آزما کر دیکھ لینا۔"

"دُر فٹے منہ" یکدم وہ اپنے اصل لہجے میں بولی "اب اپنی اصلی آواز میں بھی بول لو۔ کان ترس گئے ہیں سننے کو۔ تم تو واقعی بہت بڑے آدمی ہوتے جا رہے ہو۔ فلم کے سپر اسٹارز سے بھی بڑھتی جا رہی ہے تمہاری مصروفیت۔ ہم وہاں تمہاری خاطر تمہارے ہوٹل کے افتتاح میں گئے اور تم اس طرح ملے جیسے سرِ راہ کسی ڈاکٹر کو اپنا مریض مل گیا ہو۔ اور مریض بھی ایسا جس نے پچھلی چھ ملاقاتوں کی فیس ادا نہ کی ہو۔ اور پہلی رات تو تم سلام دعا کے بعد ہی غائب ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا تھا اس کے بارے میں تو تم سے لاہور چل کر ہی پوچھوں گی۔ کہاں غائب ہو گئے تھے؟ کس سے ملنے چلے گئے تھے؟"

"ہم جیسے بے چارے کس سے ملنے جا سکتے ہیں؟ کسی انکم ٹیکس والے سے' کسی ایکسائز والے سے' کسی وکیل سے' کسی بور قسم کے سیٹھ سے۔ اور بھلا ہمیں کون بلا سکتا ہے؟" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہم کوئی فلمی ہیرو تھوڑا ہی ہیں کہ ایک گرل فرینڈ کو ہوٹل کی لابی میں کھڑی چھوڑ کر دوسری سے ملنے سوئمنگ پول پر چلے جائیں۔ تیسری گھر پر انتظار کر رہی ہو اور چوتھی مری یا ایبٹ آباد میں راہ دیکھ رہی ہو۔"

"بس ـــ بس' رہنے دو۔ مجھے اندازہ ہوتا جا رہا ہے کہ تم فلمی ہیرو سے زیادہ بدمعاش ہو اور تمہاری زیادہ مقامات پر راہ دیکھی جاتی ہے۔ کم از کم میرے سامنے تو بھولے اور معصوم بننے کی کوشش مت کیا کرو" وہ خاصی سنجیدگی سے بولی۔

"اچھا ـــ میں تمہارے سارے گلے شکوے دور کرنے کے لئے فوری طور پر تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔ کچھ دیر بیٹھ کر اداس اداس سی باتیں کریں گے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اکٹھے بیٹھ کر اداسی کی باتیں کرنے سے اداسی کم ہو جاتی ہے" میں نے کہا۔

"میں کیا صرف اداسیاں شیئر کرنے کے لئے رہ گئی ہوں؟" وہ گویا برا مناتے ہوئے بولی "میرا مصرف کیا بس یہی رہ گیا ہے کہ

جب دنیا بھر کے مسائل نے ذہن کو بوجھل اور دل کو اداس کیا تو میرے کندھے پر سر رکھ کر اداسیوں کی لوڈ شیڈنگ کرنے آگئے؟ مجھے نہیں چاہئے ایسی دوستی اور ایسی ملاقاتیں۔ اپنے پاس ہی رکھو اپنی اداسیاں۔"

"کس قدر سنگدل ہو گئی ہو تم۔" میں نے آہ بھر کر کہا "لگتا ہے فلک کج رفتار سخت نامہربان ہوتا جارہا ہے جو تم جیسے دوست بھی آنکھیں پھیرتے جارہے ہیں۔"

فلک کج رفتار کا تو مجھے پتا نہیں۔ مجھے اس سے تبادلۂ خیال کا موقع نہیں ملا لیکن میں ضرور تم سے آنکھیں' ناک' منہ' سب کچھ پھیرلوں گی" وہ بولی۔

"اس سے پہلے ملزم کو صفائی پیش کرنے کا موقع ملنا چاہئے۔ یہ میری پُر زور اپیل ہے۔ اس وقت تم کہاں سے بول رہی ہو اور کیا کر رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس وقت تو اسٹوڈیو سے بول رہی ہوں۔ اپنے ڈریسنگ روم سے۔ لائٹ چلی گئی ہے۔ شوٹنگ رُکی ہوئی ہے۔ میں اس وقت فقیرنی کے گیٹ اپ میں ہوں۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں بیٹھی ہوں۔ کپڑے کچھ زیادہ ہی پھٹے ہوئے ہیں کیوں کہ ان میں میرا ایک ڈانس پکچرائز ہونا ہے۔"

"فقیرنی ڈانس کرے گی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ بڑا ٹھیک ٹھاک قسم کا ڈانس کرے گی۔ تمہیں شاید معلوم ہی ہو کہ ہماری اور پڑوسی ملک کی اکثر فلموں میں یہ سچویشن ضرور ہوتی ہے کہ ولن' ہیرو کو کسی مقام پر قید کرلیتا ہے۔ تب ہیروئن بھیس بدل کر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جاتی ہے۔ ولن کے اڈے پر وہ سب مل کر ڈانس کرتے ہیں۔ گانے کی صورت میں وہ بار بار ولن اور اس کے ساتھیوں کو بتاتے رہتے ہیں کہ وہ کون ہیں اور کس طرح اس کی ایسی تیسی کرنے آئے ہیں مگر ولن باچھیں پھیلا پھیلا کر جھومتا رہتا ہے۔ اسے اس وقت تک کچھ پتا نہیں چلتا جب تک ہیروئن اور اس کے ساتھی ہیرو کو رہا کرا کے نہیں لے جاتے۔ اس کے بعد ولن منہ سے جھاگ اڑاتا ہے اور ان کے تعاقب میں جاتا ہے۔" ستارہ نے قدرے تفصیل سے بتایا۔

"اوہ مائی گاڈ!" میں نے سہمے سہمے سے لہجے میں کہا "کیا یہ ہماری کسی فلم کی سچویشن ہے؟"

"نہیں' نہیں۔ تمہیں اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارے ادارے کی کسی فلم کی سچویشن نہیں ہے" وہ ہنس کر بولی۔ اس کا موڈ خوشگوار ہو چکا تھا "آفاق کم از کم اب اس قسم کی فلموں کے دور سے نکل آیا ہے۔"

"ویسے مجھے اتنا فکر مند ہونے کی بھی ضرورت نہیں" میں نے اطمینان سے سانس لیتے ہوئے کہا "میرا کون سا ان فلموں پر کسی بھی حیثیت سے نام آئے گا۔ میں تو ہمیشہ پس پردہ ہی رہوں گا۔"

"ہاں..... پس پردہ گلوکار تو ہوتے تھے ہمارے ہاں۔ اب تم جیسے پس پردہ فنکار بھی آنے لگے" وہ مجھے چڑانے کی فکر میں تھی۔

"آج جو دل چاہے کہہ لو۔ آج تمہیں آزادی ہے" میں نے کہا پھر ایک لمحے کے توقف سے کہا "ہاں..... تو کب فارغ ہو رہی ہو؟ گھر کب پہنچ رہی ہو؟"

"آج صبح اٹھ کر پتا نہیں کس کا منہ دیکھا تھا۔ آج ہر شوٹنگ میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوئے جارہی ہے۔ دیر پر دیر ہوئے جارہی ہے۔ حالاں کہ میں رات کی شوٹنگ بالکل نہیں کرتی۔ اس کے باوجود آج کم از کم دس بجے گھر پہنچوں گی" وہ بولی۔

"میں تمہیں تازہ دم ہونے کے لئے صرف آدھا گھنٹا دوں گا۔ ساڑھے دس بجے میں آن دھمکوں گا" میں نے ڈرانے کے انداز میں کہا۔

"دن تو اچھا نہیں گزرا۔ اب تم چاہتے ہو رات بھی اچھی گزرے" اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

"یہ تو میرے آنے پر ہی پتا چلے گا" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے دس بجے تک دوسرے چند کام نمٹائے اور ساڑھے دس بجے ستارہ کے ہاں جا پہنچا۔ میں نے یہ تصدیق کرنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ گھر پہنچ چکی ہے یا نہیں۔ حالاں کہ یہ معلوم تھا کہ شوٹنگوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ یہ تو ستارہ کا حوصلہ تھا کہ کام نمٹانے کے لئے رات کی شوٹنگیں نہیں کرتی تھی۔ صاف انکار کر دیتی تھی۔ گو کہ اس وجہ سے اسے فلمیں چھوڑنا پڑتی تھیں مگر وہ اپنا رات کا آرام اور تفریحات تفریحات نہیں چھوڑتی تھی۔ اس کا کہنا تھا' اگر میں نے راتوں بھی کام کر کے مزید کچھ دولت کما بھی لی تو وہ بڑھاپے میں مجھے جوانی کی راتیں اور ان راتوں کی کھوئی ہوئی نیند واپس نہیں دلا گی۔

میں اس کے ہاں پہنچا تو وہ ایک خوبصورت گاؤن اور ہلکی چپلیں پہنے' نم آلود بال کندھوں پر بکھرائے لان میں بیٹھی تھی۔ بالکل تازہ دم نظر آرہی تھی۔ چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ صبح کے اخبار اب رات کو بیٹھی دیکھ رہی تھی۔

وہ بالکل اسی طرح ملی جس طرح برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست ملتے ہیں۔ اس عورت میں یہ بڑی خوبی تھی۔ کم از کم میرے لئے اس کا غصہ مصنوعی ہوتا تھا۔ فون پر خواہ کچھ بھی کہہ لیتی پیغام خواہ کیسے بھی بھجوا دیتی تھی لیکن جونہی میں اس کے سامنے پہنچتا تھا وہ جیسے سب کچھ بھول جاتی تھی۔ اس کی دوستی میں گرمجوشی تھی وہ مجھے آج تک کہیں نصیب نہیں ہوئی تھی۔

عجیب بات یہ تھی کہ اپنے ماضی کے برعکس وہ اب چنگی غرض نظر آتی تھی اتنا بے غرض بھی میں نے کسی کو نہیں پایا اس کی دنیا کا ہر دروازہ ہر وقت میرے لئے کھلا تھا اور وہ مجھ کسی صلے کی طلب گار نہیں تھی۔ اس نے کبھی مجھ سے کچھ

نہ کبھی موہوم سے انداز میں بھی اس خیال کا اظہار نہیں کیا وہ مجھ سے شادی کی امید رکھتی ہے۔ کبھی اس نے یہ جاننا چاہا تھا کہ وہ جو اپنے آپ کو میرے لئے بندۂ بے دام بنائے ہے تو میرے ساتھ اس کا مستقبل کیا ہے۔

وہ تو جیسے اس طرح کی سوچوں میں الجھنا قطعی غیر ضروری سمجھتی تھی۔ اندھی رفاقت پر یقین رکھتی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا وہ مجھے کسی بندھن میں باندھے بغیر میری زندگی کا اہم حصہ بن گئی تھی۔ شاید میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کہیں یہی تو اس کی حکمت عملی نہیں تھی؟ جو عورت خود کو کسی مرد کی ذات میں گم کر دیتی ہے اور اس کے عوض کچھ بھی نہ چاہتی وہ گویا مرد کو خرید لیتی ہے۔

اب راحیلہ کے مل جانے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ کیا ستارہ میرا بے عنوان تعلق جاری رہ سکے گا؟ کیا مجھے اس کو جاری رکھنا چاہئے؟ ان دونوں ہی سوالوں کے جواب میں میرے دل میں سناٹا چھا گیا۔ ایک بات بہرحال طے تھی کہ اس سے ترکِ تعلق میرے لئے بہت بڑی آزمائش بن سکتا تھا۔ جو بات ستارہ میں تھی وہ راحیلہ میں نہیں تھی اور جو بات راحیلہ میں تھی وہ ستارہ میں نہیں تھی۔

میں نے اس وقت تک کھانا نہیں کھایا تھا اس لئے کھڑے کھڑے ہی کہا "چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔ آج چائنیز کھانا کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"ذرا سکون کی سانس تو لو۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے" وہ ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "ویسے میں نے گھر پر بھی اچھا کھانا پکوایا ہے۔ مجھے ایک بہت اچھا کک مل گیا ہے۔ انگلش' پاکستانی' کانٹی نینٹل اور چائنیز سب طرح کے کھانے اچھے پکا لیتا ہے۔ گرینڈ آفیسر سے زیادہ تنخواہ پر رکھا ہے۔ آج اس کی کارکردگی آزما کر دیکھو۔"

"آج گھر پر کھانے کا موڈ نہیں ہے۔ نہ اپنے گھر' نہ تمہارے یہ یہاں سے کچھ ہی دور کافی معیاری قسم کا ایک نیا چائنیز ریسٹورنٹ کھلا ہے۔ بڑا خوبصورت رومینٹک ماحول ہوتا ہے۔ میزوں پر دھیمی روشنی کی چینی لالٹینیں روشن ہوتی ہیں۔ اور چوں کہ نیا کھلا ہے اس لئے وہاں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں ہے۔ مجھے بھی ایک چینی وفد باقاعدہ فرمائش کر کے وہاں لے گیا تھا۔ ہم اس ملک میں' اس علاقے میں رہتے ہیں اور ہمیں یہاں کے والے اس ریسٹورنٹ کا علم نہیں تھا۔ چین سے آئے ہوئے لوگوں کو علم تھا۔ آؤ چلیں" میں نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"خدا کے لئے انی! کچھ تو خیال کرو" وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی "میں کیا اسی طرح با تھنگ گاؤن میں ریسٹورنٹ چل دوں گی؟ اخباروں میں خبریں آجائیں گی۔ معروف فلمی اداکارہ ستارہ تھنگ گاؤن میں شہر کی ایک ممتاز کاروباری شخصیت کے ساتھ ریستوران پہنچ گئیں۔ خبریں کہیں نہ کہیں یہ بھی دیا جائے گا کہ موصوفہ غالباً نشے میں تھیں۔"

میں نے ایک کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ایک تو تم جیسی عورتیں بھی اسکینڈلوں سے یوں ڈرتی رہتی ہیں جیسے کسی باپردہ' پرہیزگار خاتون کو کسی نیک اور متقی شخص سے اپنی منگنی ٹوٹ جانے کا خطرہ ہو۔"

"اچھا..... تو تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو جن کی نظر میں فلمی عورتوں کی گویا کوئی عزت ہی نہیں ہوتی" وہ ایک دم تن کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ شاید وہ آستینیں چڑھانے کا ارادہ بھی رکھتی تھی۔

میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "جاؤ بابا! تم تیار ہو کر آؤ۔ میری نظر میں تمہاری جتنی عزت ہے اتنی خود اپنی بھی نہیں ہے۔"

اس کی مسکراہٹ واپس آگئی اور وہ اندر جانے کے لئے مڑ گئی۔ تب میں نے بہ آواز بلند کہا "لیکن میرے چائے ختم کرنے تک تیار ہو کر آجانا۔ یہ سمجھ کر مت تیار ہونا کہ تم شوٹنگ پر جارہی ہو۔"

وہ حیرت انگیز طور پر پانچ منٹ میں تیار ہو کر آگئی۔ موسم خاصا سرد تھا لیکن اس نے نہایت ہلکا پھلکا لباس پہنا تھا البتہ ایک کشمیری شال کندھوں پر ڈال لی تھی۔ ان چند منٹوں میں اس نے برائے نام میک اپ بھی کر لیا تھا اور اس معمولی میک اپ میں وہ فلمی میک اپ سے زیادہ پُرکشش لگ رہی تھی۔

چند منٹ بعد ہم ریستوران جا پہنچے۔ کونے میں مجھے اپنی پسندیدہ میز بھی خالی مل گئی جس کے پاس کینوس کا ایک خوبصورت پارٹیشن بھی کھڑا تھا۔ اس پر رنگا رنگ چینی تصویریں بنی ہوئی تھیں جن کے عقب میں مدھم روشنیاں جھلملاتی تھیں تو وہ بہت بھلی لگتی تھیں۔

ہال میں روشنی بہت کم تھی اس کے باوجود ہمارے داخل ہوتے ہی کئی گردنیں یکے بعد دیگرے ہماری طرف گھوم گئیں۔ ظاہر ہے مجھے کم اور ستارہ کو زیادہ دیکھا جارہا تھا۔ فلم اسٹار ستارہ کو پہچان لیا گیا تھا۔ ہمیں اس کونے میں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ آٹوگراف لینے کے کئی شوقین جمع ہو گئے۔ ان میں زیادہ تر ٹین ایجرز اور بچے ہی تھے۔ جن کے پاس اس وقت آٹوگراف بک نہیں تھیں وہ کوئی نوٹ' اپنے ابا جان کا وزیٹنگ کارڈ' نشو پیپر یا کوئی اور کاغذ بھی پھاڑ کر لئے چلے آرہے تھے۔

سولہ سترہ سال کی ایک گول مٹول سی لڑکی نے ستارہ سے آٹوگراف لینے کے بعد میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "آپ بھی شاید فلمی ہیرو ہیں لیکن ابھی آپ کی کوئی فلم ریلیز نہیں ہوئی؟"

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے مشفقانہ لہجے میں کہا "نہیں چندا! میں فلموں میں کام نہیں کرتا۔ میری کوئی فلم کبھی ریلیز نہیں ہوگی۔"

بچی انگریزی میں بولی "ڈونٹ بی سو شیور۔ یو ہیو اے ہینڈسم فیس۔۔۔ اینڈ آفٹر آل یو آر اے فرینڈ آف میڈم ستارہ۔"

بچی ذہین ہی نہیں' بالغ نظر بھی معلوم ہوتی تھی۔ شاید ہر دور کے بچے' بڑوں سے زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ میں اکثر سنتا آیا تھا کہ آج کل کے بچے بڑے تیز ہو گئے ہیں۔ میں نے بچی کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے انگریزی میں ہی جواب دیا "میں اس لئے پُر یقین ہوں کہ مجھے فلموں میں کام کرنے کا بالکل بھی شوق نہیں ہے۔"

اس کی ذہین آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں تھی لیکن بہرحال امریکیوں کے سے انداز میں کندھے اچکا کر واپس چلی گئی۔ چند منٹ بعد مجھے اپنے اس خیال میں ترمیم کرنا پڑی کہ ہر دور کے بچے' بڑوں سے زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ اس میں یہ اضافہ ضروری تھا کہ احمق بھی ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔

ہمیں ابھی سکون میسر آئے زیادہ دیر ہوئی تھی اور ہم سوپ سے لطف اندوز ہونے لگے تھے کہ بیس بائیس سال کا ایک ہونق سا نوجوان اپنی گول گول سی آنکھیں گھماتا ہوا پارٹیشن کے عقب سے نمودار ہوا جیسے کوئی ریڈ انڈین درختوں میں چھپا انتظار کر رہا تھا کہ اس کا شکار ذرا تنہا ہو تو وہ اس پر حملہ کرے۔ شاید وہ ہمارے گرد بھیڑ چھٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ خاصا خوش شکل تھا لیکن چہرے پر حماقت برس رہی تھی۔ کپڑے ریڈی میڈ اور اچھی کمپنی کے تھے لیکن اس کے اصل سائز سے کم از کم ڈیڑھ گنا بڑے تھے اور شاید ایک آدھ ہفتے سے مسلسل اس کے تھکن جسم پر جھول رہے تھے۔ ناک پر موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ اس کا پنجو کسی اندرونی ہیجان سے تھرتھرا رہا تھا اور وہ بار بار تھوک نگل رہا تھا جس کی وجہ سے اس کی مرغے جیسی گردن میں نرخرے کی ہڈی مسلسل اوپر نیچے حرکت کرتی دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے ایک نوٹ بک اور پین ستارہ کے سامنے رکھ دیا اور چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے کی سی آواز میں یکدم ہی بولا۔ "آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔۔۔ میں راتوں کو آپ کو خوابوں میں دیکھتا ہوں۔۔۔ آپ میری بہن بن جائیں۔۔۔"

ہم دونوں اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ مجھے ہنسی بھی آتے آتے رہ گئی اور ایک خفیف سے ترحم کا بھی احساس ہوا۔ میں نے ملائمت سے کہا "برادر عزیز! دونوں میں سے ایک چیز چھوڑ دو۔ یا تو انہیں راتوں کو خواب میں دیکھنا چھوڑ دو یا بہن بنانے کا خیال چھوڑ دو۔"

معلوم نہیں اس کی سمجھ میں میری بات آئی یا نہیں لیکن وہ مُڑ کر نہایت سعادت مندی سے سہلاتے ہوئے بولا "جی بہت اچھا۔ میں اپنی سی کوشش کروں گا۔"

پہلے تو میں سمجھا شاید وہ میرے مشورے کے جواب میں منہ سا طنز کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن پھر اس کے چہرے پر برستی ہوئی حماقت دیکھ کر مجھے اپنا خیال مسترد کرنا پڑا۔ وہ طنز کرنا تو درکنار شاید طنز کو سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم تھا۔

ستارہ نے شاید جان چھڑانے کے لئے جلدی سے اس کی نوٹ بک میں آٹوگراف دے دیئے لیکن وہ محض آٹوگراف پر مطمئن نہ ہوا۔ تقریباً گڑگڑاتے ہوئے بولا "کوئی شعر بھی لکھ دیجئے۔"

ستارہ زیر لب کچھ بڑبڑائی تاہم اس نے یہ شعر لکھ دیا۔

ان کے پیچھے نہ چلو ان کی تمنا نہ کرو
سائے پھر سائے ہیں کچھ دیر میں ڈھل جائیں گے

شعر پڑھ کر نوجوان تڑپ اور پھڑک اٹھا۔ ہم چاہ رہے تھے وہ جلدی واپس چلا جائے لیکن وہ ابھی ہماری جان چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اسے تڑپنے اور پھڑکنے سے فرصت ملی تو میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ناک پر عینک درست کرتے ہوئے وہ ایک دم اچھل پڑا "ارے۔۔۔ میں نے تو اب آپ کو پہچانا۔ آپ تو افضل چوہدری صاحب ہیں۔ آپ تو بہت بڑے تاجر اور صنعتکار ہیں۔۔۔ میری خوش قسمتی ہے کہ یہاں ایک ہی جگہ پر دو اتنی بڑی بڑی شخصیتوں سے ملاقات ہو گئی۔"

"مجھے کیسے جانتے ہو تم؟" میں نے اسے گھورا۔

وہ اپنے استخوانی ہاتھ ملتے ہوئے گڑبڑا کر بولا "آپ میرے۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کے بارے میں میرے ابا نے مجھے بتایا تھا۔ ہمارا بھی ایک چھوٹا موٹا کارخانہ ہے۔ پلاسٹک کے پائپ اور ربر کے چپل بنانے کا۔۔۔ کارخانے تو اصل میں چار ہیں لیکن چار جڑے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں صنعت کاروں کی ایک میٹنگ میں ڈنر تھا۔ اس میں آپ بھی آئے ہوئے تھے۔ بہت بھیڑ تھی وہاں۔ ابا نے دور سے اشارہ کر کے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ تعریفیں کر رہے تھے آپ کی۔ وہ بھی آپ سے ملنا چاہ رہے تھے۔ سوچ رہے تھے تعارف وغیرہ ہو جائے لیکن کسی نے ہمیں آپ کے نزدیک ہی نہیں آنے دیا۔"

"کیا انہیں کوئی کام تھا مجھ سے؟" میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ انہیں تو کوئی کام نہیں تھا۔ بس ویسے ہی۔۔۔" اس نے دانت نکالے "پھر قدرے شرمیلے لہجے میں بولا "لیکن مجھے آپ سے کام ہے۔ بہت ضروری مشورہ کرنا ہے۔ کیسی خوش قسمتی کی بات ہے کہ آپ سے یہاں ملاقات ہو گئی۔"

"ہاں۔ میری شامت نے دعوت دی تھی جو میں یہاں چلا آیا۔ آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ پھر ستارہ کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا "بلکہ ان جیسی خاتون کے ساتھ تو بالکل ہی کہیں باہر نہیں نکلوں گا۔"

ستارہ ہونٹ دانتوں میں دبائے مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اب میری حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ نوجوان نے گویا میری بات سنی ہی نہیں۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر ہمارے قریب ہی بیٹھ گیا۔

نوجوان کی نظر میں تھا۔ میں نے اسے کرسی کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھا تو جلدی سے اس کے پشتے پر اس طرح بازو رکھ دیا کہ اسے بیٹھنا اس کے بس کی بات نہ رہی۔ دوسری کرسی پر ستارہ نے اپنا بیگ رکھ دیا۔

نوجوان نے اس پر بھی ہمت نہیں ہاری۔ کھڑے کھڑے ہی وہ میز پر جھکا سا ہوتے ہوئے بولا "مجھے اپنے ابا کے بارے میں بات کرنا تھا۔۔۔"

"کیا وہ تمہارے ابا بن کر پچھتا رہے ہیں؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے اس نوجوان پر اب غصہ آنے لگا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پبلک مقامات پر انسان اس قسم کے چغدوں کی پٹائی بھی نہیں لگا سکتا۔ خصوصاً جب کہ وہ ایک مشہور اداکارہ کے ساتھ ہو۔ اس نے ستارہ سے میری ملاقات کا لطف غارت کر دیا تھا۔

"نہیں۔ چوہدری صاحب! یہ بات نہیں ہے" وہ خوف زدہ سی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا "بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ابا جی جب میری طرح نوجوان تھے تو ربر کی چیزیں بنانے والی ایک چھوٹی سی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ امی بتاتی ہیں کہ وہ شروع سے ہی بہت کنجوس تھے۔ پائی پائی جوڑ کر کسی طرح چھوٹا موٹا کام شروع کر کے رفتہ رفتہ کارخانے دار بن گئے لیکن خوشحالی آنے کے بعد بھی ہمیشہ ہمارے گھر میں پیسے پیسے پر لڑائی ہوتی رہی ہے۔ اب تو اللہ کے فضل سے ہمارا شمار ٹھیک ٹھاک لوگوں میں ہے لیکن اب ان کی کنجوسی پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ ہم صرف دو بھائی ہیں۔ دوسرا مجھ سے بھی چھوٹا ہے۔ ہم نے ان اسکولوں میں پڑھا ہے جن میں بچے ٹاٹ پر بیٹھتے ہیں۔ اب بھی ابا سے دس روپے مانگ لیں تو کوسنے سے پٹائی ہوتی ہے۔ بات بات پر وہ چیخنے لگتے ہیں۔ ارے کمینے کتوں دے پتر! میں نے دن رات خون پسینہ ایک کر کے اس لئے تو یہ نہیں کمایا کہ تم لٹاتے پھرو بڑے عذاب میں ہے زندگی ہماری۔۔۔" اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں باقاعدہ آنسو آ گئے۔ وہ چشمہ اتار کر آستین سے آنکھیں پونچھنے لگا۔

ایک لمحے کے لئے تو مجھے شک گزرا کہ وہ کسی قسم کا ڈراما تو نہیں کر رہا؟ کہیں وہ کسی خاص مقصد کے تحت تو ہمارے سر پر سوار نہیں ہو رہا؟ لیکن اس کی صورت دیکھتے ہوئے ایک بار پھر مجھے اپنا خیال مسترد کرنا پڑا۔ وہ کسی بھی مکاری اور منصوبہ سازی کا اہل ہی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اپنے باپ کے بارے میں جو کچھ بتا رہا تھا وہ کوئی بعید از امکان باتیں نہیں تھیں۔ ایسے کردار کہیں نہ کہیں دیکھنے میں آتے ہیں۔ حد سے زیادہ کنجوسی بھی ایک نفسیاتی بیماری ہے اور تقریباً لاعلاج ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے کنبے پر اس کے عجیب عجیب اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس لڑکے کے ذہنی طور پر کچھ پسماندہ سا نظر آنے کی وجہ بھی اس کے باپ کا وہی رویہ رہا ہو جو وہ بچپن سے دیکھتا چلا آ رہا تھا' سہتا چلا آ رہا تھا اور باپ کو شاید یہ دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی ہو کہ اس کا بیٹا کس ذہنی حالت کے ساتھ پرورش پا رہا ہے۔ میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کی لہر ابھر آئی۔ ستارہ کے چہرے سے بھی تمسخر کے آثار غائب ہو گئے۔ ساتھ ہی ہمارا سوپ پینے کا لطف بھی غارت ہو گیا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" میں نے اب طنز کی ملاوٹ کے بغیر حقیقتاً ملائمت سے پوچھا۔

"وسیم احمد" وہ ناک پونچھتے ہوئے بولا۔

"وسیم میاں! جب تمہارا باپ اتنا کنجوس ہے اور پیسوں کے لئے تمہارے گھر میں اتنی جوتم پیزار ہوتی ہے تو تم اس ریستوران میں کیسے نظر آ رہے ہو؟ یہ کوئی عام چائنیز ریستوران بھی نہیں ہے۔ یہ تو ان کی نسبت بہت مہنگا ہے۔ جب کہ تمہارا باپ تو تمہیں کسی عام چائنیز میں بھی دیکھ لے تو شاید وہیں سے جوتے مارتا ہوا لے جائے کہ تم نے پیسے ضرور چرائے ہوں گے" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کی بات بالکل صحیح ہے" وہ گویا میرے اندازے پر خوش ہوتے ہوئے بولا "ہم تو زیادہ سے زیادہ کسی تھڑے پر بیٹھ کر چائے پانی کا شوق پورا کر سکتے ہیں۔ لیکن دراصل امی ہماری مدد کرتی ہیں۔ انہیں ابا سے روپے اینٹھنے کے طریقے آتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح کچھ مال کھینچ ہی لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ ابا جو نقد رقم گھر میں چھپا کر رکھتے ہیں' امی اس میں سے بھی کسی نہ کسی طرح کچھ پار کر لیتی ہیں اور ہم دونوں بھائیوں کو دیتی رہتی ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ دوسرے خوشحال گھرانوں کے بچوں کی طرح ہمارا بھی اچھی جگہوں پر جانے' اٹھنے بیٹھنے اور اچھی چیزیں استعمال کرنے کو جی چاہتا ہے۔ انہی کی مہربانی سے ہمارے پاس اکثر تھوڑی بہت رقم موجود رہتی ہے" اس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیص کی بڑی سی جیب سے چند نوٹ نکال کر مجھے دکھائے۔ ستارہ مسکرا دی۔

پھر وہ اپنا وزن ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کرتے ہوئے بولا "امی ہی کی وجہ سے میرے پاس ایک پرانی سی فوکسی موجود ہے ورنہ ابا تو کہتے ہیں کسی کباڑی سے موٹر سائیکل کا ڈھانچا خرید لو اور بلال گنج نے پُرزے خرید کر اس میں لگا لو۔ ساتھ ہی وہ اپنا زمانہ یاد دلاتے ہیں جب ان کے پاس سائیکل بھی نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے ہی کارخانے میں نائٹ سپروائزر کے طور پر ملازم رکھا ہوا ہے۔ آٹھ سو روپے تنخواہ دیتے ہیں جس سے میں کالج کی فیس دیتا ہوں اور پیٹرول کا خرچ پورا کرتا ہوں۔ دن میں کالج جاتا ہوں۔ شام کو سوتا ہوں۔ رات کو ڈیوٹی دیتا ہوں۔ ابا کہتے ہیں میں اس طرح محنت کروں گا' تنخواہ پر کام کروں گا تو مجھے لوٹ کھسوٹ سے ہی پیسہ کمانے کا سلیقہ آئے گا اور پیسے سے محبت پیدا ہو گی۔ محنت کی عادت بھی پڑے گی۔"

"بہت روشن خیالات ہیں ان کے" میں نے کہا "لیکن اس سلسلے میں' میں کیا کر سکتا ہوں؟ یہ تمہارا اور تمہارے باپ کا آپس

کا مسئلہ ہے۔"

"آپ انہیں اپنے طور پر کچھ سمجھائیں۔ میرا نام مت لیجئے گا ... کہ میں آپ سے ملا تھا ... یا میں نے ابا جی کی شکایتیں کی تھیں۔ بس کسی بہانے سے ان کے کان میں یہ بات ڈالیں کہ وہ کنجوسی چھوڑ دیں اور اولاد کے ساتھ اچھا سلوک کیا کریں۔"

"وہ یہ تو پوچھیں گے کہ مجھے یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں۔"

"آپ کوئی بہانہ بنا دیجئے گا نا ... آپ جیسے بڑے لوگ تو بہت عقل مند ہوتے ہیں" وہ گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔ میں تو بالکل بھی عقل مند نہیں ہوں" میں نے نفی میں سر ہلایا "پھر بالفرض میں نے کوئی بہانہ بنا بھی لیا تو وہ کہیں گے، نان نہ مان میں تیرا مہمان، بھئی تم کون ہو ہمارے گھریلو معاملات میں دخل دینے والے؟ تم کیوں اپنے عظیم ابا کے ہاتھوں اپنی طرح میری بھی بے عزتی کرانا چاہتے ہو؟"

"نہیں جی ... وہ آپ کی بے عزتی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے" وہ بڑے وثوق سے بولا "بڑے لوگوں کی تو وہ بڑی عزت کرتے ہیں۔ بہت ڈرتے ہیں ان سے۔ اس روز ڈنر میں ان کی آپ کے قریب جانے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ دور دور سے ہی کہے جا رہے تھے، بہت بڑے آدمی ہیں ... بہت بڑے آدمی ہیں۔ وہ تو فون پر بھی آپ کا نام سنتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔"

"اچھا ... میں ان سے بات کروں گا۔ تم اپنا کارڈ مجھے دے جاؤ" میں نے بادل ناخواستہ کہا۔

"کارڈ کہاں ہے جی میرے پاس۔ ابا جی ایسی فضول خرچیاں کہاں برداشت کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو کاغذ پر ابا جی کا فون نمبر لکھ دیتا ہوں" اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی ڈائری سے ایک ورق پھاڑ کر اس پر فون نمبر لکھ کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس کا دل رکھنے کے لئے میں نے اسے تہ کر کے ایش ٹرے کے نیچے اس کا ایک کونا دبا دیا۔

وہ گویا طمانیت کی گہری سانس لے کر بولا "چلیں کچھ امید تو پیدا ہوئی۔ واقعی بڑے لوگ دل کے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ میں اپنا یہ مسئلہ لے کر کئی لوگوں کے پاس گیا جو ابا سے زیادہ بڑے کارخانے دار اور زیادہ دولت مند لوگ ہیں۔ جن سے ابا مرعوب ہو سکتے تھے۔ مگر کسی نے میری بات ہی نہیں سنی۔ ہر ایک نے مجھے ہنس کر ٹال دیا۔ آپ پہلے آدمی ہیں جس نے توجہ سے میری بات سنی ہے ..."

پھر وہ طمانیت کی اس سے بھی لمبی سانس لے کر بولا "یہ تو تھا میرا پرانا اور لمبا مسئلہ۔ اب آپ کو اپنا نیا اور ذرا چھوٹا مسئلہ بتاتا ہوں ..."

"اف میرے خدا ... ابھی دوسرا مسئلہ بھی باقی ہے۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور بات گویا اب میری برداشت سے باہر ہو گئی۔ میں نے غیر ارادی سے انداز میں اس کی سوکھی سی کلائی پکڑ لی۔ اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ گول گول سی آنکھیں پھیل کر بالکل ہی گول ہو گئیں۔ چہرے پر اذیت کے کچھ ایسے آثار ابھر آئے جیسے اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹنے کے قریب ہو اور کوئی نہیں تھا کہ ٹوٹ ہی جاتی۔ میں نے دبے دبے غصے کے تحت اس کی کلائی کچھ زیادہ ہی زور سے پکڑ لی تھی۔

میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ رکھ لو۔ پھر کسی وقت اپنا مسئلہ لے کر میرے پاس آنا۔ میں اطمینان سے تمہارا دوسرا، تیسرا، حتیٰ کہ آخری مسئلہ بھی سنوں گا اور تمہاری کچھ مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"بہت بہتر جی" وہ کارڈ لے کر کلائی سہلاتے ہوئے بولا "آپ سن لیتے تو بڑی مہربانی ہوتی۔ مختصر سی بات ہے ..."

میں نے ایک بار پھر اس کی کلائی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گیا اور جلدی سے بولا "ٹھیک ہے ... ٹھیک ہے۔ پھر کسی وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"اگر کارخانے میں تمہاری رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے تو تم اس وقت کس نے کھلا چھوڑ دیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ... آج میرا ڈے آف ... میرا مطلب ہے میرا نائٹ آف ہے۔ آج میں عیاشی پر نکلا ہوا ہوں" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"دوسروں کی تفریح کا بیڑا غرق کرنا بھی شاید تمہاری عیاشی میں شامل ہے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں ... جی نہیں۔ آپ شاید برا منا گئے" وہ گڑبڑا گیا اور جلدی سے الٹے قدموں کھسکتے ہوئے بولا "میں پھر کبھی آپ کے وقت لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا" اس کے الٹے قدموں چلنے کی کوشش میں پارٹیشن گرتے گرتے بچا۔ اس نے اسے سنبھالا تو خود گرتے گرتے بچا۔ آخر کار وہ اپنی میز کی طرف چلا گیا اور ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے ستارہ کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے آدھا چہرہ چھپائے بے آواز طرح طرح ہنس رہی تھی۔ ہنسی اس کی آنکھوں سے بھی چھلکی پڑ رہی تھی۔

"تمہیں ہنسی آ رہی ہے؟" میں نے گھنی گھنی آواز میں پوچھا۔

"میری تو زندگی ہی عجیب و غریب کرداروں میں گزر گئی ہے" چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی "اب بھی کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی عجیب کردار ٹکرا ہی رہتا ہے۔ اب میں نے ان سے محظوظ ہونا سیکھ لیا ہے۔ ویسے اس بے چارے پر تو مجھے ترس آیا تھا۔ بعض لوگ کچھ تو قدرتی طور پر ہی قابلِ رحم ہوتے ہیں اور کچھ اسے ماحول، حالات یا ماں باپ کا نفسیاتی رویہ مزید قابلِ رحم بنا دیتا ہے۔"

"ترس تو مجھے بھی آیا تھا" میں نے تسلیم کیا "لیکن بتاؤ اب ہم جیسے غیر متعلق انسان اس قسم کے بے سروپا مسائل میں، اپنے

لیا مدد کر سکتے ہیں۔"

طویل سانس لے کر سر جھکا کر رہ گئی۔ سوپ ٹھنڈا ہو ہم نے دوسرا منگایا پھر اپنی باتوں میں مگن ہو کر ہم نے لطف اندوز ہونے کی کوشش کی۔ ستارہ بہت کم کھاتی اپنے نگر کی بہت فکر رہنے لگی تھی۔ وہ انڈسٹری میں چند سال بعد ہی دوسری کئی ہیروئنوں کی طرح بھاری بھرکم جاتی تھی۔ اسی لئے ابھی سے محتاط ہو کر چل رہی حیران تھا کہ ان پڑھ ہونے کے باوجود اسے سب باتوں کا کیسے آ گیا تھا۔

اچھوں کہ زیادہ یا کم کھانے سے کچھ بگڑتا یا سنورتا نہیں تھا میں بے فکر ہو کر کھاتا تھا۔ خصوصاً چائنیز کھانے چوں کہ میں ہوتے تھے اس لئے ان پر تو میں کچھ زیادہ ہی ہاتھ صاف تھا۔ تاہم مجھے عادی بسیار خور نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کبھی ایسا تھا کہ میں پورے پورے دن کچھ نہیں کھاتا تھا۔ کھانے پینی قوے کا دور چلا۔ کچھ دیر پہلے لوگوں کی بھیڑ بھاڑ اور وسیم کی آمد سے جو بدمزگی پیدا ہو گئی تھی وہ رفتہ رفتہ دور

ہم جب ریستوران سے نکلے تو کوئی ترنگ والی چیز پئے بغیر ہی ترنگ میں تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہم باہر آئے تو وسیم دروازے پر موجود تھا۔ شاید ہمارے ہی انتظار میں سوئی میں سکڑ رہا تھا۔ وہ ستارہ کی طرف دیکھ کر گڑگڑانے کے انداز میں بولا "تو پھر آپ میری بہن بن گئی ہیں نا؟"

"بالکل۔ بالکل" ستارہ شال لپیٹتے ہوئے جلدی سے بولی۔

"آپ مجھے اپنا فون نمبر دے دیجئے۔ میں آپ کو فون پر اپنے بہت سے آگاہ کروں گا" وہ طویل و عریض پارکنگ لاٹ میں ہمارے ساتھ چلتے ہوئے منمنایا۔

"میں ابھی ذرا غریب ہیروئن ہوں۔ ابھی میرے ہاں فون نہیں" ستارہ نے تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے اپنا ایڈریس ہی بتا دیجئے۔ میں آپ کو پابندی سے لکھا کروں گا۔"

ستارہ نے اسے ایک اسٹوڈیو کا نام بتاتے ہوئے کہا "اس کی بجائے تم مجھے خط لکھ سکتے ہو۔ مجھے فوراً مل جائے گا۔ مکان تو کرائے کا ہے۔ کیا بھروسہ کل بدل لوں۔"

"بہت بہتر" وسیم خوش ہو گیا اور میری طرف دیکھ کر سٹپٹا کر جلدی سے دوسری طرف کو بڑھ گیا۔ ادھر شاید اندھیرے میں کہیں اس کی کار کھڑی تھی۔ میں نے ستارہ کو گاڑی میں بٹھاتے ہی اتنی تیزی سے وہاں سے گاڑی نکالی کہ باؤنڈری کے گیٹ پر کھڑا ہوا چوکیدار بھی اچھل کر ایک طرف کو ہٹ گیا۔ وہ مجھے شاید نشے میں دھت کوئی نودولتیا سمجھا ہو گا۔

ستارہ بے اختیار ہنستے ہوئے بولی "تم تو اس طرح ڈر کر بھاگ رہے ہو جیسے تمہارے پیچھے کوئی بھوت لگ گیا ہو۔"

"اگر میرے پیچھے بھوت لگا ہوتا تب میں اس طرح نہ بھاگتا" میں نے اس کی غلط فہمی دور کی "وسیم کے روپ میں ہمارے پیچھے بھوت سے بڑی کوئی چیز لگ گئی ہے۔"

وہ ہنستے ہنستے مجھ پر تقریباً ڈھیر ہو گئی اور میں وسیم کو بالکل بھول گیا۔ ستارہ کے گھر پہنچ کر تو میں ستارہ کے سوا دنیا کی ہر چیز کو بھول گیا۔

دو گھنٹے بعد جب میں اس کے ہاں سے نکلا تو رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ اپنے رگ و پے میں اس کے وجود کا نشہ اور اپنے ہر مسامِ جاں میں اس کے سانسوں کی مہک لئے میں اپنے آپ میں مگن چلا جا رہا تھا کہ ایک کشادہ مگر ویران گلی میں مڑتے ہی مجھے اچانک گاڑی روکنی پڑی۔

گلی میں روشنی کم ہی تھی لیکن اگلے موڑ پر دو سائے ایک دوسرے سے الجھتے مجھے آسانی سے نظر آ رہے تھے۔ ایک لحیم شحیم مرد تھا اور ایک دوسری سروقد لڑکی جس کے خدوخال اتنی کم روشنی میں اتنی دور سے بھی بے حد دلکش دکھائی دے رہے تھے۔ ایک گاڑی بھی قریب ہی کھڑی تھی جس کے دونوں اگلے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

میں نے مرد کو لڑکی سے کوئی چوکور سی سیاہ چیز چھینتے دیکھا۔ شاید وہ کوئی بریف کیس تھا۔ لڑکی اسے واپس لینے کے لئے اس سے الجھ رہی تھی۔ مرد نے بے دردی سے اسے گھونسے، تھپڑ اور لاتیں مارنی شروع کر دیں۔ لڑکی خاصی مشاق اور مہارت سے ان سے بچ رہی تھی اور ساتھ ہی وہ بریف کیس مرد سے واپس لینے کی کوشش بھی جاری رکھے ہوئے تھی لیکن اس کوشش کے دوران کچھ گھونسے تھپڑ اور لاتیں اسے پڑ ہی گئیں۔

وہ دہری ہو گئی اور پھر زمین پر گر گئی۔ اس وقت تک میں گاڑی سے اتر کر ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ مرد دوڑ کر گاڑی میں بیٹھنے ہی لگا تھا۔

"خبردار ... ٹھہرو ... ورنہ گولی مار دوں گا" میں نے پسٹل نکالتے ہوئے للکارا لیکن میں دیکھ نہیں سکا کہ اس کے ہاتھ میں اب ریوالور تھا۔ گاڑی کی طرف لپکتے وقت وہ جیب سے ریوالور نکال چکا تھا اور اس نے فائر کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ اس وقت میں غیر ارادی طور پر ایک لمحے کے لئے جھک گیا تھا۔ گولی میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ تب میں نے بھی یہ جاننا ضروری نہ سمجھا کہ وہ کون تھا اور معاملہ کیا تھا۔ میں نے بھی عین اس کے سینے پر گولی چلا دی لیکن اس نے حیرت انگیز طور پر گولی کے رخ کا اندازہ کرتے ہوئے بروقت وہ بریف کیس نما چیز اپنے سینے پر رکھ لی۔ اسے ڈھال بنا لیا۔

وہ واقعی بڑی عمدہ ڈھال ثابت ہوئی۔ شاید وہ ٹھوس دھات کی بہت موٹی چادر کا کوئی ڈبا تھا یا شاید دھات کا کوئی ٹھوس ٹکڑا ہی

تھا۔ گولی کے دھماکے سے ٹکرانے کی واضح آواز میں نے سنی' چنگاریاں اڑیں اور گولی نہ جانے کس سمت کو پھسل گئی۔

اس وقت تک میں گاڑی کے عین قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ شخص گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اسے اب ہلاک یا زخمی کرنے کا ارادہ بدل دیا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ زندہ و صحیح سلامت میرے ہاتھ آجائے لیکن عین اسی لمحے اس نے پوری قوت سے گاڑی کا دروازہ بند کیا۔ میرا ہاتھ دروازے میں آگیا۔

تکلیف سے میری چیخ نکل گئی جو درحقیقت ہلکی سی چیخ تھی جسے میں نے دبا لیا تھا۔ میں نے ہاتھ کھینچا تو دروازہ فوراً ہی بند ہوگیا۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ گاڑی کو جھٹکا لگا تو سڑک کے ٹوٹے ہوئے پتھروں پر میرا پاؤں پھسل گیا۔ اسی وقت گاڑی میرے جسم سے رگڑ کھاتی آگے بڑھ چکی تھی۔ میں گرا تو وہی ہاتھ جو گاڑی کے دروازے میں آیا تھا' گاڑی کے پچھلے چرچراتے ٹائر تلے بھی آگیا۔ پہیہ اس پر سے گزر گیا۔ آج بے چارے اس ہاتھ کی شامت ہی آگئی تھی۔

میں نے آخری کوشش کے طور پر بغیر کسی اندازے کے تین فائر کئے۔ گاڑی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی مگر وہ رکی نہیں' تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی اور موڑ عبور کرگئی۔ موڑ پر اس کے ٹائروں کی رگڑ سے ہوا میں ربڑ جلنے کی بو محسوس ہوئی۔

اسی لمحے ایک سفید کار کو میں نے اسی رفتار سے' اسی انداز میں اس کے پیچھے غائب ہوتے دیکھا اور اطمینان کی سانس لی۔ ٹونی آج اکیلا ہی گاڑی میں میرے پیچھے تھا۔ شبیر شیخ کو میں نے ہی دو تین ضروری کاموں کے سلسلے میں بھیجا ہوا تھا۔ ٹونی اس وقت اس شخص کے تعاقب میں روانہ ہو چکا تھا جو گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ مجھے خود آج اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی۔ میں آج اپنی روایتی پھرتی اور چابک دستی کا مظاہرہ نہیں کرسکا تھا ورنہ وہ شخص نکل کر نہیں جا سکتا تھا۔ شاید یہ سب کچھ اتنی اچانک اور اتنے غیر متوقع طور پر میرے سامنے آگیا تھا کہ میری قوتِ فیصلہ صحیح طور پر برسرِ ست میں کام نہیں کرسکی تھی۔ یا پھر شاید اس وقت میرے اعصاب اور حواس مکمل طور پر بیدار نہیں تھے۔ ان پر کوئی خفیف سا سرور طاری تھا۔

میرے ہاتھ میں اٹھنے والی درد کی لہریں پورے بازو میں' بلکہ کندھے تک پھیل رہی تھیں۔ سارا سُرور ہوا ہوگیا تھا۔ اور حواس نہ صرف بیدار ہو چکے تھے بلکہ زور و شور سے فریاد کر رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے اور ہاتھ کو ہلا کر' مٹھی بند کرکے اور کھول کے دیکھا۔ کوئی ہڈی ٹوٹی نہیں تھی۔ خاصی ڈھیٹ ہڈیاں تھیں۔

پاٹل جیب میں رکھ کر میں لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ اٹھ کر تیز تیز قدموں سے ایک طرف کو چل دی تھی۔ یعنی جس کے لئے ہم نے جان کو ڈالا تھا اس نے شکریہ ادا کرنا تو درکنار' مڑ کر یہ دیکھنے کی نہیں کی تھی کہ دخل در معقولات کرنے والا احمق زندہ مرگیا۔

میں اس کے پیچھے لپکا تو اس نے باقاعدہ دوڑنا شروع اسی طرف کو جاری تھی جدھر میں نے اپنی گاڑی تھی۔ ایک چھلانگ لگا کر میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور طرف گھمایا۔ میرا بھی یہ کچھ کہنے کا ارادہ تھا لیکن اس دیکھ کر الفاظ میرے منہ میں رہ گئے۔

اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ پیشانی پر ہلکا سا نیل نمودار ہو چکا تھا۔ غالباً گھونسے کی ضرب سے ہڈی پر ابھار سا پیدا ہونے لگا تھا۔ کچھ شاید دوسری چوٹوں تھا کہ وہ ہچکیاں سی لے رہی تھی۔ مجھے اس پر ترس ڈانٹنے کے بجائے میں نے ملائمت سے پوچھا "کون تھا تمہارا کیا چھین کر بھاگا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ سسکیاں لینے کے سے انداز اس کی اپنی چیز تھی ـــ مجھے دینے کے بعد واپس مانگ ـــ میں واپس دینا نہیں چاہتی تھی ـــ"

وہ بلاشبہ ایک نہایت خوب صورت لڑکی تھی۔ سمت میکسی اور بچوں جیسے ہلکے پھلکے رنگ برنگے جوتے پہنے تھی۔ اس کے خدوخال نہایت ہی پُرکشش تھے۔ لگتا تھا ہی خاص قسم کی ورزشیں کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ آنکھیں نظر میں مجھے شناسا محسوس ہوئی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن ان آنکھوں کی مانوسیت نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

"کیا چیز تھی وہ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں ـــ کوئی خاص چیز نہیں تھی" وہ نظر ہوئے اور اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "بڑی مہربانی ـــ کہ تم میری مدد کو آئے ـــ لیکن اب تم جا خاص بات نہیں تھی۔ ہمارا آپس کا معاملہ تھا۔ وہ کوئی اجنبی تھا' میرا جاننے والا تھا۔"

"میں نے پوچھا ہے وہ کیا چیز تھی؟" میں نے سخت لہجے اور اس کے بازو پر گرفت سخت کردی۔ وہ کراہ اٹھی۔

"کچھ زیورات تھے" وہ جلدی سے بولی "میں کہہ رہی چلے جاؤ۔ بس اب بات ختم ہوگئی ہے۔"

بقول اس کے' بات ختم ہوگئی تھی لیکن وہ خوف زدہ سے ادھر اُدھر دیکھے جا رہی تھی۔ اس میں کوئی شک زیورات کے لئے عورت سر دھڑ کی بازی لگا سکتی ہے لیکن

میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ اس ڈبے میں زیورات تھے کچھ دیر پہلے کشش ہو رہی تھی۔ زیورات عموماً اس قسم اور آہنی ڈبوں میں نہیں رکھے جاتے۔

بحث کا موقع نہیں تھا۔ میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا "آؤ میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں۔"

"نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ میرا گھر یہاں سے زیادہ ہے۔" وہ پہلے سے زیادہ خوف زدہ لہجے میں جلدی سے بولی۔ "پلیز۔ چلے جاؤ۔"

زدہ بھی تھی۔ اس کے باوجود تنہا گھر جانا چاہتی تھی۔ یہ بھی ہو سکتی تھی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکی سی صورتِ حال میں پھنسی ہوتی ہے۔ کوئی مددگار بن ہے لیکن بعد میں وہی بلیک میل کرنا شروع کردیتا ناظ سے لڑکی کا خوف بجا بھی ہو سکتا تھا لیکن یکدم مجھے کہ بات یہ نہیں تھی۔ لڑکی اپنے لئے نہیں' شاید میرے زدہ تھی۔

فائیہ سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "یقین کوئی خاص بات نہیں تھی ـــ ایک نجی سا جھگڑا ٹھیک ہوجائے گا ـــ پلیز تم جاؤ۔"

ے جیتے پر تلی ہوئی تھی۔ دفعتاً میں نے اس کی آنکھیں ے دیکھیں۔ میں تیزی سے گھوما لیکن مجھے تاخیر ہوچکی ے عقب میں ایک تاریک کوٹھی کے سامنے جھاڑ جھنکاڑ پھیلی ہوئی باڑھ تھی۔ یہ باڑھ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ دو تین کوٹھیوں کے سامنے مختصر سا بیرونی لان کسی زمانے کا' جسے باڑھ کی چار دیواری میں محفوظ کیا گیا ہوگا لیکن نہ سے سب کچھ بے پروائی سے چھوڑ دیا گیا تھا۔ تینوں ہی کے سامنے جھاڑ جھنکاڑ سا پھیل گیا تھا۔

باڑھ کے عقب سے گویا کسی چیتے نے مجھ پر چھلانگ لگائی خا تو انسان ہی لیکن گولی کی رفتار سے آیا تھا۔ میں صرف ہائیں سی ہی دیکھ سکا۔ میں شاید اسے جھکائی دے جاتا کے ہاتھ میں کوئی لمبی سی چیز تھی۔ اس کی زد سے میں نہ بچ پاتا کنپٹی پر ہتھوڑا سا پڑا۔ وہ یقیناً وزنی چیز تھی اور بڑی قوت لگائی تھی۔

نی آواز جو میں نے سُنی وہ شاید کسی قسم کے سائرن کی ے لگی محسوس ہوا کہ شاید وہ میری زندگی کی آخری آواز میرا خیال یہی تھا کہ میری کھوپڑی کے پرخچے اڑ چکے ے ہی لمحے میں ہر چیز سے بے نیاز ہوگیا۔

کی آنکھ کچھ اس طرح کھلی جیسے میرے پپوٹے کسی بھاری کے سہے ہوئے تھے۔ پہلا احساس یہی ہوا کہ شاید میں اپنی جگہ کچھ زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ میرا جسم کچھ پھنسا پھنسا

پھر مفلوج حواس میں دھیرے دھیرے کہیں درد کا احساس بیدار ہوا لیکن یہ بھی صحیح طور پر پتا نہیں چل رہا تھا کہ درد تھا کہاں؟ پھر احساس ہوا کہ قبر خاصی گدیلی سی تھی اور میرا سر بھی کسی گرم و گداز تکیے پر تھا۔ میں نے گرد و پیش کو محسوس کرنے کے لئے ہاتھ ادھر اُدھر گھمایا۔ ارد گرد بیشتر چیزیں نرم و ملائم ہی تھیں۔

محسوسات نہایت آہستگی سے کچھ اس طرح بیدار ہو رہے تھے جیسے کسی انتہائی زنگ آلود مشینری کو تیل دے کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ پھر کسی کی گرم سانس میری پیشانی سے ٹکرائی۔ خوبصورت بالوں کے حلقے میں گھرا ہوا ایک چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ ان شناسا آنکھوں میں بے پناہ تشویش تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ قبر نہیں ہو سکتی تھی۔ قبر میں ایسی گداز چیزیں نہیں پائی جا سکتی تھیں۔ اور اس لڑکی کو منکر نکیر بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ وہ تو وہی تھی جس کی وجہ سے مجھ پر آج کی رات بھاری گزری تھی۔

اپنے سر میں ابھرتی ہوئی دھمک اور ارد گرد پھیلے ہوئے ملگجے اندھیرے سے میں کچھ مانوس ہوا تو اندازہ ہوا کہ میں اپنی ہی کار کی عقبی سیٹ پر لیٹا ہوا تھا اور میرا سر اس لڑکی کی گود میں تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" لڑکی کی آواز مجھے دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"ہاں" میں نے جواب دیا اور سر کو دائیں بائیں جھٹک کر اپنی دانست میں سر کا بوجھل پن کم کرنے کی کوشش کی لیکن یہ بڑی غلطی ثابت ہوئی۔ میں نے گویا درد کے ہیڈ کوارٹر کو چھیڑ دیا تھا۔ ٹیسیں سر سے پورے جسم میں بکھر گئیں۔ میں نے سانس روک کر یوگا کی تدبیر سے انہیں کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ پھر لڑکی کی مدد سے اٹھ کر بیٹھ گیا تو... میں نے اپنے آپ کو بہتر محسوس کیا۔ سر ٹٹول کر دیکھا تو کنپٹی سے ذرا اوپر ایک گومڑ محسوس ہوا۔ کچھ خون بھی نکلا تھا۔ بالوں میں چپچپاہٹ تھی۔ یہ بھی اچھا ہی تھا۔ وہ سر کی چوٹ زیادہ بری ثابت ہوتی ہے جس میں خون نہ نکلے۔

میں نے کار کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ ہم وہاں نہیں تھے جہاں میں بے ہوش ہوا تھا۔ گاڑی وہاں سے کم از کم ایک میل دور ایک سروس روڈ پر درختوں کے عقب میں کھڑی تھی۔

"ہم یہاں کیسے پہنچ گئے؟" میں نے پوچھا۔

"میں لائی ہوں" اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ اس کے چہرے سے ابھی تک خوف کے سائے چھٹے نہیں تھے اور یہ سائے اس کے معصوم چہرے پر اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

"کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

"کس طرح ـــ؟" اس نے یوں میرے الفاظ دُہرائے گویا میرا سوال اس کے نزدیک نہایت غیر ضروری بلکہ شاید احمقانہ رہا ہو "میں نے تمہیں کھینچ کھانچ کر بڑی مشکل سے گاڑی میں ڈالا اور ڈرائیو کرکے یہاں لے آئی۔ یہ جگہ مجھے کچھ محفوظ نظر آئی تو یہاں رک کر تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ کافی دیر سے

کوشش کر رہی تھی۔"

اگر اس لڑکی نے مجھے بے ہوشی کی حالت میں کھینچ کھانچ کر گاڑی میں ڈال لیا تھا تو یقیناً اس نرم و نازک سراپا میں بہت سی طاقتیں چھپی ہوئی تھیں۔

"لیکن جس شخص نے مجھے بے ہوش کیا اس نے تمہیں اتنی آسانی سے کیسے آنے دیا؟" میں نے پوچھا۔ فی الحال میں نے صرف سوالات کرنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اس کے جوابات پر شک و شبے کا اظہار کرنے کا میرا ابھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"اس شخص کو فوراً ہی وہاں سے بھاگنا پڑا تھا کیوں کہ پولیس کی گاڑی کا سائرن بھی سنائی دینے لگا تھا اور چوکیداروں یا پھر شاید پیدل گشت کرنے والے پولیس والوں کی سیٹیاں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ میں نے بھی وہاں سے اسی لئے جلد از جلد نکل جانا بہتر سمجھا کہ میں پولیس کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتی تھی لیکن تمہیں بھی وہاں بے ہوش پڑا چھوڑ کر آنے کو میرا دل نہیں مانا۔ حالاں کہ پولیس آکر تمہیں اٹھاتی تو شاید اسپتال لے جاتی جو تمہارے حق میں بہتر ہوتا۔"

"نہیں" میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جہاں میری آنکھ کھلی وہ جگہ زیادہ بہتر تھی۔"

اس کی آنکھوں میں حیا کی لہر ابھری لیکن چہرے پر کوئی خاص تغیر نہ آیا۔ میں نے پوچھا "وہ شخص کون تھا؟"

"مجھے کیا معلوم" وہ تیزی سے بولی۔

"کیا وہ اس شخص کا دوست تھا جو تمہیں مار رہا تھا؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں" وہ مجھ سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔

"ویسے بھلا اس کی مجھ سے کیا دشمنی تھی جو وہ یکدم اندھیرے سے نکل کر میری کھوپڑی توڑنے پر تل گیا" میں نے کہا۔

"اس سلسلے میں بھی میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں" وہ بے چارگی سے بولی۔

"اچھا..... وہ کس قسم کا آدمی تھا؟ اس سلسلے میں بھی تم کچھ کہہ سکتی ہو یا نہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی" وہ بولی "وہاں روشنی کوئی خاص نہیں تھی..... اور پھر وہ بے پناہ پھرتیلا تھا..... چھلاوے کی طرح آیا اور تمہیں بے ہوش کر کے چھلاوے ہی کی طرح غائب ہو گیا۔"

وہ کچھ بتانے کے لئے تیار نہیں تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ دروازے کے ہینڈل کی طرف کھسک رہا تھا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے مصنوب ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ وہ کافی سوج چکا تھا۔

"کیا ہوا تمہارے ہاتھ کو؟" وہ دفعتاً تشویش سے بولی۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کے لہجے میں میرے لئے ہمدردی اور اپنائیت تھی لیکن وہ مجھے کچھ بتانے کے لئے تیار نہیں تھی۔ انسان اگر کسی کے لئے اپنائیت محسوس کرتا ہے، اس سے اظہارِ ہمدردی یا اس کی ہمدردی کا طلب گار ہوتا ہے تو اسے اپنے مصائب کے بارے میں بتانے سے اتنا سخت پرہیز بھی نہیں

"یہ ہاتھ پہلے تمہارے اس میاں کی گاڑی کے دروا آیا پھر پہیے کے نیچے آگیا" میں نے بتایا۔

"اوہ..... میرے خدا.....!" اس نے وحشت زد میں کہا اور فوراً میرے محترم ہاتھ کو دونوں ہاتھوں لیا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس واقعی تکلیف تھا۔ وہ ہاتھ ہوئے بولی "کوئی ہڈی نہ ٹوٹ گئی ہو۔"

"نہیں۔ ہڈیاں سلامت ہیں" میں نے کہا۔

"ایکسرے کے بغیر تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"درد سب سے بڑا ایکسرے ہے" میں نے مسکراتے

"ہڈی ٹوٹنے کا تو درد ہی کچھ اور طرح کا ہوتا ہے۔"

"تم یا تو بہت خوش قسمت ہو یا بہت سخت جان" وہ بولی

"دونوں ہی باتیں درست ہیں" میں نے جواب دیا۔ اپنے آپ کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔

"اس شخص نے تمہارے سر پر راتفل سے وار کیا تھا طرف سے لاٹھی کی طرح پکڑ کر، گھما کر پوری قوت سے تھا" وہ بولی "میں تو سمجھ رہی تھی تمہاری کھوپڑی کے ٹکڑے ہوں گے لیکن شاید وار اُچٹتا ہوا پڑا یا پھر تمہاری کھوپڑی طرح ہے۔"

"دونوں ہی باتیں درست ہیں" میں نے ایک بار پھر کہا اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ہی معدوم ہو گئی۔ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر اترتے ہو "میں اب چلتی ہوں۔"

بلی کی طرح بے آواز قدموں سے وہ درختوں کے سا چلی جا رہی تھی۔ میں اتر کر اس کے پیچھے لپکا تو سر میں سخت ہوئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا گہرا ہونے لگا مگر میں نے پروا نہیں کی۔ اس نے دوڑنے کی کوشش کی مگر میں نے ہاتھ جلدی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"گھر" اس نے جواب دیا۔

"تمہیں پیدل چلنے کا اتنا شوق کیوں ہے؟ میں تمہیں میں چھوڑ دیتا ہوں" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں جانا ہے تمہاری گاڑی میں، تمہارے سا گویا پھٹ پڑی "تم میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ جو ہونا چکا۔ اب تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"مجھ سے اگر اتنا ہی گریز کرنا تھا تو تم نے مجھے میرے چھوڑ دیا ہوتا، مجھے بے ہوش چھوڑ کر چلی گئی ہوتیں" میں نے

"ہاں۔ مجھ سے بس یہی بڑی غلطی ہوئی کہ میں نے ا

تلخ لہجے میں بولی۔

"اس غلطی کے لئے میں تہہ دل سے تمہارا شکر گزار اب غلطی کر ہی چکی ہو تو اسے ذرا اور نباہ لو۔ آؤ میں تمہیں چھوڑتا ہوں" میں نے اسے پیچھے کھینچا۔ گرفت ایسی تھی کہ وہ بازو بھاگ نہیں سکتی تھی۔

"مرتعش لہجے میں بولی "میں اتنی مصیبت سے تمہیں وہاں لئے اٹھا کر نہیں لائی تھی کہ مجھے تم سے بہت ہمدردی ہیں تو بس یہ چاہتی تھی کہ تم پولیس کی تحویل میں نہ جاؤ اور وں کو میرے بارے میں کچھ نہ بتاؤ۔"

"کیوں ڈرتی ہو تم پولیس سے؟ کوئی جرم کیا ہے تم نے؟"

"رات کے پچھلے پہر مشکوک سے حالات میں مارکٹائی اور کے دوران ایک جوان لڑکی پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو کیا لئے کوئی جرم کرنا ضروری رہ جاتا ہے؟ بغیر کسی جرم کے ں کی مٹی پلید ہو سکتی ہے" وہ تلخی سے بولی۔

"میں تو اب بھی پولیس کو کچھ بتانے نہیں جا رہا۔ تمہیں کم از کم ں سلسلے میں مجھ سے کوئی خوف محسوس کرنے کی ضرورت آؤ چلیں" میں نے کہا۔ وہ گویا بادل ناخواستہ میرے ساتھ گئی۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ اسی کے سپرد کی اور یہاں تک چلا کر لے آئی ہو تو اپنے گھر تک بھی تم ہی لے

اس نے خاموشی سے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا اور گاڑی روڈ پر لے آئی۔ اسی دوران ڈیش بورڈ پر ایک ننھا سا بلب جلنے لگا اور مکھی کی بھنبھناہٹ سے مشابہ آواز وقفے وقفے سے نے لگی۔ یہ ریڈیو کا سگنل تھا۔ غالباً ٹونی مجھ سے ریڈیو پر رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ جس کار کے تعاقب میں روانہ ہوا تھا شاید کے بارے میں کوئی اطلاع دینا چاہتا تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا لڑکی ڈیش بورڈ کے خفیہ خانے میں ریڈیو کی موجودگی سے آگاہ اس لئے میں نے وہ خانہ نہیں کھولا۔ چند سیکنڈ بعد سگنل بند لیا۔ اگر وہ ٹونی تھا تو یقیناً تشویش میں مبتلا ہوا ہوگا۔ میں نے لیا۔ لیکن سردست میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

"یہ کیسا سگنل تھا؟" لڑکی نے پوچھا۔

"پیٹرول ختم ہو رہا ہے" میں نے جواب دیا۔

"لیکن فیول کا ڈائل تو یہ ہے" اس نے ایک ڈائل کی رف اشارہ کیا۔

"یہ اس کے علاوہ ایک فاضل انڈیکیٹر ہے" میں نے جواب اس ڈائل سے بھی کچھ پہلے یہ خبردار کرتا ہے۔"

"تمہاری گاڑی بہت پیچیدہ قسم کی ہے۔ اس میں بہت سی لگیاں میری سمجھ میں نہیں آئیں" وہ بولی "میں جب تمہیں گاڑی ں ڈال کر ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ہوائی جہاز کے کاک پٹ میں بیٹھ گئی ہوں۔ اس وقت تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے کہ معلوم نہیں میں اس گاڑی کو ڈرائیو بھی کر سکوں گی یا نہیں لیکن شکر ہے ڈرائیونگ آسان ہی ثابت ہوئی۔"

"یہ ماڈل شہر میں صرف تین چار لوگوں کے پاس موجود ہے" میں نے کہا "خواتین لوگوں کے رکھنے کی چیز ہے۔ میں نے براہِ راست مرسیڈیز کمپنی سے منگوائی تھی۔ میں تو چاہ رہا تھا کہ اس میں دروازے بھی چھ ہوتے لیکن کمپنی نے انکار کر دیا۔ انہوں نے لکھا کہ چھ دروازوں والی گاڑی وہ صرف سربراہانِ مملکت کے لئے تیار کرتے ہیں۔ مجھے صبر کرنا پڑا۔"

"بہت دولت مند ہو؟" وہ ترچھی نظر سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

"کوئی ایسا خاص نہیں" میں نے حسبِ عادت انکساری سے کام لیا "ویسے اچھی چیزیں رکھنے کے لئے صرف دولت ہی کی نہیں، شوق کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس شہر میں مجھ سے کہیں زیادہ دولت والے بہت سے لوگ موجود ہیں لیکن ان میں سے دو چار ایسے بھی ہیں جن کے ملازموں کے پاس ان سے بہتر گاڑیاں ہیں۔"

دفعتاً سامنے ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس آنکھیں خیرہ کر دینے والے انداز میں چمکیں۔ وہ ون وے سڑک تھی لیکن سامنے سے ایک گاڑی ون وے توڑتی ہوئی مست ہاتھی کی طرح جھومتی چلی آ رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس ہاتھی کی رفتار جیٹ سے کچھ ہی کم تھی۔

وہ ہماری گاڑی پر چڑھتی چلی آئی۔ لڑکی بوکھلا گئی لیکن شاید ہماری قسمت اچھی تھی کہ وہ بروقت گاڑی کو لہرا کر گرین بیلٹ میں دو درختوں کے درمیان اتارنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس گرین بیلٹ کے گرد منڈیر نہیں تھی، اس میں پانی کھڑا تھا جو ایک چھپاکے کے ساتھ فوارے کی سی صورت میں ادھر ادھر اچھلا اور گاڑی ایک دھچکے سے رک گئی۔ لڑکی ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ اسٹیئرنگ وہیل پر اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ دونوں گاڑیوں کے درمیان آمنے سامنے کا خوف ناک تصادم ہونے میں بال برابر کسر رہ گئی تھی۔

دوسری گاڑی چشم زدن میں دور جا چکی تھی۔ اس کے پیچھے ہوئے سائیلنسر کی گڑگڑاہٹ بھی معدوم ہو چکی تھی۔ لڑکی وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "یہ وہی تھا نا؟"

"وہی کون؟" میں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"وہی جو مجھ سے لڑ رہا تھا..... جس نے مجھے مارا تھا" وہ بولی۔

"کمال ہے! اس سے تو تمہارے اپنے بیان کے مطابق تمہارا کوئی نجی تعلق تھا اور تم اس کی گاڑی بھی نہیں پہچانتیں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "وہ سیاہ رنگ کی بیوک میں فرار ہوا تھا اور یہ عنابی رنگ کی فورڈ کورٹینا تھی۔ میں نے ڈرائیور

کی جھلک بھی دیکھی ہے۔ یہ کوئی نوجوان تھا۔ شاید نشے میں دُھت تھا۔"

"اوہ۔۔۔" اس نے طویل سانس لے کر محض اتنا کہا۔ شاید یہ طمانیت کی سانس تھی۔ گاڑی ریورس کر کے وہ دوبارہ مین روڈ پر لائی اور اگلے چوراہے سے گارڈن ٹاؤن کی طرف مڑ گئی۔

تین چار میل کے سفر کے بعد اس نے ایک بنگلے کے سامنے گاڑی روکی جو تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ پر تالا جھول رہا تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر ایک چابی تالے میں لگانے لگی۔ میں بھی جلدی سے اتر کر اس کے پاس جا پہنچا۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ بنگلے کی ایک کھڑکی میں روشنی تھی لیکن جونہی لڑکی نے تالے میں چابی گھمائی' وہ بھی بجھ گئی تھی۔ باہر تالا لگا ہوا تھا لیکن کیا اندر کوئی موجود تھا؟ اور اس نے لائٹ کیوں آف کر دی تھی؟ کہیں وہی شخص اس سے پہلے یہاں آکر تو نہیں بیٹھ گیا تھا؟ میں بظاہر بے پرواہی رہا لیکن اب میں پوری طرح ہوشیار تھا۔

"تم نے مجھے گھر چھوڑ دیا ہے۔ اب تم چلے کیوں نہیں جاتے؟" وہ تالا کھولنے کے بعد میری طرف مڑتے ہوئے بولی۔ وہ اپنی آنکھوں میں رُکھائی اور اجنبیت سمونے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔

"بداخلاقی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" میں نے اپنا لہجہ رنجیدہ بناتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے مجھے ان حالات میں میرے گھر پہنچایا ہوتا تو میں تمہیں کم از کم چھ ماہ اپنے ہاں قیام کی دعوت دیتا۔ اور تم چائے یا کافی کی ایک پیالی کو بھی نہیں پوچھ رہیں۔ میرا سر گھوم رہا ہے۔ شاید میں صحیح طور پر اپنے گھر تک ڈرائیونگ بھی نہ کر سکوں۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ اس کا چہرہ بدستور پتھرایا ہوا سا رہا لیکن اس نے گیٹ کھول دیا اور پورچ میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ "گاڑی اندر کھڑی کر دو۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس وقت تک وہ پورچ کی لائٹ آن کر چکی تھی اور اندر کا دروازہ کھول چکی تھی۔ گھر میں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے لیکن ہر طرف صفائی ستھرائی تھی۔ لان صاف ستھرا اور سرسبز تھا۔ وہاں تپائی اور لان چیئرز بھی پڑی تھیں۔ کہیں ایک خشک پتہ بھی پڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے اس کے پیچھے پیچھے اندر گھستے ہوئے کہا۔ "دو مرتبہ تم نے مجھ سے پیچھا چھڑا کر گھر کی طرف روانہ ہونے کی کوشش کی تھی۔ پیدل ہی چل پڑی تھیں اور دونوں مرتبہ تم نے یہی کہا تھا کہ تمہارا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ میں تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں کہ پیدل چلتے وقت تین چار میل کا فاصلہ تمہارے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔"

"میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں پیدل ہی جاؤں گی۔ مجھے آگے کوئی سواری مل جاتی۔" وہ خفگی سے بولی۔

"رات کے پچھلے پہر سنسان سڑکوں پر تنہا پھرنے والی لڑکی کو سواریاں عموماً پرستان لے جاتی ہیں۔" میں نے کہا۔ ہم ایک آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں کھڑے تھے۔

میں بات اس سے کر رہا تھا لیکن میرے کان کسی بھی حرکت کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ وہ میری طرف مڑتے ہوئے برہمی سے بولی۔ "مجھے اپنی نہیں' تمہاری فکر تھی۔ میں تمہارا بھلا چاہ رہی تھی لیکن لگتا ہے' تمہیں کسی کی ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم زعم ہے تمہیں اپنے بارے میں۔"

"تمہاری ہمدردی کا شکریہ ادا کرنے ہی تو میں تمہارے ساتھ آیا ہوں۔۔۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں اپنے محسنوں کا کیسا قدردان ہوں۔" میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "احسان کرنا بہت اچھی عادت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سچ بولنا بھی بہت اچھی عادت ہے۔"

وہ میرے عین مقابل خاموش کھڑی مجھے گھورتی رہی۔ میں نے اپنے سر کو ہولے ہولے ہلاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "میں نے ابھی تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔"

"حُسنہ ہے میرا نام۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"حسینہ ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ دو نتھلے بڑھ جانے سے یہ تمہارے حسن کے ہم وزن ہو جاتا۔" میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن خیر۔۔۔ ناموں میں کیا رکھا ہے۔ بعض اوقات تو نام شخصیت کے بالکل ہی اُلٹ ہوتے ہیں۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔"

اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ ساکن کھڑی مجھے گھورتی رہی۔ پھر میرے بائیں ہاتھ کو دیکھنے لگی جو اچھا خاصہ سوج چکا تھا۔ وہ سب کمروں کی بتیاں روشن کر چکی تھی۔ میں نے مصافحے کا ارادہ ملتوی کر کے دوسرے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا بنگلا ہے۔۔۔ اور بڑی محرمی سے فرنش کیا گیا ہے۔"

بظاہر آرائش دیکھنے کے بہانے میں نے ہر کمرے میں جھانکا۔ وہ میرے پیچھے تھی۔ میں نے کچن اور باتھ روم بھی دیکھ لیے۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی اتنے بڑے گھر کے کسی کونے کھدرے میں اکیلے دُکیلے آدمی کا چھپنا یا موقع مناسب دیکھ کر نکل بھاگنا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

"تسلی ہو گئی؟ یہاں کوئی نہیں ہے۔" وہ جلے کٹے سے انداز میں بولی۔

"ویسے ہی مجھے وہم سا ہوا تھا کہ جب ہم یہاں پہنچے تو ایک کھڑکی میں روشنی تھی۔" میں نے سچ بتا دیا۔ "میں تو تمہاری ہی بہتری کے لئے چیک کر رہا تھا۔"

"میں بھی تمہاری ہی بہتری کے لئے کہہ رہی ہوں' تم مجھے میرے حال پر چھوڑ کر چلے کیوں نہیں جاتے؟" اس کے لہجے میں

پھر بے چارگی آ گئی۔ "میں دوبارہ تمہاری کھوپڑی ٹوٹتے یا تم چلتے نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"یہی معاملہ ادھر بھی ہے۔" میں نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں بھی ہرگز نہیں چاہتا کہ پھر تم سے کچھ چھینے جائے اور بے دردی سے تم پر تھپڑ برسائے جائیں۔ میں نرم دل آدمی ہوں۔ اتنے حسین چہرے کو تڑپتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"مگر کہو کہ عیاش آدمی ہو۔ اچھی صورت دیکھتے ہی اسے پانی فکر میں لگ جاتے ہو۔" اس کے لہجے میں نرمی تھی۔

"نہیں۔ ابھی اتنی قابلیت مجھ میں پیدا نہیں ہوئی۔ عیاش کی حد میں پورا نہیں اترتا۔" میں نے انکساری سے کہا۔

"تم جتنے معزز آدمی نظر آتے ہو' تمہاری حرکتیں اتنی معززانہ نہیں۔"

"میرے خیال میں معزز بننے کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ آدمی تربوز کی طرح منہ پھلا کر ریوالونگ چیئر پر بیٹھ جائے اور بولتے وقت یہ دیکھتا رہے کہ سوٹ میں کہیں شکن تو نہیں۔ انسان کو ہنستے بولتے اور ہاتھ پاؤں ہلاتے جلاتے رہنا چاہئے۔ تو دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کا کچھ زیادہ ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"خواہ ٹانگ ٹوٹ ہی جائے؟"

"ابھی تک تو نہیں ٹوٹی۔ اگر ٹوٹ گئی تو شاید باز آ جاؤں۔" اس نے جواب دیا پھر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں بالکل تنہا ہو؟"

"ہاں' بالکل اکیلی۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"سارے کام کاج بھی خود کرتی ہو؟ اتنے بڑے گھر کو صاف بھی خود ہی رکھتی ہو؟ اتنی سلیقہ شعاری بلکہ جان ماری تم نے اسے سیکھی؟"

"یہاں پارٹ ٹائم کام کرنے والے آتے ہیں۔ اپنا اپنا کام کر کے چلے جاتے ہیں۔ میں کسی کو گھر میں رکھنا نہیں چاہتی۔" اس نے جواب دیا۔

"ایک پارٹ ٹائم شوہر بھی رکھ لو۔ کیا حرج ہے۔" میں نے اسے کہا۔

"کیا تم امیدوار ہو گئے ہو؟" اس نے مجھے گھورا۔

"درخواست تو میں بھی آج کل ہاتھ میں لئے گھوم رہا ہوں۔ میں اتنا جلد باز نہیں ہوں۔ میل ملاقات جاری رہی تو شاید کبھی آ جائے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"لگتا ہے کہ کیا تم ہو کر میری زبان بند کرانے کے لئے بولی "تم یہاں بیٹھو میں تمہارے سر پر بینڈیج کر دیتی ہوں اور ہاتھ پر بھی دوا لگا دیتی ہوں۔"

اس کی اس پیشکش سے فائدہ اٹھا لینے میں کوئی حرج نہیں تھا' اس لئے میں آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ باتھ روم میں گئی اور دواؤں کی الماری سے چند چیزیں نکال کر واپس آ گئی۔ بڑی عمدگی و مہارت سے اس نے بالوں سے خون صاف کر کے' دوا لگا کے پٹی کی۔ پھر دھیرے دھیرے ہاتھ پر دوا کی مالش کرنے لگی۔ چوٹوں کو ذرا سا بھی چھونے سے بڑا درد ہوتا تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں مسیحائی کی لذت بھی تھی۔ میں صوفے پر تھا' وہ آلتی پالتی مارے قالین پر بیٹھی تھی۔ ابتدائی طبی امداد کے لوازمات اس کے قریب ایک چھوٹی سی ٹرے میں رکھے تھے۔

اس کی آنکھیں جو بدستور میرے لئے الجھن کا باعث بنی ہوئی تھیں' میں نے ایک بار پھر انہی میں جھانک کر اپنی الجھن کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے انداز میں بڑی مشاقی و مہارت ہے۔ کیا تم کبھی نرس بھی رہی ہو؟"

"رہی ہو۔۔۔ ہیں اب بھی نرس ہی ہوں۔ میں تو حیران ہوں کہ تم نے ابھی تک یہ پوچھا ہی نہیں تھا کہ تم کیا کرتی ہو" وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولی۔

"ہمارے ہاں خواتین سے یہ پوچھنا کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا کہ تم کیا کر رہی ہو۔" میں نے جواب دیا' پھر ارد گرد کا از سر نو جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "ماشاءاللہ! یہ پیشہ کافی ترقی کر گیا ہے۔ اگر اس شہر کی لڑکیوں نے تمہارا رہن سہن دیکھ لیا تو سب کی سب نرس بننے پر تل جائیں گی۔"

"میرا یہ رہن سہن میری تنخواہ کی بدولت نہیں ہے۔ میں اتنی احمق نہیں ہوں جو ایسا دعویٰ کروں گی۔ میرا خاندان کافی خوشحال تھا۔ والدین کے انتقال کے بعد بہت کچھ میرے حصے میں آیا تھا۔ میں ان کی اکلوتی اولاد تھی۔"

"تو پھر تمہیں نرس بننے کی کیا سوجھی؟ دنیا میں کوئی اور کام نہیں رہ گیا تھا تمہارے لئے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"کیوں۔۔۔ کیا یہ اچھا کام نہیں ہے؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"بہت اچھا ہے۔ مگر جب ورثے میں اتنا کچھ ملا ہو تو اس پیشے کی طرف دھیان کہاں جاتا ہے۔"

"نظریات بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "مجھے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ مارکس کم رہ گئے' نہیں بن سکی۔ میں نے سوچا نرس بننے میں بھی کیا حرج ہے۔ مقصد تو تڑپتے سسکتے لوگوں کی خدمت کرنا تھا۔ ڈاکٹر بھی میں پیسے کے لئے تو بننا نہیں چاہ رہی تھی۔"

"انٹر کرنے سے پہلے سب کا یہاں یہی ہوتا ہے۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔

بہت سی دوا میرے ہاتھ میں جذب ہو چکی تھی۔ کافی راحت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے لئے کافی بناتی ہوں۔"

وہ کچن میں جاچکی تو میں نے اٹھ کر فون پر ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف جولی موجود تھی۔ میں نے نپی تلی آواز میں اور کوڈ ورڈز میں اسے ہدایت دی۔

"ٹونی جہاں کہیں بھی ہو اسے ریڈیو یا فون پر میرے بارے میں اطلاع دے دو کہ میں خیریت سے ہوں۔ وہ پریشان نہ ہو اور جس گاڑی کا وہ تعاقب کر رہا تھا اس کے بارے میں رپورٹ یا تو میرے فون پر ریکارڈ کرا دے یا میں موقع ملتے ہی اس سے خود بات کرلوں گا۔ فی الحال میں اس سے بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

میرے آخری الفاظ ادا کرنے تک وہ دروازے میں آن کھڑی ہوئی تھی اور غصیلی نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔ لیکن میرے الفاظ کچھ اور تھے۔ وہ ان سے کوئی مفہوم اخذ نہیں کرسکتی تھی۔ میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"کسی کو یہاں بلایا ہے؟ پولیس کو اطلاع دی ہے؟ تمہاری اطلاع کے لئے بتادوں کہ پولیس میرے معاملات میں مداخلت نہیں کرتی۔" وہ تیزی سے بولی۔

"ظاہر ہے' پولیس کو شرفا کے معاملات میں مداخلت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے معصومیت سے کہا۔ "تمہیں یہ گمان کیونکر گزرا کہ میں کسی کو بلا رہا ہوں یا پولیس کو اطلاع دے رہا ہوں؟"

"تو پھر میرے جاتے ہی گھٹی گھٹی آواز میں ٹیلی فون پر ٹرانے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟" وہ بدستور مجھے گھور رہی تھی۔

"کاروباری آدمی ہوں۔ وقت بے وقت منڈی کے بھاؤ معلوم کرتا رہتا ہوں۔" میں نے حتی الامکان سادگی سے کہا۔

"رات کے اس پہر تو صرف ایک ہی منڈی کھلی ہوتی ہے۔ اور اس کے بھاؤ معلوم کرنا خاصا معیوب کام سمجھا جاتا ہے۔" وہ بلا تامل بولی۔

"اچھا۔! کہاں ہے وہ منڈی؟ کیا تمہیں اس کے بارے میں خاصی معلومات ہیں؟ کچھ مجھے بھی بتاؤ۔ کبھی کبھی معیوب سی حرکتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔" میں نے اشتیاق سے کہا۔

وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے مجھے گھورتی رہی۔ پھر قدرے بے چارگی آمیز سے لہجے میں بولی "تم سچ سچ بتا کیوں نہیں دیتے۔۔۔ کے فون کر رہے تھے؟ مجھے الجھن رہے گی' ذہن میں خلش رہے گی۔"

"میں نے تمہاری اتنی باتوں پر یقین کیا۔ تم میری ایک بات پر بھی یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہو۔ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔۔۔۔ بہرحال تمہارے اطمینان کے لئے بتادیتا ہوں۔ ایک دوست کو میرے بارے میں تشویش ہوگی۔ اسے اپنی خیریت کی اطلاع دے رہا تھا۔"

معلوم نہیں وہ میرے جواب سے مطمئن ہوئی یا نہیں۔ بہرحال کچن میں واپس چلی گئی۔ اس کے کچن میں جدید ترین ساز و سامان موجود تھا۔ فوراً ہی کافی بنا کر لے آئی۔ اب میں نے دیکھا وہ اپنے چہرے کی چوٹوں پر بھی دوا کی مالش کرچکی تھی۔ کافی نوشی کے خاموشی رہی۔ بیشتر وقت ہم پُرخیال انداز میں ایک دوسرے رہے جیسے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو تول رہے ہو پھر شاید ہم ایک دوسرے کی دروغ گوئی کو تول رہے تھے۔

جونہی میں نے کافی کا مگ خالی کرکے ٹرے میں واپس رکھا بول اٹھی۔ "تم اب چلے کیوں نہیں جاتے؟"

"اگر تم دو منٹ پہلے کہہ دیتیں تو میں کافی کا مگ ہاتھ میں ہی رخصت ہوجاتا۔ خواہ مخواہ ہی تم نے دو منٹ مزید مجھے برداشت کیا۔" میں نے کہا۔ "اب تو جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا۔ بہت اچھی تھی۔ اسے پینے کے بعد میرے خیالات میں بڑی تبدیلی آگئی ہے۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر رو دینے والے لہجے میں بولی "دیکھو سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔ خدا کے لئے اس وقت چلے جاؤ۔ بہت پریشان ہوں۔ مجھے اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔ اگر میرے سر پر سوار ہونے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر کسی اور آجانا۔ گھر تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔"

"پھر کبھی آنے کا ارادہ رکھنے والوں کو عموماً بہت زیادہ ہوجایا کرتی ہے۔ بعض اوقات تو ان کا دوبارہ آنا بے کار ہی ہے۔" میں نے اطمینان سے کچھ اور پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا "زیادہ اہم تو آج ہی کی رات ہے۔ دراصل مجھے شبہ ہے کہ وہ لوٹ کر ضرور آئے گا۔ پھر وہ نہ جانے تم سے کیا سلوک کرے۔"

"تم سے۔ کس نے کہہ دیا کہ میں اس کے آنے کے تصور سے خوفزدہ ہوں؟" وہ غصیلے انداز میں بولی۔ "ہوسکتا ہے مجھے اس کی آمد کا انتظار ہو۔"

"یہی تو میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کس کو کس کا انتظار ہے۔ کون کس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔" میں نے کہا "مجھے امید ہے کہ تم نے اسے گھر کی چابی بھی دی ہوئی ہوگی تاکہ وہ جس وقت چاہے کال بیل بجانے کی زحمت کئے بغیر اندر آسکے؟"

"ہاں' دی ہوئی ہے۔ تم سے مطلب؟" وہ تقریباً چلا اٹھی۔

"گڈ! حسین لڑکیوں کو ایسا ہی ملنسار ہونا چاہئے۔" میں نے سہلاتے ہوئے کہا۔ لیکن سہلانے سے درد دیوار بھی آنکھوں کے سامنے تھوڑا تھوڑا ہلنے لگے۔ میں نے فوراً ہی سر کو مزید ہلنے سے روک لیا۔ ابھی میں عافیت تھی۔ بینڈیج کرتے وقت حسن نے کھانے کے لئے دو گولیاں بھی دی تھیں۔ اب میری حالت خاصی بہتر تھی لیکن ابھی چوٹ کے اثرات تو بہرحال باقی تھے اور میرا خیال تھا کہ دو تین دن تک اس سے بھی زیادہ تکلیف برداشت کرنی پڑے گی۔

"یس تھی تو میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "اسے تمہارے گھر کی چابی سے یا اس شخص سے کوئی خاص غرض ہے۔ لیکن مجھ میں ایک بڑی خرابی ہے۔ اگر کوئی اپنی گاڑی سے

کچل کر مجھ پر گولی چلا کر اور میرے سامنے کسی سے کچھ چھین کر جائے تو عام طور پر مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ اسے تلاش میرے لئے اتنا ہی ضروری ہوجاتا ہے جتنا خرگوش کے لئے کھانا۔ معاف کرنا' اس وقت کوئی مناسب تشبیہ نہیں سوجھ رہی۔"

وہ ایک ٹک مجھے گھور رہی تھی۔ اس وقت اسے میرا خوش دلی سے بات کرنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا۔ "وہ تھا کون؟"

"عبدالرشید۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا سبزی منڈی کا کوئی آڑھتی تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں' بکرا منڈی میں بکرے بیچتا تھا۔" وہ جل کر بولی۔ وہ بڑے ہی انداز میں بات گول کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"بکرے نہیں' بکریاں بیچتا ہوگا۔ دو ٹانگوں والی خوش شکل بکریاں۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ اس کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ الجھن اور جھنجلاہٹ کا شکار تھی لیکن اس کی رنگت متغیر نہیں ہوئی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے حتی الامکان سنجیدگی سے کہا۔ "میں دراصل یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ اس سے تمہارے تعلق کی نوعیت کیا ہے جو تم اس کی اتنی بدسلوکی بھی صبر و سکون سے برداشت کرنے کے لئے تیار ہو؟"

وہ بھی بظاہر سنجیدگی سے ہی بولی "وہ میرا منگیتر ہے۔"

"او میرے خدا۔!" میں صوفے سے گرتے گرتے بچا۔ یقیناً میری آنکھیں بھی پھیل گئی تھیں۔

"اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟" وہ خفگی سے بولی۔

"اس سے میری ملاقات بے شک خوشگوار حالات میں نہیں ہوئی تھی۔ وہاں روشنی بھی کم تھی۔ میں اسے صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا لیکن پھر بھی مجھے اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ اس کی عمر پچاس سے کم نہیں تھی۔"

"تب بھی حیرت کی بات کیا ہے اس میں؟" وہ بولی "کیا اس معاشرے میں بڑی عمر کے مردوں کی شادیاں نوجوان لڑکیوں سے نہیں ہوتیں؟ کیا یہ کوئی انہونی بات ہے؟"

"نہیں۔ انہونی بات تو نہیں" میں نے تسلیم کیا "مگر نہ جانے کیوں دل کو نہیں لگ رہی لیکن خیر۔۔۔ کیا اس کا نام عبدالرشید ہی ہے؟"

"نہیں۔ وہ میں جل کر کہہ رہی تھی۔ اس کا نام احمد شجاع ہے۔ جوانی میں ملکی سطح پر وہ اچھا خاصا نامور باکسر تھا۔ اس عمر میں بھی تندرست' طاقتور اور چاق و چوبند ہے" اس نے جواب دیا۔

"تبھی تو میری گرفت میں آنے سے بچ گیا۔ اس کے تندرست' طاقتور اور چاق و چوبند ہونے میں تو مجھے کوئی شک نہیں۔ اور وہ ایسا نہ ہوتا تب بھی اس سے تمہاری شادی پر مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا" میں نے ملائمت سے کہا "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس سے دوبارہ جلد از جلد کہاں اور کس طرح ملاقات ہوسکتی ہے؟"

"کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"میرے ہاتھ کی ورم اور سر پر بندھی ہوئی پٹی اپنا حساب مانگ رہی ہے۔"

"دیکھو۔۔۔" وہ تھکے تھکے انداز میں گہری سانس لے کر بولی۔ "ہوسکتا ہے تم حساب لینے کی فکر کرو تو نقصان میں رہو۔ یہ کوئی فلمی سچویشن نہیں ہے اور نہ ہی وہ ولن یا تم ہیرو ہو کہ کہیں تمہارے ساتھ کچھ ہوگیا تو تم لاٹھی لہراتے ہوئے انتقام لینے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ اسے ایک حادثہ سمجھ کر بھول جاؤ۔ انسان کو سرِراہ جاتے جاتے بھی تو چوٹ لگ جاتی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہم اس سے بھی زیادہ خطرناک حادثے سے بچے ہیں۔ وہ شرابی اگر ہماری گاڑی سے گاڑی ٹکرا ہی دیتا تو تم کیا کرتے؟"

"اگر میں زندہ بچ جاتا اور وہ بھی کسی نہ کسی حالت میں زندہ پایا جاتا تو میں اسے ضرور سبق سکھاتا کیوں کہ یہ محض اتفاقیہ حادثہ نہ ہوتا۔ اس کی شراب نوشی کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آتا۔ میری ذاتی عدالت اسے ضرور سزا دیتی" میں نے جواب دیا۔

"تمہاری ذاتی عدالت۔۔۔؟" اس نے قدرے چونک کر کہا۔

"میرا مطلب ہے' میں اپنی ذات کی حد تک اسے قابلِ معافی نہ سمجھتا" میں نے جلدی سے کہا۔

"تم تو واقعی بزا درد سر ہو" وہ کنپٹیاں مسلتے ہوئے بولی "احمد شجاع کا تو تم نے پیچھا پکڑ لیا ہے لیکن جس نے تمہیں زیادہ شدید چوٹ لگائی' تمہاری کھوپڑی پر رائفل کے بٹ سے وار کیا' اسے تم بھول گئے ہو۔ اس کے بارے میں کیا کرو گے؟"

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں اسے بھول گیا ہوں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میرا دل کہتا ہے کہ جب مجھے احمد شجاع مل جائے گا تو اس دوسرے شخص کا سراغ بھی خود بخود ہی مل جائے گا۔"

"تو کیا اب تم زندگی بھر یہاں بیٹھے احمد شجاع کا انتظار کرتے رہو گے؟"

"تو کیا تمہارے خیال میں وہ اب میری زندگی میں یہاں نہیں آئے گا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو یہ پوچھ رہی تھی' تم کب تک اس کا انتظار کرو گے؟" وہ جلدی سے بولی۔

"صرف سپیدۂ سحر نمودار ہونے تک" میں نے جواب دیا "دن کی روشنی میں تمہیں تنہا چھوڑتے ہوئے میرے دل کو اتنا افسوس نہیں ہوگا" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "تمہارا کب اس سے شادی کا پروگرام تھا؟"

"جلدی۔ بس دو تین مسائل کا تصفیہ ہونا باقی ہے" وہ بولی۔

"ان مسائل میں کہیں اس کی پہلی بیوی اور جوان بچے وغیرہ تو شامل نہیں ہیں؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

وہ مجھے گھور کر رہ گئی' پھر کاٹ کھانے والے انداز میں بولی۔ "تمہیں اس سے مطلب؟"

"ایسے ہی۔۔۔ ذرا جنرل نالج کے لئے پوچھ رہا تھا" میں نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں ذرا یہ برتن دھولوں" وہ ٹرے اٹھا کر کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے کچن کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ شاید برتنوں کو نئے ہوئے چھوڑنا اس کی عادت نہیں تھی۔ یا پھر اپنے اضطراب کو چھپانے کے لئے اس وقت وہ کوئی مصروفیت ڈھونڈ رہی تھی لیکن جس محبت اور انہماک سے وہ برتن دھو رہی تھی اس سے اس کی فطرت کے کسی اور ہی پہلو کا پتا چلتا تھا۔

"لگتا ہے گھر بسانے کی بہت آرزو تھی تمہیں" میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔

"تم پر یہ انکشاف کیسے ہوگیا؟" وہ جارحانہ لہجے میں بولی۔ حالاں کہ میں دیکھ چکا تھا' میری بات سن کر اس کے ہاتھ ایک ثانئے کے لئے لرز کر رہ گئے تھے' جیسے کسی نے دل کی گہرائیوں میں مدفون درد کے تار چھیڑ دئے ہوں۔

"ویسے ہی۔۔۔ تمہارا برتن دھونے کا انداز دیکھ کر احساس ہوا۔"

"بہت تجربہ ہے اس چھوٹی سے عمر میں۔ کتنی شادیاں کی ہیں اب تک؟" اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ پہلی بار اس کے لہجے میں تناؤ کچھ کم محسوس ہوا۔ اس نے مجھے یوں چھوٹی عمر کا قرار دیا تھا جیسے خود کوئی بزرگ خاتون ہو حالاں کہ وہ زیادہ سے زیادہ میری ہی ہم عمر ہو سکتی تھی۔

"ابھی ایک ہی کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی' اور تم اس طرح پوچھ رہی ہو جیسے یہ بھی درخت سے ٹہنیاں توڑنے کے مترادف ہے۔ کہ اب تک کتنی توڑ چکے ہو۔"

"بعض لوگوں کے لئے یہ اس سے بھی آسان کام ہوتا ہے" وہ برتنوں کو سکھا کر ایک کیبنٹ میں رکھتے ہوئے بولی۔

"مثلاً احمد شجاع۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تم ہر بات پر اس کو کیوں بیچ میں کھینچ لاتے ہو؟" وہ پھر چڑ گئی۔

"آج وہ میرے ذہن پر سوار ہوگیا ہے۔ میں اپنی بدذوقی پر معذرت خواہ ہوں کہ ذہن پر سوار ہوا بھی تو کون۔۔۔"

اس پر وہ کچھ نہیں بولی۔ میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ "بیوک میں تھا۔ کھاتا پیتا آدمی ہوگا؟"

"طے کا تو خود ہی پوچھ لینا۔ میں اب تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔ میں پہلے ہی پریشان ہوں۔ اوپر سے تم میرا دماغ چاٹ گئے ہو" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

وہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ اسی ٹیلیفون سیٹ کی طرف لپکی جو ڈرائنگ روم میں رکھا ہوا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس کا انداز کچھ ایسا بے تابانہ تھا جیسے اسے بہت دیر سے فون کال کا انتظار رہا ہو۔ ریسیور اٹھا کر اس نے صرف "یس" کہا اور دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ میں نے اس کے چہرے پر کوئی تاثر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے اس میں ناکامی ہوئی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سپاٹ تھا۔ تقریباً ایک منٹ بعد اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا وہ خیریت سے گھر پہنچ گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس نے واقعی عہد کر لیا تھا کہ اب میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے گی۔ وہ ایک بار پھر کمرے سے نکل آئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کچن کی طرف جائے گی لیکن وہ دائیں طرف مڑ کر یکدم بیڈ روم میں گھس گئی اور دروازہ اس نے مقفل کر لیا۔

میں نے بہ آوازِ بلند کہا "میں نے تو ابھی تک کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو تمہیں یوں اندر گھس کر دروازہ بند کرنے کی ضرورت پیش آئی۔"

"اب تو سپیدۂ سحر بھی نمودار ہوگیا ہے۔ خدا کے لئے اب تو چلے جاؤ" اس کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی "اس میں تمہاری بھلائی بھی ہے۔ میری بات مان لو۔ کبھی کبھی کسی اجنبی کا مشورہ بھی مان لیا کرتے ہیں۔"

میں نے ہال کے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ واقعی سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ میں چند لمحے وہیں تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ آخر کار میں فیصلے پر پہنچ گیا۔ اب بہت ہو چکی تھی۔ مجھے چلے ہی جانا چاہئے تھا۔ حسنہ کے لہجے میں کوئی بات تھی جس نے مجھے شرمندہ سا کر دیا تھا۔ ویسے بھی اب میں اس کی صورت اور لٹکا ہوا چہرہ دیکھ چکا تھا۔ مجھے کافی حد تک یقین تھا کہ وہ کہیں نہیں جا سکے گی۔

میں نے اسے خدا حافظ بھی نہیں کہا اور خاموشی سے باہر آگیا۔ خنک ہوا میرے چہرے سے ٹکرائی تو بڑی فرحت محسوس ہوئی۔ پرندوں کی چہکار بھی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ چوک میں اس کی فورڈ کھڑی تھی۔ گاڑی چھوٹی لیکن بیش قیمت تھی۔ میں نے اس کا نمبر ذہن نشین کر لیا اور اس کے عقب سے اپنی گاڑی نکال لی۔ وہ گیٹ بند کرنے بھی نہیں آئی۔ میں نے بھی کھلا ہی رہنے دیا۔

مین روڈ پر پہنچ کر میں ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا اور گاڑی کی رفتار بھی معمولی ہی تھی کہ کوئی سڑک کے عین بیچ میں آگیا اور زور زور سے دونوں ہاتھ ہلانے لگا' جیسے سخت مصیبت میں ہو۔ وہاں دو طرفہ سڑک کے درمیان گرین بیلٹ تیار کی جا رہی تھی۔ نئے لگائے گئے پودوں کے گرد اینٹوں کی چھوٹی چھوٹی' جالی دار حفاظتی

دیواریاں کھڑی کی گئی تھیں۔ ایسی ہی ایک چار دیواری کے پیچھے سے نکل کر وہ سامنے آیا تھا۔ صبح کا اجالا ابھی واضح نہیں تھا اس لئے میں نے ہیڈ لائٹس روشن رکھی تھیں۔ ان کی روشنی میں' میں نے اسے فوراً ہی پہچان لیا اور بے اختیار گہری سانس لے کر گاڑی روک لی۔ میں اس سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا تو بعید نہیں تھا کہ وہ کمبخت گاڑی کے نیچے ہی آجاتا۔ وہ اتنا ہی بوکھلایا ہوا نظر آرہا تھا۔

وہ وسیم احمد تھا۔

"تم یہاں کیسے پہنچ گئے احمق!" میں نے گاڑی ایک طرف لگانے کے بعد کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔

"میں تو چائنیز ریستوران سے ہی آپ کے تعاقب میں ہوں لیکن میری گاڑی شور بہت کرتی ہے اس لئے میں نے فاصلہ برقرار رکھا تھا۔۔۔" اس نے مسکین سی صورت بنا کر جواب دیا۔

میں ایک لمحے کے لئے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کیا وہ واقعی اتنا احمق تھا جتنا نظر آتا تھا؟ یا میں کچھ بے پروا ہوتا جا رہا تھا؟ وہ رات سے میرے تعاقب میں تھا اور مجھے علم نہیں تھا۔ میں نے دیکھا' دوسری طرف کی سڑک کے کنارے ایک دیوار کے قریب رنگ کی ایک فوکسی کھڑی تھی۔ یقیناً وہ اسی کی تھی۔

میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا "کیا ضرورت آن پڑی تھی تعاقب کی؟"

"پہلے تو میں میڈم ستارہ کا گھر دیکھنا چاہتا تھا" وہ قدرے گلے سے لہجے میں بولا "پھر اس امید پر باہر موجود رہا کہ شاید آپ نکلیں تو آپ کا موڈ خوشگوار ہو اور آپ مجھ پر ترس کھا لیں میرے مسئلے کا کوئی حل تجویز کر دیں۔ لیکن جب آپ میڈم کے ہاں سے نکلے تو مجھے آپ سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا یوں کہہ لیں کہ ہمت ہی نہیں پڑی۔ میں پھر آپ کے پیچھے لگ گیا۔ اتفاق سے جدھر آپ جا رہے تھے اُدھر سے ہی مجھے بھی گھر جانا تھا۔۔۔ لیکن آپ کے ساتھ تو راستے میں عجیب ہی چکر لگا۔ میں تو ڈر گیا۔ دور ہی سے چھپ کر دیکھتا رہا۔ جب اس بندر نما انسان نے آپ کو بندوق کا بٹ مار کر بے ہوش کیا۔۔۔"

"بندر نما انسان نے؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔ وہ چھوٹے سے قد کا تھا۔ لمبے لمبے بال تھے۔ حالاں کہ وہاں سے کافی دور چھپا ہوا تھا اور وہاں روشنی بھی کم تھی جب سے میں نے یہ عینک لگائی ہے' میری نظر بہت شاندار طریقے سے کام کرنے لگی ہے" اس نے عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے عقب میں گول گول آنکھیں گھمائیں "میں نے اس کی بندریاں سی دیکھیں ان سے یہی اندازہ ہوا کہ وہ بالکل بندر جیسا ہے۔ پھرتیلا تھا۔ بندر سے بھی زیادہ۔"

"تمہیں یقین ہے نا کہ اسی نے میرے سر پر بٹ مارا تھا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں۔ میں اندھیرے میں ایک دیوار سے چپکا کھڑا تھا اور سب کچھ دیکھ رہا تھا" وہ وثوق سے بولا۔

حسنہ میرے عین قریب تھی مگر اس کا کہنا تھا کہ وہ اس شخص کی جھلک دیکھ کر اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتی تھی۔ وہ اس کی صورت نہیں دیکھ سکی تھی۔ جب کہ اس احمق لڑکے نے دور سے اسے دیکھ کر اس کے بارے میں کام کی بات بتا دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ حسنہ اس بندر نما شخص کے بارے میں یقیناً کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی' جو اسے فن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ حسنہ کا اس فن سے کوئی تعلق تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔ اب وہ احمق مجھے اتنا برا نہیں لگ رہا تھا۔

"شاید پولیس کے آنے کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔ اس بندر نما شخص اور لڑکی نے مل کر جلدی سے آپ کو آپ کی گاڑی میں ڈالا۔۔۔"

"تم نے اچھی طرح دیکھا تھا کہ اس شخص نے اس کام میں لڑکی کا ہاتھ بٹایا تھا؟" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔

"جی ہاں۔ اور اس کے فوراً بعد وہ تو چھلاوے کی طرح معلوم نہیں کہاں غائب ہوگیا اور لڑکی آپ کی گاڑی ڈرائیو کر کے آپ کو لے کر چل دی" وسیم نے بتایا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ مجھے بے ہوشی کی حالت میں حسنہ تنہا گھسیٹ کر گاڑی میں نہیں ڈال سکتی تھی جبکہ میرے سوٹ یا جسم پر گھسیٹے جانے کے نشانات بھی نہیں تھے۔

وسیم بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میری روح فنا ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گا لیکن میں نے سوچا' لڑکی آپ کو پتا نہیں کہاں لے جا رہی ہے اس لئے میں آپ کے پیچھے لگا رہا۔ وہ ایک محفوظ جگہ پر رک گئی۔ کافی دیر بعد عقبی شیشے سے آپ کی بھی پرچھائیں دکھائی دی اور میں سمجھ گیا کہ آپ ہوش میں آگئے ہیں۔ تب میرے دل کو کچھ اطمینان ہوگیا۔ اس کے بعد میں آپ کے تعاقب میں یہاں تک آیا اور تب سے یہاں چھپا آپ کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔"

"میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں" میں نے گاڑی سے اتر کر یہ سوچتے ہوئے اس کی پیٹھ تھپکی کہ کبھی کبھی کھوٹا سکہ بھی کام آجاتا ہے "اب مجھے تمہارے بارے میں رائے بدلنی پڑے گی۔ میرا خیال ہے' تم اتنے احمق نہیں ہو جتنا میں تمہیں سمجھا تھا۔"

"کون کہتا ہے جی میں احمق ہوں؟" اس نے قدرے خفگی سے کہا "ابھی آپ کو میری فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ میں اس لئے کر رہا تھا کہ مجھے جاسوسی کا بڑا شوق ہے۔ میں تو ایک جاسوسی ناول بھی لکھ رہا ہوں۔ گیارہ سو صفحے لکھ چکا ہوں۔"

"گیارہ سو صفحے؟" میں نے حیرت سے کہا "اسے چھاپے گا کون؟"

"یہ تو میں بعد میں سوچوں گا۔ پہلے اسے مکمل تو کرلوں" وہ بے پروائی سے بولا "میں تو بننا بھی پرائیویٹ سراغ رساں ہی چاہتا تھا لیکن ابا نے مجھے نائٹ سپروائزر بنا دیا۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ میں پرائیویٹ سراغ رساں بننا چاہتا ہوں۔ انہوں نے اپنے ہی کارخانے کی بنی ہوئی چپل اٹھا کر مجھے رسید کی اور کہنے لگے 'مار مار کر کھال ادھیڑ دوں گا' ساری سراغ رسانی اور جاسوسی نکال دوں گا۔ مجھے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر میرے جاسوسی ناول کا مسودہ ان کے ہاتھ لگ گیا تو کہیں پھاڑ نہ دیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ" میں نے ملائمت سے کہا "ابھی جب میں اس بنگلے کے اندر تھا تو تم نے کسی کو باہر آتے یا آس پاس منڈلاتے تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا' پھر شکوہ آمیز لہجے میں بولا۔ "لیکن آپ نے واپس آنے میں بہت دیر لگادی سر! میں تو اب بالکل ہی مار گیا۔ میں تو آپ سے مسئلے کا حل پوچھنے کی فکر میں تھا لیکن فی الحال تو ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ میں گھر جا کر ابا کو کیا جواب دوں گا؟"

"کس سلسلے میں؟" میں نے جاننا چاہا۔

"کہ میں تمام رات کہاں غائب رہا۔ وہ تو میری چمڑی ادھیڑ دیں گے" وہ خوف زدہ سے لہجے میں بولا۔

"تاکہ تم بڑی مصیبت میں پھنس گئے تھے اور یہی بڑا غنیمت ہے کہ تم گھر واپس پہنچ گئے" میں نے کہا۔

"وہ اس قسم کی باتیں سنتے کہاں ہیں۔ یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے' بلکہ وہ خود سب سے بڑی مصیبت ہیں" وہ منہ بنا کر بولا۔

"خیر... اب تم اتنے بڑے ہو گئے ہو۔ تمہیں مصیبتوں کا سامنا کرنے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کرنی چاہئے۔ فی الحال تو تم گھر جاؤ" میں نے اس کا کندھا تھپکا۔

وہ سر کھجاتے ہوئے بولا "اور وہ میرا مسئلہ...؟ میرا مستقبل' میری نوکری داؤ پر لگی ہوئی ہے۔"

"میں کہہ چکا ہوں نا' کہ اس کے بارے میں اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ ایسے اہم اور سنگین مسائل کے بارے میں سرِراہ کھڑے ہو کر کیا بات ہو سکتی ہے" میں نے ملائمت سے کہا۔

"اچھا" وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے قدرے مایوسی سے بولا۔ اس کے لئے ہیجان خیزی اور ایڈونچر کی مختصر سی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ اب اسے واپس گھر کی طرف جانا تھا جہاں بوریت تھی' اولاد کے مزاج سے ناآشنا اور سخت دل باپ تھا اور تشنۂ تعبیر خواب تھے۔

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا اور وہ گاڑی کی طرف جاتے جاتے پلٹ آیا۔ اپنے مخصوص احمقانہ انداز میں باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا "ویسے لونڈیا یہ بھی خوبصورت تھی جو آپ کو اٹھا کر لے گئی تھی۔ کافی دیر رہے آپ اس کے بنگلے میں۔ کیا کہہ رہی تھی؟"

"کہہ رہی تھی وسیم بھائی سے میرا سلام کہئے گا۔" میں نے جواب دیا۔

اس کی ناک سکڑ گئی اور باچھیں مزید پھیل گئیں۔ مجھے اس کے جسم کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے لگے۔ حلق سے عجیب سی آواز برآمد ہوئی۔ بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی گاڑی پٹرول ختم ہونے کی وجہ سے جھٹکے لے لے کر رکنے لگی ہو۔ دراصل وہ شرمیلے انداز میں ہنس رہا تھا۔

"مذاق مت کریں چوہدری صاحب! سچی سچی بتائیں" وہ اصرار کر بولا۔

"دیکھو... میری تمہیں نصیحت ہے کہ اس لڑکی کو بہن بنانے کے چکر میں مت پڑنا اور نہ ہی اس کی سراغ رسی کی کوشش کرنا۔ یہ خطرناک معاملات ہیں۔ کہیں اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈال لینا۔ سمجھ گئے نا؟"

"سمجھ گیا" اس نے اپنی پھیلی ہوئی باچھیں سکیڑ لیں۔ پھر دونوں اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ اگلے چوراہے پر دونوں الگ الگ سمتوں میں مڑ گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد میں نے گاڑی کی رفتار کم کرتے کرتے آخر کار اسے ایک جگہ روک لیا۔ میرے ذہن میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔

مجھے اس لڑکی کو ایک بار پھر کریدنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ مشکوک تو وہ میری نظر میں پہلے ہی تھی۔ اس کی کسی بات میں نے یقین نہیں کیا تھا لیکن وسیم کے بیان کے بعد تو اسے تن بدن بھی اس کا کوئی تعلق محسوس ہونے لگا تھا اور یوں وہ خطرناک تک مشکوک ہو گئی تھی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے گاڑی واپس موڑ لی۔

جب میں دوبارہ اس بنگلے پر پہنچا تو اس پر بڑا سا وہی تالا جھول رہا تھا اور صبح کی ملگجی روشنی میں در و دیوار گہرے سکوت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی سے اتر کر ایک لمحے سوچا' ادھر ادھر دیکھا پھر چار دیواری پر چڑھ کر اندر چھلانگ لگا دی۔ میں نے نہایت احتیاط سے پنجوں کے بل چھلانگ لگائی تھی۔ اس کے باوجود سر میں ایسی دھمک ہوئی کہ ایک بار تو میرا دل چاہا کہ دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہیں بیٹھ جاؤں لیکن میں نے صرف ایک لمحے کے لئے پول کے ستون کا سہارا لینے پر اکتفا کیا۔

پورچ میں حسنہ... یا جو بھی اس کا اصل نام تھا... کی گاڑی بھی اب موجود نہیں تھی۔ اندرونی دروازہ بھی مقفل تھا۔ میں نے عمارت کے چاروں طرف چکر لگایا۔ تمام کھڑکیاں دروازے مضبوطی سے بند تھے۔ ویسے بھی میری حسیات بتا رہی تھیں کہ وہ اب یہاں موجود نہیں تھی۔ شاید میرے جاتے ہی نکل چکی تھی۔ بہت چالاک

اس نے... میں نے کوئی تالا کھولنے کی کوشش نہیں کی چھلانگ کر واپس باہر آگیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ حسنہ اب اس گھر میں نہیں ملے گی۔ ممکن تھا کہ یہ اس کا گھر ہی لیکن جس انداز میں وہ گھر میں چل پھر رہی تھی اور چیزیں استعمال کر رہی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم از کم سے خوب اچھی طرح مانوس ضرور تھی۔

گھر واپس آگیا اور اپنے بیڈ روم میں پہنچتے ہی میں نے ٹیلی فونک ریکارڈنگ مشین کا سوئچ آن کیا۔ ٹونی کا ریکارڈ شدہ پیغام تھا۔

میں نے اس سیاہ بیوک کا تعاقب کیا۔ وہ شخص یا تو حد درجہ بدحواس تھا یا پھر نشے میں تھا۔ بہت خطرناک ڈرائیونگ کی۔ وہ شیریاؤ برج کی طرف مڑا تو میں اس کے بالکل قریب تھا لیکن شاید آپ کو معلوم ہو برج پر ایک جگہ حفاظتی جنگلا ٹوٹا ہوا ہے۔ چند دن پہلے ایک ٹرک کی اس جنگلے سے بڑی ٹکر ہوئی تھی تاہم ٹرک نیچے گرنے سے بچ گیا تھا۔ جنگلے کی مرمت نہیں ہو سکی۔ وہیں شاید سڑک پر کچھ آئل بھی پھیلا تھا ایک تو وہ شخص بہت خراب ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ مجھے اس کو نکلنے کی کوشش میں ہر حربہ آزما رہا تھا۔ دوسرے اس کی کار پر آئل کی چمک بھی نہیں دیکھی۔ وہاں شاید اس نے میری گاڑی سے ٹکرانی چاہی تھی لیکن اسی لمحے اس کی گاڑی بری طرح پھسلتی ہوئی ٹوٹے جنگلے کو توڑتی ہوئی نیچے ریلوے لائن پر جا گری۔ گاڑی نے کئی قلابازیاں کھائی تھیں۔ فوراً ہی اس میں آگ لگ گئی۔ ریلوے کے آس پاس ہی غیر قانونی جھگیوں پر مشتمل جو بستی ہے وہاں کے لوگ آن پہنچے۔ آگ بھی بجھائی گئی لیکن وہ شخص مر چکا تھا۔ ابھی کافی خراب حالت میں ملی۔ اسے سرکاری اسپتال میں لے گیا ہے۔ دن چڑھے تک آپ کو مزید معلومات فراہم کروں گا۔"

ان کے علاوہ ANSWE RING اور ریکارڈنگ مشین میں کچھ موجود نہیں تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر سوئچ آف کر دیا اور ڈھیر ہو گیا۔

بمشکل ایک گھنٹا سویا تھا جب میرے مخصوص ٹیلیفون کی گھنٹی نے مجھے جگا دیا۔ گھڑی دیکھتے ہوئے میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف ٹونی تھا۔ میرا احوال جاننے کے بعد وہ بولا "سر! مقتول کا نام احمد شجاع تھا اور وہ ریٹائرڈ ڈی آئی جی تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے خود ریٹائرمنٹ لے لی تھی حالاں کہ اس کی سروس کے چار پانچ سال باقی تھے۔ حادثاتی موت تھی۔ لاش اس کے لواحقین کے حوالے کر دی گئی ہے۔"

"ڈی آئی جی...؟" میں نے قدرے حیرت سے سوچا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا "تمہارے پیغام میں اور تمہاری تازہ رپورٹ میں بھی ایک چیز کا کوئی ذکر نہیں ہے جس کے بارے میں' میں کافی متجسس ہوں۔ تمہیں معلوم ہے احمد شجاع کے پاس سیاہ رنگ کا لوہے یا کسی اور دھات کا ایک باکس سا موجود تھا؟"

"نہیں سر! میں نہیں دیکھ سکا تھا" ٹونی نے جواب دیا "میں جب موڑ کاٹ کر اس گلی میں داخل ہوا اس وقت وہ گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہو رہا تھا اور آپ گر چکے تھے۔ تاہم میں نے دیکھ لیا تھا کہ آپ زیادہ زخمی نہیں ہیں۔ اس لئے میں نے آپ کے پاس رکنے کے بجائے اس کا تعاقب کرنے کو ترجیح دی۔"

"وہ تو خیر تم نے اچھا کیا" میں نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔

طلسم زادی

★------ ایم - اے راحت

روشنی کی دُنیا سے دُور پُراسرار دُنیا کی کہانی جہاں مافوق الفطرت زندگی کا دور دورہ تھا۔ دو دُشمنوں کی عجیب داستان جنہوں نے جب ایک دُوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ تو ایک ناقابلِ یقین کہانی نے جنم لیا۔

ایم - اے راحت کا ایک شاہکار ناول

قیمت: حصّہ اول -/150

قیمت: حصّہ دوئم -/150

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

"لیکن حادثے کے بعد تم نے اس قسم کی کوئی چیز اس گاڑی سے برآمد ہوتے تو نہیں دیکھی؟"

"نہیں سر!" ٹونی نے جواب دیا "حادثے کے فوراً بعد لوگوں نے آگ بجھانے اور گاڑی ٹھنڈی ہونے کے بعد گاڑی کی تلاشی لی تھی کیوں کہ ایک تو انہیں ایسی کوئی چیز نہیں مل رہی تھی جس سے اس شخص کی شناخت میں مدد مل سکتی۔ دوسرے وہ نہیں چاہتے تھے کہ بے چارے کی کوئی قیمتی چیز تباہ شدہ گاڑی میں رہ جائے اور بعد میں کوئی پار کرلے۔ وہ اس کی ہر چیز لاش کے ساتھ ہی اسپتال پہنچانا چاہتے تھے تاکہ جب اس کے لواحقین لاش لینے آئیں تو چیزیں بھی وصول کرلیں۔ چھوٹی موٹی چیزیں تباہ شدہ سی حالت میں گاڑی سے برآمد ہوئیں لیکن اس قسم کا کوئی باکس یا بریف کیس وغیرہ نہیں نکلا تھا۔ میں نے خود تلاشی لینے والوں پر نظر رکھی تھی۔"

"اور وہ شخص تعاقب کے دوران بھی تمہاری نظر سے قطعاً اوجھل نہیں ہوا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"صرف ایک موڑ پر چند سیکنڈ کے لئے اس کی گاڑی میری نظر سے اوجھل رہی تھی۔ وہ پہلے موڑ عبور کرگیا تھا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس نے راستے میں کہیں کوئی چیز پھینکی ہوگی" ٹونی بولا۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ جو چیز اس نے جان پر کھیل کر اپنے قبضے میں رکھی تھی' اسے وہ کیسے پھینک سکتا تھا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ وہ باکس پھر کہاں گیا؟

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "مجھے ذرا اس کا ایڈریس لکھواؤ۔ میں خود جاکر دیکھوں گا۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہوجائے۔"

ٹونی نے ایڈریس مجھے لکھوا دیا۔ وہ کینٹ کے علاقے کا ایڈریس تھا۔ میں نے اس خیال سے ایڈریس لے لیا تھا کہ شاید بعد میں کار کے ملبے سے وہ دھات کا باکس برآمد ہوگیا ہو اور احمد شجاع کے گھر پہنچا دیا گیا ہو' شاید اس کے گھر کے کسی فرد سے مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوسکے۔

دل میں یہی امید لے کر میں سوئم والے دن احمد شجاع کے ہاں جا پہنچا۔ میرے خیال میں یہ ایک ایسا موقع تھا جب متوفی سے اپنی تعلق داری کے بارے میں کوئی بھی دعویٰ کیا جاسکتا تھا اور اس کے اہلِ خانہ کے زیادہ سے زیادہ قریب جانے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔

احمد شجاع کے گھر پہنچ کر مجھے خاصی حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ گھر کیا تھا' ایک اچھا بھلا قلعہ تھا۔ کینٹ جیسے مہنگے علاقے میں اتنا طویل و عریض اور عالیشان مکان ہونا کوئی معنی رکھتا تھا۔ گلی میں دونوں طرف قیمتی کاروں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈی آئی جی بڑی چیز ہوتا ہے۔ سرکار کی طرف سے جائز ذرائع سے بھی اسے بہت کچھ ملتا ہے لیکن

ایک نوجوان کی سنسنی خیز لہو رنگ
خودنوشت

دہشت گرد

سلیم فار

○ وہ محب وطن ہونے کے باو
دہشت گرد کہلاتا تھا۔
○ وقت کی راسیں تھامتے اس
ہاتھ لہولہان ہوگئے تھے۔
○ "سچی کہانیاں" کا ایک مق
ترین ایڈونچر سلسلہ چار حصوں
شائع ہو رہا ہے۔

ناشر: مکتبہ افریقی سرکلر روڈ اردو بازار لاہو

فون: 7224665

ں کوٹھی کی شان و شوکت میری آنکھ میں کچھ کھٹکی تھی۔ رودیوار دیکھ کر ہی اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کس آراستہ و پیراستہ ہوگی۔ دیواروں سے کئی کئی ائرکنڈیشنر ہے تھے۔ طویل و عریض پورچ میں پانچ بیش قیمت کاریں یب کھڑی تھی۔ یہ کاریں اور جیپ اس کیڈلک کے علاوہ مارتے میں تباہ ہوچکی تھی۔ باہر کھڑی کاریں تو مہمانوں کی ا پورچ میں کھڑی ہوئی کاریں یقیناً اہلِ خانہ ہی کی تھیں۔ ا پر شامیانے لگے ہوئے تھے۔ بوفے ٹیبلز سجی ہوئی یوں باوردی بیرے مستعدی سے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ تے جارہے تھے۔ دو تین نوجوانوں سے اظہار افسوس رہے تھے اور کھا پی کر رخصت ہوتے جارہے تھے۔ فضا کھانوں اور ان کے لوازمات کی خوشبو میں پھیلی ہوئی وڑی تھوڑی دیر بعد ایک مشہور کیٹرنگ سروس کی گاڑی ور کھانے پینے کی چیزیں پہنچا کر چلی جاتی تھی۔

ان بھی بس اظہارِ افسوس کرنے تک سنجیدہ اور بوجھل سی ے نظر آتے لیکن جونہی کھانے کی میز پر پہنچتے ہنسی مذاق جاتا تھا۔ سوئم کیا تھا' اچھا بھلا شادی کا سا سماں دکھائی تھا۔ عجیب زمانہ آگیا تھا۔ شادی اور مرگ میں کوئی خاص ظر نہیں آتا تھا۔

تینوں نوجوان یقیناً احمد شجاع کے بیٹے تھے جن سے لوگ رہے تھے۔ ان کی عمروں میں تھوڑا تھوڑا ہی فرق تھا۔ ا بڑی شباہت تھی اور ان تینوں کی شخصیتوں میں احمد شجاع ی جھلک تھی۔ احمد شجاع کو میں نے ملگجے اندھیرے میں چند لئے دیکھا تھا اور وہ چند لمحے بھی زندگی اور موت کی کشمکش رت تھے لیکن اس کا سراپا میری نگاہوں میں محفوظ ہوگیا ت مدت بعد کوئی شخص مجھے اس طرح زک پہنچا کر بھاگنے یاب ہوا تھا۔ اگر وہ مرنہ گیا ہوتا تو میرے دل میں خواہ مخواہ ے میں خلش سی بیٹھ جاتی۔

ں فوری طور پر ان نوجوانوں کے پاس تعزیت کرنے نہیں ایک طرف کو بیٹھ کر ایک بیرے سے کوک لے کر دھیرے چسکیاں لینے لگا۔ میں یونہی ذرا گرد و پیش کا جائزہ لے رہا یہ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا کیونکہ اسی دوران مجھے وہاں ں آئی شریف سیال نظر آگیا۔

ں سرسری نظر سے دیکھ کر تو شاید اسے پہچان ہی نہ پاتا۔ وہ اس میں تھا جبکہ میں نے اسے جتنی بار بھی دیکھا تھا' وردی الدکھا تھا۔ سادہ لباس میں تو وہ بہت ہی مختلف نظر آرہا تھا۔ ا والے عام طور پر سادہ لباس میں بھی پہچانے جاتے ہیں کہ وہ ا والے ہیں۔ لیکن شریف سیال پر تو کوئی شبہ تک نہیں تا تھا کہ وہ پولیس والا ہے۔ اسے گاما حلوائی نخانا بنایا یا شیدا لائز میکہ کچھ بھی سمجھا جاسکتا تھا' پولیس والا نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں بازو پھیلا کر میری طرف بڑھا اور چکا۔

"اوئے بلے بلے..... ایتھے تے اپنے چوہدری صاحب وی آئے ہوئے نیں....."

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ زیادہ لوگ میری طرف متوجہ ہوں۔ میں حتی الامکان غیر نمایاں نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک طرف کو دبکا بیٹھا تھا۔ اس کے باوجود کئی افراد نے بار بار مڑ کر میری طرف دیکھا۔ شریف سیال تو اپنی جھنکے دار چکار سے چھوٹا موٹا مجمع لگا سکتا تھا۔

میرا اشارہ پاکر وہ میرے برابر والی کرسی پر آبیٹھا۔ میں نے طویل سانس لے کر نیچی آواز میں کہا۔ "تو تم بھی احمد شجاع صاحب کو جانتے تھے۔" میں نے اپنے لہجے کو سوالیہ بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"میرے تو وہ ڈیپارٹمنٹ کے آدمی تھے چوہدری صاحب!" وہ قدرے فخریہ سے لہجے میں بولا "تھے تو وہ بہت بڑے افسر لیکن مجھے ڈائریکٹ جانتے تھے۔ میں اس وقت ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ بڑے دل والے آدمی تھے۔ غرور اور افسرانہ اکڑ بالکل نہیں تھی ان میں۔ کئی بار انہوں نے چھوٹی موٹی باتوں پر انعام سے نوازا۔ محکمے کی طرف سے نہیں' بلکہ اپنی جیبِ خاص سے۔" اس کے چہرے پر عجیب سی چمک تھی۔ بے شک اس کے لہجے میں عقیدت اور ممنونیت تھی لیکن اس کی تہ میں کوئی اور تاثر بھی چھپا ہوا تھا جسے میں کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "آپ کے کب واقف بنے تھے؟"

شریف سیال ایسا آدمی تھا جس سے کم از کم مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی اور میں اسے بلا تکلف کرید بھی سکتا تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا "میری ان سے کوئی خاص شناسائی نہیں تھی۔ میں پہلی بار ان کے گھر آیا ہوں۔ کیا مرحوم خاندانی طور پر خاصے کھاتے پیتے آدمی تھے؟ رہن سہن بڑا ٹھاٹ دار دکھائی دے رہا ہے۔"

وہ عجیب سے انداز میں بے آواز طریقے سے ہنسا اور ادھر اُدھر دیکھ کر گردن میری طرف جھکاتے ہوئے نیچی آواز میں بولا۔ "کسی کے سوئم پر اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں' اچھا نہیں لگتا۔ لیکن آپ میرے زیادہ مربی و محسن ہیں' اب آپ سے کیا چھپانا۔ آپ تو ان کا یہ ایک ہی گھر دیکھ کر شاید اندر ہی اندر کچھ حیران و پریشان سے ہورہے ہیں۔ ان کی جائیداد کا تو کچھ پتا ہی نہیں ہے' کہاں کہاں کس کس طرح کی کوٹھیاں اور بنگلے بکھرے ہوئے ہیں....." وہ ایک بار پھر گویا سائیلنسر لگا کر ہنسنے لگا۔

ہنسی تھمی تو وہ سرگوشی میں بولا۔ "شجاع صاحب بڑے دھڑلے

کے آدمی تھے۔ بہادری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یعنی رشوت کھانے کے معاملے میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ بے خوف و خطر کھاتے تھے اور بے حساب کھاتے تھے۔ ظاہر ہے ان کا عہدہ بھی کچھ ایسا تھا۔ سیکڑوں اور ہزاروں کی باتیں تو ان سے ہو نہیں سکتی تھیں۔ لمبے ہی معاملات ان کے پاس جاکر پہنچتے تھے۔ لاکھوں کے چکر ہوتے تھے۔ چھوٹے موٹے نذرانوں والے معاملے تو نیچے ہی نیچے طے ہوجاتے ہیں نا۔ لوگ حسب مراتب اپنا اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ شجاع صاحب مہینے میں دو تین شکار کرلیتے تھے۔ باقی دن آرام سے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر ڈکاریں لیتے گزر جاتے تھے۔"

"کیا نوکری کے دوران بھی موصوف اسی شان و شوکت سے رہتے تھے؟" میں نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"زیادہ شان و شوکت تو ریٹائرمنٹ کے بعد آئی تھی۔ بہرحال دورِ ملازمت میں بھی کچھ کم نہیں تھی۔ لڑکوں کو تو اسی زمانے میں کام سے لگا دیا تھا۔ کارخانے لگوا دیئے تھے ہر ایک کو الگ الگ۔"

"اور کوئی انہیں نہیں پوچھتا تھا کہ یہ کیا سلسلہ ہے؟ کہاں سے آرہی ہے اتنی دولت؟" میں نے پوچھا' حالانکہ اس سوال کے تمام ممکنہ جوابات مجھے معلوم تھے۔

"پوچھنے والوں کے گھر بھی بڑے بڑے نذرانے' تحفے تحائف جاتے رہتے ہیں جی۔ ایک بار جب میں کسی گمنام شخص کی طرف سے تحفے میں آئے ہوئے دو لاکھ روپے کا بریف کیس لے کر سخت گھبرایا ہوا آپ کے پاس پہنچا تھا تو آپ ہی نے تو مجھے بتایا تھا اور تسلیاں دی تھیں کہ لوگ کیا کچھ کررہے ہیں لیکن کوئی انہیں کچھ نہیں کہہ رہا۔ مجھے لگتا ہے آپ کو ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن آپ یونہی سیدھے اور معصوم بن کر سب کچھ پوچھتے رہتے ہیں۔" وہ بغور میری طرف دیکھ کر گردن ہلاتے ہوئے مسکرایا۔

"ہاں۔ مجھے معلوم تو بہت کچھ ہوتا ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

"پھر بھی..... پوچھتے رہنے سے کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہی رہتی ہے۔ کوئی نہ کوئی مختلف نکتہ سامنے آتا ہی رہتا ہے۔ تم بتاتے رہو۔ بتانے میں کیا حرج ہے۔"

جی ہاں۔ آپ تو اپنے ہی آدمی ہیں' آپ سے تو ساری گپ شپ لگتی رہتی ہے" وہ مطمئن لہجے میں بولا۔ "آپ کو تو معلوم ہی ہے' یہ جو کھانے پینے کا سلسلہ ہے یہ بھی اوپر سے نیچے تک ایک مربوط نظام ہے۔ میں تو ایک ڈرپوک آدمی ہوں' اس نظام میں پوری طرح داخل نہیں ہوسکا۔ لیکن ایک مرتبہ آدمی اس میں گھس جائے تو اس بڑی سی مشین کا ایک پرزہ بن جاتا ہے۔ آرام سے اپنا کام بھی کرتا رہتا ہے۔ اور اس کی مدد سے دوسروں کا کام چلتا رہتا ہے۔"

اندر سے قرآن خوانی کی آواز آرہی تھی۔ مدھم سی یہ اجتماعی آواز کبھی بالکل معدوم ہوجاتی تھی۔ مرحوم کو ایصال ثواب کے لئے قرآن ختم کئے جارہے تھے۔ پورچ کی طرف سے خواتین رفت جاری تھی۔ وہ اندر کہیں جارہی تھیں۔ مردوں میں جنہیں قرآن خوانی میں شرکت کرنا تھی' وہ ڈرائنگ روم جاتے تھے۔

شریف سیال ایک نظر پورچ کی طرف دیکھ کر مدھم بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "شجاع صاحب تو بڑے ا انہیں تو ویسے بھی چھوٹے موٹے آدمی تو پوچھ ہی نہیں سکتے بڑے لوگوں سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ بہت بڑ لوگوں کو ان سے.... بڑے بڑے کام پڑتے رہتے تھے سب سے بڑی بات یہ تھی چوہدری صاحب۔!" اس ٹھنڈی سانس لی "کہ شجاع صاحب سے ویسے بھی کوئی کچھ نہیں سکتا تھا۔ قانونی طور پر ان کے سارے کام پکے تھے۔ پر ایسے افسروں کی دو چار ایکڑ بھی خاندانی زمین ہوتی ہے تو زمیندار مشہور ہوتے ہیں۔ اور اگر نہیں بھی ہوتی تو وہ ا دیتے ہیں۔ خواہ انہوں نے جاکر ان زمینوں کی شکل بھی نہ لیکن حیرت انگیز طور پر وہ انہیں بڑی آمدنی دیتی رہتی ہے۔ سارے ٹھاٹ باٹ زمینداری کے مرہونِ منت نظر آ۔ شجاع صاحب کا بھی یہی سلسلہ تھا۔ پہلے زمینداری کی آڑ رہی۔ پھر اس کی "آمدنی" اور کچھ قرضے وغیرہ ملا کر کار لئے۔ آپ کو پتا ہی ہے ایک بار آدمی کی لائن سیدھی ہوجا چل سو چل۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

"لوگ بڑی تعریف کرتے ہیں کہ شجاع صاحب نے کی' اپنے وسائل کو بڑے صحیح طریقے سے استعمال کیا واقفانِ حال جانتے ہیں کہ سارا پیسے کا کھیل ہے۔ اور سے آیا تھا' یہ بھی جانتے ہیں۔ لیکن چوہدری صاحب! ر روپیہ ہی ہوتا ہے۔ اس کی کوئی قسم' کوئی ذات کوئی ہوتی۔ روپے کو سلام ہوتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں' ان کے بعد بھی کیسے کیسے لوگ ان کے روپے کو سلام کرنے آ ہیں۔" اس نے آنکھوں سے گرد و پیش کی طرف اشارہ کیا۔

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا اور سر جھٹک کر وہ اپنے کا سے تھپتھپاتے ہوئے بولا "توبہ۔ توبہ! کتنے کمینے ہوتے لوگ۔ کسی کے سوئم پر کیسی باتیں کررہے ہیں۔ درفنطنے

"کیا کریں' اتفاق سے موقع ہی اب میسر آیا ہے"

"اس سے پہلے بھلا ہم احمد شجاع کے بارے میں کب اور کرسکتے تھے؟"

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ اب ہمیں مرحوم کی تھوڑی سی تعریف بھی کرلینی چاہئے کوئی شک نہیں کہ مرحوم تھے بہت اچھے آدمی۔ ان کی خا ہمیں کیا مطلب؟ ہمیں تو ان خامیوں سے کوئی نقصان

میں تو ان کے سامنے ایک بہت ہی ادنیٰ آدمی تھا لیکن مجھے نے ہمیشہ کوئی نہ کوئی فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔ انعام و م سے نوازتے رہے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ہم ایک ہی کے تھے۔ میں جب چھوٹا تھا تب سے انہیں جانتا تھا۔ ے باپ دادا ان کے باپ دادا کو جانتے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ع میں ان کی کوئی زمین وغیرہ نہیں تھی۔ اور وہ کوئی ایسے ال آدمی نہیں تھے۔ ان کا خاندان ہمارے خاندان سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ شاید وہ یہی چاہتے ہوں کہ میں کسی سے ان خاندانی پس منظر کا ذکر نہ کروں۔"

وہ سیدھا آدمی تھا لیکن سمجھتا بہرحال سب کچھ تھا۔ میں نے دور کھڑے ہوئے تین ہم شکل سے نوجوانوں کی طرف اشارہ تے ہوئے تصدیق چاہی۔ "یہ تینوں شجاع صاحب کے بیٹے ہیں

"جی ہاں۔ آپ ان سے نہیں ملے؟" شریف سیال بولا۔ ے لڑکے ہیں۔ لڑکپن میں ہی صنعتکار بن گئے ہیں۔ سرکاری ں سے بعض لوگوں کی توسات خلیلیں سنور جاتی ہیں۔ اسی لئے تو ے ہاں سرکاری نوکریوں کے لئے اتنی کھینچا تانی' بلکہ قتل و خون تے ہیں۔ ہمارا تو سیاسی نظام بھی سرکاری نوکریوں کے گرد گھوم ہے۔ ہر پارٹی اپنے جاں نثاروں سے وعدے کرتی ہے کہ وہ ار میں آتے ہی انہیں نوکریوں سے نوازے گی۔ اور یہ بات گویا خانے طے شدہ ہوتی ہے کہ نوکری سے مراد صرف نوکری ہے۔ بلکہ "سرکاری نوکری" ہوگی۔ اور وہ بھی کچھ اس قسم کی ی جس میں تنخواہ اگر ہزار روپے ماہوار ہوگی تو اوپر کی آمدنی ہزار روپے روزانہ۔ اسی لئے تو سر دھڑ کی بازی لگی رہتی ہے۔ تو حیران ہوں کہ اگر ہماری ہوس کا یہی عالم رہا تو ہمارا انجام کیا ا؟"

"اگر ہم شترمرغ بن کر ریت میں منہ نہ چھپائیں تو انجام کا ازہ تو کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا "خیر۔ یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ ذرا مرحوم کے لڑکوں سے تو مل لوں۔ میں نے تو ابھی تک تعزیت انہیں کی۔"

"آپ پسند کریں تو میں ان سے آپ کا تعارف کرا دیتا ہوں۔ ردار ہیں اپنے' بڑی عزت کرتے ہیں۔" شریف سیال اٹھتے ئے بولا۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کے کندھے پر رکھ کر اسے بٹھاتے ہوئے کہا "میں خود ہی مل لوں گا۔"

ان تینوں نوجوانوں کے پاس پہنچ کر میں نے اپنا تعارف کرایا شجاع صاحب کی ناگہانی موت پر افسوس کا اظہار کرنے لگا۔ ایسے شخص کی موت پر اظہارِ افسوس مجھے عجیب لگ رہا تھا ہانے بغیر کسی دشمنی کے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر ہلاکت کوشش میں کامیاب ہوگیا ہوتا تو آج اس کی جگہ میرا سوئم ہو رہا ہوتا۔ تینوں نوجوان کچھ مغموم اور کچھ تشکر بھرے انداز میں سر ہلاتے رہے۔ حتیٰ کہ کچھ دیر میں نے مرحوم کی اعلیٰ صفات پر بھی تبادلۂ خیال کیا۔ وہ اعلیٰ صفات جن کا مجھے ذرا بھی علم نہیں تھا۔

جب خاصی دیر اس طرح کی باتیں ہوچکیں تو چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "شجاع صاحب سے میری شناسائی زیادہ پرانی نہیں' اس لئے آپ لوگوں سے بھی ملاقات کا موقع نہیں آسکا تھا۔ لیکن کاروباری طور پر ہمارا تعلق بہت مضبوط ہورہا تھا اور مستقبل قریب میں اس کے مزید مضبوط ہونے کے امکانات تھے۔ ان کی بے وقت موت نے جہاں وہ سلسلہ خطرے میں ڈال دیا' وہیں ایک الجھن بھی کھڑی کردی۔ لیکن چلئے چھوڑیئے۔ اس موقع پر اس قسم کی باتیں کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔"

بڑا لڑکا جس کا نام سرور تھا' قدرے چونکتے ہوئے بولا۔ "نہیں' نہیں۔ آپ تکلف نہ کریں۔ اطمینان سے باتیں کریں۔ ویسے تو ڈیڈی کے سارے کاروباری معاملات ہمارے ہی ہاتھوں میں تھے۔ وہ تو صحیح معنوں میں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے تھے۔ ہم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ آپ گھومیں پھریں ہمیش کریں۔ زندگی بھر آپ نے محنت کی ہے۔ اب ہر ذمے داری ہم پر ڈال دیں۔ لیکن انہوں نے کبھی آپ سے کسی کاروباری تعلق کا ذکر نہیں کیا۔ تاہم اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔ آپ سے تعلق ہمارے لئے فخر کا باعث ہوگا۔ ڈیڈی سے اگر آپ کی کوئی بات ہوئی تھی تو ہم اسے نباہیں گے۔ ہم نے ہمیشہ ان کے تمام کاموں' تمام ذمے داریوں کو اون کیا ہے۔ اگر ان کی طرف کوئی لین دین تھا تو ہم اسے بھی پورا کریں گے۔ آپ بلا تکلف بات کریں۔ موقع کی فکر نہ کریں۔ جو باتیں کل ہونی ہیں وہ اگر آج ہوجائیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔"

سرور بڑا شریں زبان نوجوان تھا۔ میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہم ذرا ایک خاص قسم کے پروجیکٹ پر کام کررہے تھے۔ ابھی تو اس کی کوئی شکل ہی نہیں بنی تھی اس لئے کسی سے اس کے بارے میں بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔" میں نے اپنے لہجے کو معنی خیز بنانے کی کوشش کی۔

سرور نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "معاملہ لین دین کا نہیں' صرف ایک چھوٹی سی امانت کا ہے۔"

اس کے چہرے پر قدرے طمانیت ابھر آئی۔ شاید اس لئے کہ میں کسی رقم وغیرہ کا دعوے دار ثابت نہیں ہوا تھا۔ میں نے نظر اس کے چہرے پر جمائے رکھی اور کہا۔ "وہ لوہے کا ایک سیاہ رنگ کا باکس تھا' چھوٹی سی ایک تجوری سے مشابہ۔ لیکن وہ چاروں طرف سے بند تھا۔ اس کا کوئی حصہ کھلنے والا دکھائی نہیں دیتا تھا۔" میں نے اچھی طرح وضاحت سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کس قسم کا باکس تھا۔ ہاتھوں کے اشاروں کی مدد سے میں نے اس

کا سائز بھی واضح کرنے کی کوشش کی۔

اس کی ساخت کے بارے میں سمجھانے کے بعد میں نے کہا۔ "حادثے سے کچھ دیر پہلے جو باکس شجاع صاحب کے پاس تھا، وہ میری امانت تھا۔ شاید پولیس یا اسپتال والوں نے وہ آپ کو دیا ہو۔ یا آپ کو اس کے بارے میں کچھ علم ہو۔ وہ مجھے واپس چاہئے تھا۔"

تینوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر سروری بولا۔ "اس قسم کا تو کوئی باکس ہمیں کسی ذریعے سے نہیں ملا۔ اور نہ ہی ہمیں اس کے بارے میں کچھ علم ہے۔ کیا تھا اس باکس میں؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔" میں نے دیانتداری سے کہا۔ "میرے پاس بھی درحقیقت وہ کسی اور کی امانت تھا۔ شجاع صاحب کے انتقال کے بعد اسے واپس پہنچانا بے حد ضروری ہوگیا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ باکس جس شخص کا تھا اسے ہمارے پروجیکٹ میں ہمارا تیسرا پارٹنر بننا تھا۔ وہ باکس کسی اور شخص کے لئے بالکل بے کار ہے۔ یہ مجھے اس کے اصل مالک نے بتایا ہے۔ اب شجاع صاحب کے بغیر پروگرام پر عملدرآمد نہیں ہوسکے گا، سارا منصوبہ منسوخ کردیا گیا ہے۔"

سرور بے بسی آمیز سے لہجے میں بولا۔ "لیکن ہم اب اس سلسلے میں تو آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتے، ہمیں تو اس باکس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ تباہ شدہ کار کو بھی ہم نے خود جاکر دیکھا تھا۔ اس میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ ڈیڈی نے اشارتاً بھی کبھی اس قسم کی کسی چیز کا ہم سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ اگر ہمیں کچھ معلوم ہوتا تو میں ضرور اس کے بارے میں عرض کردیتا۔" اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ سچ ہی بول رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "خیر۔ چلئے کوئی بات نہیں۔ لیکن اسے ذہن میں ضرور رکھئے گا۔ اگر اس سلسلے میں کوئی بات سامنے آئے تو مجھے ضرور مطلع کیجئے گا۔ خواہ وہ آپ کو کتنی ہی غیر اہم محسوس ہو" میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ سرور کو دے دیا۔

کارڈ کا جائزہ لیتے ہوئے وہ ہچکچاہٹ آمیز سے لہجے میں بولا۔ "آپ کو کیسے یقین ہے کہ حادثے سے کچھ دیر پہلے وہ باکس ڈیڈی کے پاس تھا؟ آپ نے باکس ڈیڈی کو دیا تھا یا آپ خود ان کے ساتھ تھے؟"

"نہ تو میں ان کے ساتھ تھا اور نہ ہی باکس میں نے ان کے حوالے کیا تھا۔" میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "بلکہ مجھے یہ بات ایک لڑکی نے بتائی ہے جس سے وہ شادی کرنے والے تھے۔"

تینوں کو بیک وقت خاصا زوردار جھٹکا لگا اور تینوں نے ایک ساتھ ہی دزدیدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا، گویا اس خیال سے سہم گئے ہوں کہ یہ بات کسی نے سن نہ لی ہو۔

سرور تھوک نگل کر بولا۔ "آیئے اُدھر چل کر بات کرتے ہیں" وہ مجھے شامیانے سے باہر لان کے ایک گوشے میں لے گیا جہاں لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔ باقی دونوں بھائی شامیانے میں ہی رہ گئے۔

ایک بار پھر وہ محتاط سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ "مجھے ڈر تھا کہ کوئی عزیز رشتے دار اس قسم کی بات نہ سن لے اور ممی کے کان میں نہ ڈال دے۔ اس عمر میں اس قسم کی بات سن کر ظاہر ہے ممی کی سائیکالوجی پر کچھ اچھے اثرات مرتب نہیں ہوں گے۔"

مجھے یقین تھا کہ اچھے اثرات تو خود اس کی اپنی سائیکالوجی پر بھی مرتب نہیں ہوئے تھے تاہم میں نے اس سلسلے میں کچھ نہ کہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "کون ہے وہ لڑکی؟"

"حسنہ اس کا نام ہے۔ ویسے مجھے شبہ ہے کہ یہ اس کا اصل نام نہیں ہے" میں نے اطمینان سے کہا "میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تاہم مجھے اس کا ایڈریس معلوم ہے۔" میں نے اسے گارڈن ٹاؤن کی اس کوٹھی کا نام بتایا جس میں حسنہ مجھے ملی تھی۔

وہ قدرے چونک کر بولا "یہ کوٹھی تو ہماری ہی ہے۔ ڈیڈی کہتا تھا کہ انہوں نے کسی کو کرائے پر دے رکھی ہے۔"

"اس جملے میں شاید "کرائے" کا لفظ فاضل ہو۔ حسنہ کو رکھی ہوگی۔" میں نے سادگی سے کہا۔ میں تو یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ کرایہ شاید وہ کسی اور شکل میں وصول کرتے ہوں گے۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو یہ جملہ کہنے سے باز رکھا۔

وہ ایک لمحے الجھن آمیز انداز میں ہاتھ مسلنے کے بعد بولا۔ "دیکھیں چوہدری صاحب! اب آپ سے کیا چھپانا۔ ڈیڈی نے بھرپور زندگی گزاری۔ جوانی میں تو وہ عورتوں کے معاملے ..... منہ زور تھے ہی۔ لیکن جوں جوں بڑھاپا آرہا تھا، وہ انگیز طور پر وہ اور بھی وہ ہوتے جارہے تھے۔ کیا کہنا چاہئے اسے۔ وہ گویا کوئی موزوں لفظ تلاش نہیں کرپا رہا تھا۔ آخر باپ کا معاملہ تھا۔

"عیاش۔" میں نے سنجیدگی سے اس کے جملے میں خالی جگہ پُر کردی۔ اس نے یوں مجروح سی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے اسے مجھ جیسے شریف آدمی سے اپنے باپ کے بارے میں موقع پر ایسے لفظ کے استعمال کی توقع نہیں تھی۔

تاہم اس لفظ کو اس نے گویا ذہنی طور پر قبول کرلیا اور سر میں سر ہلاتے ہوئے قدرے خجالت سے بولا۔ "ہاں۔ بس یہی سمجھ لیجئے۔ اس عمر میں بھی ایک سے ایک خوبصورت اور نوخیز لڑکی ان کے مراسم رہتے تھے۔ لیکن یہ سب حرکتیں وہ ممی سے چھپ کر کرتے تھے۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ ممی سے ڈرتے تھے یا ان کی قسم کی چیز تھے۔ ڈرتے تو شاید وہ کسی سے بھی نہیں تھے۔ بس یہی انہوں نے ممی کا وہ مان اور احترام ہمیشہ قائم رکھا جو ایک بیٹے ممی کے سامنے انہوں نے کبھی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنے یا دل توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ میرا مطلب ہے وہ شادی کے بعد بھی نہیں بڑے۔ اس معاملے میں وہ بڑے ٹھیک آدمی تھے۔ اپنے طور طریقوں کا اثر انہوں نے اپنے گھر پر کبھی پڑنے دیا۔ ان کی گھریلو زندگی میں کبھی کوئی خلل نہیں آیا۔"

"عیش و عشرت کے بھی کچھ اصول ہونے چاہئیں۔" میں نے سر سے سر ہلایا۔

"وہ ہر معاملے میں بڑے بااصول آدمی تھے چوہدری صاحب!" سرور نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ وہ واقعی فرزندی کا حق ادا کررہا تھا۔ باپ اس کے لئے دولت و جائیداد چھوڑ کر مرا تھا تو مرحوم کی ہر ادا میں اصول پسندی نظر آرہی تھی۔

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "میں گارڈن ٹاؤن والی کوٹھی میں جاکر دیکھوں گا کہ وہ لڑکی کون ہے اور ڈیڈی سے اس کا کیا معاملہ تھا۔ باکس کے بارے میں اگر کوئی بھی بات معلوم ہوسکی تو میں ضرور آپ کو اطلاع دوں گا۔"

"بہت شکریہ۔ میں اب چلتا ہوں۔" میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ مجھے یقین تھا کہ حسنہ اب اسے کوٹھی میں نہیں ملے گی۔

"آپ نے کھانا وغیرہ کھایا؟" سرور کو دفعتاً آداب میزبانی کا خیال آیا۔

"نہیں۔ بس بہت شکریہ۔ یہ سوئم وغیرہ کے اتنے پُرتکلف اور پُراہتمام کھانے میرے حلق سے نیچے نہیں اترتے۔" میں نے کہا۔ اور جواب کا انتظار کئے بغیر تیزی سے جانے کے لئے مڑ گیا۔

واپسی میں میں شریف سیال سے ملنے کے لئے ذرا رک گیا۔ وہ اس وقت بونے نیبل پر تھا اور ایک چرخے پر ہاتھ صاف کررہا تھا۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ ہاتھ گندے کررہا تھا۔ کیونکہ وہ چھری کانٹے کا تکلف کرنے والا آدمی نہیں تھا۔

"چوہدری صاحب!" وہ مجھے جاتے دیکھ کر چونک کر بولا۔ "میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ میں نے آپ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس رقم سے مکان خرید لیا تھا جو کسی نامعلوم مہربان نے مجھے بھجوائی تھی۔ تھوڑا سا قرضہ بھی پکڑ لیا تھا۔ بڑا اچھا مکان مل گیا تھا۔ بیوی بچے بڑے خوش ہیں۔ آپ کو دن رات دعائیں دیتے ہیں۔ میں بھی آپ کو بہت دعائیں دیتا ہوں۔"

"لیکن میں نے تو تمہارے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں نے تو صرف مشورہ دیا تھا۔" میں نے حقیقتاً ذرا حیرت سے کہا۔

"چوہدری صاحب! مشورہ بھی اگر کسی بڑے آدمی کا ہو، سمجھدار آدمی کا ہو۔ اور اس میں اس کا خلوص بھی شامل ہو تو اس مشورے سے بڑھ کر قیمتی چیز کیا ہوسکتی ہے۔" وہ حقیقی ممنونیت سے بولا "ویسے بھی میں تو محسوس کرتا ہوں کہ جب سے میری آپ سے شناسائی ہوئی ہے میرے حالات کچھ بدلتے جارہے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ سے صرف شناسائی رکھنا بھی مجھ جیسے غربا کے لئے بخت آور ثابت ہوتا ہے۔"

"اب اتنا بھی شرمندہ مت کرو شریف!" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "خالی خولی مشوروں کے بدلے دعائیں کیا لینا۔ ایسا کرو، کل شام گھر پر ہی رہنا۔ میرے دفتر سے کوئی آدمی آکر تمہارے مکان کا جائزہ لے جائے گا اور اسے معقول طریقے سے فرنش کرا دے گا۔ اب مکان ہوگیا ہے تو اس کی سجاوٹ بھی تمہاری خوشی کے مطابق ہوجانی چاہئے۔ تم صرف اتنی زحمت کرنا کہ میرے آفس فون کرکے میری سیکریٹری کو اپنا ایڈریس لکھوا دینا۔ میں ابھی آفس ہی جارہا ہوں۔ اسے اس سلسلے میں ہدایات دے دوں گا۔"

یہ کہہ کر میں گیٹ کی طرف چل دیا۔ وہ چرخا چھوڑ کر میرے پیچھے لپکا اور مرتعش لہجے میں بولا۔ "چوہدری صاحب! ایمان نال، اللہ دی قسم اس مہربانی کی ضرورت نہیں۔ میرے لئے تو یہی بڑا اعزاز ہے کہ آپ جیسا بڑا آدمی میرا مہربان، میرا شناسا اور دوست ہے۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہئے۔ آپ کی دعاؤں سے مکان ہوگیا ہے تو مرغی کا فرنیچر بھی ہوجائے گا۔ مجھے نہ تو جلدی ہے اور نہ ہی لالچ۔"

"اسی لئے تو میں یہ انتظام کررہا ہوں۔ میں ان لوگوں کا بڑا قدردان ہوں جنہیں نہ تو اپنی خواہشات کی تکمیل کی عجلت ہوتی ہے اور نہ ہی لالچ۔" میں نے رکے بغیر کہا۔

وہ میرے ساتھ ڈگ بھرتا آرہا تھا۔ چرغے کی بوٹی اس کے منہ میں ہی پھنسی رہ گئی تھی۔ گھٹی گھٹی آواز میں اس نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "بکواس بند کرو اور جاکر کھانا کھاؤ۔ بالکل اسی طرح کرنا جس طرح میں نے کہا ہے ورنہ یاد رکھنا کہ میں اپنی بات نہ ماننے والے دوستوں کو بھی "پھینٹی" لگا دیا کرتا ہوں"

میں اسے وہیں دم بخود کھڑا چھوڑ کر باہر آگیا اور گاڑی میں بیٹھ کر دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔ نہ جانے کیوں اس باکس کی پُراسراریت میں میرا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا جو میں یہاں بھی چلا آیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا یہیں ممکن ہے وہ باکس اتنا اہم نہ ہو جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ بے شک احمد شجاع نے اس کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی لیکن عین ممکن تھا کہ وہ صرف اس کی اپنی ذات کی حد تک ہی بہت اہم رہا ہو۔ لیکن مجھے اس باکس سے ریڈ ڈاٹ کا بھی کوئی تعلق نظر آرہا تھا۔ اور اگر احمد شجاع اس کے لئے سردھڑ کی بازی لگا رہا تھا تو یہ بھی عین ممکن تھا کہ ریڈ ڈاٹ سے اس کا بھی کوئی تعلق رہا ہو اور ریڈ ڈاٹ جیسی ایک انتہائی مشکوک قسم کی تنظیم سے ایک ریٹائرڈ ڈی آئی جی کا کیا تعلق ہوسکتا تھا، یہ ایک خاصی قابلِ غور بات تھی۔

پھر مجھے یہ بھی خیال آیا کہ میں اس معاملے میں خواہ مخواہ ہی

پُراسرار ت تلاش نہیں کررہا؟ ابھی تک تو مجھے صحیح طور پر یہی معلوم نہیں تھا کہ ریڈ ڈاٹ کیا چیز تھی؟ یہ واقعی کوئی تنظیم تھی یا دو چار پڑھے لکھے بدمعاشوں نے یونہی ذرا تاثر بنانے کے لئے اپنی ٹولی کا ایک نام رکھ لیا تھا؟

انہی سوچوں میں الجھا ہوا میں آفس پہنچا تو عمارت کے صدر دروازے پر ایک اور الجھن میری منتظر تھی۔ اور اس الجھن کا نام وسیم احمد تھا۔ وہ دروازے کے قریب ہی ایک ستون کا سہارا لئے کھڑا تھا اور عینک کے عقب میں اپنی گول گول سی آنکھیں گھما رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اگر وہ مجھے دیکھ نہ چکا ہوتا تو شاید میں الٹے قدموں لوٹ جاتا اور عمارت کے گرد گھوم کر پچھلے دروازے سے اندر چلا جاتا۔ مگر قدرت کو یوں میری گلوخلاصی منظور نہ تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر میری طرف لپکا چلا آرہا تھا۔

"سر جی۔ چوہدری صاحب۔!" اس کے انداز میں اتنی لجاجت تھی کہ اگر میں اس کا ہاتھ نہ تھام لیتا تو شاید وہ میرے پیروں میں ہی گر پڑتا۔ اس نے دیر تک مجھ سے مصافحہ کیا اور دیر تک باچھیں پھیلائیں۔ پھر بولا۔ "میں دو دن سے آپ کے دفتر کے چکر لگا رہا ہوں۔ ریسپشن والے مجھے آپ سے ملتے ہی نہیں دیتے۔ کبھی کہہ دیتے ہیں کہ آپ مصروف ہیں۔ کبھی کہہ دیتے ہیں کہ آپ آفس میں نہیں ہیں۔ فون کرتا ہوں تب بھی یہی جواب ملتا ہے۔ گھر فون کرتا ہوں تو وہاں بھی آپ موجود نہیں ہوتے۔"

ریسپشن والے عام طور پر مجھے ہر شخص کی آمد کی اطلاع ضرور دیتے تھے۔ اس سے ملنے نہ ملنے کا فیصلہ میں ہی کرتا تھا۔ لیکن پچھلے دو دنوں میں واقعی میں بہت مصروف رہا تھا اور شاید ریسپشن والوں نے وسیم کی شکل دیکھ کر بھی فیصلہ کرلیا ہو کہ وہ میرا وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں کرے گا۔

میں نے اسے اندر لے جانے کا قطعاً کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا اور وہیں کھڑے کھڑے قدرے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ "کس لئے ملنا چاہتے تھے کوئی خاص کام تھا مجھ سے؟"

"وہی مشورہ کرنا تھا نا آپ سے۔" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بے چارگی آمیز سے انداز میں بولا

ایک لمحے کے لئے مجھے اس پر ترس بھی آگیا۔ مشورے کا اتنا سچا طالب میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ میں نے ذرا ملائمت سے کہا۔ "ہاں۔ بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟"

وہ تھوک نگل کر بدستور ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ابا نے مجھے اپنے کارخانے میں نائٹ سپروائزر کے طور پر ملازم رکھا ہوا ہے۔"

"ہاں۔ مجھے یاد ہے" میں نے تیزی سے کہا "بلا تمہید اپنا اصل مسئلہ بتاؤ"

"ابا نے اپنے چھوٹے بھائی یعنی میرے چچا کو بھی ملازم رکھا ہوا ہے۔" اس نے گویا ہمت سے کام لیتے ہوئے تیزی سے بولنا شروع کیا۔ "سارا کیش وغیرہ انہی کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ انتہائی چالاک اور چرب زبان آدمی ہیں۔ ابا ان پر بہت زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ ان کی ہر بات مانتے ہیں لیکن اپنی اولاد پر بھروسا نہیں کرتے اور نہ ہی اولاد کی بات مانتے ہیں۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔

"اچھا تو پھر؟" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"بعض ہول سیلر مال خریدنے کے لئے کارخانے میں ہی آجاتے ہیں اور نقد ادائیگی کرتے ہیں۔" وہ ہانپنے کے سے انداز میں بولا۔ "اصولاً چھوٹے چچا کو ہر شام تک کی وصول شدہ رقم دوسرے روز صبح ہی بینک میں جمع کرادینی چاہئے لیکن وہ ہفتہ ہفتہ کیش بینک میں جمع نہیں کراتے۔ رقم ان کی میز کی درازوں میں بھری رہتی ہی ہے۔"

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" میں اپنے لہجے کی بیزاری کو چھپانے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ "ممکن ہے تمہارے ابا نے انہیں یہی ہدایت کر رکھی ہو۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولا "وہ ابا کو بھی چکر دیئے رکھتے ہیں۔ اکاؤنٹینٹ، کیشئر، منیجر سب کچھ وہی ہیں۔ انہیں سب کو چکر دینے کے طریقے آتے ہیں۔ ابا تو ویسے بھی آنکھیں بند کرکے ان پر اعتبار کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ کیش میں مستقل طور پر گھپلا کرتے ہیں۔ یہ مجھے معلوم ہے۔ لیکن ابا ان کے بارے میں ایک لفظ سننے کو تیار نہیں۔ جونہی ان کے سامنے چھوٹے چچا کا نام میری زبان پر آتا ہے، وہ زبان بند کرادیتے ہیں۔ مجھے بے نقط سناتے ہیں۔ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ میں خود تو نالائق ہوں، کچھ کر نہیں سکتا چھوٹے چچا نے اگر اتنا کام سنبھالا ہوا ہے تو میں ان کے خلاف سازشوں کی فکر میں لگا رہتا ہوں۔ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں ابا۔"

"یار کیا واقعی وہ تمہارے سگے ابا ہیں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں چوہدری صاحب!" اس کی آواز یکدم بھرا گئی۔ "لیکن باتیں سن کر کوئی یقین نہیں کرتا۔ اس طرح کی باتیں تو سوتیلے باپ بھی نہیں کرتے۔"

"تو پھر تم کیوں فکر میں دبلے ہورہے ہو؟" میں نے قدرے بے زاری سے کہا "ایسے باپ کا مال جارہا ہے تو جانے دو"

اس کی صرف آواز ہی نہیں بھرائی، آنکھوں سے آنسو بھی چھلکنے لگے تھے۔ وہ ذرا غصیلے لہجے میں فوراً بولا "مال کی فکر کس کمبخت کو ہے۔ میری طرف سے تو چاہے ابا کا سارا مال لڑھک جائے۔ ہم کون سا اس مال سے عیش کررہے ہیں۔ مجھے اس کی فکر نہیں۔ فکر تو مجھے اس بات کی ہے کہ چھوٹے چچا مستقل مال کھا رہے ہیں لیکن غبن کے چکر میں مجھے پھنسانا چاہتے ہیں۔ غبن کے

ں بھی نہیں۔ بلکہ یوں سمجھیں مجھ پر چوری کا الزام لگانا ہے۔ مجھے چوری کے چکر میں پھنسا کر وہ اپنے راستے کا یہ کانٹا بھی ہٹانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اگر ان کی یہ کامیاب ہوگئی تو شاید رفتہ رفتہ وہ مجھے ابا کی نظر میں اتنا برا بنا ہم چھوٹی موٹی سہولتوں اور وراثت وغیرہ سے بھی محروم ہ"

تمہارا کیش سے کوئی تعلق ہے جو وہ تمہیں چوری کے الزام انے کی کوشش کرے؟" میں نے دریافت کیا۔

میں رات کو جاکر اسی کمرے میں بیٹھتا ہوں جہاں وہ اپنی میز زوں میں نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں وہاں سے کافی دور لگی ہوئی ہیں۔ رات کو میں تین چار چکر ے لگاتا ہوں لیکن زیادہ تر دفتر میں ہی بیٹھتا ہوں۔ میرا زیادہ ہی قسم کا ہی ہے۔ چھوٹے چچا کی حرکات و سکنات سے مجھے وگیا ہے کہ وہ مجھے چوری کے چکر میں پھانسنے کی تیاریاں ہ ہیں۔"

بس۔ اتنے سے مسئلے کے لئے تم میرے پیچھے لگ گئے ہو؟" نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تمہیں کیونکر یقین ہوگیا ہے کہ مارا مسئلہ حل کرسکتا ہوں؟"

میرا دل کہتا ہے کہ آپ انسانوں کے کام آتے ہیں۔ اتنا بڑا ہونے کے باوجود اپنی مصروفیات میں سے لوگوں کے لئے وقت ہیں۔" وہ بڑے وثوق سے بولا۔ "اور جسے آپ "اتنا سا" کہہ رہے ہیں، مجھ غریب کے لئے وہ زندگی اور موت کا مسئلہ مجھے یقین ہے کہ آپ ضرور میری مدد کریں گے اور تو کوئی بات سنتا ہی نہیں۔"

"ہاں میرے بھائی! میں ہی سن کر پھنس گیا ہوں۔" میں نے ی سانس لے کر کہا۔

وہ شرمیلی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "مجھے معلوم ہے آپ مذاق ایسی باتیں کرتے ہیں ورنہ حقیقت میں تو آپ کو مجھ سے دلی روحانی ہے۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔" میں نے ایک اور ٹھنڈی س لے کر کہا "چاہتا تو میں یہی ہوں کہ تمہیں اٹھا کر کسی ایسی بھیجنگ دوں جہاں سے مجھے دوبارہ تمہاری صورت دکھائی نہ ے۔ لیکن تمہاری صورت دیکھتا ہوں تو ترس آجاتا ہے۔"

"آپ مجھ پر رحم کھائیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا صلہ ے گا چوہدری صاحب!" وہ عینک اتار کر سچ مچ زار و قطار رونے ا۔

"ارے۔ ارے۔ یہ کیا کررہے ہو! رونے کی ضرورت یں۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔ "میں تو تمہارے مسئلے کا حل بتانے ا تھا۔ تم نے رونا شروع کردیا۔"

اس کے آنسو تقریباً اسی طرح رک گئے جس طرح ٹونٹی بند کرنے سے پانی کی دھار رک جاتی ہے۔ عینک اس نے دوبارہ لگالی اور پوری طرح میری طرف متوجہ ہوگیا۔ عام حالات میں بھی اس کی آنکھیں پھیلی پھیلی سی رہتی تھیں لیکن اس وقت تو کچھ اس طرح پھیل گئی تھیں جیسے وہ کانوں سے نہیں بلکہ آنکھوں سے میری بات سنے گا۔

"تمہیں تھوڑی سی ہمت سے کام لینا پڑے گا" میں نے کہا۔ "تمہارے لئے بہترین راستہ یہی ہے کہ چھوٹے چچا کی سازش کو انہی پر الٹ دو۔ ان کے کچھ کرنے سے پہلے تم ہی کچھ کر گزرو۔ تم جب ڈیوٹی پر پہنچتے ہو تو کیا کمرے میں کوئی ہوتا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے پُر امید انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ "کمرے کا تالا میں ہی جاکر کھولتا ہوں۔ چوکیدار گیٹ پر ہوتا ہے۔ اور ور کر مشینوں پر ہوتے ہیں۔"

"تم جاتے ہی ان درازوں کا تالا توڑ دو جن میں رقم ہوتی ہے اور رقم کی گڈیاں اس طرح میز پر سجا دو جیسے کوئی چور ان کو لے جانے کی تیاری کررہا تھا۔ یہ کام اس دن کرنا جس دن تمہیں یقین ہو کہ ہفتے بھر کا کیش درازوں ہی میں جمع ہے۔ اس بات کا تو تمہیں اندازہ رہتا ہے نا؟"

"بہت اچھی طرح۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں دن میں بھی اکثر و بیشتر دفتر جاتا رہتا ہوں۔ اسی لئے تو چھوٹے چچا کی نظروں میں زیادہ کھٹکنے لگا ہوں۔ میں سب کچھ دیکھتا رہتا ہوں۔ ابا دوسرے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اس آفس میں کبھی آکر نہیں جھانکتے۔"

"میں تمہارے چھوٹے چچا کا فراڈ سمجھ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "چھوٹے کارخانوں کے حسابات زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتے۔ درازیں توڑنے سے پہلے تم اس ہفتے کی کیش سیل کا رجسٹر دیکھ لینا۔ اس میں مجموعی طور پر کم رقم کا اندراج ہوگا جبکہ درازوں میں زیادہ رقم موجود ہوگی۔ بینک میں جمع کراتے وقت چھوٹے چچا فاضل رقم اپنے پاس رکھ لیتے ہوں گے۔ تم رقم جوں کی توں میز پر رکھ دینا اور گھبرائے ہوئے انداز میں اپنے ابا کو فون کرنا کہ جب تم کمرے میں داخل ہوئے تو کوئی شخص درازوں سے رقم نکال نکال کر میز پر جمع کررہا تھا۔ تم نے اسے للکارا تو وہ کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔ تھوڑی بہت ایکٹنگ تو تم کرلیتے ہو نا؟"

"ایکٹنگ تو میں اچھی خاصی کرلیتا ہوں سر!" وہ تھوک نگل کر بولا۔ اور ایک لمحے کے لئے مجھے گمان سا گزرا کہ کہیں اس کا حد سے زیادہ بے وقوف نظر آنا بھی ایکٹنگ ہی تو نہیں تھی؟ "بس تو پھر یہ ڈراما کر گزرنا۔" میں کہا "اس سے کم از کم دو فائدے تو ہوں گے۔ رقم چوکنے ہر حال میں گنی ضرور جائے گی اور حساب کیا جائے گا کہ چور کچھ لے تو نہیں گیا۔ اس سے ایک تو یہ انکشاف ہوجائے گا کہ چھوٹے چچا ہفتہ ہفتہ بھر کیش بینک میں جمع نہیں کراتے۔ دوسرے وصولی کے رجسٹر کی رقم اور کیش میں فرق ہوگا۔ چھوٹے

چچا کی پوزیشن لازماً مشکوک ہو جائے گی۔ بس اتنی سی بات ہے۔ ذرا ہمت کرو گے تو الٹی چال چھوتے چچا پر پڑ جائے گی۔ لیکن پہلے اچھی طرح سوچ لینا کہ یہ کام تمہارے بس کا ہے یا نہیں۔"

اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آگئی تھی اور یہ حماقت کی چمک سے مختلف تھی۔ وہ ذرا تامل کے بعد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے میں یہ کام کر ہی لوں گا۔ کم از کم چھوٹے چچا کو سبق سکھانے کے لئے تو کر ہی گزروں گا۔"

"بس تو اب جاؤ۔ فی الحال تمہارے لئے میرے پاس یہی مشورہ ہے۔ معذرت چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنے ساتھ دفتر میں نہیں لے جارہا۔ مجھے کچھ ضروری کام کرنے ہیں جن کے لئے مجھے تنہائی اور یکسوئی کی ضرورت ہے۔ پھر کبھی موقع مناسب ہوا تو چند منٹ بیٹھیں گے۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ بُرا منائے بغیر بولا۔ بُرا منانے کی تو شاید اس میں حس ہی نہیں تھی۔ "مجھ پر تو آپ کا یہی احسان کافی ہے کہ یہاں کھڑے کھڑے آپ نے مجھ سے اتنی باتیں کرلیں۔" مصافحہ کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر تقریباً دُہرا ہوگیا۔ اس بار میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر سیدھا کردیا اور خدا حافظ کہہ کر عمارت میں داخل ہوگیا۔

اپنے آفس میں جاکر بیٹھے ہوئے مجھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ کیتھرین نے بتایا "کسی مسٹر ایڈیم کا فون ہے۔ میں نے ملانے کے لئے کہا۔ دوسرے ہی لمحے وہی مانوس اور کچھ منحوس سی آواز سنائی دی۔ "احمد شجاع کے ہاں سے ہو آئے؟"

میں اندازہ نہیں کرسکا کہ یہ سوال تھا یا بیان۔ یا پھر محض یہ جتانا مقصود تھا کہ وہ ہر وقت میری نقل و حرکت سے واقف رہتے تھے۔

"ہاں۔ ہو آیا۔" میں نے ملائمت سے جواب دیا۔

"اس کے بارے میں چھان بین کرنے گئے تھے کہ وہ کس قسم کا آدمی تھا؟" ایڈیم عرف ایڈی نے اپنے مخصوص پُراسرار سے لہجے میں اردو میں ہی پوچھا۔

"جب تمہیں یہ معلوم ہے کہ میں وہاں گیا تھا تو پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ کس لئے گیا تھا۔" میں نے رکھائی سے کہا۔

"نہیں۔ ہمارا آدمی تمہارے اتنا زیادہ قریب نہیں ہوسکا۔" وہ بولا "بہرحال یہ بات زیادہ اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ باکس ہمیں چاہئے۔"

"کون سا باکس؟" میں نے حقیقتاً حیرت سے کہا۔ اس نے گویا تحمل سے کام لیتے ہوئے اس سیاہ باکس کی ساخت کی وضاحت کی جو ابھی تک میرے لئے معمّا بنا ہوا تھا۔

"مگر وہ تو فرار ہوتے وقت احمد شجاع ہی کے ہاتھوں میں تھا۔ میں تو اسے بریف کیس سمجھا تھا۔" میں نے سادگی سے کہا۔ "مجھے تو اس کے بعد شاید تمہارے ہی کسی منحوس آدمی نے حسب معمول گیدڑوں کی طرح پیچھے سے حملہ کرکے بے ہوش کردیا تھا۔ پھر پاس وہ باکس کہاں سے آسکتا تھا۔"

"احمد شجاع کے فرار ہوتے ہی ایک سفید گاڑی تیزی سے اس کے تعاقب میں روانہ ہوئی تھی۔ اس میں وہی نوجوان آدمی تمہارے سیکیورٹی گارڈ کے فرائض انجام دیتا ہے' ہر وقت سایہ کی طرح تمہارے پیچھے لگا رہتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے' کیا ہم اسے نہیں پہچانتے؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ میرے بارے میں واقعی سب کچھ ہی جانتے تھے۔ ایڈی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ہم یہ نہیں جان سکے کہ جب تمہارا آدمی احمد شجاع کے تعاقب میں روانہ ہوا اور جب اسے حادثہ پیش آیا اس کے درمیان کیا ہوا اور اسی درمیانی وقفے میں وہ باکس کہیں غائب ہوگیا۔ اس کے بارے اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ حادثہ شدہ کار سے برآمد نہیں ہوا۔ ظاہر ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ راستے میں تمہارا آدمی اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا اور وہ تم تک پہنچ چکا ہے۔ اب وہ کوئی ایسی چیز تو تھی نہیں کہ احمد شجاع اسے چبا کر نگل جاتا۔ اسے تو کوئی وہیل مچھلی بھی نگل کر ہضم سے نہیں رہ سکتی۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہیل مچھلی اسے نگل کر سکھ سے رہ سکتی ہے یا معدے کے السر اور درد قولنج میں مبتلا ہوتی ہے" میں نے خشک لہجے میں کہا "میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ نہ وہ باکس مجھ تک یا میرے کسی آدمی تک پہنچا ہے اور نہ ہی مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔ مجھے اس قسم کے کسی باکس وغیرہ سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی لیکن اب تمہاری تشویش دیکھ کر دلچسپی پیدا ہوچلی ہے۔ اب شاید میں بھی اسے تلاش کرنے کی کوشش کروں۔"

"تم بہت اونچی چیز ہو۔ ہم تمہاری باتوں میں آنے والے نہیں ہیں" ایڈی گہری سنجیدگی سے بولا۔ وہ زیادہ تر بات کرتے وقت "ہم" کا صیغہ استعمال کرتا تھا۔ شاید وہ بات کرتے وقت غیر شعوری طور پر اپنے تمام ساتھیوں کی ترجمانی کررہا ہوتا تھا۔ پھر اس کے سنجیدگی میں سفاکی کی آمیزش بھی ہوگئی اور وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں آخری بار کہہ رہا ہوں' باکس ہمیں واپس کردو۔ وہ تمہارے کام کی چیز تو ہے نہیں۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں بھی آخری بار کہہ رہا ہوں کہ تم اب باکس کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔ میں وضاحتیں کرنا پسند نہیں کرتا اور نہ ہی یہ بات میرے لئے قابل برداشت ہے کہ کوئی میرے کہے پر یقین نہ کرے اور مجھے جھوٹا سمجھے۔"

اس کے لہجے میں دوبارہ نرمی آگئی اور وہ سمجھانے کے انداز میں بولا "اگر کسی نے غلط طریقے سے اس باکس کو کھولنے

کی تو وہ دھماکے سے پھٹ کر تباہ ہوجائے گا اور کھولنے والے کے بھی پرخچے اڑ جائیں گے۔"

"پھر تو تمہیں اس کی کوئی فکر ہونی ہی نہیں چاہئے۔" میں نے کہا "اس میں کوئی قیمتی چیز نہیں ہے۔ اگر کوئی راز محفوظ ہے تو اسے کھولنے کی کوشش کرنے والا یقیناً مارا جائے گا اور باکس کے راز سمیت تباہ ہوجائے گا کیونکہ "پرچا ترکیب استعمال" تو اس کے ساتھ ہے نہیں۔ لہٰذا تمہیں اس کے بارے میں تشویش نہیں ہونا چاہئے۔"

"ہم اس کی طرف سے بے نیاز ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے" وہ بولا۔

"یہ سوچ کر کہ کہیں کوئی اسے صحیح طریقے سے نہ کھول لے؟" میں نے پوچھا۔

"جو چاہو سمجھ لو۔" وہ مبہم لہجے میں بولا۔ "لیکن باکس ہمیں واپس کردو۔"

"خدا کی پناہ!" میں نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم یا میری کہی بات پر یقین نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے؟ تمہارے پاس اگر وہ میرے پاس ہے تو جب اور جس طرح چاہو مجھ سے باز پرس کرلو۔ تمہاری معلومات تو ویسے ہی لامحدود ہیں۔ تمہیں علم ہی ہوگا کہ میں نے باکس کہاں رکھا ہوا ہے۔ مجھے بھی بتا دو۔ خود اٹھا کر تمہاری خدمت میں پیش کردوں گا۔ اس سے زیادہ میرا نہ پیشکش کیا ہوسکتی ہے۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ تم ہمارے پسندیدہ' بلکہ مطلوبہ آدمیوں کی فہرست میں شامل ہو۔ ورنہ یہ جب چاہو اور جس طرح چاہو' والی بال استعمال کرنے کی تو نوبت ہی نہیں آتی۔" وہ طویل سانس لے کر بولا "اگر ہم تم پر مہربان نہ ہوتے تو نہ جانے اب تک تمہارا کیا حشر ہوچکا ہوتا۔"

"اپنی سی کوششیں تو کرچکے ہو۔ اگر میرا خدا مجھ پر مہربان نہ ہوتا تو شاید ان میں سے کوئی کامیاب ہوچکی ہوتی۔" میں نے کہا۔ اس کا متکبرانہ انداز مجھے بہت برا لگتا تھا۔ اگر وہ شخص میری رسائی میں ہوتا تو مجھے امید تھی کہ میں اس کا تکبر نکال دیتا۔ وہ اپنا لہجہ کسی نیت زدہ بادشاہ کا سا بنانے کی کوشش کرتا تھا۔

"ارے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تو تم سمجھتے ہو کہ وہ کوششیں تمہیں ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں تھیں؟" وہ میرے خیال سے گویا بہت محظوظ ہورہا تھا۔ "یہ بچکانہ خیال ذہن سے نکال دو چندا! تمہیں ٹھکانے لگا دینا ہمارے لئے ایسا ہی ہے جیسے سر پر بیٹھی ہوئی کسی مکھی کو اڑا دینا۔ تم پر جو حملے ہوئے وہ تو تمہاری اہلیت اور قابلیت کے چھوٹے موٹے امتحان تھے۔ انہی کی بنا پر تو تم ہمیں زیادہ عزیز ہوگئے ہو۔ اس سے پہلے ہم فیصلہ نہیں کرپا رہے تھے کہ تمہیں اہمیت دیں یا نہیں۔"

"بڑی نوازش ہے تمہاری کہ تم نے مجھے سایۂ عاطفت میں لیا ہوا ہے۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "میرا وقت خاصا قیمتی ہوتا ہے اور تم ہر بار فون پر بڑی بوڑھیوں کی طرح اِدھر اُدھر کے قصے چھیڑ کر بیٹھ جاتے ہو۔ میرا خیال ہے اب بات ختم ہوچکی ہے۔ خدا حافظ۔"

"بات تو اب شروع ہوگی پیارے!" وہ یک دم بدلے بدلے لہجے میں بولا۔

"اگر تم نے باکس واپس نہ کیا تو ایک ایسی کہانی شروع ہوگی جس کا انجام کم از کم تمہارے لئے بڑا المناک ہوگا۔"

"بعض اوقات میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری باتوں کا کیا جواب دوں۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"ہم عام طور پر صرف وہ جوابات سننے کے عادی ہیں جو ہمارے حق میں جاتے ہوں" وہ بولا۔ "تم نے وہ کیسٹ دیکھی؟"

"ہاں۔ تم لوگوں کی خباثت کا وہ ثبوت میں نے بغور دیکھا تھا۔ تنہا اور مجبور و بے بس انسانوں کے ساتھ جو لوگ یہ سب کچھ کرتے ہیں' انہیں ایک نہ ایک روز اس کا حساب دینا پڑتا ہے۔" میں نے نفرت سے کہا۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ اس کے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟"

"اکثر خبیث اپنی خباثتوں کے کوئی نہ کوئی جواز گھڑ لیتے ہیں۔"

وہ گویا میری بات سنے بغیر بولا۔ "وہ بھی ہم سے اکثر اسی لہجے میں بات کرتا تھا جس طرح تم کرتے ہو۔ وہ بھی ہماری بات نہیں مانتا تھا۔ اور جب ماننے پر تیار ہوا اس وقت بہت تاخیر ہوچکی تھی۔ اس وقت ہم اپنے پسندیدہ اور مطلوبہ آدمیوں کی فہرست سے اس کا نام کاٹ چکے تھے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔"

"میرا نام اپنے پسندیدہ اور مطلوبہ آدمیوں کی فہرست سے کب کاٹ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بہت جلدی ہے تمہیں کسی لرزہ خیز انجام سے دوچار ہونے کی؟" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اصل میں تم اس لئے مجھ سے ایسے لہجے میں بات کرتے رہتے ہو کہ ابھی تمہارے فرشتوں کو بھی اندازہ نہیں ہے کہ تم کس سے مخاطب ہو۔ تمہیں ذرا بھی علم نہیں ہے کہ میں جن کی نمائندگی کرتا ہوں وہ کون ہیں۔"

"تو پھر تم بتا دو تاکہ میں تھر تھر کانپنے لگوں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"بتا دیں گے' بتا دیں گے۔" وہ مربیانہ انداز میں بولا۔ "ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ تمہارا نام اپنے پسندیدہ اور مطلوبہ آدمیوں کی فہرست سے کاٹنے کے مراحل بھی ابھی دور ہیں۔ لیکن تم کوشش بھی کرو اور دعا بھی کہ ان مراحل تک نہ پہنچو کیونکہ تم بہت قیمتی انسان ہو۔"

"اور تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہم تمہیں بن مول خریدنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے تم پر اتنی

توجہ دی جارہی ہے۔ ہم چاہتے ہیں تم ہمارے کام آؤ.... اس طرح تم اور بھی قیمتی آدمی بن جاؤ گے۔ بہت عروج ملے گا تمہیں۔"

"میرے لئے اتنا ہی عروج کافی ہے جتنا مجھے مل چکا ہے۔ میں قناعت پسند آدمی ہوں۔ اگر مجھے مزید عروج کی خواہش بھی ہوگی تب بھی میں اس کے لئے کسی کی مدد نہیں چاہوں گا۔ خصوصاً تم جیسے لوگوں کی۔"

"خیر۔ یہ سب کچھ تو وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ لیکن اس وقت تک بھی تم قناعت پسندی کی باتیں مت کرو۔ آج کے دور میں قناعت پسند تقریباً نایاب ہوگئے ہیں۔ اب تو درویش اور سادھو بھی قناعت پسند نہیں رہے۔ ہاں اگر تم فیشن کے طور پر اپنے آپ کو قناعت پسند کہہ رہے ہو تو کوئی حرج نہیں۔ کروڑ پتیوں میں اپنے آپ کو درویش، مزدور اور قناعت پسند وغیرہ کہنے کا فیشن ہے۔ جس سال کروڑوں کا منافع ہوتا ہے اس سال بھی اگر کوئی پوچھ لے کہ کاروبار کیسا جارہا ہے؟ تو یہی جواب دیتے ہیں کہ بس دال روٹی چل رہی ہے۔ اس فیشن کے مطابق تمہاری قناعت پسندی پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

"تمہیں اعتراض ہو بھی تو میری صحت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ویسے تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم کون ہو، ریڈ ڈاٹ کیا ہے۔ اور مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے اس امید پر کہا کہ شاید اس بار وہ کھل ہی جائے۔

"یہ باتیں اتنی آسانی سے بتائی جانے والی تو نہیں ہیں۔ اور ابھی یہ سب کچھ جاننا تمہارے لئے اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کچھ جان ہی جاؤ گے" وہ بے پروائی سے بولا۔

"لیکن مجھ پر ہی تمہاری نظرِ انتخاب کیوں ہے؟ اس شہر میں، اس ملک میں مجھ سے کہیں بڑے بڑے سرمایہ دار پڑے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم سے کس نے کہا کہ ہمیں کسی سرمایہ دار کی ضرورت ہے؟" وہ گویا میری ناسمجھی پر قدرے حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "سرمایہ تو تم ہم سے جتنا چاہو لے لو۔ سیٹھوں سے ہمیں دلچسپی ضرور ہے لیکن ویسی نہیں جیسی تم سے ہے۔ تم صرف سرمایہ دار ہی نہیں اور بھی بہت کچھ ہو۔ تمہارے اندر بے شمار صلاحیتیں ایسی ہیں جن کا ابھی شاید تمہیں خود بھی علم نہ ہو۔ ہمارے لئے تم سرمایہ دار نہیں بلکہ خود ایک سرمایہ ہو۔ ہم نے تمہیں اپنے ریزرو بینک میں ڈالا ہوا ہے۔ سیٹھوں کا کیا ہے۔ سیٹھ تو ہمارے لئے گاجر مولی کی طرح ہیں۔ جس کو چاہتے ہیں اٹھا کر جیب میں ڈال لیتے ہیں۔"

عزت افزائی کا بہت شکریہ۔ اور خدا حافظ۔" میں نے کہا۔

"باکس واپس کرنے کے بارے میں ضرور غور کرنا۔" اس نے ایک بار پھر تاکید کی۔ اس بار میں نے کوئی جواب ہی نہیں دیا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

اس شام میں گھر پہنچا تو ایک اور حیرت میری منتظر تھی۔ میں ڈرائیو وے میں گاڑی سے اترا تو کوٹھی کے سیکیورٹی انچارج طارق خان نے سر کھجاتے ہوئے قدرے ندامت آمیز انداز میں دوچار مجھے بتایا "سر! آپ کے بیڈ روم سمیت چند کمروں میں آپ کو کچھ گڑبڑ نظر آئے گی۔ یہ مت سمجھئے گا کہ یہ میری سستی کی وجہ سے ہے۔ میں نے اس شخص کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ کچھ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے کس چیز کی تلاش تھی....."

"وہ گھر میں داخل کس طرف سے ہوا تھا؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"عقبی لان کی دیوار پھاند کر۔" طارق خان نے جواب دیا "اور اس کا خیال غالباً یہی تھا کہ اسے کسی نے دیکھا نہیں ہے لیکن میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔"

طارق خان کی ڈیوٹی زیادہ تر دن میں ہوتی تھی اور وہ گیسٹ ہاؤس میں ہی رہتا تھا لیکن کبھی کبھار کسی آسیب کی طرح نہایت غیر محسوس انداز میں اصل عمارت کا چکر لگا لیتا تھا، یعنی کسی کو کم ہی نظر آتا تھا۔ گھر میں گھومنے پھرنے کا اس کا اپنا ایک مخصوص انداز تھا۔ وہ کہیں بھی، کسی کے سامنے اچانک نمودار ہوسکتا تھا۔

کوٹھی کی چار دیواری کافی اونچی تھی اور اس کے اوپر باریک، متوازی تاریں بچھی ہوئی تھیں جو دیوار کے اوپر چڑھنے کے بعد بھی غور سے دیکھنے پر ہی نظر آسکتی تھیں۔ رات کے بارہ بجے بعد صبح کی سپیدی نمودار ہونے تک ان برہنہ تاروں میں کرنٹ دوڑتا تھا۔ جو تاریں دیوار پر باڑھ کی طرح لگائی جاتی ہیں، میری

غیر ملکی زبانیں سیکھئے

پروفیسر ایم اشرف

فرنچ اردو ریڈر 90/=

فرنچ اردو ڈکشنری 90/=

جاپانی اردو ریڈر 90/=

جاپانی اردو ڈکشنری 60/=

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور

وئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ دیواریں پھاند کر گھروں میں ے والے انہیں دور سے ہی دیکھ کر ان کا کوئی بندوبست کر اوان میں کتنے ہی وولٹ کرنٹ دوڑ رہا ہو۔ لیکن طارق فض کا ذکر کررہا تھا وہ دن میں کسی وقت دیوار پر چڑھا ں ہماری چار دیواری کی تاروں میں کرنٹ نہیں ہوتا تھا۔ ں کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔

لئے کا آدمی تھا وہ؟ کوئی نقاب وغیرہ چڑھائی ہوئی تھی اس نے اپنے لہجے کی بے تابی چھپانے کی کوشش کرتے

ں سر! نقاب وغیرہ کہاں۔ وہ تو وہی بندر نما شخص تھا جو ، کر گیا تھا۔ جس کے بارے میں آپ نے حکم دے رکھا ، پکڑنے کی کوشش کی جائے۔ میں نے اسی لئے اسے تے... دیکھ کر نہ تو تاروں میں کرنٹ آن کیا اور نہ ہی اس ۔ میں چاہتا تھا، وہ زندہ ہی ہاتھ آجائے۔ زخمی بھی نہ ہو اس کے انداز سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی چیز کی تلاش ۔ میں نے اسے گھیرنے کے لئے دو تین کمروں کی تلاشی دیا۔"

ری سانس لے کر رہ گیا۔ اس مردود اے ٹن نے مجھے کھ دیا تھا۔ وہ واقعی میرے لئے دردِ سر بنتا جارہا تھا۔

خان بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "پھر وہ اوپر آپ میں چلا گیا۔ میرا اسے وہیں گھیرنے کا ارادہ تھا کیونکہ ماگنے کا دروازے کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ کھڑکی کی بلندی کم از کم بیس فٹ ہے۔ اس سے چھلانگ لگانے ری ہوسکتا ہے۔ اس لئے میں نے اسے شمار نہیں کیا

وہ اسی سے کود کر بھاگ گیا ہوگا؟" میں نے اس کی بات ے کہا۔ طارق خان نے ندامت آمیز انداز میں اثبات

س وقت بیڈ کے نیچے سے نکل رہا تھا جب میں نے کمرے ہو کر اپنے عقب میں دروازہ بند کرلیا۔" اس نے دھیمی ا میں نے گن دکھاتے ہوئے اسے سیدھا کھڑا ہونے ا وقت تک وہ غالباً کمرے کی اچھی طرح تلاشی لے چکا نے تو ایک لمحے بھی توقف نہیں کیا، کوئی بات نہیں میں تو اس کی شکل بھی صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا۔ اس ابازی کھائی اور بالکل اس طرح کھڑکی سے باہر نکل گیا ندہ اڑتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا ہو۔ کسی انسان سے ہت لگانے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ میرا خیال تھا میں وہ یہ کرتب تو دکھا گیا ہے لیکن اب ٹانگ وانگ گلی میں پڑا ہوگا۔ میں نے دوڑ کر کھڑکی سے جھانک کر اسے کی طرح گلی کے موڑ پر غائب ہورہا تھا۔"

"شکر کرو اس سے فائرنگ کے تبادلے یا ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ "ورنہ شاید کمانڈو ہونے کے باوجود تمہیں مزید پچھتانا پڑتا۔ محض اندازوں کی غلطی کی وجہ سے۔ بلکہ غلطی اصل میں میری ہی ہے کہ میں نے تمہیں اس کو قابو میں کرنے کا حکم تو دے دیا لیکن صحیح طور پر اس کے بارے میں خبردار نہیں کیا، جس کی وجہ سے تم نقصان بھی اٹھا سکتے تھے۔ اُسے سب سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہے کہ اس کا مختصر سا وجود اور مضحکہ خیز شکل دیکھ کر ہر کوئی غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اس کے بارے میں انتہائی غلط اندازے لگاتا ہے۔"

"میں سر! یہ تو مجھے تجربہ ہوگیا۔" طارق نے تسلیم کیا۔

"آئندہ اگر کبھی اسے دیکھو اور قابو کرنے کا ارادہ کرو تو یہ سوچ کر کرنا کہ تمہارا مقابلہ کسی آسمانی بلا سے ہے جو محض آنکھوں کو دھوکا دینے کے لئے مختصر اور مضحکہ خیز سا بہروپ دھارے ہوئے ہے۔ اس چھوٹے سے وجود میں شاید کوئی شیطان مقید ہے۔ اس سے تم کسی بھی حرکت کی، کسی بھی بات کی توقع رکھ سکتے ہو۔ یہ سوچ کر ہاتھ ڈالو گے تو شاید کچھ کامیابی ہوسکے۔"

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا سر!" وہ مستعدی سے بولا۔ "آئندہ اگر وہ نظر آگیا تو آپ ضرور کوئی اچھی خبر سنیں گے۔"

اندر جاکر میں نے کمروں کا جائزہ لیا۔ سازو سامان الٹ پلٹ پڑا ہوا تھا۔ تاہم تلاشی کا انداز بتاتا تھا کہ ڈھونڈنے والے کو کسی بہت چھوٹی چیز کی تلاش نہیں تھی، اس لئے بہت زیادہ اکھاڑ پچھاڑ نہیں مچائی گئی تھی۔ میرے خیال میں یہ اسی سیاہ باکس کی تلاش کا شاخسانہ تھا۔ بلاشبہ وہ اس کی تلاش کے سلسلے میں بہت مستعدی دکھا رہے تھے۔ لیکن یہ سوچنا ان کی بے وقوفی تھی کہ اگر باکس واقعی میرے پاس تھا اور میں اسے چھپانا چاہ رہا تھا تو وہ اسے اس طرح تلاش کرسکتے تھے۔

میں نے گھر کے منتظم کو کمروں کی حالت درست کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے میرے معائنے کے لئے چیزوں کو جوں کا توں چھوڑ دیا تھا۔ میں خود لاؤنج میں بیٹھ کر ٹونی کو فون کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت وہ گھر واپس پہنچ چکا ہوگا۔

"ٹونی!" میں نے سلسلہ ملنے پر کہا "میں تمہیں ایک انتہائی ضروری کام بتا رہا ہوں۔ دنیا کا ہر کام چھوڑ کر تمہیں صرف اسی کی فکر کرنی ہے۔ اپنے علاوہ تم نے جن لوگوں کو اس کام پر لگایا ہوا ہے، انہیں بھی بتالو۔ میری نگرانی اور حفاظت کی فکر بالکل چھوڑ دو۔ اللہ نے میری زندگی جتنی لکھی ہوگی اتنا میں ضرور جیوں گا۔ اور اگر اوپر سے بلاوا آگیا تو محافظوں کی بہت بڑی فوج بھی مل کر مجھے نہیں بچا سکے گی۔ اس لئے خدارا تم یہ ہر وقت میرے پیچھے دو آدمی لگائے رکھنے کی ضد چھوڑ دو۔"

وہ دھیرے سے ہنس کر بولا۔ "سر! آپ منتیں کیوں کررہے ہیں۔ آپ باس ہیں، حکم دیجئے۔ جس طرح آپ حکم دیں گے اس

طرح ہو جائے گا۔"

"نہیں۔ جو کام میرے ساتھی' میرے دوست میری محبت میں کرتے ہیں ان کے بارے میں مجھے ان کی منت کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔"

"سر! ہمیں تو اب یوں لگتا ہے جیسے ہم ہر کام ہی آپ کی محبت میں کرتے ہیں۔" ٹونی بولا۔

"بس تو پھر سمجھ لو کہ میں ہر کام کے سلسلے میں تمہاری منت کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم سے بہتر کون جانتا ہے کہ ہمارے ہاں باس اور ماتحت کا روایتی چکر نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہمارا ڈسپلن مثالی ہے۔"

"بے اصولی دنیا میں کتنی ہی عام سہی' اس کے باوجود ہماری بقا اصولوں میں ہی ہے سر۔ بے اصول لوگ بہت جلد فنا ہو جاتے ہیں۔" ٹونی انتہائی سنجیدگی سے بولا۔ "سر! آپ حکم کیجئے' وہ ضروری کام کیا ہے؟"

"تم نے اس بندر نما شخص کو تو دیکھا ہی ہے جسے ہم نے اپنی دانست میں مار دیا تھا لیکن وہ زندہ ہی تھا۔ اس کے بعد کئی بار میرے سامنے آچکا ہے۔ وہ اپنا نام اے نن بتاتا ہے۔ اسے ہر حال میں پکڑنا ہے۔ زندہ یا کم از کم نیم زندہ۔ جان سے نہیں مارنا ہے ورنہ اس کے "فوت" ہونے کے ساتھ ساتھ اسے پکڑنے کا مقصد بھی فوت ہو جائے گا۔"

"آپ مطمئن رہیں سر! آپ چاہیں گے تو اسے اس طرح پکڑا جائے گا کہ اس کے جسم پر ایک خراش تک نہیں ہوگی۔" ٹونی بڑے اعتماد سے بولا۔

"اس کام کو اتنا آسان بھی مت سمجھو۔" میں نے اس کی معصوم خود اعتمادی سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "تم خود بھی خیال رکھنا اور تمام ساتھیوں کو بھی ہدایت کر دینا کہ جب بھی اس پر ہاتھ ڈالا جائے' یہ سمجھ کر ڈالا جائے کہ وہ کسی بلا یا کسی چھلاوے کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کی ظاہری حالت دیکھ کر ہمارا کوئی بھی آدمی قطعاً خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی کوشش نہ کرے۔"

"ٹھیک ہے سر!" ٹونی فوراً بولا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں یہ ہدایات ذاتی تجربات کی بنا پر دے رہا تھا۔

"تم نے تو اسے اچھی طرح دیکھ ہی رکھا ہے۔" میں نے مزید کہا۔ "لیکن باقی ساتھیوں میں تقسیم کرنے کے لئے طارق خان سے اس کی تصویر کے پرنٹ لے لینا۔ اس کے پاس تصویر موجود ہے' وہ مزید پرنٹ نکلوا دے گا۔ سب ساتھیوں کو اس کام پر لگا دو۔ اسے بالکل اسی طرح سرگرمی سے تلاش کرنا ہے جس طرح والدین اپنے گمشدہ بچے کو تلاش کرتے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت' کسی بھی جگہ اچانک ہی نظر آسکتا ہے۔ سب کا ٹرانسمیٹر پر ایک دوسرے سے رابطہ رہنا چاہئے۔ اگر کسی کو مدد کی ضرورت پڑے تو قریب ترین

ساتھی فوراً اس کی مدد کو پہنچنے کی کوشش کرے۔ ایک بار پھر دوں کہ وہ مجھے مردہ نہیں چاہئے۔ ہمیں اس سے بہت معلومات حاصل کرنی ہیں۔ خاموش حالت میں وہ ہمارے کم نہیں۔"

"میں سمجھ گیا سر! آپ مطمئن رہئے۔" ٹونی اعتماد سے میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں حقیقتاً مطمئن ہو گیا تھا۔ کہ تھا کہ صبح سے ہماری مختصر مگر نہایت مستعد و فعال مشینری میں آجائے گی تو جلد یا بدیر کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور برآمد ہوگا۔

ملازمین کمرے درست کر چکے تھے اور میں اس وقت باہر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا جب ایک ملازم نے مجھے وزیٹنگ کارڈ لا کر دیا۔ میری کسی سے ملاقات طے نہیں نے کارڈ لے کر دیکھا۔ وہ نہایت خوبصورت' نفیس اور کارڈ تھا اور اس پر نہایت خوبصورتی سے ہی صرف ایک ہوا تھا۔ طاہرہ خانم!

نام کے سوا اس پر کچھ نہیں تھا۔ نہ تو حیثیت کی کوئی اور نہ ہی کوئی فون نمبر یا ایڈریس وغیرہ۔ مجھے غیر ممالک ایسی شخصیات کے وزیٹنگ کارڈ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا وزیٹنگ کارڈ پر نام کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ مگر وہ ان نہایت اہم اور معروف شخصیات میں شمار ہوتی تھیں۔ میں نہ آیا کہ طاہرہ خانم کس شمار قطار میں تھی جو اس کارڈ کے سلسلے میں یہ انداز اپنایا تھا۔

مجھے یاد پڑتا تھا کہ اس عورت کو میں نے صرف پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے صدر کے ہاں اس پارٹی میں جس میں بے بی نشاط کی لاش سوئمنگ پول سے تھی۔ اس قتل کا سرا نام نہاد فلمی مصنف نصیر نواز سے اور میں نے اسے اس کے کئے کی سزا دے دی تھی۔ طاہرہ میں نے نصیر نواز کے ساتھ ہی دیکھا تھا۔ وہ اس کی بانہیں ڈالے مستقل اسی کے ساتھ تھی۔

کسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بہت دولتمند عورت تھی بہت بڑی فائنانسر کے طور پر فلم انڈسٹری میں داخل ہو کر رہی تھی۔ بتانے والے کے انداز سے مجھے یہی تاثر نصیر نواز ہی کی دریافت تھی اور وہی اسے فلم انڈسٹری تھا۔ طاہرہ خانم سے اسی پارٹی میں میرا محض رسمی سا تھا۔ اب نصیر نواز کی "خودکشی" کے بعد وہ مجھ سے تھی؟

میں نے ہال میں آکر تاریک شیشے والی ایک کھڑکی دیکھا۔ وہ چم چم کرتی ایک خوبصورت لنکن کے پاس ڈرائیور کھڑی تھی اور تنقیدی نظر سے کوٹھی کا جائزہ لے رہی خان نے نظروں ہی نظروں میں اس کا اور گاڑی کا جائزہ تبھی اسے ڈرائیور وے میں اتنا آگے آنے کا موقع

ران میں شامل خواتین کو خصوصاً یہ احساس ہرگز نہیں جاتا تھا کہ میرے گھر میں سیکیورٹی کا کوئی نظام کام کرتا ال ایسی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ میں اس نظام کو زیادہ تفصیلی بناتا۔ یہ محض ہلکی پھلکی احتیاط تھی۔ اور ت والا پُراسرار اور ناقابلِ فہم سا سلسلہ سامنے نہ آتا تو اس کی بھی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ میں حفاظتی انتظامات یقین نہیں رکھتا تھا۔

نے گہری نظر سے طاہرہ خانم کا جائزہ لیا۔ وہ بلاشبہ ایک ل عورت تھی۔ دراز قد' خوبصورت اور خوش لباس۔ کی شخصیت کا وہی تاثر اب بھی برقرار تھا جو میں نے پہلی محسوس کیا تھا۔ یعنی اس کے چہرے مہرے اور شخصیت عجیب سی سرد مہری کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے تاثر میں کی رنگت کی وجہ سے بھی اضافہ ہوتا تھا۔ اس کی رنگت یادہ ہی گوری تھی۔ پہاڑوں پر جمی ہوئی برف کی طرح سفید تھی۔ شاید اسی لئے وہ خود بھی ایک برف پوش چٹان ہی تی تھی۔ اس میں اپنی ایک الگ ہی طرح کی کشش تھی جو کو اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کرتی تھی۔ لیکن اس ے اس کی پُراسرار سی شخصیت کے دروازے بند معلوم تھے۔ کم از کم فی الحال!

ں نے ملازم کو ہدایت کی کہ اسے ڈرائنگ روم میں ۔ اور خود تیار ہونے چلا گیا۔ میرا صرف ٹائی لگانا اور جوتے ابالی تھا' اس کے باوجود میں خلافِ معمول عورتوں کی طرح فاضت اور سست روی سے تیار ہوا۔ درحقیقت میرا ذہن اس عورت میں ہی الجھا ہوا تھا۔ اس کی آمد کا کیا مقصد تھا؟ مجھے اس سے کس طرح پیش آنا چاہئے تھا اور کس میں گفتگو کرنی چاہئے تھی؟ پھر میں نے دل ہی دل میں اپنے سمجھایا کہ ان سب باتوں کا فیصلہ تو اس کا رویہ دیکھنے کے بعد ہئے تھا۔

میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہ ایک ملکہ کی سی تمکنت ہوئے میں دھنسی بیٹھی تھی اور گرد و پیش کے جائزے سے ی ہوئی تھی۔ وہ ہر چیز کا گہرا مشاہدہ کرنے کی عادی معلوم ہوتی وہ جس چیز کو بھی دیکھتی تھی' نہایت ٹھہرے ٹھہرے انداز میں' ی سے۔ گویا اس کی تصویر تماحتر جزئیات کے ساتھ ذہن کے نہاں خانے میں ڈالتی جاتی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ دلکش مگر ذرا نپے تلے سے انداز میں مسکرائی چہرے کے برف زار پر اس کی آنکھوں میں بہت گہرائیوں میں محسوسات کی مخفی سی چنگاری جھلملائی لیکن دوسرے ہی لمحے دم ہو گئی۔ شاید اس نے ممجھے بھی سر سے پاؤں تک تماحتر ات کے ساتھ ذہن کے مخصوص نہاں خانوں میں محفوظ کرنا ا کر دیا تھا۔ میں شاید اس کے لئے جیومیٹری کی کوئی تصویر تھا' سائنس کا کوئی ڈایاگرام تھا جسے اس کے ذہن کی کمپیوٹرائزڈ فوٹو لائبریری اپنے اندر محفوظ کر رہی تھی۔

میں نے پہلی بار جب اسے نصیر نواز کے ساتھ دیکھا تھا تو مجھے اس میں ہلکی سی "ویساتیت" کی جھلک محسوس ہوئی تھی لیکن اس وقت وہ اپنے میک اپ' لباس اور رکھ رکھاؤ سے مکمل طور پر اس طبقے کی نمائندہ عورت دکھائی دے رہی تھی جن کی زندگی کا بیشتر حصہ فرانس' امریکا اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ میں بسر ہوتا ہے۔ شاید میں ہی پہلی ملاقات پر صحیح طور پر اس کا جائزہ نہیں لے سکا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ اس وقت میرے ساتھ شعلہ بردوش ستارہ تھی جو ... بہت خاص موڈ میں تھی۔ وہ مجھے کسی اور طرف متوجہ ہونے کی مہلت ہی نہیں دے رہی تھی۔

"معاف کیجئے گا طاہرہ خانم!" میں نے انتہائی شائستگی سے کہا۔ "خواتین کو..... اور خصوصاً خوبصورت خواتین کو انتظار کرانا انتہائی بدذوقی کی دلیل ہے لیکن مجھے مجبوراً چند منٹ آپ کو انتظار کی زحمت دینا پڑی۔ دراصل میں اس حالت میں نہیں تھا کہ آپ کی آمد کی خوشخبری سن کر فوراً آپ کے سامنے آسکتا' ورنہ شاید میں خود باہر آکر آپ کو ریسیو کرتا۔"

اس کے چہرے کا برف زار دھیرے دھیرے تھوڑا سا پگھلا اور مسکراہٹ کی کرن جھلملائی۔ اسی دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ پلک جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتے ہوئے نہایت مترنم آواز میں بولی۔ "ہو سکتا ہے میرا شمار ان لوگوں میں ہو جو آپ کو کسی بھی حالت میں دیکھ کر خوش ہوتے ہوں۔"

اس کے الفاظ سے زیادہ معانی اس کے لہجے میں پوشیدہ تھے۔ میں نے بے ساختہ کہا۔ "نزع کی حالت میں دیکھ کر بھی؟"

"بدشگونی کی باتیں مت کیجئے۔" وہ یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔"

"اوہ! آئی ایم سوری۔ ایسے ہی ذرا زبان پھسل گئی تھی۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "لیکن کیا واقعی مجھے عالمِ نزع میں دیکھنا آپ کے لئے خوشی کی بات نہیں ہوگی؟"

"میں نے تو ابھی آپ کو زندگی کے عالم میں صحیح طور پر نہیں دیکھا' آپ نزع کی باتیں کرنے لگے۔ میری معلومات اور میرے قیافے کے مطابق تو آپ اتنے قنوطیت پسند نہیں ہیں۔ آپ تو بدترین حالات میں بھی شگفتہ انداز میں سوچنے والے اور بے خوف انداز میں بولنے والے ہیں۔" وہ اسی مترنم دل نشیں اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ میرے بارے میں معلومات بھی رکھتی تھی اور قیافے بھی لگائے بیٹھی تھی۔ جو تقریباً درست ہی تھے۔ لیکن یہ کیونکر ممکن ہوا تھا؟ یہ میں سمجھ نہیں سکا۔

سردست میں نے اسے کریدنے کے بجائے شکرگزارانہ سے لہجے میں کہا۔ "آپ میرے بارے میں حسنِ ظن لے کر آئی

ہیں۔ میں بے حد ممنون ہوں۔ آپ کیا پینا پسند کریں گی؟"

"شیمپین منگا لیجئے۔ طبیعت بڑی بے کیف ہو رہی ہے۔" وہ بلا تامل بولی۔ مجھے اندر ہی اندر اس فرمائش پر خفیف سا جھٹکا لگا لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ میں اب جس طبقے میں شامل تھا وہاں کسی عورت کے منہ سے اس قسم کی فرمائش حیرت کا باعث نہیں بننی چاہئے تھی۔ لیکن پھر بھی بہرحال یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ طبقہ خواہ کچھ بھی ہو' پہلی ملاقات کے اپنے کچھ تقاضے' کچھ تکلفات ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تمام تقاضوں کو فضول سمجھ کر' تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر آئی تھی۔

ملازم شیمپین اور لوازمات کی ٹرے سجا کر لے آیا تو میں نے کہا۔ "ہیلپ یور سیلف پلیز۔ آپ کو خود ہی زحمت کرنا پڑے گی۔"

اس نے دو ڈرنکس تیار کیں۔ میں خاموشی سے دیکھتا رہا۔ جب اس نے ایک گلاس میری طرف بڑھایا تب میں نے کہا۔ "شکریہ۔ میں پیتا نہیں ہوں"

اسے گویا حیرت کا خاصا زوردار جھٹکا لگا۔ حیرت کے اظہار کے طور پر اس نے تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے طویل و عریض ڈرائنگ روم کی ایک دیوار کی طرف دیکھا۔ اس دیوار پر لکڑی کا خوبصورت آرائشی کام تھا' جس کے عقب میں بار موجود تھا۔ ملازم نے طاہرہ خانم کے سامنے وہیں سے سب کچھ نکالا تھا۔

وہ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن اس اہتمام میں تو ذاتی دلچسپی اور ذوق کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ ویسے تو اب ہمارے طبقے میں بار زیادہ تر گھروں کے لوازمات میں شامل ہو گیا ہے۔ لیکن یہ خوبصورتی اور وسعت میں نے کہیں نہیں دیکھی۔"

"ذاتی دلچسپی تو میں عموماً ہر کام میں شامل کر لیتا ہوں۔" میں نے کہا "میں اس نظریے کا قائل ہوں کہ انسان برائی کو بھی اپنائے تو سلیقے سے اپنائے۔"

"تو آپ اسے برائی سمجھتے ہیں۔" اس نے شیمپین کا خوبصورت فرانسیسی ہائی بال بلند کرتے ہوئے کہا جس سے وہ ایک گھونٹ بھر چکی تھی۔

"ہاں۔ برائی تو برائی ہے۔" میں نے بلا تامل کہا۔

"اوہ....." وہ متاسفانہ انداز میں خوبصورت ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولی۔ "یہاں میرا اندازہ غلط ہو گیا۔ میں آپ کو اتنا پارسا سمجھ کر آپ کے پاس نہیں آئی تھی۔"

"میں نے کب کہا کہ میں پارسا ہوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "مجھے پارسائی کا دعویٰ ہرگز نہیں۔ لیکن میں رند خرابات بھی نہیں۔"

"تو پھر آپ کیا ہیں؟" اس نے ایک اور گھونٹ بھر کر گلاس کو ایک ادائے خاص کے ساتھ انگلیوں میں گھماتے ہوئے پوچھا۔

"یہ میں خود بھی فیصلہ نہیں کر سکا۔" میں نے دیانتداری سے کہا۔ "شاید میں کوئی بہت اچھا آدمی نہیں ہوں لیکن اچھا آدمی بننے کے لئے کوشاں ضرور رہتا ہوں۔ کوئی نہ کوئی غلط کام کبھی کبھار مجھ سے سرزد ضرور ہو جاتا ہے لیکن اس پر میں نے خوشی یا محسوس نہیں کیا۔ ہمیشہ پچھتاوا ہی محسوس کیا ہے۔ میرے خ یہ اس بات کی پکی دلیل ہے کہ میرا ضمیر خراب نہیں ہے۔ ہر برائی کو صرف چکھا ہے اور چکھ کر چھوڑ دیا ہے۔ یہ میرا قسمتی ہے کہ میں کسی بھی نشے' کسی بھی برائی کا مستقل ا ہو سکا۔"

"بہت..... خوب..... بہت خوب" اس نے کر نادیدہ حاضرین کو تالیاں بجانے کا اشارہ کیا پھر خالی ہوتے گلاس کو میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی "فرض رکھ لیجئے یہ بار اور میں ٹی وی پر آپ کا انٹرویو لے رہی ہوں۔ ہاں تو صاحب! یہ بتائیے آپ کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟"

میں نے اپنی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آنے دیا اور بات رکھتے ہوئے کہا "میں اس سلسلے میں بھی آج تک کسی نتیجے پہنچ سکا۔ کبھی کبھی مجھے اپنی زندگی کی کہانی بے مقصد ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کے ننانوے فیصد طرح میری زندگی بھی مقصد سے محروم ہی رہے گی۔ دوسرے لوگوں کی طرح میرا معاملہ بھی یہی رہے گا کہ ہوئے' اِدھر اُدھر بھٹکے' کاروبار کیا' روپیہ کمایا' کچھ ا برائیوں میں الجھے اور بالآخر مر گئے۔ یہ کوئی زندگی نہیں۔ ایسا ہوا تو مجھے اس پر افسوس ہو گا۔ لیکن کبھی کبھی کوئی مجھے اطمینان دلاتی ہے کہ ایسا نہیں ہو گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ مقدر میں کوئی بڑا کام لکھا ہے۔ قدرت مجھ سے کوئی بہت لینا چاہتی ہے۔ اسی لئے وہ اتنی تیزی سے مجھے اوپر لا رہی میں تو بہت ہی حقیر اور بے وسیلہ سا انسان تھا۔ دو وقت کی لالے پڑے رہتے تھے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس میں اس طرح کے گھر میں' اس طرح کے ڈرائنگ روم آپ جیسی کسی حسین خاتون سے اس بے تکلفی سے گفت ہوں گا۔"

"صرف ایک خاتون سے ہی نہیں' بلکہ اونچے طبقے کی کتنی خواتین سے۔" طاہرہ خانم نے تصحیح کی۔

"آپ میرے بارے میں حسن ظن ضرور رکھیں مگر مت رکھیں۔" میں نے انکساری سے کہا۔

"یہ حسن ظن کی نہیں حسن زن کی باتیں ہیں۔" وہ گلاس خالی کر کے اس نے واپس میز پر رکھتے ہوئے کہا "مائیک ہٹا لیا ہے' انٹرویو ختم۔ اب آف دی ریکارڈ باتیں ہیں۔"

ہم دونوں ہی ہنس دیئے۔ اس نے وہ گلاس اٹھا لیا لئے تیار کیا تھا۔ وہ چہرے سے جتنی سرد مہر اور خشک مزاج تھی' ویسی نہیں تھی۔ ایک لمحے کے سکوت کے بعد میں۔ "آف دی ریکارڈ کون سی باتیں؟"

وہ ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر بولی۔ "آپ نے پوچھا نہیں کہ میں ی خاص شناسائی کے' بغیر کسی دعوت کے' بغیر کسی اطلاع کے کے ہاں کیوں چلی آئی؟"

"آپ چلی آئیں یہی کافی ہے۔ آپ کی نوازش ہے۔ اب کو سوالوں کے خار زار میں گھسیٹنے پھرنا تو بڑی بے وقوفی اور ی بات ہو گی۔" میں پہلے اسے اچھی طرح خوش کرنے پر تلا خا کہ شاید اس طرح اس کی اصلیت کو سمجھنے میں کچھ مدد مل

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک بالکل تو مجھ سے ی سرزد ہو چکی ہے کہ جب سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں سے تعارف ہوا تھا تو میں نے آپ کو دعوت نہیں دی کہ کبھی ے ہاں تشریف لا کر اس غریب خانے کو رونق بخشیں شاید میں احتیاطاً ایسا نہیں کیا تھا کیونکہ آپ نصیر نواز کے ساتھ تھیں۔ نے سوچا وہ' حسد اور رقابت میں مبتلا نہ ہو جائے"

"ہاں۔ یہ عین ممکن تھا۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "شاید میں بھی اس وقت زیادہ توجہ سے آپ کی طرف اس لئے نہیں دیکھا کہ ستارہ آپ کے شانہ بہ شانہ تھی۔" اس نے حساب برابر یا۔

میں نے لہجہ قدرے مغموم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ا ہے نصیر نواز نے خودکشی کر لی تھی اور کوئی اعتراف نامہ قسم کی بھی چھوڑی تھی جس میں نہ جانے کن کن گھپلوں کا ذکر تھا؟"

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ دوسرا پیگ بھی ں سے اتار چکی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں خمار کا شائبہ تک ں تھا' البتہ اس کی برف جیسی سفید رنگت میں زندگی کا ہلکا سا ار جھلکنے لگا تھا۔ ایک ثانیے کے لئے مجھے یوں لگا جیسے اس کی ریں میری روح کی گہرائی تک میں اتر جائیں گی۔ میں نے پوری وشش کی کہ میرے باطن کے دروازے بند ہو جائیں۔ کہیں کوئی وزن بھی باقی نہ رہے۔ میں چہرے پر حتی الامکان معصومیت طاری ئے بیٹھا رہا۔

"ہاں۔ خودکشی تو اس نے کر لی تھی۔" وہ بدستور میری گھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ "لیکن نہ اسے کیوں اس کی خودکشی میرے لئے ایک معمہ بن گئی ہے۔"

"اور آپ کو معمے حل کرنے کا شوق ہو گا۔" میں نے بظاہر ادگی سے کہا۔

بات شوق کی نہیں' افسوس کی ہے۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے ل۔ "آپ کو یقیناً بہت اچھی طرح اندازہ ہے کہ وہ میرا کس قسم کا ست تھا۔ مجھے نیک پروین نظر آنے کا قطعاً کوئی شوق نہیں ہے میں جو کچھ کرتی ہوں اسے چھپانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کرتی اور جو کچھ کہنا چاہتی ہوں اسے بھی دل میں دبائے رکھنے کی عادی نہیں ہوں۔ مثلاً میں آپ کو یہ بتا دینے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی کہ آپ مجھے پہلی ہی ملاقات میں بہت اچھے لگے تھے۔ اسی کے نتیجے میں آپ آج مجھے یہاں دیکھ رہے ہیں۔"

"بہت شکریہ۔ یہ صرف آپ کا حسن نظر ہے ورنہ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"اوہ..... خدا کے لئے یہ روایتی قسم کی غیر ضروری انکساری کا اظہار کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہم سیدھی اور سچی باتیں کریں تو دوستی میں زیادہ لطف رہے گا۔" وہ نہایت شستہ انگریزی میں بولی۔ یہ بھی خوب تھا کہ وہ اپنی طرف سے ہی دوستی کا پروگرام طے کر کے آئی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کہوں؟" میں نے پسندیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہلی بار کسی حسین عورت نے پہلی ہی ملاقات پر اس صاف گوئی سے ایک مرد کی تعریف کی ہے' پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ عام طور پر صرف عورت ہی یہ اپنا حق سمجھتی ہے کہ اس کی تعریف کی جائے' اس سے عشق جتایا جائے"

"آپ مردوں نے ہی اسے ایسا بنایا ہے۔ اس کی زبان بند کر دی ہے۔ وہ بے چاری صرف جھوٹی سچی تعریفیں سن سن کر ہی خوش ہوتی رہتی ہے۔ خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ اس چکر میں وہ اپنے جذبات کو بھول ہی جاتی ہے۔ انہیں لفظوں کی شکل .... دینا اب اس کی سرشت میں ہی شامل نہیں رہا۔ لیکن میں مرد کے بنائے ہوئے اس خول میں مقید نہیں رہی۔ میں اپنے جذبات کے اظہار میں اپنے آپ کو لاشعوری گھٹن میں مبتلا نہیں رکھتی۔ مجھے اگر ایک مرد اچھا لگتا ہے تو میں بھی اس سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ اور کیوں اچھا لگ رہا ہے میں بھی اس سے اظہارِ عشق میں پہل کر سکتی ہوں۔"

"بے شک۔ بے شک۔" میں نے سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح نسوانیت کا شاعرانہ تصور مجروح ہوتا ہے۔" وہ خود ہی بولی۔ "وہ جو ایک شرمائی' لجائی' سکڑی سمٹی بیٹھی ہوئی لڑکی کا تصور ہے' جو بات بات پر لال گلال ہو جاتی ہے' اس تصور کو دھچکا لگتا ہے۔ کہتے ہیں مرد کے حوصلے بلند رکھنے کے لئے یہ تصور ضروری ہے' ورنہ کہیں وہ نہ سکڑنا سمٹنا شروع کر دے۔ لیکن میرے خیال میں یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ زمانے اور وقت نے جہاں دوسرے تصورات کی جڑ مار دی ہے' وہاں اس تصور کو بھی سنبھال کر بیٹھے رہنے کا کیا فائدہ؟ میں تو کہتی ہوں عورت کا اظہارِ عشق' اس کی جرأت مندی مرد کو زیادہ جارح بنا سکتی ہے' مہمیز دے سکتی ہے۔ اس کے بہت سے نامعلوم جذبے بھی بیدار ہو سکتے ہیں۔ کیا تھوڑا سڑک صاف دیکھ کر زیادہ تیز نہیں دوڑتا؟ گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کے پاس ضائع کرنے کے لئے اتنا بہت سا وقت کہاں ہے۔"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا "جی ہاں۔ شاید آپ درست ہی

کہہ رہی ہیں۔ دراصل میرے تجربات کچھ اتنے زیادہ نہیں ہیں۔"
مجھے احساس ہوگیا تھا کہ وہ اتنی سطحی عورت نہیں تھی جتنی میں اسے سمجھا تھا۔ میں اس سے بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پہلے ہی مجھے کافی الجھائے دے رہی تھی۔ ابھی تک اس کی شخصیت کا سرا میرے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ ابھی تک اس کی آمد کا مقصد حقیقتاً واضح نہیں ہوا تھا۔

"آپ اب بچنے کی کوشش مت کیجئے۔" وہ دوسرا پیگ خالی کرکے رکھتے ہوئے بولی۔ اس کے پتلے پتلے اور قدرے سفاک سے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی عمر زیادہ نہیں مگر یہ مت کہئے کہ آپ کے تجربات زیادہ نہیں۔"

میں نے بظاہر سہمے سہمے سے انداز میں چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کیا تجربات میرے چہرے پر لکھے نظر آنے لگے ہیں؟"

وہ میرے انداز پر بے ساختہ دھیرے سے ہنس دی۔ "نہیں۔ اتنا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تجربات چہرے پر دکھائی تو نہیں دے رہے۔ اگر دکھائی دیں تب بھی انہیں پڑھنے کے لئے خاص ہی نظروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کے چہرے پر تو بڑی معصومیت ہے۔ ابھی آپ برسوں تک ان گفت تجربات اس معصومیت کی تہ میں چھپا سکتے ہیں۔"

"تو پھر آپ نے کیونکر کہہ دیا کہ میرے تجربات زیادہ ہیں؟"

"یہ بھی میرا قیافہ ہے۔"

"آپ کے قیافے بھی آپ کی طرح حسین ہونے چاہئیں۔"

وہ مربیانہ سے انداز میں سرہلاتے ہوئے بولی۔ "آپ کو گفتگو کا سلیقہ کس نے سکھایا؟"

"وقت نے۔" میں نے بلا تامل جواب دیا۔ "میں نے بطور خاص کسی سے بھی کچھ سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وقت جیسے خود بخود ہی سب کچھ سکھاتا چلا گیا۔"

ہلکا سا ہنکارا بھر کر وہ بولی۔ "بہت مہربان ہے وقت آپ پر۔"

ایک لمحے خاموشی رہی پھر وہ جیسے کسی خیال سے چونکتے ہوئے بولی۔ "بات ہو رہی تھی نصیر نواز کی۔ مجھے اس کی موت کا خاصا افسوس ہوا تھا' خصوصاً اس لئے کہ وہ خودکشی کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ اس کے پاس سے ملنے والے خط میں جو باتیں لکھی ہوئی تھیں وہ اسے خودکشی پر مجبور نہیں کرسکتی تھیں۔ بدنامی' بے عزتی' رسوائی' کسی جرم کی سزا کا خوف۔ یہ تو اس کے لئے نہایت معمولی باتیں تھیں۔ وہ زندگی سے چمٹا رہنے والا آدمی تھا۔ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی زندگی کے لئے ہزاروں زندگیاں برباد کرسکتے ہیں۔ اپنے فائدے کے لئے ساری دنیا کو نقصان میں دیکھنا گوارا کرسکتے ہیں۔ ایسے آدمی خودکشی نہیں کیا کرتے۔ وہ صرف ایک صورت میں خودکشی کرتے ہیں۔ یعنی اس وقت جب انہیں پکا یقین ہوجائے کہ اگر انہوں نے خودکشی نہ کی تو وہ کسی اور کے ہاتھوں زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ ذلت آمیز طریقے سے مریں گے۔"

"یہ آپ اس کی تعریف کررہی ہیں یا برائی؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"تعریف نہ برائی۔ میں تو اس کی شخصیت کا صحیح تجزیہ کررہی ہوں۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"اس کے باوجود وہ آپ کا گہرا دوست تھا؟" میں نے ملا سے کہا۔

"ہاں۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔

"آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے اس محاورے سے اتفاق نہیں۔" وہ بولی۔ "انسان حال میں وہی رہتا ہے جو وہ ہوتا ہے۔ آج کے مشکل زمانے کامیابی سے زندگی گزارنا ایک ہنر ہوگیا ہے۔ ایک ہنرمند کی طرح کے اوزار اپنے ساتھ رکھنا پڑتے ہیں۔ انسان کے دوست دراصل اس کے اوزار ہوتے ہیں۔"

"بہت خوب!" میں نے صرف اتنا ہی کہا۔ میں اس انوکھی فلسفے سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا لیکن میں نے اپنے آپ کو ہنسنے سے باز رکھا۔

"نصیر نواز زندگی کے کئی مرحلوں میں میری ضرورت تھا۔ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ "اور پھر وہ ہینڈسم بھی تھا۔ ہینڈسم میری کمزوری ہیں لیکن ہر ہینڈسم مرد نہیں۔ مائنڈ اٹ۔"

"اوہ....." میں ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔ وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بات کرتے وقت وہ پلکیں کم جھپکاتی تھی۔

"چوہدری صاحب! آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ نصیر نواز جیسا آدمی بھلا کیونکر خودکشی کرسکتا تھا؟" وہ یک دم ذرا آگے کو جھکتے ہوئے بولی۔

"اگر میں اسے ذرا بھی قریب سے جانتا تو شاید اس سلسلے میں کوئی رائے ظاہر کرنے کی کوشش کرتا۔" میں نے قدرے تلخی سے کہا۔ "میں آپ کے اس باصلاحیت دوست کی شناسائی سے بالکل ہی محروم تھا۔ میں بھلا کیا اندازے لگا سکتا ہوں۔ مجھے تو اس کی موت کی خبر بھی اخبارات کے ذریعے ہی ملی تھی۔"

"میں نے اس کے کردار کا جو خاکہ کھینچا ہے اس کی روشنی میں آپ کچھ تو رائے زنی کرسکتے ہیں کہ کیا ایسا آدمی خودکشی کرتا تھا؟" اس کے لہجے میں ہلکا سا اصرار تھا۔

"یہ کیفیت مجھے کیوں کرید رہی ہے؟ کیا اسے کسی قسم کا شک ہے' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ منطقی طور پر ایسا ممکن تو نہیں تھا۔

میں نے بیزاری سے کہا۔ "خانم! اس شہر میں طبعی اور غیر طبعی ملا کر پچیس تیس اموات روزانہ ہوتی ہیں۔ بعض کے بارے میں ہم جان پاتے ہیں اور بعض کے بارے میں نہیں۔ بعض کے بارے

میں ہمیں کوئی خواہش بھی محسوس نہیں ہوتی۔ نصیر نواز میرے نزدیک انہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ وہ میرے لئے اجنبی تھا۔ مجھے اس کی موت کا تاسف ضرور ہوا تھا لیکن میں پوری تفتیش کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ آپ کے ذہن میں تضمن میں کوئی سوال' کوئی خلش یا تشکی ہے تو آپ پولیس کو تھوڑا سا ہلائیں جلائیں' شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو۔"

اس کے چہرے پر مسکراہٹ اب پوری طرح طلوع ہوئی اور وہ بدلے بدلے سے لہجے میں بولی۔ "اوہو..... آپ تو شاید ناراض ہوگئے چوہدری صاحب! مجھ میں دراصل یہی خرابی ہے کہ مجھے اچھا لگتا ہے اس سے پہلی ملاقات پر ہی میں فرض کرلیتی ہوں کہ اس سے میری برسوں کی دوستی ہے۔ اس سے اپنی اور اپنی الجھنیں اس طرح زور و شور سے ڈسکس کرنے لگتی ہوں جیسے وہ بھی ان پر میری ہی طرح تڑپ اٹھے گا اور ہر گتھی کو سلجھانے کے لئے بے چین ہوجائے گا۔ میں بھول گئی تھی کہ نصیر نواز صرف میرا دوست تھا' آپ کا نہیں۔ آپ بور نہ ہوں' میں اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گی۔"

اس نے بڑی ہوشیاری سے موضوع کا تاثر بدل دیا تھا۔ اب وہ ظاہر کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ وہ درحقیقت مجھے کرید رہی تھی۔ تاہم میں نے اپنا لہجہ خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے حق میں اچھا ہوگا۔ پہلی ملاقات پر ایسے ناگوار اور دل دکھانے والے موضوع زیر بحث نہیں آنے چاہئیں۔"

"بالکل درست کہا آپ نے۔" اس کے لہجے میں اب ایک عجیب قسم کی مٹھاس سی تھی "ویسے بھی مجھے اندازہ تھا کہ نصیر نواز کے ساتھ ایک روز نصیر نواز کسی افسوسناک انجام سے ہی دوچار ہوگا۔ اس میں ایک بڑی خرابی یہ بھی تھی کہ اپنی ہر طرح کی خواہشات کی تکمیل کے سلسلے میں وہ نتائج کی بالکل پروا نہیں کرتا تھا۔ جو کرنا ہوتا تھا' بس کر گزرتا تھا۔ یہ نہیں سوچتا تھا کہ کوئی بظاہر بھلی نظر آنے والی چیز گلے بھی پڑ سکتی ہے۔"

میں نے شیمپین کی بوتل اور سوڈے کے سائفن وغیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور پیجئے نا۔ آپ رک کیوں گئیں؟"

"بس۔" وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "طبیعت کی بے کیفی دور کرنے کے لئے اتنی ہی کافی ہے۔" پھر وہ کھنکتی سی آواز میں' دھیمی ہنسی کے ساتھ بولی "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ خود پیتے نہیں' دوسروں سے فرمائش کرتے ہیں کہ اور پئیں۔ شاید آپ دوسروں کو پیتا دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔"

"میرے ہاں ہر ذوق کے لوگ آتے ہیں۔ کاروبار کے سلسلے میں غیر ملکی پارٹیاں بھی آتی رہتی ہیں۔ ہوٹلوں کے علاوہ کبھی کبھی دکانوں کا یہاں بھی قیام و طعام یا کوئی چھوٹی موٹی تقریب ہوجاتی ہے۔ میں ان سب پر اپنے نظریات و افکار تو نہیں ٹھونس سکتا۔ اور ابھی میں خود کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ایسی کوئی بات کرسکوں۔ اس لئے میں واعظ و نصیحت نہیں کرتا۔ اگر کبھی میرے یہ اعمال اس قابل ہوگئے تو پھر شاید یہ جرأت کروں۔ فی الحال تو میں واقعی لوگوں کو کھاتے پیتے دیکھ کر خوش ہوتا ہوں' محظوظ ہوتا ہوں۔"

"اچھا چلئے ان باتوں کو چھوڑئے۔ میرا خیال ہے اس مختصر سی ملاقات میں ہم ایک دوسرے کو بہت بہتر طور پر جان گئے ہیں۔" وہ یکدم جیسے سارے مسائل کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بولی۔ "اب ذرا کچھ تفریح کی باتیں کرتے ہیں۔ انٹرکان میں آج رات ایک زبردست ڈانسر کا شو ہے۔ ہفتے میں تین دن شو ہوتا ہے۔ مرد ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ ٹکٹ بلیک میں بکتے ہیں۔"

"ایسی کیا خاص بات ہے اس میں؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

وہ ایک آنکھ کو خفیف سا دباتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "تم مرد ہو۔ یہ تو تمہیں بہتر طور پر معلوم ہونا چاہئے۔ سنا ہے یورپ اور بیروت وغیرہ کے بڑے کامیاب دورے کرکے آئی ہے۔"

"اس قسم کے ڈانس شوز میں کبھی کبھار اتفاقاً ہی جانا ہوا ہے۔ بطور خاص' ارادہ کرکے میں کبھی نہیں گیا۔" میں نے کہا۔

"لیکن اس میں تو چلنا پڑے گا۔ میرے پاس دو عدد وی آئی پی ٹکٹ ہیں۔ مجھے امید ہے آپ بور نہیں ہوں گے۔" اس کے لہجے میں اصرار تھا۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مرد تو عورتوں کو اس قسم کی دعوتیں دیتے رہتے ہیں لیکن کسی عورت کے منہ سے مرد کے لئے اس طرح کی دعوت [illegible] مجھے پہلی بار ہوا تھا۔ اس قسم کے ڈانس شوز میں میں نے [illegible] مردوں کے ساتھ ان کی بیویوں یا دوست عورتوں کو دیکھا تھا انہیں کافی بدمزہ ہی پایا تھا۔ کیونکہ ان کے ساتھی مردوں کی تمام تر توجہ ڈانسر کی ہوشربا حرکات پر ہوتی تھی۔ بعض کے منہ سے تو صرف رال بہنے کی کسر ہوتی تھی۔ ظاہر ہے ساتھی عورتوں کے لئے یہ کوئی قابل رشک صورت حال نہیں ہوتی تھی۔ لیکن طاہرہ خانم یقیناً ایک مختلف عورت تھی۔ یا پھر دوستی میں گرمجوشی لانے کے لئے اس کا طریق کار مختلف تھا۔

مجھے ایک لمحے کے لئے خاموش دیکھ کر وہ بولی۔ "ویسے بھی میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ شاید کہیں باہر ہی جانے کے لئے تیار ہوکر آئے تھے۔"

"جی ہاں۔ اسی لئے تو میں ڈانس شو کے بارے میں معذرت چاہوں گا۔ میری ایک اور ہوٹل میں باہر کی پارٹی سے کاروباری ملاقات طے ہے۔" میں نے حقیقتاً معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

وہ قدرے مایوسی سے بولی۔ "چوہدری صاحب! میرے قیافے عام طور پر غلط ثابت نہیں ہوتے۔ لیکن آپ کے بارے میں تو میرا علم قیافہ کچھ کچھ غلط ثابت ہوتا جارہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ اُن

لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کاروبار کو سر پر سوار کر لیتے ہیں۔ دن رات کاروبار کے سوا انہیں کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا۔ زندگی کی آسائشوں اور طرب و نشاط سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اور بالآخر وہ دوسروں کے لئے بینکوں میں اثاثوں کی صورت میں ڈھیروں دولت چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔"

اس میں شک نہیں تھا کہ میرے بارے میں اس عورت کے تمام اندازے درست تھے لیکن میں جان بوجھ کر انہیں غلط ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے یہ تمام اندازے مجھے محض ایک پارٹی میں دیکھنے کے بعد قائم کئے تھے۔ اگر اس سے ملاقاتیں شروع ہو جاتیں تو اس کے اندازوں کا جانے کیا عالم ہوتا!

وہ مجھے خاموش دیکھ کر گویا قائل کرنے کے لئے بولی۔ "انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کماتا ہے۔ اگر وہ اس دولت سے کوئی لطف ہی نہ اٹھا سکے تو کیا فائدہ؟"

میں نے اسے نہیں بتایا کہ یہ باتیں تو میں خود لوگوں سے کرتا رہتا تھا۔ اس کے بجائے میں نے کہا۔ "لطف' آسائشوں اور لذتوں کے بھی اپنے اپنے معیار ہوتے ہیں۔"

وہ میرے الفاظ پر توجہ دیئے بغیر بولی۔ "میں خود بھی ایک کاروباری عورت ہوں۔ اور عورت کو تو پیسے کا لالچ زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن میں نے کاروبار کو کاروبار کی جگہ رکھا ہوا ہے۔ چار بجے کے بعد میں ایک لمحہ آفس میں نہیں بیٹھتی اور نہ ہی اس کے بعد کوئی کاروباری مصروفیت رکھتی ہوں۔ میں بھی اگر دوسروں کی طرح چوبیس گھنٹے کاروبار کی فکر میں پھنسی رہوں تو اسے مزید وسعت دے سکتی ہوں لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ اس چکر میں اگر پھنس جاؤ تو پھر اس کی کوئی انتہا نہیں۔ جبکہ میں تو اپنے کاروبار کے موجودہ پھیلاؤ سے ہی تنگ ہوں۔ مجھ سے یہی نہیں سنبھلتا۔"

"کیا کاروبار ہے آپ کا؟ یہ میری نالائقی ہے کہ شہر کی بیشتر بے ہنگم قسم کی کاروباری شخصیات اور ان کے کاروبار سے تو واقف ہوں لیکن اس خشک اور بے کیف میدان میں ایسے حسین چہرے کی موجودگی سے بے خبر رہا۔"

وہ دلفریب انداز میں مسکرائی لیکن اس مسکراہٹ میں خفیف سی شرارت بھی پنہاں تھی' جیسے دل ہی دل میں کہہ رہی ہو..... "میں خوب سمجھ رہی ہوں تمہیں۔ بڑی شے ہو تم بھی۔ ایک طرف بے نیازی بھی جتا رہے ہو' دوسری طرف تعریف کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے'

بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ قدرے بے نیازی سے بولی۔ "چھوٹی موٹی کچھ انڈسٹریز ہیں۔ ڈسٹری بیوشن کا کچھ کام ہے۔ دو سینما ہیں۔ لیکن ہمارا شمار زیادہ بڑے لوگوں میں نہیں ہے۔ دوسرے میں چیمبر آف کامرس کی سرگرمیوں میں بھی بالکل حصہ نہیں لیتی۔ شاید اسی لئے آپ ہمارے وجود سے بے خبر رہے ہوں۔"

میں نے جب مزید کریدا تو وہ اسی بے نیازی سے ایک مشہور برانڈ کے ایک گھی' صابن اور پینٹ کا نام بتاتے ہوئے "ان تینوں چیزوں کے کارخانے ہیں۔ ان کے علاوہ شیخوپورہ پچھلے سال گارمنٹس اور ہوزری کے دو بڑے یونٹس لگائے ہیں۔ اسی سال ان کی پروڈکشن شروع ہوئی ہے۔ ٹیکسٹائل ملز کی بھی ایک ایک فیکٹری تھی۔ وہ دونوں میں نے بیچ دی ہیں۔ حالت اچھی نہیں تھی۔ یونینوں نے انہیں ڈوبنے کے قریب تھا۔"

"بہت خوب!" میں نے سر ہلایا۔

"یہ "بہت خوب" آپ کس بات پر کہہ رہے ہیں؟ اس پر کہ یونینوں نے فیکٹریوں کو ڈوبنے کے قریب پہنچا دیا تھا؟" وہ مسکراہٹ میں ہلکی سی شرارت برقرار رہی۔

"نہیں۔ اس بات پر کہ آپ ڈوبتے کاروبار کو بچانے اور کاروبار شروع کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔" میں نے کہا "سنا ہے آپ فلم انڈسٹری میں بھی قدم رکھ رہی ہیں۔"

"وہ تو بس ایسے ہی۔" وہ بے معنی سے انداز میں بولی۔ "دراصل وہ میں نصیر نواز کی خوشنودی کے لئے کر رہی تھی۔ کاروباری مقصد بھی اپنی جگہ تھا لیکن نصیر نواز کی خوشی عزیز تھی۔ آخر وہ دوست تھا۔"

میں نے اب تک دولت مند مردوں کو اپنی "خاص" دوستوں کے لئے اس طرح کی سرمایہ کاریاں کرتے دیکھا تھا۔ عورت تھی جس کے منہ سے میں ایک مرد کی خوشنودی کے لئے سرمایہ کاری کی بات سن رہا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اب آپ سے کیا چھپانا۔ دراصل پچھلے کچھ برسوں میں میرے کچھ ملازموں اور انکم ٹیکس وغیرہ کے کچھ وکیلوں نے اپنی دانست میں میری ہمدردی

اسلام کے نامور مجاہدین — قمر تسکین
اسلام کی نامور خواتین — قمر تسکین
سو مسلمان مشاہیر — قمر تسکین
ملک ملک کی عورتیں — قمر تسکین

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے کہ میرے پاس کافی بلیک منی ہے۔ ویسے تو بلیک منی خیر زیادہ تر بڑے کاروباری لوگوں کے پاس ہوتی ہی ہے۔ لیکن میری کچھ ایسی ہے کہ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وکیلوں اور وکیلوں نے کام پکا نہیں کیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں بلیک میل ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لئے نصیر نواز سے دوستی بہت گہری ہو گئی اور اس نے فلمیں بنا کر بلیک منی کو وہائٹ کرنے کا بہت اچھا فارمولا پیش کیا۔ میں نے ہامی بھر لی۔ لیکن اب اس کی موت کی وجہ سے کچھ بیچ میں رہ گیا۔"

"اوہ..... یہ تو بہت برا ہوا!" میں نے رسمی سے لہجے میں کہا۔

وہ بظاہر سرسری سے لہجے میں بولی۔ "آپ نے بھی تو آفاق کو فلمیں شروع کرا کے دی ہے۔ ابتدا میں آپ کا کتنی بلیک منی کو وہائٹ کرنے کا ارادہ ہے؟"

"ذرا سی بھی نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے بلیک منی کا ایک روپیہ بھی فلم انڈسٹری میں نہیں لگایا۔ اور نہ ہی وہائٹ کرنے کا ارادہ ہے۔ میرے پاس بلیک منی ہے ہی نہیں۔"

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر نوعمر لڑکیوں کے سے انداز میں ہنسنے لگی۔ "میں نے کوئی ناقابلِ یقین بات کہہ دی ہو۔ میری سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس کی ہنسی تھمی تو وہ بولی۔ "یہ تو یقین کرنے والی بات ہی نہیں۔ ہمارے ٹیکسوں کے نظام میں اگر کوئی کاروباری شخص سو فیصد صحیح چلے تو وہ آپ کی طرح بزنس ایمپائر بنانا تو دور کی بات' گزارا بھی نہیں کر سکتا۔ عین ممکن ہے وہ دیوالیہ ہی ہو جائے۔"

"نہیں۔ ایسی بھی بات نہیں ہے۔" میں نے متانت سے کہا۔ "میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے شروع سے ہی کچھ ماہرین معاشیات اور ان کے لوگوں کا تعاون حاصل ہو گیا۔ ہم نے بہت سے راستے نکال لئے جن پر چل کر دیانتداری سے بھی بہت تیز رفتار ترقی کی جا سکتی ہے۔"

"ایسے نایاب لوگوں سے تو ہمیں بھی ملوایئے گا۔ ہماری بھی کچھ مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ لہجہ معمولی سا استہزائیہ تھا۔

میں نے بُرا منائے بغیر کہا "ضرور۔ ضرور۔ ویسے اب تو میں بھی ان سب لوگوں سے اتنا کچھ سیکھ چکا ہوں اور اتنے تجربات سے گزر چکا ہوں کہ اگر میرے پاس معاشیات کی کوئی بڑی ڈگری ہوتی اور میں کاروبار میں اتنا نہ پھنس چکا ہوتا تو شاید بہت بڑا بینکر ہوتا۔ لوگوں کے سرمائے کو اس بری طرح الٹ پلٹ کرتا کہ دنیا بھر میں نہ جانے کتنی ایمپائرز کھڑی کر لیتا۔ میرے موجودہ کاروبار تو اس کے سامنے اونٹ کے منہ میں زیرے کے مصداق دکھائی دیتے۔"

یہ حقیقت تھی۔ میں اب کچھ ایسا ہی محسوس کرتا تھا۔ وہ میرے لہجے کی سنجیدگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کے چہرے سے خفیف سے تمسخر کے آثار غائب ہو گئے اور وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی "اگر کبھی کوئی بڑا پروگرام بنے تو مجھے یاد رکھئے گا۔ اپنی حیثیت کے مطابق میں بھی آپ کے ساتھ چلنے میں خوشی محسوس کروں گی۔ لیکن آپ کی فلم پروڈکشن والی بات پر میری حیرت اب بھی برقرار ہے۔ میرا خیال تھا کہ فلم انڈسٹری میں تو شاذ و نادر ہی کوئی وہائٹ منی لے کر جاتا ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ ہر کاروباری میدان کی طرح اس میدان میں بھی ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ میں فلم انڈسٹری کو زیادہ قریب سے تو نہیں دیکھ پایا لیکن جتنا دیکھ پایا ہوں اس سے کافی باتوں کا اندازہ ہو گیا ہے۔ ہر طرح کا آدمی آتا ہے۔ ہر طرح کا پیسہ لے کر آتا ہے۔ کچھ لوگ صاف ستھرا پیسہ لے کر آتے ہیں اور صرف کمانے کی دُھن لے کر آتے ہیں۔ دوسرے تمام کاروباروں کی طرح اسے بھی ایک کاروبار سمجھتے ہیں۔ کچھ بلیک منی بھی لے کر آتے ہیں۔ کچھ شوق کے تحت آتے ہیں۔ کچھ سٹرک پوری کرنے آتے ہیں۔ اس ٹریڈ کے رنگ ڈھنگ تھوڑے سے مختلف ضرور ہیں لیکن بنیادی باتیں تو وہی ہیں جو کسی بھی کاروباری میدان میں ہوتی ہیں۔"

"چلئے ایسا کیجئے۔" وہ پُرخیال انداز میں بولی۔ "کہ نصیر نواز کی غیر متوقع موت سے میرے جو پروگرام ادھورے رہ گئے ہیں انہیں جاری رکھنے میں آپ ہی میری کچھ مدد کیجئے۔ آفاق کے ذریعے سے میرا بھی کچھ روپیہ فلم انڈسٹری میں لگوا دیجئے۔ یوں تو بہت سے لوگ بہت سے منصوبے لے کر میرے پیچھے لگے رہتے ہیں لیکن میں چاہتی ہوں' جو بھی کام ہو کسی صحیح آدمی کے ہاتھوں سے ہو۔ پیسے کی مجھے کچھ زیادہ پروا نہیں۔ لیکن میں بالکل ہی ریت کے گھروندے بھی بنانا نہیں چاہتی۔"

وہ کچھ کچھ مجھ سے ملتے جلتے نظریات کا اظہار کر رہی تھی۔ آفاق کے ساتھ کام کا آغاز کرتے وقت میں نے بھی کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ طاہرہ خانم کی سرمایہ کاری کی پیش کش سن کر میں دل ہی دل میں وقت اور حالات کی بوالعجبی پر کچھ حیران بھی ہوا اور کچھ محظوظ بھی۔ میں بزنس کی دنیا میں آگے آگیا تھا تو ہر طرف سے سرمایہ چلا آ رہا تھا۔ جب مجھے ضرورت نہیں تھی تو بینک' شرفا' اسمگلر' بلیک مارکیٹیئے' غرضیکہ سبھی مجھے روپیہ دینے کو تیار تھے۔ آدمی جب غریب ہوتا ہے تو کوئی اسے دس روپے بھی اُدھار نہیں دیتا۔ اپنے پلے ڈھیروں روپیہ ہو تو بینک تک بھی مزید روپیہ دینے کو تیار رہتے ہیں۔ اور وہ بھی دوسروں کا روپیہ۔ پھر اگر اثر رسوخ ہو تو معاف بھی کر دیتے ہیں' بھول بھی جاتے ہیں۔ دنیا واقعی بڑی عجیب جگہ ہے!

میں نے ملائمت سے کہا "اپنی فلم کمپنی میں تیسرے پارٹنر کو شامل کرنے کے بارے میں تو فی الحال میں معذرت چاہوں گا۔ البتہ میں آفاق سے بات کر کے آپ کو بتاؤں گا۔ شاید وہ آپ کو نئی کمپنی

قائم کرنے میں پوری مدد دینے پر تیار ہو جائے۔ پیسے کی ضرورت تو ہر جگہ رہتی ہے۔ فلم انڈسٹری میں بھی پیسے والوں کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔"

"ہماری دلچسپی تو آپ میں ہے۔" وہ بلا جھجک بولی "ہم تو اس چیز سے تعلق جوڑنے کے تمنائی تھے جس سے آپ کا کوئی تعلق ہو۔ لیکن آپ انکار پر انکار کئے جا رہے ہیں۔ شاید ابھی آپ کھلنا نہیں چاہتے۔ یا پھر شاید اس لئے ہماری قدر کم ہو گئی ہے کہ ہم خود چل کر آپ کے دروازے پر آ گئے ہیں۔"

"بخدا ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا "آپ کا چل کر آنا میرے لئے باعث عزت افزائی ہے۔ آپ نے اس گھر کو عزت بخشی ہے۔ باقی یہ انسانوں کے معاملات میں انکار اور اقرار تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ کسی بھی معاملے میں میرا انکار پتھر پر لکیر ہرگز نہیں ہے۔ کل حالات بھی بدل سکتے ہیں' میری رائے بھی تبدیل ہو سکتی ہے' انکار اقرار میں بھی بدل سکتا ہے۔ آپ انڈسٹری اور کاروبار چلا رہی ہیں۔ آپ کو تو ان باتوں کا تجربہ ہونا چاہئے۔"

"تجربہ ہی تو نہیں ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "میرا مطلب ہے انکار سننے کا تجربہ نہیں ہے۔ کچھ خوش قسمتی رہی ہے میری۔ جدھر بھی نظر اٹھائی' آمادگی دیکھنے کو ملی۔ جس طرف بھی دست سوال دراز کیا' خالی واپس نہیں آیا۔ آج پہلی بار عزتِ نفس۔ یا یوں کہئے کہ نسوانی انا مجروح ہوتی محسوس ہوئی ہے۔"

"اوہ پلیز! ایسا ہرگز نہ سمجھئے۔ میری خواہش آپ کو دل گرفتہ کرنے کی ہرگز نہیں ہے۔ میں آپ جیسی نفیس عورت کو اپنے دوستوں میں ہی دیکھنا پسند کروں گا لیکن مجھے سنبھلنے کا موقع تو دیجئے۔ آپ کی ایک دم نوازشات نے مجھے بوکھلا دیا ہے۔"

میرے الفاظ سے گویا اس کی کچھ دلجوئی ہوی۔ بجھے ہوئے چہرے پر پھر مسرت کی ہلکی سی چمک ابھری اور وہ ایک بار پھر پہلے کی طرح مسکراتے ہوئے بولی "آپ بہت ڈپلومیٹک گفتگو کرتے ہیں۔ بہت محتاط آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھ سے بالکل الٹ طبیعت ہے آپ کی۔"

"بعض اوقات متضاد طبیعتوں کے لوگ زیادہ اچھے دوست ثابت ہوتے ہیں۔ اور یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ میں آپ سے بالکل ہی متضاد شخصیت کا مالک ہوں۔ عین ممکن ہے ہمارے درمیان بہت سی عادات مشترک پائی جائیں۔ بعض باتوں کا دھیرے دھیرے پتا چلتا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ مخمور سے انداز میں مسکرائی۔ میں اٹھ کر اس کے قریب جا بیٹھا اور بظاہر غیر ارادی سے انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ سرد مہری محض اس کا نقاب تھی ورنہ وہ تو سرتاپا حرارت و گداز تھی۔ مجھے قریب پا کر وہ یکدم اس نودمیدہ پھول کی طرح کھل گئی جس نے سورج کی پہلی کرن دیکھ لی ہو۔ شاید اس کی منشا یہی تھی۔ ساری تمہید اسی لئے تھی۔ نصیر نواز کی خود کشی کی چھان بین' شبہات کا اظہار' کاروبار کے منصوبے' روپے پیسے کی باتیں، کچھ وہ جیسے بھول گئی۔

اور یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔

چند لمحے بعد وہ بوجھل لہجے میں بولی "تو پھر چل رہے ہیں ہ ساتھ ڈانس شو میں؟"

"بار بار انکار کروا کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔" میں نے م دیکھتے ہوئے کہا "آج کے بزنس ڈنر کا انتظام میں نے ہی کیا۔ اب اگر میں خود ہی غائب رہوں گا تو اچھا محسوس نہیں ہو گا۔ شو تو ابھی چلتا ہی رہے گا۔ آپ پر نسس تہمینہ کے شو کی بات کر ہیں نا؟ میں نے ایک انگریزی اخبار میں اس کا اشتہار دیکھا تھا۔ غالباً ابھی ایک ماہ چلے گا۔ پھر کسی دن سہی۔"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اچھا..... جیسے آپ مرضی۔"

"میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "اب یہ "آپ جناب کچھ عجیب نہیں لگ رہا؟"

"بہت زیادہ میں تو تمہاری وجہ سے یہ انداز تخاطب ب رکھے ہوئے تھی۔ ورنہ جو لوگ میرے دل میں کھب جاتے ہیں کے ساتھ "آپ جناب" کرتے ہوئے مجھے دلی تکلیف ہوتی ہے وہ فوراً بولی۔

"ویسے یہ میرا آپ کے دل میں کھب جانے کا حادث اچانک ہی نہیں ہو گیا؟ میں نے تو نہیں سوچا تھا کہ قسمت کبھی طرح بھی مجھ پر مہربان ہو سکتی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا

"میرے ساتھ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو صورت اچھی لگتی ہے وہ پہلی نظر میں ہی اچھی لگ جاتی ہے۔ ورنہ خواہ زندگی صاحب سلامت رہے لیکن ہم سے کوئی ناتا استوار نہیں ہو پاتا۔" وہ میرے قریب سمٹتے ہوئے بولی "اور میرا خیال ہے زیا لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے لیکن انہیں اعتراف میں د لگ جاتی ہیں۔ میں لمبے چکروں میں نہیں پڑتی۔ کہ تم مجھے اچھے تو پہلے میں ذرا میٹھی میٹھی نظروں سے بھی کبھار تمہاری طر دیکھوں۔ تم پیش قدمی کرو تو ذرا نخرے دکھاؤں۔ مہینوں دو دو ر باتیں ملاقاتیں چلتی رہیں' پھر دوستیوں اور قربتوں کے مر آئیں۔ مجھ سے اتنا انتظار نہیں ہوتا۔ میں بڑی بے تاب اور صبری عورت ہوں۔ اور میں نے اپنے اوپر کوئی خول نہیں چ رکھا۔ جو کچھ بھی ہوں' تمہارے سامنے ہوں۔ چاہے مجھے ا سمجھو یا بجری۔"

"تم بہت اچھی ہو۔ اور حوصلے والی بھی۔" میں نے دھیمے میں کہا۔

"اب میں چلتی ہوں۔" وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی "تم نے اچھی کہہ دیا' بس اب میں مطمئن ہوں۔ میرے اندر گزار گئے ہیں۔ باقی باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ اب میں تمہاری جان چ

ہوں تاکہ تم بزنس ڈنر میں شرکت کر سکو۔"

وہ ایک سروقد عورت تھی جس کے سراپا میں زلفِ دراز سے کر پائے نازک تک کچھ عجیب سے بھید چھپے ہوئے تھے۔ وہ ن تھی تو خوبصورت لگتی تھی' کھڑی ہوتی تھی تو خوبصورت تر۔

میں نے شاید یونہی اس کے پیکر سے توجہ ہٹانے کے لئے ھا "طاہرہ! تم نے اپنی دولت خود کمائی ہے یا کوئی خاندانی ورثے ہ کا سلسلہ ہے؟"

"کچھ تو خاندانی طور پر بھی میں ٹھیک ٹھاک ہی تھی۔ اس کے بعد شوہروں نے مجھے نہایت حسین قسم کی بیوگی سے دوچار کیا۔ یعنی مر گئے لیکن میرے لئے بہت کچھ چھوڑ گئے۔ انہوں نے مجھ سے ت نہیں کی تھی لیکن باقی ہر طرح سے میرا بہت خیال رکھا تھا۔ ں کے ساتھ مجھے دنیا گھومنے اور بہت کچھ سیکھنے کا بھی موقع ملا ۔ اس لئے ان کے بعد میں نے اس دولت اور بزنس میں اضافہ یا۔ محض عورت اور وہ بھی تنہا عورت ہونے کے باوجود اسے برباد ں کیا۔ لیکن ساتھ ساتھ میں نے خود کو بھی برباد نہیں کیا۔ ہروں کے زمانے میں میں نے بڑی گھٹن کی زندگی گزاری۔ یکے ر دیگرے دونوں ہی مجھے ایک جیسے ملے۔ لیکن اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ زندگی کو انجوائے کروں گی۔ سو وہ میں کر رہی ں۔ میں عمر میں تم سے بڑی ہوں لیکن میرا دل شاید تم سے زیادہ ان ہے۔"

"بے شک۔ بے شک۔" میں نے یہ بات تسلیم کرنے میں ہی افیت سمجھی۔ وہ دروازے کی طرف چل دی تھی۔ میں اس کی لداری کے لئے اسے رخصت کرنے باہر اس کی گاڑی تک آیا۔ میرے طویل و عریض لان پر پھیلی ہوئی دنیا بھر کے رنگا رنگ پھولوں کی کیاریوں کی وجہ سے فضا میں بھینی بھینی خوشبو کی آمیزش تھی۔

وہ چاروں طرف دیکھ کر' آسمان کی طرف منہ کر کے ایک بہت طویل سانس لے کر بولی۔ "کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے' ساری خوشبوئیں' ساری رونقیں' ساری لذتیں اور ساری خوشیاں اپنے رگ و پے میں اتار لوں۔ میں واقعی ایک بے صبری اور بے قناعت عورت ہوں۔"

میں خاموش رہا۔ میں اس کے الفاظ اور اس کی شخصیت میں الجھا ہوا تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھی لیکن ایک عجیب اور مختلف عورت ضرور تھی۔ جھرجھری سی لے کر وہ اپنے محسوسات کی دنیا سے باہر آتے ہوئے بولی۔ "اب کسی دن تم میرے گھر آؤ۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ شاعرانہ زبان میں تمہارے لئے بام و در سجاؤں۔ لیکن مجھے معلوم ہی نہیں ہے کہ بام و در کیسے سجائے جاتے ہیں۔ ہاں البتہ میں یہ ضرور کروں گی کہ میرا کک تمہارے لئے دنیا کے بہترین کھانے پکائے گا۔ میں تمہارے لئے دنیا کی بہترین موسیقی کی کیسٹس جمع کروں گی۔ دنیا کی بہترین ڈرنکس اور وائن کا انتظام کروں گی۔"

لیکن یہ کہتے ہوئے اسے گویا کچھ یاد آیا اور وہ قدرے مایوسی سے بولی۔ "مگر اس اہتمام کی کیا ضرورت ہے؟ تم پیتے ہی نہیں۔"

"میرا کچھ بھروسا بھی نہیں ہے۔" میں نے قدرے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں ناقابلِ اعتبار سا آدمی ہوں۔ کوئی بعید نہیں کہ تم جیسا پلانے والا میسر آ کے تو پینے بیٹھ ہی جاؤں۔"

"جو لوگ خود اپنی زبان سے اپنے آپ کو ناقابلِ اعتبار کہتے ہیں وہ عموماً زیادہ قابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔ اور جن کی زبانیں اپنے قابلِ اعتبار ہونے اور اپنی پارسائی کا ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتیں وہ عموماً بالکل ناقابلِ اعتبار اور اندر سے غلیظ ہوتے ہیں۔" وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

میں گاڑی پر جھکا تو کھڑکی کے فریم کے قریب مجھے ایک خاصا گہرا ڈینٹ نظر آیا۔ وہاں سے پینٹ بھی اکھڑ گیا تھا۔ خوبصورت اور چم چم کرتی گاڑی پر یہ گڑھا اور داغ گڑھ کے نشان کی طرح چمک رہا تھا۔ حالانکہ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی مگر حسن پرستی میری فطرت کا ایک حصہ تھی۔ میں طاہرہ خانم کی توجہ اس طرف دلائے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہ کہاں مار دی تھی گاڑی؟ ٹھیک نہیں کرایا اس ڈینٹ کو؟" میں نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ خوبصورت چیزوں میں عیب میری آنکھ میں کھٹکتا تھا۔ خصوصاً ایسا عیب جسے دور کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا تھا۔

اس نے دروازے سے سر نکال کر جھک کر اس ڈینٹ کو دیکھا اور بولی "ارے ہاں۔ گاڑی کو ڈینٹر پینٹر کے ہاں بھجوانا یاد ہی نہیں رہتا۔ دراصل یہ میری پسندیدہ ترین گاڑی ہے۔ ہر وقت میرے استعمال میں رہتی ہے۔ ایسا موقع ہی نہیں ملتا کہ اسے ایک دو دن کے لئے چھوڑ دوں۔ اور تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں نے گاڑی کہیں ماری نہیں تھی۔ میں بڑی زبردست ڈرائیور ہوں اور میری خوش قسمتی ہے کہ دوسروں کی غلطیوں سے بھی زیادہ تر محفوظ ہی رہتی ہوں۔ یہ ڈینٹ تو بس عجیب ہی انداز میں پڑ گیا۔ بس یوں سمجھو کہ کسی بھاگتے چور کا نقشِ قدم ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے کسی خاص دلچسپی کے بغیر یونہی سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"کسی نہ کسی پارٹی' کسی نہ کسی تقریب کی وجہ سے میں اکثر ہی رات کو دیر سے گھر پہنچتی ہوں" وہ بتانے لگی۔ "یہ تین دن پہلے کا واقعہ ہے۔ اس رات بھی میں بہت دیر سے گھر پہنچی تھی۔ میں گیٹ کے سامنے چند سیکنڈ کے لئے رکی تھی۔ ابھی چوکیدار نے گیٹ نہیں کھولا تھا۔ اچانک ایک سیاہ کیڈلک اتنی تیزی سے میرے قریب سے گزری کہ میں سمجھی' شاید اس کا ڈرائیور بےگراں پری" ریس میں حصہ لینے کی مشق کر رہا ہے۔ معاملہ یہیں تک ہوتا تب بھی کوئی بات نہیں تھی لیکن اس منحوس نے آندھی طوفان کی طرح جاتے جاتے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر دھات کا کوئی سیاہ باکس

سا میری طرف اچھال دیا۔"

میں یکدم چونکا۔ میرے ڈھیلے پڑے ہوئے اعصاب گویا ایک جھٹکے سے بیدار ہوگئے۔ طاہرہ خانم میرے اس تغیر سے بے خبر' بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "وہ شاہ سے آکر میری گاڑی کی اس کھڑکی سے ٹکرایا۔ اچھا خاصا وزنی معلوم ہوتا تھا' جس نے لگن جیسی گاڑی میں اچھا خاصا ڈینٹ ڈال دیا۔ شکر ہے اس وقت کھڑکی کا شیشہ چڑھا ہوا نہیں تھا ورنہ شاید یہ بھی ٹوٹ جاتا۔ اس گاڑی کی کھڑکی چونکہ خاصی بڑی ہے' اس لئے اس شخص نے شاید وہ باکس کھڑکی کے راستے اندر ہی پھینکنے کی کوشش کی تھی لیکن طوفانی رفتار کی وجہ سے اندازہ غلط ہوگیا اور باکس نیچے کہیں جا گرا۔"

میری سانس تقریباً رک گئی تھی اور میں بمشکل اپنے آپ کو کسی سوال سے باز رکھے ہوئے تھا۔ میں طاہرہ خانم کی بات بھی سن رہا تھا اور ساتھ ہی میرا ذہن تیزی سے حالات کا تجزیہ کرنے کی بھی کوشش کررہا تھا۔ طاہرہ خانم کی میرے ہاں آمد قطعی غیر متوقع تھی اور وہ اپنے دامن میں میرے لئے غیر متوقع سی ہی نوازشات بھی سمیٹ کرلائی تھی۔ اور اب اس نے مجھے اسی سیاہ باکس کی کہانی بھی سنانی شروع کردی تھی۔ کہیں یہ سب کچھ کسی سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تو نہیں تھا؟ کہیں اس کے سرے کہیں اور جاکر تو نہیں ملتے تھے؟ کہیں طاہرہ خانم کی اصل شخصیت کچھ اور تو نہیں تھی؟ لیکن اس رخ سے معاملہ بیان کرنے سے اس کیا فائدہ حاصل ہوسکتا تھا؟ میں ان سب پہلوؤں پر غور کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

دوسری طرف یہ سب محض اتفاق بھی ہوسکتا تھا۔ قسمت کبھی کبھی عجیب ہی انداز میں مجھ پر مہربان ہوتی تھی اور بالکل غیر متوقع طور پر کسی چیز کا سراغ ہاتھ آجاتا تھا۔

طاہرہ خانم کہہ رہی تھی۔ "میں نے کیڈلک والے کو بہ آواز بلند دو تین گالیاں دیں اور گاڑی سے اتر کر دیکھنے کا ارادہ ہی کررہی تھی کہ اس نے کیا پھینکا تھا' اچانک سڑک کے موڑ سے ایک دوسری گاڑی نمودار ہوئی۔ وہ سفید رنگ کی کوئی نامعلوم سی گاڑی تھی۔ سیاہ کیڈلک اس وقت تک کافی آگے نکل چکی تھی لیکن سفید گاڑی کی رفتار بھی کچھ کم نہیں تھی اور وہ یقیناً کیڈلک ہی کے تعاقب میں تھی۔ میں نے گاڑی سے اترنے کا ارادہ ترک کردیا۔ سفید گاڑی بھی میرے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ اس وقت تک چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ میں ڈرنے والی عورت نہیں ہوں لیکن اس وقت ذرا خوفزدہ سی ہوگئی تھی۔ معلوم نہیں کیا چکر تھا۔ میں فوراً گاڑی اندر لے گئی۔ گاڑی ڈرائیو وے میں کھڑی کرنے کے بعد میں چوکیدار کے ساتھ دوبارہ باہر آئی اور درحقیقت تب ہی میں نے دیکھا کہ میری طرف اچھالی جانے والی وہ چیز سیاہ رنگ کا ایک عجیب سا باکس تھا۔"

وہ غالباً باکس کی ساخت بیان کرنے لگی تھی لیکن اس سے پہلے میں نے اس کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے پوچھا۔ "ایسا ہی تھا وہ؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے قدرے حیرت سے بولی۔ "ایسا ہی تھا۔ لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"وہ میرا ہی باکس ہے۔" میں نے ذہن میں کوئی خاص بندی کئے بغیر کہا۔ "اس میں میری کچھ نہایت بیش قیمت چیزیں چند اہم دستاویزات ہیں۔ بہت خطرناک قسم کے کچھ جرائم لوگوں نے اسے چرا لیا ہے۔ میں تو اس کی طرف سے مایوس ہوچکا تھا۔ لیکن بیٹھے بٹھائے یک دم ہی تمہاری طرف سے یہ خبری سننے کو مل گئی۔ تم نے اسے سنبھال کر تو رکھا ہے؟ بے ہودہ سے کہیں اِدھر اُدھر تو نہیں پھینک دیا؟" میں کوشش کے باوجود اپنے لہجے کی بے تابی کو مکمل طور پر نہیں چھپا سکا۔

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔ "میں نے کب کہا کہ وہ میں نے اٹھالیا تھا؟ میں تو بتانے لگی تھی کہ وہ وہیں پڑا تھا جہاں چند لمحے پہلے میری گاڑی کھڑی تھی۔ وہ میں ہی کچھ عجیب سا لگ رہا تھا' جیسے کسی بڑی مشین کا کوئی حصہ ہو۔ مجھے اس سے خوف محسوس ہوا کہ کہیں کوئی خطرناک چیز نہ ہو۔ جانے کیوں مجھے وہم سا ہو رہا تھا کہ اگر اس کے ساتھ غلط طریقے سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کی گئی تو کہیں دھماکے سے پھٹ نہ جائے۔"

مجھے دل ہی دل میں اس عورت کو داد دینا پڑی۔ اس کی حسیات اس کی صحیح رہنمائی کرتی تھیں۔ میں نے بے تابی سے پوچھا۔ "اگر تم نے اسے اٹھایا نہیں۔ تو پھر کیا کیا؟"

"میں نے ڈرتے ڈرتے اسے پاؤں سے تھوڑا سا کھسکا کر دیکھا۔ خاصا وزنی تھا۔" طاہرہ بولی "پھر میں نے چوکیدار کو حکم دیا کہ اسے اسی طرح احتیاط کے ساتھ پاؤں سے آہستہ آہستہ کھسکاتے ہوئے کچھ دور ایک بنگلے کی دیوار کے ساتھ لگا دے۔ وہ بنگلا کافی عرصے سے خالی پڑا ہے۔" وہ سانس لینے کو رکی۔

"پھر؟" میں اب اپنی بیتابی کو چھپانے کی کوشش کررہا تھا۔

"بس۔ چوکیدار کے ذریعے اسے اپنے گھر سے ذرا دور پہنچا کر میں اندر آکر سو گئی۔ چوکیدار کو بھی میں نے سختی سے منع کردیا تھا کہ اسے اپنی جگہ سے اٹھانے یا چھونے کی کوشش نہ کرے۔ پھر میں اس چیز کو بھول گئی۔ صبح میں ذرا دیر سے آفس جانے کے لئے نکلی تب وہ مجھے دوبارہ یاد آیا اور میں نے جاتے جاتے اس خالی بنگلے کی دیوار کی طرف دیکھا۔ باکس وہاں نہیں تھا۔"

"وہاں نہیں تھا؟" میں نے مردہ سے لہجے میں پوچھا۔ "کوئی لے گیا تھا اسے؟"

"مجھے کیا معلوم۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"شاید چوکیدار کو معلوم ہو۔" میں نے ایک موہوم سی امید کے سہارے کہا۔

"شاید معلوم ہو۔ میں نے تو اس سے پوچھا نہیں تھا۔" اس کی بے نیازی برقرار رہی "رات گزر گئی اور دن چڑھ آیا تو مجھے وہ چیز اہم سا لگنے لگا تھا۔ ویسے بھی میں اس قسم کی باتوں میں سر نہیں کھپاتی جن کا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہو۔"

"چلو' چوکیدار سے چل کر پوچھتے ہیں۔" میں نے جلدی سے اور اس کے برابر بیٹھنے کے لئے گاڑی کے دوسرے دروازے کی طرف بڑھا۔

وہ گاڑی سے اتر آئی اور حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم میرے ساتھ چلو گے؟ میرے گھر؟"

"ہاں۔ کیوں' اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"تمہیں تو بہت ضروری بزنس ڈنر میں جانا تھا۔ تم تو ڈانس شو بھی جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔" اس نے ہلکے سے طنزیہ لہجے میں مجھے یاد دلایا۔

میں نے اس کے طنز کا بُرا منائے بغیر کہا۔ "یہ کام بزنس ڈنر سے زیادہ ضروری ہے۔"

"وہ آہ بھر کر دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں اس کے برابر جا بیٹھا۔ وہ ونڈ اسکرین سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "واہ! تیری اس دنیا میں ہر کوئی غرض کا بندہ ہے۔ اپنا کام پڑتا ہے تو پھر میں کیسے پروگرام بدل جاتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ اسے یہ باتیں کرنے کا حق تھا۔ ویسے بھی اس کا ذہن باکس میں الجھا ہوا تھا۔ ریڈ ڈاٹ والے جسے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا رہے تھے وہ چیز راستے میں لاوارث پڑی رہ گئی تھی اس کے لئے اس کی اہمیت تھی ان میں سے کسی کی بھی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔

"طاہرہ خانم!" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ "تمہیں حق حاصل ہے کہ اس عاجز و مسکین پر طنز کے جتنے تیر چلانا چاہو چلالو لیکن مجھے جلد از جلد وہاں لے چلو جہاں تم نے باکس چھوڑا تھا۔"

"عاجز و مسکین!" وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر اپنے مخصوص کھنکتے انداز میں ہنسی "مزا دیتے لگتے ہیں تمہاری شخصیت کے ساتھ یہ الفاظ۔"

"میری شخصیت میں کون سا سُرخاب کا پر لگا ہوا ہے۔ میں تو ایک عام سا گناہ گار... انسان ہوں۔ ویسے بھی یہ عام سی بات ہے کہ جب کوئی الجھن میں ہوتا ہے تو اسے دیکھ کر دوسروں کو ہنسی آتی ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

وہ قدرے سنجیدگی سے بولی۔ "کیا واقعی وہ باکس تمہارے لئے بہت اہم ہے؟"

"ہاں۔ بہت زیادہ۔" میں نے جواب دیا حالانکہ مجھے ابھی یقیناً معلوم نہیں تھا کہ وہ میرے لئے کیوں اہم تھا۔ شاید اس لئے کہ ریڈ ڈاٹ اس میں بہت دلچسپی لے رہی تھی اور میں ریڈ ڈاٹ کا کوئی سرا ہیر تلاش کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

"میں تو تفریح کی تلاش میں تمہارے پاس آئی تھی لیکن مجھے لگ رہا ہے' جیسے کوئی جاسوسی کہانی شروع ہوگئی ہے۔"

"جاسوسی کہانی میں کیا کم تفریح ہوتی ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ میں اب اپنے اندرونی ہیجان پر قابو پاچکا تھا اور پُرسکون نظر آنے کی پوری پوری کوشش کررہا تھا۔

"تمہارے ساتھ رہنے کا موقع ملا تو شاید اس قسم کے چکروں سے بھی لذت اندوز ہونے کا ہنر سیکھ لوں۔" وہ بولی۔

وہ حقیقتاً بڑی خوب صورت اور مہارت سے ڈرائیونگ کررہی تھی۔ جاپانی قسم کی گاڑی اس کے مرمریں ہاتھوں میں کھلونا معلوم ہورہی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ ریڈ ڈاٹ کی طرف سے فون پر مجھ سے باتیں کرنے والا ایڈم عرف ایڈی جب بھی رابطہ قائم کرتا تھا' یہی تاثر دیتا تھا کہ وہ لوگ میری تمام نقل و حرکت سے واقف رہتے تھے۔ اس کا مطلب یہی ہوسکتا تھا کہ ان کا کوئی نہ کوئی آدمی ہر وقت میرا تعاقب کرتا تھا لیکن میں نے جب بھی ایسے کسی شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی تو مجھے کم از کم اپنے تعاقب میں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ صرف ایک آدھ بار اے ٹن نے میرا تعاقب کیا تھا۔ لیکن وہ بات پرانی ہوچکی تھی۔ اب تو کافی دنوں سے وہ بالکل ہی غائب تھا۔ مجھے تو اس کی جھلک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔

اب بھی احتیاطاً میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ میرے اپنے آدمی تو میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میری نگرانی کا سلسلہ منقطع کرچکے تھے۔ لیکن مجھے شبہ ہوا کہ کوئی اور گاڑی میرا تعاقب کررہی تھی۔ گہرے سے رنگ کی وہ ٹویوٹا کافی دور تھی بریک پر اور بھی گاڑیاں رواں تھیں لیکن اس پر نہ جانے کیوں مجھے تعاقب کا شبہ ہوا۔ اس میں اے ٹن ہرگز نہیں تھا۔ گاڑی میں صرف ڈرائیو کرنے والا ہی تھا اور وہ کوئی معزز قسم کا بزنس مین معلوم ہوتا تھا۔ غالباً سوٹ میں تھا' کوٹ ٹائی کی جھلک نظر آئی تھی۔ وہ ہونٹوں میں سگریٹ دبائے بظاہر اپنے خیالوں میں مگن ڈرائیو کرتا آرہا تھا۔ میں مڑ کر گاڑی کے عقبی شیشے سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے انداز و اطوار میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ گردوپیش سے اس کی لاتعلقی مصنوعی سی لگ رہی تھی۔

میں نے طاہرہ خانم سے کہا۔ "تم اپنی ڈرائیونگ کی بڑی تعریف کررہی تھیں۔ تمہاری اہلیت کا امتحان لینے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔"

پھر میں نے عقب نما آئینے میں اسے وہ گاڑی دکھائی اور کہا۔ "مجھے شبہ ہے کہ یہ گاڑی ہمارا تعاقب کررہی ہے۔ پہلے تو ذرا دو چار سڑکوں پر اسے لمبے لمبے دو چار بے مقصد قسم کے چکر دے کر تصدیق کرو کہ یہ واقعی ہمارے ہی پیچھے ہے۔ اس کے بعد اس سے پیچھا چھڑانا ہے۔ کرلوگی یہ کام؟"

"گل ای کوئی نئیں بادشاؤ۔" وہ چٹکی بجا کر بولی۔ یکایک ہی اس میں نو عمر لڑکیوں والا وہ چلبلا پن نظر آنے لگا تھا جس کی مجھے کم از کم اس کی طرف سے ہرگز توقع نہیں تھی۔

اس نے گاڑی کی رفتار یکدم بڑھائی اور اسے لہراتے ہوئے دوسری گاڑیوں کے درمیان سے نکالتے ہوئے بولی۔ "میں وقت بے وقت ہر طرح کی سڑکوں پر تنہا گاڑی دوڑائے پھرتی ہوں۔ کبھی کبھار نو دولتیوں کے شدے سے لڑکے کار یا اسپورٹس موٹر سائیکل وغیرہ پر میرے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ انہیں چکر دینے اور زچ کرنے میں مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ حالانکہ ان میں سے بھی بیشتر ڈرائیونگ یا رائیڈنگ میں بڑے بدمعاش ہوتے ہیں لیکن میں انہیں بھی جب چاہتی ہوں مجھ دے دیتی ہوں۔ ڈاج دینے میں بڑی ماہر ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔"

"حسن کے ایسے نوخیز قدر دانوں کو تمہیں ڈاج نہیں دینا چاہئے۔ ان کی قدر دانی سے تو استفادہ کرنا چاہئے۔" میں نے کہا۔

وہ مصنوعی خفگی سے ایک نظر میری طرف دیکھ کر بولی۔ "میں تفریح پسند اور عیش کوش ضرور ہوں لیکن کھلونا نہیں ہوں۔ میرا معیارِ نظر اب اتنا گرا ہوا بھی نہیں ہے کہ ہر راہ چلتے سے' ہر لوفر لفنگے سے' ہر انجانے سے' ہر باچھیں کھلاتے ہوئے چند سے پینگیں بڑھانے لگوں۔ میں ایک ٹیسٹ فل عورت ہوں۔ میرا کوئی ذوق ہے۔"

"نصیر نواز تو مجھے کوئی اچھا آدمی معلوم نہیں ہوا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ کم از کم ہینڈسم تو تھا۔ اور سوسائٹی میں اس کا کوئی مقام تھا۔ وہ کوئی راہ چلتا' گمنام اور باپ کی دولت پہ اکڑنے والا لفنگا سا نوجوان تو نہیں تھا۔ اس چکر میں البتہ میں نہیں پڑتی تھی کہ اسے اعلیٰ انسانی اقدار کے پیمانے سے ناپوں۔" وہ باتیں بھی کرتی جا رہی تھی اور اس گاڑی پر نظر بھی رکھے ہوئے تھی۔

بڑی ہوشیاری سے اس نے اِدھر اُدھر کی سڑکوں پر چند میل کا چکر کاٹا اور یہ بات طے ہو گئی کہ گہرے رنگ کی ٹویوٹا ہمارے تعاقب میں تھی۔ وہ شخص غالباً سمجھ گیا تھا کہ ہم تعاقب کی تصدیق کر رہے ہیں اور اب جبکہ یہ بات ظاہر ہو ہی گئی تھی تو اس نے احتیاط چھوڑ دی تھی اور فاصلہ بھی کم کر لیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اسے گھیرنے کی کوشش کرتا۔ آج کل مجھے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کسی سراغ کی شدت سے تلاش تھی اور شاید وہ ایک سراغ ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن اس وقت میرا ذہن صرف سیاہ باکس میں الجھا ہوا تھا۔ فی الحال اس کے سوا مجھے کوئی چیز اہم نہیں لگ رہی تھی۔

"یہ لدھڑ کا بچہ ہے تو ہمارے ہی تعاقب میں۔" طاہرہ خانم بولی۔ "کون ہے یہ؟"

"کاش مجھے معلوم ہوتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"کیا کرنا ہے اس کا؟" طاہرہ نے بالکل اس انداز میں جیسے کسی خانساماں کے سامنے آلو وغیرہ رکھے ہوں اور وہ پوچھ رہی ہو۔ "کیا کرنا ہے ان کا؟" چپس بنانے ہیں یا بھرتا؟"

"فی الحال تو اس سے صرف پیچھا چھڑا لو۔ میں نہیں چاہتا کہ اس بات سے آگاہ ہو کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

چند لمحے بعد بالکل فلمی قسم کی کار چیزنگ شروع ہو گئی۔ اس شخص کو دھکا چھپا نہیں بلکہ علی الاعلان قسم کا ڈاج دینے ہوئی تھی۔ شہر کے راستوں سے بھی وہ خوب واقف تھی اور "علم" سے حاظر دماغی کے ساتھ فائدہ اٹھانے میں بھی اس کا جواب نہیں تھا۔ تعاقب کرنے والا شاید ایک عورت سے اس قسم کی ڈرائیونگ کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ شروع میں شاید وہ کچھ گیا تھا لیکن اس نے بہرحال ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔

طاہرہ بالآخر گاڑی فیروز پور روڈ کی طرف نکال لے گئی وہاں اس نے ون وے کا نہایت خوبصورتی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس طرح ٹویوٹا والے کو ڈاج دیا کہ وہ سر پیٹتا رہ گیا ہوگا۔ اچھرہ ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں ذرا سا چکرانے کے بعد طاہرہ جلد ہی واپس فیروز پور روڈ پر نکل آئی۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ تعاقب کرنے والا یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ ہم چند منٹ بعد وہیں واپس آ جائیں گے جہاں سے ہم نے اسے چکمہ دیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اچھرہ کی گلیوں میں ہماری تلاش میں بھٹک رہا ہوگا۔ جبکہ طاہرہ جمال کے راستے آندھی طوفان کی طرح واپس گلبرگ کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔

سہراس کرنے کے بعد جب اسے اطمینان ہو گیا کہ تعاقب کرنے والے کا کہیں دور دور تک پتا نہیں تو وہ تحسین طلب نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئی بولی۔ "کیسا ہے؟"

"بہت اچھا ہے۔" میں نے ہولے سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "اطمینان رکھو' اگر کبھی ڈاج دینے کے سلسلے میں کوئی ایوارڈ ہوا تو وہ یقیناً تمہیں ہی ملے گا۔"

"تمہاری تھپکی ہی میرے لئے ایوارڈ ہے۔" وہ مسرور لہجے میں بولی۔ "فیروز پور روڈ تو ذرا غنیمت قسم کی سڑک ہے' اگر میں کسی اور گھٹیا اور ناکارہ قسم کے ہائی وے کی طرف لے جاتی تو ممکن نہ کہیں اسے کچے میں لڑھکنیاں بھی کھلا سکتی تھی۔ اس کے شاید وہ گاڑی سے زندہ سلامت برآمد نہ ہوتا۔"

"خیر۔ اب اتنے تردد کی بھی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے کہا "میرا مشورہ ہے کہ تم جو فلمیں فائنانس کرو گی ان میں چیزنگ کے مناظر خود ہی پکچرائز کر دیا کرنا۔ تمہیں تو کیمرا ٹرک بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

وہ دھیرے سے ہنسی اور بولی۔ "فلمی کار چیزنگ تو بہت ہی بھلی لگتی ہے مجھے۔ ہنسی آتی ہے دیکھ کر۔ ٹکڑے جوڑ جوڑ کر ناظرین کو بے وقوف بناتے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ منافع بخش کاروبار کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"کیا؟ کار چیزنگ؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ لوگوں کو بے وقوف بنانا۔" میں نے جواب دیا۔

وہ ایک بار پھر دھیرے سے ہنسی۔ اتنے قریب سے اس کی یہ ساختہ اور جلترنگ سی ہنسی سن کر دل میں گدگدی سی ہوتی جلد ہی اس نے گاڑی اپر مال سے ملحق علاقے کی ایک کشادہ سڑک پر لے جا روکی۔

"لو جی' یہ آ گیا۔ گھر پیارا گھر۔ میرا گھر' میری جنت وغیرہ وغیرہ۔" وہ انجن بند کر کے دونوں ہاتھوں سے اپنے کھلے بال سمیٹتے ہوئے بولی۔ سامنے ایک خاصا اونچا آہنی گیٹ نظر آ رہا تھا۔ بظاہر گیٹ پر لوہے کی لکیروں سے بے معنی سے پیٹرن بنے دکھائی دے رہے تھے لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ وہ عمر خیام کی وہی خیالی اور علامتی تصویر تھی جو کہیں کہیں بنے میں آتی ہے۔ وہی ایک شاعرِ مدہوش و پریشان خیال۔ وہی جام۔ وہی اس میں سے نمودار ہوتی ہوئی ایک سرمست و پُرناز حسینہ۔ وہی ایک ساز۔ وہی فضا میں بکھرتے ہوئے سُروں کی علامتیں۔ تصویر بہت پرانی تھی۔ عام ہو چکی تھی۔ کینڈر والوں نے اسے چیپ کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں ایک خاص موڈ کے آدمی کو متاثر کرتی تھی' بہت سی دوسری پرانی چیزوں کی طرح۔

"طاہرہ خانم! تم واقعی ایک خاص سج کی باذوق عورت ہو۔" میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ "صرف نصیر نواز کی ابتر دوست ہونے کی وجہ سے مجھے تمہاری خوش ذوقی پر شک ہونے لگتا ہے۔"

"تم تو کہتے ہو کہ تم نصیر نواز کو جانتے نہیں تھے' پھر اس کے بارے میں اتنے بدگمان کیوں ہو؟" اس نے ترچھی نظر سے میری طرف دیکھا۔

"میں بھی تمہاری طرح انسان کے بارے میں قیافے اور محسوسات کی بنیاد پر کوئی نہ کوئی رائے رکھنے کا عادی ہوں۔ اور نصیر نواز کے بارے میں وہ رائے کچھ اچھی نہیں۔ اور پھر اس نے اپنی خودکشی کے سلسلے میں جو خط چھوڑا تھا اس سے بھی تو اس کا کتنا گھٹیا کردار سامنے آتا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور گاڑی سے اتر آئی۔ اس کی کوٹھی کی دیوار سے اتنی بیلیں اور اتنے بہت سے گھنے درخت جھانک رہے تھے کہ اصل عمارت ان کے عقب میں ہی چھپ کر رہ گئی تھی۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا' سیاہ فام نوجوان تھا۔ کندھے پر بڑی شاندار قسم کی چائنا رائفل لٹکائے ہوئے تھا لیکن شکل سے کچھ بے وقوف ہی دکھائی دے رہا تھا۔

طاہرہ نے اسے گیٹ پر ہی کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور مجھے اپنے ساتھ ایک دیوار کے قریب لے جاتے ہوئے بولی۔ "میں نے یہاں تک کھسکایا تھا اس باکس کو۔ اور آخری بار میں نے تکیے کے اندھیرے میں اسے یہیں پڑے دیکھا تھا۔"

"تمہارے چوکیدار کا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"عبدالرشید راجپوت۔ اسے پورے نام سے مخاطب کرو تو بہت خوش ہوتا ہے۔" طاہرہ نے جواب دیا۔

میں نے واپس آ کر چوکیدار کو دوستانہ لہجے میں مخاطب کیا۔ "عبدالرشید راجپوت! تمہیں معلوم ہے وہ کالا باکس جو اُس رات تم نے بھی دیکھا تھا اور جسے بیگم صاحب نے پاؤں سے کھسکا کر ادھر دیوار کے ساتھ چھوڑا تھا' کہاں گیا؟"

"ہاں جی۔ معلوم ہے۔ اسے ٹین ڈبے والا لے گیا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ میری دھڑکن جو ایک لمحے کے لئے تیز ہوئی تھی دوبارہ سست پڑ گئی۔

"ٹین ڈبے والا..... وہ کون ہے؟" میں نے ایک لمحے کے لئے خود کو چند محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"ٹین ڈبے والا تو بس ٹین ڈبے والا ہی ہوتا ہے نا صاحب جی!"

عبدالرشید عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اسے گویا معلوماتِ عامہ میں میری کمزوری دیکھ کر خاصا صدمہ پہنچا تھا۔ پھر وہ ذہن پر زور دے کر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہی لوگ جی' وہ جو ٹھیلوں پر کاٹھ کباڑ لادے آواز لگاتے پھرتے ہیں۔ ردی اخبار' خالی بوتلیں' ٹین ڈبے وغیرہ لے لیتے ہیں۔"

"اوہ' اچھا وہ۔" میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ شاید یہ اتفاق ہی تھا کہ میں نے اپنے علاقے میں آج تک کوئی ٹین ڈبے والا نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ اس قسم کے علاقوں میں مجھے کوئی سے بھی ٹھیلے اور خوانچے والے شاذ و نادر ہی دکھائی دیئے تھے۔ میں سمجھتا تھا' شاید وہ اس گئے ان علاقوں میں نہیں آتے کہ ان کی صدا یہاں صدا بہ صحرا ہی ثابت ہوتی ہوگی۔ اتنے بڑے بڑے گھروں میں' تقریباً ساؤنڈ پروف کمروں میں ان کی آوازیں کہاں پہنچتی ہوں گی۔

عبدالرشید بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ادھر کوٹھی بنگلوں میں جو نوکر چاکر ہیں وہ ان ٹھیلے والوں کو کاٹھ کباڑ بیچتے رہتے ہیں جی۔ انہیں چار پیسے مل جاتے ہیں۔"

اب میری سمجھ میں آیا کہ ٹھیلے والے تو آتے تھے لیکن ان سے خرید و فروخت اب نوکروں کے شعبے میں چلی گئی تھی اس لئے مجھ جیسوں کو ان کے وجود کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ میں تو ان لوگوں کو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔

"تم تو اس ٹھیلے والے کو جانتے ہو گے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"میں بھلا کیسے جاننے لگا صاحب جی! میں نے تو آج تک اس کے ہاتھ کوئی چیز نہیں بیچی۔" یہ کام گویا اس کے مقام و منصب کے خلاف تھا اور یہ پوچھ کر میں نے گویا اسے ڈی گریڈ کر دیا تھا جس کا

اس نے یقیناً دل ہی دل میں برا منایا تھا لیکن میں چونکہ اس کی بیگم صاحب کے ہمراہ تھا اس لئے وہ از راہ مروت بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہاں سے چار پانچ ٹھیلے والے گزرتے ہیں۔ وہ بھی انہی میں سے ایک ہے لیکن وہ کبھی کبھار آتا ہے۔ شاید اس نے علاقوں کی باری باندھ رکھی ہے۔ وہ جب آتا ہے تو صبح ہی صبح سب سے پہلے آتا ہے۔ میں اس وقت دودھ والے کے لئے گیٹ کھول رہا تھا' اس لئے اتفاق سے میں نے اسے وہ ڈبا اٹھا کر ٹھیلے پر رکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں نے سوچا بھی کہ کم سے کم اسے خبردار ہی کردوں کہ اسے احتیاط سے ایک طرف رکھے۔ کہیں کوئی خطرناک چیز نہ ہو' بیگم صاحب نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا۔ لیکن پھر میں نے سوچا' مجھے کیا پڑی ہے۔ ویسے بھی ڈبا رات بھر وہیں پڑا رہا تھا۔ کچھ نہیں ہوا تھا۔"

میرے چہرے پر یقیناً خاصی مایوسی پھیل گئی تھی۔ تبھی طاہرہ خانم نے چوکیدار کو اپنی جگہ واپس جانے کا اشارہ کیا اور تسلی آمیز انداز میں میرا کندھا تھپکتے ہوئے بولی۔ "اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ اب جہاں اتنا سراغ مل گیا ہے وہاں آگے بھی سراغ ملتا چلا جائے گا۔ کہانیوں میں بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ میں دوسرے نوکروں' نوکرانیوں سے پوچھ گچھ کروں گی۔ ڈبے والے کا ضرور کچھ پتا چل جائے گا۔ جونہی وہ دوبارہ اس گلی میں آیا' اسے پکڑ کر یہاں بٹھا لیا جائے گا اور تمہیں فوری اطلاع دی جائے گی۔ میں اس سلسلے میں تمہاری پوری مدد کروں گی۔ تمہاری تشویش دیکھ کر مجھے یقین آگیا ہے کہ وہ واقعی تمہارے لئے کوئی اہم چیز ہے۔ لیکن فی الحال اس کی فکر ذہن سے اتار دو' اسے بھول جاؤ۔ میرے گھر آئے ہو' مجھے یاد رکھو۔ آؤ میرے ساتھ۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر اندر چل دی۔ اس کے لہجے اور لفظوں میں خلوص تھا۔ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ اب وہ باکس واقعی مل جائے گا۔ میرے دل کو قرار سا آگیا۔

چند لمحے بعد میں اس کے خوبصورت اور آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اس کے ڈرائنگ روم کو یقیناً کسی بہت اچھے انٹیریئر ڈیکوریٹر نے پلان کیا تھا۔ دیواروں میں شیشے کے بڑے بڑے کیس اس طرح نصب تھے کہ دیواروں ہی کا حصہ معلوم ہو رہے تھے۔ ان میں مصنوعی سبزہ' پودے اور پھول لہلہا رہے تھے اور انہی کے اندر خفیہ روشنیوں کا کچھ ایسا انتظام تھا کہ رات کے وقت بھی دن کا سماں تھا اور کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک شاہانہ ڈرائنگ روم کے لوازمات کسی سبزہ زار میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ طاہرہ خانم کو یقیناً ہریالی اور پھولوں سے پیار تھا۔ اس کی کوٹھی کی اصل عمارت کے گرد بھی ایک خوبصورت اور گھنا باغ موجود تھا جس نے عمارت کو اپنے دامن میں تقریباً چھپا رکھا تھا۔ کمروں اور راہداریوں میں بھی کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی طرح اس نے پھولوں اور سبزے کو جگہ دے رکھی تھی۔

میں بیٹھ چکا تو وہ مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ "شوق تھا مجھے تمہاری آمد پر ڈھیروں اہتمام کرنے کا۔ لیکن تمہاری یہاں آمد یوں اچانک لکھی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تمہاری کیا مدارت کروں۔"

"تم میری صرف یہ مدارت کرو کہ میرے لئے ٹھنڈے پانی کا ایک جگ بھر کر منگواؤ۔ اس کے بعد تقریباً جگ ہی بھتنا بڑا گرم گرم بلیک کافی کا منگوالو۔"

"اتنی ٹھنڈی چیز کے بعد یکدم اتنی گرم چیز؟" وہ مسکرائی۔

"کبھی کبھی میں توازن اسی طرح برقرار رکھتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کے بعد کیا پروگرام ہے؟" اس نے بٹلر کو طلب کر کے دونوں چیزوں کا حکم دینے کے بعد پوچھا۔

"اس کے بعد وہی ڈانس شو دیکھنے چلیں گے جس کے ٹکٹ تمہارے پاس ہیں" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اور تمہارا وہ بزنس ڈنر۔؟" اس نے ایک بار پھر یاد دلایا۔

"بھاڑ میں گیا بزنس ڈنر۔" میں نے کہا۔

"جب میں کہہ رہی تھی اس وقت تم بزنس ڈنر کو بھاڑ میں بھیجنے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھے۔" وہ مسکرائی۔

"میں نے کہا نا کہ میرا کچھ پتا نہیں ہوتا۔"

"عجیب آدمی ہو تم بھی۔"

"میں تمہاری رائے سے سو فیصد متفق ہوں۔"

"ویسے کھانا گھر میں بھی تیار ہے۔" وہ بولی۔

"وہیں ڈنر بھی کرلیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ وہ بہت خوش نظر آنے لگی۔

کچھ دیر بعد جب ہم گھر سے روانہ ہونے لگے تو میں نے کہا "کل صبح سے میرا ایک آدمی تمہارے گیٹ کے پاس موجود رہے گا اور جونہی وہ ٹین ڈبے والا نظر آئے گا یا کسی اور ذریعے سے سیاہ باکس کے بارے میں کوئی سراغ ملے گا' وہی اس سلسلے میں ضروری کارروائی کرے گا۔"

"وہ کیا گیٹ کے پاس کھڑا رہے گا؟" طاہرہ نے حیرت سے پوچھا

"نہیں۔ گاڑی میں ہوگا۔ میرا مطلب ہے صرف ایک نہیں ہوگا۔ ڈیوٹی بدلتی رہے گی۔ چوبیس گھنٹے کوئی نہ کوئی موجود رہے گا۔ میں نے اس لئے بتا دیا ہے کہ اپنے گھر کے قریب مستقلاً کسی کو موجود دیکھ کر تم پریشان نہ ہو جاؤ۔"

"میرے گھر میں ایک الگ انیکسی موجود ہے جسے میں گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کرتی ہوں۔ تمہارا کوئی بھی آدمی اس میں آکر ٹھہر سکتا ہے۔ لیکن اس کی ضرورت کیا ہے؟ میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ تمہیں ضرور اس سلسلے میں اطلاع مل جائے گی۔" میں نے یقین دلایا۔

اُداس جنگل کی خُوشبو

------★ اے حمید

میں نے اِس لڑکی کو دیکھا ہے، جس کی یہ ناکام داستان مُحبت ہے۔ وہ غروب ہوتے سُورج کی غم زدہ روشنی میں چنار کے درختوں میں سے گزر رہی تھی۔ اِس کا چہرہ اُداس تھا۔ اِس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ رُخساروں پر رات کو بہائے ہوئے آنسوؤں کے نشان تھے۔

آنسو خشک ہوگئے، مُحبت کرنے والے جُدا ہوگئے----

یادیں باقی رہ گئیں----- یہ لڑکی کون تھی؟

"اداس جنگل کی خُوشبو" اِسی اداس چہرے والی لڑکی کی داستانِ مُحبت ہے۔

ناشر: مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2 قیمت -/100 روپے

ایک عظیم ناول----------ایک عظیم تاریخ

فاتح بیت المقدس

سلطان صلاح الدین ایوبی

عظیم ناول نگار الماس ایم - اے کے قلم سے

اُردو زُبان کا سب سے زیادہ ضخیم و عظیم ناول

ناشر: مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2 قیمت -/450 روپے

"میں نے سوچا شاید چوکیدار صحیح طور پر دھیان نہ رکھ سکے اور وہ ٹین ڈبے والا نکل جائے۔" میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"میں چوکیدار کے علاوہ ایک نوکر کی ڈیوٹی بھی لگا دوں گی۔ اس کے علاوہ میں خود کل صبح اپنے ملازموں کے علاوہ پاس پڑوس کے بھی دو چار ملازموں کو بلوا کر "تفتیش" کروں گی۔ ہو سکتا ہے' ٹین ڈبے والے کی آمد کا انتظار بھی نہ کرنا پڑے۔ اس کا کوئی ٹھکانا وغیرہ ہی معلوم ہو جائے۔ تم مجھ پر بھروسہ رکھو۔ اس ڈبے کے لئے تمہاری پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی۔ دل چاہ رہا ہے....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا دل چاہ رہا ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"دل چاہ رہا ہے وہ ڈبا ابھی کہیں سے مل جائے اور میں اسے تمہارے سر پر دے ماروں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"اگر وہ مل جائے تو میں تمہاری اس حرکت کا بھی بُرا نہیں مناؤں گا۔"

"یقیناً۔ کیونکہ تم بُرا منانے کے قابل ہی نہیں رہو گے۔ تمہاری کھوپڑی ٹوٹ چکی ہوگی۔" وہ اطمینان سے بولی۔

ہم جب ہوٹل پہنچے تو شو کا ٹائم شروع ہوئے آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔ مگر شو ابھی تک شروع نہیں ہوا تھا۔ مشتاقانِ دید کے صبر کا پوری طرح امتحان لیا جا رہا تھا۔ شو کے لئے ہوٹل کا ہال روم مخصوص کر دیا گیا تھا اور اس میں ایک خصوصی اسٹیج اور میزیں لگا دی گئی تھیں۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کسی تیسرے درجے کے تھیٹر کی طرح دیواروں کے ساتھ بھی لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ تین چار پولیس والے بھی موجود تھے۔ ٹکٹ بہت مہنگا تھا' اس کے باوجود اتنا رش دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس ہوٹل میں کسی بھی تقریب یا شو وغیرہ کے سلسلے میں مَیں نے کبھی ایسا ہجوم نہیں دیکھا تھا۔ تاہم طاہرہ خانم کے لئے سب سے اگلی وی آئی پی قطار میں ایک میز خالی تھی جس کے ساتھ صرف دو نشستیں تھیں۔

غنیمت یہ رہا کہ ہمارے بیٹھتے ہی شو کی تمہید شروع ہو گئی۔ یعنی ہال کی بتیاں بجھ گئیں اور اسٹیج کے تاریک پردے پر رنگ برنگی روشنیاں چکرانے لگیں۔ ہیجان خیز قسم کی مغربی موسیقی سے فضا مرتعش ہو گئی۔ دھیرے دھیرے پردہ ہٹا اور روشنیاں اسٹیج پر چکرانے لگیں۔ پھر یکدم یہ روشنیاں بھی غائب ہو گئیں اور موسیقی بھی ایک جھٹکے سے دم توڑ گئی۔ ہال میں سکوت چھا گیا۔ صرف لوگوں کی گہری سانسوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بالکل ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی بڑے سے غار میں بہت سے ریچھ اجتماعی شب خوابی کا پروگرام بنا کر سو رہے ہوں۔

پھر اچانک ہی ایک چھناکا سا ہوا' اسٹیج پر بجلیاں سی چمکیں اور وہ قیامت یکدم سامنے کودی جس کے انتظار میں سب دل تھام کر بیٹھے تھے۔ ڈانسر کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ چھت کی طرف سے اسٹیج پر کودی ہو۔ اس کا سراپا اور رقص کا انداز دیکھ کر مجھے ہال میں مردوں کی تعداد پر تو حیرت نہ رہی لیکن وہاں کئی عورتیں موجود تھیں' صرف طاہرہ خانم ہی نہیں تھی۔ ان کی موجودگی میری حیرت ضرور برقرار رہی۔ شاید وہ یہ "تحقیق" کرنے آئی تھیں کہ مرد کس بات پر لٹو ہوتے ہیں۔

پھر جب ڈانسر پرنسس تہمینہ نے موسیقی تیز ہونے کے ساتھ یہ ثابت کرنا شروع کیا کہ اس کے رگ و پے میں بجلیاں دوڑ رہی ہوئی تھیں تو ہال میں اچھا خاصا شور ہونے لگا حالانکہ وہاں اکثر شہر کے معززین کی تھی لیکن مجھے اس روز معلوم ہوا کہ شہر کے معززین کا بھی سیٹیاں بجا کر اور بڑھکیں مار کر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ان دنوں اس قسم کے ڈانس شو پر کوئی خاص پابندی نہیں تھی۔ اونچے ہوٹلوں' ڈراموں' حتیٰ کہ میلوں ٹھیلوں میں بھی ڈانس کا کوئی نہ کوئی موقع نکلتا رہتا تھا۔ بڑے شہروں میں تو نائٹ کلب تک کھلے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود لوگ پرنسس تہمینہ کا ڈانس کچھ اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار موقع ملا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ زبردست رقاصہ تھی۔ اس کو اچھل پھل کرنے کا فن اسے خوب آتا تھا۔ لیکن ابھی تک اس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا۔ اسپاٹ لائٹ ابھی تک اس پر نہیں پڑی تھی۔ لوگوں کو چہرے سے شاید کچھ زیادہ غرض نہیں تھی۔ پھر رقص میں کچھ اور روانی آئی تو ایک اسپاٹ لائٹ پرنسس تہمینہ کے چہرے پر پڑی اور میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

طاہرہ خانم میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھانے کی کوشش کرتی ہوئی گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔ "دیکھا۔ میں نہ کہتی تھی تمہارے دل پر بھی ضرور بجلیاں گرائے گی۔ مگر اب آپا' انسان اپنی سیٹ سے ہی اٹھ جائے۔ پلیز اب بیٹھ جاؤ۔ جذبات کا اظہار بیٹھے بیٹھے ہی کرتے رہو۔ ڈانسر کی جگہ بننے کی کوشش نہ کرو۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے نیچی آواز میں کہا۔ "میں زدہ ہو کر نہیں اٹھا ہوں۔ دراصل مجھے تو اس لڑکی کی طلب یہ کسی اور نام سے مجھے کچھ دے چکی ہے۔"

"کوئی بات نہیں جان خانم!" وہ پچکارنے کے سے انداز میں بولی۔ "ان عورتوں کا کام ہی کچھ دے ہوتا ہے۔ ہر گھڑی' ہر نہ جانے کن کن مردوں کو نچھ دیتی ہوئی کہاں سے کہاں ہیں۔ نہ جانے کتنے ملکوں میں کتنی جائیدادیں بنا لیتی ہیں۔ بینکوں میں ان کے اکاؤنٹ ہوتے ہیں۔ تم بھی اب اس کو بھول جاؤ اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

میں بیٹھ تو گیا کیونکہ میرے پیچھے والی میزوں سے شور ہونے لگا تھا۔ شرفا کا نظارہ خراب ہو رہا تھا۔ طاہرہ خانم دھیرے دھیرے میرا ہاتھ سہلا رہی تھی جیسے کسی روتے ہوئے بچے کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی ہو۔

"تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ بات دراصل یہ ہے....."

کہ چند دن پہلے وہ لڑکی عجیب پُراسرار حالات میں مجھے ملی تھی۔ اس نے اپنا نام حسنہ بتایا تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر بھی لے گئی تھی۔ پھر اسی رات اس گھر سے غائب بھی ہو گئی تھی۔ میں اس کے چکر میں اسی کی وجہ سے پڑا تھا۔ اسی رات ریٹائرڈ ڈی ایس پی شجاع فرار ہوتے ہوئے حادثے کا شکار ہو کر مر گیا تھا۔ الجھے ہوئے معاملات تھے اور ان کے سرے نہ جانے کہاں کہاں مل رہے تھے۔ معاملات کا سب سے زیادہ تعلق ریڈ ڈائٹ سے معلوم ہوتا تھا۔

پرنسس تہمینہ کے ڈانس شو کا اشتہار میں نے کل ہی اخبار میں دیکھا۔ اس میں لہو کو گرمانے والی اس کی تصویر بھی شامل تھی۔ کچھ اس قسم کی تصویر تھی جس میں چہرے کو ایکسپوز کرنے پر توجہ دی جاتی ہے۔ میں نے بھی چہرے کی طرف توجہ کم ہی کی۔ کچھ ہیئر اسٹائل اور میک اپ وغیرہ کا بھی عمل دخل تھا۔ میں اسے حسنہ کی حیثیت سے نہیں پہچان سکا تھا۔ پہچانا تو میرا اس پر شبہ بھی نہیں گیا تھا۔ ویسے بھی پرنسس تہمینہ کا سرکے طور پر کئی ملکوں میں جانا پہچانا تھا۔ میں اس رات سوچ نہیں سکتا تھا کہ مجھے اپنا نام حسنہ بتانے والی لڑکی پرنسس تہمینہ ہے۔ اس نے بھی یقیناً دل ہی دل میں شکر ادا کیا ہو گا کہ میں خیالی سے بے وقوف بن گیا۔

اب میں اس رات کے واقعات کو یاد کر رہا تھا تو مجھے ایک اور بات عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق پرنسس تہمینہ اصلاً ترکی کی باشندہ تھی۔ لیکن اس رات جب وہ حسنہ مجھے ملی تھی تو مجھے اس پر غیر ملکی ہونے کا شبہ تک نہیں ہوا۔ کسی صورت کی حد تک تو ایک پاکستانی اور ترک لڑکی میں کوئی حد فاصل مقرر کرنا بڑا مشکل تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کا لہجہ بھی خالصتاً پاکستانی تھا۔ اس میں کسی غیر ملکی لہجے کی جھلک نہیں تھی۔ جبکہ اخبار میں ڈانس شو کا جو اشتہار چھپا تھا اس میں بتایا گیا تھا کہ پرنسس تہمینہ کا یہ پاکستان کا پہلا دورہ تھا۔

یہ سب الجھنیں تو اپنی جگہ تھیں لیکن فی الحال طاہرہ خانم مجھ سے بڑی الجھن بننے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ میری بات کاٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میں سب سمجھ رہی ہوں۔ اس قماش کی عورتیں' تقریبات میں' جہاں بھی شہر کے چیدہ چیدہ مردوں کو دیکھ لیتی ہیں' فوراً دوستی گانٹھ لیتی ہیں۔ لیکن یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ کسی اور نام سے نچھ دے چکی ہے' یہ بات البتہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ شو بزنس کی عورتوں کا نام ہی تو ان کا اصل نام ہوتا ہے۔ اور بھلا ان کے پاس ہوتا ہی کیا ہے؟ ان کے نام کی شہرت اور شہرت کی چکا چوند سے ہی تو متاثر ہو کر لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ لیکن اگر کسی کو کچھ عرصہ ان کے ساتھ رہنے کا موقع میسر آ جائے تو سارا شوق اتر جاتا ہے....."

لیکن تھا وہ ابھی شو بزنس کی عورتوں کی زندگی کے بارے میں مزید سبق آموز حقائق سے مجھے آگاہ کرتی لیکن' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم بات کو بالکل غلط رخ سے لے رہی ہو۔ معاملہ یہ نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جس رات مجھے وہ بلیک باکس....."

طاہرہ خانم نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا "اف میرے خدا..... پھر وہی بلیک باکس!" پھر وہ چھت کی طرف دیکھ کر کراہنے کے سے انداز میں بولی۔ "وے میرا سوہنیا ربا' توں ای ایس بندے تے رحم فرما۔"

اس التجا کے بعد اس نے ترحم آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور گویا بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔ "ایک حسین عورت اتنا زبردست ڈانس پیش کر رہی ہے اور ایک حسین عورت تمہارے پہلو میں بیٹھی ہے۔ لوگ اکیلے بھی بیٹھے ہیں تو دنیا کو بھولے بیٹھے ہیں۔ اور ایک تم ہو کہ جسے اس منحوس بلیک باکس کے سوا کچھ سوجھ ہی نہیں رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی طیارہ کریش ہو جائے اور جائے حادثہ سے اس کا بلیک باکس غائب ہو جائے تو ائرلائن والے شاید اسے..... بھی اس جوش و خروش اور دیوانگی سے تلاش نہ کریں جو تم نے اپنے سر پر سوار رکھی ہے۔"

پھر وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ "دیکھو' وہ بلیک باکس کتنا بھی قیمتی سہی' اس میں کتنی ہی قیمتی دستاویزات اور ہیرے موتی سہی۔ لیکن وہ سب چیزیں زندگی سے زیادہ قیمتی تو نہیں۔ تم اس پر شکر ادا کیوں نہیں کرتے کہ تم اس وقت صحت اور تندرستی کے ساتھ زندہ ہو اور ان گنت نعمتیں' آسائشیں' دولت اور عیش و نشاط کا سامان تمہارے قبضے میں ہے۔ وہ سب چیزیں تمہارے پاس موجود ہیں جن کا اس ملک میں بسنے والے نہ جانے کتنے لوگوں نے کبھی خواب تک نہیں دیکھا۔ تم صرف انہی سے انجوائے کیوں نہیں کرتے؟ فی الحال اس ذلیل منحوس بلیک باکس کو بھول کیوں نہیں جاتے؟"

میں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔ عام حالات میں میرے بھی بالکل یہی خیالات ہوتے تھے جن کا وہ اظہار کر رہی تھی۔ یعنی وہ میرا ہی فلسفہ میرے منہ پہ مار رہی تھی۔ میری اپنی حماقتوں کی وجہ سے یہ نوبت آئی تھی۔ میں اپنے اعصاب اور اپنی زبان پر اس طرح کنٹرول نہیں رکھ پا رہا تھا جس طرح ہمیشہ رکھا کرتا تھا۔ ایک لمحہ پہلے میں ایک حماقت اور کرنے لگا تھا۔ یعنی طاہرہ خانم کو بلیک باکس والا اصل واقعہ سنانے لگا تھا جس سے یہ ظاہر ہو جاتا کہ وہ درحقیقت میری ملکیت نہیں تھا۔ میں تو محض اس کی پُراسراریت اور ریڈ ڈائٹ کی وجہ سے اس میں دلچسپی لے رہا تھا۔ جبکہ آج شام ہی میں طاہرہ خانم سے کہہ چکا تھا کہ وہ میری ملکیت تھا اور اس میں میری کچھ قیمتی چیزیں تھیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ طاہرہ خانم نے جھنجلاہٹ میں میری بات کاٹ دی ورنہ میری تضاد بیانی سامنے آ جاتی۔ ایسی حماقت مجھ سے شاذ و نادر ہی سرزد ہوتی تھی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے ملائمت سے کہا۔ "آئی ایم سوری۔ واقعی میں نے بلیک باکس کو اپنے سر پر کچھ زیادہ ہی سوار کرلیا ہے۔ لیکن خیر۔ اب میں اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ بس سمجھ لو میں نے لعنت بھیج دی اس پر۔"

میں پرنس تہمینہ کی طرف متوجہ ہوگیا جو اب ڈانس کا پیٹرن بالکل بدل کر جمناسٹک کے سے کچھ کرتب دکھا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی موسیقی کا انداز بھی بدل گیا تھا۔

"ذرا دیکھو تو۔" طاہرہ ہولے سے میرا ہاتھ دبا کر بولی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت کے جسم میں ہڈی تو کہیں ہے ہی نہیں۔"

"ہاں۔ واقعی۔" میں نے خلوصِ دل سے اس کی تائید کی اور محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ میں نادانستہ طور پر اب تک اس کی طرف سے جتنی بے توجہی برت چکا تھا' اب اس کی تلافی کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے چہرے پر سرشاری اور آنکھوں میں نشیلا پن سا آگیا۔

پرنس تہمینہ کے جمناسٹک کے کرتب دیکھ کر لوگ دم بخود بیٹھے تھے۔ لیکن یہ مرحلہ جلد ہی ختم ہوگیا۔ موسیقی نے ایک بار پھر کروٹ لی اور اس نے دوبارہ رقص شروع کردیا۔ رقص میں اس نے یکے بعد دیگرے سات پیٹرن بدلے' یعنی اس کے رقص میں کم از کم سات ملکوں کے روایتی رقص اور ثقافت کی جھلک تھی۔ اس نے مسلسل تقریباً ایک گھنٹے رقص کیا۔ اتنی دیر لگاتار ایسا "جان توڑ" قسم کا رقص کرنا اور بیچ میں جمناسٹک کے کرتب بھی دکھانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ رنگ برنگی روشنیوں میں اس کے جسم پر پسینہ چمک رہا تھا۔ لیکن اس کی پھرتی و مہارت اور جسم کے لوچ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی وہ شگفتگی بھی برقرار تھی جو وہ اولین لمحے میں اپنے ساتھ لے کر اسٹیج پر اتری تھی۔

بالآخر موسیقی نے دم توڑ دیا اور وہ حاضرین کے سامنے تشکر کے اظہار کے لئے جھک گئی۔ اسپاٹ لائٹس صرف اس کے وجود پر مرتکز تھیں۔ باقی اسٹیج تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگ تالیاں بجا بجا کر اپنے ہاتھ توڑے ڈال رہے تھے۔ میں نے بھی سوچا کہ تالیاں بجانے میں کنجوسی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ میں بھی خاصے جوش و خروش سے تالیاں بجانے لگا۔ میرا خیال تھا' اس سے طاہرہ بھی خوش ہوگی کہ میرا ذہن تفریح کی طرف مائل تو ہو چکا تھا۔

لیکن دنیا کسی حال میں بھی خوش نہیں رہتی۔ میں نے زیادہ تالیاں بجائیں تب بھی طاہرہ خانم نے میرا ہاتھ روک دیا اور مصنوعی خفگی سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "کچھ تالیاں آئندہ کے لئے بھی بچا رکھو۔ یہ اس ہوٹل کی تاریخ کی آخری ڈانسر نہیں ہے۔ امید ہے یہاں آئندہ بھی ڈانسرز آتی رہیں گی۔"

"تمہاری مرضی۔" میں نے معصومیت سے کہا۔ "میں تو تمہاری خوشی کے لئے بجا رہا تھا۔ تمہیں بڑا شکوہ تھا کہ میں اس عظیم فنکارہ کے فن کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے رہا۔"

"بہت بدمعاش ہو تم۔" وہ سہلاتے ہوئے بولی۔ اس دوران دھیرے دھیرے اسٹیج کا پردہ گر گیا اور ہال کی بتیاں روشن ہوگئیں۔ میں اٹھ کر اسٹیج کے بائیں ونگ کی طرف بڑھا۔ مجھے معلوم تھا ادھر سے آرائشی پردوں کے عقب سے ایک راستہ اسٹیج کے پیچھے جاتا تھا۔ اس ہال میں چونکہ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد کوئی غیر معمولی شو ہوتا رہتا تھا' اس لئے اسٹیج کے عقب میں کپڑے کی ایک قطار کو مستقل طور پر ڈریسنگ روم' میک اپ روم میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ شو ختم ہونے کے بعد آرٹسٹ وہیں جاتے تھے۔

میں ایک قدم بھی بڑھا نہیں پایا تھا کہ طاہرہ خانم نے ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اس بار اس کی گرفت میں گداز اور حرارت کم' سختی زیادہ تھی۔

"تم کہاں چل دیئے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے حسنہ۔ میرا مطلب ہے پرنس تہمینہ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پانچ منٹ میں واپس آرہا ہوں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اور بھی بہت سے لوگ اسٹیج کے عقبی حصے کی طرف جارہے تھے۔

وہ خفگی سے بولی۔ "میں تمہیں اس لئے یہاں نہیں لائی کہ تم مجھے چھوڑ کر پرنس تہمینہ سے "ضروری باتیں" کرتے پھرو۔ یہ تو مل بیٹھنے اور موڈ خوشگوار بنانے کا ایک بہانہ تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن تم مجھ پر اعتبار کرو۔ میں اس پر فریفتہ ہونے کے ارادے سے ہرگز نہیں جارہا۔ یہ محض ایک اتفاق ہے کہ اس کا تعلق ایک پُراسرار معاملے سے نکل آیا ہے۔ وہ مشکوک عورت ہے۔ میرا اس سے بات کرنا ضروری ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"اس قسم کی عورتوں کا اکثر ہی پُراسرار معاملات سے کوئی تعلق بن جاتا ہے۔ لیکن تمہیں ایسے کسی معاملے میں پڑنے سے بات کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ تم پولیس والے ہو یا آئی ڈی والے؟" طاہرہ مجھے دوبارہ نشست پر بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ کوئی اور عورت ہوتی تو شاید میں ایک ہاتھ رسید کردیتا۔ لیکن وہ کمبخت ایک تو حسین بھی اوپر سے ستم یہ کہ دل کی بہت اچھی تھی۔ کسی قسم کی لگی لپٹی رکھے بغیر اور تمہیدیں باندھے بغیر اس نے پہلی ملاقات میں ہی اور جتا بھی دیا تھا کہ وہ مجھ سے دوستی چاہتی تھی اور درمیان میں دیوار نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ مزید یہ کہ وہ رقابت میں مبتلا ہوسکتی تھی۔ دوستی کے پہلے ہی دن!

مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولی۔ "ویسے بھی تم اس سے ملنے کے لئے غلط وقت کا انتخاب کررہے ہو۔ اس وقت اپنے پرفارمنس کی وجہ سے وہ تھکی ہوئی ہے۔ اوپر سے شہر

رنگین مزاج باچھیں پھیلائے ہوئے اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ ملنے والے بھی جاکر اسی وقت اسے گھیر کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جنرل منیجر' پبلک ریلیشنز منیجر' پرنس تہمینہ کا اپنا منیجر' ہوٹل کے سرے دار لوگ' سیکیورٹی والے' اس وقت سب وہیں ہوتے ہیں۔ شہر کے اچھے بھلے معززین سے اور بڑے بڑے لوگوں سے بھی اس وقت وہاں کوئی خاص اچھا سلوک نہیں ہوتا۔"

"اچھا سلوک کرانا تو خیر میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کے مالکان سے لے کر ویٹر تک مجھے جانتے بھی ہیں اور مانتے بھی۔ میرا اسی وقت اس لڑکی کو پکڑنا ضروری ہے ورنہ یہ پھر غائب ہوجائے گی۔ کیونکہ ایک بار پہلے بھی مجھے اپنا گھر دکھا کر اس غائب ہوچکی ہے کہ مجھے بعد میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔"

"گھر؟ اس کا یہاں کوئی گھر نہیں۔ یہ اسی ہوٹل کے وی آئی پی نمبر تین سوسترہ میں ٹھہری ہوئی ہے۔" طاہرہ خانم اطمینان سے بولی۔ "اور یہ کہیں غائب نہیں ہوسکتی۔ اس ہوٹل کے ساتھ پورے ایک ماہ کی پرفارمنس کا معاہدہ ہے اور ابھی تو اسے پیش کرتے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا۔"

"لیکن یہ مجھے گارڈن ٹاؤن کی ایک کوٹھی میں ملی تھی۔ اس کا مالک تھا کہ وہ اس کا گھر ہے۔ اس کے پاس وہاں کی تمام چابیاں ہیں۔" میں نے کہا۔

طاہرہ خانم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اوہ! کیا تم واقعی بالکل ہی بھولے ہو؟ بھئی اس قبیل کی عورتوں کے لئے شہر کے بہت سے رؤسا اپنے دل کے دروازے بھی کھلے رکھتے ہیں اور اپنی خالی کوٹھیوں کے بھی۔ کسی مہربان نے دے دی ہوگی اپنی کوٹھی۔ پھر اس نے مناسب سمجھا ہوگا' وہاں سے غائب ہوگئی ہوگی۔ لیکن اس کا اصل ٹھکانا یہیں وی آئی پی سوئٹ نمبر تین سوسترہ میں ہے۔ جب چاہو اس نمبر پر اس سے رابطہ قائم کرسکتے ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں' یہ فی الحال کہیں نہیں بھاگے گی۔ لیکن کم از کم اب تک میں تمہارے ساتھ ہوں' تم بھاگ بھاگ کر اس کی طرف جانے کی کوشش مت کرو۔"

"تمہیں اس کے بارے میں اتنی معلومات کیوں کر ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں جب کسی چیز میں تھوڑی بہت دلچسپی لیتی ہوں تو اس کے بارے میں معلومات رکھنے کی کوشش ضرور کرتی ہوں۔ یہ میری ہابی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے پہلے ہی دن اس عورت کی پرفارمنس دیکھی تھی اور اس نے مجھے عورت ہوتے ہوئے بھی متاثر کیا تھا۔ اس میں کوئی بات ہے ضرور۔ یہ محض جسمانی نمائش پر انحصار نہیں کررہی' اس کے پاس فن بھی ہے اور اس کی شخصیت میں کوئی پُراسرار سی کشش بھی ہے۔ یہ زبردست ڈانسر ہے۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے بھی شبہ سا ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ ڈانسر نہیں ہے۔"

میں نے اپنے جوش و خروش کو دباتے ہوئے بیٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ یہ طاہرہ خانم بھی بڑے کمال کی چیز تھی۔ میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ملک میں تفتیشی رپورٹنگ INVESTIGATIVE REPORTING کا رواج نہیں ہے لیکن تمہیں کسی اچھے سے اخبار میں اسی قسم کی رپورٹر ہونا چاہئے تھا۔"

وہ سنجیدگی سے بولی۔ "تفتیشی رپورٹنگ کی طرف میرا رجحان ہے یا نہیں' اس سلسلے میں تو میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن کسی زمانے میں مجھے عورتوں کے لئے ایک بڑا ماڈرن قسم کا رسالہ نکالنے کا بہت شوق تھا۔ جس کام کی سٹک چڑھ جائے وہ میں کر گزرتی ہوں۔ زبردست انتظامات اور کافی بڑی انوسٹمنٹ کے ساتھ نکال ڈالا انگریزی میں پہلا ایک رسالہ۔"

"کیا نام تھا؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اسپارک۔" طاہرہ نے جواب دیا۔

"کبھی سنا نہیں یہ نام اور نہ ہی کبھی رسالہ نظر سے گزرا۔" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"یہی تو ٹریجڈی رہی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "ہم خود ہی میگزین چھاپتے تھے اور خود ہی پڑھتے تھے۔ حتیٰ کہ جن بے شمار کینوں میں ہم مفت بانٹتے تھے وہ بھی نہیں پڑھتے تھے۔ رسالے سے زیادہ رسالہ نکالنے والیوں میں لوگ زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔"

"پھر تو تمہیں خوش ہونا چاہئے تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں تو خیر خوش ہی تھی کیونکہ میں ہرحال میں خوش رہتی ہوں۔ لیکن میرا مطلب ہے لوگوں کی تماتر مہربانیوں کے باوجود رسالے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ ہم اسے جاری نہیں رکھ سکے۔ میں نے اس میں بہت سی خوبصورت اور چلبلی قسم کی لڑکیاں رکھی تھیں۔ میرا خیال تھا جس رسالے کے پیچھے اتنے بہت سے خوبصورت چہرے ہوں اسے تو چل ہی جانا چاہئے۔"

"پھر بھی نہیں چلا؟" میں نے حقیقتاً حیرانی سے پوچھا۔

"ہمیں تو یہی لگتا تھا کہ خوب چل رہا ہے۔ آراستہ و پیراستہ عالیشان قسم کے دفتر میں ہروقت گہما گہمی رہتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے اسٹاف سے زیادہ مصروف لوگ دنیا میں پائے ہی نہیں جاتے۔ لڑکیاں واقعی بہت مصروف تھیں۔ کوئی بوائے فرینڈز کی تعداد بڑھانے میں مصروف تھی۔ کوئی گھر بسانے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ کوئی مال بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ کوئی اپنے بگڑے ہوئے کام سنوارنے میں مصروف تھی۔ کوئی رسالے کے خرچ پر نت نئے تجربات کرنے میں مصروف تھی۔ رسالے کو اشتہارات بھی خوب ملتے تھے۔ اس کے باوجود خسارہ لاکھوں میں جارہا تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ جیب میں بھی کچھ نہیں آرہا تھا۔ سال ڈیڑھ سال میں لاکھوں کا نقصان اٹھانے کے بعد میرا شوق پورا ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا کہ انگریزی جرنلزم کی

یہ نام نہاد قسم کی ماہرین مجھے بیچ کر کھا جائیں گی۔ چنانچہ میں نے رسالہ بند کردیا۔ مجھے خود بھی حیرت ہوئی کہ اتنی بڑی انڈسٹریز میں چلا سکتی ہوں' اتنا سا رسالہ نہیں چلا سکی۔"

"جس کا کام اسی کو ساجھے۔" میں نے کہا "انڈسٹری تمہاری لائن بن گئی ہے۔ ضروری نہیں کہ اب تم ہر لائن میں ٹانگ اڑا سکو۔ میرا خیال ہے رسالے نکالنے والے اگر کاروبار یا انڈسٹری کی طرف آنے کی کوشش کریں تو شاید وہ بھی اسی طرح ناکام رہیں۔"

"ممکن ہے۔" وہ بولی۔ "اسی لئے تو اگر اب میں کوئی نیا کام شروع کرنے کا سوچتی ہوں اور مجھے اس کا تجربہ نہیں ہوتا تو میں خود اس کی کرتا دھرتا نہیں بنتی۔"

اس دوران ہال تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ چند میزوں پر لوگ رہ گئے تھے۔ کھانے پینے کی چیزیں وہاں بھی سرو کی جارہی تھیں لیکن طاہرہ بولی۔ "چلو ریستوران میں چل کر کھانا کھاتے ہیں۔"

ریستوران میں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ بیشتر لوگوں نے کھانے سے فارغ ہو کر ڈانس شو کا رخ کیا تھا۔ کھانے پینے کا اپنا ایک خمار ہوتا ہے اور اس خمار کو دوبالا کرنے کے لئے لوگ اس قسم کے "پوسٹ ڈنر آئٹم" سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ایک پرسکون گوشے میں میز سنبھالنے کے بعد ہم نے اپنی اپنی پسند کی چیزوں کا آرڈر دیا۔

کھانے کے دوران طاہرہ ٹٹولنے والی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اب تو پرنسس تمینہ ذہن سے اتر گئی یا اب بھی سوار ہے؟"

"اتر گئی۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔ "اب تو ذہن پر صرف تم سوار ہو۔"

"رات ڈھل رہی ہے نا۔" وہ خوابناک سے لہجے میں بولی۔ "چاند سورج کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ انسان کے اندر کا موسم بھی بدلتا رہتا ہے۔ کبھی فرصت میں تم سے پوچھوں گی کہ اس عورت نے تمہیں کیونکر مجھ پر دیا' کس سلسلے میں دھوکا دیا؟ فی الحال تو میں صرف اپنی اور تمہاری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں یہاں صرف اس لئے لائی تھی کہ تم اسے محض تفریح کا ایک ذریعہ سمجھ کر دیکھو گے۔ مجھے گمان تک نہیں تھا کہ اس سے تمہارا کوئی چکر نکل آئے گا۔"

"چکر کوئی نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں نے اب اس معاملے کو ذہن سے جھٹک دیا ہے۔ تم بھی جھٹک دو۔ یہ محض اتفاق تھا کہ تم آئیں تو تمہارے ساتھ کچھ الجھے ہوئے معاملات کے سراغ بھی چلے آئے۔ لیکن میں نے اب کسی بھی معاملے میں سر کھپانے کا ارادہ ترک کردیا ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں بھی اب صرف اپنے اور تمہارے بارے میں سوچنے کی کوشش کروں گا۔"

میں اس کی دلجوئی کے لئے یہ باتیں کررہا تھا ورنہ پرنسس تمینہ کو فی الحال میں اپنے ذہن سے جھٹکنا نہیں چاہتا تھا۔ طاہرہ کی مزید

اردو کے شاہکار سفرنامے	ضیاء ساجد	00/-
منتخب مشہور سفرنامے	ضیاء ساجد	50/-
منتخب مشہور افسانے	ضیاء ساجد	0/-
منتخب اعلیٰ افسانے	ضیاء ساجد	5/-

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور 2

دلجوئی کے لئے مجھے اس کے ساتھ دوبارہ اس کے گھر بھی جانا پڑ وہاں سے صبح ہی واپسی ہو سکی۔ نیند کی کمی سے میری آنکھیں بو تھیں لیکن میرا سونے کے بجائے تیار ہو کر آفس جانے کا ارا تھا۔ آج کئی ضروری ملاقاتیں طے تھیں۔ تاہم اس سے پہلے ا اور کام بھی ضروری تھا۔

میں نے اپنے ایک خاص کارکن منیر کو فون کیا اور کہا۔ "ا کان کے سوئٹ نمبر تین سو سترہ میں پرنسس تمینہ کے نام سے ا ڈانسر مقیم ہے جو اسی ہوٹل میں روزانہ ڈانس شو پیش کررہی ہے

"یس سر۔ مجھے معلوم ہے۔" منیر نے کہا۔

"مسعود کو بھی ساتھ لے لو۔ اس لڑکی کی چوبیس گھنٹے نگ ہونی چاہئے۔ مسعود کے علاوہ بھی کسی کی ضرورت ہو تو اسے طلب کرو۔ جس طرح بھی تم چاہو نگرانی کے انتظامات کرلو۔ سروس کے ویٹروں اور کمروں میں چھوٹے موٹے کام کرنے میڈز کو بھی ساتھ ملانا ضروری ہو تو کسی بھی حربے سے ملا لیا جا یہ لڑکی کہیں غائب نہ ہونے پائے۔ سمجھ گئے نا؟"

"یس سر۔ ایسا ہی ہوگا۔ غائب نہیں ہوسکے گی۔" منیر وثوق سے کہا۔ اس کا وعدہ یا دعویٰ پتھر پر لکیر ہوتا تھا۔ اسے مسعود کو اس قسم کے کاموں میں خصوصی مہارت تھی۔ کسی جگہ مقیم یا کہیں بھی سرگرم عمل آدمی' خواہ اس کے معمولات بھی ہوتے' اس کی چوبیس گھنٹے نگرانی میں منیر اور مسعود کا جو نہیں تھا۔ یہ کام بظاہر بہت آسان نظر آتا تھا لیکن درحقیقت ہی ذہانت طلب اور اعصاب شکن کام تھا۔ خصوصاً جبکہ وا بہت ہی شاطر قسم کے لوگوں سے ہو۔ منیر اور مسعود اس کا اسپیشلسٹ تھے۔ اس ضمن میں جو بھی انتظامات کرنے ضر ہوتے تھے وہ خود ہی کرلیتے تھے۔

تیار ہونے اور ناشتا کرنے کے بعد میں آفس جانے کے نکلنے ہی لگا تھا کہ طاہرہ خانم کا فون آگیا۔ نیند کی کمی کے اثرات کی آواز سے بھی ظاہر ہونے چاہیے تھے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ کے لہجے میں تو رات سے بھی زیادہ شگفتگی اور کھنک تھی۔

چھیڑنے کے سے انداز میں بولی۔ "کیا حال اے سوہنیو؟"

"میں تو ٹھیک ہوں۔ تم اپنی سناؤ۔" میں نے ایک بار

پ میں شب رفتہ کا خمار محسوس کرتے ہوئے کہا۔

ہارے لئے ایک اچھی خبر ہے۔" وہ بولی۔

یا آج رات پھر ملاقات رہے گی؟" میں نے پوچھا۔

ہ تو رہے گی ہی۔ لیکن دوسری خبر شاید تمہیں اس سے زیادہ ن محسوس ہو۔" وہ بولی۔ "وہ تین ڈبے والا ہاتھ آگیا ہے۔ ید راجپوت نے اسے پکڑ کر اپنے کمرے میں بٹھایا ہوا ہے۔ ہ پہلے تو بری طرح ڈر گیا تھا لیکن میری ہدایت پر اس کے ت اچھا سلوک کیا گیا۔ بلکہ یوں سمجھو کہ اسے وی آئی پی ی دیا جارہا ہے۔ اب بتاؤ مزید "تفتیش" کا بندوبست بھی میں یا تم خود ہی اس معاملے کو سنبھالو گے؟"

تم کچھ بھی مت کرو۔ تم نے جتنا کردیا اتنا ہی کافی ہے۔ پندرہ ٹ تک میرا ایک آدمی پہنچے گا۔ اس سے آگے جو کچھ بھی روری ہوگا' وہی کرے گا۔ بس تم تین ڈبے والے کو اس الے کردینا۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم۔" میں نے کہا۔

جر کی چند باتیں اور ہوئیں پھر میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

س کے بعد میں نے سردار شیخ سے رابطہ قائم کیا اور اسے س والا معاملہ سمجھانے کے بعد کہا۔ "اب وہ تین ڈبے والا خانم کی کوٹھی پر موجود ہے۔ تمہیں اس سے معلومات کرکے بڑھنا ہے اور ہر حال میں اس بلیک باکس کو تلاش کرکے یہ ت دو نمبر میں پہنچانا ہے۔ یہ اطمینان کرلینا کہ اس دوران کوئی ے پیچھے نہ لگا ہو۔ باکس حاصل کرنے کے بعد تمہیں بہت حتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔ وہ باکس کوئی تم سے چھیننے نہ ۔"

"اوکے سر!" سردار شیخ نے جواب دیا۔ "آئی ایم آن مائی ۔" میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔ اس دوران ملازم نے خاص ا اخبارات لاکر میرے سامنے رکھ دیئے۔ آج میں ابھی تک رات بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔ ذہن دوسری باتوں میں الجھا ہوا میں نے سوچا' جانے سے پہلے سرسری نظر ڈال ہی لی جائے۔ انگریزی اخبار میں کبھی کوئی کام کی بزنس انکوائری نظر آجاتی سے دیکھنے میں میرا ایگزیکٹو اسٹاف بھی کبھی کبھار سستی کرجاتا

میں اس وقت نیم توجہی سے ایک انگریزی اخبار کے صفحات ہا تھا جب تفریحات کے صفحے پر میری نظر ایک نمایاں تصویر پر ہ وہ صرف چہرے کا کلوز اپ تھا۔ تصویر باکس میں چھپی ہوئی ہ اب یہ چہرہ میرے لئے خوب جانا پہچانا تھا کیونکہ گزشتہ رات ہ میں نے اسے اسی طرح گہرے میک اپ میں ہرزاویئے سے لیا تھا۔ وہ پرنسس تمینہ کا چہرہ تھا۔ تصویر کے نیچے چند سطری رت تھی۔ اخبار نے لکھا تھا:

تفریحات کے ضمن میں پرنسس تمینہ شہر میں ایک اچھا اضافہ لیکن پریس کے لئے اس کی آمد کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہے کیونکہ شوبزنس کی بیشتر شخصیتوں کے برعکس یہ خاتون نہ تو اخباری نمائندوں سے ملنا پسند کرتی ہیں اور نہ ہی انٹرویو دیتا۔ حتیٰ کہ تصویر کھنچوانا بھی گوارا نہیں کرتیں۔ ابھی تک ان کی واحد تصویر وہی ہے جو اشتہار میں چھپتی ہے اور وہ کوئی ایسی قابل تعریف تصویر نہیں۔ شاید خاتون کا خیال ہو کہ وہ جو کچھ اسٹیج پر پیش کرتی ہیں وہی ان کی شہرت دور دور تک پھیلانے کے لئے کافی ہے۔ بہرحال ہمارے فوٹو گرافر گزشتہ رات اچانک ہی اس وقت نہایت عمدگی

انکا' اقابلہ' سونا گھاٹ کا پجاری'

غلام روحیں' امبر بیل' درخشاں' خبیث

کے بعد انوار صدیقی کا ایک اور

پراسرار ناول

برہمچاری

نیکی اور بدی کا خوفناک تصادم

خوبصورت سرورق' دیدہ زیب

کتابت و طباعت

قیمت =-/150 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

سے ان کا کلوز اپ اپنے کیمرے میں محفوظ کرنے میں کامیاب ہوگئے جب وہ ڈریسنگ روم سے نکل ہی تھیں۔ موصوفہ کی تماحتر برہمی کے باوجود ہم یہ تصویر اپنے قارئین تک پہنچانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔"

عبارت کا انداز تھوڑا سا بہکتا ہوا بھی تھا۔ اس کے باوجود تصویر کچھ اس طرح شائع کی گئی تھی جیسے یہ ایک کارنامہ تھا۔ اور اگر یہ کارنامہ انجام نہ دیا جاتا تو صحافت کی تاریخ میں بہت بڑا خلا رہ جاتا۔

کئی لمحے تک میں ایک ٹک اس چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ حیران حیران آنکھیں بھی گویا میری ہی جانب نگراں تھیں۔ اور میں ایک بار پھر الجھن میں تھا۔ جب یہ لڑکی حسنہ کے نام سے مجھے ملی تھی تب بھی انہی آنکھوں نے مجھے الجھن میں ڈالے رکھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ آنکھیں میرے لئے شناسا کیوں تھیں؟

اب چونکہ یہ آنکھیں تصویر کی صورت میں میرے سامنے ساکت تھیں اس لئے میں زیادہ بہتر طور پر ان کے بارے میں غور کرسکتا تھا۔ ایک اجنبی چہرے پر یہ شناسا آنکھیں کہاں سے آگئی تھیں؟

پھر یک لخت میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ بعض باتیں یونہی اچانک بالکل غیر متوقع طور پر یاد آتی ہیں' جیسے گہری تاریکی میں بجلی کا کوندا لپکا ہو اور کوئی منظر یکدم روشن ہوگیا ہو۔

مجھے یاد آگیا تھا کہ یہ آنکھیں کس کی تھیں۔ اور مجھے یقین تھا کہ یہ محض مشابہت کا معاملہ بھی نہیں تھا۔ اب مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ جب یہ لڑکی حسنہ کے نام سے میرے سامنے تھی تو وہ کون سی خلش تھی جو میرے اعصاب میں سرسراہٹ سی دوڑائے ہوئے تھی۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ حسنہ کی آنکھیں مجھے شناسا لگ رہی تھیں بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی پوری شخصیت ہی میرے لئے شناسا تھی۔

درحقیقت وہ نہ تو حسنہ تھی اور نہ ہی پرنسس تہمینہ۔ اب مجھے سو فیصد یقین ہوگیا تھا کہ وہ اصل میں ہنی تھی۔ لیکن اس کی صورت کو کیا ہوا تھا؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا.....!

کئی لمحے تک میں اس تصویر کو تکتا رہا۔ اس لڑکی کے کتنے روپ تھے؟ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ ایک مختصر سے عرصے میں اس کی شخصیت کئی زاویوں سے میرے سامنے آئی تھی۔ ہر بار مجھے اس میں ایک عجیب سی پُراسراریت کا احساس ہوا تھا لیکن اب تو معاملہ بہت ہی حیران کن ہوگیا تھا۔ اب تو اس کی صورت ہی بدل گئی تھی۔ اسے غائب ہوئے تقریباً تین ماہ ہوچکے تھے اور اس دوران مجھ سے ٹیلیفون پر رابطہ رکھنے والے ایڈم عرف ایڈی کی باتوں سے یہی ظاہر ہوا تھا کہ وہ ریڈ ڈاٹ کے قبضے میں تھی لیکن اب آزاد

اے حمید کی ایڈونچر سیریز

عاطون

۱۔ اہرامِ مصر سے فرار -/150
۲۔ اندلس کی آخری شمع -/125
۳۔ ہڑپہ کی ناگن -/125
۴۔ عاطون موت کے دروازے پر -/200

شیوسینا کے دہشت گرد

۱۔ ٹاپ سیکرٹ مشن -/150
۲۔ کشمیر کے غازی -/150
۳۔ کمانڈو ایکشن -/200
۴۔ گولکنڈہ کے مجاہد -/200

گنگا کے پجاری ناگ (اول) -/150
گنگا کے پجاری ناگ (دوئم) -/200

مکتبہ القریش
اردو بازار، لاہور۲
فون: 7224665

کے باوجود اور مجھ سے سامنا ہونے کے باوجود وہ مجھ سے کیوں بنی رہی تھی؟ صرف اجنبی ہی نہیں بنی رہی تھی بلکہ اس بھید چکر دینے کی بھی پوری پوری کوشش کی تھی۔ کیا اسے یہ احساس نہیں تھا کہ اس کے اغوا نے مجھے کتنا پریشان کیا تھا اور اس کے لئے کتنا فکرمند رہا تھا؟

فی الحال چونکہ ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا اس لئے میں نے انہیں ذہن کے کسی اندھیرے گوشے میں دھکیلنے کی کوشش کی اور آفس روانہ ہوگیا۔

آفس کی اپنی ایک الگ ہی دنیا تھی۔ وہاں پہنچ کر میں بہت مصروف ہوجاتا تھا۔ فائلیں' فون کالز' معذرتیں' شکریے' کاغذات کا انبار' دستخطی دستخط' مالی انتظامات۔ اور ایسی جانے کتنی چیزیں ہوتی تھیں جو سر کھجانے کی بھی مہلت نہیں دیتی تھیں۔ پھر بعض اوقات غیر کاروباری' معاملات کی رپورٹیں وہیں آتی رہتی تھیں۔ انہیں بھی سننا ہوتا تھا اور ان کے بارے میں فیصلے بھی کرنا ہوتے تھے۔ اس روز بھی شام تک میں بے مصروف رہا۔ پھر وہ غیر کاروباری فون کال آئی جس کا مجھے فوری سے انداز میں انتظار تھا۔ وہ سردار شیخ کا فون تھا جسے میں ٹین ڈبے والے کے ساتھ بلیک باکس کی تلاش کی مہم پر بھیجا تھا۔

"یہ ایک عجیب وغریب مہم تھی سر!" وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ اس ہنسی میں ہلکی سی تھکن اور خود استہزائی کی جھلک تھی۔ "ٹین ڈبے والے کا کہنا تھا کہ اس نے حسبِ معمول شام تک کباڑ جمع کیا اور لے جاکر کباڑئے کے ہاں ڈھیر کردیا جہاں ہر چیز کی چھانٹی ہوتی ہے۔ شیشہ' کاغذ' لوہا پلاسٹک وغیرہ' سب کی الگ الگ ڈھیریاں لگائی جاتی ہیں اور پھر ہر چیز کے ریٹ کے حساب سے بیچنے والوں کو پیسے ملتے ہیں۔"

"اور یہ کباڑیا کہاں ہوتا ہے؟" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اس کا ٹھکانا طاہرہ خانم کی کوٹھی سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ میاں میر کے علاقے میں اس نے ایک بہت بڑے اور قیمتی پلاٹ پر ناجائز قبضہ کرکے' بڑے بڑے چھپر ڈال کر اپنا گودام بنایا ہوا ہے۔ پلاٹ کے چار دعوے دار ہیں' چاروں مقدمے بازی میں برسوں سے مصروف ہیں اور اس دوران کباڑیا اطمینان سے وہاں اپنے کاروبار میں مصروف ہے۔ ٹھیلے والے اسے ٹھیکیدار جی کہتے ہیں اور وہ خاصا آسودہ حال آدمی ہے۔ اس کے پاس ٹرک چلتے ہیں۔"

"بہت خوب!" میں سردار شیخ کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس شخص میں یہ بڑی خوبی تھی۔ اسے جب خصوصی ہدایات کے ساتھ کسی معاملے میں لگایا جاتا تھا تو وہ بڑی گہرائی میں جاکر ہر پہلو سے متعلق تفصیلی معلومات جمع کرکے لاتا تھا' خواہ بظاہر ان کی کوئی اہمیت نظر نہ آتی۔ اس کا کہنا تھا کہ معلوم نہیں کب کون سا نکتہ اہم اور کارآمد ثابت ہوجائے۔

سردار شیخ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "شام سے ٹھیکیدار کے ہاں گہما گہمی شروع ہوجاتی ہے۔ ٹھیلوں پر اور بوریوں وغیرہ میں کچرا اور کاٹھ کباڑ جمع کرنے والے وہاں پہنچنا شروع ہوجاتے ہیں۔ ہر طرح کی چیزوں کی چھانٹی ہوتی ہے اور ان لوگوں کو پیسے دے کر فارغ کردیا جاتا ہے۔ ٹھیلے والے نے اس باکس کو دھات کی چیزوں میں ہی ڈالا تھا لیکن وہ چونکہ کچھ صاف ستھری سی چیز معلوم ہورہی تھی اس لئے اس نے بعد میں اسے الگ رکھ لیا تھا کہ اسپیشل آئٹم' کے طور پر ٹھیکیدار سے اس کی خصوصی قیمت وصول کرنے کی کوشش کرے گا۔

پہلے ٹھیلے والے نے اس باکس کو خود بھی ٹھونک بجا کر دیکھا تھا۔ اس میں ہینڈل تو موجود تھا لیکن وہ تقریباً ٹھوس دھات کا ایک ٹکڑا محسوس ہورہا تھا۔ اس میں کہیں کوئی جوڑ نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی پتا چلتا تھا کہ وہ کہیں سے کھلتا ہے یا نہیں۔ تھک ہار کر اس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ کوئی ایسی کارآمد چیز نہیں ہے جسے اپنے پاس رکھا جائے۔ چنانچہ شام کو اس نے دیگر کاٹھ کباڑ کے ساتھ ٹھیکیدار کے آدمی کے سپرد ہی کردیا تھا۔ اس کی بڑی منت سماجت کے بعد ٹھیکیدار کے آدمی نے الگ سے اس کی قیمت لگادی تھی۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں وہ قیمت کیا تھی؟"

"نہیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں۔" میں نے اعتراف کیا۔

"دو روپے" سردار شیخ نے بتایا۔ "دو روپے میں وہ باکس کاٹھ کباڑ میں چلا گیا۔"

"اوہ خدایا!" میرے پہلو میں ٹیس سی اٹھی۔ جس چیز کے لئے کشت وخون ہونے کے آثار پیدا ہورہے تھے' جان کی بازیاں لگتی دکھائی دے رہی تھیں' وہ دو روپے میں کباڑی کے ہاتھ بک گئی تھی۔ کیا ستم ظریفی تھی!

سردار شیخ نے کہانی سنانے کے انداز میں بات جاری رکھی۔ میں اس کہانی کا کلائمکس جاننے کے لئے بے چین تھا لیکن اپنی بے تابی پر قابو رکھتے ہوئے مرحلہ وار ہر بات سن رہا تھا۔ سردار شیخ کہہ رہا تھا "ٹھیکیدار یعنی کباڑئے کے ہاں شام کے وقت دو تین آدمی "مال" کی وصولی کرتے ہیں۔ وہ خود ایک لمبی چوڑی چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہتا ہے۔ اسے تو باکس کے سلسلے میں کچھ نہیں معلوم۔ ٹھیلے والے نے اس دن اپنا "مال" جس شخص کے سپرد کیا تھا اسے یاد ہے کہ اس قسم کی کوئی باکس نما چیز اس روز آئی تو تھی لیکن اسے صحیح طور پر یہ یاد نہیں کہ اس کا کیا بنا تھا۔ کباڑ خانے میں ہاتھ سے کام کرنے والی دو تین پریس مشین قسم کی چیزیں ہیں۔ ان سے کاٹھ کباڑ کو پچکا کر اس کا حجم کم کیا جاتا ہے اور مختلف نوعیت کی چیزیں ٹرکوں میں لاد کر مختلف کارخانوں کو روانہ کردی جاتی ہیں۔ اس روز اتفاق سے لوہے کے سامان کا ٹرک جارہا

تھا۔ تو سے فیصد امکان یہی تھا کہ وہ باکس اسی ٹرک میں لوہے کے کارخانے کو چلا گیا۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟" میں نے اپنا لہجہ حتی الامکان پُرسکون رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ظاہر ہے سر' میں صرف یہ سن کر تو نہیں آسکتا تھا کہ وہ باکس آگے کہیں چلا گیا۔" سردار طویل سانس لے کر بولا۔ "میں اس کارخانے میں گیا جہاں لوہے کا ٹرک گیا تھا۔ بیچ میں ایک آدھ حتی کا کردار بھی آتا ہے جو پہلے مختلف کباڑیوں کے ہاں سے آنے والے مال کو یکجا کرتا ہے پھر کارخانے والوں سے اکٹھا لین دین اور حساب کتاب کرتا ہے۔"

"کارخانہ کہاں تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ شیخوپورہ روڈ پر واقع ایک اسٹیل ری رولنگ مل ہے۔" سردار نے جواب دیا "اس کا احاطہ بہت بڑا ہے جہاں لوہے کا کاٹھ کباڑ ڈھیر کیا جاتا ہے۔ پھر اسے صاف کرنے کے لئے مختلف مراحل میں بھٹیوں میں بھیجا جاتا ہے۔ وہاں نہ جانے کس کس علاقے سے اور کب کب کا آیا ہوا کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ یوں سمجھئے کہ کاٹھ کباڑ کے پہاڑ کھڑے تھے۔ ظاہر ہے وہاں کس کو یاد رہ سکتا تھا کہ کسی انبار میں لوہے کی بکس نما کوئی چیز بھی آئی تھی یا نہیں۔"

"ہاں۔ یہ تو درست ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

"اس کے باوجود میں نے کسی نہ کسی طرح انتظامات کیے کہ کاٹھ کباڑ کے ان تمام پہاڑوں کو کھنگالا جائے۔" سردار نے بتایا۔

"اوہ۔" میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ سردار شیخ' ٹونی اور حنیف وغیرہ اس طرح تقریباً ناممکن کاموں کو ممکن بنانے میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔

سردار بات جاری رکھتے ہوئے بولا "لیکن سر! کہیں دھمکی' کہیں لالچ اور کہیں چکر دینے کے باوجود اس ساری جدوجہد کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس باکس نما چیز کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ کم از کم وہ ان انباروں میں کہیں نہیں تھا جو کارخانے کے احاطے میں موجود تھے۔ پچھلے تین چار دنوں میں کئی انبار پگھلائے بھی جا چکے تھے اور صاف کرنے کے بعد سلاخوں وغیرہ میں ڈھالے جا چکے تھے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ ان میں شامل ہو کر ایسے ہی کسی انجام کو پہنچ چکا ہے۔"

"نہیں' یہ ممکن نہیں ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "اگر ایسا ہوا ہوتا تو بھٹی دھماکے سے اڑ جاتی۔ اور اگر کارخانے میں اس قسم کا کوئی حادثہ پیش آیا ہوتا تو تمہارے علم میں ضرور آجاتا۔"

مجھے یاد تھا ایڈم عرف ایڈی نے باکس کے بارے میں فون پر مجھ سے بحث کرتے وقت خبردار کیا تھا کہ اگر باکس کو ذرا بھی غلط طریقے سے کھولنے کی کوشش کی گئی تو وہ دھماکے سے پھٹ جائے گا۔ اگر باکس میں کسی قسم کے میکنزم سے منسلک ڈائنامیٹ موجود تھا تو بھٹی میں جا کر اسے زیادہ تباہ کن انداز میں پھٹ جانا چاہئے تھا۔

کارخانے والوں نے اس قسم کے کسی حادثے کا نوٹس کیا۔" سردار بولا "وہاں تو سکون و اطمینان سے معمول کے کام ہو رہا تھا۔"

"وہ باکس بظاہر لوہے کا ایک ٹکڑا ہی نظر آتا تھا جس میں صرف اسے اٹھانے کی غرض سے چھوٹا سا ہینڈل لگا ہوا تھا۔ ذرا توجہ سے دیکھنے پر خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ممکن ہے کارخانے کے احاطے میں سے کوئی مزدور وغیرہ اسے اٹھا کر لے گیا ہو۔" میں نے کہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں سوچ رہا تھا کہ شاید ایڈی محض مجھے خوفزدہ کرنے کے لئے گپ ہی چھوڑی ہو تاکہ میں باکس کھولنے کی کوششوں سے باز رہوں۔ عین ممکن تھا کہ اس میں ڈائنامیٹ وغیرہ نہ رہا ہو اور وہ واقعی بھٹی میں جا کر کسی اور شکل میں ڈھل چکا ہو۔

سردار بولا "نہیں سر! یہ عین ممکن ہے۔ کارخانے میں اجرت پر کام کرنے والوں اور مستقل ملازموں کو ملا کر تقریباً بیس آدمی کام کرتے ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو ہم باری باری سب کو چیک کر لیتے ہیں۔ ان کے گھروں پر پہنچ کر پوچھ گچھ کرتے ہیں اور ذرا چھان بین بھی کر لیتے ہیں تاکہ کوئی جھوٹ بول کر ٹالنے کی کوشش نہ کرے۔"

مجھے معلوم تھا' سردار کسی کام کو بے نتیجہ چھوڑنا پسند نہیں کرتا تھا خواہ اس میں کتنی ہی محنت کی ضرورت ہوتی۔ لیکن میں فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ "چلو چھوڑو سردار! اتنے لمبے چکروں میں مت پڑو۔ فی الحال اتنی جدوجہد ہی کافی ہے۔ میری اس میں دلچسپی یکایک ہی کم ہو گئی ہے۔ لعنت بھیجو اس پر۔"

"جیسے آپ کا حکم سر۔ ویسے آپ کہیں تو ایک کوشش کر کے دیکھی جا سکتی ہے۔ تمام ملازموں کو چیک کرنے کا کام چار دن میں مکمل ہو جائے گا۔ ہم تین چار آدمی لگ جائیں۔ ذرا اطمینان ہو جائے گا۔"

"بس رہنے ہی دو' مجھے ویسے ہی اطمینان سا ہو گیا ہے۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے طاہرہ خانم کے مشورے پر عمل کر ہی لیا تھا اور بلیک باکس پر لعنت بھیج دی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے ٹرانسیٹر پر منیر سے رابطہ قائم کیا جسے نے پرنس تہمینہ کی نگرانی کی ذمے داری سونپی تھی۔ ٹرانسیٹر اس کی طرف سے جواب ملنے میں چند منٹ لگ گئے۔ شاید وقت وہ کسی مناسب جگہ پر نہیں تھا جب اسے ٹرانسیٹر پر سگنل

"کیا خبر ہے؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"نگرانی جاری ہے سر!" منیر نے جواب دیا "وہ آج سارا اپنے سوئٹ میں ہی موجود رہی ہے۔ چند منٹ کے لئے بھی نہیں نکلی۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ہمارے علاوہ بھی کوئی اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ بظاہر وہ ایک بے ضرر سا سفید فام ہے۔ عمر رسیدہ

سا معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر اپنے آپ میں مگن رہتا ہے لیکن ہے کہ وہ پرنس تہمینہ کی نگرانی پر مامور ہے۔"

"عین ممکن ہے۔" میں نے تصدیق کی "اس کے علاوہ تو کوئی نہیں آیا؟"

"جی نہیں۔ نگرانی کرنے والا تو کوئی نہیں لگا۔ لیکن ہوٹل کے میں بھی مجھے نچلے درجے کے دو ایک ملازمین پر شبہ ہے کہ کے لئے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ پرنس کا مینیجر بھی کچھ ٹھیک آدمی نہیں لگتا۔ وہ صرف مینیجر نہیں ہوتا۔"

منیر کا مشاہدہ قابل داد تھا۔ ابھی اسے نگرانی پر مامور ہوئے گھنٹے گزرے تھے لیکن اس نے بہت سی باتیں معلوم کر لی اور بہت سی باتیں محسوس کر لی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ نگرانی جاری رکھو لیکن غیر معمولی طور پر محتاط اور اگر ڈیوٹی بدلنے کی ضرورت پیش آئے تو اپنی جگہ احمد اور کو مامور کرنا۔" میں نے ہدایت کی۔

"کم از کم اڑتالیس گھنٹے تک تو میں اور مسعود نگرانی جاری رکھے ہیں سر!" منیر نے جواب دیا "اس میں کسی خاص بھاگ دوڑ کے آثار نظر نہیں آرہے اس لئے شاید ہم اس سے زیادہ وقت کے بھی مسلسل نگرانی جاری رکھ سکیں۔ بہرحال اگر ضرورت پڑی تو انتظام کر لوں گا اور آپ کو اطلاع دے دوں گا۔"

میں نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھا ہی تھا کہ کیپٹن نے طاہرہ خانم' طاہرہ خانم مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے لائن لینے کے لئے کہا۔ طاہرہ خانم میری آواز سنتے ہی بولی۔ "کیا آج تم میں ہی رات گزارنے کا ارادہ ہے؟ خدا خیر کرے' سیکرٹری بھی یہیں موجود ہے۔"

"بدمعاشی والی گفتگو نہیں چلے گی۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"کیوں؟ تمہیں ڈر ہے وہ سن لے گی اور برا مانا جائے گی؟"

"میرے دفتر میں ایسی سیکریٹری نہیں پائی جاتی جو میری اجازت کے بغیر کسی سے میری گفتگو کے بارے میں اس حد تک تجسس میں مبتلا ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"میں نے گھر فون کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم گھر پہنچ چکے ہو گے۔"

"بس..... کبھی کبھار دیر ہو جاتی ہے۔"

"اس باکس کا کیا رہا؟ ہاتھ آیا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ انگریزی کا ایک محاورہ ہے نہ' جس کا مطلب کچھ یوں ہے۔ گھاس کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنا۔ وہی گھاس جسے پنجابی میں پرالی کہتے ہیں۔ تو اس باکس کی مثال بھی اب کچھ ایسی ہی ہو گئی ہے۔ اسے تلاش کرنا سوکھی گھاس کے انبار میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ میں نے تمہاری نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اس پر لعنت بھیج دی ہے۔"

"شکر ہے" اس نے سکون کی سانس لی "ورنہ میرا تو خیال تھا کہ اب تمہاری باقی زندگی اسی کا وظیفہ پڑھتے گزر جائے گی۔ اچھا یہ بتاؤ آج میری طرف آرہے ہو یا نہیں؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا" میں نے تذبذب کے عالم میں کہا "مجھے ایک کام ہے۔ اگر وہ نہ ہوا تو میں تمہاری طرف آسکتا ہوں۔"

"مجھ سے دو ٹوک بات کرو ڈیئر انی! اس طرح انتظار کی سولی پر لٹکا کر میری شام برباد مت کرو۔ اور مجھے اسپیئر وہیل بھی مت بناؤ کہ فلاں وہیل ٹھیک نہ چلا تو اس کی جگہ تمہیں لگا لوں گا ورنہ اسی سے کام چل جائے گا۔ میں اس انداز کی دوستی کی قائل نہیں۔"

"دراصل میرا دل تو تمہاری ہی طرف اٹکا ہوا ہے لیکن ذہن کہیں اور پھنسا ہوا ہے۔" میں نے سچ بیانی سے کہا۔ میں آج رات پرنس تہمینہ والے سلسلے میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔ میرا ذہن ادھر پھنسا ہوا تھا۔

"یہی تو میں تمہیں بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ ہم اس طرز زندگی کے قائل نہیں ہیں۔ دل کہیں اٹکا ہوا ہے' ذہن کہیں..... اٹکا ہوا ہے اور جسم کہیں اور اٹکا ہوا ہے۔ جب اٹکاؤ تو سب کچھ ایک ہی جگہ اٹکاؤ اور جب رخصت کی طلب ہو تو اپنا سارا ہی بستر بوریا سمیٹ کر وہاں سے کوچ کر لو۔ قدموں کے نشان تک مت چھوڑو۔"

"یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔ تم تو بہت ہی سٹنڈلی کی باتیں کر رہی ہو۔" میں نے کہا۔

"تم عمر میں مجھ سے چند سال چھوٹے ہو۔ شاید چند سال میں تمہارا سوچنے کا انداز بھی میرے جیسا ہو جائے۔ بشرطیکہ تمہیں بھی وہی تجربات حاصل ہو سکیں جو مجھے ہوئے ہیں۔" وہ بولی۔ میں نے وہ پہلی عورت دیکھی تھی جو کم عمر بننے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ وہ چاہتی تو اپنی عمر چھپا سکتی تھی۔ اس کا سراپا ایسا ہی تھا۔ میں نے ایسی عورتیں بھی دیکھی تھیں جن کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا تھا کہ پیٹ میں آنت نہ منہ میں دانت۔ مگر میں نے بات بات پر انہیں یہ بھی کہتے سنا تھا "ابھی ہماری عمر ہی کیا ہے۔" بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں عمر کی سیڑھی پر دوسروں سے ذرا اوپر کھڑے ہونا برا نہیں لگتا بلکہ وہ دوسروں کے چھوٹے پن' معصومیت اور ناتجربے کاری سے محظوظ ہوتے ہیں۔

"مجھے ایسے تجربات نہیں چاہئیں جو انسان کو کٹھور بنا دیں۔" میں نے کہا۔

"سٹنڈلی اور حقیقت پسندی کے درمیان بہت باریک سی لکیر ہے۔ اور میں حقیقت پسند ہوں' سٹنڈلی نہیں" وہ بولی "جو چیز میرے قبضے میں ہو' میرے ہاتھ میں ہو' میں اس کی ملکیت کے احساس سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔ جو ہاتھ سے چلی جائے اس کے لئے تھوڑی دیر افسوس ضرور کرتی ہوں' زیادہ پیاری چیز ہو تو اس

کے لئے رو بھی لیتی ہوں۔ لیکن ہمیشہ ہی بیٹھی روتی نہیں رہتی۔ اور نہ ہی یہ امید رکھتی ہوں کہ کسی معجزے کے تحت وہ چیز یا وہ رفاقت گم گشتہ مجھے دوبارہ مل جائے گی۔"

"تم بہت عجیب عورت ہو۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اگر تم ذات کی گہرائی میں جا کر دیکھو گے تو تمہیں ہر عورت ہی کچھ نہ کچھ عجیب ضرور ملے گی۔ ایسی باتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ یہ بتاؤ تم آ رہے ہو یا نہیں؟" وہ ہموار لہجے میں بولی۔

"مشکل ہے۔" مجھے معذرت کا کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ کل سہی" وہ گویا اس بات کو ذرا بھی محسوس کئے بغیر بولی "لیکن بس اتنا بتا دو کہ آج کہیں تم اسی بے ہودہ عورت پرنس تہمینہ کے پاس تو نہیں جا رہے ہو؟"

ایک لمحے میں وہ عورت سیدھی اور شفاف نظر آتی تھی اور ایک لمحے میں پیچیدہ تضادات کا مجموعہ۔ ایک شام کی ملاقات میں وہ سارے مراحل طے کر گئی تھی۔ حقیقت پسند اور بے نیاز بھی بنتی تھی۔ اس کے باوجود اندر ہی اندر رقابت کا بھی شکار تھی۔ ایسی عورت کے نزدیک رقابت ایک بالکل بے معنی چیز ہونی چاہئے تھی۔ بظاہر تو وہ بے پروائی سے ہی پوچھ رہی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ اندر کوئی بات ضرور تھی۔

"دیکھو' مجھے اس کے پاس جانے کا قطعاً شوق نہیں ہے۔" میں نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی "وہ ایک بہت ہی عجیب اور پُراسرار معاملہ ہے۔ میں اسے سمجھنے کے لئے کوشاں ہوں۔"

"لیکن مجھے سمجھانے کی کوشش نہیں کر رہے کہ آخر پُراسرار معاملات سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ میں پہلے بھی پوچھ چکی ہوں' تم پولیس والے ہو' سی آئی ڈی والے ہو' ایف آئی اے والے ہو' جاسوس ہو' کیا ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں تو ایک بندۂ ناچیز ہوں۔" میں نے اس کے لہجے سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"خیر۔ اب اتنے ناچیز بھی نہیں ہو۔ چیز تو بہت بڑی ہو۔ لیکن میرا مطلب ہے تم بزنس مین ہو' بزنس مین کی طرح زندگی گزارو۔ ابھی تمہاری شادی بھی نہیں ہوئی۔ اس لئے دن چاہے کتنے ہی جھنجٹوں میں گزارو لیکن شامیں تو اپنی رکھو۔ دفع کرو ان پُراسرار چکروں کو۔ انہیں پُراسرار لوگوں کے لئے ہی رہنے دو۔"

"بعض اوقات انسان نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے معاملات میں الجھ جاتا ہے۔" مجھے خود بھی اپنا لہجہ کمزور سا لگا۔

"میں تو اب پچھتا رہی ہوں کہ تمہیں اس ڈانس شو میں کیوں لے کر گئی۔ اور بھی بہت سی جگہیں تھیں جانے کے لئے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"خیر۔۔۔ اس کے لئے تو میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ وہ شاید عین میری ناک کے نیچے پرنس تہمینہ کے نام

سے مہینہ بھر دھوم مچا کر چلی جاتی۔ دوبارہ غائب ہو جاتی اور بھی نہیں چلتا۔ کیونکہ میں نے اس شو کا اشتہار زیادہ توجہ سے دیکھا تھا اور دو ایک بار اشتہار دینے کے بعد انہیں مزید ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

"چلو خیر۔۔۔ کل تم سے ملاقات رہے گی۔ ویسے اگر تم رات کے کسی پہر فارغ ہو جاؤ تو میں گھر پر ہی ملوں گی۔ خدا اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ریسیور رکھنے کے بعد بھی میں چند لمحے ساکت بیٹھا رہا خانم سے بات کرنے کے بعد چند لمحے تک تو اعصاب جھنجھناتے رہتے تھے۔ میں اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ گھنٹی ایک بار اٹھی۔ کیترین بھی بے چاری میری ہی وجہ سے آفس میں اٹکی بیٹھی ہوئی تھی ورنہ تقریباً پورا اسٹاف جا چکا تھا۔ اس نے اب ستارہ کا فون تھا۔

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بھی ایسی ہستی تھی جس سے میں کوئی بہانہ کر سکتا۔ کیترین سے کہہ سکتا کہ ٹرخا دے۔ میں نے بات کرانے کے لئے کہا اور ستارہ کی طرف آغاز میں ہی طنز کا تیر۔۔۔ بلکہ بھالا آیا۔

"سنا ہے وزارتِ خزانہ اور وزارتِ صنعت و تجارت قلمدان تمہارے سپرد کر دئے گئے ہیں۔" وہ بولی "اور وہ قلمدان قطار در قطار رکھے ہوئے ہیں۔ کہ تمہیں ذرا فرصت تمہارے سپرد کئے جائیں۔ کیا یہ درست ہے؟"

"چلاؤ۔۔۔ چلاؤ۔۔۔ تم بھی طنز کے تیر چلاؤ۔ طنز کے تیر ہمیں دوست ہلاک نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔" کراہ کر کہا۔

"میں طنز تو نہیں کر رہی" وہ بڑی معصومیت سے بولی ضرورت کس کمبخت کو ہے؟ تمہاری معصوفیات سے ظاہر ہے کہ اس ملک کا سارا مالیاتی اور تجارتی نظام تمہارے ہی سے چل رہا ہے۔ اگر تم نے توجہ ذرا کم کر لی تو تجارت بیوہ ہو جائے گی اور کاروبار کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔"

"کاروبار کا تو مجھے نہیں معلوم" میں نے کہا "لیکن اگر اسی طرح طنز کے گولے برساتی رہیں تو میری ریڑھ کی ہڈی ضرور ٹوٹ جائے گی۔ بھئی میں کچھ عجیب سے چکر میں پھنس گیا تھا' اس لئے فون نہیں کر سکا۔"

"چکر کا نام کیا تھا؟ شادی شدہ تھا' بیوہ یا غیر شادی شدہ" اس نے فوراً پوچھا۔

"مذکر بھلا بیوہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے اعتراض اٹھایا۔

"تمہارے چکر عام طور پر مونث ہوتے ہیں۔" وہ بولی۔

"عورت کو ہر چیز کی تہ میں عورت ہی نظر آتی ہے۔ حالانکہ بیماری مردوں کو ہونی چاہئے۔ بہر حال۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ تمہاری قسم کھانے کو تیار ہوں۔ واقعی معصوفیت بہت

بہت ہی عجیب قسم کی معصوفیت۔ میرا تو خود تمہاری طرف بہت دل چاہ رہا تھا۔"

"ٹ" وہ فوراً بولی۔ "اکثر میں ہی ڈھیٹ بن کر تمہیں فون کرتی ہوں۔ سراپا دعوت نامہ بن کر تمہیں اپنے ہاں بلاتی ہوں۔ فلمی سپر اسٹارز کی معصوفیت کی مثالیں دیتے ہیں لیکن ہمیں کہ تمہاری آمد کی امید نہ ہوتے ہوئے بھی تمہارا انتظار کرنے کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ ہمارے بعد تمہیں ایسے لوگ نہیں ملیں گے۔"

"ہمارے بعد چاہنے والوں کو تلاش ہی کون کمبخت کرے گا۔" میں نے خلوص سے کہا۔

"یہ سب منہ دیکھے کی باتیں ہیں۔" اس کے لہجے میں واقعی افسردگی در آئی تھی۔

"اس وقت تو خیر میں تمہارا منہ دیکھے بغیر یہ بات کر رہا ہوں۔ معلوم ہی ہے ٹیلیفون پر منہ تو نظر نہیں آتے نا۔ یہاں منہ ہی چہرے ہیں۔" میں نے اسے شگفتگی کی طرف لانے کی کوشش کی۔

"تم نے محاورہ استعمال کیا تھا۔" وہ بولی۔

"اتنی ڈپلیس کیوں ہو رہی ہو کہ محاورے بولنے پر اتر آئی ہو۔" میں نے اب بھی ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

"جب کئی دن تک تم سے ملاقات نہیں ہوتی تو میں ایسی ہی ہوں۔ باوجود تماتر معصوفیت کے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"میں بس آج کل میں تمہاری طرف آنے والا ہوں۔" میں نے یقین دلایا۔ "اور تو سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ ٹھیک ہی ہے۔" وہ کچھ عدم دلچسپی سے بولی۔ پھر جیسے کچھ یاد آیا ہو "ہاں ایک خرچا بڑھ گیا ہے۔"

"کیا خرچا بڑھ گیا ہے؟ کوئی بکری یا بلی پال لی ہے کیا؟"

"بکری پالی نہیں البتہ بکرے یا بچے پالے ہیں۔ میرا خیال ہے بچے ہی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ دو خونخوار قسم کے بچے۔ میرا مطلب ہے میں نے اپنی حفاظت کے لئے دو مسلح گارڈ رکھ لئے ہیں۔" وہ بولی۔

"تو پھر انہیں بکرے ہی کہو' قربانی کے بکرے۔" میں نے کہا "لیکن تمہیں ان کی کیا ضرورت آن پڑی؟"

"معلوم نہیں کیوں مجھے کچھ وہم سا رہتا ہے کہ جیسے ہر وقت کوئی نگرانی ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں میری کون سی حس مجھے یہ خیال دلاتی رہتی ہے کہ کوئی نادیدہ یا نامعلوم آنکھ مجھے دیکھ رہی ہے۔ کئی بار کہیں آتے جاتے یہ احساس بھی ہوا کہ میرا تعاقب ہو رہا ہے۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتی لیکن ان باتوں کا وہم سا ہونے لگا ہے۔ میں نے سوچا احتیاط ہی بہتر ہے۔" وہ نہایت سنجیدگی سے یہ بات بتا رہی تھی۔

"ارے۔۔۔ تو تم نے مجھ سے ذکر کیا ہوتا۔ میں تمہیں آدمی دیتا۔ کرائے کے آدمی۔ میرا مطلب ہے لگی بندھی تنخواہ پر کام کرنے والے یہ روایتی سے محافظ کوئی خاص کارآمد نہیں ہوتے۔"

"ارے چھوڑو" وہ شکوہ آمیز سے لہجے میں بولی "تم نے تو تسلیاں دیتے دیتے ہی وقت گزارتے رہنا تھا۔ اس دوران خواہ یہ بندی ہی گزر جاتی۔"

"میری نیت جھوٹی تسلیاں دینے کی نہیں ہوتی" میں نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ "کیا تم میری عادت کو سمجھ نہیں سکیں؟ میں شروع میں ان باتوں کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ بلکہ اپنے معاملے میں تو آخر تک بھی میں ان معاملات کو اہمیت نہیں دیتا۔ اب جبکہ میرے گرد نامعلوم دشمن کا جال تنگ ہو رہا ہے' میں نے اپنے ساتھیوں کو اپنی نگرانی سے بالکل منع کر دیا ہے۔ لیکن تمہارے لئے تو بہر حال جو تم کہتیں وہ کیا جا سکتا تھا۔ اب میں تمہاری طرف سے اتنا بھی بے پروا نہیں ہوں۔ خیر۔۔۔ اب بھی میں اپنے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔ وہ دور سے تمہاری نگرانی کرتا رہے گا اور اگر کوئی تمہارا تعاقب کرتا ہے یا ٹوہ میں رہتا ہے تو وہ اس کی بھی چھان بین کر لے گا۔"

"ارے نہیں" وہ یکدم بدلے ہوئے شگفتہ لہجے میں بولی "اب اتنا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تو ویسے ہی تمہیں چھیڑ رہی تھی۔ کرید رہی تھی کہ تمہیں میری کچھ پروا بھی ہے یا نہیں۔ تمہارے لہجے کی تشویش ہی میرے لئے کافی ہے۔ ان معاملات سے ڈرتی میں بھی نہیں' گارڈ تو میں نے یونہی بس احتیاطاً رکھ لئے ہیں۔ بھئی کوئی میری نگرانی کرتا ہے تو کرتا رہے۔ تعاقب کرتا ہے تو کرتا رہے۔ بھاڑ میں جائے۔ جب کوئی کچھ کرے گا تو دیکھا جائے گا۔ جو مقدر میں ہو گا بھگت لیں گے۔ ویسے آدمی میں نے روایتی سے نہیں رکھے۔ اچھے آدمی ہیں۔ اسلحے کے استعمال میں ماہر ہیں اور جوڈو کراٹے وغیرہ بھی جانتے ہیں۔ بھروسے کے بھی ہیں۔ کبھی کبھی میں انہیں فلموں میں اسٹنٹ مین کے طور پر تھوڑا بہت کام دلوا دیتی ہوں۔ اچھے اسٹنٹ مین ہیں۔ انہیں فلموں میں اس طرح کام کرنے کا شوق بھی ہے اور انڈسٹری میں آجکل اس قسم کے آدمیوں کی ذرا کمی بھی ہے۔ تنخواہ کے علاوہ انہیں آمدنی بھی ہو جاتی ہے۔ بے چارے خوش ہو جاتے ہیں۔ سرکاری کمانڈو رہ چکے ہیں۔"

"چلو تم کہہ رہی ہو تو ٹھیک ہی ہو گا۔ لیکن میرا ایک آدمی۔۔۔ بہر حال دُہری حفاظت کے لئے تمہارے پیچھے رہا کرے گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ارے نہیں۔۔۔ بس اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا نا کہ حقیقت میں تو میں بھی تمہاری ہی طرح ملنگوں اور درویشوں کے سے انداز میں سوچتی ہوں۔ کم از کم زندگی اور موت کے بارے میں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"تو پھر گارڈ کس لئے رکھ لئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یونہی شوق میں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "آدمی ذرا وی آئی پی سا لگنے لگتا ہے۔ اور اگر پہلے ہی سے وی۔ آئی پی ہو تو ڈبل وی آئی پی ہو جاتا ہے۔ فلم اسٹار کو تو ویسے بھی ضرورت رہتی ہے۔ دیکھا نہیں، کبھی کبھی مداح اور پرستار کیسی بدتمیزی پر اتر آتے ہیں۔ کبھی کسی جگہ اچانک کس طرح ہجوم ہو جاتا ہے۔ اظہارِ عقیدت کے طریقے بھی تو ہمارے ہاں کچھ عجیب ہیں۔ لوگوں کا بس نہیں چلتا کہ اپنے پسندیدہ فنکاروں کی بوٹیاں نوچ ڈالیں، اس کی گاڑی توڑ ڈالیں اور اس سے ایسا سلوک کریں کہ وہ کبھی پبلک مقامات پر آنے کی جرأت نہ کرے۔"

"شاید آتے آتے کبھی سلیقہ آ ہی جائے۔ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر مشورہ دیا۔

"ہاں۔ بہار آنی ضرور چاہئے، پھول کھلنے ضرور چاہئیں۔ خواہ ہماری قبر پر ہی کھلیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "فی الحال تمہارا کیا پروگرام ہے؟ کہاں جا رہے ہو؟"

"ایک میٹنگ میں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم سے جب بھی پوچھو تم کسی میٹنگ میں جا رہے ہوتے ہو یا میٹنگ سے آ رہے ہوتے ہو۔ تم تو بزنس مین کے بجائے کوئی سرکاری افسر معلوم ہونے لگے ہو۔ خیر۔ میں تمہارے فون کی منتظر رہوں گی۔" اس نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں ریسیور رکھ کر اٹھنے کے لئے اپنا بریف کیس وغیرہ ہی سنبھال رہا تھا کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بج اٹھی اور شریر سی ہنسی کے ساتھ کیترین نے بتایا "اب کراچی سے راحیلہ کی کال ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ!" میں دھم سے دوبارہ کرسی پر گر پڑا۔ آج تو عجیب ہی اتفاق ہو گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ کیا تینوں عورتوں کے فون آج ہی۔۔۔ اور اوپر تلے ہی آنے تھے؟ تینوں میں سے کوئی شخصیت ایسی نہیں تھی جس کے لئے میں کیترین سے یہ کہنے کا تصور کر سکتا کہ اسے ٹرخا دیا جائے۔ راحیلہ کے فون کی اطلاع سن کر تو میرا دل عجیب سی انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے روز فون کیا کروں گا لیکن پچھلے دس روز میں ایک مرتبہ بھی یہ وعدہ وفا نہیں ہو سکا تھا۔

کسی باضمیر چور کی طرح شرمندہ سے لہجے میں، میں نے کیترین سے کہا "ملاؤ۔"

کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ راحیلہ کی آواز ابھری جو رگ و پے میں نشہ سا دوڑا دیتی تھی۔ وہ بلا تمہید بولی "سچ ہے جب کوئی چیز حاصل ہو جائے تو اس کی وہ قدر نہیں رہتی۔ بعض لوگ اچھا نہیں کرتے کہ اپنے عشق کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ میں انہی بدنصیبوں میں سے ایک ہوں۔"

"حاصل حصول کی منزلیں تو بہت دور ہیں راحیلہ ڈیئر! ابھی تو تم سے جی بھر کے باتیں کرنے کا بھی شوق پورا نہیں ہوا اور تم نے بے قدری کے شکوے شروع کر دئے۔" میں نے حقیقتاً کراہ کر کہا۔

وہ بات کاٹتے ہوئے بولی "ہاں۔ واقعی۔۔۔ تمہارے عالم تو دیکھا نہیں جا رہا۔ صبح تمہارے فون کی گھنٹی سے ہی ہے اور رات کو بھی تم سے ہی باتیں کرتے کرتے سوتی ہوں۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ آج پر طفر کے اتنے گولے برسے تھے کہ دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں۔ آج کی شام بڑی بدنصیب تھی۔

"راحیلہ! اگر میں چند دن تمہیں فون نہیں کر سکا تو مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں بھول گیا یا میرے دل میں تمہاری کم ہو گئی؟" میں نے دردناک لہجے میں پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔ بلکہ اگر تم مزید چھ ماہ فون نہیں کرو۔ زیادہ متاثر ہو جاؤں گی۔ میں سمجھوں گی میری جدائی میں حال ہو گیا ہے کہ آنکھیں دھندلا گئی ہیں، ٹیلی فون دکھائی نہیں دیتا۔ نقاہت کے مارے نمبر ڈائل نہیں ہوتا، شدت غم سے حافظہ جواب دے گیا ہے۔ میرا نمبر تک یاد نہیں رہا۔ نمبر تم نے کہیں نوٹ نہیں کیا تھا اور نہ ہی تمہیں کہیں سے مل سکتا تھا کیونکہ میں زمین پر تو رہتی نہیں۔ دوسرے سیارے پر رہتی ہوں۔ ہمارا بھلا کس طرح ہو سکتا تھا؟"

میں بالکل خاموش رہا۔ ایک لمحے کے انتظار کے بعد وہ بولی "کیا قوتِ گویائی بھی جواب دے گئی؟"

"جس بے چارے کے ساتھ اتنی بری ہو رہی ہو، وہ بولنے کا قابل رہے گا؟" میں نے مردہ سے لہجے میں کہا۔

"پھر بھی کچھ تو بولو۔ کوئی جھوٹ ہی بولو۔"

"میں اچھا بچہ ہوں، جھوٹ نہیں بولتا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ طنزیہ انداز میں ہنسی "بہت خوب! اس سے بڑا جھوٹ کیا ہو سکتا ہے۔"

تاریخی ناول

خالد بن ولید — الماس ایم۔اے

سلطان ٹیپو شہید — الماس ایم۔اے

نواب حیدر علی خاں — الماس ایم۔اے

سلطان صلاح الدین ایوبی — الماس ایم۔اے

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور

"دیکھو تم نے جی بھر کے مجھے شرمندہ کر لیا۔" میں نے غمناک لہجے میں کہا "مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ تم جو سزا دو، مجھے قبول ہے۔ میں اگر محض تمہارا شکوہ دور کرنے کے لئے روایتی اور رسمی انداز میں تمہیں فون کرنا چاہتا تو یقیناً گزشتہ دنوں میں کئی بار کر سکتا تھا۔ لیکن میرے نزدیک تو تمہیں فون کرنا ایک خصوصی کام تھا۔ میں تو نہایت فرصت میں، نہایت اطمینان کے ساتھ تم سے نہایت لمبی لمبی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ بس یہی میری غلطی تھی۔ مگر اتنی فرصت میسر نہ آ سکی، ایسا خصوصی موقع نہ مل سکا اور فون نہ کیا جا سکا۔ اب بتاؤ اس کی تلافی کس طرح کروں؟ پرسوں تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاؤں؟ گلے شکوے کچھ کم ہو سکیں گے؟"

"اب اتنے بڑے جھوٹ بھی مت بولو کہ دم ہی نکل جائے مارے خوشی کے۔" وہ مضطرب سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"یہ تو پرسوں ہی پتا چلے گا جب یہ بندۂ ناچیز ہونٹوں کی طرح منہ اٹھا کر تمہارے درِ دولت پر دستک دے رہا ہو گا۔"

"درِ غربت کہو۔" اس نے تصحیح کی "اب میں تمہیں اتنی زیادہ بھی تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ اب تم صحیح معنوں میں بزنس مین ہو۔ جتنا وقت میرے پاس آنے اور جانے میں ضائع کرو گے اتنی دیر میں تو دو چار لاکھ روپے کما لو گے۔"

"اف فوہ۔۔۔!" میں نے ایک ٹانٹے کے لئے دانت بھینچنے کے بعد کہا "اب تو بے اختیار سر پیٹنے کو دل چاہ رہا ہے۔ میرا بزنس مین ہونا تو میرے لئے طعنہ بن گیا ہے۔ لیکن کم از کم تم مجھے روپے پیسے کے لالچ کا طعنہ مت دینا۔ ورنہ ابھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسی سوٹ میں کراچی پہنچ جاؤں گا۔ بلکہ نہیں۔۔۔ یہ سوٹ بھی مہنگا ہے، امارت کی نشانی ہے۔ اسے بھی یہیں چھوڑ دوں گا اور لنڈا بازار پہنچ کر کسی مرے ہوئے انگریز کی نیکر بش شرٹ خرید کر پہن لوں گا۔ کسی ٹرین کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بیٹھ کر آ جاؤں گا۔ پھر گزارا کر لو گی میرے ساتھ؟ زندگی بھر؟"

وہ بے اختیار ہنس دی۔ اس کی حزنم اور کھنکتی ہنسی دل کے تپتے صحرا پر بارش سی کر دیتی تھی۔ غصہ تو اسے پہلے بھی کم تھا۔ اصل میں تو غصے کی اداکاری ہی زیادہ کر رہی تھی لیکن اب اس کی ہنسی نے بتا دیا کہ جو تھوڑا بہت غصہ تھا وہ بھی میرے خلوص کے ریلے میں بہہ گیا تھا۔

"تم بہت بدمعاش ہو۔ میرا کافی دیر تک تم سے خفا رہنے کا ارادہ تھا لیکن تم نے بہت جلد مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔" وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"یہ اعزاز صرف تمہیں حاصل ہے کہ تمہارے غصے پر مجھے غصہ نہیں آتا، پیار آتا ہے۔ ورنہ غصے کے جواب میں مجھے خود زیادہ غصہ آنے لگتا ہے۔ کوئی صرف غرائے تو میرا اس پر دہاڑنے کو جی چاہتا ہے۔ کوئی آنکھیں دکھائے تو میرا گھونسا دکھانے کو جی چاہتا ہے۔"

"بندی آئندہ احتیاط کرے گی عالم پناہ!" وہ اپنی آواز میں لرزش پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "اور یہ کنیز چونکہ زیادہ طویل فون کال کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لئے اب فون بند کر رہی ہے۔"

"کیا فون کرنے کا مقصد صرف لعن طعن کرنا ہی تھا؟ اتنی دیر میں تم نے روح کو معطر کرنے والا ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ دل کو خوشی دینے والی ایک بھی بات نہیں کی۔"

"فون تو تمہیں صرف یہ یاد دلانے کے لئے کیا تھا کہ کراچی میں صرف تمہارے بزنس پارٹنر اور بزنس کو چلانے والے کارندے ہی نہیں رہتے، کچھ اور لوگ بھی رہتے ہیں، جو بے شک تمہارے لئے کچھ کماتے نہیں مگر جن کے دل تمہارے لئے دھڑکتے ہیں اور جو ہر لمحے تمہیں یاد کرتے ہیں۔"

"اے بندی خاص اور کنیز عام! جا کر ان لوگوں سے کہہ دو کہ ہم جلد ہی ان سے ملنے آ رہے ہیں" میں نے شاہانہ لہجے میں کہا۔ "اور اگر ان کے دل واقعی ہمارے لئے دھڑکتے ہیں اور وہ واقعی ہر لمحے ہمیں یاد کرتے ہیں تو پھر انہیں ہم سے رسمی قسم کے گلے شکوے ہرگز نہیں کرنے چاہئیں۔ جذبے ٹیلی فون کالز کے محتاج نہیں ہوتے۔ جذبوں کو تو اپنا جواب خود بخود ہی مل جاتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور ریسیور رکھ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ آج یکے بعد دیگرے تینوں عورتوں کے فون آئے تھے تو مجھے احساس ہوا تھا کہ کہیں میں کچھ زیادہ ہی تو نہیں الجھ گیا تھا۔ دل میرا یہی کہتا تھا کہ عشق مجھے صرف راحیلہ سے تھا۔ لیکن اگر میں ستارہ سے قطع تعلق کرنے کے بارے میں سوچتا تھا تب بھی میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ اور اگر کبھی میں یہ سوچتا تھا کہ اس سے میرے تعلق کا انجام کیا تھا؟ تب بھی کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ ایک اچھی یا بری بات یہ تھی کہ خود ستارہ نے آج تک نہیں پوچھا تھا کہ اس کے اور میرے تعلق کا انجام کیا تھا۔ ایک کشتی تھی جو بس خواہشات اور محسوسات کے دھارے پر بہتی چلی جا رہی تھی۔ کہاں جا رہی تھی؟ یہ نہ تو اسے معلوم تھا اور نہ ہی مجھے۔

یہ بے منزل سفر تو اپنی جگہ تھا ہی لیکن اب اس طاہرہ خانم نے آ کر ایک ہی رات کی ملاقات میں مجھے کسی انجانے بندھن میں جکڑ لیا تھا۔ وہ بھی یکدم ہی مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بے پناہ حسین تھی۔ لیکن بہرحال نوجوانی میں ہی دو مرتبہ بیوہ ہو چکی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کی عمر نہ جانے کس کس دشت کی سیاحی میں گزری تھی۔ عمر میں مجھ سے کئی سال بڑی بھی تھی۔ ستارہ گو کہ میری ہم عمر تھی لیکن گھاٹ گھاٹ کا پانی وہ بھی پیے ہوئے تھی۔

راحیلہ، جس سے میری دانست میں مجھے عشق تھا، گو کہ بہت ہی نفیس، بہت ہی اونچی چیز تھی۔ وہ میرا آئیڈیل تھی، ایسا آئیڈیل

جسے لڑکپن کے زمانے میں' میں صرف ایک حسین بت کی طرح ذہن میں تراش سکتا تھا' کبھی پانے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ میرے بیکراں عشق کو اپنی بانہوں میں سمیٹنے سے پہلے اس نے میرے دل پر گہرا گھاؤ بھی لگایا تھا۔ کسی اور کی بن کر اس کا گھر بسانے کی کوشش بھی کر دیکھی تھی۔ اس کے باوجود گم گشتہ التفات کے مرجھائے پھول لئے اچانک ہی زندگی کے ایک موڑ پر سامنے آگئی تھی تو مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ میرے دل میں تو اس کے لئے وہی شعلہ فروزاں تھا جس سے آغازِ عشق میں دل منور تھا۔

ستم ظریفی یہ تھی کہ میں تو ہی کے لئے بھی بے چین تھا۔ اسے میں نے گویا پانے سے پہلے ہی کھو دیا تھا۔ جب وہ میری ذرا سی نظرِ التفات کے لئے بے چین تھی' دیدہ و دل میری راہوں میں بچھائے رکھتی تھی تو میرا ذہن نہ جانے کہاں الجھا ہوا تھا۔ مجھے اس کی طرف پیش قدمی کی مہلت نہیں ملی تھی لیکن جب وہ پُراسرار حالات میں یکدم غائب ہوئی تھی تو مجھے بھی اچانک احساس ہوا تھا کہ میرے دل میں اس کے لئے کوئی بات ضرور تھی۔ میں اسے تلاش کرنے کے لئے بے چین ہو گیا تھا۔ بارہا میں نے دیر تک اس کے بارے میں سوچا تھا۔ اس کے بارے میں فکرمند ہوا تھا کہ نہ جانے اس پر کیا گزر رہی ہوگی۔ مجھے اس کی خاموش عقیدتیں' اس کی نگاہوں کی پیاس' اس کا ایثار بے تحاشہ یاد آتا رہا تھا۔

اب میں وہ سب کچھ یاد کرتا تھا تو احساس ہوتا تھا کہ وہ جذبات کی تماتر شدتوں سے میری طرف بڑھنا چاہتی تھی لیکن اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ شاید وہ یہی سمجھتی تھی کہ میں اس کی بے غرض چاہت کی پذیرائی نہیں کروں گا۔ اسے وہ مقام نہیں دے سکوں گا جس کی وہ خواہش مند تھی۔ اور یوں اس کا شیشۂ دل ٹوٹ جائے گا۔ اس نے اپنے پندار کو مجروح کرنے کے بجائے اپنی ذات کے خول میں سکڑے سمٹے رہنا ہی بہتر سمجھا تھا۔

اب جب سے میں نے اسے پرنسس تہمینہ کے روپ میں پہچانا تھا' تب سے اس پر گزرے ہوئے حالات کو جاننے کا تجسس تو بے قابو ہوا ہی تھا لیکن اسے یہ بتانے کی خواہش بھی بڑی شدت سے ابھر آئی تھی کہ اسے کھونے کے بعد میں نے اس کے بارے میں کیا محسوس کیا۔ کس طرح اس کی طلب میرے دل میں جاگی۔

آج پہلی مرتبہ بیک وقت ان سب عورتوں کے بارے میں سوچنے بیٹھا تھا تو یہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ آخر میری ذات میں یہ کیا تماشا بپا تھا؟ یہ کون سی پیاس تھی جو مجھے ساحل ساحل بھٹکا رہی تھی؟ اس میں شک نہیں تھا کہ اپنے اپنے ناقابلِ رشک ماضی کے باوجود یہ عورتیں معمولی عورتیں نہیں تھیں۔ اپنی اپنی جگہ پر ہر ایک بہت مختلف اور بہت غیر معمولی تھی۔ اس کے باوجود اگر میں تھوڑا سا خود پرست ہو کر سوچتا تو ان کا اور میرا ساتھ کچھ جچتا نہیں تھا۔ گو کہ ان میں سے ہر ایک ایسی تھی جس کی اِک ذرا سی نظرِ التفات کے لئے نہ جانے کیسے کیسے لوگ متاعِ حیات ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے۔ پھر بھی کم از کم مجھے ان پر مرمٹنے سے پہلے کچھ کے لئے سوچنا چاہئے تھا۔ جو میں نے نہیں سوچا تھا۔

جبکہ اس سے پہلے زندگی کے سفر میں نہ جانے کتنی پوتر نگاہوں کو' نہ جانے کیسے کیسے اچھوتے پیکروں کو' نہ جانے پاکیزہ ہیولوں کو نظرانداز کرتا ہوا بڑھتا چلا آیا تھا۔ ان میں سے بھی زندگی کا ساتھی ہو سکتا تھا' کوئی بھی میرے بڑھے ہوئے بصد شوق تھام سکتا تھا' کوئی بھی لازوال محبتوں کا دعوے دار تھا' کوئی بھی ایسا مہرباں جس کے ماضی سے کوئی لغزش وابستہ تھی۔ کوئی بھی ایسا نازک خیال جس کے وجود کی چاندی کو لمس کی حرارت سے پگھلی نہیں تھی۔ مگر میں نے کبھی ان کی خاص توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ میں اپنے آپ کو جتنی مضبوط شخصیت کا مالک سمجھتا تھا' اندر سے درحقیقت اتنا ہی کمزور تھا؟ میرے جذبے آوارہ تھے' میری سوچیں بے لگام تھیں' میری خواہشیں سمندر تھیں اور ضبط کے بند کچے؟ شاید ایسا نہیں تھا بلکہ صرف اتنی تھی کہ میری ذہنی سطح عمر سے آگے چلی گئی تھی۔ سوچوں کا سفر شاید بہت تیز تھا۔ کچی باتیں' کچی عمریں' کچے پیکر نظر میں جچتے ہی نہیں تھے۔ شاید سوچ کی اسی تیز رفتاری نے دنیاوی کامیابیاں بھی جلد از جلد حاصل کرنے میں بڑی مدد دی تھی۔ خیالوں کے یہ پنچھی کونجوں کی ڈار کی طرح ذہن کے افق پر اڑتے چلے گئے۔ اچانک میں نے چونک کر جھرجھری سی لی۔ حقیقتاً خوفزدہ سی نظروں سے فون کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو سمجھایا۔ برخوردار انی! اس سے پہلے کہ فون کی ایک بار پھر بیل اٹھے' تم اپنا یہ روحانی تجزیہ یا تحلیلِ نفسی وغیرہ کرو۔ اور جو کرنے کا کام ہے وہ کرو۔ زندگی کو کٹی پتنگ کی طرح نہ دو' خواہ سنبھال سنبھال کر رکھو' اسے تو جس طرح گزرنا ہے اسی طرح گزرے گی۔ زیادہ بقراط مت بنو اور نہ ہی اپنے آپ کو اونچے سنگھاسن پر بٹھا کر اپنا جائزہ لو۔ جیسی گزر رہی ہے گزر دو۔ دیکھا جائے گا۔ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔ تم میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے جو اپنے بارے میں ایسے تشویش زدہ ہو کر سوچنے لگے ہو؟ اس سے پہلے تو تم پر اس طرح کا دورہ نہ پڑا تھا۔

میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے اپنے ڈائریکٹ لائن والے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اپنے چند ساتھیوں کو ضروری ہدایات دیں۔ انہیں ایک متوقع پوزیشن کے بارے میں سمجھایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اپنے آفس کے بیرونی حصے میں آیا تو کیترین احترام میں کھڑی ہوئی۔ اس کی میز کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے رک کر کہا "کیتھی! معاف کرنا' آج میری وجہ سے تمہیں بھی بہت دیر تک بیٹھنا پڑا۔"

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

سنگتراش

اوہام پرستی کے نت نئے رنگ میں رنگے ہوئے جبرین قبیلے کی طلسماتی داستان

آتش کدے کا مقدس پروہت مانینی پراسرار اور ماورائی طاقتیں اس کی غلام تھیں۔

جس سے جبرین کا سردار جوبا بھی خائف رہتا تھا۔

ایک سنگتراش کی محبت کا دلگداز فسانہ جس کی محبت کی روح پروہت کے قبضے میں تھی۔

اقلیم علیم کے پراسرار قلم سے

خوبصورت سرورق، دیدہ زیب کتابت و سرورق

دو جلدوں میں مکمل

جلد اول : -/150

جلد دوم : -/150

کتاب اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ادارے کے نام مکمل قیمت کا منی آرڈر ارسالِ فرمائیں

کتاب آپ کو بذریعہ رجسٹری ارسال کر دی جائے گی۔

خط و کتابت کے لئے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور ۲، فون 7224665

کیتھرین کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آگئی۔ وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی "سر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ باس بھی کہیں معذرت کیا کرتے ہیں؟ دفتر میں جو بھی دیر تک کام کرتا ہے اسے اتنا اوور ٹائم ملتا ہے جتنا کسی اور دفتر' کسی اور کارخانے میں نہیں ملتا سر!"

"وہ صرف تمہارے وقت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ لیکن جس خلوص سے میرے ساتھی میرے لئے کام کرتے ہیں اس خلوص کا میں کوئی معاوضہ نہیں دے سکتا۔" میں اس کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ میری یہ گفتگو اور یہ تھپکی کاروباری ڈپلومیسی نہیں تھی۔ میں واقعی تہ دل سے اپنے کارکنوں کے خلوص کا معترف تھا۔ میری ترقی میں ان کی انتھک محنت کا بڑا دخل تھا۔ اسی لئے میں نے اپنے کاروباری نظام میں ایسی بہت سی شقیں رکھی تھیں کہ میرے ساتھ دھیرے دھیرے یہ لوگ بھی کچھ نہ کچھ ترقی کرتے چلے جائیں۔ ان کے بھی حالات کچھ نہ کچھ بدلتے چلے جائیں۔ شاید یہی وجہ تھی..... یا پھر یہ بھی محض میری خوش قسمتی کی ایک اور مثال تھی کہ جو کارکن میرے لئے صرف دفتری اور کاروباری خدمات انجام دیتے تھے وہ بھی میرے جاں نثار تھے۔

ٹونی' سردار شیخ' حنیف' شبیر شیخ' شفیع شاہ اور ان جیسے دوسرے پچاسوں جوان تو مشن کے سے انداز میں میرے ساتھ تھے۔ کاروبار بھی سنبھالتے تھے اور دوسرا کوئی حکم بجالانے کے لئے بھی مستعد رہتے تھے۔ لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جنہیں گمان تک نہیں تھا کہ میری کچھ غیر کاروباری مصروفیات بھی ہو سکتی ہیں۔ عام سیٹھوں کے برعکس میں بہت سے خطرناک معاملات میں بھی ہاتھ ڈال سکتا ہوں یا اپنے آپ کو بہت خطرناک سمجھنے والے طاقتور لوگوں سے الجھ بھی سکتا ہوں۔ وہ لوگ مکمل طور پر مجھے صرف اور صرف کاروباری شخصیت سمجھتے تھے لیکن وہ بھی وقت پڑنے پر مجھ پر جان نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ بعض موقعوں پر میں نے ان کے خلوص اور جاں نثاری کے ایسے مظاہرے دیکھے تھے کہ میری آنکھوں میں نمی سی آگئی تھی۔

انسان کی شخصیت کا یہ تضاد کبھی کبھی مجھے بہت حیران کرتا تھا۔ عقوبت خانوں میں جو لوگ دوسروں کو سسکا سسکا کر مارتے ہیں یا ان کی زندگی کو موت سے بدتر بنا دیتے ہیں وہ بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ اور یہی انسان جب کسی عقیدت و محبت کا اظہار کرنے پر آتا ہے تو اس کے پاؤں چاٹنے میں بھی فخر محسوس کرتا ہے' اس کے اشارے پر جان دینے کے لئے تیار رہتا ہے اور اس کی بڑی سے بڑی خباثت' حیوانیت اور بڑے سے بڑے عیب کو بھی نہ صرف نظر انداز کر دیتا ہے بلکہ اس کی بدترین حرکتوں میں بھی اچھے معانی تلاش کر لیتا ہے۔ بلاشبہ حضرت انسان بے شمار تضادات کا مجموعہ ہے۔ یا پھر شاید اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

اپنے افکار پریشاں سے الجھتا ہوا میں گاڑی میں بیٹھ کر انٹرکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے ہیڈ آفس کی عمارت سے انٹرکان کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ تاہم میں نے اسے نہایت سست رفتاری سے طے کیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو جو ہدایات دی تھیں میں انہیں ان پر عمل درآمد کے لئے مہلت دینا چاہتا تھا۔

انٹرکان کی پارکنگ لاٹ میں پہنچ کر میں گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ بظاہر میں نے سرسری سے انداز میں اردگرد کا جائزہ لیا۔ گاڑیاں تو بہت سی موجود تھیں لیکن کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ حتیٰ کہ گاڑیوں کی نگرانی کرنے والا بھی نہیں تھا۔ میں نے ڈیش بورڈ کے خفیہ خانے سے ریڈیو کا مائیک نکالا اور صفدر سے رابطہ قائم کیا۔ صفدر میرے اس ساتھی کا نام تھا جسے میں نے کچھ دیر پہلے طلب کیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی سلیمان تھا۔ لازمی نہیں تھا کہ مجھے ان دونوں کی ضرورت پڑ ہی جاتی۔ میں نے صرف احتیاطاً انہیں دو مختلف مقامات پر تعینات کرنے کے لئے بلایا تھا۔ اگر کوئی چھوٹا سا کام کرنا ضروری ہو جاتا جو میرے ذہن میں تھا تو صفدر اور سلیمان بہت کارآمد ثابت ہو سکتے تھے۔

"یس سر!" صفدر نے سگنل ملنے اور کوڈ ورڈ سننے کے بعد کہا۔ "میں اور سلیمان اپنی پوزیشن پر پہنچ چکے ہیں۔ آپ کا سگنل ملتے ہی ہم حرکت میں آجائیں گے۔"

سلیمان جو اس وقت دوسرے پوائنٹ پر موجود تھا' وہ بھی ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا تو وہ بولا "میں سر انٹرکان کا پچھلا چھوٹا گیٹ میری نظر میں ہے۔ ادھر گلی چھوٹی ہے اور اندھیرا بھی ہے۔ پارسل اگر ادھر سے لے جانا پڑا تو زیادہ اچھا رہے گا۔"

"دیکھیں گے جیسی بھی چوائس ہوئی۔" میں نے مبہم لہجے میں کہا "یہ کچھ ایسا معاملہ ہے کہ اس میں قبل از وقت کوئی حتمی ہدایت نہیں دی جا سکتی۔ عین ممکن ہے کہ یہ کام کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ کوئی دوسرا راستہ نکل آئے۔ خدا حافظ۔" میں نے ریڈیو آف کیا' خفیہ خانہ بند کیا اور گاڑی سے اتر آیا۔ موسم خنک اور خوشگوار تھا۔ تاریکی گہری ہو چکی تھی لیکن انٹرکان کی عمارت اپنی روایت کے مطابق جگمگا رہی تھی۔

پارکنگ لاٹ اور اصل عمارت کے طویل و عریض ڈرائیو وے کے درمیان ایک اونچی دیوار حائل تھی جس کے تقریباً وسط میں دروازہ موجود تھا۔ اس سے گزر کر میں ڈرائیو وے میں آیا تو میں دروازے کے سامنے گاڑیوں کی آمدورفت اور خوب چہل پہل نظر آئی۔ یہ صورتِ حال گویا میری خواہش کے عین مطابق تھی۔ میں یہی چاہتا تھا کہ جب میں ہوٹل پہنچوں تو وہاں خوب گہما گہمی ہو۔

ہوٹل میں مختلف شعبوں میں کام کرنے والے اسٹاف میں بیشتر لوگ مجھے پہچانتے تھے۔ آنے جانے والوں میں بھی اکثر شناسا صورت آشنا نکل آتے تھے۔ لیکن زیادہ گہما گہمی کی صورت میں بہت مشکل تھا کہ میری طرف کسی کی توجہ جاتی اور کوئی میری آمد یاد رکھتا۔ آج نائٹ ڈانس شو کی وجہ سے ویسے ہی بہت سے ایسے

آمدورفت بھی شروع ہو چکی تھی جو اکثر و بیشتر اس ہوٹل والوں میں شامل نہیں تھے۔ ان میں سے بعض ایسے تھے ہوٹلوں میں نشست و برخاست کے درحقیقت متحمل نہیں تھے لیکن اس قسم کی کسی کشش کی وجہ سے آنے لگے تھے۔ ایسے تھے جن کے پاس روپیہ کافی تھا لیکن وہ اچھی اشیائے خورد و نوش کا ذوق نہیں رکھتے تھے۔ مگر پرنس تہمینہ کا انہیں بھی یہاں کھینچ لاتا تھا۔

لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں شامل ہو کر میں لفٹ تک پہنچا اور تھوڑی دیر میں آگیا۔ ساری بھیڑ بھاڑ اور رونق گراؤنڈ فلور تک ہی محدود تھی اوپر کی منزلوں پر وہی سناٹا تھا جو ہمیشہ رہا کرتا تھا۔ ہوٹل میں کم کمرے خالی رہتے تھے لیکن راہداریوں میں عموماً ایسا ہی سناٹا تھا جیسے تمام کمرے خالی ہیں اور مدتوں سے بند ہیں۔ کسی کے علاوہ شاذ و نادر ہی کوئی آتا جاتا یا کمرے سے برآمد ہوتا دکھتا تھا۔

لیکن اس راہداری میں اتنی زیادہ ویرانی نہیں تھی جس میں وی آئی پی سوئٹ نمبر تین سو سترہ واقع تھا۔ میں جو نہی اس تیزی سے مڑا' ایک تقریباً اپنے ہی جتنے دراز قد آدمی سے ٹکراتے رہ گیا۔

رکتے ہی مجھے معلوم ہوا کہ آدمی دراصل ایک نہیں دو ہیں۔ دونوں کی شکلیں گو کہ ملتی نہیں تھی لیکن پھر بھی ان پر جڑواں ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں کا قد' جسامت اور رنگت تقریباً ایک جیسی تھی اور وہ ایک جیسی ملبوس دردی میں تھے۔

ان کے سروں پر پولیس والوں سے ملتی جلتی ٹوپیاں تھیں اور ان کی جیب پر عقاب کی تصویر والا ایک مونوگرام سا کڑھا ہوا تھا۔ دونوں کی بیلٹ میں بڑے بڑے ہولسٹروں میں کوئی خاص ہی قسم کے ریوالور جھول رہے تھے ورنہ ریوالوروں کے ہولسٹر عام طور پر اتنے بڑے نہیں ہوتے تھے۔

سرسری نظر میں تو وہ انگلش فلموں میں نظر آنے والے پولیس مین ہی معلوم ہو رہے تھے لیکن ان کی یونیفارم اور مونوگرام کو ذرا توجہ سے دیکھتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کون تھے۔ ان دنوں سیاسی دہشت گردی' سیاسی بدمعاشیاں' ڈاکے اور اغوا برائے تاوان کے سلسلے کچھ ایسے عروج پر نہیں تھے۔ اس لئے پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈز کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔ اسی لئے ظاہر ہے کہ پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسیاں بھی نہیں تھیں۔

مجھے معلوم تھا کہ لاہور میں صرف ایک ہی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی تھی جو بہت محدود پیمانے پر کام کر رہی تھی۔ کوئی ریٹائرڈ کرنل اکرم صاحب تھے۔ عمر کافی حصہ انہوں نے دوسرے ملکوں میں گزارا تھا۔ کچھ عرصے پہلے انہوں نے ایک غیر ملکی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کے اشتراک اور الحاق سے یہاں ایجنسی کھولی تھی۔

اس ایجنسی میں گنتی کے چند گارڈز موجود تھے اور انہیں بھی مصروفیت ذرا کم ہی میسر آتی تھی۔ اس میں شک نہیں تھا کہ ایجنسی کی خدمات کا معیار بہت اچھا تھا لیکن پھر بھی اچھے بھلے دولت مند لوگ بھی مستقلاً تو اس سے استفادہ کرنے کے بارے میں سوچتے تک نہیں تھے کیونکہ اس کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ اور بیشتر سرمایہ داروں کو ابھی جان اور مال کے لالے نہیں پڑے تھے۔

بہت تھوڑے لوگ' زیادہ ہی مجبوری کے عالم میں کبھی کبھار ہی عارضی طور پر اس ایجنسی کے گارڈز کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ میرے خیال میں کرنل صاحب کو ایجنسی سے کوئی خاص آمدنی نہیں ہو رہی تھی لیکن وہ خاندانی دولت مند آدمی تھے۔ ایجنسی کو اسی معیار سے چلائے جا رہے تھے۔ شاندار دفتر' گاڑیاں نہیں' اسلحہ تھا اور باصلاحیت لوگ مستقل ملازم تھے۔ شاید ایجنسی اس امید پر چل رہی تھی کہ کبھی نہ کبھی تو حالات زیادہ خراب ہوں گے اور پیسے والے لوگ پرائیویٹ ایجنسیوں کی طرف بھاگیں گے۔

وہ دونوں جوان بظاہر اسی ایجنسی "شیلڈ" کے گارڈز معلوم ہوتے تھے۔ لفظ بظاہر' میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ ان کے پاس ایجنسی کے لوازمات یعنی یونیفارم اور مونوگرام وغیرہ تو موجود تھے لیکن انہیں ذرا توجہ سے دیکھنے پر میری چھٹی یا شاید کسی اور نامعلوم حس نے نہ جانے کیوں مجھے بالکل خفیف اور مدھم سے انداز میں خبردار کیا تھا کہ ان کا تعلق "شیلڈ" سے نہیں تھا۔

حالانکہ میں نے شیلڈ کے گارڈز کی شکلیں فرداً فرداً دیکھی نہیں تھیں اور نہ ہی میں ایجنسی کے مالک ریٹائرڈ کرنل اکرم صاحب کو جانتا تھا۔ ایجنسی کا دفتر بھی میں نے صرف باہر سے ہی دیکھا ہوا تھا یا پھر ایجنسی کی دو ایک گاڑیاں کبھی سڑک پر ادھر اُدھر آتی جاتی دیکھی تھیں۔ اس سے زیادہ مجھے اس کے بارے میں کوئی معلومات نہیں تھیں۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں میں نے انہیں دیکھتے ہی نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ وہ شیلڈ کے آدمی نہیں تھے۔

وہ دونوں سفید فام تو نہیں تھے لیکن سرخ و سپید اور لمبے تڑنگے تھے۔ صرف چہرہ دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کس ملک کے باشندے ہیں۔ وہ دونوں سوئٹ نمبر تین سو سترہ ہی کے سامنے تعینات تھے۔ اس راہداری میں مڑنے سے پہلے ہی وہ آگے بڑھ کر میرے راستے میں حائل ہو گئے تھے گویا انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ دوسری راہداری سے کوئی شخص ان کی طرف آرہا تھا۔ حالانکہ راہداریوں میں دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور میرے قدموں کی ذرا سی بھی آہٹ نہیں ابھری تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بطور گارڈز وہ برے نہیں تھے۔

ان میں سے ایک نے بالکل درست تلفظ کے ساتھ صاف اور شستہ اردو میں مجھے مخاطب کیا "آپ کس سے ملنے کے لئے تشریف لائے ہیں؟" اس کے لہجے میں کوئی عیب نہیں تھا۔ اس کے باوجود

نہ جانے کیوں میرا یہ شبہ دور نہ ہوسکا کہ شاید وہ پاکستانی نہیں تھے۔ ایک مجھ سے بات کرنے کے لئے ذرا آگے آگیا تھا۔ دوسرا ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا تھا اور بالکل خاموش تھا۔ چہرے دونوں ہی کے سپاٹ تھے۔ دونوں کے ہاتھ ویسٹرن فلموں کے ہیرو کی طرح ہولسٹروں پر تھے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جو مجھ سے مخاطب تھا۔ اس کی بھوری آنکھیں دیواروں کی طرح تھیں جن کے پار اس کی شخصیت میں جھانکنا بڑا مشکل تھا۔ میں اس طرح ایک ٹک کسی کی طرف دیکھتا تھا تو عام طور پر وہ نظر چرا لیتا تھا لیکن اس نے ایسا بھی نہیں کیا۔ میں مسکرا دیا۔ تب بھی اس کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔ وہ انسان تھا مگر چہرہ سپاٹ رکھنے کے معاملے میں کسی بت سے زیادہ مستقل مزاج تھا۔

میں اس کی اصلیت کے بارے میں کسی شبے کا اظہار کرنا چاہتا تھا لیکن پھر میں نے اس سے مطلب کی بات کے علاوہ کوئی بات کرنے کا ارادہ ملتوی کر... کے نپے تلے لہجے میں صرف اتنا کہا "مجھے پرنس تہمینہ سے ملنا ہے۔"

"میڈم اس وقت آرام کر رہی ہیں سر۔" اس نے اپنے چہرے سے بھی زیادہ سپاٹ لہجے میں کہا "اٹھنے کے بعد وہ شو کی تیاری کریں گی۔ یہ ان کا کسی سے بھی ملنے کا وقت نہیں ہے۔ صرف شو کے بعد وہ تھوڑی بہت دیر کے لئے لوگوں سے ملتی ہیں۔"

دل تو چاہا اس سے کہوں "ایسی تیسی تمہاری میڈم کی اور ساتھ تمہاری بھی۔" دل تو یہ بھی چاہا کہ اتنا کہتے ہی بیک وقت دونوں کی کھوپڑی پر کراٹے کا وہ ہاتھ رسید کروں کہ کھوپڑیاں چیخ جائیں اور اسپتال جا کر ہی ہوش آئے لیکن میں نے صرف سرد سی مسکراہٹ پر اکتفا کیا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ اپنی میڈم کو دے دو۔ وہ یقیناً مجھ سے ملنا پسند کریں گی۔"

وہ جو بھی جواب دینے جا رہا تھا' یقیناً نفی میں ہی تھا لیکن اسی دوران پیچھے سوئٹ کا دروازہ کھلا اور ایک گھریلو ملازم ٹائپ شخصیت یوں باہر آئی جیسے کسی نے اسے باہر دھکا دیا ہو۔ وہ تقریباً چالیس کی عمر کا ایک منحنی اور شاطر صورت سا آدمی تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ذرا سنبھل کر یوں آگے بڑھا جیسے بند دروازے کے پیچھے سے وہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا حالانکہ یہ ممکن نہیں تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ میرے آنے سے پہلے دروازہ پوری طرح بند تھا اور جب وہ شخص باہر آیا اس وقت دروازے کی ناب گھومی تھی۔ دروازے میں لگی ہوئی جھجک آئی سے بھی صرف سامنے کھڑا ہوا ایک ہی آدمی نظر آتا تھا جبکہ اس وقت ہم تینوں اس دروازے کے سامنے بھی نہیں کھڑے تھے۔ دروازے سے خاصا ہٹ کر کھڑے تھے۔

عجیب پُراسرار سے انداز میں وہ باہر آیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ پُراسرار انداز میں اس نے نہایت خاموشی سے میرے ہاتھ سے وزیٹنگ کارڈ اچک لیا اور کسی کے چہرے پر ایک نظر ڈالے بغیر ایک لفظ بولے بغیر واپس سوئٹ میں چلا گیا۔ دونوں گارڈز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر امریکیوں کے سے انداز میں کندھے اچکائے اور پیچھے ہٹ کر دروازے کے دونوں طرف دیوار سے لگ کر کھڑے ہوگئے۔ میرے آنے سے پہلے وہ غالباً اسی جگہ کھڑے تھے۔

چند لمحے بعد سوئٹ کا دروازہ دوبارہ کھلا۔ اس بار تھری پیس سوٹ میں ایک میانہ قد مگر بھاری بھرکم اور مضبوط جسم کا آدمی باچھیں پھیلاتا ہوا برآمد ہوا جیسے اسے اپنے کسی برسوں سے بچھڑے ہوئے دوست کی آمد کی اطلاع ملی ہو۔ حالانکہ اس کی صورت میرے لئے اتنی ہی اجنبی تھی جتنی افریقہ سے درآمد شدہ کسی بن مانس کی۔ تاہم اس کی شکل بن مانس سے مشابہ ہرگز نہیں تھی۔ اچھا خاصا خوش شکل اور ادھیڑ عمر آدمی تھا۔

وہ گرمجوشی سے مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا لیکن نہ جانے کیوں یہ گرمجوشی اس کے چہرے سے کچھ میل نہیں کھا رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس کے نقوش بہت نوکیلے اور پتھریلے سے تھے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا چہرہ پتھر کی کسی سل کو تراش کر بنایا گیا ہو اور مجسمہ ساز نے نقوش کو زیادہ ہی باریکی سے تراشے ہوں۔

ایک جھٹکے سے اس نے مصافحے کے لئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ بھی پتھر ہی سے تراشیدہ معلوم ہوتا تھا۔ نہ جانے

غیر ملکی زبانیں سیکھئے

مصنف: پروفیسر ایم اشرف

جرمن اردو ریڈر	90/=
جرمن اردو ڈکشنری	90/=
جرمن فریز بک	90/=
اطالوی اردو ریڈر	80/=
اطالوی اور ڈکشنری	90/=

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

ایک ثانیے کے لئے میرا دل چاہا کہ اس ہاتھ کو اپنے ہاتھ کی ... میں پیس کر رکھ دوں لیکن بلاوجہ ایسا کرنا ظاہر ہے کوئی ... حرکت نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر تو دوستی اور خوش خلقی ... پڑ رہی تھی۔

... اس نے ہینڈ پمپ کی طرح میرا ہاتھ ہلاتے ہوئے گرمجوشی سے ... کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ تاہم مجھے اتنا ضرور معلوم ہوگیا ... زبان ترکی تھی۔ میں نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے وہی ... عالم مصرع دہرا دیا۔

... یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

... وہ کم از کم اس مصرعے کی حد تک تو فارسی سمجھتا ہی ... نہایت خوش دلی سے ہنسا اور انگریزی میں بولا "معاف کیجئے گا ... چوہدری! میں اپنی اس کمزوری پر آج تک قابو نہیں پا سکا کہ ... گرمجوشی میں اپنی مادری زبان بولنے لگتا ہوں۔"

... میں اس سے کچھ زیادہ متنفس نہیں تھا۔ وہ ترک ہو بھی سکتا تھا ... عین ممکن تھا کہ وہ مجھے محض اپنے ترک ہونے کا یقین دلانے ... کوشش کر رہا ہو۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "مجھے کمال نے ... کہتے ہیں۔ میں پرنس تہمینہ کا منیجر ہوں۔ آیئے تشریف لایئے۔" ... نے سوئٹ کے دروازے کی طرف اشارہ کیا "میں آپ کو خوش ... دید کہتا ہوں۔"

"میں پرنس تہمینہ سے ملنے آیا ہوں۔" میں نے قدم بڑھائے ... کہا۔ میں گویا یہ کہتے کہتے رہ گیا تھا "مجھے تم سے ملنے کا کوئی شوق ... نہیں ہے۔" لیکن میں نے اپنے لہجے میں رُکھائی نہیں آنے دی تھی ... م جو تاثر میں دینا چاہتا تھا وہ اس نے لے لیا مگر ذرا بھی برا منائے ... بولا "میں آپ کو پرنس سے ہی ملانے لے جا رہا ہوں۔ میں اس ... فہمی میں مبتلا ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ آپ جیسے بڑے ... مجھ سے ملنے آئیں گے۔"

... میں نے گارڈز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مگر یہ تو کہہ ... ہے تھے کہ پرنس آرام کر رہی ہیں اور اس وقت کسی سے نہیں ... سکتیں۔"

"اوہو مسٹر چوہدری! آپ اتنے بڑے بزنس مین ہیں۔ آپ کو ... اندازہ ہونا چاہئے بلکہ آپ کو تو خود بھی یہ طریقے استعمال کرنا ... پڑتے ہوں گے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ یہ انتظامات کن لوگوں ... لئے ہوتے ہیں اور کن لوگوں کے لئے نہیں۔ کس وقت ان پر ... درآمد ضروری ہوتا ہے اور کس وقت انہیں واپس لے لیا جاتا ... ہے۔ آیئے تشریف لایئے۔ پرنس بے تابی سے آپ کا انتظار ... کر رہی ہوں گی۔"

اس راہداری میں صرف دو ہی وی آئی پی سوئٹ تھے اور ان ... دونوں کے دروازے بھی ایک دوسرے کے عین مقابل نہیں تھے۔ ... سوئٹ کو زیادہ سے زیادہ پرائیویسی فراہم کرنے کا پورا پورا خیال ... رکھا گیا تھا۔ میں کمال نے سن کی رہنمائی میں اندر پہنچا تو اس نے دروازہ میرے عقب میں مقفل کر دیا اور اپنی دانست میں میری نظر بچا کر چابی جیب میں ڈال لی۔ میں نے اسے احساس نہیں ہونے دیا کہ میں نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی تھی۔ اس قسم کی حرکتوں پر مجھے تشویش زدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس قسم کی ملاقاتوں پر جاتے وقت ایسی حرکتیں میرے لئے متوقع ہوتی تھیں۔ کچھ کا انتظام کر کے آتا تھا اور کچھ کا توڑ کرنے کے لئے میں خود بھی تیار رہتا تھا۔

آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم سے گزر کر ہم سیدھے بیڈ روم میں جا پہنچے۔ پرنس تہمینہ سامنے ہی ایک آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ کمال نے سن نے کہا تھا کہ وہ بے تابی سے میرا انتظار کر رہی ہوگی لیکن پرنس جس انداز میں بیٹھی تھی اسے اور خواہ کچھ بھی کہہ لیا جاتا' کم از کم بے تابانہ انداز نہیں کہا جا سکتا تھا۔

وہ بالکل بت بنی بیٹھی تھی۔ ایک ایسا بت جس کی آنکھیں کسی انجانے خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے دونوں بازو آرام کرسی کے ہتھوں پر یوں جمے ہوئے تھے گویا وہ بمشکل اپنے آپ کو اٹھ بھاگنے سے باز رکھ رہی ہو۔ اس کے سڈول جسم پر ایک نہایت نفیس ٹلر نہایت ناکافی لبادہ تھا۔ لبادہ کیا تھا' بس لبادے کا خلاصہ ہی تھا۔ وہ پورے میک اپ میں تھی۔ گلے میں جوگیوں جیسی' موٹے موٹے منکوں والی ایک مالا تھی جو اس کے گلے میں کچھ یوں پچ رہی تھی کہ شاید ہیروں کا ہار بھی اس کے سامنے پیچ معلوم ہوتا۔ اگر اس کے چہرے پر اتنا خوف نہ ہوتا اور وہ جسم کو کچھ ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھی ہوتی تو شاید ڈانسر کے بجائے پرنس ہی معلوم ہوتی۔

وہ گھریلو ملازم نما شخص جو میرا وزیٹنگ کارڈ لے کر اندر آیا تھا' ایک کونے میں قدیم زمانے کے غلاموں کی طرح ہاتھ باندھے' نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ وہ گویا مراقبے میں تھا۔ کچھ دیکھ رہا تھا نہ سن رہا تھا۔

میں نے سوئٹ میں داخل ہوتے وقت اور بیڈ روم تک پہنچنے کے دوران غیر محسوس طور پر اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر اطمینان کر لیا تھا کہ وہاں کمال نے سن' پرنس اور اس ملازم نما شخص کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ البتہ وارڈ روب کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن اس میں کسی کے ہونے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ ماڈرن ہوٹلوں کی الماریاں ایسی نہیں ہوتی تھیں کہ ان میں کوئی آسانی سے چھپ سکتا۔ اور پھر وارڈ روب کا دروازہ پوری طرح بند تھا۔ ایسی انٹرنائٹ الماری میں چند منٹ چھپنے کے لئے بھی بڑا حوصلہ درکار تھا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی پرنس تہمینہ نے اپنے تاثرات پر قابو پانے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ ایک کامیاب اداکارہ کی طرح اس کے تاثرات یکسر ہی تبدیل ہوگئے۔ وہ حتی الامکان پُرسکون اور پُراعتماد نظر آنے لگی۔

"ہیلو مسٹر چوہدری! خوش آمدید۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ اس کا

اٹھتا گویا ایک خوب صورت سانچے میں ڈھلی ہوئی سمندری موج کا اٹھنا تھا۔ اس کے اعضا میں لہروں کا سا لوچ تھا۔ میں حیران تھا کہ جب میں نے اسے ہنی کی حیثیت سے دیکھا تھا تب مجھے اس میں اتنی خوب صورتیاں کیوں نظر نہیں آئی تھیں؟

شاید اب وہ کچھ پالش' ہو کر سامنے آئی تھی۔ شاید پہلے مجھے اس کی طرف اتنی گہری نظروں سے دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اور شاید اس وقت اس کا حدود اربعہ اتنی تفصیل سے سامنے بھی نہیں آیا تھا۔ اس کی مرحوم ماں نے ذکر تو کیا تھا کہ اس کے ایک ڈانس نے فلم میں بڑی دھوم مچائی تھی مگر میں وہ فلم بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ یقیناً اس میں وہ کچھ اسی انداز میں سامنے آئی ہوگی' جس انداز میں آج کل اس کا ڈانس شو چل رہا تھا۔

اس نے بڑی تمکنت سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ایک لمحے پہلے اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے خوف کے باوجود اس کا ہاتھ سرد نہیں تھا۔ کمال نے سن کے ہاتھ کے چھریلے لمس کے بعد اس ہاتھ کی حرارت اور گداز ایک خوش گوار تجربہ تھا۔

وہ کھنکتی سی آواز میں انگریزی میں بولی "میں شکر گزار ہوں کہ آپ مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے مسٹر چوہدری! مجھے آپ سے مل کر حقیقتاً بہت خوشی ہوئی ہے۔" الفاظ میں بڑی روانی تھی' لہجے میں حتی الامکان خلوص سمونے کی کوشش کی گئی تھی لیکن پھر بھی اس میں ایک پیشہ ورانہ سا رنگ آگیا تھا۔ نہ جانے اس جملے کی... اور اس جیسے دوسرے کتنے جملوں کی کتنی مشق کی گئی تھی۔

"مجھے بھی آخر کار تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہنی... عرف حسنہ... عرف پرنس تہمینہ!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

اس کی آنکھوں میں ایک ثانئے کے لئے وہی پہلا سا خوف عود کر آیا۔ رنگت ذرا متغیر ہوئی مگر فوراً ہی سنبھلتے ہوئے وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولی "اس اپنائیت کے لئے بھی میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے ہنی کہہ کر مخاطب کیا۔ میرے لئے یہ بات ناگواری کے بجائے خوشی کا باعث بنی ہے۔"

"اور حسنہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"حسنہ...؟" اس کی محرابی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ "میں سمجھی نہیں۔ آپ اگر مجھے اس نام سے مخاطب کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ویسے یہ میرے نام کا حصہ نہیں۔ لیکن آپ جس نام سے بھی پکاریں' میرے لئے وہی اچھا ہے۔"

"تلافی تم پر ختم ہے ہنی! تمہارے منہ سے یہ اپنائیت بھرے الفاظ سن کر بڑے بڑے لوگ پھڑک اٹھتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں اس وقت یہاں دل فریب جملوں سے خوش ہونے نہیں' حقیقت جاننے آیا ہوں۔"

"کیسی حقیقت مسٹر چوہدری؟ کس کی حقیقت؟" اس نے نہایت معصومیت سے انگریزی میں ہی پوچھا۔

"سو ہنیو! ہن اے نخرے بازیاں چھڈ دی دیو۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ مجھے معلوم تھا ہنی ٹھیٹھ پنجابی بھی اچھی طرح بولنی سمجھتی تھی۔

لیکن اس وقت وہ اپنی اداکاری جاری رکھنے پر تلی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں معصومیت سے ہٹ پٹاتے ہوئے بولی "میں نے یہ زبان یہاں سنی تو ہے لیکن میں ابھی اسے سمجھنے نہیں لگی۔ ویسے میں زبانیں سیکھنے کے معاملے میں بڑی تیز ہوں۔ جس ملک' جس علاقے میں بھی جاتی ہوں' چند ہی روز میں گزارے لائق اس کی زبان سیکھ لیتی ہوں۔ یہ غالباً یہاں کی علاقائی زبان میں کچھ کہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو ہفتے بعد میں آپ کو ایسے چھوٹے موٹے جملوں کا جواب دینے کے قابل ہو جاؤں گی۔"

"جان!" میں نے گہری سانس لے کر کہا "اگر میں نے تمہارے سر پر دست شفقت رکھ دیا تو تم چند ہی سیکنڈ میں نہ جانے کن کن زبانوں میں کیسی کیسی باتوں کا جواب دینے کے قابل ہو جاؤ گی۔"

کمال نے سن ہم دونوں کے درمیان ریفری کی طرح کھڑا تھا اور گویا انتظار کر رہا تھا کہ دونوں حریفوں میں اصل معرکہ شروع ہو تو وہ پوائنٹ گننے شروع کرے۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولا "میرا خیال ہے ہمیں کم از کم بیٹھ تو جانا چاہئے۔ سنگین سے سنگین گفتگو بھی بیٹھ کر ہو سکتی ہے۔" اس کے لہجے میں اب پہلے جیسی خوش خلقی یا انکساری نہیں تھی۔

ہم تینوں شیشے کی ایک سینٹر ٹیبل کے گرد کھڑے تھے۔ بیٹھنے میں پہل پرنس تہمینہ نے ہی کی۔ پھر میں اور کمال نے سن بھی بیٹھ گئے۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی اہم کانفرنس شروع ہونے والی ہو اور شرکا نے اپنی نشستیں سنبھال لی ہوں۔

میں نے قدرے بے زاری سے پرنس تہمینہ کو مخاطب کیا "میں زیادہ لمبی باتوں میں پڑنا نہیں چاہتا ہنی! تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ تمہاری گمشدگی سے میں کتنا پریشان تھا' کوئی ذرا سا سراغ بھی میرے سامنے ہوتا تو میں نہ جانے کیا کچھ کر گزرتا۔ لیکن سراغ کے بجائے اب تم خود ہی مجسم سامنے آگئی ہو تو مجھے پہچاننے سے بھی منکر ہو۔ کیا اس طرح صلہ دیتے ہیں کسی کی ہمدردی کا؟"

وہ یوں خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی جیسے میری گفتگو کا ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔ کمال نے سن کی پُراسرار خاموشی بھی برقرار رہی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا شاید وہ دونوں منتظر تھے کہ مجھے جتنا بولنا ہے میں بول چکوں تاکہ انہیں اندازہ ہو جائے کہ میں کیا جانتا ہوں' کتنا جانتا ہوں۔

وہ ایک لمحے کے لئے پیشانی مسل کر الجھن زدہ لہجے میں بولی "کیا آپ واقعی سنجیدگی سے یہ ساری گفتگو کر رہے ہیں؟ قسم سے

ساری باتوں کے سر پیر کا پتا نہیں چل رہا۔"

ہنی!" میں نے ملائمت سے کہا "کیا تم ابھی تک اپنے آپ یقین دلانے پر تلی ہوئی ہو کہ میں نے تمہیں نہیں پہچانا؟ یہ ہے کہ اس رات جب تم نے مجھے حسنہ کے نام سے پکارا تو ہی تمہیں نہیں پہچان سکا تھا۔ لیکن تمہیں اتنا تو یاد ہوگا کہ ت تم فرفر اردو بول رہی تھیں۔ پھر میں نے آج کے اخبار مارا ایک کلوز اپ دیکھا اور صرف آنکھوں کی وجہ سے پہچان لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری صورت یکسر ل ہے۔ لیکن تمہاری آنکھیں وہی ہیں۔ میں ان آنکھوں کو ں میں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتا۔ اب تو یہ آنکھیں اپنے پیشہ تقاضوں یا کچھ اور مصلحتوں کی وجہ سے پل پل رنگ بدلتی ہیں س وقت ان بڑی بڑی آنکھوں میں صرف ایک بے عنوانی سی بسیرا کئے رہتی تھی۔ اور اسی لئے یہ آنکھیں مجھے بہت پسند میرے دل پر نقش تھیں۔ اسی لئے میں نے انہیں پہچان بھی اسی لئے میں ان کے بارے میں اتنا پُریقین بھی ہوں۔"

پرنس تہمینہ کے ہونٹ ایک لمحے کے لئے تھرتھرائے مگر اس نہیں سختی سے بھینچ لیا۔ کمال نے سن کھنکار کر گلا صاف کرتے بولا "جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں' آپ کو پرنس تہمینہ پر اپنی دوست کا گمان گزر رہا ہے مسٹر چوہدری! جبکہ آپ یہ بھی تسلیم ہے ہیں کہ میڈم کی شکل آپ کی اس دوست سے بہت مختلف آخر آپ میڈم سے اپنی بات منوانے پر کیوں تلے ہوئے آپ کو میڈم کے چہرے پر صرف آنکھیں شناسا لگ رہی ہیں تو ان کو اپنی دوست قرار دینے پر بضد ہیں۔ اس دنیا میں تو بعض ت دو آدمی مکمل طور پر ایک دوسرے کے ہم شکل بھی نکل ہیں لیکن بہرحال وہ دو مختلف انسان ہوتے ہیں۔"

میں نے کمال نے سن کو گھورتے ہوئے کہا "چلو... یہ ہنی نہ م از کم حسنہ ہونے کا تو اقرار کرلے۔ منگل کی رات دو بجے یہ اسی شکل صورت' اسی سراپا کے ساتھ ایک نیم تاریک گلی میں آئی تھی۔" میں نے مختصراً وہ واقعہ دُہرایا اور زہریلے لہجے میں "اب تم کہو گے کہ وہ بھی کوئی اور عورت تھی۔"

"یہ ایک عجیب اتفاق ہو سکتا ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا "آپ عجیب کہانی لے کر ہمارے پاس آئے ہیں مسٹر چوہدری! لیکن ال... زندگی اتفاقات کا ہی مجموعہ ہے۔ آپ ان ساری باتوں بھول کیوں نہیں جاتے؟ بھول جانے میں آپ کا کیا نقصان ہے؟ نہیں آپ کا کچھ لے کر بھاگی ہے اور نہ ہی حسنہ نے آپ کو کوئی مان پہنچایا ہے۔"

"مسٹر کمال نے سن... یا جو کچھ بھی تمہارا نام ہے..." میں اسے گھورتے ہوئے سرد لہجے میں کہا "اگر میں تمہارے منہ پر ونسا مار کر تمہارے کچھ دانت پیٹ میں پہنچا دوں تو یہ بھی محض اتفاق ہوگا۔"

اس کا چھریا ہوا سا چہرہ بدستور سپاٹ رہا اور اسی سپاٹ لہجے میں وہ بولا "نہیں مسٹر چوہدری! یہ اتفاق نہیں' غلطی ہوگی' ایک سنگین غلطی۔"

"تب بھی مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ میری زندگی میں اس قسم کی سنگین غلطیوں کا انبار لگا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ وہ کچھ نہ بولا' ایک ٹک میری طرف دیکھتا رہا۔ لیکن اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں ایک ڈانسر کے منیجر کی آنکھیں نہیں تھیں۔

میں نے ان آنکھوں کی سفاکی کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا "مسٹر کمال نے سن! تمہارا کہنا ہے کہ میں صرف آنکھیں شناسا ہونے کی وجہ سے پرنس تہمینہ پر ہنی ہونے کا شبہ کر رہا ہوں؟ بات صرف آنکھوں کی نہیں ہے' وجہ ان کی بھی ہے۔ میرا وجدان کہہ رہا ہے کہ یہ آنکھیں ہنی کے سوا کسی کی بھی نہیں ہو سکتیں۔ اور اب... جبکہ میں اس عورت کے روبرو بیٹھا ہوں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہنی کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ مجھے اس گہرے میک اپ اور کلون کی خوشبوؤں تلے سے ہنی کے وجود کی خوشبو آرہی ہے۔ انسان اُن گنت خوشبوئیں استعمال کرتا ہے مگر اس کے اپنے وجود کی بھی ایک الگ بدبو یا خوشبو ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں کوئی مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ اس معاملے میں میری قوتِ شامہ کسی بلڈ ہاؤنڈ سے بھی تیز ہے۔"

"لیکن مسٹر چوہدری...!" کمال نے سن بدستور پُرسکون لہجے میں بولا "پرنس تہمینہ ایک عالمی شہرت یافتہ شخصیت ہیں۔ ان کے پاس ٹرکش پاسپورٹ موجود ہے۔ آٹھ سال سے اسٹیج کی دنیا میں اس نام کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ دنیا کے تقریباً چالیس ممالک میں میڈم اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی ہیں۔ وہاں کے اخباروں رسالوں میں ان کے فن کے مظاہروں کی ایک تاریخ محفوظ ہے۔ یہ شخصیت کوئی راتوں رات اٹھ کر سامنے نہیں آگئی جو آپ ایسا بے سروپا قسم کا دعویٰ کر رہے ہیں۔"

"ہاں... کام تو یقیناً پکا کیا گیا ہوگا۔" میں نے تسلیم کیا "یہی گتھی سلجھانے کے لئے تو میں آیا ہوں۔ عین ممکن ہے اصلی پرنس تہمینہ کو غائب کر دیا گیا ہو اور اس کی جگہ اس عورت کو سامنے لایا گیا ہو۔ کاغذات یا پاسپورٹ اور دیگر سب چیزیں پرنس تہمینہ کی.... میرا مطلب ہے اصل پرنس تہمینہ ہی کی چل رہی ہوں۔ میرے خیال میں تم جن لوگوں کی نمائندگی کر رہے ہو' ان کے لئے تو یہ.... اور اس قسم کے ہزاروں دوسرے کام بائیں ہاتھ کا کھیل ہیں۔"

"اور آپ کے خیال میں' میں کن لوگوں کی نمائندگی کرتا ہوں مسٹر چوہدری؟" وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ اس کی آنکھیں سانپ کی معلوم ہوتی تھیں گو کہ وہ گول نہیں تھی۔ مگر وہ انہیں جھپکتا ہی نہیں تھا۔ شاید اس

وقت جھپکتا تھا جب میری نظر اس کی طرف نہیں ہوتی تھی۔

"کاش مجھے ان کے بارے میں صحیح طور پر کچھ معلوم ہوتا!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "صرف ایک نام اب تک سامنے آیا ہے۔ شاید وہ بھی فرضی ہو۔ لیکن مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا ہے کہ وہ معمولی لوگ نہیں ہیں اور معمولی چکروں میں نہیں ہیں۔ کوئی بہت ہی بڑا سیٹ اپ ہے اور بہت ہی بڑے مقاصد ہیں۔ لیکن تم انہیں میری طرف سے بھی پیغام دے دینا۔ اگر تمہاری بہت اونچی سطح تک رسائی ہے تو ان سے کہہ دینا کہ وہ مجھے انڈر ایسٹی میٹ نہ کریں' مجھ سے پنگا نہ لیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مجھے اذیت پہنچانے کے لئے نئے نئے طریقے اختیار نہ کریں اور مجھے بلیک میل کرنے کے لئے میرے دوستوں اور ہمدردوں کو مشق ستم نہ بنائیں۔"

"یہ پنگا کیا ہوتا ہے مسٹر چوہدری؟" کمال نے سن نے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا۔ میں نے اپنی گفتگو میں اس لفظ کا انگریزی میں ترجمہ نہیں کیا تھا۔ جو بات اصل میں تھی وہ ترجمے میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔

"پنگا.... بس پنگا ہی ہوتا ہے۔ جب انسان لے چلتا ہے تب ہی اس کی سمجھ میں آتا ہے کہ اس نے دراصل پنگا لیا ہے۔ عام طور پر اس کے بارے میں پہلے سے خبردار کرنے سے انسان خبردار نہیں ہوتا۔" میں نے وضاحت کی۔

"آپ فکشن مائنڈڈ آدمی معلوم ہوتے ہیں چوہدری!" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "اتنے بڑے آدمی بننے کے بعد آپ کو بہت پریکٹیکل ہونا چاہئے تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ذہن افسانہ طرازیوں میں الجھا رہتا ہے۔ زندگی کسی جاسوسی ناول' جرم و سزا کی کہانی یا اسپائی فلم سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ آپ بہت سیدھی سادی چیزوں میں پیچیدگیاں ڈھونڈنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔"

"مسٹر کمال نے سن! مجھے زندگی کے بارے میں سبق پڑھانے کی کوشش مت کرو۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں زندگی کیا ہوتی ہے اور کیا نہیں۔ میں نے زندگی کا ہر رنگ' ہر ڈھنگ اور ہر روپ دیکھا ہے' اس لئے مجھے یقین ہو چکا ہے کہ زندگی درحقیقت جاسوسی ناولوں' جرم و سزا کی کہانیوں اور اسپائی فلموں سے زیادہ پُراسرار' پیچیدہ اور سنسنی خیز ہے لیکن ہر ایک کی زندگی نہیں۔ زندگی اپنی پُراسراریت' اپنی پیچیدگیوں اور اپنی سنسنی خیزیوں کے اظہار کے لئے کسی کسی کو منتخب کرتی ہے۔"

وہ بدستور ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بات جاری رکھی "میں جب نوعمر تھا' غریب تھا تب فکشن مائنڈڈ تھا۔ خیالوں خوابوں کی دنیا میں کھویا رہتا تھا۔ مستعار لے کر فلمی رسالے' جاسوسی ناول' اسپائی کہانیاں' غرضیکہ جو مل جاتا تھا پڑھتا تھا اور میرا ذہن نہ جانے کن کن بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہتا تھا لیکن اُس وقت عملی زندگی میں مجھے کوئی پُراسرار' کوئی سنسنی خیز' کوئی انوکھا واقعہ پیش نہیں آتا تھا۔ میری زندگی اتنی ہی سپاٹ تھی جتنی جوہڑ میں پڑے ہوئے کسی مینڈک کی۔ ذرا چھلانگ لگائی تو ایک قدم آگے ہو گئے' پھر ذرا پھدک کر تو دو قدم پیچھے ہو گئے۔ اور سوچا کر بس یہی کل کائنات ہے۔ عجیب و غریب اور الجھے ہوئے واقعات تو مجھے اس وقت سے پیش آنے شروع ہوئے ہیں جب سے میں دولت مند ہوا ہوں۔ معاشرے میں مجھے کوئی مقام حاصل ہوا ہے۔"

اس سے پہلے کہ کمال نے سن مزید کچھ کہتا' میں نے پرنسس تہمینہ کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا پھیلی پھیلی سی آنکھوں سے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے کمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تہمینہ کو مخاطب کیا "ہنی! تمہیں اس سے... یا کسی سے بھی ڈرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ تم پر جو بھی گزری ہے' بلا جھجک اور بلا کم کاست مجھے بتا دو۔ یہاں نہیں بتا سکتیں تو گھر چل کر بتا دینا' میں تمہیں لینے ہی آیا ہوں۔"

میرا خیال تھا کہ ہنی عرف پرنسس تہمینہ' کمال کی طرف التجائی نظروں سے دیکھے گی۔ وہ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی دھمکی دے گا اور وہ دل کی بات کہتے کہتے رہ جائے گی۔ لیکن وہ اس کے! ہی دھیمی سی آواز میں بولی "میں کمال کی بات کی تائید کروں گی۔ آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کو بیک وقت مجھ پر دو مختلف شخصیتوں کا گمان گزر رہا ہے جبکہ میں اصل میں تیسری شخصیت ہوں۔ یعنی پرنسس تہمینہ۔ اس کے سوا میرا کوئی اور نام یا کوئی اور شخصیت نہیں ہے۔ اور نہ کبھی رہی ہے۔ میں آپ کے تصورات کو دھچکا پہنچانے کے سلسلے میں معذرت خواہ ہوں لیکن میں مجبور ہوں میں بھلا آپ کی انسونی سی باتوں کو کیونکر تسلیم کر لوں۔ بات ہی ایسی ہے کہ میں محض آپ کا دل رکھنے کو بھی اسے تسلیم نہیں کر سکتی۔"

گویا جس پر تکیہ تھا وہ پتہ بھی ہوا دے رہا تھا۔ میں نے یکد

تاریخی ناول

ابلیس مصر	الماس ایم۔اے	-/00
حسن بن صباح	الماس ایم۔اے	-/25
راجکماری	الماس ایم۔اے	-/50
نورالدین زنگی	الماس ایم۔اے	-/50
سلطان عادل	الماس ایم۔اے	-/50

مکتبہ القریش اُردو بازار۔لاہور 2

ائی اختیار کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے' جیسے تم دونوں کی میں نے تو سوچا تھا کہ ہنی اگر میری کوششوں سے اپنے گھر پہنچ جائے اور سکون و عافیت سے آئندہ زندگی گزار سکے تو ے عوض میں بلیک باکس ان لوگوں کے حوالے کر دوں گا اس کی تلاش ہے۔ میرے لئے ہنی زیادہ اہم تھی' وہ بلیک نہیں۔ میری نظر میں یہ سودا برا نہیں تھا۔ لیکن تم دونوں تو نیقت کو حقیقت تسلیم کرنے کے لئے ہی تیار نہیں ہو۔ میں ں۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھہرو مسٹر چوہدری!" کمال نے سن تیزی سے بولا۔ پہلے تو س کی آنکھیں ہی عجیب لگ رہی تھیں کہ سانپ کی طرح وہ جھپکتا نہیں تھا' اب مجھے اس کی آواز بھی سانپ کی پھنکار شابہ محسوس ہوئی۔

میں نے چڑانے کے لہجے انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے بغیر بولا "اب بلیک باکس کا ذکر ں گیا ہے تو تم اتنی آسانی سے نہیں جا سکتے۔"

"کون روکے گا مجھے؟" میں نے اس کی طرف تھوڑا سا جھکتے ے پوچھا "تم.... یا تمہارے وہ جعلی گارڈز جو شیٹر کی وردی پہنے کھڑے ہیں؟"

سنجیدہ گفتگو شروع ہونے کے بعد وہ خوش خلقی سے باچھیں لنے کی اداکاری بالکل بند کر چکا تھا۔ اب پہلی بار اس کے ں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری لیکن یہ مسکراہٹ بس ایسی تھی جیسے کسی مجسمے نے کسی ہلکے پھلکے جادو کے زیر اثر اپنے ں کو مبہم سی حرکت دینے کی کوشش کی ہو۔

"میں تمہارے بارے میں بہت کچھ سن چکا ہوں مسٹر چوہدری! ب کچھ یقین سا آنے لگا ہے کہ وہ درست ہی ہو گا۔ تمہاری یات بہت تیز ہیں۔ بالکل درندوں کی طرح' جو بہت سی ایسی باتیں ں محسوس کر لیتے ہیں جن کا بظاہر کوئی جواز نہیں ہوتا۔ تم نے یقیناً شیٹر کے سارے گارڈز کی شکلیں تو نہیں دیکھ رکھی ہوں گی لیکن تم نے محسوس کر لیا۔"

ایک ثانئے کی خاموشی کے بعد وہ ہاتھوں کی انگلیاں ایک سرے میں پھنساتے ہوئے بولا "لیکن اس صورت میں تمہیں ان سے زیادہ خطرہ محسوس کرنا چاہئے کہ وہ شیٹر کے گارڈز نہیں ہیں۔ ائیویٹ سیکیورٹی ایجنسیوں کے گارڈز بھی بھلا کوئی گارڈز ہوتے ہیں۔ ان میں اور تمہارے ملک کی پولیس میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ یہ سب وہ پتلے ہیں جو پرندوں کو ڈرانے کے لئے کھیتوں میں کھڑے کر دئے جاتے ہیں۔ ان سے صرف پرندے ہی ڈرتے ہیں' درندے نہیں۔ لیکن وہ جو باہر کھڑے ہیں ان سے درندوں کو بھی ڈرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ عجیب ہی چیز ہیں۔ محسوسات نام کی کوئی چیز ان میں نہیں ہے۔ بس آنکھیں بند کر کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں درندوں سے بھی بدتر ہیں۔"

میں نے قدرے بے زاری سے کہا "بس۔ زیادہ قصیدہ خوانی کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت کھڑے نہیں' لیٹے ہوئے ہوں گے۔ تمہارا کہنا شاید درست ہو کہ وہ آنکھیں بند کر کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں لیکن اس وقت ان کی آنکھیں بند ہونا تو نہیں' حقیقتاً بند ہوں گی۔"

"کیا مطلب؟" اس کی پیشانی کی شکنوں میں ایک اور شکن کا اضافہ ہو گیا۔

"اس سوئٹ کے سامنے والا بھی وی آئی پی سوئٹ ہے نا؟" میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ اس نے الجھن آمیز انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

"اور تم اپنے گارڈز کی جتنی تعریفیں کر رہے تھے اس سے مجھے وہ بھی وی آئی پی محسوس ہونے لگے تھے۔ چنانچہ انہیں وی آئی پی سوئٹ میں پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ اس وقت لگژری بیڈ پر اوندھے لیٹے آرام کر رہے ہوں گے۔ ان کے ساتھ تھوڑی سی ناشائستگی صرف یہ ہوئی ہو گی کہ ان کے ہاتھ پشت پر باندھ دئے گئے ہوں گے... اور عین ممکن ہے پاؤں بھی بندھے ہوئے ہوں۔ اس کے لئے میں پیشگی معذرت خواہ ہوں۔"

"یہ کیا بکواس ہے!" وہ برہمی سے بولا اور اس کے پتھرائے ہوئے نقوش میں یک لخت بھونچال سا آ گیا۔

"یہ بکواس نہیں' چند چھوٹی موٹی تبدیلیاں ہیں جو باہر رونما ہو چکی ہوں گی لیکن تم یہاں ہونے کی وجہ سے انہیں دیکھ نہیں پا رہے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"اور تم کیا انہیں دیکھ رہے ہو؟" اس نے طنزیہ سے لہجے میں پوچھا۔

"تقریباً یہی سمجھ لو۔" میں نے جواب دیا "میں جب وقت کا تعین کر کے اپنے آدمیوں کو کوئی کام بتا کر آتا ہوں تو آنکھیں بند رکھتے ہوئے بھی مجھے یقین ہوتا ہے کہ وہ کام اسی طرح ہو رہا ہو گا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"مگر سامنے والے سوئٹ میں تو کوئی غیر ملکی ڈپلومیٹ ٹھہرا ہوا ہے۔" کمال اپنی برہمی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"وہ آج شام جا چکا ہے۔ انہوں نے معلوم کر لیا تھا۔ وہ کچا کام نہیں کرتے۔"

"میں ابھی دیکھ لیتا ہوں۔" وہ اٹھنے لگا۔

میں نے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ایک معزز آدمی کی بات پر یقین کرنا چاہئے۔ ویسے بھی شاید کسی کو اس وقت تمہارا اس کمرے سے باہر جانا پسند نہ ہو۔" میں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ ذرا سا کھل چکا تھا اور اس سے ایک ریوالور کی چھپی' خوف ناک سی نال جھانک رہی تھی۔

ریوالور جس کے ہاتھ میں تھا وہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ احمد ہوگا۔ احمد بلاشبہ کمال کا آدمی تھا۔ مقفل دروازے کو بے آواز طریقے سے کھولنے میں اس کا جواب نہیں تھا۔ کمال نے سن جیسے شاطر و ہوشیار آدمی کو بھی پتا نہیں چلا تھا کہ کب سوئٹ کا بیرونی دروازہ اور پھر بیڈ روم کا دروازہ کھلا تھا۔ باہر اس کے دونوں مسلح گارڈز کو کب قابو میں کیا گیا اور کب سامنے والے سوئٹ میں منتقل کیا گیا' اس کا تو اسے ذرا بھی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کام میں احمد کے ساتھ آفتاب شریک تھا۔

اس وقت مجموعی طور پر انٹرکان میں میرے چھ آدمی ڈیوٹی پر تھے۔ احمد کے ریوالور کی نال تو بیڈ روم میں جھانک رہی تھی۔ آفتاب باہر دروازے پر تعینات تھا۔ منیر اور مسعود پہلے ہی نیچے کمپاؤنڈ میں موجود رہتے ہوئے سوئٹ کی نگرانی کر رہے تھے۔ صفدر اور سلیمان ہوٹل سے باہر جانے کے راستوں پر تعینات تھے۔ میں ہنی کو ساتھ لے جانے کا پورا بندوبست کر کے آیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ آسان کام نہیں ہوگا۔

کمال نے سن اٹھ چکا تھا لیکن ایک لمحے تک دروازے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد وہ گہری سانس لے کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر دوبارہ پہلا سا ٹھہراؤ آگیا۔ اس نے گویا دل ہی دل میں اعتراف کر لیا تھا کہ جو کچھ ہو رہا تھا اس کو روکنے کے لئے اب کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور اس احساس کے ساتھ گویا اسے قرار سا آگیا تھا۔

"یہ سب کیا ہے مسٹر چوہدری؟" اس نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہموار لہجے میں پوچھا۔

"یہ سب میرے ریموٹ کنٹرول نظام کا ایک حصہ ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اور اس وقت اس نظام کی کارکردگی مجھے دکھانے کا مقصد؟" اس نے ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ میں ہنی کو ساتھ لے جانے کے لئے آیا ہوں۔" میں نے دوستانہ لہجے میں جواب دیا "مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں ہے کہ کوئی میرے دوستوں کو اغوا کرے اور انہیں کھلونوں کی طرح استعمال کرتا پھرے۔"

وہ بڑی تحمل مزاجی سے بولا "یہ عورت جسے آپ ہنی سمجھنے پر بری طرح بضد ہیں' پہلے اس سے تو پوچھ لیجئے۔ کیا یہ آپ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہے؟" اس کے لہجے میں بڑا زہر تھا لیکن شکر میں لپٹی ہوئی گولی کی طرح۔

میں نے ہنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرے ساتھ چلو۔ اس سے اچھا موقع تمہیں پھر نہیں ملے گا۔ میں تمہاری خاطر بڑا رسک لے رہا ہوں۔"

وہ گویا سر پیٹتے پیٹتے رہ گئی اور بے زاری سے بولی "مسٹر چوہدری! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں ہنی نہیں ہوں۔ اس لئے میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ اگر یہ ہنی سمجھ کر آپ کو کوئی خوشی مل رہی ہے تو بے شک سمجھتے رہیں لیکن مجھے ساتھ لے جانے کی ضد مت کیجئے۔ میں جہاں ہوں بہت خوش ہوں۔ آخر آپ کیوں خون خرابہ کرانے پر تلے ہوئے ہیں؟"

یہ میرے لئے شرمسار کر دینے والی صورتِ حال تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ اتنا تردد میں نے کس لئے کیا تھا؟ لیکن یہ ایسا اٹھا ہوا قدم تھا جس کا واپس ہونا بڑا مشکل تھا۔ واپسی میں بھی بہرحال خطرات پنہاں تھے۔

"اگر کسی نے کوئی حماقت نہ کی تو کوئی خون خرابہ نہیں ہوگا۔" میں نے ہنی کو یقین دلایا "اگر میرے ساتھ چلنے میں تمہاری کوئی مجبوری آڑے آرہی ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں اس کا بھی حل نکال لوں گا۔"

"میری سب سے بڑی مجبوری تو یہی ہے کہ میں ہنی نہیں ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی "دوسری مجبوری یہ ہے کہ اس ہوٹل میں میرا ایک ماہ کا کنٹریکٹ چل رہا ہے جس کو پورا ہونے میں ابھی تیئس دن باقی ہیں۔ اگر کنٹریکٹ میری طرف سے ٹوٹا تو مجھے لاکھوں روپے ہرجانہ ادا کرنا پڑے گا۔"

"جس مسئلے کا تعلق روپے پیسے سے ہو اس کی تو بالکل ہی فکر مت کرو۔ ہرجانہ جتنا بھی ہوا' بھر دیا جائے گا۔ اور کچھ؟" میں نے ان شناسا آنکھوں میں جھانکا جو اجنبی نظر آنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھیں۔

میری اس پیشکش سے وہ گویا زچ ہو گئی۔ اس نے مزید کچھ کہنے کے بجائے سر جھکا لیا' ساتھ ہی اس کے کندھے بھی بے جان سے انداز میں جھک گئے۔

کمال نے سن ہولے سے کھنکارنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر "تم نے ابھی بلیک باکس کی بات کی تھی۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "اور اس میں دلچسپی ظاہر کر کے تم نے ثابت کر دیا تھا کہ تم ریڈ ڈاٹ کے آدمی ہو۔"

"اس بات کو جانے دو کہ میں کس کا آدمی ہوں اور کس کا نہیں۔ ضروری نہیں کہ بلیک باکس سے دلچسپی صرف ریڈ ڈاٹ ہی کی ہو۔ ویسے بائی دا وے... یہ ریڈ ڈاٹ ہے کیا؟ کسی آدمی کا فرضی نام ہے؟"

"اب اتنے معصوم نہ بنو۔" میں نے بے زاری سے کہا "مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہنی کو ریڈ ڈاٹ نے اغوا کرایا تھا اور یہ انہی کے قبضے میں تھی۔ اور یہ بات خود ایڈم عرف ایڈی فون پر مجھ سے کہہ چکا ہے۔ وہ مجھے یہی نصیحتیں کیا کرتا تھا کہ میں اس کی تلاش کے سلسلے میں پریشان ہونا چھوڑ دوں۔"

"اور یہ ایڈم عرف ایڈی کون ہے؟" اس نے پوچھا۔ میرے تاڑنے کے باوجود وہ معصوم بننے پر تلا ہوا تھا۔

"تم عرف ایڈی تمہارا روحانی باپ ہے جسے تم نے فراموش کر دینا بھی ممکن ہے وہ تمہارا حقیقی باپ ہی ہو۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔" میں نے اسے تاؤ دلانے کے لئے کہا۔ تاؤ مجھے خود آرہا تھا۔

ہنی وہ ذرا بھی غصے میں آئے بغیر متاسفانہ سے انداز میں سر ہلاتے بولا "جب آدمی اس طرح جھنجلا کر جواب دے تو اس کا یہی ہوتا ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔"

"ظاہر ہے' اگر مجھے کچھ معلوم ہوتا تو بات کچھ آگے نہ بڑھ جاتی۔ میں اتنے عرصے تک ہنی کے معاملے میں بے دست و پا نہ بیٹھا رہتا۔" میں نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیا "لیکن ریڈ ڈاٹ کے بارے میں اتنا بے خبر بننے کا شوق کیوں چرایا ہے؟"

"ہو سکتا ہے مجھے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ معلوم ہو اور ہو سکتا ہے کہ کچھ معلوم نہ ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم ریڈ ڈاٹ کو چھوڑو اور کام کی بات کرو۔ اگر تم بلیک باکس میرے حوالے کر دو تو اس عورت کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو جسے تم ہنی سمجھ رہے ہو۔ اب یہ ہنی نکلے یا کچھ اور یہ تمہارا مقدر ہے۔"

"دیکھ لیا تم نے؟" میں نے ہنی کو مخاطب کیا "یہ ہے ان لوگوں کا طریقہ۔ تمہاری اوقات۔ یہ تمہاری مرضی معلوم کئے بغیر بلیک باکس کے عوض تمہیں میرے سپرد کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا لیا۔ شاید اس نے اب خاموش ہی رہنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

کمال نے سن بولا "تم پرنسس کو چھوڑو' مجھ سے بات کرو۔ اگر باہر کہیں ہے تو اپنے آدمیوں سے منگوا لو۔ ابھی... اسی کمرے میں ہم دونوں کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بلیک باکس میز پر رکھ کر پرنسس کا ہاتھ تھام کر اسے ساتھ لے جاؤ۔"

"بے چاری پرنسس!" میں نے ترحم آمیز لہجے میں کہا "جس کا اس کی تقدیر کا فیصلہ کر رہا ہے! میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں ایسی بھی کوئی پرنسس موجود ہے۔" میں ہنی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ شاید اس کے دل میں خوف کی دھند میں لپٹے ہوئے کسی جذبے کو سرکشی پر آمادہ کر سکوں مگر وہ میری طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔

کمال نے سن اب اپنے لہجے کی بے تابی نہ چھپا سکا۔ تیزی سے بولا "مسٹر چوہدری! کام کی بات کرو۔ وقت ضائع مت کرو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہارے پاس اتنا فالتو وقت ہوتا ہے۔"

"فالتو وقت تو میرے پاس واقعی نہیں ہوتا۔ دراصل وقت کو استعمال کرنے کے اپنے اپنے انداز ہوتے ہیں۔ میرے انداز تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ کام کی بات کے بارے میں گزارش یہ ہے میرے بھائی.... کہ میں بلیک باکس تمہارے حوالے کر ہی نہیں سکتا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ میرے پاس ہے ہی نہیں۔"

"تو تم جھوٹ بول رہے تھے؟" اس کے پتھرائے ہوئے چہرے پر ایک بار پھر زلزلے کے سے آثار نمودار ہوئے۔

"یہی سمجھ لو۔ میں بلف کر رہا تھا' جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ بلف کرنا میرا مشغلہ ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا "دوسری بات یہ کہ تم تو اس وقت شرائط عائد کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہو۔ ہنی عرف پرنسس تہمینہ کو تو میں ہر حال میں ساتھ لے ہی جاؤں گا۔ شاید اپنے یا میرے گھر پہنچنے کے بعد اسے یاد آجائے کہ یہ واقعی ہنی ہے۔"

"اتنی احمقانہ اور حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اچھی نہیں ہوتی۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ پھر اس نے ایک نظر گھڑی پر ڈالنے کے بعد کہا "میں بھی تمہیں اپنے ریموٹ کنٹرول نظام کا ایک معمولی سا نمونہ دکھاتا ہوں۔" وہ اس میز کی طرف بڑھا جس پر ٹی وی وغیرہ رکھا ہوا تھا۔

"کوئی احمقانہ حرکت نہ کرنا مسٹر نے سن!" میں نے خبردار کیا۔

"گن کی جو نالی دروازے سے جھانک رہی ہے یہ محض دکھاوے کے لئے نہیں ہے۔ یہ آتش و آہن بھی اگلتی ہے۔ تمہاری ذرا سی غلط حرکت تمہارے لئے موت کا پیغام ثابت ہو سکتی ہے۔ دروازے کی طرف پشت نہ کرنا۔ اور نہ ہی میری طرف۔"

اس نے ترچھی نظر سے میری طرف دیکھا۔ اسے احساس نہیں ہو سکا تھا کہ کب میرے ہاتھ میں مشین پسٹل آچکا تھا۔ اس کی نظر میں میرے اس پسٹل کے لئے بھی اور دروازے سے جھانکتی ہوئی نال کے لئے بھی بے پناہ حقارت ابھر آئی۔

"دو بڑے آدمیوں کو بات چیت کرتے وقت اس قسم کے کھلونوں سے ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔" وہ مربیانہ لہجے میں بولا "یہ چھوٹے لوگوں کے کام آنے والی چیزیں ہیں۔ کیا تم ان پر بہت زیادہ بھروسا کرتے ہو مسٹر چوہدری؟"

"بھروسا تو میں صرف اوپر والے پر کرتا ہوں۔" میں نے درویشیانہ انداز میں انگلی اٹھا کر چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور بولا "ہو سکتا ہے ان کھلونوں کی موجودگی میں بھی تم اس ہوٹل سے باہر نہ جا سکو۔"

"اگر میں ہوٹل سے باہر نہ جا سکا تو ہوٹل ملبے کا ڈھیر بن جائے گا ڈیئر کمال نے سن!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیکھا جائے گا۔" وہ بے پروائی سے کندھے اُچکا کر بولا۔ "لیکن تمہارے لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ زیادہ بڑی بڑی باتیں مت کیا کرو۔"

محتاط انداز میں وہ اس طرح ٹی وی کی طرف بڑھا کہ اس کے ہاتھوں کی حرکات و سکنات دیکھی جا سکیں۔ اس نے ٹی وی ٹرالی

کھولی۔ اس میں وی سی آر رکھا ہوا تھا۔ کمروں میں رکھے ہوئے ٹی وی ہوٹل کے ایک مرکزی وی سی آر سے منسلک تھے لیکن وی آئی پی سوئٹ میں ایک الگ وی سی آر کی موجودگی کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ وہ سوئٹ میں قیام کرنے والے کا اپنا بھی ہو سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہوٹل والوں نے فراہم کیا ہو۔

مگر ذرا توجہ سے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ وی سی آر سے کچھ مختلف تھا۔ وہ سائز میں وی سی آر جتنا ہی تھا لیکن اس کا سوئچ پینل بہت مختلف تھا اور اس پر مانیٹر کے طور پر کام دینے والی ایک چھوٹی اسکرین بھی موجود تھی۔ سوئچوں اور سرخ سبز لائٹوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کلوز سرکٹ ٹی وی کے نظام کو چلانے والی ایک مختصر کیثیر المقاصد مشین تھی اور اس دور کے لحاظ سے جدید ترین تھی۔

اس نے مشین کا ایک بٹن دبایا اور ٹی وی آن کیا۔ اس کی اسکرین روشن ہو گئی لیکن اس پر کوئی منظر نہیں ابھرا۔ مانیٹر کی چھوٹی اسکرین بھی سادہ ہی تھی۔ کمال نے سن ایک نظر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "ہم نے اس سوئٹ کا انتخاب صرف اس لئے نہیں کیا تھا کہ یہ اہم شخصیات کے لئے مخصوص ہے۔ بلکہ ہمیں اس کا محل وقوع بھی پسند تھا۔ دو طرف سے یہ اوپن ہے۔ تمہارے آدمیوں کو بھی یہ آسانی محسوس ہوئی کہ وہ نیچے کمپاؤنڈ میں دو مختلف مقامات پر کھڑے ہو کر اس پر نظر رکھ سکتے تھے۔ لیکن اسی طرح ہمارے لئے بھی ان پر نظر رکھنا آسان تھا۔ انہی دونوں سمتوں میں اس سوئٹ کی کھڑکیوں میں دو کیمرے نصب ہیں جن کا تمہارے آدمیوں کو علم نہیں۔"

مجھے حیرت کا تھوڑا سا تکلیف دہ جھٹکا لگا۔ پرنس تہمینہ کے سوئٹ کی نگرانی منیر اور مسعود کر رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان کے بارے میں کسی کو شبہ تک نہیں ہو گا کہ وہ کسی کی نگرانی کر رہے ہیں۔

کمال نے سن گویا میرے خیالات پڑھتے ہوئے بولا۔ "ویسے تمہارے آدمیوں کی کارکردگی ہے بہت عمدہ۔ ان پر کوئی کسی قسم کا شبہ نہیں کر سکتا۔ لیکن انہیں۔ بلکہ تمہیں بھی ابھی تک اندازہ نہیں ہے کہ تمہارا واسطہ کن لوگوں سے ہے۔"

اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور مشین پر ایک بٹن اور دبایا۔ اسکرین تاریک ہو گئی۔ کمال ایک اور بٹن کو بار بار دباتے ہوئے بولا۔ "تمہارے دونوں آدمی اس وقت اندھیرے میں ہیں۔ لیکن ہمارے کیمرے انفراریڈ ہیں۔ انہیں یہیں سے اس مشین کے ذریعے حرکت بھی دی جا سکتی ہے۔ کیمرا ابھی تمہارے آدمیوں کو تلاش کر لے گا۔"

اسکرین پر تاریکی ہلکی ہو چکی تھی اور متحرک نظر آ رہی تھی۔ اچانک ایک ہیولا نمودار ہوا اور کیمرا وہیں ٹھہر گیا۔ ایک لمحے بعد وہ ہیولا اور اس کے آس پاس کا منظر کافی واضح ہو گیا۔ تقریباً اتنا ہی واضح، جتنا ہمارے ہاں فلموں میں رات کا منظر دکھایا جاتا ہے۔ منیر تھا جو اپنی چھوٹی سی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ وہ سگریٹ پیتا نہیں تھا لیکن شاید بے کیف نگرانی اور طویل انتظار کی کوفت سے اکتا کر اس وقت شغل کے طور پر پی رہا تھا۔

کمال نے سن نے ایک اور بٹن دبایا۔ منظر بدل گیا۔ اب کنکشن دوسرے کیمرے سے ہو گیا تھا۔ یہ کمپاؤنڈ ہی کا ایک اور گوشہ تھا۔ یہاں پتھر کی بینچ بھی پڑی تھی اور تھوڑی سی روشنی بھی تھی جس کی وجہ سے منظر روز روشن کی طرح صاف نظر آ رہا تھا۔ مسعود پتھر کی بینچ پر پشتے سے ٹیک لگائے، ٹانگ پر ٹانگ رکھے بے فکرے نوجوانوں کی طرح غالباً سیٹی بجا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی حرکات سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

کمال نے سن تعریفی انداز میں بولا۔ "یہ دونوں نوجوان جتنی دیر کمپاؤنڈ میں رہتے ہیں، اس سوئٹ کی کھڑکیوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان کی نظر سے کچھ بھی اوجھل نہیں۔ یہ جگہ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کس وقت سیڑھیوں کا چکر لگانا چاہیے۔ کتنی دیر میں لفٹوں کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ کتنی کتنی دیر بعد باری باری راہداریوں میں نظر ڈال لینی چاہیے۔ احتیاطاً انہوں نے سیکنڈ فلور پر ایک کمرا بھی لے لیا ہے تاکہ ہوٹل میں ان کی موجودگی اور ارد گرد

ہٹلر کی حیاتِ معاشقہ

★ ---- پروفیسر ایم اشرف

ہٹلر کے معاشقوں کی مکمل تفصیل
اِس کی ذاتی زندگی کے متعلق
ایک دلچسپ کتاب----
جو اِس سے پہلے شائع نہیں ہُوئی۔

قیمت: -/75 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

زیادہ آمد و رفت مشکوک نظر نہ آئے۔ انہیں ہمارے فلور پر داخل ہو سکتا تھا لیکن انہوں نے جان بوجھ کر نہیں لیا تاکہ ہم آمنا سامنا ہونے کا امکان کم رہے۔" وہ بالکل اس طرح اعتماد سے سمجھ بیان کر رہا تھا جیسے منیر اور مسعود کی حرکات و سکنات سے وہ ان کی سوچوں سے بھی واقف ہو۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے بلاوجہ منیر اور مسعود کا وقت اور توانائی ضائع کی تھی۔

کمال نے سن بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس میں شک نہیں کہ میری اور پرنس تہمینہ کی جگہ کوئی اور ہوتا۔ اور وہ اس سے نکلنا چاہتا تو ان دونوں کی نظر میں آئے بغیر نہیں نکل سکتا تھا لیکن ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں تو اس ہوٹل سے فی الحال نکلنا نہیں تھا۔ اور اگر ہم نکلنا چاہتے تو تمہاری یہاں کھڑی کی ہوئی ایک بٹالین بھی ہمیں نہیں روک سکتی تھی۔ ہمیں خواہ یہاں کمپاؤنڈ فلور تک چھتوں میں سوراخ کر کے اور پھر زمین میں سرنگ بنا کر بھی جانا پڑتا تو ہم چلے جاتے۔ لیکن ہمیں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اور ہمیں چونکہ تمہاری آمد کی توقع بھی تھی اس لئے ہم اس کے لئے بھی تیار تھے۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ تمہاری آمد کا انداز کیا ہو گا۔ صرف اسی لئے باہر کھڑے ہوئے ہمارے دو آدمیوں کو ذرا تکلیف اٹھانی پڑی۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

کندھے اُچکا کر اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور خفیف سی کراہٹ کے ساتھ بولا۔ "تم نے اپنے ریموٹ کنٹرول نظام کا ذکر کیا تھا۔ اتفاق سے کچھ اسی قسم کا نظام ہمارا بھی ہے۔ اب ذرا اپنے آدمیوں کا حشر بھی دیکھ لیتا۔ وقت تو ہو گیا ہے...."

اسکرین پر اب بھی مسعود بینچ پر بیٹھا سیٹی بجاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک بینچ کے نیچے سے گہرے رنگ کے کسی چست قسم کے لباس میں ایک شخص سانپ کی طرح بل کھا کر نکلا۔ اس نے مسعود کے عقب میں سر ابھارا تھا۔ اپنے سائے سے بھی خبردار رہنے والا مسعود اس کی موجودگی سے آگاہ نہیں ہو سکا تھا۔

اس شخص کا چہرہ اسکرین پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیمرے کا زاویہ کچھ ایسا تھا لیکن میں نے اسے پائپ یا ڈنڈے جیسی کوئی چیز جو زیادہ لمبی نہیں تھی، مسعود کے سر پر رسید کرتے ہوئے دیکھا۔ مسعود کے سر پر کئے جانے والے اس وار کی چوٹ مجھے اپنے دل پر محسوس ہوئی لیکن اب کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مسعود کی گردن ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک طرف کو جھک گئی مگر اس سے پہلے کہ وہ بینچ پر ڈھیر ہو جاتا، اسی شخص نے عقب سے اس کے گلے میں بازو ڈال کر بے رحمی سے اسے کھینچ لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ دونوں کیمرے کی آنکھ سے اوجھل ہو گئے۔

کمال نے سن نے پہلے والا بٹن دبایا۔ کیمرا منیر کی کار پر آیا لیکن اب منیر وہاں نہیں تھا۔ احاطے کے فرش پر ایک سگریٹ پڑی اب بھی سلگ رہی تھی اور ٹی وی کی اسکرین پر چنگاری کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

کمال نے سن طمانیت بھرے انداز میں گہری سانس لے کر بولا۔ "یہ تو پہلے ہی روانہ ہو چکا ہے۔"

میرا اندازہ تھا کہ منیر پر وار کرنے کے لئے آدمی اس کی کار کے نیچے سے برآمد ہوا ہو گا۔ میں نے ایک ٹک کمال کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "ان دونوں کو کہاں لے جایا جا رہا ہے؟"

"کسی انجانے سفر پر۔ منزل مجھے معلوم نہیں۔" وہ بے نیازی سے دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا۔

میں نے یہ آواز بلند صرف ایک کوڈ ورڈ بولا۔ یہ احمد اور آفتاب کے لئے تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ فوری طور پر اپنے ان ساتھیوں کی خبر لیں جن کا حشر ہمیں ٹی وی پر دکھایا گیا تھا، یہاں کی صورتِ حال کو میں خود ہی سنبھال لوں گا۔

چشم زدن میں ریوالور کی نال دروازے سے غائب ہو گئی اور دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔ وہ لوگ بھی مشینی انداز میں حرکت میں آنے والے تھے، اس کی تو مجھے توقع تھی لیکن میری ساری توجہ کمال نے سن پر رہی اور یہی میری غلطی تھی۔ میں نے کونے میں کھڑے ہوئے اس مجہول اور ڈھانچا نما شخص کو نظر انداز کر دیا تھا جو حلیے سے گھریلو ملازم اور جسمانی طور پر نہایت نحیف و نزار نظر آ رہا تھا۔

کمال نے سن نے تو اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کی لیکن وہ ڈھانچا یکدم ہی اس طرح ہوا میں اچھلا جیسے اس کے پیروں تلے نہایت طاقتور اسپرنگ فٹ تھے جنہوں نے اسے مشینی گڈے کی طرح ہوا میں اچھال دیا تھا۔

صرف یہی نہیں بلکہ وہ گویا اڑنے پر بھی قادر تھا۔ عقاب کی طرح اڑتا ہوا ہی وہ یکدم مجھ پر آ گرتا لیکن عین آخری لمحے میں مجھے اس حیرت کے جھٹکے سے سنبھلنے کا موقع مل گیا تھا جو اس کے حرکت میں آنے سے مجھے لگا تھا۔ میں نے نہایت تیزی سے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے مشین پسٹل کا دستہ اس کی کھوپڑی پر رسید کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کی کھوپڑی کے بجائے کندھے پر لگا۔

اس ضرب سے بھی میرے اندازے کے مطابق اس کے کندھے کی ہڈی کم از کم چٹخ تو جانی چاہئے تھی لیکن اس بدبخت پر تو جیسے اس کا بال برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ چھپکلی کی طرح دھپ سے اوندھے منہ دبیز قالین پر گرا مگر اسی ثانیے اس طرح اچھل کر سیدھا اٹھ کھڑا ہوا جیسے اسپرنگوں والے کسی بہت موٹے گدے پر گرا تھا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے جس انداز میں ٹانگ گھمائی اور ساتھ ہی مجھے چاپ رسید کرنے کی کوشش کی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تو جیوجتسو کا ماہر تھا۔ جس انداز میں اس کا استخوانی بازو ہوا میں گھوما تھا وہ کسی عام آدمی کی گردن توڑ دینے کے لئے کافی

تھا۔ میرا بھی اس سے بچ جانا خوش قسمتی ہی تھی۔ میری ہڈیوں کی تمامتر مضبوطی کے باوجود شاید کوئی ہڈی تو چٹخ ہی جاتی اور نہ جانے کتنی دیر کے لئے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا۔

یہ محض میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے بروقت اس کے بارے میں خبردار ہونے اور اس کی خطرناکی کا اندازہ لگانے کی مہلت مل گئی ورنہ اس کا ظاہری سراپا یقیناً لوگوں کو دھوکا دیتا ہوگا اور وہ کسی کے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی اسے ڈھیر کر دیتا ہوگا۔

اب جبکہ وہ بھی سمجھ چکا تھا کہ میں کوئی آسان شکار نہیں ہوں تو یکدم محتاط ہو گیا تھا۔ ادھر کمال نے سن نے نہ جانے کہاں سے ایک خوفناک صورت سا ریوالور نکال لیا تھا جس پر نہایت عمدہ قسم کا ایک سائیلنسر فٹ تھا مگر اس سے ریوالور کی خوفناکی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

صورتِ حال اب عجیب ہو گئی تھی۔ میرے ہاتھ میں مشین پسٹل اور کمال کے ہاتھ میں سائیلنسر والا ریوالور تھا۔ ہم دونوں کے درمیان وہ ڈھانچا نما شخص تھا جس کا مردار سا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا مگر اس کی آنکھوں میں خون کی پیاس تھی۔

چند لمحے کے لئے تو ہم تینوں ساکت رہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ کس کی ذرا سی حرکت، کس کا ذرا سا غلط اٹھا ہوا قدم کس کے لئے موت کا پیغام لا سکتا تھا۔ واگھن کے تنے ہوئے تاروں کی طرح گویا ہم ایک دوسرے کی زندگی کے تار تھامے ہوئے تھے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ذرا سے غلط دباؤ سے کس کی زندگی کا تار ٹوٹ جائے۔ حتیٰ کہ وہ دونوں تو ساتھی ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لئے فرشتۂ اجل ثابت ہو سکتے تھے۔ کسی ایک کی غلطی ان میں سے کسی کو بھی مروا سکتی تھی۔ گو کہ ہدف ان دونوں کا میں ہی تھا۔

پرنس تہمینہ ایک دیوار سے جا لگی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ کمرا بے شک کشادہ تھا لیکن بہرحال ہوٹل کا کمرا تھا۔ کوئی طویل و عریض میدانِ جنگ تو تھا نہیں۔ محض جگہ کی تنگی کے باعث بھی موت کسی کا لہو چاٹتی ہوئی گزر سکتی تھی۔ اس کا اندازہ چاروں ہی کو تھا۔

پھر ہم تینوں نے بہتر زاویے پر آنے کے لئے بیک وقت چیونٹی کی رفتار سے اپنی جگہ سے کھسکنا شروع کیا۔ کوئی ایک دوسرے سے ذرا سی بھی زیادہ عجلت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان دونوں کا مرکزِ نگاہ میں تھا اور مجھے بیک وقت ان دونوں پر نظر رکھنا پڑ رہی تھی۔ میں نہایت آہستگی سے دوسری دیوار سے جا لگا۔ موجودہ صورتِ حال میں یہی حکمتِ عملی بہتر تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مار دھاڑ شروع ہو تو ڈھانچا نما شخص درمیان سے نکل جائے یا کسی طرح میری پشت پر پہنچ جائے۔ کمال کی اور میری انگلی کا دباؤ اپنی اپنی گن کے ٹریگر پر خطرناک حد تک بڑھ چکا تھا۔ کسی کی گن سے کسی بھی لمحے گولی برآمد ہو سکتی تھی۔

صورتِ حال کا تناؤ شاید پرنس تہمینہ کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ وہ چلا اٹھی۔ "کمال! پلیز۔۔۔ روکو۔۔۔ یہ سب کچھ روکو۔ میں چوہدری صاحب کو منا لوں گی۔ ان کی منت کر لوں گی۔ یہ یہاں سے چلے جائیں گے۔ تم دونوں میں سے کسی کا بھی مرنا ٹھیک نہیں ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے بھی میری طرف سے نظر ہٹانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ پرنس کی طرف دیکھے بغیر بھنچے بھنچے دانتوں کے درمیان سے بولا۔ "تم خاموش رہو۔ تمہارے دل میں کیا مسٹر چوہدری کی ہمدردی جاگ اٹھی ہے؟ کیا تم اسے مرتے دیکھنا نہیں چاہتیں؟"

"نہیں۔ میں دراصل تمہیں مرتے نہیں دیکھنا چاہتی۔" وہ تیزی سے بولی۔ اس کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔

کمال کے دانت بدستور بھنچے رہے اور اسی عالم میں وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔ اس کی ہنسی دیوانگی کی طرف مائل کسی درندے کی آواز محسوس ہوئی اور وہ بدستور چیونٹی کی رفتار سے کھسکتے ہوئے بولا۔ "میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں۔ لیکن میری خواہش تھی کہ چوہدری بھی نہ مرتا۔ لیکن اس نے بغیر کسی خاص مقصد کے، نہایت احمقانہ انداز میں اپنے آپ کو غلط پوزیشن میں پھنسا لیا ہے۔"

کشیدگی کے انتہائی حد تک تنے ہوئے تار کو توڑنے میں ڈھانچا نما شخص نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ وہ کٹے ہوئے تنے کی طرح بنگر اس سے کہیں زیادہ تیزی سے نیچے گرا۔ اپنی دانست میں اس نے بڑی ہوشیاری دکھائی تھی۔ اس نے اپنی لمبی ٹانگیں بڑھا کر مجھے اڑنگی لگا کر اوندھے منہ گرانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اپنی جگہ سے ہٹتے ہوئے اس کے ٹخنے پر ٹھوکر رسید کی جو ٹخنہ توڑ ڈالنے کے لئے کافی تھی۔

اسی لمحے کمال نے سن فائر کر چکا تھا مگر میرے اس جگہ سے ہٹ جانے کے باعث صرف دیوار کا تھوڑا سا پلستر اکھڑ کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں آگے بڑھ کر ڈھانچے کی پسلیوں میں بھی ٹھوکر رسید کر چکا تھا۔ اگر مجھے دوسری ٹھوکر رسید کرنے میں ایک ثانیے کی بھی تاخیر ہوئی ہوتی تو وہ اچھل کر دوبارہ کھڑا ہو چکا ہوتا۔

وزن تو اس کا کم ہی تھا، میری پوری قوت سے رسید کی گئی ٹھوکر نے اسے تقریباً ایک فٹ اوپر اچھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی شاید میں کمال پر بھی فائر کر چکا ہوتا لیکن اسی لمحے ایک اور ایسی حرکت ہوئی جو میرے لئے قطعی غیر متوقع تھی۔ پرنس تہمینہ پر سے میری نظر ایک ثانیے کے لئے ہٹ چکی تھی اور اس کی طرف سے مجھے اندیشہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس خطرناک کشمکش میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کرے گی۔

لیکن شاید وہ کمبخت ہنی نہیں تھی، پرنس تہمینہ ہی تھی۔ سب کام ایک ساتھ ہی ہو رہے تھے۔ اسی لمحے وہ بھی نہ جانے کہاں

چھپا سا پستول نکال چکی تھی جو میں نے بعد میں دیکھا۔ مجھے [illegible] پتا چلا کہ محض پٹاخا چلنے جیسا ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور [illegible]نسل میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

[illegible]ں تہمینہ کے نشانے کی خوبی یہ تھی کہ میرے ہاتھ پر [illegible] نہیں آئی تھی اور اس کی چلائی ہوئی گولی کی بدولت [illegible]ے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ورنہ شاید اس لمحے کمال کی [illegible]رج غروب ہو چکا ہوتا۔ شاید اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ [illegible]انی سے مرنے والا نہیں تھا لیکن یہ عین ممکن تھا کہ اس [illegible]ں کی سخت جانی نہیں بلکہ ایسے اتفاقات ہی رہے ہوں۔

[illegible] تو فائر نہیں کر سکا تھا لیکن کمال نے فائر کر دیا تھا۔ میں اس [illegible]یں بھی کامیاب ہو گیا لیکن گولی میرے کوٹ کی آستین کو [illegible]ئی گزری۔ تاہم اس دوران فائدہ یہ ہوا کہ میں کمال کے [illegible]نے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اندھا دھند فائرنگ کا خطرہ کوئی [illegible] نہیں لے سکتا تھا، اس لئے مجھے بے خوفی سے ہاتھ پاؤں [illegible]موقع مل گیا۔

[illegible]نے اس کے بازو پر کراٹے کا ایک ہاتھ رسید کیا۔ مجھے یہی [illegible]ں نے لوہے کے کسی چھوٹے موٹے پول پر ہاتھ رسید کر دیا [illegible] گولی اور چل گئی لیکن ریوالور بہرحال اس کے ہاتھ سے [illegible]یں اس پر مزید کوئی وار نہ کر پایا کیونکہ اسی لمحے عقب سے [illegible]نچے نے مجھے آن دبوچا تھا جس کی چند پسلیاں اور ٹخنہ [illegible]اندازے کے مطابق ٹوٹ ٹانا چاہئے تھے۔

[illegible]ں ان دونوں کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ گیا۔ ہم تینوں [illegible]ل پر جا کر گرے۔ اس دوران شاید اس بدبخت ڈھانچے نے [illegible] پر کوئی داؤ بھی آزمایا تھا کیونکہ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں [illegible]ندید لہر محسوس ہوئی تھی۔ وہ تپائی بڑی مضبوط تھی۔ بیک [illegible]ہم تینوں کے گرنے سے بھی نہیں ٹوٹی تھی۔

[illegible]نچا اس وقت نیچے تھا لیکن وہ کینچوے کی طرح کلبلا کر نکل [illegible]سی لمحے کمال نیچے آ گیا اور میں اوپر۔ ڈھانچا "واہو" کی [illegible]چ کے ساتھ ہوا میں اچھلا۔ میں نے اس کا استخوانی ہاتھ [illegible]ں طرح نیچے آتے دیکھا۔ اس کا یہ جیوجستو کا وار میرے لئے [illegible]تلوار کے وار سے کم نہ ہوتا۔ میں کمال سمیت نیچے لڑھک [illegible]راس وار سے بال بال ہی بچا۔ وہ تپائی جو ہم تینوں کے بیک [illegible]رنے سے نہیں ٹوٹی تھی، اس استخوانی ہاتھ کی ضرب سے [illegible]ں سے ٹوٹ گئی۔ اگر اس کی جگہ میری گردن ہوتی تو۔۔۔

[illegible]صورتِ حال کی سنگینی اور نزاکت حد سے بڑھی تو میرے جسم [illegible]لخت ایک انسانی سی حیوانی قوت جاگ اٹھی۔ سارا منظر [illegible]نکھوں کے سامنے دھندلا گیا۔ صرف کمال اور ڈھانچے کے [illegible]رہ گئے۔ مجھے ان چہروں کو منظر سے ہٹانا تھا۔ اس کے سوا گویا [illegible]ں کوئی خیال، کوئی اندیشہ، کوئی احتیاط باقی نہ رہی۔ مجھ پر [illegible]ی سوار ہو گئی۔

ڈھانچے نے وار خالی جاتا دیکھ کر فوراً ہی لات ہوا میں بلند کر کے ہتھوڑے کی طرح میری پیشانی پر رسید کرنا چاہی لیکن میں ایک طرف ہٹ گیا۔ لات کمال نے سن کی پیشانی پر پڑی۔ بالکل اسی طرح جیسے فرش پر پڑے ہوئے خربوزے کو کسی نے ہاکی مار کر پچکانے کی کوشش کی ہو۔ کمال کا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور وہ وہیں ساکت ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ ڈھانچے نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔

ایک وار خالی جاتا دیکھ کر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر دوسرا وار کرنا مارشل آرٹس کا بنیادی اصول ہے۔ ڈھانچا اس اصول پر کچھ زیادہ ہی عمل پیرا تھا۔ ابھی میں ایک وار سے سنبھل نہیں پاتا تھا کہ وہ دوسرا وار کرتا تھا لیکن مجھ میں اب جو درندگی پیدا ہوئی تھی اس کی وجہ سے اب یہ مقابلہ ٹیکنیک کا نہیں، طاقت کا ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ ایک بار پر عقاب کی طرح مجھ پر آیا۔ وہ میری پیشانی پر چاپ مارنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کا وار روکتے ہوئے اسے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ میری گرفت میں آ گیا تھا۔ اب اس کی حیثیت میرے لئے ایک کینچوے سے زیادہ نہیں تھی۔

میں نے اسے بھینچنا شروع کیا تو وہ بلبلا اٹھا۔ مارشل آرٹس میں دشمن کی گرفت سے نکلنے کے لئے جتنے داؤ پیچ سکھائے جاتے ہیں وہ سب اس نے مجھ پر آزمانے کی کوشش کی لیکن اب اس کی ایک نہ چلی۔ چوہا چوہے دان میں آ چکا تھا۔ اب اس کی کوئی تدبیر اس کے کام نہیں آ سکتی تھی۔

ہر لڑنے بھڑنے والے کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا موقع ضرور آتا ہے جب وہ محسوس کرتا ہے کہ فتح حاصل کرنے کے لئے صرف مارشل آرٹس یا کسی بھی قسم کی صرف ٹیکنیک کافی نہیں ہوتی۔ جب اس کے ساتھ طاقت۔۔۔ بلکہ بے پناہ طاقت کا امتزاج ہو تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

میرے اندر ایک عجیب سا ابال اٹھ رہا تھا جو لمحہ بہ لمحہ شدید ہو رہا تھا۔ میری رگ و پے میں کوئی طوفان سا اٹھ رہا تھا جو بگولے کی طرح بلند ہوتا ہوا گویا کھوپڑی میں آ کر مرتکز ہو رہا تھا۔ میں ڈھانچے کو بھینچتا چلا گیا۔ وہ بلاشبہ فولاد کی طرح سخت تھا مگر کچھ شکنجے ایسے ہوتے ہیں جن میں فولاد کو بھی کچھ نہ کچھ سہنا پڑتا ہے۔

اس کی حالت غیر ہو گئی۔ دھنسی ہوئی آنکھیں ابل آئیں۔ پچکے ہوئے گال پھول گئے۔ چھپکلی کے پیٹ کی طرح زرد چہرہ ارغوانی ہو گیا۔ اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جیوجستو بھی اس کے کسی کام نہ آئی۔

آخر کار کچھ دیر بعد وہ فولادی ڈھانچا نرم پڑ گیا، جیسے کسی روبوٹ کے نٹ بولٹ ڈھیلے ہو گئے ہوں۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مر ہی جائے۔ میں نے اسے بازوؤں کے شکنجے سے آزاد کر دیا۔ وہ مردہ سانپ کی طرح قالین پر جا

کرا۔ وہ اور کمال نے سن اب پاس پاس ہی آرام فرما رہے تھے۔ کمال چت پڑا تھا جبکہ ڈھانچا اوندھے منہ گرا تھا۔

ان سے نمٹ کر میں نے پرنسس تہمینہ کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور اپنا چپٹا سا پستول ہاتھ میں دبائے دیوار سے لگی دم بخود سی کھڑی تھی۔ اس نے اس دوران نہ تو مجھ پر گولی چلائی تھی اور نہ ہی کوئی حکم دیا تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میرے وجود کی گہرائیوں سے غیظ و غضب کا جو طوفان امنڈا تھا اس کی شدتوں میں میں پرنسس تہمینہ کو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ وہ چاہتی تو اس دوران آسانی سے مجھے گولی مار سکتی تھی یا کسی اور طرح نزند پہنچا سکتی تھی۔ لیکن وہ اپنی جگہ ساکت رہی تھی۔ یہ صورتِ حال شاید اس کے لئے بہت زیادہ حیران کن تھی۔

کمال اور ڈھانچے کے بے ہوش ہوتے ہی جیسے میرے غیظ و غضب کا طوفان سرد ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے سے سرخ دھند چھٹنے لگی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ میں اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ ناپ چکا تھا۔ نظروں ہی نظروں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ میرے ہاتھ کی رسائی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اگر وہ میکسیکن ظلموں کے ہیرو کی طرح فائر کرنے کے معاملے میں حد سے زیادہ پھرتیلی ہوتی تب بھی میں اپنے آپ کو گولی سے بچاتے ہوئے اس کے ہاتھ سے پستول چھین سکتا تھا۔

میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے کمال اور ڈھانچے پر باری باری جھک کر بغور انہیں دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اطمینان کر رہی تھی کہ دونوں واقعی بے ہوش ہیں۔

پھر میں یہ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ رائٹنگ ٹیبل کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے کھڑے کھڑے ہی جھک کر پستول نہایت آہستگی سے میز پر رکھا اور قلم اٹھا کر ہوٹل کے رائٹنگ پیڈ پر تیزی سے کچھ لکھنے لگی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ اسے گویا اس بات کی کوئی پروا نہیں رہی تھی کہ میں اسے کوئی نقصان بھی پہنچا سکتا ہوں جبکہ چند سیکنڈ پہلے اس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔

میں نے خاموشی سے انتظار کرنا ہی بہتر سمجھا۔ کمال نے سن کی سانسوں کے زیر و بم میں کچھ تبدیلی آ رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہے گا۔ پرنسس تہمینہ نے تیزی سے کچھ لکھنے کے بعد رائٹنگ پیڈ سے ورق یوں احتیاط سے پھاڑا کہ کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ خاموشی سے وہ ورق اس نے میری طرف بڑھا دیا۔ اس پر لکھا تھا۔

"میں خواہ کچھ بھی کہوں، تم ایک لفظ بھی نہ بولنا۔ یہاں ہونے والی تمام گفتگو ریکارڈ ہوتی ہے۔ فوری طور پر یہاں سے چلے جاؤ۔ تمہاری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ کل رات میرے شو کے بعد ہوٹل کے تہ خانے میں لانڈری روم کے قریب مجھ سے ملو۔ اگر میں کل نہ آ سکی تو پھر پرسوں اسی وقت، اسی جگہ میرا انتظار کرنا۔ کسی کو ساتھ

ایم اے راحت کے طلسماتی قلم سے

تاریک وادی

دو جلدوں میں

حصہ اول =/150

حصہ دوئم =/150

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

نواب حیدر علی

الماس ایم اے قیمت: =/200

مت لانا۔ یہ اطمینان بھی کرتے ہوئے آنا کہ کسی نے تمہارا تعاقب نہ کیا ہو۔ اس سوئٹ کی نگرانی ختم کرا دو۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

نیچے اس نے اپنا کوئی نام نہیں لکھا تھا لیکن تحریر کا انداز دوستانہ تھا۔ اس میں میرے لئے ہمدردی کا رنگ پایا جاتا تھا۔ فی الحال یہ تحقیق نہیں کی جا سکتی تھی کہ یہ رنگ سچا تھا یا جھوٹا۔ تحریر میں بھی میرے لئے شناسائی کی جھلک تھی لیکن چونکہ وہ پیغام بہت ہی جلدی میں، نہایت گھسیٹ کر لکھا گیا تھا اس لئے میں تحریر کی شناخت کرنے کے معاملے میں فی الحال زیادہ پُر یقین نہیں تھا۔ بہرحال میں نے ان ہدایات پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے دل نے مجھے یہی مشورہ دیا تھا۔

پرنسس تہمینہ پستول بلند کرتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولی۔ "اے... اے مسٹر چوہدری! میں کہتی ہوں، تم منصو کو چھوڑ دو... دیکھو اگر یہ مر گیا تو میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ اسے فوراً چھوڑ دو ورنہ میں گولی چلا رہی ہوں..." پھر اس نے پاؤں فرش پر مار کر دھپ کی سی آواز پیدا کی جیسے کوئی گرا ہو۔

اس نے گویا اطمینان کی سانس لی اور قدرے کم کشیدہ

"زندگی چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ ورنہ تلاش والوں کو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔"

سمجھ گیا کہ منصو اس ڈھانچے کا نام تھا جسے میں نے چند لمحے پہلے شکنجے سے آزاد کیا تھا لیکن پرنسس تہمینہ یہ ظاہر کر رہی تھی کہ کارروائی اب ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے خاموش رہنے کی کی تھی لیکن میں نے سوچا کہ تھوڑا بہت بول کر میری طرف اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھر دیئے جانے میں کوئی میں تھا۔

میں نے غرانے کے سے انداز میں کہا۔ "فی الحال تو میں ہوں۔ لیکن تم جو کوئی بھی ہو، اپنے سرپرستوں کو بتا دینا کہ اگر ے ساتھیوں کو کوئی نقصان پہنچا تو میں قبر تک ان کا پیچھا کروں

یہ کہہ کر میں تیزی سے گھوما اور بیڈ روم و ڈرائنگ روم کے زے خاصی زوردار آوازوں کے ساتھ بند کرتا ہوا باہر آ گیا۔ اور بڑی راہداری میں مکمل سناٹا تھا۔ اندر ایک ہنگامہ بپا ہو چکا لیکن باہر وہی سکوت تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ احمد اور آفتاب اس منیر اور مسعود کے اغوا کو ناکام بنانے کے لئے ان کے تعاقب ہوں گے۔

میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ گھر واپس جاتے وقت میں ابھی ستے ہی میں تھا کہ کار کے ریڈیو پر سگنل موصول ہوا۔ دوسری ف آفتاب تھا۔ اس نے بتایا۔ "سر! ہم نے منیر اور مسعود کو رالیا ہے۔ انہیں لے جانے والے تین آدمی تھے۔ ایک ڈرائیور اور دو شاید وہی تھے جنہوں نے منیر اور مسعود کو بے ہوش کیا ۔ وہ تینوں مارے گئے ہیں۔"

"اوہ...!" میں نے تاسف سے کہا۔ یہ تاسف ان کے مارے نے پر نہیں تھا بلکہ اس بات پر تھا کہ کوئی کارآمد سراغ ہاتھ آنے ایک اور موقع ضائع ہو گیا تھا۔ میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "تم نے ن کا تعاقب کر کے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہوتی کہ وہ منیر اور مسعود کو کہاں لے جانا چاہ رہے تھے۔ یا پھر منیر اور مسعود کو اس طرح چھڑانے کی کوشش کی ہوتی کہ انہیں اغوا کر لے جانے والوں میں سے کوئی زندہ ہاتھ آ جاتا۔ شاید اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی۔"

"یہ دونوں ہی باتیں ممکن نہیں تھیں سر!" آفتاب بولا۔ "ان تینوں کو ہلاک کیے بغیر منیر اور مسعود کو جلد از جلد ان کی گرفت سے چھڑانا ممکن نہیں تھا۔ انہیں چھڑانے میں ہم جتنی تاخیر کرتے اتنا ہی ان کی زندگی کے لئے خطرہ بڑھتا جاتا۔ ایک ایک لمحے کی تاخیر منیر اور مسعود کو موت کی طرف لے جا رہی تھی۔"

"وہ کیوں؟" میں نے دریافت کیا۔

"سر! وہ منیر اور مسعود کو کسی عام گاڑی میں نہیں لے جا رہے تھے۔" آفتاب نے بتایا۔ "ہوٹل کے عقب کی طرف، جہاں سپلائی کی گاڑیاں وغیرہ آتی ہیں، آئس کریم سپلائی کرنے والا ایک بڑی مشہور کمپنی کا ٹرک کھڑا تھا۔ وہ اس ٹرک کو لے بھاگے تھے۔ ڈرائیور کی جگہ انہوں نے اپنا آدمی بٹھا دیا تھا اور منیر اور مسعود کو بے ہوشی کی حالت میں فریزر میں ڈال دیا تھا۔ وہ اندھا دھند ٹرک کو کینٹ کی طرف بھگائے لئے جا رہے تھے۔ میرا اندازہ یہی ہے کہ ان کی کوئی خاص منزل نہیں تھی۔ وہ بس یہی چاہ رہے تھے کہ منیر اور مسعود فریز ہو کر مر جائیں تو ان کی لاشوں کو کسی ویران مقام پر پھینک دیا جائے۔"

میرے اعصاب میں ایک لمحے کے لئے تناؤ آ گیا۔ آفتاب بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس صورتِ حال میں ہم معاملے کو طول دینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے سر! اب بھی منیر اور مسعود ہمیں برف کی طرح یخ اور اکڑے ہوئے ملے ہیں۔ بدبختوں نے انہیں بالکل مذبح خانے سے آنے والے گوشت کی طرح آئس کریم کی شیلفوں کے درمیان ٹھونسا ہوا تھا۔"

"انہیں فوری طور پر دو نمبر لے جاؤ۔" میں نے حکم دیا۔

"ہم وہیں لے جا رہے ہیں سر!" آفتاب نے جواب دیا۔ ماڈل ٹاؤن والی طویل و عریض کوٹھی میں محدود سی جگہ میں، محدود پیمانے پر آج کل وہ تمام طبی سہولتیں میسر تھیں جو کسی چھوٹے موٹے مگر جدید اور اعلیٰ اسپتال میں میسر آ سکتی تھیں۔ کچھ عرصہ قبل ہی میں نے ضرورت محسوس کرتے ہوئے یہ انتظامات کئے تھے۔ ہر وقت وہاں ایک ڈاکٹر اور ایک نرس بھی موجود رہتی تھی۔ وہ بھی اپنے ہی لوگ تھے۔ اس سے بڑی سہولت ہو گئی تھی۔

آفتاب بولا۔ "صفدر اور سلیمان کو ہم نے ہوٹل کے انہی دروازوں پر موجود رہنے کی ہدایت کی تھی جہاں وہ تعینات تھے۔"

"میں نے انہیں وہاں سے رخصت کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہوٹل کی... یا اس سوئٹ کی نگرانی کرنا اب کوئی خاص ضروری نہیں رہا۔"

احمد کی آواز ریڈیو پر ابھری۔ "سر! اگر آپ حکم دیں تو کمال نے سن کو اٹھا لیتے ہیں۔ وہ تھوڑا بہت اہم آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"اگر ایسا کرنا ضروری ہوا تب بھی چند دن بعد کریں گے۔" میں نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے وہ فی الحال غائب نہیں ہو گا۔ وہ جہاں ہے اسے وہیں رہنے دو۔ میں آج کے واقعے کے سلسلے میں اس کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد تم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ اسے ہدایات کہاں سے ملتی ہیں۔ ویسے مجھے وہ اہم آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ میرا اپنا اندازہ تو یہی ہے کہ ابھی تک کوئی اہم آدمی ہمارے سامنے آیا ہی نہیں۔ ہم تو ابھی یونہی آس پاس کے جھاڑ جھنکاڑ سے الجھ رہے ہیں۔ اصل درخت، اس کی شاخوں ... بلکہ پتوں تک بھی نہیں پہنچے۔ جڑ تو بہت دور کی بات ہے۔ یہ ریڈ ڈاٹ کا کوئی بہت ہی بڑا، بہت ہی لمبا چوڑا چکر معلوم ہوتا ہے۔"

"میں بھی یہی سمجھ کر رہا ہوں سر!" احمد بولا "ابھی تک ہم اس کے بارے میں صرف محسوسات کی بنیاد پر ہی بات کر سکتے ہیں۔ ٹونی نے اس معاملے میں ہمیں جس حد تک بریف کیا ہے اس سے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر یہ واقعی کوئی تنظیم ہے تو ابھی تک اس کے سربراہ کا پتا نہیں چل رہا۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر مشفقانہ لہجے میں کہا "بیٹے! ابھی تو تمہارا باس اندھیرے میں ہے' تمہاری سمجھ میں کیا آئے گا۔ بہرحال.... کچھ سوالوں کے جواب صرف وقت کے پاس ہوتے ہیں۔ میں بھی انتظار کر رہا ہوں اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ آنے والے چند دنوں میں کوئی نہ کوئی بات.... کوئی خاص بات ضرور سامنے آئے گی۔"

احمد بولا "سر! وہ جن دو جعلی گارڈز کو ہم نے بے ہوش کر کے پرنس تہمینہ کے سامنے والے سوئٹ میں ڈالا ہے ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ انہیں اٹھوا لیا جائے؟ دو نمبر میں منتقل کرا لیا جائے؟ شاید ان سے کچھ معلوم ہو سکے۔"

"احمد ڈیئر! وہ اپنی جگہ خطرناک ضرور معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ وہ بھی مجھے معمولی حیثیت ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سب جھاڑ جھنکاڑ ہی ہے۔ اس سے الجھنے میں توانائیاں ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "وہ جو تین آدمی تم لوگوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے ہیں ان کے بارے میں تم نے کیا رائے قائم کی تھی؟"

"پیشہ ور دہشت گرد معلوم ہوتے تھے سر!" احمد نے جواب دیا "گو کہ انہیں ہمارے سامنے دہشت گردی دکھانے کا موقع نہیں ملا لیکن ان کے انداز و اطوار بتا رہے تھے کہ وہ بڑی تباہی پھیلانے کے اہل تھے۔ ان کے جسموں پر گہرے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے سفاری سوٹ تھے اور پیٹ' ٹانگوں اور پسلیوں کے ساتھ کئی خطرناک قسم کی گنیں اور خنجر وغیرہ بندھے ہوئے تھے لیکن کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے ان کی شناخت میں مدد ملتی۔"

"مجھے یہی امید تھی۔" میں نے کہا "وہ جعلی گارڈز بھی اسی قبیل کی چیز معلوم ہوتے تھے۔ اہم وہ بھی دکھائی نہیں دیتے۔ یہ جسم اور ہتھیار استعمال کرنے والے لوگ ہیں۔ جو ہدایات ملتی ہوں گی' آنکھیں بند کر کے ان پر عمل کر گزرتے ہوں گے۔ قتل و غارت مچانے اور تباہی پھیلانے میں یقیناً ماہر ہوں گے لیکن زیادہ اہم' دماغ استعمال کرنے والے لوگ ہوتے ہیں' جن کا حکم چلتا ہے' جن کی ہدایات پر عمل ہوتا ہے۔ ایسا کوئی آدمی سامنے آئے گا تو کچھ بات بنے گی۔"

میں گھر پہنچ چکا تھا۔ گاڑی ڈرائیو وے میں روکتے ہوئے میں نے ریڈیو پر پوچھا "منیر اور مسعود کی کیفیت اس وقت کیسی ہے؟"

جواب آفتاب نے دیا "تشویش کی کوئی بات نہیں ہے سر! ان کے جسموں کی حرارت بحال ہو رہی ہے۔ ہم دو نمبر پہنچنے ہی والے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم انہیں وہاں پہنچا دو۔ میں صبح ان کی حالت کے بارے میں جولی سے رپورٹ لوں گا۔" میں نے خدا حافظ کہہ کر ریڈیو کا سوئچ آف کر دیا اور خفیہ خانہ بند کر دیا۔

اندر پہنچ کر میں نے شاور لیا اور کھانا کھا کر سب کچھ ذہن سے جھٹک کر سو گیا۔ گو کہ آج کی رات کا آغاز اچھا نہیں ہوا تھا لیکن خواب بہت اچھے آنے لگے۔ میں اس وقت یقیناً بہت گہری نیند میں تھا جب فون کی گھنٹی سے میری آنکھ کھلی۔ کئی سیکنڈ تک تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ میرے بیڈ کے قریب جو چیز وقفے وقفے سے بج رہی تھی وہ فون کی گھنٹی تھی۔

گھر پر آنے والی ٹیلی فون کالز گیٹ ہاؤس میں ہی ریسیو کی جاتی تھیں۔ طارق خان یا ظاہر علی میں سے جو بھی ڈیوٹی پر ہوتا تھا وہ فون ریسیو کرتا تھا اور اگر ضروری سمجھتا تھا تو مجھ سے ملا دیتا تھا لیکن اس وقت گھنٹی میرے پرائیویٹ فون کی بج رہی تھی جو ڈائرکٹ تھا۔ اس کا نمبر خاص خاص لوگوں ہی کے پاس تھا۔

اس وقت رات کے تین بجنے والے تھے۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ رات کے اس پہر کس کو مجھے فون کرنے کی ضرورت پیش آ گئی تھی؟ شاید ستارہ یا پھر کراچی سے راحیلہ تھی۔

اگر اس قسم کا کوئی 'آوازِ دوست' سنائی دینے والا معاملہ ہوتا تو شاید اتنی گہری نیند سے بیدار ہونا مجھے ناگوار نہ گزرتا۔ گو کہ اتنی گہری نیند مجھے کبھی کبھار ہی آتی تھی اور معمول سے کچھ زیادہ تازہ دم کر دیتی تھی۔ لیکن جب میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو نیند ٹوٹنے کا صدمہ دوچند ہو گیا۔ طبیعت جھک ہو گئی۔ بڑی شدت سے دل چاہا کہ ٹیلی فون کے نظام میں یہ سہولت بھی شامل ہونی چاہئے تھی کہ اگر انسان فون کرنے والے کے سر پر ریسیور کھینچ کر مارنا چاہے تو مار سکے۔

دوسری طرف وہی ہونق وسیم احمد تھا جسے میں تقریباً بھول چکا تھا۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر سے محسوس کیا کہ اس کی آواز کانپ رہی تھی' وہ سخت گھبراہٹ زدہ انداز میں پوچھ رہا تھا "سر.... سر! آپ افضل چوہدری ہی بول رہے ہیں نا؟"

"نہیں۔ میں ان کی روح بول رہی ہوں جو قفسِ عنصری اور جسدِ خاکی وغیرہ سے پرواز کر چکی ہے۔" میں نے جل کر جواب دیا۔

"سر! میں اس وقت آپ کو پریشان کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔ لیکن سر.... یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔" وہ بدستور مرتعش لہجے میں بولا۔

"نہیں' نہیں۔ میں نے کب کہا کہ یہ مذاق کا وقت ہے۔ یہ قبروں میں لیٹے ہوئے مُردوں کو نہایت سنجیدگی سے جگانے کا وقت ہے۔ معلوم نہیں مجھ سے یہ حماقت کس طرح ہو گئی کہ میں نے تمہیں اپنا وہ وزیٹنگ کارڈ دے دیا جس پر میرا پرائیویٹ فون نمبر بھی موجود تھا۔"

"سر! میں اس وقت بڑی مصیبت میں ہوں۔ میری کچھ مدد کیجئے۔" وہ گڑگڑایا۔

"اس پر کوئی ایسا وقت بھی گزرتا ہے جب تم مصیبت میں نہیں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"سر! اس وقت مجھے بہت ہی بڑی مصیبت کا سامنا ہے.... یہ معمولی بات نہیں ہے۔ ورنہ میں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔ دل نے کہا کہ آپ کے سوا کوئی میری مدد نہیں کرے گا۔ سر! خدا کے لئے فون بند مت کیجئے گا.... میری زندگی برباد ہو جائے گی۔"

"تمہاری زندگی پہلے کون سی آباد ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر قدرے نرم لہجے میں کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ جب میں نے اس مسکین سی صورت دیکھتا تھا یا اس کا چہرہ میرے تصور میں آتا تو مجھے اس پر ترس آنے لگتا تھا' اوپر سے اس کا لہجہ مجھے اور کمزور کر دیتا تھا۔ اتنی عاجزی اور مسکینی ہوتی تھی اس کے لہجے میں۔ اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے شرمندگی سی ہونے لگتی تھی۔

وہ یکدم ہی جیسے پھٹ پڑا۔ بھوں بھوں کر کے رونے لگا' فون پر سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ مجھے ایک بار پھر اس پر ترس آیا۔ مجھے پھر وہی خیال آ گیا کہ اگر کچھ لوگ ایسے ہونق' کم عقل اور خبط الحواس ہوتے ہیں تو اس میں ان کا اپنا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ انہیں خود تو شاید احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ ہونق' کم عقل اور خبط الحواس ہیں۔ سمجھتا تو ہر شخص یہی ہے کہ اس میں دنیا کی خوبیاں یکجا ہیں۔ انہی خوش فہمیوں کے سہارے تو زندگی ذرا سے بسر ہو جاتی ہے ورنہ درحقیقت زندگی بڑی کٹھن ہے۔

لیکن وسیم احمد کم از کم اس حد تک تو غنیمت تھا کہ اسے اپنی خوبیوں کا کچھ نہ کچھ احساس تھا۔ ہر معاملے میں وہ خود ہی بقراط بنتا تھا۔ وہ جب بھی اپنے آپ کو مصیبت میں محسوس کرتا تھا تو کسی کے لئے کسی نہ کسی کی طرف بھاگتا تھا لیکن اب یہ اس کی خوش فہمی تھی کہ بیشتر لوگ اسے دھتکار دیتے تھے۔ حتیٰ کہ خود اس کے باپ کے دل میں اس کے لئے ہمدردی نہیں تھی' اس کی طرف توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔

"مسئلہ کیا ہے؟" میں نے جان بوجھ کر اپنا لہجہ زیادہ نرم نہیں کیا۔

"سر! اس وقت میرے سامنے ایک لاش پڑی ہے۔" وہ سسکیاں روکتے ہوئے بولا۔

"لاش؟" میں نے قدرے چونک کر کہا "یہ تم کہاں سے لاش کے چکر میں پڑ گئے۔ کس کی لاش ہے؟"

"چھوٹے چچا کی۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ چھوٹے چچا اچانک لاش میں کیونکر تبدیل ہو گئے؟ انہوں نے تو تمہاری زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ تم کہاں سے بول رہے ہو؟ مجھے پوری بات بتاؤ اور شروع سے بتاؤ۔"

"میں کارخانے ہی سے بول رہا ہوں.... اپنے آفس سے۔" وہ گویا کچھ سنبھلتے ہوئے بولا "آپ کو معلوم ہی ہے کہ میری رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ چھوٹے چچا مجھے چوری وغیرہ کے چکر میں پھانسنے کی تیاری کر رہے ہیں اور آپ نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں ان کی چال کو انہی پر الٹ دوں...."

مجھے یاد تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ چھوٹے چچا ہفتہ ہفتہ بھر کیش بینک میں جمع کرانے کے بجائے میز کی درازوں میں ہی بھرے رکھتے تھے۔ اسی کمرے میں رات کو آکر وسیم احمد بیٹھتا تھا اور اپنے ہی باپ کے کارخانے میں نائٹ سپروائزر کے طور پر ایک ملازم کے فرائض انجام دیتا تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ جس رات میز کی درازوں میں ہفتے بھر کا کیش جمع ہو' اس رات وہ کسی طرح درازیں کھول کر ساری گڈیاں اس طرح میز پر سجا دے جیسے کوئی چور انہیں لے جانے کی تیاری کر رہا تھا لیکن اوپر سے وسیم احمد کے آ جانے کی وجہ سے وہ بھاگ گیا۔ وہ اپنے باپ کو فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دے دے۔

اس طرح ایک تو اسے تھوڑا سا کریڈٹ مل جائے گا کہ بروقت اس کی آمد کی وجہ سے اور اس کے للکارنے کی وجہ سے بہت بڑی رقم چوری ہونے سے بچ گئی۔ دوسرے جب رقم گنی جائے گی تو چھوٹے چچا کے کھیلے بھی سامنے آ جائیں گے۔ اول تو اس کی پوزیشن مشکوک بنانے کے لئے یہی کھیلا کافی ہوگا کہ وہ ہفتے بھر کا کیش درازوں ہی میں رکھتا تھا۔

وسیم احمد کہہ رہا تھا "آج رات میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے درازوں سے سارا کیش نکال کر میز پر سجا دیا تھا۔ میز کی دراز میں ایک بھرا ہوا ریوالور بھی موجود تھا۔ معلوم نہیں ابا کو اس کا بھی پتا ہوگا یا نہیں۔ بہرحال میں نے ریوالور بھی نکال کر میز پر رکھ لیا تھا۔ میری کارروائی ابھی جاری تھی کہ اچانک دھاڑ سے دروازہ کھلا اور چھوٹے چچا اندر آ گئے۔"

"یہ رات کے تین بجے چھوٹے چچا کارخانے میں کہاں سے پہنچ گئے؟" میں نے حیرت سے کہا "تم نے تو بتایا تھا کہ ان کی ڈیوٹی دن میں ہوتی ہے۔"

"سر! یہ تو میں خود بھی نہیں سمجھ سکا.... اس وقت اگر سچ مچ کوئی چور یا ڈاکو آ جاتا تو شاید مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی لیکن ان کی آمد کا تو مجھے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔"

"چوکیدار اس وقت کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"چوکیدار تو یہاں سے کافی فاصلے پر گیٹ پر ڈیوٹی دے رہا ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت میں نے اسے ایک قریبی ریستوران میں بھیجا ہوا تھا۔ یہاں چونکہ آس پاس کئی کارخانے ہیں اور تین تین شفٹوں میں کام چلتا ہے اس لئے وہ ریستوران دن رات کھلا رہتا ہے' کھانے پینے کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ اسی لئے ہم نے کارخانے

میں اس طرح کا کوئی انتظام نہیں رکھا۔ مجھے اس وقت کچھ بھوک سی لگ رہی تھی۔ میں نے چوکیدار کو بھیج دیا کہ میرے لئے ناشتا لے آئے۔ ویسے بھی میں نے سوچا کہ میری کارروائی کے دوران وہ ڈیوٹی پر نہ ہی رہے تو اچھا ہے۔ کبھی کبھی چکر لگاتا ہوا گیٹ سے یہاں تک آجاتا ہے۔ چھوٹے چچا بھی یقیناً اس کی غیر موجودگی میں ہی اندر آئے ہوں گے۔" اس نے بتایا۔

"اچھا... خیر... ان کے آنے کے بعد کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا سر...!" اس کی آواز ایک بار پھر بھرانے لگی۔ "انہوں نے مجھے دیکھا' پھر میز پر بچی ہوئی نوٹوں کی گڈیوں کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی نہ جانے کیا سوچ کر آئے تھے لیکن یہ منظر دیکھ کر تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ کونے میں ایک موٹا سا ڈنڈا دیوار سے لگا ہوا تھا۔ پتا نہیں کس نے اور کیوں یہاں رکھا تھا۔ چھوٹے چچا وہ اٹھا کر اتنی غضبناک حالت میں میری طرف بڑھے کہ بالکل غیر ارادی طور پر میں نے میز سے ریوالور اٹھا کر ان پر فائر کردیا..." اس کی آواز ایک بار پھر کانپ گئی۔

مجھے فون پر بھی اس کے تھوک نگلنے کی 'ٹرچ' صاف سنائی دی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "سر! آپ تو میری بات کا یقین کرتے ہیں نا؟ قسم سے... اس میں میرا بالکل کوئی قصور نہیں۔ اگر میں گولی نہ چلاتا تو چھوٹے چچا یقیناً میری کھوپڑی کھول دیتے اور ان کی جگہ اس وقت میری لاش پڑی ہوتی۔ مجھے اپنی جان بچانے کے لئے گولی چلانا پڑی۔ لیکن میری بات بھلا کون سنے گا؟"

"چنانچہ تم نے اپنی "ڈے اینڈ نائٹ ایڈوائزری سروس" کو فون کرلیا۔" میں نے مصنوعی ناگواری سے کہا "اب تم یہ پوچھنا چاہتے ہو گے کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے؟ کس طرح تمہاری جان بچ سکتی ہے۔ یہی بات ہے نا؟"

"سر! آپ کو معلوم ہے اس دنیا میں میرا کوئی ہمدرد نہیں۔ میں کہاں جاؤں؟ کس سے مشورہ کروں؟ میری سنتا ہی کون ہے!" مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ ایک بار پھر رونے لگے گا۔ آنسو بہانے اور انہیں یکدم روکنے میں اس کا جواب نہیں تھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ چھوٹے چچا اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں؟" میں نے جلدی سے پوچھا "تم نے ایک ہی فائر کیا تھا نا؟"

"یس سر!" اس نے سعادت مندانہ لہجے میں کہا جو اس وقت مضحکہ خیز محسوس ہوا "گولی تو میں نے ایک ہی چلائی.... لیکن قدرت کا کمال دیکھئے' اگر میں چھ ماہ نشانے بازی کی پریکٹس کرتا رہتا تب بھی شاید اتنا اچھا نشانہ لگانا میرے لئے مشکل ہوتا۔ بغیر نشانہ لئے اور بغیر سوچے سمجھے چلائی ہوئی یہ گولی عین ان کے دل کے پار ہوگئی ہے... میرا خیال ہے وہ فرش پر گرنے سے پہلے ہی مر چکے تھے۔"

"ماشاء اللہ!" میں نے کہا "مبارک ہو۔ تمہاری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ حل ہوگیا' اب اور کیا چاہتے ہو؟"

"سر! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔" وہ گڑگڑایا "چوکیدار کسی بھی لمحے واپس آنے والا ہوگا۔ میں اس وقت کھڑکی کے راستے گیٹ کی طرف ہی دیکھ رہا ہوں۔"

"اچھا.... یہ بتاؤ' کیا ریوالور تم نے ابھی تک ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ میز پر رکھ دیا ہے۔ آپ کو فون کرنے سے پہلے رکھ دیا تھا۔"

"سب سے پہلے اسے کسی کونے میں پھینک دو۔" میں نے کہا "لیکن پھینکنے سے پہلے اس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کردینا۔"

"انگلیوں کے نشانات تو اس پر ہیں ہی نہیں سر!" وہ جلدی سے بولا "میں نے میز کی درازوں سے نوٹ وغیرہ نکالنے کی کارروائی احتیاطاً دستانے پہن کر شروع کی تھی۔ دستانے ابھی تک میرے ہاتھوں پر ہیں۔" ایک لمحے کے لئے وہ جیسے خطرات کو بھول گیا اور اپنے مخصوص احمقانہ شرمیلے پن کے ساتھ بولا "میں نے آپ کو بتایا تھا نا' کہ میں کافی جاسوسی کہانیاں وغیرہ پڑھتا رہتا ہوں۔ تھوڑا بہت احتیاط کا تو خیال تھا مجھے۔"

"بس تو پھر... احمق کہیں کے! اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔ سیدھا سادا حل تمہارے سامنے تو موجود ہے۔" میں نے ہلکی سی جمائی لے کر کہا "پستول.... یا ریوالور.... جو کچھ بھی وہ ہے... اسے چھوٹے چچا کے سامنے کسی کونے میں پھینک دو اور خود جلدی سے مشینوں والے حصے کا چکر لگانے چلے جاؤ۔ چوکیدار تمہارا ناشتا لے کر اسی کمرے میں آئے گا نا؟"

"یس سر!" وہ مستعدی سے بولا۔

"بس... لاش اسے ہی دریافت کرنے دو۔" میں نے کہا "غرض کرلو.... بلکہ اپنے آپ کو یقین دلادو کہ کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ کم از کم تم نے کچھ نہیں کیا ہے۔ چوکیدار لاش دیکھے گا تو بچائے گا یا تمہیں ڈھونڈتا ہوا دوڑا دوڑا آئے گا۔ تب تم دوسرے آدمیوں کو ساتھ لے کر کمرے میں پہنچنا اور حیرت زدہ دہشت زدہ وغیرہ رہ جانے کی جتنی بھی اچھی اداکاری کرسکو

امریکہ رے امریکہ	طارق اسمٰعیل ساگر -/50
صہونیت اور عالم اسلام	طارق اسمٰعیل ساگر -/25
کورٹ مارشل	طارق اسمٰعیل ساگر -/00
آخری گناہ کی مہلت	طارق اسمٰعیل ساگر -/50

مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2

الا۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم اداکاری میں اچھا خاصا عمل دخل رکھتے ہو؟"

"بس جی... یونہی تھوڑا بہت گزارا کرلیتا ہوں۔" اس نے یوں انکساری سے کہا جیسے کسی بہت بڑے پیشہ ور اداکار کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی جارہی ہو اور اس کی بے پناہ تعریف و توصیف کی جارہی ہو۔ جس کے جواب میں وہ انکساری کا مظاہرہ کررہا ہو۔

"تم یہی ظاہر کرنا کہ تم تو چوکیدار کو ناشتے کے لئے بھیج کر مشینوں پر کام ہوتا دیکھنے چلے گئے تھے۔ تمہیں تو کچھ معلوم ہی نہیں کہ تمہارے پیچھے اتنی سی دیر میں چھوٹے چچا کہاں سے ٹپک پڑے۔ میز پر نوٹوں کی گڈیاں کہاں سے آگئیں اور چھوٹے چچا کے سینے میں سوراخ کون کرگیا۔ تم کہہ دینا کہ پٹاخے جیسی ایک آواز تم نے سنی تو تھی لیکن اس لئے زیادہ توجہ نہیں دی تھی کہ صنعتی کاموں میں اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہی رہتی ہیں۔"

وہ اتنی خاموشی سے میری بات سن رہا تھا کہ مجھے ایک لمحے کے لئے شبہ ہوا' شاید دوسری طرف کوئی موجود ہی نہیں۔ مجھے احتیاطاً پوچھنا پڑا "تم میری بات سن رہے ہو یا تمہاری روح بھی قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی ہے؟"

"نہیں سر!" وہ گڑبڑا کر جلدی سے بولا "میں تو آپ کی باتیں بہن نشین کررہا ہوں تاکہ مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو۔"

"لوگوں کو تم خود ہی نتائج اخذ کرنے دینا۔" میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "البتہ بیچ بیچ میں تھوڑے بہت اشارے دیتے رہنا کہ شاید تمہارے جاتے ہی کوئی چور کمرے میں آن گھسا ہوگا۔ اس نے درازوں سے ساری رقم نکال لی ہوگی لیکن کسی عجیب و غریب اور نامعلوم اتفاق کے تحت اوپر سے چھوٹے چچا پہنچ گئے ہوں گے۔ انہوں نے چور کو للکارا ہوگا' اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہوگی اور اس کے ہاتھوں مارے گئے ہوں گے۔ یعنی بس تم اپنا کردار کسی نامعلوم چور کو سونپ دو۔ چچا رات کے اس پہر کیونکر یہاں پہنچے... اور درازوں میں اتنا کیش کیوں موجود تھا؟ اس قسم کے سوالوں کے لئے پولیس کے لئے اور اپنے ابا جی کے لئے چھوڑ دو۔ وہ خود ہی جواب تلاش کرتے رہیں گے اور ابا جی پر ذرا چھوٹے چچا کی حقیقت بھی ظاہر ہوجائے گی۔ یہی وہ کام ہے جو تم کرنا چاہ رہے تھے اور جس کی کوشش میں تم نے اتنا کھڑاگ پھیلالیا۔"

"ٹھیک ہے سر! میں ایسا ہی کروں گا۔ لیکن...." ایک بار پھر گویا اس کی روح فنا ہونے لگی۔

"اب کیا ہوا؟" میں نے پوچھا "کیا چوکیدار واپس آگیا؟"

"نہیں سر! میری قسمت اچھی ہے۔ وہ تو ابھی تک نہیں آیا۔ ریستوران پر تقریباً ہر وقت ہی خاصا رش ہوتا ہے۔ میں تو دراصل پولیس والے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ تو بڑی باریکی سے تفتیش کریں گے نا۔ سب سے زیادہ پوچھ گچھ تو مجھ سے ہی کریں گے۔ میری تو ویسے ہی کسی خوف ناک سی شکل والے پولیس مین کو دیکھ کر روح فنا ہوتی ہے۔ اگر کسی نے مجھے زیادہ ڈرا دھمکا کر پوچھ گچھ کی تو بوکھلا کر کہیں میرے منہ سے سچ نہ نکل جائے۔"

"اب یہ تمہارے نصیب ہیں بچے!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اگر تم کچھ دیر کے لئے اپنے دل و دماغ اور زبان کو قابو میں نہیں رکھ سکتے تو میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"اتنی رُکھائی اختیار نہ کریں سر! میرا ٹوٹا ہوا دل کچھ اور ٹوٹ جائے گا۔ مجھے تھوڑا سا ہی حوصلہ دے دیں۔ شاید میں آزمائش سے گزر ہی جاؤں۔" وہ منمنایا۔

"بھائی! اب میں تمہیں اور کس طرح حوصلہ دوں؟ کیا وہاں آکر تمہارا سر سہلاؤں' تمہاری کمر پر تھپکیاں دوں' تمہیں سینے سے لگاؤں؟" میں نے ملائمت سے پوچھا "یہ تمہاری بقا کا مسئلہ ہے' تمہیں تھوڑی بہت تو ہمت کرنی پڑے گی نا۔"

"وہ... سر...! دراصل مجھے ان کے چھتروں' ڈنڈوں اور بھاری بوٹوں کے ٹھڈوں سے بہت خوف آتا ہے۔ اور پھر وہ دوسری بہت سی شرمناک حرکتیں بھی کرتے ہیں۔ بہت ایذا دیتے ہیں جی آدمی کو۔ ایسا لگتا ہے جی' جیسے ملزم کو بُرے بُرے طریقوں سے زیادہ سے زیادہ اذیتیں دے کر انہیں روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے' بہت لطف آتا ہے۔ اس معاملے میں وہ ذہنی مریض لگتے ہیں سر! مجھے ایک مرتبہ ایک نوجوان کے ساتھ تفتیش ہوتے دیکھنے کا اتفاق ہوگیا تھا۔ غلطی سے یا بدقسمتی سے مجھے سب کچھ دیکھنا پڑا تھا۔ اس پر چوری کا الزام تھا حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس نے چوری نہیں کی تھی مگر...." اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر گویا جھرجھری لی۔

پھر غالباً وہ تھوک نگل کر بولا "تب سے ذہن میں دہشت سی بیٹھ گئی ہے سر! کسی بارعب سی شکل کے پولیس والے کو دیکھ کر سیدھی بات بھی منہ سے الٹی نکلنے لگتی ہے۔ وہ چیزیں یاد آجاتی ہیں جن سے وہ اس بے چارے' بے قصور کی مٹی پلید کررہے تھے۔ خاص طور پر وہ چھمتر...! سنگروں نے اس پر یہ بھی لکھا ہوا تھا۔ "چناں کتھاں گزاری ائی رات وے" حالانکہ ملزم بے چارے نے وہ رات گوجرانوالہ میں گزاری تھی' جس رات چوری ہوئی تھی۔ میں اس کا گواہ تھا۔ مگر انہوں نے کسی کی نہیں سُنی۔ بلکہ میرے بولنے پر وہ تو مجھے بھی شاملِ تفتیش کرنے لگے تھے۔ قسمت اچھی تھی' میں بال بال بچ گیا۔"

"ہر جگہ... ہر بار ہی ایسا نہیں ہوتا میرے بھائی!" میں نے آخر کار حوصلہ بندھانے والے لہجے میں کہا "سبھی پولیس والے یوں اندھا دھند اپنا تارچ کا سامان لے کر کسی پر نہیں چڑھ دوڑتے۔ تمہیں اتنا دہشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم نے اس واقعے کو ذہن پر مسلط رکھا تو تم اپنا کام خراب کرلو گے۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ بہت باریکی سے ہی تفتیش کریں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ساری تفتیش کا مرکز تم ہی بنو۔ بعض

اوقات تو وہ اس قسم کے واقعات کو بالکل عام سا معاملہ سمجھ کر رسمی کارروائی کر کے ایک طرف ڈال دیتے ہیں' زیادہ زحمت ہی نہیں کرتے۔ اور پھر آخر تم کارخانے کے مالک کے بیٹے ہو۔ اور اس معاملے میں کیش غائب نہیں ہوا بلکہ بچ گیا ہے۔"

"کارخانے دار کا بیٹا ہونے سے ہی تو مجھے زیادہ خوف آ رہا ہے۔ ابا کون سا میری حمایت کریں گے۔ بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ چھوٹے چچا کی موت سے ان کا دماغ زیادہ ہی نہ الٹ جائے۔ میرے بارے میں ان کا غیظ و غضب اور نہ بڑھ جائے۔" اس کے لہجے میں حقیقتاً بڑا خوف تھا۔ ایک بیٹے کے لہجے میں باپ کی طرف سے اتنا خوف محسوس کر کے میرے دل میں درد کی لہر سی اٹھی۔

میں نے ملائمت سے کہا "تم ہر خوف ذہن سے نکال دو۔ جس طرح میں نے کہا ہے اس طرح کرو۔ اگر پولیس واقعی تم سے کچھ زیادہ پوچھ گچھ کرے اور تم ان کے تیور ذرا بھی بدلتے دیکھو تو کسی طرح مجھے ایک فون کر دینا۔ میں سائٹ کے ایس ایچ او سے کہہ دوں گا' کوئی تمہیں انگلی بھی نہیں لگائے گا۔ اب تو ٹھیک ہے؟ اور بولو کیا چاہتے ہو؟"

اس کے لہجے میں یک بیک اس بچے کی خوشی سٹ آئی جسے کسی خوف ناک بلا کے پنجوں سے نجات مل گئی ہو "بس.... آپ نے یہ کہہ دیا' میرا سارا خوف دور ہو گیا سر! اب میں شیر بن گیا ہوں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ مجھے معلوم تھا' میرا مسئلہ آپ کے سوا کوئی حل نہیں کر سکتا۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی دے سر! اور اس سے بھی بڑا آدمی بنائے....."

"بس.... اب مجھے سونے دو اور خود بھاگ کر مشینوں کی طرف چلے جاؤ۔ اب کیا اس وقت ہی یہاں سے ہلو گے جب چوکیدار سر پر آ جائے گا؟" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے سوچا' اب نیند تو خراب ہو ہی چکی ہے' لگے ہاتھوں منیر اور مسعود کی خیریت بھی دریافت کر لوں۔ میں نے دو نمبر فون کیا۔ حسب معمول جولی عرف مس ٹرپ نے ریسیو کیا۔ معلوم نہیں یہ عورت دن رات کے کسی حصے میں سوتی بھی تھی یا نہیں۔ اگر سوتی تھی تب بھی فون بہرحال وہی ریسیو کرتی تھی۔

میں نے منیر اور مسعود کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی "وہ تو یہاں پہنچنے کے ایک گھنٹے بعد ہی بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گئے تھے سر! میں نے انہیں اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک تو دیر کافی ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا' آپ سو گئے ہوں گے۔ دوسرے وہ کچھ شرمندہ شرمندہ سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اس لئے میں نے ہی ان سے کہہ دیا تھا کہ باس کو رپورٹ کرنے کی ضرورت نہیں' میں خود ہی ان سے بات کر لوں گی۔"

"شرمندہ شرمندہ کیوں تھے وہ؟" میں نے دریافت کیا۔

"اسی بات پر کہ انہیں بے خبری میں چوہوں کی طرح مار لیا گیا تھا اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکے۔ آپ نے ان پر اتنا بھروسا کیا تھا' یہی سوچ سوچ کر پانی پانی ہوئے جا رہے تھے۔" جولی نے بتایا۔

"احمق ہیں وہ۔" میں نے اس خبر سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "ایک تو انہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس بار ہمارا واسطہ عام قسم کے جرائم پیشہ لوگوں سے نہیں ہے۔ دوسرے ان کے ساتھ پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے' شاید اس لئے وہ شرمندگی محسوس کر رہے ہیں۔ ابھی نوجوان ہیں' زیادہ پختہ نہیں ہوئے ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ جو ہمیشہ دوسروں کو ناکوں چنے چبواتے ہیں انہیں کبھی کبھی خود بھی ناک رگڑنی پڑ جاتی ہے۔ یہ کوئی ایسی انہونی بات تو نہیں۔ یہ سلسلے تو زندگی کے ساتھ ہیں اور چلتے ہی رہیں گے۔ کبھی اونچ کبھی نیچ۔"

"وہ ذرا ڈر رہے تھے کہ کہیں آپ ان سے خفا نہ ہوں۔" جولی بولی۔

"میں اسی وقت فون کر کے ان کا ڈر دور کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر کے منیر اور مسعود کو فون کیا۔ سمن آباد کے ایک چھوٹے سے بنگلے میں وہ دونوں اکٹھے ہی رہتے تھے۔ فون منیر نے ریسیو کیا۔ انہیں قطعاً توقع نہیں تھی کہ میں رات کے اس پہر ان کی خیروعافیت دریافت کرنے کے لئے فون کروں گا۔ میں نے انہیں تسلی دی اور بتایا کہ میرے لئے ان کا بخیروعافیت لوٹ آنا ہی سب سے زیادہ اہم تھا۔

فون بند کرتے وقت مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دونوں بے حد خوش اور پرجوش تھے۔ ساتھیوں کا مورال بلند رکھنے کے لئے اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ تین چار افراد سے اتنی دیر باتیں کر کے نیند تو اچاٹ ہو گئی لیکن دل پہلے سے کچھ زیادہ مطمئن سا ہو گیا۔ میں نے تکیے میں منہ چھپایا تو چند منٹ بعد دوبارہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

دوسرے روز میں آفس میں بے حد مصروف تھا کہ مارکیٹنگ منیجر نے فون کر کے بتایا "سر! وہ ایک نوجوان ہے نا..... محسن علی۔ جسے آپ کی خصوصی ہدایت پر یہاں ہیلنگ سپروائزر کے طور پر ملازم رکھا گیا تھا' وہ کئی دن سے آپ سے ملنے کے لئے بے چین ہے۔ کوئی دفتری مسئلہ ہوتا تو میں حل کر دیتا۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ کوئی پرسنل کام ہے۔"

مجھے یاد آیا کہ جب میں نشاط عرف بے بی کے قتل کے سلسلے میں سراغ کی تلاش میں رائل پارک کی ایک بلڈنگ میں گیا تھا' دبلا پتلا سانولا سا یہ نوجوان مجھے سیڑھیوں میں مل گیا تھا۔ وہ ایک تلخ اور حساسیت زدہ نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ اس کی باتوں نے مجھے کچھ متاثر کیا تھا۔ غربت اور بے روزگاری کی تلخیوں کا مارا ہوا تھا۔ میں نے اسے اپنے ہاں رکھوا دیا تھا اور بھول گیا تھا۔ آج مارکیٹنگ منیجر نے ذکر کیا تھا تو مجھے وہ سارا واقعہ اور اس نوجوان کی باتیں یاد آ گئی تھیں۔

ہے' لنچ کے بعد ڈھائی بجے اسے بھیج دینا۔ میں کوشش کروں گا کہ پانچ دس منٹ اس کے لئے نکال سکوں۔" میں نے کہا۔

ڈھائی بجے محسن علی میرے کمرے میں آیا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ پہلے سے بہت بہتر اور نکھرا نکھرا دکھائی دے رہا تھا۔ بہتر تھا' صحت بھی پہلے سے بہتر تھی۔

"بیٹھو محسن علی؟" میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "مجھ سے ملنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟ کیا تم یہاں خوش نہیں؟ یہ واہ اچھی نہیں مل رہی یا ڈیوٹی وغیرہ سخت ہے؟"

"نہیں سر! ایسا ہی کوئی مسئلہ ہوتا سر!" اس کے لہجے میں ایک اضطراب تھا "مجھے امید ہے کہ ایسا کوئی مسئلہ ہوتا تو بہت جلد ہو جاتا۔ اس کے لئے مجھے آپ کے پاس آنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تنخواہ میری توقعات سے بہت زیادہ مل رہی ہے۔ دوسرے اندازوں سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اب یہ کوئی ایسا کام ہے سر۔ کہ آدمی ایک رجسٹر لے کر کھڑا رہے اور صرف دیکھتا رہے کہ پیکر ہر کارٹن میں چیز صحیح انداز میں اور صحیح تعداد میں ہے یا نہیں۔ بس.... یہ دیکھ کر ہر کارٹن پر مہر لگانا میرا کام ہے۔"

"پھر تم کس لئے آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اپنی ناشکری کا اظہار کرنے کے لئے سر؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"بہت خوب!" میں دھیرے سے ہنس دیا۔

"انسان بہت ناشکری مخلوق ہے سر!" وہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں وہی پرانی' خفیف سی اداسی بھی تھی۔ "جب انسان بے کار ہوتا ہے..... بھوکوں مر رہا ہوتا ہے تو سب سے بڑا مسئلہ روزگار ہی ہوتا ہے۔ پیٹ اس کے لئے سب سے بڑا عفریت ہوتا ہے۔ لیکن جب پیٹ بھر جاتا ہے تو اسے اور عیاشوں کے عفریت ستانے لگتے ہیں۔"

"مسئلہ کیا ہے؟" میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ بات کو..... اور انسانی احساسات کو سمجھنے والے ہیں سر! امید ہے میری بات کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ میں ہوں گے۔ وہ۔ دراصل میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے بننے سے بچا لیں۔ میں صرف رجسٹر پکڑ کر کھڑا ہونا اور کارٹن پر مہریں لگانا نہیں چاہتا۔ میں کوئی اہم کام کرنا چاہتا ہوں۔ میرے اس دبلے پتلے جسم اور میری آنکھوں میں پھیلی ہوئی سی کونہ دیکھیں' میرے اندر کوئی شعلہ سا مقید ہے جو پہلے کی برف تلے دبا ہوا تھا۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے مضطربانہ انداز میں پہلو بدلتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا "آپ کوئی اہم کام میرے سپرد کر کے دیکھیں سر! کوئی ایسا کام جسے کرتے ہوئے محسوس ہو کہ ہاں واقعی میں کوئی کام کر رہا ہوں۔ ضروری نہیں کہ وہ دفتری نوعیت کا ہی کام ہو۔ آپ کوئی بھی کام میرے سپرد کر سکتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر کے دکھاؤں گا۔"

پھر جیسے اسے کوئی خیال آیا۔ بے تابانہ لہجے میں بولا "یہ مت سمجھئے گا کہ میں زیادہ تنخواہ حاصل کرنے کے لالچ میں آپ کے پاس یہ فریاد لے کر آیا ہوں۔ تنخواہ تو میرے لئے بس اتنی ہی کافی ہے جس سے جسم و جاں کا رشتہ اور سفید پوشی قائم رہ سکے۔ اس سے زیادہ کا مجھے لالچ نہیں۔ تنخواہ آپ میری بے شک یہی رہنے دیجئے جو میں لے رہا ہوں۔ بلکہ اس سے کم بھی ہو جائے تو مجھے کوئی پروا نہیں سر! آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟" اس نے التجائیہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں نہ صرف اس کا مطلب سمجھ رہا تھا بلکہ دل ہی دل میں اس کے بارے میں فیصلہ بھی کر چکا تھا۔ اس قسم کے نوجوانوں کی تو ہمیں ہر وقت ضرورت رہتی تھی۔ لیکن کیا وہ میرے لئے اتنا ہی وفادار' اتنا ہی جاں نثار اور اتنا ہی بے خوف ثابت ہو سکتا تھا جتنا میں اسے دیکھنا چاہتا تھا؟ اس سلسلے میں فی الحال میں اس کے بارے میں زیادہ پُریقین نہیں تھا۔ خیر.... یہ تو وقت آنے پر دیکھا جاتا۔

"تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یس سر! کافی اچھی آتی ہے کیونکہ ایک ٹیکسی ڈرائیور سے سیکھی تھی۔ معاش کے لئے ایک زمانے میں یہ پیشہ بھی اختیار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر وہ ٹیکسی ڈرائیور اپنے گاؤں واپس چلا گیا اور یہ معاملہ بھی درمیان میں رہ گیا۔ کوئی اور ٹیکسی چلانے کے لئے نہیں مل سکی۔"

"اور کوئی ہتھیار وغیرہ استعمال کرنے کی کچھ شدبد ہے؟ خنجر.... پستول.... ریوالور.... رائفل یا ہلکی مشین گن وغیرہ؟ معرکہ آرائی سے ڈرتے تو نہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں شکوک کے سائے رینگ آئے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "ڈرو مت۔ میں تمہیں چوری' ڈاکے یا اغوا وغیرہ کی مہمات پر بھیجنے کا ارادہ نہیں کر رہا۔ میرا اس قسم کا کوئی "سائڈ بزنس" نہیں ہے۔ میں تمہیں ایک شخص کی تلاش پر مامور کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا کوئی سراغ نہیں ہے میرے پاس۔ وہ بس یونہی کبھی ادھر اُدھر پھرتے' آوارہ گردی کرتے تمہیں کہیں بھی نظر آ سکتا ہے۔"

اب اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن وہ ہے بہت خطرناک آدمی۔ تم جیسے شریف اور عام سے آدمی کو تو چٹکی میں مسل سکتا ہے۔ انتہائی خطرناک قسم کا جرائم پیشہ شخص ہے۔ دوسرے کئی آدمی بھی اسے تلاش کر رہے ہیں جو اس قسم کے آدمیوں سے نمٹنے کے ماہر ہیں لیکن شاید اسے تلاش کرنا اور قابو میں کرنا تم جیسے عام' شریف اور اناڑی نوجوان کے مقدر میں لکھا ہو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ

تمہارے اندر جو شعلہ مقید ہے وہ تمہیں کیا کچھ کر گزرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔"

"میں ضرور اس کام میں قسمت آزمائی کر کے دیکھوں گا سر!" وہ پُرجوش سے لہجے میں بولا "دست بہ دست لڑائی میں تو میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ اپنے سے کئی گُنا طاقتور انسانوں سے بھی نہیں ڈرتا۔ کیونکہ بے روزگاری اور مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے میرے اندر جھنجلاہٹ اور غصے کا ناگ چپکے چپکے بس گھولتا رہا ہے۔ آپ کو شاید اندازہ ہی ہو کہ نفرت کا زہر انسان کو اندر ہی اندر بہت طاقتور بنا دیتا ہے' خواہ اس کا جسم کتنا ہی کمزور ہو۔"

محسن علی خود اپنا تجزیہ بھی عمدگی سے کر سکتا تھا۔ وہ صرف اپنا ہی نہیں بلکہ عمومی انسانی نفسیات کا اصول بیان کر رہا تھا۔ وہ اپنی مزید ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے بولا "اب یہ تو استعمال کرنے والے پر منحصر ہے کہ وہ ہم جیسوں کے سینے میں مقید اس آتش فشاں کی توانائی کو فولاد پگھلانے اور نت نئے سانچوں میں ڈھالنے کے لئے استعمال کرتا ہے یا دوسروں کا گھر جلانے کے لئے۔"

پھر ایک لمحے توقف سے وہ بولا "اگر کوئی میری ذرا سی مدد کرے تو میں دو چار دن میں ہی ہر چیز کا استعمال اچھی طرح سیکھ لوں گا۔ میں کچھ بھی سیکھنے کے معاملے میں غبی نہیں ہوں۔"

"ٹھیک ہے ..... یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کا بندوبست ہو جائے گا۔" میں نے کہا "میں چاہتا تو تمہیں دفتر میں ہی یا اپنے کسی کارخانے وغیرہ میں زیادہ مشکل اور زیادہ تھکا دینے والے کام پر لگا دیتا جس میں تمہیں سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ملتی۔ لیکن مجھے معلوم ہے' تم دو چار دن میں اس سے بھی اکتا جاتے۔ تمہاری روح اصل ایڈونچر مانگ رہی ہے۔"

"مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ صرف آپ میری بات سمجھ سکیں گے سر!" وہ پہلے سے زیادہ پُرجوش لہجے میں بولا "اسی لئے میں نے آپ کے پاس آ کر اپنا مسئلہ بیان کرنے کی جرأت کی۔ آپ کی جگہ کوئی اور باس ہوتا تو میری باتوں کو حقیقتاً صرف ناشکری کی بیداوار سمجھ کر مجھے کان سے پکڑ کر نکال باہر کرتا۔ اچھا ..... تو سر! اگر وہ شخص نظر آ جائے تو مجھے کیا کرنا ہے؟"

"تمہیں دو تین ایڈریس دیئے جائیں گے۔ کسی بھی طرح اس شخص کو قابو میں کر کے ان میں سے کسی ایڈریس پر پہنچانا ہے۔ یہ خیال رہے کہ آدمی مرنے نہ پائے' مجھے وہ زندہ حالت میں چاہئے۔ اب تم اسے کس طرح قابو میں کرو گے' موقع محل کی مناسبت سے کیا طریقۂ کار اختیار کرو گے' یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے سر!" وہ مستعدی سے بولا۔ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ شاید اسے قطعاً توقع نہیں تھی کہ اس کے تمام تر اناڑی پن کے باوجود کوئی اہم مہم اس کے سپرد کر دی جائے گی۔ میرے لئے گو کہ یہ مہم کوئی ایسی اہم بھی نہیں تھی لیکن اسے دینے کے لئے۔ فی الحال یہی ایک "ٹیسٹ کیس" میرے ذہن میں آیا تھا۔

صحرا کا چاند	اے حمید	1/-
پہلی محبت کے آنسو	اے حمید	10/-
اداس جنگل کی خوشبو	اے حمید	10/-
چاند چہرے	اے حمید	10/-

مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2

وہ بالکل اناڑی اور معصوم تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ اے خ
ہاتھوں محض ایک سیکنڈ میں مار بھی جا سکتا تھا لیکن اس۔
میں شعلہ مقید ہونے کی بات کی تھی اور سینے میں شعلہ مقید
والوں کا امتحان میں اسی طرح لینے کا قائل تھا۔ اگر وہ واقع
فن کے مقابلے میں محض اپنے جذبے کی بدولت کچھ کر گزر
ایک تجربہ ہی اسے یکدم کندن بھی بنا سکتا تھا۔ اگر اسے
"رگڑا" لگ جاتا تب بھی وہ بہرحال بہت کچھ سیکھ سکتا تھا
بے تاب اور پُرجوش امیدوار جو بہت جلد تیراکی سیکھنا چا
اس کے لئے میری نظر میں تو مناسب طریقہ یہی تھا کہ اسے ا
کھلے سمندر میں دھکا دے دیا جائے۔ میرے تجربے کے مطا
بات کا بہت کم امکان ہوتا تھا کہ وہ ڈوب جائے۔

میں نے دراز سے اے فن کی ایک کوارٹر سائز کی تصویر نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ ہے وہ شخ
تلاش کرنا ہے۔"

تصویر کو دیکھتے ہی جیسے اس کا سارا جوش و خروش جو
طرح بیٹھ گیا۔ شاید اسے یہ گمان بھی گزرا ہو کہ میں اس۔
کر رہا ہوں۔ اے فن کو تو روبرو دیکھنے سے بھی کچھ اچھے
مُرتب نہیں ہوتے تھے جبکہ یہ تصویر تو ویسے ہی عمدہ نہیں تھ
اسٹوڈیو میں کھینچی گئی ہوتی تب تو شاید فوٹوگرافر' اے فن۔
کی تمام تر مضحکہ خیزی کے باوجود اس میں بھی اسکرین
کرنے کی اپنی سی کوشش کرتا۔ لیکن یہ تو محض سیکیورٹی کے
میں استعمال ہونے والے کیمرے سے اس کی لاعلمی میں ا
کھینچی گئی تھی۔ اس میں تو اے فن تقریباً بندر ہی معلوم ہو
میں محسن علی کے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ وہ
نہ رہ سکا "سر! اسے آپ انتہائی خطرناک آدمی کہہ رہے ہیں
قابو میں کرنے کے لئے آپ نے بہت سے آدمیوں کی ڈیوٹی
ہے؟" اس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے لہجے
یقینی تھی۔

ں نے مسکراتے ہوئے کہا "میرے لئے تمہارا ردِعمل غیر
میں ہے۔ ہر عام آدمی کا ردِعمل یہی ہوگا۔ لیکن اگر تم خاص
نا چاہتے ہو تو لوگوں کے ظاہری سراپا کے اندر چھپے ہوئے
انسان کو پہچاننے کا ہنر سیکھنے کی کوشش کرو۔ صرف ظاہری
صورت یا ظاہری رویہ دیکھ کر کسی کے بارے میں حتمی رائے
رنے کی کوشش مت کرنا۔"

"یس سر!" وہ یکدم بدلے ہوئے سے لہجے میں بولا "میں
ت چاہتا ہوں۔ میں ایک لمحے کے لئے بھول گیا تھا کہ اس
ی کے بارے میں مجھے آپ بتا رہے ہیں۔ اور جب آپ بتا رہے
پھر ٹھیک ہی بتا رہے ہوں گے۔"

"میں اس لئے بھی تمہیں اس کے بارے میں زیادہ اچھی
ح خبردار کر کے میدانِ عمل میں بھیج رہا ہوں کہ مجھے تمہاری
ی عزیز ہے۔" یہ کہہ کر میں نے ایک چھوٹی سی چٹ پر ایک
نمبر لکھا اور نیچے صرف ایک جملہ لکھا "بچے کو تیرنا سکھاؤ۔"

چٹ میں نے محسن علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس نمبر
ون کرنا۔ جو آدمی فون ریسیو کرے گا اس سے کہیں ملاقات کا
ت طے کرنا اور یہ چٹ اسے دے دینا۔ وہ تمہیں گاڑی اور
یار دے گا۔ نیز چند دن میں جتنا کچھ سکھانا ضروری ہوگا وہ سکھا
ے گا۔ بہت مختصر سی تربیت ہوگی۔ اپنی اصل تربیت تو تم خود ہی کرو
ے یا پھر حالات تمہیں بہت کچھ سکھا دیں گے۔ لیکن تربیت کے
ران بھی اگر تمہیں یہ بندر نما شخص کہیں نظر آ جائے تو تمہیں
ں پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش ضرور کرنی ہے یا ہمیں اطلاع کرنی
ہے۔ ہمیں اطلاع دینے کے طریقے بھی تمہیں یہی شخص سمجھا دے
ا۔" میں نے چٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں سر!" وہ یوں خوش نظر آ رہا
تھا' جیسے من کی مُراد پوری ہو گئی ہو۔ مجھے اس نوجوان میں ٹیلنٹ
نظر آ رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ جوہڑ کا یہ کچھوا کھلے پانیوں میں جا کر اپنی
جون بدل لے گا۔

"اب تم جا سکتے ہو۔" میں نے کہا اور وہ شکریہ ادا کر کے اٹھ
کھڑا ہوا۔

اچانک اسے گویا کچھ یاد آیا اور رکتے ہوئے بولا "سر! میرے
موجودہ فرائض کون انجام دے گا؟"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ لوگ آتے رہتے ہیں' جاتے رہتے
ہیں' ایک دوسرے کی جگہ لیتے رہتے ہیں۔ اتنے بڑے سیٹ اپ
میں ایک پیکنگ سپروائزر کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔
صرف اپنے ڈیپارٹمنٹ کے انچارج کو مطلع کرتے جانا کہ تم میری
ہدایت پر کسی اور کام پر جا رہے ہو۔"

اس کے جانے کے بعد شام تک میں بے حد مصروف
رہا۔ کاروباری معاملات بہت پھیلتے جا رہے تھے۔ ادھر چند دن کے
لئے میں لندن' امریکا کے چند شہروں اور تورانتو کے دورے پر جانا
بہت ضروری ہو رہا تھا لیکن میں اس کا بھی کوئی شیڈول نہیں بنا پا رہا
تھا۔ ادھر ریڈ ڈاٹ میری جان کو آئی ہوئی تھی۔ ادھر راحیلہ' طاہرہ
خانم اور ستارہ کے ساتھ میرے وعدے وفا ہونے کی نوبت نہیں
آ رہی تھی۔

حالانکہ میں نے کام کو اتنے بہت سے خود مختار شعبوں میں
بانٹ رکھا تھا' اتنے آدمی آزادانہ طور پر الگ الگ میرے کاروبار
کو چلا رہے تھے۔ اس کے باوجود مصروفیات میرے اعصاب پر
سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھیں' جو میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ میں
اپنے اعصاب کو ہر بوجھ سے آزاد رکھنا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا
کہ اس جوانی سے ہی فکرات اور مصروفیات اس طرح مجھ پر سوار
ہو جائیں کہ ادھیڑ عمری تک میرے ہاتھوں میں لرزہ آ جائے'
آنکھوں سے وحشت ٹپکنے لگے اور خواب آور گولیوں کی مدد سے بھی
نیند آنی بند ہو جائے۔ یہ دولت اور کاروبار کا چکر کچھ ایسا ہی طلسماتی
قسم کا تھا۔ انسان کو پتا بھی نہیں چلتا تھا اور یہ اسے جکڑ کر کہیں سے
کہیں لے جاتا تھا۔ انسان سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس
شکنجے سے نہیں نکل پاتا تھا۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے
اعصاب جواب دے رہے ہیں' بوجھ اس کی برداشت سے باہر
ہو رہا ہے' اس کا دماغ چٹخنے کو ہے۔ مگر وہ اپنا بوجھ کم کرنے کے لئے
کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ جنہیں وہ بوجھ کم کرنے کے لئے اپنے قریب
لانے کی کوشش کرتا ہے وہ خود الٹا اس پر مزید بوجھ بن جاتے ہیں۔

میں آفس سے نکلا تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ آج رات
بزی صاحب کے ہاں پارٹی تھی اور میں کئی روز پہلے اس میں آنے
کی ہامی بھر چکا تھا۔ بزی صاحب بھی بہت بڑے امپورٹر ایکسپورٹر
تھے۔ کنسٹرکشن کا بزنس بھی تھا۔ انگریزی فلمیں بھی امپورٹ کرتے
تھے اور فلمسازی میں سرمایہ کاری بھی کرتے تھے۔

چونکہ فلمی شعبے سے کسی نہ کسی حد تک ان کا تعلق تھا' اس
لئے مجھے اندیشہ تھا کہ ان کی پارٹی میں ستارہ بھی موجود نہ ہو۔ فلمی
دنیا سے جن کا بھی کچھ نہ کچھ قابلِ ذکر تعلق ہوتا تھا' فلمی ہیروئنوں
کے بغیر تو ان کی پارٹیاں مکمل ہی نہیں ہوتی تھیں۔ اب عالم یہ تھا
کہ دو چار دن کے لئے میں ستارہ کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہ رہا
تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر وہ پارٹی میں ٹکرا گئی تو وہی شکوے گلے
ہوں گے اور وہی طنز کے تیر۔ اور اگر کہیں بدقسمتی سے وہاں طاہرہ
خانم بھی موجود ہوئی تو صورت حال میرے حق میں کچھ عجیب سی
ہو جائے گی۔

طاہرہ خانم آندھی طوفان کی طرح مجھ پر چھانے کی کوشش
کر رہی تھی۔ وہ ویسے بھی بہت کھلی ڈلی عورت تھی۔ تکلفات رکھنے
کی تو قائل نہیں تھی۔ اگر وہ بھی بزی صاحب کی پارٹی میں ٹکرا
جاتی تو نہ جانے اس کا رویہ کیا ہوتا اور ستارہ اسے دیکھ کر کیا تاثر
لیتی۔ میں اس کشمکش کا نشانہ بننا نہیں چاہتا تھا۔

لیکن مجھے رات کم از کم بارہ بجے تک وقت بھی گزارنا تھا اور

یہ وقت بھی ایسا تھا کہ کاروباری مصروفیات میں استعمال نہیں ہو سکتا تھا۔ پرنس تہمینہ نے مجھے ہوٹل کے تہ خانے میں لانڈری روم کے قریب ملنے کے سلسلے میں یہی لکھا تھا کہ میں اس کے شو کے بعد وہاں اس کا انتظار کروں' اس کا مطلب یہی تھا کہ مجھے رات ایک بجے کے قریب ہی وہاں جانا چاہئے تھا۔

چنانچہ گھر پہنچ کر دوبارہ تیار ہونے کے بعد میں وقت گزاری کے لئے ڈرتے ڈرتے بڑی صاحب کے ہاں پارٹی میں چلا ہی گیا۔ غنیمت تھا کہ وہاں ستارہ اور طاہرہ خانم دونوں ہی مدعو ہونے کے باوجود نہیں آئی تھیں۔ البتہ اور بہت سے چاند چہرے ستارہ آنکھیں موجود تھیں۔ مہرباں چہرے بھی تھے اور حد سے زیادہ مہرباں آنکھیں بھی۔ لیکن میرا ذہن ادھر اُدھر پھنسا ہوا تھا۔ بہرحال وقت بہت اچھا گزرا۔

رات بارہ بجے میں بڑی صاحب کی طویل و عریض حویلی نما بنگلے کی تھی سے نکل آیا۔ پارٹی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی تاہم اکا دُکا مہمان رخصت ہونے شروع ہو گئے تھے۔

روانہ ہونے سے پہلے میں نے گلی میں کھڑی ہوئی اپنی کار میں بیٹھ کر ٹونی سے رابطہ قائم کیا اور اسے پوزیشن سمجھاتے ہوئے بتایا کہ میں کہاں' کس سے ملاقات کے لئے جا رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پرنس تہمینہ سے ملاقات کے دوران یونہی احتیاطاً دور کہیں ٹونی کو موجود رہنا چاہئے تھا۔ پرنس کا پیغام میرے لئے کوئی جال بھی ہو سکتا تھا۔ گو کہ میری نامعلوم حس مجھے اس سلسلے میں کسی دھوکے سے خبردار نہیں کر رہی تھی لیکن پھر بھی احتیاط بہتر تھی۔

ٹونی پوری بات سننے کے بعد بولا "ٹھیک ہے سر! میں آپ کو یا پرنس کو ظہر نہیں آؤں گا لیکن میں آس پاس کہیں نہ کہیں موجود ہوں گا۔"

سلسلہ منقطع کرنے کے بعد بھی میں کچھ دیر تک گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ فضا میں خنکی تھی اور اوس سے بھیگی ہوئی ہوا خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ آخر کار میں نے کھڑکی کا شیشہ چڑھایا' گاڑی اسٹارٹ کی اور ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں جب ہوٹل پہنچا تو ڈانس شو ختم ہوا ہی تھا۔ بیشتر لوگ رخصت ہو چکے تھے۔ سناٹا سا چھانے لگا تھا۔ رات گئے تک ہوٹل کی رونق شو کے دم سے ہی تھی۔ شو ختم ہوتے ہی سکوت سا چھانے لگتا تھا۔ تھوڑی بہت رونق کافی شاپ یا پھر بینکوئٹ ہال میں باقی رہ جاتی تھی۔

گاڑی پارکنگ لاٹ میں چھوڑ کر میں ٹہلنے کے سے انداز میں صدر دروازے کے سامنے سے گزر کر عمارت کے دوسری طرف پہنچا جہاں ڈھلواں کشادہ راستہ تہ خانے کی طرف جا رہا تھا۔ تہ خانے کے داخلے کا راستہ بہت بڑے کیرج سے مشابہ تھا۔ اس میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اندر کئی شعبے تھے۔ ان کے الگ الگ دروازے تھے۔ دو تین بڑے بڑے اسٹور روم تھے جن میں کھانے پینے کے سامان سمیت تمام فاضل چیزوں کا اسٹاک رکھا جاتا تھا۔ ایک کونے میں بڑا سا لانڈری روم تھا جہاں واشنگ اور ڈرائی کلیننگ کی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔

اس وقت وہاں روشنی برائے نام تھی۔ سب دروازے مقفل تھے۔ میں نے تہ خانے کا چکر لگایا۔ کہیں کوئی موجود نہیں تھا۔ یہاں کا فرش خاصا گندا اور چپکتا تھا۔ باہر آنے تک میرے جوتوں کے تلے چپ چپے ہو چکے تھے۔ میں نے انہیں باہر پختہ روش پر رگڑ کر صاف کیا اور ہلکے اندھیرے میں ایک طرف ٹرالیوں کے قریب دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

رات کے اس پہر اس طرف شاذ و نادر ہی کوئی آتا تھا۔ شو ختم ہوئے چند منٹ گزر چکے تب تو ہوٹل کی مین بلڈنگ کی طرف بھی سناٹا چھانے لگا۔ سامنے کافی فاصلے پر عمارت کے کونے پر ایک پول پر لگا ہوا آرائشی گلوب دھندلی دھندلی' زرد سی روشنی جھمجھا رہا تھا۔ میں کچھ زیادہ پُریقین نہیں تھا کہ پرنس تہمینہ آئے گی۔ رات کو اس وقت اسے ہوٹل کے ایک نیم تاریک اور ویران گوشے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر نہ جانے راستے میں کتنے لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوتی۔ لابی میں تو اس وقت بھی خاصے لوگ بیٹھے ہوتے تھے' جو راتوں کو اُلوؤں کی طرح دیر تک جاگتے تھے اور صبح دیر تک سوتے تھے۔ اس کے علاوہ میرا خیال تھا کہ کمال نے سن سائے کی طرح پرنس کے ساتھ لگا رہنا تھا۔ اس سے وہ کیسے جان چھڑا سکتی تھی؟ یہ باتیں پہلے بھی میرے ذہن میں تھیں' اس کے باوجود میں نہ جانے کس طرح چلا آیا تھا۔

مجھے وہاں کھڑے خاصی دیر گزر گئی۔ پرنس تو نہ آئی البتہ مجھے مایوسی کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ لیکن مجھے یاد تھا کہ اس نے خود بھی اپنے پیغام میں اس بات کا امکان ظاہر کر دیا تھا کہ شاید وہ نہ آسکے۔ اس صورت میں اس نے دوسرے روز اسی وقت اسی جگہ مجھے دوبارہ انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ لیکن مجھے آج ہی کچھ دیر اس طرح گزار کر احساس سا ہو گیا تھا کہ کسی معیوب سی جگہ پر کھڑے ہو کر چوروں کی طرح انتظار کرنا.... اور وہ بھی بے یقینی کے عالم میں انتظار کرنا واقعی بڑا تکلیف دہ مسئلہ تھا۔

عین اس وقت جبکہ میں وہاں سے ہٹنے اور واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا' عمارت کے کونے سے گلوب کی دھندلی روشنی میں ایک عورت مجھے بیس منٹ کے ڈھلواں راستے پر آتی دکھائی دی۔ وہ ہوٹل ہی کی کوئی ہاؤس میڈ تھی۔ میڈ کے یونیفارم میں تھی۔ یونیفارم میں دوپٹا بھی شامل تھا جسے اس نے چہرے پر کچھ زیادہ ہی آگے تک جھکایا ہوا تھا۔

موڑ مڑتے ہی چونکہ روشنی اس کے عقب میں رہ گئی تھی اس لئے میں اسے سامنے سے صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن خدوخال سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک اسمارٹ میڈ تھی۔ ورنہ بیشتر ہاؤس میڈز گھروں میں کام کرنے والی ماسیوں سے ذرا ہی بہتر دکھائی نہیں۔ ان میں شاذ و نادر ہی کوئی اسمارٹ اور خوش شکل ہوتی ہو شاید کسی مجبوری کی وجہ سے ہی اس معمولی نوکری میں لگن ہی تھی۔

راستہ ڈھلوان ہونے کے باوجود وہ بڑے نپے تلے قدم اٹھاتی میری طرف آ رہی تھی۔ اس کی چال میں شاخِ گل کا سا لہراؤ لچک تھی۔ میں شاید ابھی اسے نظر نہیں آیا تھا۔ وہ متلاشی سی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتی آ رہی تھی۔

دن میں تو عام طور پر میڈز کمروں میں بستروں کی چادریں اور کپڑے وغیرہ تبدیل کرنے کے بعد ایک ٹرالی میں بھر کر ٹرالی کی لانڈری شاپ پر دینے کے بجائے براہِ راست لانڈری روم میں لے آتی تھیں لیکن رات کو اس وقت یوں بازو پر کچھ کپڑے جھولا کر کسی میڈ کا اس طرف آنا کسی کو قدرے عجیب لگ سکتا تھا۔ مگر پھر بھی اس کی آمد پر پرنس تہمینہ کی آمد سے بہرحال کم توجہ حاصل کرتی۔ پرنس خود نہیں آسکی تھی لیکن اس نے شاید میڈ کے ہاتھ کوئی پیغام بھیجا تھا۔

وہ جب روشنی کی رسائی سے کافی آگے تقریباً اندھیرے میں آئی تو اس نے چہرے پر ڈھلکا ہوا آنچل ذرا پیچھے کر لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھا۔ مجھے حیرت کا ہلکا سا جھٹکا لگا۔ وہ دراصل پرنس تہمینہ ہی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ میک اپ سے بالکل بے نیاز تھا لیکن پھر بھی کم از کم مجھے اس سے بہتر لگ رہی تھی جیسی وہ پورے اسٹیج میک اپ کے ساتھ تیز اور رنگا رنگ روشنیوں میں نظر آتی تھی۔

میں دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ وہ ابھی تک مجھے نہیں دیکھ سکی تھی۔ میں دراصل یہ اطمینان کر رہا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے تو نہیں آ رہا۔ لیکن اس کے پیچھے آنا تو درکنار' ابھی تک کسی نے عمارت کے کونے سے جھانکا بھی نہیں تھا۔

آخر کار اس نے تھوڑا اور آگے آکر سرگوشی کے انداز میں پکارا "ٹائی!"

ایک لمحے کے لئے میری دھڑکنیں بے ترتیب سی ہو گئیں۔ یہ لمحہ تو میرے لئے شناسا تھا۔ تو از گو کہ سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی پھر بھی مجھے پرنس تہمینہ کی تو از سے بہت مختلف محسوس ہوئی تھی۔ اس نے بازو پر لٹکائے ہوئے کپڑوں کو تھکے تھکے اور بے زاری آمیز انداز میں ایک ٹرالی پر پھینک دیا۔

آخر کار میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا "میں یہاں ہوں۔"

وہ لپک کر ادھر آئی اور برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست کی طرح ملی۔ میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ کئی لمحے کی صبر آزما خاموشی کے بعد وہ میرے ہاتھ دیوانوں کی طرح اپنی آنکھوں پر مسلتے ہوئے بولی "کتنی بے چین تھی میں تم سے ملنے کے لئے مگر تمہیں اپنا سامنے دیکھ کر بھی نہیں مل سکتی تھی۔ حتیٰ کہ شناسائی کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ کچھ آنکھیں میری جانب نگراں ہوتی تھیں۔ الیکٹرانک قلات سے میری آواز.... میری ہر سرگوشی بھی کچھ کانوں تک پہنچ رہی ہوتی تھی۔"

"اب کیسے آئی ہو؟" میں نے اس کی مہکتی زلفوں کے قریب سرگوشی کی۔

"وہ پرانی.... بادشاہوں کے زمانے والی ترکیبیں آج کے دور میں بھی کام آجاتی ہیں۔" وہ مُرتعش لہجے میں بولی "معلوم نہیں یہ تاریخ کے معتبر حصے ہیں یا غیر معتبر' بہرحال کسی جگہ پڑھا تھا کہ شہزادی کو محبوب سے ملنے جانا تھا.... کپڑے پہرے تھے۔ آخر کار وہ اپنی جگہ کنیز کو بُلا کر اس کے کپڑے پہن کر نکل گئی۔ میری جگہ اس وقت میرے شب خوابی کے لباس میں میڈ لیٹی ہوئی ہے۔" وہ ہولے سے ہنسی "آخر میں بھی تو شہزادی ہوں۔ پرنس تہمینہ۔ جعلی ..... بلکہ جعلی در جعلی پرنس ہی سہی کیونکہ اصل پرنس تو وہ بھی نہیں تھی جس کی میں نے جگہ لے رکھی ہے۔ اس نے بھی صرف نام کو زیادہ بھاری بھرکم' پُرکشش اور معززانہ بنانے کے لئے پرنس ساتھ لگایا ہوا تھا۔"

"مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی۔ صرف تمہاری آنکھوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم ہی ہو۔" میں نے کہا۔

"جب تم نے مجھے پہچانا تو میں نہ تاسیں سکتی کہ کتنی مشکل سے میں نے اپنے اندر اٹھنے والے محسوسات کے طوفان کو دبایا۔ عجیب حالت ہو گئی تھی میری۔ مجھے یوں لگا کہ اس بھری پُری سفاک دنیا میں صرف تم ہی میرے دوست' میرے ہمدرد اور آشنا ہو۔ میرا دل چاہ رہا تھا' مٹی بن کر تمہارے پیروں میں بچھ جاؤں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔"

"خیر اب اتنی بھی انکساری ٹھیک نہیں تھی۔" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"یہ انکساری نہیں تشکر تھا۔ محبت کا تشکر۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں تمہارے بارے میں کس طرح سوچتی تھی۔ کیا محسوس کرتی تھی۔ میں تو یہی سمجھتی تھی کہ میں تمہارے لئے راستے میں پڑے ہوئے تنکے سے بھی زیادہ حقیر ہوں۔ لیکن جب تم نے مجھے پہچانا' میرے لئے تشویش کا اظہار کیا تو مجھے احساس ہوا کہ تمہاری نظر میں میری کوئی اہمیت تھی' تم نے میرے بارے میں کچھ سوچا تھا' میرے بارے میں فکرمند ہوئے تھے۔ تب میں اندر ہی اندر اپنی نظر میں بہت اونچی' بہت معزز' بہت آبرومند ہو گئی۔"

"میری نظر میں تو ویسے بھی ہر آدمی اس وقت تک بہت اونچا بہت معزز اور بہت آبرومند رہتا ہے جب تک وہ اپنی کسی حرکت اور عمل کے ذریعے اپنے آپ کو ذلیل اور پست ثابت نہ کر دے۔" میں نے کہا۔

"اوروں کی بات میں نہیں جانتی۔" وہ بولی "میں تو اپنی بات

کررہی تھی۔ میں تو ایک راندۂ درگاہ قسم کی عورت ہوں نا۔ چپکے چپکے دل میں تم سے پیار کرتی تھی لیکن تم سے ایک لفظ بھی کہنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتی تھی۔ زمانہ اگر میرے روز و شب کا حساب کرنے بیٹھے تو مجھے طوائف' فاحشہ' بدچلن' آبروباختہ اور نہ جانے ایسے کون کون سے القابات سے نوازے۔ اور یہی بات یہ ہے کہ میں ان کی مستحق بھی ہوں۔ لیکن تمہارے سامنے آتی تھی تو میں اندر ہی اندر اپنے آپ کو سولہ سال کی معصوم اور اچھوتی لڑکی محسوس کرتی تھی۔ تم سے کچھ بھی تو کہنے کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ تم میرے لئے آسمان کی رفعتوں پر جھلملاتے ہوئے کسی بہت ہی روشن ستارے کی طرح تھے اور میں خود اپنی نظر میں زمین پر پھیلا ہوا کیچڑ تھی۔"

میں عجیب سے انداز میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ ہنسی اپنے آپ پر تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی۔۔۔ اتفاق تھا۔۔۔ یا میری اپنی لاشعوری طلب کا نتیجہ تھا کہ میری قسمت میں راندۂ درگاہ قسم کی عورتیں ہی لکھی تھیں۔ اس قبیل کی عورتیں بہت ہی تھوڑے وقت میں مجھ پر فریفتہ ہو جاتی تھیں۔ اور سچی بات یہ تھی کہ مجھے بھی کشش انہی میں محسوس ہوتی تھی۔ کچی عمر کی' کچے ذہن کی' چھوئی موئی سی نظر آنے والی لڑکیاں مجھے کبھی اپیل نہیں کرتی تھیں۔ دل ان کی طرف کھنچتا ہی نہیں تھا۔ شاید لڑکپن سے ہی دل و دماغ میں کوئی خرابی بیٹھ گئی تھی۔ شاید مجھ میں تابِ انتظار نہیں تھی۔ بند دریچوں پر مدتوں دستک دیتے رہنے' تب کوئی پٹ کھلتا ہے اور پھر بھی کہہ نہیں سکتے اندر کتنی گھٹن ہو' کتنے کمپلیکس ہوں۔ بے دردِ بام میدانوں میں سفر کے لئے تمہیدیں نہیں باندھنا پڑتیں' مدتوں دستکیں نہیں دینا پڑتیں۔ ان میں پیچ در پیچ راستے نہیں ہوتے۔ جو بات ہوتی ہے' سیدھی اور صاف ہوتی ہے۔

لڑکپن میں صرف راحیلہ ایک ایسی لڑکی تھی جو جنون بن کر ذہن پر سوار ہوئی تھی اور وہ راندۂ درگاہ قسم کی چیزیں تھی تیز طرار بہت تھی' بہت اونچی چیزی تھی۔ لیکن سیپ سے نکلے ہوئے موتی کی طرح شفاف اور آبدار۔ اس سے تعلقِ خاطر کے دوران کبھی خواہشوں کے گھوڑے بے لگام نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اب وہ بھی ایک طلاق کی مار ضمہ آئی تھی۔ لیکن کمبخت اب پہلے سے زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ میرے ذہن میں کہیں نہ کہیں کوئی ٹیڑھ تھی ضرور۔ جب کسی کو دل سے اتر جانا چاہئے تھا اس وقت وہ دل میں کھب جاتی تھی۔

ہنسی کہہ رہی تھی "اس وقت میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی جب تم نے مجھے پہچانا تھا۔ میری ماں بھی شاید اس بدلی ہوئی شکل اور اس روپ میں مجھے نہ پہچان پاتی جو دن رات کی محنت سے مجھے دیا جا رہا تھا۔"

"ماں کے ذکر پر یاد آیا۔۔۔" میں نے جلدی سے کہا "مجھے ان کی موت کا بہت افسوس ہوا تھا۔ کس نے قتل کیا تھا انہیں؟"

"انہیں قتل نہیں کیا گیا تھا۔" اس کے لہجے میں افسردگی آگئی۔ "یہ ایک افسوسناک اتفاق ہے کہ انہیں ریڈ ڈاٹ والوں کی تحویل میں رہنے کے دوران ہی ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ گو کہ ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت نہیں تھی لیکن رابطہ بالکل اس طرح تھا کہ میں کبھی کبھار انہیں چلتے پھرتے' اپنے چھوٹے موٹے کام کاج کرتے ٹی وی اسکرین پر بھی دیکھ سکتی تھی۔ ان سے بات بھی کر سکتی تھی۔ ان پر کوئی تشدد وغیرہ نہیں کیا جا رہا تھا۔ انہیں وہ صرف مجھے بلیک میل کرنے کا ایک ذریعہ بنا کر ساتھ لے گئے تھے۔ اگر میں ان کے ساتھ تعاون نہ کرتی تب وہ ضرور ان پر تشدد کرتے اور آخر کار انہیں مار ڈالتے۔"

"لیکن یہ قصہ کیا ہے۔۔۔؟ مجھے سب کچھ شروع سے بتاؤ۔ بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ تمہاری شکل بدل جانے کا کیا قصہ ہے؟ یہ ریڈ ڈاٹ کیا ہے۔۔۔۔۔ کون لوگ ہیں یہ؟ تمہیں کیوں اغوا کیا گیا تھا؟" یکدم ہی کئی سوالات میری زبان پر آگئے۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ ریڈ ڈاٹ کیا ہے۔ میں نے بھی بس ان لوگوں میں رہنے کے دوران یہ نام ہی سنا ہے۔ بہرحال اپنے انداز و اطوار سے یہ کوئی تنظیم ہی لگتی ہے لیکن اس کا کوئی سربراہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔" وہ بھی میرے قریب ہی دیوار سے لگ کر کھڑی ہوتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

"کیا مافیا قسم کی کوئی چیز ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مافیا کے بارے میں مجھے بہت زیادہ اور حقیقی معلومات تو نہیں۔" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "لیکن کہانیوں کتابوں میں جتنا کچھ پڑھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریڈ ڈاٹ شاید اس سے کہیں آگے کی کوئی چیز ہے۔ مافیا کا تو بس کچھ ایسا امیج ہے نا۔۔۔ کہ بہت بڑی عالمگیر تنظیم ہے۔ بہت اونچے مقامات تک اس کے پنجے گڑے ہوئے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر ان کی سرگرمیاں ناجائز تجارت' منشیات کے کاروبار اور اسلحے کی تجارت کی گرد ہی گھومتی ہیں اور اس سلسلے میں جتنی دہشت گردی کی ضرورت پیش آتی ہے وہ بے دریغ اس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔"

"ہاں' تقریباً ایسا ہی معاملہ ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن ریڈ ڈاٹ ہر معاملے میں اس سے بہت آگے معلوم ہوتی ہے۔" ہنسی جھرجھری سی لے کر بولی "میرا خیال ہے میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان پائی' کچھ بھی نہیں دیکھ پائی۔ اس کے باوجود میری عقل دنگ ہے۔ ان کا کیا سائنٹیفک طریقِ کار ہے۔۔۔۔ کیا کیا ایجادات ہیں ان کے پاس۔ معلوم نہیں اس میں کس کس قوم کے لوگ شامل ہیں۔ یہ کہاں سے آئی ہے؟ اس کی جڑ کہاں ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ میں کچھ بھی نہیں جان سکی۔ اس کے باوجود ان کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہوں۔"

میرے کان اس کی سرگوشی نما آواز پر لگے ہوئے تھے اور مجھے خون کی گردش کچھ تیز ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے یوں سانس لی کہ ذرا بھی آواز پیدا نہ ہونے پائے۔ پھر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی "اب یہی دیکھ لو کہ کاسمیٹک سرجری کے ذریعے شکل بدل گئی ہے۔ ایک ہفتے تک میرے چہرے پر کاسمیٹک سرجری کا عمل جاری رہا۔ صرف آنکھوں کو نہیں چھیڑا گیا کیونکہ ان کی ویسی ہی تھیں جیسی انہیں مطلوب تھیں۔ اور انہی آنکھوں کی وجہ سے تم نے مجھے پہچان لیا۔" وہ اندھیرے میں میری طرف دیکھ کر والہانہ سے انداز میں مسکرائی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "وہ ایک نہایت شاندار اور جدید ترین آپریشن تھیٹر تھا جہاں میری کاسمیٹک سرجری کی گئی۔ وہاں ایسے ایسے جدید آلات اور مشینری موجود تھی جن کے نام تک معلوم نہیں۔ اور شاید تم بھی ان کا تصور نہ کر سکو۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کاسمیٹک کلینک اور آپریشن تھیٹر تھا کہاں۔ میرے چہرے کی تبدیلی کا عمل مکمل ہونے اور کانوں کے پیچھے سرجری کے بعض نشانات درست ہونے میں ایک ماہ لگ گیا۔ اس کے بعد ایک ماہ تک میری برین واشنگ کی جاتی رہی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اپنے ماضی کے کسی دوست' شناسا یا کسی بھی قسم کا تعلق رکھنے والے کو پہچانوں۔ اس مقصد کے لئے دوائیں' آلات' نفسیاتی حربے اور تمام جدید ترین ٹیکنیکس استعمال کرنے کے علاوہ مجھے ہپناٹائز بھی کیا گیا۔ ابتدا میں چند دن کے لئے واقعی میں اپنی یادداشت تقریباً کھو بیٹھی تھی لیکن اس بات کا شاید تمہیں بھی اندازہ نہ ہو کہ میں انتہائی مضبوط قوتِ ارادی کی مالک ہوں۔ میں مسلسل مزاحمت کرتی رہی۔ یوں مکمل برین واشنگ سے بچ گئی لیکن میں نے عافیت اسی میں محسوس کی کہ یہ بات ان پر ظاہر نہ ہونے دوں۔ ان کے سامنے میں واقعی ایسی بن گئی جیسے میرا برین مکمل طور پر واش ہو چکا ہے اور میں ان کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی بن چکی ہوں۔"

وہ اپنے اس کارنامے پر بہت خوش نظر آرہی تھی۔ مجھے اندھیرے میں بھی اس کی مسکراہٹ بڑی روشن محسوس ہوئی۔ یہ کام کتنا مشکل تھا' اس کا اندازہ تو حقیقتاً اسی کو ہو سکتا تھا جو اس تجربے سے گزر کر آرہی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "پھر ایک مہینے تک مجھے پرنس تہمینہ کے انداز میں نشست و برخاست اور اسٹیج شو پیش کرنے کی تربیت دی گئی جو میرے لئے زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ کیونکہ میں بنیادی طور پر ڈانسر ہی تھی۔ یہ سب کام کہاں کہاں ہوتے رہے اور کون کون مرد اور عورتیں میرے پاس آتی رہیں' اس طرح کی کوئی بات مجھے نہیں معلوم۔ اس لئے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔"

"لیکن یہ سوال تو میں کئے بغیر نہیں رہ سکوں گا کہ آخر وہ یہ سب تردد کس لئے کر رہے تھے۔۔۔ اور اس کے لئے ان کی نظرِ انتخاب تم پر ہی کیوں پڑی تھی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ اس سوال کا کچھ جواب تو میں نے مختلف لوگوں کی اُچٹتی ہوئی باتوں سے اخذ کیا ہے جو مختلف مواقع پر میرے کانوں میں پڑتی رہیں۔ دوسرے میں نے اپنے طور پر بھی کچھ اندازے لگائے ہیں۔ پرنس تہمینہ تو واقعی اس دنیا میں موجود تھی۔ یہ تو تمہیں بھی معلوم ہوگا۔ وہ ایک ورلڈ کلاس ڈانسر اور ان کی آلۂ کار تھی۔ ان کے لئے بہت بڑے بڑے کام انجام دیا کرتی تھی۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں' کب اور کس طرح وہ ریڈ ڈاٹ سے باغی ہو گئی۔ اس دوران وہ اپنی انفرادی حیثیت میں بھی خاصی طاقتور اور اپنی دانست میں اس پنجرے سے پرواز کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ لیکن پرواز کے آغاز میں ہی اسے ہلاک کر دیا گیا۔ اس کی خوب صورت لاش کو نہ جانے کب بحرالکاہل کی مچھلیاں کھا چکی ہیں۔ نہایت خاموشی سے میں اس کی جگہ لے چکی ہوں۔ اسی کا پاسپورٹ' اسی کے کاغذات اور اسی کی تمام شناختی چیزیں میرے لئے استعمال ہو رہی ہیں۔ لیکن ایک ایک پل میری نگرانی ہو رہی ہے۔ میری ہر بات سنی جاتی ہے۔ اپنی ذرا ذرا سی حرکت کے لئے مجھے ہدایات ملتی ہیں اور میں انہی کے مطابق ہر قدم اٹھاتی ہوں۔"

"لیکن اس رات تم مجھے حسنہ کے نام سے ٹکرائی تھیں۔" میں نے یاد دلایا۔

"وہ میری بوکھلاہٹ کا نتیجہ تھا۔ اس وقت تھوڑی دیر کے لئے گویا ایک قسم کی ہنگامی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ قسمت کا عجیب تماشا تھا کہ مجھے ہر حال میں تم سے دور رہنے کی تلقین کی گئی تھی لیکن تم ہی اس تاریک گلی میں مجھ سے آن ٹکرائے۔ میں چند لمحے کے لئے ہدایات نہیں لے سکی تھی۔ میں نے اپنے ہی طور پر محسوس کیا کہ شاید ان مشکوک سے حالات میں میرا تم سے پرنس تہمینہ کی حیثیت سے ملنا مناسب نہ ہو۔ تم نے اس حیثیت سے مجھے پہچانا بھی نہیں تھا۔ اس لئے فوری طور پر میں حسنہ بن گئی۔ یہ میری غلطی تھی۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں پرنس تہمینہ کی حیثیت سے بھی اپنا تعارف کرا دیتی تب بھی کوئی فرق نہیں پڑنا تھا لیکن بس وہ خواہ مخواہ بوکھلاہٹ میں ایک حماقت سرزد ہو گئی۔ مگر میری اس غلطی کو معاف کر دیا گیا تھا کیونکہ ایک تو اس سے حالات میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا' دوسرے میں تمہارے سامنے اس سے صاف ہی مکر گئی تھی۔ ان کے خیال میں بس اتنا ہی کافی تھا۔ انہوں نے اس معاملے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ اصل اہمیت تو بس اس بلیک باکس کی تھی جو اُن کے ہاتھ میں آتے آتے پھر نکل گیا۔ لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ زیادہ قصور اے ٹن کا تھا جو صحیح وقت پر مقررہ جگہ پر نہیں پہنچ

سکا تھا جہاں مجھے باکس اس کے حوالے کرنا تھا۔"

"اس باکس کا کیا قصہ ہے؟ اس نے ریڈ ڈاٹ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی پریشان کر رکھا ہے۔ آخر اس میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ ہمارے ملک کے نہ جانے کن کن اہم آدمیوں کے ہاتھوں میں سے ہوتا ہوا آخر کار اس ریٹائرڈ ڈی آئی جی احمد شجاع کے پاس پہنچ گیا تھا۔ معلوم تو شاید اسے بھی نہیں تھا کہ اس میں کیا ہے لیکن اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بہت اہم چیز ہے اور اس کے لئے سرد جنگ کی بازیاں لگی ہوئی ہیں۔ اس نے اسے کہیں چھپا دیا تھا۔ احمد شجاع ایک کرپٹ آدمی تھا۔ پہلے اسے کسی ذریعے سے روپے کا لالچ دیا گیا لیکن نہ جانے کیوں وہ نہیں مانا۔ حالانکہ روپیہ اس کی کمزوری تھا۔ ہو سکتا ہے وہ دیکھنا چاہتا ہو کہ پیشکش زیادہ سے زیادہ کتنی اونچی جا سکتی ہے۔

بہرحال اس دوران ریڈ ڈاٹ والوں نے اس پر دوسرا حربہ آزمانے کی کوشش کی۔ اس کی دوسری بڑی کمزوری عورت تھی۔ وہ ہوٹل میں پہلے دن میرا پہلا شور دیکھتے ہی مجھ پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ بے باک اتنا تھا کہ اسی روز میرے میک اپ روم میں تنہائی میں پہلی ملاقات میں ہی اس نے مجھے پیشکش کر دی کہ جب تک میں پاکستان میں ہوں تب تک اگر میں اس کی داشتہ بن کر رہوں تو وہ مجھے کسی بھی بڑے سیٹھ سے زیادہ فائدے پہنچا سکتا ہے۔ اس نے مجھے گارڈن ٹاؤن میں وہ کوٹھی بھی تحفے میں دینے کی پیشکش کی جہاں میں تھوڑی دیر کے لئے تمہیں لے گئی تھی۔

مجھے جو ہدایات ملی ہوئی تھیں ان کے مطابق میں نے اس سے کہہ دیا کہ مجھے اس کی پیشکش قبول ہے مگر اس کے عوض مجھے کچھ بھی نہیں چاہئے' صرف وہ بلیک باکس میرے حوالے کر دے۔ وہ بڑا بدمعاش اور بڑا چکرباز تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح مان گیا۔ اس کی شرط تھی کہ کوئی تیسرا فرد اس معاملے میں ٹانگ نہیں اڑائے گا۔

ریڈ ڈاٹ کے لئے وہ ایک مکھی سے زیادہ اہم نہیں تھا۔ اسے کسی وقت بھی ہلاک کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اندیشہ تھا کہ یہ راز وہ سینے ہی میں نہ لے جائے کہ اس نے بلیک باکس کہاں چھپایا ہوا ہے۔ بہرحال ... پروگرام طے ہو گیا کہ جونہی باکس وہ میرے حوالے کر دے گا میں اس کی دی ہوئی کوٹھی میں جا کر رہنا شروع کر دوں گی اور روزانہ شو ختم کرنے کے بعد وہیں جا کر رات گزارا کروں گی۔ اس نے کوٹھی کی چابیاں بھی مجھے دے دی تھیں۔

اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ حادثے میں مارا گیا۔ باکس وصول کرنے کے بعد اسے ویسے بھی ہلاک کر دیا جانا تھا کیونکہ اس نے ریڈ ڈاٹ والوں کا خاصا ناک میں دم کیا تھا۔ بہرحال اس رات شو پروگرام میں شو ختم کرنے کے بعد اس کے ساتھ روانہ ہوئی۔ اس نے باکس اپنے خیمہ ٹھکانے سے نکال بھی لیا لیکن یہ وقت پر نہ جانے کیوں اس کا ارادہ بدل گیا اور اس نے باکس دینے سے انکار کر دیا۔ مجھے داشتہ بنانے سے بھی کم از کم ظاہری طور پر اس کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ اس کا ذہن بھی کسی شیطانی مشین کی طرح کام کرتا تھا۔ نہ جانے اس کے ذہن میں کیا منصوبہ آیا تھا۔

بہرحال ادھر ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ اسے فن بالکل غیر محسوس طور پر ہمارا تعاقب کرے گا تاکہ احمد شجاع کہیں بدک نہ جائے۔ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ جونہی وہ باکس میرے حوالے کرے گا اسے فن کسی بھی جگہ آگے آ کر وہ مجھ سے چھین لے گا اور احمد شجاع کا بھی قصہ ختم کر دے گا۔ مگر اس سارے پروگرام میں کسی طرح سے گڑبڑ ہو گئی۔ ادھر احمد شجاع کا ارادہ بدل گیا' ادھر اسے فن وقت پر نہیں پہنچ سکا اور مجھے عین وقت پر کام بگڑتے دیکھ کر اپنے کے لئے احمد شجاع سے باقاعدہ دھینگا مشتی کرنا پڑی۔ اور ادھر تم میں آن ٹپکے جس کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یوں سب کچھ گڑبڑ ہو گیا اور ایک بار پھر وہ باکس نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔"

"اوہ..." میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کچھ نہ کچھ گتھیاں تو کھلی تھیں لیکن معما در معما کا سلسلہ ابھی چل رہا تھا۔

"وہ بات تو درمیان میں ہی رہ گئی..." میں نے کہا "کہ انہوں نے تمہیں ہی پرنسس تمینہ بنانے کا تردد کیوں کیا؟"

"ایک تو اس لئے کہ پرنسس تمینہ بھی ایشیائی تھی اور میں بھی۔ اس کی اور میری رنگت' آنکھیں اور سراپا بالکل ایک جیسا تھا۔ میری اور اس کی تمام پیمائشیں تک ایک ہیں۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ میں بھی بنیادی طور پر ڈانسر تھی۔ انہیں میری شکل

ایم اے راحت کے قلم سے

کائنات

دو حصوں میں مکمل

جلد اول =/50

جلد دوئم =/50

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور

میں درحقیقت صرف معمولی سی تبدیلیاں کرنی پڑیں جن سے زمین آسمان کا فرق پڑ گیا۔ میری شکل یکسر تبدیل ہو گئی۔"

"اور اب تم کیا کچھ کر رہی ہو؟" میں نے دریافت کیا۔

"مجھے ابھی کچھ زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ سرحال بڑے بڑے اہم سرکاری' غیر سرکاری لوگ اور بڑے بڑے سیٹھ میرے در دولت' پر قطار در قطار حاضری دے رہے ہیں۔ مجھے ہدایات ملتی رہتی ہیں کہ فلاں سے تعلقات بڑھانے ہیں' فلاں سے رکھائی اختیار کرنی ہے۔ مزید ہدایات ملتی رہیں گی کہ کس کو کس طرح استعمال کرنا ہے' کس سے کیا کام لینا ہے' کس کو کس حد تک آگے آنے کی ہدایت دینی ہے وغیرہ وغیرہ۔"

میں ابھی کچھ اور پوچھنے ہی والا تھا کہ تہ خانے میں بڑے زور کی کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ گہرے سکوت میں وہ آواز کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ ہنی نے خوفزدہ ہو کر میرا بازو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ شاید بے اختیار چیخ اٹھتی لیکن میں نے بروقت اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ہنی کا خوف بھی لجاتی تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے خوف پر قابو پا لیا تھا۔ میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ میرا اندازہ درست ہی تھا۔ وہ اب اتنی خوف زدہ نہیں تھی۔ گہری مگر بے آواز سی سانس لے کر اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

آواز سے مجھے اس کی نوعیت کا کچھ اندازہ تو ہو گیا تھا۔ وہ ٹین کا کوئی ایسا ڈبا گرنے کی آواز تھی جس میں کچھ بھرا ہوا تھا۔ وہ ڈبا گر کر یقیناً دو تین فٹ تک لڑھکتا چلا گیا تھا۔

ایک لمحے کے لئے میں اور ہنی دیوار سے چپکے رہے۔ ایک بار پھر چاروں طرف وہی سکوت چھا چکا تھا۔ میں نے ہنی کو وہیں ساکت رہنے کا اشارہ کیا اور خود دیوار سے الگ ہوئے بغیر گھوم کے بیس منٹ میں داخل ہو گیا۔ ہم بیس منٹ کے دروازے کے قریب ہی کھڑے تھے اور اس دروازے میں کوئی پٹ یا شٹر وغیرہ نہیں تھا۔

میرا پسندیدہ ترین مشین پسٹل میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ میرے لئے یہ ہلکی مشین گن کا کام دیتا تھا۔ مجھے کسی حد تک اندازہ تھا کہ آواز کہاں سے ابھری تھی۔ وہ یقیناً اسٹور اور ڈرائی کلیننگ پلانٹ کے درمیان کوئی جگہ تھی۔ دروازے سے اس کا فاصلہ خاصا تھا اور اندر گھپ اندھیرا تھا۔

اندر بھی میں دیوار سے لگ کر ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ اندھیرے میں انسان دیوار کے ساتھ لگ کر کسی طرف بڑھے تو اس کا ہیولا حرکت کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ میری آنکھیں تو اندھیرے میں دیکھنے کی کافی حد تک عادی تھیں۔ ویسے بھی اب تو مجھے اندھیرے میں کھڑے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسٹور روم کا آہنی دروازہ اور اس پر لگا ہوا بڑا سا تالا مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

لازوال

کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی

کے

شاہکار ناول

خبیث (۵ حصے) -/۲۰۰

برہمچاری -/۱۵۰

درخشاں (۲ حصے) -/۹۰

رقصِ ابلیس -/۱۵۰

آسیب زدہ -/۱۱۰

دستک -/۱۰۰

مکتبہ القریش

اردو بازار لاہور ۲

فون ۷۲۲۴۶۶۵

اسٹور روم اور ڈرائی کلینگ پلانٹ کے کمرے کے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔ گلی سی بنی ہوئی تھی۔ وہاں جو کوئی بھی تھا وہ اس گلی میں موجود تھا۔ میری نامعلوم حس مجھے وہاں کسی کی موجودگی کی اطلاع بھی دے رہی تھی۔

اس گلی کی سیدھ میں پہنچ کر میں نے ایک گھٹنے کے بل کھڑے ہوتے ہوئے جیب سے اپنی ننھی اور چپٹی سی ٹارچ نکالی جو سائز میں میری سب سے چھوٹی انگلی سے بھی چھوٹی تھی مگر اس سے روشنی گویا چمکیلی دھوپ کی ایک تیز دھار کی سی صورت میں نکلتی تھی اور اگر اچانک اندھیرے میں کسی کے چہرے پر پڑتی تھی تو ایک لمحے کے لئے وہ اندھا سا ہو جاتا تھا۔ اسے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے روشنی کا یہ آبشار اس کی آنکھوں سے ہوتا ہوا کھوپڑی کے پار نکل گیا ہے۔ تاہم یہ روشنی زیادہ بڑے دائرے میں نہیں پھیلتی تھی۔

اس تنگ سی گلی میں مجھے ایک ہیولا اسٹور روم کی دیوار کے ساتھ چپکا نظر آگیا۔ مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ وہ جو کوئی بھی تھا' اکیلا ہی معلوم ہوتا تھا۔ اسٹور روم یا دوسرے کمرے کے عقب میں بھی کوئی ہو سکتا تھا لیکن اس کا امکان ذرا کم ہی تھا۔

اس شخص کو دور ہی سے بہتر طور پر دیکھنے کے لئے ٹارچ روشن کرنا ضروری تھا۔ اس کے جواب میں ادھر سے گولی بھی آسکتی تھی۔ اس کے لئے تیار رہتے ہوئے میں نے ناخن سے ٹارچ کا ننھا سا بٹن دبایا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلی ٹریگر کو بھی تقریباً دبا ہی چکی تھی۔ روشنی کی دھار اس شخص پر پڑی مگر جواب میں میری طرف گولی نہیں آئی۔ گھگھیائی ہوئی سی آواز آئی۔

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ شخص دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ اُدھیڑ عمر معلوم ہوتا تھا۔ سفید کرتے پاجامے میں تھا۔ میں اس کی شکل نہیں دیکھ پا رہا تھا مگر مسکین سا ہی آدمی معلوم ہوتا تھا۔ تاہم میں نے اس کی مسکینی پر زیادہ بھروسا نہیں کیا اور مشین پسٹل جیب میں نہیں ڈالا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور ٹارچ روشن رکھتے ہوئے ہی اس کے قریب پہنچا۔ اس نے چہرے سے ہاتھ نہیں ہٹائے۔ اسی دوران میں نے دیکھا جبرائیل کا ایک بڑا سا ڈبا لڑھک کر دوسری دیوار کے پاس پہنچا ہوا تھا۔ وہ ایک طرح کا سیال مکھن سا تھا جو ان دنوں غالباً ہالینڈ سے امپورٹ ہوا کرتا تھا۔ ہم نے جو آواز سنی تھی وہ یقیناً اسی ڈبے کے گرنے اور لڑھکنے کی تھی۔

"کون ہو تم؟" میں نے نیچی آواز مگر سخت لہجے میں پوچھا۔ اس کی کپکپاہٹ کچھ اور بڑھ گئی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اس کے حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

"میں نے پوچھا ہے کون ہو تم؟ ہاتھ ہٹاؤ چہرے سے" میں نے ڈپٹ کر کہا۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹالئے مگر آنکھیں ذرا سی ہی کھول پایا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ہی مرکوز کر دی تھی۔ اس طرح وہ میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"مم..... میں ہوں جی..... ویٹر چراغ دین" وہ دہشت زدہ سی آواز میں بولا۔ میں نے محسوس کیا' یہ جان کر نہ جانے کیوں اس کا خوف شاید ذرا سا کم ہوا تھا کہ میں اسے پہچانتا نہیں تھا۔

"ویٹر کی وردی میں تو نہیں ہو تم" میں نے کہا۔

"ڈڈ..... ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے جناب! گھر جا رہا تھا" وہ لرزتی آواز میں بولا

"یہ خانے کے راستے سے جاتے ہو گھر؟" میں نے ڈپٹ کر پوچھا اور کچھ دور پڑے ہوئے جبرائیل کے ڈبے کی طرف دیکھا۔ اب بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کا تھر تھر کانپنا بجا تھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا' ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ میں نے مشین پسٹل جیب میں رکھتے ہوئے کہا "چوری کرتے ہو اسٹور سے؟"

"روز تو نہیں کرتا سر.....!" وہ ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے لگا "کبھی کبھار ہی کرتا ہوں سر! خدا کے لئے کسی کو نہ بتائیں سر! میں برباد ہو جاؤں گا۔"

"کیسے کرتے ہو چوری؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا "اسٹور روم کے دروازے پر تو صحیح سلامت تالا لگا ہوا ہے؟"

"سر..... وہ..... پہلے یہ تالا فورتھ فلور والے اسٹور روم کو لگایا جاتا تھا" وہ تھوک نگلتے ہوئے اٹک اٹک کر بولا "جہاں ڈیکیوم کلینرز رکھے جاتے ہیں..... اس وقت اس کی ایک چابی میرے پاس بھی رہتی تھی..... پھر یہ یہاں لگا دیا گیا..... ایکسٹرا چابی مجھ سے واپس لینے کا کسی کو خیال ہی نہیں آیا....."

"اور تم نے یہاں چوری شروع کر دی؟"

"قسم سے..... روز نہیں کرتا سر! کبھی کبھار کرتا ہوں۔ خدا کے لئے آپ کسی سے شکایت نہ کریں۔ مجبوراً چوری کرتا ہوں سر۔ میرے گیارہ بچے ہیں۔ بہن بھائی بھی ہیں۔ والدین بھی ہیں۔ میں اکیلا کمانے والا ہوں سر! تنخواہ تھوڑی ہے سر! ٹپ وغیرہ کافی بن جاتی ہے سر! لیکن پھر بھی گزارہ نہیں ہوتا سر!"

میں نے سنا تھا' کئی ویٹر خاصے خوش حال ہوتے تھے لیکن جتنے افراد کا بوجھ وہ اپنے اوپر بتا رہا تھا' عین ممکن تھا اس کا گزارہ نہ ہوتا ہو۔ ہر ایک کے حالات اور مسائل الگ الگ ہوتے ہیں۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ درست ہی کہہ رہا ہو۔

"تم سمجھ رہے ہو کہ چوری کرو گے تو گزارہ ہونے لگے گا؟ گدھے کہیں کے! پھر تو بالکل ہی نہیں ہو گا۔ رہی سہی برکت بھی اڑ جائے گی گھر سے۔ آمدنی کم ہے' گزارہ نہیں ہوتا تو کوئی اور تدبیر کر کوئی اور طریقہ سوچ۔ شاید وہ اس سے زیادہ آسان' اس سے زیادہ بابرکت ہو" میں نے کہا

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب!" وہ دوبارہ ہاتھ باندھتے

ہوئے جلدی سے بولا "جتنی دیر سے یہاں پھنسا کھڑا تھا' یہی سوچ رہا تھا۔ آج زندگی میں پہلی بار اپنی ہی نظر میں اتنی ذلت محسوس کر رہا تھا اور دل ہی دل میں عہد کر رہا تھا کہ آئندہ چوری نہیں کروں گا۔ اب سے میں نے یہ اسٹور سے چیزیں چرا کے گھر لے جانے کا سلسلہ شروع کیا ہے' بچے زیادہ بیمار رہنے لگے ہیں۔ گھر میں زیادہ تنگی ترشی رہنے لگی ہے۔"

"چلو۔ شکر ہے یہ سیدھی سی اور پرانی سی بات تمہاری سمجھ میں آگئی" میں نے کہا۔

"بس جی..... آپ اس مرتبہ مجھے معاف کر دیں اور کسی کو میری رپورٹ نہ کریں۔ ورنہ میں برباد ہو جاؤں گا۔ مجھے تو کہیں نوکری ملنا بھی مشکل ہو جائے گی۔ میرے بچے بھوکے مر جائیں گے"

اس نے میرے پیروں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی لیکن میں نے بروقت اس کا بازو گرفت میں لے کر اسے اس کوشش سے باز رکھا۔

"تم نے ہماری باتیں بھی سنی ہوں گی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا

"کون سی باتیں جی.....؟" اس نے حیرت اور معصومیت سے میری طرف دیکھا۔ یہ حیرت اور معصومیت مجھے مصنوعی نہیں لگی۔ ویسے بھی بیس منٹ کے دروازے سے یہاں تک کا فاصلہ اتنا تھا کہ سرگوشیوں میں کی جانے والی باتیں سنی نہیں جا سکتی تھیں۔ اس کے باوجود میں نے اسے اچھی طرح کھنگال لینا بہتر سمجھا۔

وہ خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولا "صاحب جی! میں تو اس وقت ڈبا لے کر یہاں سے نکلنے ہی لگا تھا جب سامنے سے مجھے آپ آتے دکھائی دیے۔ میں یہاں دبک گیا کہ شاید کسی کو میری چوری کی خبر ہو گئی ہے۔ کوئی مجھے پکڑنے آرہا ہے۔ لیکن آپ بیس منٹ کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ میں سمجھا کوئی صاحب راستہ بھول کر آنکلے ہیں' ابھی چلے جائیں گے مگر پھر آپ باہر ہی نہ جانے کس طرف کو ہو کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے آپ نظر نہیں آرہے تھے لیکن معلوم تھا کہ ابھی آپ گئے نہیں ہیں۔ پھر میں نے سرزد سا سگنال کر جھانک کر دیکھا تو ایک اور ہیولے..... کو آتے دیکھا۔ وہ عورت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے سوچا' شاید اسٹاف میں سے کوئی عورت کسی ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ کبھی کبھار کسی اندھیرے کونے کھدرے میں ایسا چکر ہو جاتا ہے۔ پھر میں نے سوچا' اسٹاف کے لوگوں کو ویسے بھی کہیں نہ کہیں ملنے کے مواقع میسر رہتے ہیں۔ انہیں اندھیرے میں اتنی دور دھکے کھانے کی کیا ضرورت تھی۔ مین بلڈنگ میں ہی بہت سے کونے کھدرے ہیں۔ بس ادھر یہ الجھن تھی اور ادھر خوف تھا۔ آپ دونوں تھے کہ جانے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ لیکن مجھ سے جو قسم چاہے لے لیں' میں نے آپ میں سے کسی کی کوئی آواز نہیں سنی۔"

"تم شروع سے یہیں چھپے کھڑے ہو؟ آگے نہیں آئے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں سر! اس سے آگے تو چھپنے کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ آپ ذرا اندر جھانکتے تو مجھے دیکھ لیتے۔ میں تو جب سے یہیں دیوار سے چپکا کھڑا ہوں۔ آپ میرا خوف اور بے وقوفی دیکھیں..... عقل بالکل خبط ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ دیکھیں کہ اس وقت سے میں ڈبا ہاتھ میں ہی لٹکائے کھڑا ہوں۔ اتنی بھی عقل نہیں آئی کہ اسے آہستہ سے فرش پر ہی رکھ دوں۔ آخر کار ہاتھ شل ہو گیا اور یہ چھوٹ کر گر گیا۔ ورنہ شاید میری چوری نہ پکڑی جاتی۔ آپ آخر کار اپنی باتیں ختم کر کے چلے ہی جاتے" وہ اب کافی حد تک سنبھل چکا تھا لیکن آواز میں لرزش باقی تھی۔

"ہر چوری ایک نہ ایک دن پکڑی جاتی ہے" میں نے کہا۔ "اب تم یہ ڈبا اٹھاؤ اور یہاں سے پھوٹ لو۔ لیکن شرط یہ ہو گی کہ آنکھیں بند کر کے میرا ہاتھ پکڑ کے باہر نکلو گے۔ میں تمہیں پچھلے گیٹ تک چھوڑ آؤں گا" میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اندھیرے میں بھی ہنی عرف پرنس تہمینہ کا ہیولا دیکھے۔

"سر! آپ واقعی کسی سے میری شکایت نہیں کریں گے؟" اسے گویا یقین نہیں آرہا تھا۔

"اب میں تمہیں یہ بات عدالتی کاغذ پر تو لکھ کر دینے سے رہا۔ جلدی سے ڈبا اٹھاؤ" میں نے ٹارچ کا رخ ڈبے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ نقرئی ڈبا تیز روشنی میں آئینے کی طرف چمک رہا تھا۔

"خدا کے لئے یہ ٹارچ بجھا دیجئے" وہ گھگھیایا۔ اسے اب اس ڈبے سے خوف آرہا تھا جس کی خاطر اس نے اتنا خطرہ مول لیا تھا۔

میں نے ٹارچ بجھا دی تو وہ سرگوشی میں بولا "کیا واقعی ڈبا میں لے جاؤں؟"

"ہاں۔ اب یہ آخری چوری تو تمہارے حساب میں لکھی ہی گئی ہو گی۔ اسے تو اب لے ہی جاؤ۔ کوئی باہر پڑا دیکھے گا تو چوری کا راز کھل جائے گا اور چھان بین شروع ہو جائے گی" میں نے کہا۔

اس نے ڈبا اٹھا لیا۔ میں نے احتیاطاً اس کی آنکھوں پر رومال باندھ دیا جو اس نے نہایت سعادت مندی سے بندھوا لیا مگر کانپتی آواز میں بولا "سر! کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ جب رومال میری آنکھوں سے ہٹے تو میں اپنے آپ کو مینجر صاحب کے سامنے کھڑا پاؤں؟"

مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ وہ عمر میں مجھ سے کہیں بڑا تھا لیکن میں نے مشفقانہ لہجے میں کہا "نہیں برخوردار! اطمینان رکھو' ایسا نہیں ہو گا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"

میں اس کا ہاتھ تھام کر لے چلا تو وہ بولا "آپ اتنی زحمت نہ کریں۔ میں آنکھوں پر رومال بندھا ہونے کے باوجود پچھلے دروازے تک چلا جاؤں گا۔ یہاں کا چپہ چپہ میرا جانا پہچانا ہے۔ آنکھیں بند کر کے بھی جا سکتا ہوں۔"

"برخوردار!" میں نے پہلے سے زیادہ شفقت سے کہا "میں تمہیں اس لئے کچھ دور تک چھوڑنے جارہا ہوں کہ راستے میں ایک شخص کھڑا ہوگا۔ وہ کچھ اور سمجھ کر کہیں تمہیں گولی نہ ماردے۔"

مجھے معلوم تھا' تہ خانے کی دیوار کے ساتھ پچھلے حصے کی طرف ٹوٹی کھڑا تھا۔ وہ ایک ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں وہ مین بلڈنگ کی طرف سے آنے والوں پر نظر رکھ سکتا تھا۔ اگر وہ ایسے کسی شخص کو تہ خانے سے رخصت ہوتے دیکھتا جسے اس نے آتے نہیں دیکھا تھا تو تشویش میں مبتلا ہو سکتا تھا۔

میں چراغ دین کو اندھیرے میں ہنی کے سامنے سے لے کر گزرا تو وہ دیوار سے چپکی کھڑی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس نے ہمیں دیکھ کر سانس بھی روک لی تھی۔ اس نے میڈ کی یونیفارم کا دوپٹہ نقاب کی طرح چہرے پر لپیٹ لیا تھا۔ وہ کچھ بولی نہیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بغور دیکھتی رہی کہ میں کیا کررہا ہوں۔ میں نے اسے وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ گیا۔

تہ خانے کے کونے سے گھوم کر ہم زیادہ لمبی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھے۔ کچھ دور تکیے اندھیرے میں ٹوٹی دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔ میں نے اسے "سب ٹھیک ہے" کا اشارا دیا اور چراغ دین کو کچھ آگے تک چھوڑ کر کہا "اب دُم دبا کر جہاں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔ مگر مڑ کر مت دیکھنا۔ کہیں کھوپڑی میں سوراخ نہ ہوجائے۔"

وہ خوف سے کانپتی ٹانگوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ میں واپس ہنی کے پاس آیا تو وہ بہت خوف زدہ تھی اور سارا معاملہ جاننے کے لئے تجسس سے بھی مری جارہی تھی۔

"کھودا پہاڑ' نکلا چوہا۔ اور وہ بھی چوریاں کرنے والا چوہا" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "وہی غربت کی دکھ بھری سی کہانی!"

"کیا قصہ تھا؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

میں نے قصہ اسے سنایا تو وہ بولی "اس نے یقیناً ہماری باتیں سن لی ہوں گی۔ وہ ریڈ ڈاٹ والوں کا جاسوس ہوگا" اس کے لہجے میں بے پناہ خوف تھا۔ شاید برین واشنگ کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی تھے۔ یہ اس کی شاندار قوت ارادی ہی کا کام تھا کہ اتنے سائنٹیفک انداز میں کئی مرحلوں میں کی جانے والی برین واشنگ میں وہ اپنا ذہن بچا کر لے آئی تھی لیکن کوئی بعید نہیں تھا کہ کچھ نہ کچھ گوشوں پر' کچھ خلیات پر کسی حربے' کسی الیکٹرک شاک یا کسی دوا کے تھوڑے بہت اثرات باقی رہ گئے ہوں۔

اس کے رویے سے میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ذہن پر ریڈ ڈاٹ کا بہت زیادہ خوف بیٹھا ہوا تھا۔ شاید وہ جو کچھ دیکھ کر آئی تھی وہ اسے خوف زدہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ میں ابھی ان کے بارے میں کچھ زیادہ آگاہ نہیں تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اکثر آگہی ایک عذاب اور ناآگہی رحمت ہوتی ہے۔

"اب میں اتنا بھی اناڑی اور احمق نہیں ہوں" میں نے تشفی آمیز انداز میں اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "میں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی اسے آنے دیا ہے۔"

"تمہاری یہ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کسی روز تمہیں لے نہ ڈوبے۔ میں اس تصور سے ڈرتی ہوں۔"

"جب ڈوبنا ہوگا ڈوب جائیں گے۔ ابھی سے اس فکر میں دبلے ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے کہا "تم سلسلۂ کلام دیر سے جو ٹوٹ جہاں سے ٹوٹا تھا۔ کیا کہہ رہی تھیں تم؟"

"اب تو مجھے خود بھی یاد نہیں رہا" وہ سادگی سے بولی۔ وہ ایک عجیب عورت تھی۔ زندگی میں جانے کیا کچھ دیکھ چکی تھی لیکن کبھی کبھی اس کے انداز گفتگو میں اتنا بھولپن اور سادگی ہوتی تھی کہ حیرت ہونے لگتی تھی۔ تاثرات سے وہ اسکول کی ایک نوخیز او معصوم لڑکی نظر آنے لگتی تھی۔

"ہاں..... تم بتارہی تھیں کہ مختلف کاموں کے سلسلے میں تمہیں ہدایات ملتی رہتی ہیں۔ کون دیتا ہے ہدایات؟" میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے پوچھا۔

"کبھی کوئی' کبھی کوئی۔ ویسے زیادہ تر ہدایات کمال نے ہنی کی زبانی ملتی ہیں۔" اس نے جواب دیا "لیکن کسی بھی وقت' کسی بھی ذریعے سے میرے لئے کوئی حکم آسکتا ہے۔"

"تمہیں کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ اس تنظیم کا سربراہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سربراہ.....؟" اسے گویا اب میری سادگی پر ہنسی آتے آتے رہ گئی "میں نے بتایا تو ہے کہ مجھے ابھی تک تنظیم کے سربراہ کی سمجھ ہی نہیں آئی۔ سربراہ تو دور کی بات ہے' مجھے ابھی تک یہی اندازہ نہیں ہو سکا کہ جتنے لوگوں سے مجھے واسطہ پڑ چکا ہے ان میں زیادہ اہم کون تھا۔ ایک ہی شخص ایک روز کسی سے احکامات لینے لگتا ہے اور دوسرے روز وہی شخص اسے احکامات دینے لگتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تمہیں تو ان کے مقاصد کا بھی کچھ اندازہ نہیں ہوگا؟" میں نے قدرے مایوسی سے کہا۔

"ہرگز نہیں" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی "البتہ چھوٹے چھوٹے کام جو آنکھوں کے سامنے ہوتے نظر آرہے ہوں ان کے بارے میں اپنے طور پر کچھ اندازہ ہوجاتا ہے کہ فلاں کام کے پیچھے یہ مقصد پوشیدہ ہوگا اور فلاں کے پیچھے وہ۔ مثلاً جب مجھے ہدایت ملتی ہے کہ فلاں سرکاری آفیسر کے دل میں گھر کروں اور کسی ایسے لمحے میں' جب وہ ریشہ خطمی ہورہا ہو' اس سے معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ فلاں نمبر کی فائل کس کی تحویل میں ہے اور اس کی حفاظت کے کیا انتظامات ہیں؟ تو میں سمجھ جاتی ہوں کہ اب اس فائل کی خیر نہیں۔ وہ یا تو چوری ہوجائے گی یا اس کی فلم بنالی جائے گی۔ لیکن میرا کام بہرحال صرف معلومات حاصل کرنے تک ہی

رہتا ہے۔ اس سے آگے دوسرا مرحلہ شروع ہوجاتا ہے جس کے ماہرین الگ ہوتے ہوں گے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس فائل کی نوعیت کیا ہے' اس میں ریڈ ڈاٹ کی دلچسپی کی وجہ کیا ہے' کب اور کس طرح اسے چرایا یا کاپی کی جائے گا اور اس کا کیا مصرف ہوگا۔ یہ کوئی بڑا زبردست نیٹ ورک ہے۔ کوئی بہت بڑی چیز ہے۔ مجھ سے پہلے کسی پرزے کا کام چل رہا ہوتا ہے۔ پھر وہ تک پہنچتا ہے۔ میں بھی ایک چھوٹا سا پرزہ ہوں۔ میں اپنا کام کر دے دیتی ہوں۔ اس کے بعد کسی اور پرزے کا کام شروع ہوتا ہے۔ وہ حرکت میں آجاتا ہے۔ مشینری کیا ہے' اس کی ضرورت کیا ہے' اس کا نقشہ کیا ہے' ظاہر ہے یہ پرزوں کو نہیں معلوم۔"

"لیکن اس طرح تو تمہاری پوزیشن مشکوک ہوسکتی ہے..... تم کو خطرے سے دوچار ہوسکتی ہو کہ ادھر تم نے کسی اعلیٰ سرکاری افسر سے کسی اہم اور خفیہ فائل کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور ادھر وہ فائل غائب ہوگئی۔ اس آفیسر کا خیال تو سیدھا تمہاری طرف جائے گا۔ وہ پلٹ کر تمہاری طرف آسکتا ہے۔ تمہارے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ تمہاری پرفارمنس نیچے طبقے کے لئے سہی' لیکن بہرحال تم عوامی سطح پر کام کررہی ہو" میں نے کہا۔

"یہ تو میں نے محض خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ فائل چوری ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے ایسا نہ ہوتا ہو" وہ بولی "ہوسکتا ہے اس کا صرف کاپی کی جاتی ہو اور کسی کو شبہ تک بھی نہ ہوتا ہو" پھر وہ تھوڑی سی لے کر بولی "ابھی مجھے سرگرم عمل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ ابھی تک تو مجھے کسی خطرے سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ کم از کم مجھے یہ اطمینان تو رہتا ہے کہ میرے گرد ہر طرح کا مکمل نظام موجود رہتا ہے اور میں تمہیں سچی بات بتاؤں۔ میرا یہ اندازہ ہے کہ کوئی اہم سے اہم فائل' خفیہ ترین کاغذات بھی چوری ہوجائیں تب بھی کوئی آفیسر پلٹ کر میری طرف آنے یا کوئی کارروائی کرنے کے بارے میں شاید سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"کیوں؟" میں نے انجان بن کر دریافت کیا۔

"اس سے پہلے اسے اور بہت کچھ سوچنا پڑے گا" وہ گہری سانس لے کر بولی "میں تو پہلے بھی حیران ہوا کرتی تھی' اب اور زیادہ حیران ہوتی ہوں کہ ہم کیسی کرپٹ سوسائٹی میں رہ رہے ہیں۔ کیسی خرابیاں اور عیاشیاں کس کس سطح پر اور کس کس انداز میں رائج ہوئی ہیں۔ کیسی مشینری ہمارے معاشرے کو چلا رہی ہے۔ کیا چلتے رہنا خدا کا واقعی بہت بڑا معجزہ ہے۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد مجھ جیسی گناہ گار عورت کا بھی قدرت پر یقین پختہ ہوجاتا ہے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "کوئی آفیسر پلٹ کر کسی کا جواب طلبی کے سلسلے میں بھلا میری طرف کیسے آسکتا ہے؟ جس نے میرے دربار میں حاضریاں دی ہوں..... نہ جانے کن کن حالتوں میں' کس کس انداز میں وقت گزاریاں کی وہاں' اس کے بارے میں تم پہلے ہی تصور نہیں کرسکتے کہ وہ کتنا کرپٹ ہوگا؟ جہاں جہاں وہ اپنی شرم ناک کمزوریوں اور بدعنوانیوں کے ثبوت چھوڑ کر گیا ہو وہاں وہ چھان بین کے لئے کس منہ سے آسکتا ہے؟"

پھر اسے کچھ یاد آیا اور وہ بولی "تمہارے جو آدمی اپنی دانست میں بڑی رازداری سے میری نگرانی کررہے تھے..... اور وہ یقیناً اپنی لائن کے ماہر بھی ہوں گے۔ ان پر بھی کیمرے مرکوز تھے۔ کمال نے سن میرے بیڈ روم میں بیٹھا ٹی وی پر انہیں دیکھتا تھا۔ تو سوچو کہ عیش و نشاط میں غرق لوگوں کے بارے میں کیا کچھ مواد جمع نہیں ہوتا ہوگا؟ یہ سب بھی محض میرے اندازے ہیں۔ مجھے بتایا کچھ نہیں جاتا۔ لیکن میں خاموشی سے سر جھکا کر ہدایات پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ کن انکھیوں سے حالات کا جائزہ لے رہی ہوں۔ اپنے طور پر کچھ نہ کچھ مشاہدہ کرنے کی کوشش کررہی ہوں اور جو کچھ میری ناقص عقل میں آرہا ہے وہ تمہیں بتارہی ہوں۔"

"تمہاری عقل ناقص نہیں' بڑی کارآمد ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اور شاید آگے چل کر مزید کارآمد ثابت ہو۔"

"تشویش میں مبتلا ہونا اور نتائج کے بارے میں غور کرنا ویسے بھی میری ذمے داری نہیں ہے۔" ہنی اپنی دھن میں بولی "یہ کمال نے سن کا شعبہ ہے۔ مجھے ہدایت ملی ہوئی ہے کہ مجھے کسی بھی قسم کا خطرہ یا اندیشہ محسوس ہو' میں صرف کمال نے سن کو اس کے بارے میں بتادوں۔ میری تو ویسے ہی چوبیس گھنٹے نگرانی ہوتی ہے۔ مجھ سے پہلے تو ہر خطرے کو وہ خود ہی محسوس کرلیتے ہیں اور خود ہی نمٹ لیتے ہیں۔ لیکن اگر ان کی نظر چوک بھی جائے تب بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس طرف سے مجھے اطمینان ہے۔ صرف تم جیسا سرپھرا ہی مگرمچھ کے اس جبڑے میں سر گھسیڑنے کے بعد محفوظ رہ سکتا ہے۔"

"میری طرف یہ لوگ اتنے متوجہ کیوں نظر آتے ہیں؟ میری ذات میں ان لوگوں کی دلچسپی کی وجہ کیا ہے؟ اس سلسلے میں تمہیں کچھ اندازہ ہوا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی "اس سلسلے میں میں کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکی۔ میرے سامنے اب تک جو لوگ آئے ہیں وہ شاید اتنے اہم نہیں تھے کہ ان کے درمیان تمہارے بارے میں کوئی تفصیلی تبادلۂ خیال ہوتا۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ مسکرائی۔ اس کے ہموار' سفید دانت اندھیرے میں موتیوں کی طرح جھلملا اٹھے۔ شریر سے لہجے میں وہ بولی "ہوسکتا ہے میری طرح ریڈ ڈاٹ بھی تم پر بے وجہ عاشق ہو۔ اتنا اندازہ مجھے بہرحال ہوچکا ہے کہ یہ تمہیں ہلاک کرنا نہیں چاہتے۔ ورنہ یہ ان کے لئے ذرا بھی مشکل کام نہیں ہے۔"

میں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "جب تک اوپر والے کو منظور نہیں ہوگا تب تک ان کے لئے کیا' ان سے بھی

بڑی شیطانی قوتوں کے لئے یہ ایک مشکل کام ہی رہے گا۔ جس دن اوپر والا چاہے گا اس دن ایک ٹھوکر سے بھی موت آسکتی ہے۔"

"بہت درویش آگئی ہے طبیعت میں" وہ بولی۔

"ہمیشہ سے ہی درویشی ہے میری طبیعت میں۔ تم نے محسوس نہیں کی ہوگی پہلے۔" میں نے کہا "اس درویشی کی وجہ سے ہی تو میں اندر سے بہت مطمئن رہتا ہوں۔"

"اور بدمعاشیاں بھی ساتھ ساتھ جاری ہیں؟" وہ مسکرائی۔

"بندہ بشر ہوں۔ گناہ گار ہوں۔ اس امید پر جی رہا ہوں کہ کسی روز ان کمزوریوں پر بھی قابو پالوں گا اور کوئی ڈھنگ کا انسان بن جاؤں گا" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

اسے جیسے کچھ یاد آیا "کل جب تم میرے پاس آئے اور تم نے اپنا کارڈ اندر بھیجا تو کمال نے سن کی باچھیں کھل اٹھی تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم نے مجھے پہچان لیا ہے۔ وہ تو یہی سمجھا تھا کہ آخر کار تمہیں بھی میری کشش کھینچ لائی ہے۔ گو کہ انہیں معلوم ہے' عورتوں سے تمہاری دوستی کا معیار کچھ عجیب ہی ہے۔ تم عام دولت مندوں کی طرح عیش پرست نہیں ہو۔ چیپ اور پروفیشنل عورتوں کی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتے۔ اونچے طبقے کی عورتوں کی بارے میں بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی تمہیں کب اپیل کر جائے اور کس کے حسن و جمال کی چکاچوند کے باوجود تم اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو....."

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "میری ذات کا یہ پہلو تو خود میرے لئے بھی گورکھ دھندا ہے۔ اس معاملے میں میں خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکا۔ لیکن میں نے جو اپنا تھوڑا بہت تجزیہ کیا ہے اس سے میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں نے اپنی ذات میں سے بھد کوشش ہر طرح کا کمپلیکس نکال دیا ہے لیکن کہیں نہ کہیں' لاشعور کی گہرائی میں محبت سے محرومی کا کوئی بہت بڑا خلا موجود ہے۔ باپ کے سوا مجھے بچپن سے کسی کی بے غرض محبت نہیں ملی۔ اب میں نہ چاہتے ہوئے بھی کسی ایسی عورت کی طرف جھک جاتا ہوں جس میں ایک خاص قسم کی کشش تو ہوتی ہی ہے لیکن میرے لئے زیادہ اہم بات یہ ہوتی ہے کہ وہ بغیر کسی غرض کے مجھے چاہتی ہے' میری طلب رکھتی ہے۔ مجھ سے کوئی صلہ نہیں چاہتی' کوئی زیادہ لمبی امیدیں وابستہ نہیں رکھتی' مجھ پر قبضہ نہیں جماتی' مجھ سے باز پرس نہیں کرتی۔ مجھے کٹی پتنگ کی طرح چھوڑے رکھتی ہے لیکن جب بھی میں اس کی طرف لوٹ کر آتا ہوں' وہ اسی پرانے خلوص' اسی گرم جوشی' اسی شدت سے مجھے اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ وہ کسی بھی وجہ سے اپنی شدتوں میں کوئی کمی نہیں آنے دیتی۔ قبضہ پرست عورتوں سے بہت گھبراتا ہوں۔"

اس کے بھرے بھرے نیم وا ہونٹوں کے عقب سے سفید دانت اب بھی جھانک رہے تھے۔ اندھیرے میں گھات لگا کر بیٹھی ہوئی کسی شیرنی..... کسی خوب صورت شیرنی کی طرح۔ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں ہی بولی "یہ بھی آوارگی ہی کی ایک قسم ہے۔ کسی ایک کے ہو جاؤ۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔"

"ہاں۔ کوشش تو کر رہا ہوں آج کل کسی ایک کا ہو کر بیٹھنے کی۔ دل تو دہیں انکار رہتا ہے۔ لیکن یہ تن آوارہ نہ جانے کس شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ ہے۔ ہواؤں کے دوش پر ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا ہے۔ لیکن یہ اس وقت تم کیا باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ یہ وقت ہے ایسی باتیں کرنے کا؟ کمال نے سن کے بارے میں کیا بتا رہی تھیں تم؟"

"بس یہی بتا رہی تھی کہ تمہارا کارڈ دیکھ کر کمال نے سن کی باچھیں کھل گئی تھیں کہ چلو اس راستے سے ہی تم ان کے پاس آؤ پھنسو گے۔ تمہاری بشری کمزوریوں کے کچھ ثبوت ہاتھ آجائیں گے تو شاید تم کچھ مجبور ہو جاؤ گے۔ شاید کچھ باتیں ماننے لگو گے۔"

میں ہولے سے ہنس دیا "کیا منوانا چاہتے ہیں وہ مجھ سے؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں" وہ بے بسی سے بولی۔

"اس قسم کے تھرڈ ریٹ ہتھکنڈوں سے میں بلیک میل ہونے والا نہیں ہوں۔ کسی کی خلوت سے چرائے ہوئے جذباتی لمحوں کی تصویروں کو استعمال کرنا بہت ہی چھوٹے بدمعاشوں کی بہت ہی پرانی ٹیکنیک ہے۔ میں ریڈ ڈاٹ سے اس کی توقع نہیں کر سکتا تھا" میں نے حقارت سے کہا۔

"ضرورت ضرورت کی بات ہے" وہ بولی "جہاں جو حربہ کارگر نظر آرہا ہو وہاں یہ وہی استعمال کر لیتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ مقصد پورا ہونا چاہئے' خواہ وہ کسی بھی ذریعے سے ہو۔ اسی لئے بعض اوقات یہ لوگ مجھے مافیا' سی آئی اے اور کے جی بی سے بھی آگے نظر آتے ہیں اور بعض اوقات بقول تمہارے بالکل تھرڈ ریٹ بدمعاش اور گروہ باز لگتے ہیں۔"

"لیکن مجھ پر تو تھرڈ ریٹ حربوں میں انہیں بالکل ناکامی ہوگی کیوں کہ میں نہ تو کوئی اعلیٰ سرکاری آفیسر ہوں..... نہ سیاسی لیڈر ہوں..... نہ وزیر ہوں' نہ سفیر ہوں..... نہ کوئی نام نہاد سماجی رہنما ہوں..... نہ ہی کسی پارسا شخصیت کے طور پر مشہور ہوں۔ حتیٰ کہ میں تو شادی شدہ بھی نہیں ہوں۔ مجھے اس قسم کے راز فاش ہو جانے سے کیا ڈر ہو سکتا ہے!"

"ایک بہت بڑے بزنس مین تو ہو۔ آخر ایک بڑے صنعت کار ایک بڑے بزنس مین کا بھی معاشرے میں اپنا ایک مقام ہوتا ہے" وہ بولی۔

"بزنس..... اور معاشرے میں اپنے اس مقام وغیرہ کی کچھ زیادہ پروا نہیں ہے۔ میں من موجی آدمی ہوں۔ اگر مجھے چیزوں کی زیادہ سے زیادہ پروا محسوس ہوگی تو پھر ان کی حفاظت کرلوں گا۔ اول تو ایسا کوئی امکان نہیں ہے..... لیکن اگر اس سے کبھی مجھے رسوا کرنے کی کوئی کوشش کی جائے اور اس کی کھوپڑی کھوم جائے تو پھر ریڈ ڈاٹ والے ہوں یا کوئی اور انہیں بھی دن میں تارے نظر آجائیں۔"

"منہ دری نہیں ہے کہ کمال نے سن کے ذہن میں وہی خیال آیا ہو جو میں سمجھ رہی ہوں" ہنی بولی "ممکن ہے اس کی باچھیں کسی اور وجہ سے کھلی ہوں۔ بہرحال وہ تمہاری آمد کی اطلاع پاتے ہی بہت خوش ہوا تھا اور اس نے جلدی سے مجھے ہدایت کی تھی "تمہیں سب کچھ بھول بھال کر چوہدری کو قابو میں کرنا ہے۔ اسے اپنا بے دام غلام بنانا ہے۔ اسے اتنا خوش کرنا ہے کہ اپنے ہوش و حواس سے بے گانہ ہو جائے۔ چوہدری ایک آزاد پرندہ ہے" اس کے پر کترنے ہیں" وہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں ان الفاظ کی وضاحتوں میں جاتی۔ تمہارے آنے کے بعد تو بساط ہی الٹ گئی۔"

"اس بے چارے کو معلوم نہیں تھا کہ چوہدری تو پہلے ہی تمہارا بے دام غلام ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جھوٹی باتیں مت کرو۔ سانے خواب مت دکھاؤ۔ مجھے اپنی اوقات معلوم ہے" اس کے لہجے میں یک بیک اداسی اتر آئی۔

"وہی عورتیں تو مجھے اچھی لگتی ہیں جنہیں اپنی اوقات معلوم ہوتی ہے۔ خیر..... کل کی اٹھا پٹخ کے بعد کمال نے سن اور اس ڈھانچے کا ردعمل کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بس انہیں چپ سی لگ گئی تھی۔ تم انہیں ادھ موا چھوڑ کر گئے تھے لیکن شو کے وقت تک وہ دونوں ہوش میں آگئے تھے۔ اس ساری گڑبڑ کے باوجود میں نے وقت پر شو پیش کیا تھا۔ انہوں نے شاید اوپر کسی کو اس واقعے کی رپورٹ کر دی تھی۔ مجھے نہیں معلوم انہیں اوپر سے مزید کیا ہدایات ملی ہوں۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ مجھے صرف یہی تبدیلی نظر آئی کہ وہ پہلے کی نسبت کچھ چپ چپ سے ہیں۔ پہلے کی طرح زیادہ چہک نہیں رہے۔"

"وہ ڈھانچا جسے تم منحوس کے نام سے مخاطب کر رہی تھیں' کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں" اس نے جواب دیا اور میں اس جواب پر کچھ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جلدی سے بولی "میرا مطلب ہے مجھے اس کی اصلیت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ مجھے وہ انڈین لگتا ہے۔ وہ تقریباً گونگوں کی طرح رہتا ہے۔ شاذ و نادر ہی کچھ بولتا ہے۔ وہ میرے لئے نچلے درجے کے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دیتا ہے۔ ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا ہے۔ اس پر کمال نے سن کا حکم چلتا ہے۔ کمال نے سن گویا میرا ذرا اونچے درجے کا باڈی گارڈ ہے۔ منحوس بہت خطرناک آدمی ہے۔ اس کے گھریلو ملازم جیسے حلیے کی وجہ سے بہت سے لوگ اس کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کمال نے سن اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک آدمی ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ کل وہ دونوں کس طرح تم سے مار کھا گئے۔"

"ابھی تمہیں اس طرح کی شاید اور بہت سی حیرتوں کا سامنا کرنا پڑے" میں نے کہا "کیا تمہیں اپنے ارد گرد زیادہ تر ایشیائی لوگ ہی نظر آئے ہیں؟"

"ہاں" اس نے ایک لمحے سوچ کر جواب دیا "شاید اس لئے کہ وہ یہاں زیادہ آسانی سے گھل مل جاتے ہیں۔ ویسے جس سرجن نے میری کاسمیٹک سرجری کی وہ اور اس کا اسسٹنٹ سفید فام تھے۔ بعض لوگ میں نے ایسے بھی دیکھے ہیں جن کی قومیت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ کئی زبانیں اسی طرح روانی اور درست تلفظ کے ساتھ بولتے تھے جس طرح انسان اپنی مادری زبان بولتا ہے۔"

"حیرت ہے!" غیر ارادی طور پر میرا انداز خود کلامی کا سا ہو گیا "یہ کوئی عجیب ہی چکر ہے۔ واقعی اس کا کوئی سر پیر سمجھ میں نہیں آتا۔ معلوم نہیں ہماری ایجنسیاں اور ادارے کیا کر رہے ہیں۔"

"ہمارے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے" وہ تلخی سے بولی "ایجنسیوں اور اداروں کی عین ناک کے نیچے نہ جانے کیا کچھ ہوتا رہتا ہے۔ وہ صرف اس وقت چونکتے ہیں جب بڑے بڑے سانحے ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس وقت وہ رسمی اور کاغذی کارروائیاں یا محض خانہ پُری اور عذر خواہی کرتے ہیں۔ وہ بھی بادل نخواستہ" اسے عورت ہوتے ہوئے بھی اتنا اندازہ تھا۔

"اے نن کے بارے میں تمہیں کیا معلوم ہے؟" آج موقع میسر آگیا تھا تو میں اس سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھا لیکن یہ کوشش کچھ زیادہ سود مند ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ معلومات کے سلسلے میں وہ خود تہی دامن تھی' میری مدد کرتی۔

"اے نن مجھے کوئی انسانی مخلوق نہیں لگتا" وہ کراہیت سے جھرجھری سی لے کر بولی "وہ کوئی عجیب ہی چیز ہے اور شاید عجیب غریب کام ہی اس کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہیں کہ وہ کوئی اہم آدمی ہے یا نہیں۔ ہر عورت کو دیکھ کر رال ٹپکنے لگتا ہے' زبان ایک بالشت باہر لٹک آتی ہے۔ مجھے تو اس کو دیکھ کر گھن آتی ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ میں نے ایک سفید فام عورت کو اس پر فریفتہ دیکھا۔ نہایت مردار قسم کی عورت تھی۔ فٹ سے نکلتا ہوا تو اس کا قد ہوگا۔ لیکن تھی بے پناہ خوب صورت۔ سوئس معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس طرح اے نن کے گلے میں بانہیں ڈالے پھرتی تھی جس طرح کوئی اپنے پالتو بندر کو پھراتا ہے۔ اس کی ہر بات پر اتنا خوش ہوتی تھی کہ میرے سامنے ہی....." اس نے گہری سانس لے کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا "میں تمہیں کیا بتاؤں!"

میرے خیال میں اس نے جتنا بتا دیا تھا اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے پوچھا "تم انہیں کہاں دیکھا کرتی تھیں؟"

"جہاں مجھے کاسمیٹک سرجری اور برین واشنگ کے دوران چند ماہ رکھا گیا تھا۔ وہ دونوں کبھی کبھار وہاں آتے تھے۔ یہ نہیں معلوم کہ کس لئے آتے تھے۔ وہ کوئی بہت بڑا اور عالیشان

پراسرار قسم کا بنگلا معلوم ہوتا تھا۔ میں وہاں صرف دو کمروں تک محدود تھی۔ مجھے کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ بنگلا کہاں واقع تھا یا اس میں آمد و رفت کے راستے کون سے تھے تاہم میں نے وہاں بڑی حیرت انگیز سائنسی ایجادات' الیکٹرونک آلات اور مشینریاں وغیرہ دیکھیں۔"

"کیا وہ ریڈ ڈاٹ کا ہیڈ کوارٹر تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں" وہ جلدی سے بولی "اتنا تو مجھے اندازہ ہو گیا۔ وہ تو ان کے چھوٹے موٹے کاموں کے سلسلے میں زیر استعمال رہنے والی کوئی معمولی اور غیر اہم سی جگہ تھی۔ ہیڈ کوارٹر کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں ہو اور کیسا ہو۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "تم نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں نے تو اسے فن کو کوئی اہم آدمی سمجھ کر اپنے سب آدمیوں کو اس کی تلاش پر لگا دیا ہے۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بالکل بے کار اور بے مقصد اقدام ہے۔ اپنے آدمیوں کا وقت اور انرجی ضائع مت کرو" وہ مربیانہ لہجے میں بولی "اول تو وہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہ بڑی خبیث روح ہے۔ اور اگر ہاتھ آ بھی گیا تو میں نہیں سمجھتی اس سے تمہیں کوئی فائدہ ہو گا۔ جتنی معلومات تمہیں میں نے دی ہیں' اس سے شاید اتنی بھی حاصل نہ ہو سکیں۔ جب کہ میں یہی سمجھتی ہوں کہ ابھی مجھے کوئی کام کی بات نہیں معلوم۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گھڑی دیکھ کر جھرجھری سی لیتے ہوئے بولی "اب میں چلتی ہوں۔ میرے پاس نیند کے یہی چند گھنٹے ہوتے ہیں جن کے دوران مجھے تنہائی میسر ہوتی ہے۔ آج کی نیند میں نے قربان کر دی ہے۔ صبح سے دن بھر نہ جانے کیسے کیسے لوگوں سے ملاقاتیں کرنا پڑیں گی اور کل رات پھر شو پیش کرنا ہے۔ بڑے اعصاب شکن روز و شب ہیں میرے۔ اوپر سے جس میڈ کو اپنی جگہ 'اپنے لباس میں لٹا کر آئی ہوں' اسے گو کہ میں نے بہت بھاری معاوضہ دیا ہے لیکن پھر بھی ظاہر ہے ایک راز اس کے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ میں کچھ دیر کے لئے رازدارانہ انداز میں کہیں غائب ہوئی تھی۔ اگر کسی کو ذرا سا بھی شک ہو گیا تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ یا ویسے ہی اگر اس میڈ نے محسوس کر لیا کہ یہ کوئی بہت اہم چکر ہے اور وہ بک گئی' کسی خوف یا کسی لالچ کے تحت اس نے یہ بات اگل دی تو نہ جانے میرا کیا حشر ہو گا۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ اتنا بھی مت ڈرو" میں نے اسے تسلی دی۔

"اب تم مجھ سے ملنے یا سامنے آنے کی کوئی دانستہ کوشش مت کرنا" وہ بولی "تمہارا ردعمل ایسا ہونا چاہئے جیسے تمہیں یقین آ گیا ہے کہ میں ہنی نہیں' پرنس تہمینہ ہی ہوں۔ اگر کبھی اتفاقاً سامنا ہو بھی جائے تو اجنبی ہی بنے رہنا۔ میں کوشش کروں گی کہ ان لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے اگر کوئی کارآمد اطلاع تمہیں بھجوا سکوں تو کسی نہ کسی ذریعے سے بھجوا دوں۔ اس میں میری زندگی کو خطرہ لاحق ہو گا لیکن میں یہ کام کرنے کی کوشش کروں گی۔ مگر تم از خود مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی قطعاً کوشش نہ کرنا۔ کل کے واقعے کو گویا تم بالکل بھول جاؤ گے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے مضطربانہ لہجے میں ہدایات کا سلسلہ جاری رکھا "بلکہ میرا تو تمہیں یہی مخلصانہ اور دوستانہ مشورہ ہے کہ ان سے الجھنے کا سلسلہ ہی بند کر دو۔ ان سے نمٹنا میرے تمہارے بس کی بات نہیں لگتی۔"

"میں کہاں الجھتا ہوں" میں نے کہا "الجھتے تو وہ خود ہیں۔ لیکن اب میرا تجسس اتنا بڑھتا جا رہا ہے کہ شاید میں تمہارے مشورے پر عمل نہ کر سکوں۔"

"مردوں میں..... خصوصاً تم جیسے مردوں میں یہ بڑی خرابی ہوتی ہے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "کہ انہیں جس کام سے منع کرو اسے وہ ضرور کرتے ہیں۔"

"کیا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا؟ تم زندگی بھر اسی طرح ان کے اشاروں پر ناچتی رہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو مجھے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا" پھر وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسی "اور تم یہ "زندگی بھر" کے الفاظ اس طرح استعمال کر رہے ہو جیسے یہ کوئی بہت لمبی مدت ہو۔ ان کے ساتھ رہتے ہوئے زندگی بہت مختصر بھی ہو سکتی ہے۔ خصوصاً مجھ جیسی عورت کی۔ جو دل سے ان کی وفادار بھی نہیں ہے اور جس کی اہمیت بھی ان کی نظر میں صرف جسم و جوانی کی کشش کے حوالے سے ہے۔ اگر یہ مجھ سے خوش رہیں تب بھی جسم کے چراغ کی لو مدھم پڑتے ہی میری اہمیت ختم ہو سکتی ہے اور مجھے تمام چھوٹے موٹے رازوں سمیت دریا برد کیا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا ہے کہ شاید اصل پرنس تہمینہ کو محض غداری کی وجہ سے غرق نہ کیا گیا ہو بلکہ اصل وجہ یہی ہو کہ اس کی عمر ڈھلنے لگی ہو۔ بھیڑیوں کے لئے اس خوبصورت شکار میں کشش نہ رہی ہو۔"

"تم بیٹھی بیٹھی اس قسم کے دل شکن اندازے مت لگاتی رہا کرو۔ جو نامعلوم ہے اسے نامعلوم ہی رہنے دو۔ بعض اوقات ناآگہی بڑی رحمت ہوتی ہے" میں نے کہا۔

"میں نے تمہیں اصل بات تو بتائی ہی نہیں کہ فی الحال میرے ان لوگوں کے ساتھ رہنے کی سب سے بڑی وجہ کیا ہے" وہ گہری سانس لے کر گویا کہانی کے اصل موڑ کی طرف آتے ہوئے بولی۔

"وہ وجہ بھی بیان کر ڈالو' اس سے پہلے کہ صبح کی سپیدی نمودار ہو جائے" میں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یاد ہے تم اصل میں میرے دوست کس طرح بنے تھے اور میرے خلوص کا یقین تمہیں کب آیا تھا؟" اس نے گویا میری آنکھوں میں کچھ تلاش کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ ایسی باتیں میں بھولا نہیں کرتا۔" میں نے ان بھولے

لمحوں کا تناؤ اپنے اعصاب پر محسوس کرتے ہوئے کہا "میرے خون کے پیاسے میرے تعاقب میں تھے اور میں غیر ارادی طور پر بازار حسن کے ایک مکان میں جا گھسا تھا۔ وہاں تم عروسی لباس پہنے مسہری پر بیٹھی نظر آئی تھیں۔ تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے پناہ دی تھی۔ پھر اپنا پستول دیا تھا۔ فرار ہونے کے لئے اپنی گاڑی دی تھی۔"

"اور میں نے تمہیں ایک ننھی سی کہانی بھی سنائی تھی۔ کہ کم عمری میں کوئی مجھے پہلی پہلی محبت کے خوب صورت خواب دکھا کر عروسی لباس پہنا کر سیج پر بٹھا کر گیا تھا کہ میں تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔ مگر وہ لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ وہ شادی ادھورے خواب کی طرح رہ گئی تھی۔ اسی دن کی یاد منانے کے لئے میں عین اسی وقت' اسی کمرے میں' وہی عروسی لباس پہن کر ہر سال جا کر بیٹھتی تھی کہ شاید کبھی کسی معجزے کے تحت وہ لوٹ ہی آئے۔ مگر وہ معجزہ رونما نہیں ہوا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے یہ بھی۔ تم نے مجھے بتایا تھا" میں نے کہا۔

"وہ بھی مجھے ان لوگوں کے درمیان نظر آ گیا ہے۔ وہ ان کے لئے کام کر رہا ہے" وہ سر جھکا کر افسردہ لہجے میں بولی۔ میں بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

وہ سرگوشی سے بھی دھیمے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی "جس بنگلے میں مجھے رکھا گیا تھا' وہ بھی وہاں موجود تھا۔ میرا دل اسے دیکھ کر دھڑکنا بھول گیا۔ اس وقت تو میری برین واشنگ کا عمل بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھے دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔ وفا کی ڈسی ہوئی ایک طوائف زادی نے برسوں اس کا انتظار کیا تھا....." اس کی سرگوشی بھی ٹوٹ گئی۔

"لیکن کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے مضبوطی سے یوں میرا ہاتھ تھام لیا جیسے ڈوبنے سے بچنے کے لئے سہارا تلاش کر رہی ہو۔ دو آنسو آتش سیال کی طرح میرے ہاتھ پر گرے مگر وہ مسکراتے ہوئے بولی "اس نے مجھے پہچانا ہی نہیں۔ میری ساری گرم جوشی' میری ساری باتوں کے جواب میں وہ یوں بت بنا رہا جیسے میں کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہوں اور میری زبان اس کی سمجھ سے باہر ہے۔"

"وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟" میں نے جلدی سے اسے سوال میں الجھانے کی کوشش کی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا دل قطرہ قطرہ لہو رو رہا تھا مگر وہ ایک بہادر عورت تھی' مسکرائے جا رہی تھی اور اپنی آنکھیں خشک رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

"میں تمہیں اس کے بارے میں بتا نہیں سکی تھی" وہ اپنی سرگوشیوں میں گھلے ہوئے کرب کو دباتے ہوئے بولی "وہ بھی طوائفوں کے ایک بہت اونچے اور معروف گھرانے کا لڑکا تھا لیکن لڑکپن سے ہی بہت حساس اور ذہین تھا۔ کم عمری میں ہی یہ سوچ کر بازار حسن سے بھاگ گیا تھا کہ وہ اس خاندانی پس منظر کا بوجھ اٹھا کر زندگی کا سفر طے نہیں کر سکے گا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایک بہت اچھے خاندان میں پہنچ گیا۔ ایک آسودہ حال مگر بے اولاد جوڑے نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور بہت شاندار طریقے سے تعلیم دلائی تھی۔ ہمارے ہاں تو ابھی تک الیکٹرونکس کی تعلیم عام نہیں ہے مگر وہ ان دنوں امریکا سے الیکٹرونکس کا کوئی کورس کر کے آیا تھا۔"

دوپٹے سے میرے ہاتھ سے اپنے آنسوؤں کی نمی صاف کرتے ہوئے وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی "خون کی کشش جوش مارتی تھی تو وہ کبھی کبھی چھپ کر بازار حسن آیا کرتا تھا۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے لیکن ایک بڑی بہن اس وقت تک بازار میں تھی اور بڑی اونچے درجے کی رقاصہ تھی۔ وہ چاہتی بھی تو بازار حسن نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ بہت بڑے بدمعاشوں کے قبضے میں تھی اور ویسے بھی اس پر بازار حسن کی چھاپ اتنی گہری ہو چکی تھی کہ باہر کی دنیا میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔"

"اچھا..... تو اسی پس منظر کی وجہ سے وہ تمہیں جانتا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ بچپن سے ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار تھے۔ اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تو میں بھی بعد میں اپنی [illegible] کو لے کر بازار حسن سے نکل آئی تھی۔ میری ماں بہت اچھی [illegible]۔ اس نے کبھی میری کوئی بات نہیں ٹالی۔ اس جیسی مائیں شریف زادوں کو بھی کم ہی نصیب ہوتی ہیں۔ وہ جتنا عرصہ زندہ رہی' صرف میرے لئے زندہ رہی۔"

[illegible] کوئی اس والہانہ انداز میں اپنی ماں کا تذکرہ کرتا تھا تو میرے سینے میں دل گویا ایک تاریک خلا بن جاتا تھا جس میں آندھیاں سیٹیاں سی بجانے لگتی تھیں جیسے رات کے پچھلے پہر ان دیکھے صرف زادوں میں کوئی طوفان سر اٹھا رہا ہو۔

"میں نے پوچھا تھا وہ..... تمہارا محبوب وہاں کیا کر رہا تھا؟" میں نے جلدی سے اپنا سوال دہرایا۔

"وہ شاید وہاں بعض الیکٹرونک آلات اور کچھ عجیب قسم کے کمپیوٹرز کی نگرانی پر مامور تھا۔ میرا خیال ہے اس کی حیثیت بس ایک مستری کی سی تھی اور وہ ایک روبوٹ کی طرح ادھر ادھر آتا جاتا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا چہرہ ہمیشہ تاثرات سے عاری رہتا تھا۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح تمہیں نہ پہچاننے اور اپنے ماضی سے بے خبر ہونے کی اداکاری کر رہا ہو جس طرح تم کل تک میرے سامنے کر رہی تھیں؟" میں نے خیال ظاہر کیا "اس نے اسی میں عافیت اور مصلحت سمجھی ہو؟"

"مجھے اس سے تنہائی میں بھی بات کرنے کا موقع بارہا ملا۔ وہ الیکٹرونک کا ماہر ہے۔ وہ چاہتا تو اس طرح مجھ سے بات کرنے کا موقع نکال سکتا تھا کہ ہماری آواز کہیں اور نہ سنی جا سکتی۔ مگر اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے چہرے پر تو کوئی تاثر ہی

نہیں ابھرا۔ اور پھر تم کیا سمجھتے ہو..... ایک عورت کے جس کے تصور میں ایک عمر گزار دی ہو' کیا وہ اتنا بھی محسوس نہیں کر سکتی کہ ذہنوں کا رابطہ نہیں ہو رہا۔ میں اس کے دل میں تھی ہی نہیں۔ میری کوئی تصویر' میری یاد کا کوئی نقش اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں بھی محفوظ نہیں تھا۔ وہ گویا مکمل طور پر ایک نیا انسان تھا۔ نیا جنم لے کر آیا تھا۔ صرف شکل گویا کسی کی غلطی سے پرانی لگی رہ گئی تھی۔"

"ہو سکتا ہے وہ تمہارے محبوب کا ہم شکل ہو۔ اس کا کوئی جڑواں بھائی تو نہیں تھا؟" میں نے جلدی سے کہا۔

"میں تمہیں کسی فلم کی کہانی نہیں سنا رہی" وہ دھیرے سے ہنس کر بولی۔ اس خاموش ہنسی میں بھی زہر تھا۔

"نام کیا تھا اس کا؟" میں نے پوچھا۔

"عدنان" اس نے آہ بھرنے کے سے انداز میں نام لیا۔

"جہاں تم نے اسے دیکھا تھا وہاں اسے اسی نام سے پکارا جا رہا تھا؟"

"وہاں میرے سامنے اسے صرف ایک بار پکارا گیا تھا۔ سفید فام سرجن کے سفید فام اسسٹنٹ نے اسے "مسٹر جے" کہہ کر پکارا تھا۔ انداز تحکمانہ تھا۔" اس نے بتایا۔

"ہو سکتا ہے وہ مسٹر جے ہی ہو" میں نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔

"کوئی اسے جے کہے یا کے۔ مجھے معلوم ہے وہ میرا عدنان تھا" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"تم اس کا ذکر بھی جذبوں کی ان شدتوں کے ساتھ کرتی ہو۔ ادھر مجھ سے بھی عشق جتاتی ہو۔ یہ کیا چکر ہے؟" میں نے یونہی ذرا اسے ٹٹولنے کی خاطر پوچھا۔

"میرا اصل عشق وہی ہے۔ وہی بچپن کی محبت جو کبھی انسان کے دل سے جدا نہیں ہوتی' چاہے وہ کتنا بھی آوارہ ہو جائے' کتنی ہی دنیا گھوم لے' کتنا ہی بڑا بن جائے۔ وہ جو ایک میٹھی سی خلش دل میں نہاں رہتی ہے وہ تو بس زندگی بھر کے لئے ہوتی ہے نا۔ عدنان نظر آیا تو سب بھولے بسرے خواب جاگ اٹھے۔ ساری تشنگی' ساری محرومیاں' تمام ادھوری تمنائیں..... سب کچھ از سر نو زندہ ہو گیا۔ عدنان تو میری کتاب زندگی کا پہلا ورق ہے نا۔ اسے تو میں پھاڑ کر نہیں پھینک سکتی۔ کتاب بے شناخت سی ہو جاتی ہے۔"

"اور میں کیا ہوں..... اسپیئر وہیل؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

وہ دھیرے سے اسی بے آواز انداز میں ہنسی "تم بھی مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ لیکن تم سے میرا عشق بس کچھ ایسا ہی ہے جیسے انسان کو دمکتا چاند اچھا لگتا ہے..... فلک بوس چوٹیوں پر جمی ہوئی برف اچھی لگتی ہے..... شام ڈھلے چناروں پر آگ کی طرح دہکتے سے پھول اچھے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسی کسی چیز سے بھی انسان کو عشق ہو جاتا ہے مگر وہ اس کی رسائی میں نہیں ہوتی' اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان چیزوں کو پا نہیں سکتا لیکن محض اسی بنا پر وہ ان سے منہ نہیں موڑ سکتا۔"

"میں بددعا نہیں دے رہا..... ویسے ہی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک امکان سا ظاہر کر رہا ہوں۔ یا تو شاید تم عدنان کو کبھی نہ سکو" میں نے کہا۔

"بس ایک موہوم سی امید تو ہے۔ اس کے کچھ بھولے بسرے وعدے تو میرے پاس امانت ہیں۔ تمہارا تو میرے پاس کوئی وعدہ امانت نہیں۔ چاند ستارے' برف پوش چوٹیاں اور چنار کسی سے وعدے نہیں کرتے کہ وہ ان کے ہو جائیں گے۔ تم نہ جانے کن منزلوں کے راہی ہو اور میرا انجام نہ جانے کیا ہونا ہے۔ لیکن تم یہ سب باتیں کیوں کر رہے ہو؟ تمہیں کون سا زندگی کے سفر میں میرے ساتھ چلنے کی آرزو ہے؟" وہ ایک بار پھر میری آنکھوں کے راستے دل میں جھانکتے ہوئے بولی۔

میں کچھ نہ بولا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں اس سے کوئی ایسا وعدہ نہیں کر سکتا تھا جسے پورا کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اپنی منزل تو مجھے خود معلوم نہیں تھی۔ میں نے کسی بھی عورت سے کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کیا تھا۔ میں اچھا انسان تھا یا برا۔ لیکن میں نے کسی جھوٹے جذبے کا کھوٹا سکہ کسی اچھی یا بری عورت کے ہاتھ چلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ رفاقتیں جیسی بھی تھیں' انہیں معلوم تھا۔ میں نے ان میں کبھی جھوٹے سچے وعدوں کے رنگ بھرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"چپ ہو گئے نا؟" وہ میری ناک چھوتے ہوئے شریر سے لہجے میں بولی "ڈرو مت۔ میرا تمہارے گلے پڑنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں تو ویسے ہی پوچھ رہی تھی کہ آخر تم مجھے اتنا کیوں کرید رہے ہو؟ جب کہ تمہارا اس کھنڈر کو محل بنانے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"میں بھی بس ویسے ہی کرید رہا تھا" میں نے اسی کے سے لہجے میں جواب دیا "کسی سمے کی گتھیاں سلجھتے دیکھ کر ایک نامعلوم سی خوشی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس نے کچھ دریافت کیا ہے۔"

"میں اب چلتی ہوں" اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی "گھبراہٹ سے اس میڈ کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔ دو گھنٹے کا معاوضہ میں نے اسے دس ہزار دیا ہے۔ اس کی دس ماہ کی تنخواہ۔"

"یہ معاوضہ اس کا ہارٹ فیل ہونے سے بچانے میں کافی معاون رہے گا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "معاوضے کے ذکر پر یاد آیا..... تمہیں کوئی مالی پریشانی تو نہیں ہے؟"

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اسی بے آواز انداز میں ہنسنے لگی۔

"کیا میں نے کوئی بہت احمقانہ بات پوچھ لی ہے؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"مجھے تمہارے پوچھنے کے انداز پر ہنسی آ رہی ہے۔ تمہیں جو

کچھ پوچھنا ہوتا ہے' بہت سادہ اور دو ٹوک انداز میں پوچھ لیتے ہو۔"

"دوستوں کے سامنے انسان کو اسی طرح رہنا چاہئے۔ خواہ مخواہ کے پیچ و خم ڈالنے سے کیا فائدہ" میں نے کہا۔

"نہیں۔ مالی مسئلہ کوئی نہیں ہے" وہ سنجیدگی سے بولی "بہت روپیہ ہے۔ بلکہ خرچ کرنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ روپے پیسے کے معاملے میں انہوں نے مجھے بہت بااختیار بنا رکھا ہے۔ اور پھر میرا اپنا سب کچھ بھی انہوں نے پہلے ہی نہ جانے کب میرے نئے نام پر ٹرانسفر کر دیا ہے۔ ہنی کی حیثیت سے میں اپنی کوکھ بھی پرنسس تہمینہ کو بیچ چکی ہوں۔ کوئی مجھ سے کسی چیز کا حساب طلب نہیں کرتا۔ کم از کم اس اعتبار سے وہ مجھے خوش اور مطمئن رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"دوبارہ اس بنگلے میں جانا نہیں ہوا جہاں تمہیں چند ماہ رکھا گیا تھا؟"

"نہیں" اس نے جواب دیا۔

"پھر تو شاید عدنان سے بھی دوبارہ سامنا نہیں ہوا ہو گا؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر بولی "لیکن میں اس کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔ کم از کم یہی معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ ان ماہ و سال میں اس پر کیا گزری۔ اور کیا اب بھی وہ کسی طرح مجھے اور اپنے آپ کو شناخت کرنے کی کوشش کرتا ہے؟ کتنی عجیب بات ہے..... دو انسانوں سے ان کی شخصیت اور ان کا ماضی چھین لیا گیا ہے۔"

اس نے جانے کے لئے قدم بڑھایا۔ وہ میڈ ہی کی معمولی سی جوتیاں پہنے ہوئے تھی۔ میں نے اس کے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اتنی دیر تک دیوار سے لگ کر کھڑی رہنے سے تمہارا تو حشر خراب ہو گیا ہو گا؟"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی "میں بڑی سخت جان ہوں۔"

"ہاں' کافی حد تک اندازہ ہوتا جا رہا ہے" میں نے تسلیم کیا اور اس کے ساتھ چلنے کے لئے قدم بڑھایا۔

وہ مجھے روکتے ہوئے بولی "تم یہیں کھڑے رہو۔ میرے جانے کے بعد جانا۔ اور میری ہدایات یاد ہیں نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد کچھ دیر تک میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ وہ میری سوچوں کو کچھ نئی راہیں ضرور دے گئی تھی۔ ریڈ ڈاٹ کے بارے میں میں کسی نہ کسی حد تک روشنی میں ضرور آیا تھا۔ میں غیر جذباتی اور حقیقت پسند ہو کر سوچنے کی کوشش کرتا تھا تو یہی سمجھ میں آتا تھا کہ مجھے ان کے بارے میں زیادہ جارحانہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے حق میں بہتری تھی کہ صرف چوکنا رہوں اور جب کبھی وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں تو اپنے آپ کو اس سے بچاؤں۔ کسی حد تک دفاعی حکمت عملی پر ہی کاربند رہوں۔ وہ کون تھے' کیا تھے' ان کے مقاصد کیا تھے' کہیں کسی بہت بڑی سازش کے تانے بانے تو نہیں بنے جا رہے تھے؟ یہ جاننا میرا نہیں' ایجنسیوں کا کام تھا۔

میں اپنے آپ کو بار بار یاد دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ مجھے بس ایک بڑے بزنس مین ہی کی طرح سوچنا چاہئے تھا اور اپنے طور طریقے بھی کافی حد تک ویسے ہی رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے تھی۔ زیادہ سے زیادہ بس یہی مناسب تھا کہ میں اپنے آپ کو عام دولت مند یا بزنس مین کی طرح آسان شکار نہ بننے دوں اور اگر کوئی میرے ساتھ کسی بھی سطح پر زیادتی کی کوشش کرے تو اسے منہ توڑ جواب دوں یا ساتھ ساتھ تھوڑا بہت سبق سکھا دوں۔ اس سے آگے نہ بڑھوں۔ اسی حکمت عملی کو اپنی مستقل پالیسی بنا لوں۔

لیکن میرے اندر جو ایک اور افضل چوہدری چھپا بیٹھا تھا وہ مجھے اتنا نپا تلا انداز اختیار نہیں کرنے دیتا تھا۔ وہ مجھے کبھی کبھی جذباتی بھی بنا دیتا تھا۔ کبھی میرے تجسس کو بھی بڑھا دیتا تھا اور کبھی میرے دل میں یہ تشویش بھی پیدا کر دیتا تھا کہ کہیں میرے ملک کے خلاف تو کچھ نہیں ہو رہا؟ لوگوں کے پاس دولت زیادہ آتی ہے تو ان کے دل میں وطن کی محبت کم ہو جاتی ہے۔ ان میں سے بہت سے ملک کے بارے میں بہت بے فکر ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی اپنی فکریں دور ہو چکی ہوتی ہیں۔ وہ کچھ اس انداز میں سوچنے لگتے ہیں کہ خدانخواستہ ملک کو کچھ ہو بھی گیا تب بھی ہمارے لئے کیا فرق پڑتا ہے۔ بھاگ کر فلاں ملک چلے جائیں گے۔ فلاں ملک میں ہمارا پیسہ ہے' فلاں ملک میں بنگلا ہے' فلاں ملک میں کاروبار ہے' فلاں ملک میں کمپنی میں شیئرز ہیں' فلاں ملک میں ولا ہے' فلاں ملک میں بچے پڑھ رہے ہیں۔

میرا معاملہ الٹ تھا۔ میرے پاس دولت آئی تھی تو مجھے اس ملک میں اپنی جڑیں زیادہ گہری محسوس ہونے لگی تھیں۔ میں سوچتا تھا' میں جو کچھ بھی ہوں اوپر والے کی مہربانیوں اور اس ملک کی عنایات کے سبب ہوں۔ جس شاخ پر بیٹھ کر میں نے کسی طرح بھی اپنا آشیانہ بنایا ہے' جسے میں اپنی ایمپائر سمجھتا ہوں' اب اس شاخ کا بھی کچھ نہ کچھ خیال رکھنا میرا فرض ہے۔ بس اسی انداز فکر کی وجہ سے مجھے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں بھی تشویش ہونے لگتی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اتنے بڑے پیمانے پر اتنے منظم اور خفیہ انداز میں نامعلوم قسم کی سرگرمیاں کسی بڑے اور منفی مقصد کے لئے ہی ہو سکتی ہیں۔ ہنی نے جو کچھ بتایا تھا اس سے میرے شبہات کچھ اور قوی ہوئے تھے۔

انہی سوچوں میں الجھا ہوا میں دیوار کے قریب سے ہٹ کر بنتا گلی کے سامنے آیا تاکہ ٹوٹی مجھے دیکھ لے اور سمجھ جائے کہ میں اب رخصت ہو رہا تھا۔ اب وہ بھی جا سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہاں کھڑے ہونے کے بعد میں عمارت کے سامنے والے حصے کی طرف چل دیا۔

گھر آکر میں لمبی تان کر سو گیا۔

دوسری صبح میں دیر تک سوتا رہا اس لئے خوب دن چڑھے تیار ہو کر آفس جانے کے لئے گھر سے نکلا۔ میں اپنی گلی کے موڑ پر پہنچا ہی تھا کہ ایک نوجوان ایک کوٹھی کے سبزے کی باڑھ کی اوٹ سے نکل کر یوں سامنے آگیا جیسے کسی نے اس کی کمر پر لات رسید کر کے اسے میری گاڑی کے سامنے دھکیل دیا ہو۔ میں نے فوراً بریک لگائی۔ دیو ہیکل گاڑی خفیف سے دھچکے کے ساتھ رک گئی۔

گاڑی کا ینڈر اس کے گھٹنوں کو تقریباً چھو رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس طرح ہاتھ ہلا رہا تھا جیسے ابھی میں کافی دور ہوں اور وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر مجھے رکنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ اس کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ پھر مجھے گلی کے کونے سے اس کی زرد فوکسی بھی جھانکتی نظر آگئی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا تھا۔ آج تو کسی کالی بلی نے میرا راستہ بھی نہیں کاٹا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں گھر سے نکلتے ہی یہ نوجوان آ ٹکرایا تھا۔

جی ہاں..... وہ وسیم احمد تھا! گلاس کے پیندے جتنے موٹے موٹے عدسوں والی اس کی عینک پھسل کر عین ناک کی نوک پر آئی ہوئی تھی' قمیص پتلون سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ میں وہ کوئی ڈبا سا اٹھائے ہوئے تھا۔

میں نے گاڑی ایک طرف دیوار کے ساتھ لگائی اور دروازہ کھول کر گردن نکالتے ہوئے کہا "وسیم! اگر تم نے گاڑی کے نیچے آکر ہی مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو کم از کم مجھے بتا تو دیا ہوتا۔ میں تمہیں گاڑی کے نیچے آنے کا صحیح طریقہ بتاتا جس میں تکلیف کم ہوتی اور نتیجہ سو فیصد یقینی نکلتا۔"

"سر! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں" وہ قریب آتے ہوئے شرمیلے سے لہجے میں بولا۔

"آپ کی وجہ سے تو مجھے نئی زندگی ملی ہے۔ میں بھلا خودکشی کا کیسے سوچ سکتا ہوں۔"

"اگر نئی زندگی مل ہی گئی ہے تو اس پرانی زندگی کو کیوں ضائع کرنے پر تل گئے ہو۔ اسے بھی سنبھال کر رکھ لو۔ کبھی کام آجائے گی" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "مجھے تو یہی محسوس ہوا تھا کہ تم خودکشی کرنا چاہتے ہو جس کے لئے تم نے کافی عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے میری گاڑی کا انتخاب کیا ہے کیوں کہ یہ تقریباً ٹرک جتنی بھاری ہے۔ اس کے نیچے آکر تمہاری قیمتی ہڈیوں کے سلامت رہنے کے امکانات ذرا کم ہی ہوتے۔"

"سر! میں کروں..... مجھے اسی طرح آپ کو راستے میں روکنا پڑتا ہے۔ آپ کا اسٹاف میرے اور آپ کے درمیان سماج کی دیوار بنا رہتا ہے" یکدم ہی اس کی آواز گلوگیر سی ہو گئی۔ "دفتر جاتا ہوں تو آپ کے ریسپشن والے آگے نہیں جانے دیتے۔ گھر آتا ہوں تو آپ کے سیکیورٹی گارڈز وغیرہ گیٹ سے اندر قدم بھی نہیں رکھنے دیتے۔ بلکہ آپ کو میری آمد کی اطلاع بھی نہیں بھجواتے۔ منت سماجت سے بھی موم نہیں ہوتے۔"

"اصل میں وہ لوگ کافی تجربہ کار ہو گئے ہیں۔ انہیں شکل دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون کام کی بات کرنے آیا ہے اور کون صرف وقت ضائع کرنے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"سر! کیا میں شکل سے اتنا ہی احمق لگتا ہوں کہ کوئی مجھ سے کسی کام کی بات کی توقع ہی نہیں رکھتا؟" اس نے دردناک سے لہجے میں پوچھا اور خود ہی اپنی ٹھوڑی تھام کر چہرہ گویا میرے معائنے کے لئے ذرا آگے کو کر دیا۔ اس کے اس انداز پر مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ اس کی شخصیت میں یہی بڑی عجیب بات تھی۔ ایک پل میں اس پر غصہ آنے لگتا تھا اور ایک پل میں ترس۔ یا پھر خواہ مخواہ ہی ہنسی آجاتی تھی۔ خصوصاً اس کی حد سے زیادہ سنجیدگی اور "دردناکی" مضحکہ خیز لگتی تھی۔ ورنہ جہاں تک اس کی شکل صورت کا تعلق تھا' اچھا بھلا ہینڈسم لڑکا تھا۔ خرابی بس یہی تھی کہ اس کی شکل پر حد سے زیادہ حماقت برستی تھی' خصوصاً موٹے موٹے شیشوں کے عقب میں اس کی آنکھیں الو کی آنکھوں کی طرح گول گول نظر آتی تھیں۔ ان کی وجہ سے چہرے پر زیادہ مضحکہ خیزی جھلک آتی تھی۔

"نہیں۔ نہیں" میں نے فوراً نرمی سے کہا "شکل صورت تو اللہ کی بنائی ہوتی ہے۔ محض شکل دیکھ کر کسی کے بارے میں اندازے لگانے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہئے۔ میں تو ویسے ہی مذاق کر رہا تھا۔"

وہ یک دم جیسے اپنا سارا "رنج و غم" بھول گیا اور شکایت کے بجائے بڑے مان سے بولا "آپ کو معلوم ہے..... میں ایک گھنٹے سے آپ سے ملاقات کے انتظار میں کھڑا ہوں؟ آپ کے گارڈ نے جب مجھے بھگا دیا تو میں یہاں آکر کھڑا ہو گیا۔ میں باڑھ کے پیچھے اس لئے چھپا ہوا تھا کہ کہیں آپ بھی مجھے دور سے دیکھ کر گاڑی ریورس کر کے بھگا نہ لے جائیں۔ ویسے بائی دا وے چوہدری صاحب.....! یہ دنیا مجھے دیکھ کر بھاگتی کیوں ہے؟"

"دنیا کو ابھی تمہاری قدر نہیں معلوم" میں نے تسلی دینے کے انداز میں کہا "بہرحال تم دل چھوٹا نہ کرو۔ ایک وقت آئے گا کہ دنیا اس قدر ناشناسی پر پچھتائے گی۔ تم یہ بتاؤ کہ دن چڑھتے ہی میری طرف کیسے دوڑ پڑے؟"

"مبارک باد دینے اور شکریہ ادا کرنے آیا تھا سر!" وہ نہایت مسرور لہجے میں بولا "آپ کے لئے مٹھائی بھی لایا تھا" اس نے ڈبا گاڑی میں ہی میرے گھٹنوں پر رکھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے باز رکھا۔ تب ہی میں نے دیکھا کہ وہ واقعی مٹھائی کا ایک بڑا سا ڈبا تھا۔ اس پر گفٹ پیکنگ کا سرخ ربن بھی لپٹا ہوا تھا۔

"مٹھائی.....! کس بات کی مٹھائی لائے ہو بھائی؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ میں ابھی تک گاڑی سے نہیں اترا تھا۔

"وہ..... چھوٹے چچا قتل ہو گئے تھے نا....."

"تو اس خوشی میں تم مٹھائی بانٹ رہے ہو؟" میں نے اب خاصی حیرت سے پوچھا۔

"ویسے تو سر..... دنیاداری اور شرع کی شرم نہ ہو تو اس دنیا میں ان گنت لوگ ایسے ہیں جن کی موت پر مٹھائی بانٹنا بڑا اچھا کام محسوس ہو" اس کے چہرے پر بدستور حماقت برستی رہی مگر بات وہ گہری کر گیا۔ پھر جلدی سے بولا "لیکن بہرحال میں مٹھائی اس لئے نہیں بانٹ رہا۔ آپ کو تو سمجھ جانا چاہئے تھا۔ میں تو اس خوشی میں آپ کے لئے مٹھائی لایا ہوں کہ میں چھوٹے چچا کے قتل کے الزام میں ملوث ہونے سے بچ گیا ہوں۔ میں نے آپ کے مشورے کے مطابق کہانی گھڑ کر ابا جی کو اور پولیس کو سنائی۔ پولیس نے تو ویسے ہی مجھ میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی....."

"مبارک ہو" میں نے کہا "جس کے کمرے میں قتل ہوا ہو اور پولیس اس آدمی میں دلچسپی نہ لے وہ مبارک باد کا مستحق ہوتا ہے۔"

"خیر مبارک۔ خیر مبارک" وہ ایک بار پھر تھوڑا سا شرما کر بولا "لیکن اصل مبارک باد کے مستحق تو آپ ہیں۔ اسی لئے میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے کی وجہ سے ہی میں اس چکر سے بچا ہوں۔ ابا جی کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ انہیں یقین آگیا کہ چھوٹے چچا گھپلے کر رہے تھے۔ اب تو ان کے سامان کی تلاشیاں لی جا رہی ہیں۔ ان کے کاغذات دیکھے جا رہے ہیں۔ اور ہر قدم پر نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ وہ کارخانے کو میرے اندازوں سے زیادہ چونا لگا رہے تھے۔ تبھی تو کارخانہ اتنا زیادہ منافع نہیں دے رہا تھا جتنا اسے ابا جی کے اندازوں کے مطابق دینا چاہئے تھا۔"

"چلو..... دیر سے ہی سہی لیکن بہرحال ابا جی کی آنکھیں تو کھل گئیں" میں نے کہا۔

"آنکھیں کیا کھلی ہیں بلکہ چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں" خوشی کے مارے وسیم احمد کے قدرے پچکے ہوئے گالوں پر سرخی آگئی تھی۔ "میرے لئے تو کئی طرف سے خوشیوں کا سامان ہو گیا ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اتنی بہت سی خوشیوں کو کس طرح سنبھالوں۔ ادھر پولیس نے میری کہانی پر یقین کر لیا کہ چھوٹے چچا کسی ڈاکو کے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں اور انہوں نے مجھے اس میں ملوث کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ادھر چھوٹے چچا کا کانٹا درمیان سے نکل گیا جنہوں نے میری غمزدہ زندگی کو مزید غمزدہ بنا رکھا تھا۔ سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ ابا جی کی نظر میں میری کچھ قدر ہو گئی ہے۔ فی الحال تو ان کا رویہ کافی بدل گیا ہے۔ شاید انہیں احساس ہو گیا ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں بہرحال انسان کی اولاد پھر بھی اس کی زیادہ ہمدرد ہوتی ہے۔ چاہے وہ نکمی ہو' احمق ہو' نکھٹو ہو۔ جیسی بھی ہو۔ لیکن اولاد بہرحال اولاد ہوتی ہے۔"

"چلو..... تمہاری پانچوں گھی میں ہو گئیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میری زندگی میں تو جیسے راتوں رات انقلاب آگیا ہے چوہدری صاحب!" وہ تشکر بھرے لہجے میں بولا "لیکن یہ سب آپ کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ آپ پارس ہیں سر! جسے بھی آپ چھو لیتے ہیں وہ سونا ہو جاتا ہے۔ جس دن سے میں آپ کی صورت دیکھ کر آپ کے پیچھے لگا ہوں' میری زندگی میں انقلابات ہی انقلابات آئے چلے جا رہے ہیں۔ میرے تو حالات ہی بدل گئے ہیں۔ آپ بہت کمی انسان ہیں سر! جو آپ کے ساتھ لگتا ہے اس کی بھی قسمت بدل جاتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کے پاؤں چھو لوں..... بلکہ چوم لوں۔"

وہ سچ مچ میرے پیروں پر جھکنے لگا۔ میں نے جلدی سے پاؤں سیٹ کے نیچے گھسا لئے اور اسے کندھے سے پکڑ کر سیدھا کرتے ہوئے کہا "انسانوں کے ساتھ اتنی زیادہ عقیدت کا اظہار اچھا نہیں ہوتا۔ اچھے برے اتفاقات تو زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے سر! انسان کے حق میں بعض لوگ اچھے ثابت ہوتے ہیں اور بعض برے۔ کسی کا ساتھ میسر آتا ہے تو بگڑے کام سنورنے لگتے ہیں اور کوئی ساتھ لگتا ہے تو اچھے بھلے کام بھی اوندھے ہو جاتے ہیں۔ آپ کا ساتھ میرے لئے بہت مبارک ثابت ہوا ہے سر!" اس کا جوش عقیدت کم نہیں ہو رہا تھا۔

"لیکن میں نے تو تمہارا کسی معاملے میں صحیح معنوں میں ساتھ دیا ہی نہیں بھائی! میں نے ٹیلی فون پر تمہیں صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ اگر حادثاتی طور پر چھوٹے چچا تمہارے ہاتھوں مارے ہی گئے ہیں تو تم اب اپنا بیان اس طرح دینا" میں نے ملامت سے کہا "اور اگر تم میں تھوڑی سی عقل ہوتی تو جو کچھ میں نے کہا ہے' وہ بات خود بخود تمہارے ذہن میں بھی آجاتی۔"

"میرے پاس عقل ہوتی تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا سر!" ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "آپ نے فون پر جو کچھ کہا تھا' میرے لئے بس وہی کافی تھا۔ اسی نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا' کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔ سر! اس خوشی میں آپ مجھ غریب کی طرف سے تھوڑی سی مٹھائی تو کھائیں" اس نے پھرتی سے ڈبا کھولا اور میرے سامنے کر دیا۔

"بس بھائی! بہت شکریہ۔ میں مٹھائی نہیں کھاتا" میں نرمی سے ڈبا اپنے سامنے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اس میں جانے کس کس نمونے کی مٹھائی بھری ہوئی تھی۔ مٹھائی کھانا درکنار' ایک عرصے سے میں نے مٹھائی دیکھی بھی نہیں تھی۔

"سر! آپ تھوڑی سی کھا لیں۔ ڈائیٹنگ وغیرہ کی فکر نہ کریں۔ آپ کون سا ماپے کا شکار ہیں۔ آپ تو ماشاءاللہ ایسے کسرتی جسم کے مالک ہیں۔ آپ کو تھوڑی بہت مٹھائی کھا لینے سے کیا پڑ جائے گا" اس نے اصرار کیا۔

"یہ بات نہیں ہے یار! میں کبھی ڈائیٹنگ وغیرہ کے چکر

نہیں پڑا۔ میں تو بڑا لکڑ ہضم، پتھر ہضم قسم کا انسان ہوں۔ بس ویسے ہی اس وقت دل نہیں چاہ رہا۔ میں ابھی ابھی نگڑا ناشتا کر کے نکلا ہوں" میں نے مٹھائی سے جان چھڑانے کی ایک اور کوشش کی۔ ساتھ ہی محسوسات پر ایک عجیب سی لہر آ کر گزر گئی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے بچپن یاد آ گیا تھا۔ کتنا شوق ہوا کرتا تھا مجھے مٹھائی.... اور خصوصاً برفی کھانے کا۔ گاؤں میں چھپے حلوائی کے چھوٹے اور گندے سے شوکیس میں تھوڑی سی رنگ برنگی مٹھائی بجی رہتی تھی جو لعل، یاقوت اور زمرد سے زیادہ خوبصورت لگتی تھی۔ دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ کتنا دل چاہتا تھا ساری مٹھائی ہڑپ کر جانے کو۔ اس وقت تو سستی بھی بہت تھی۔ مگر اس وقت سستے داموں خریدنے کے لئے بھی جیب میں پیسے نہیں ہوتے تھے۔

کیا چیزیں تبھی خوب صورت لگتی ہیں جب رسائی میں نہیں ہوتیں؟ اب ضرورت پڑنے پر شہر بھر کی دکانوں کی مٹھائی خرید کر بھی کسی تقریب میں تحفے کے طور پر بھجوائی جا سکتی تھی۔ لیکن اب مٹھائی کھانے کو ایک عرصے سے دل نہیں چاہا تھا۔ کبھی یاد بھی نہیں آئی تھی۔ اب تو کبھی کبھی شدت سے دل چاہتا تھا کہ کوئی چیز ایسی بھی ہو جسے دیکھ کر منہ میں پانی آئے اور اس کا حصول مشکل نظر آئے۔ کرب نارسائی کی لذت سے بھی آگاہ رہنا چاہئے۔ اسے بھولنا نہیں چاہئے۔

"سر! آپ تھوڑی سی کھالیں۔ مجھ غریب کا دل رہ جائے گا" وسیم ایک بار پھر گھگیایا "قسم سے..... مجھے کوئی اتنے پیار، محبت اور عقیدت سے زہر بھی کھلائے تو میں کھالوں۔"

میں نے برفی کا ایک ٹکڑا اٹھالیا اور دھیرے دھیرے چباتے ہوئے اس میں بچپن کی گم گشتہ لذتیں تلاش کرنے لگا مگر وہ اس میں نہیں تھیں۔ وسیم کے اس قدر مجبور کرنے پر میں نے اس کی فرمائش تو پوری کر دی تھی لیکن اب وہ ڈبا ہاتھ پر ٹکائے اپنے مخصوص احمقانہ انداز میں آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے بولا "اس کا کیا کروں سر؟ یہ تو میں آپ کے لئے لایا تھا۔"

"تم ایسا کرنا وسیم!" میں نے کچھ سوچتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا "تھوڑی سی زحمت کرنا۔ اسی دکان پر چلے جانا جہاں سے تم نے مٹھائی خریدی ہے۔ ذرا دیر کے لئے وہاں کھڑے ہو جانا اور گزرتے ہوئے لوگوں کو ذرا غور سے دیکھنا۔ ان میں تمہیں کوئی نہ کوئی ایسا کم عمر لڑکا ضرور نظر آئے گا جو شوکیس میں سجی ہوئی رنگا رنگ مٹھائیوں کو حسرت کی نظر سے دیکھتا ہوا گزرے گا۔ اس کی نظروں کی مایوسی بتا رہی ہوگی کہ وہ کچھ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ یہ ڈبا میری یا اپنی طرف سے اسے دے دینا۔ بلکہ اگر تم وہاں زیادہ دیر کھڑے ہو سکو اور تمہیں ایسے کتنے ہی بچے اور بچیاں نظر آئیں ان سب کو میری طرف سے ایک ایک اتنا ہی بڑا ڈبا خرید کر دے دینا۔ تمہارے پاس اگر پیسے نہ ہوں تو مجھ سے لے جاؤ۔"

موٹے موٹے عدسوں کے عقب میں اس کی گول گول سی آنکھیں ایک لمحے کے لئے ساکت ہو گئیں۔ مجھے ایک بار پھر شبہ ہوا کہ ان آنکھوں کی گہرائیوں میں اتنی حماقت نہیں تھی جتنی سطحی طور پر نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ میری بات اس کے دل پر جا کر لگی تھی۔ جب کہ حساس باتیں ایسے احمقوں کی سمجھ میں نہیں آتیں جیسا وسیم نظر آتا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ گویا کسی خیال سے چونکتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بولا "آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ آپ فکر ہی نہ کریں سر! میں ابھی مین مارکیٹ جا کر دکان کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں سارا دن وہیں کھڑا رہوں گا اور جو بھی ایسا بچہ نظر آیا جو مٹھائی کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہوگا، میں اسے ایک ڈبا لے دوں گا۔ پیسوں کی آپ فکر نہ کریں سر! آج کل میرے مالی حالات کچھ ٹھیک ہی چل رہے ہیں۔ آئندہ مزید ٹھیک ہونے کی امید ہے کیوں کہ ایک تو ابا جی کا رویہ ٹھیک ہوتا نظر آ رہا ہے دوسرے اب چھوٹے چچا والی جگہ مجھے ہی سنبھالنا ہوگی۔ میرا عہدہ، اہمیت اور تنخواہ..... سب کچھ بڑھ جائے گا۔ اب تو فکر کی کوئی بات ہی نہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اب جاؤ..... عیش کرو..... اور مجھے اجازت دو" میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ایسے نہیں سر...!" وہ جلدی سے بولا "یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ نے جو کام بتایا ہے وہ تو میں کر ہی دوں گا۔ لیکن یہ کوئی کام تو نہ ہوا سر...!"

"کیا مطلب؟" میں نے اسے گھورا۔

"مطلب یہ کہ سر...." وہ نظریں چراتے ہوئے سر کھجا کر بولا۔ "مجھے کوئی ٹھیک ٹھاک قسم کا کام بتائیے۔ کوئی مشکل قسم کا کام۔ مجھے اپنی خدمت کا موقع دیجئے۔ میں آپ کے لئے کوئی اہم کام انجام دینا چاہتا ہوں جس پر آپ خوش ہو کر میری پیٹھ ٹھونکیں۔ مجھے شاباش دیں۔ میرے دل میں آپ کے لئے عقیدت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ محبت کا طوفان اٹھ رہا ہے۔ میں آپ کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ آپ میری کچھ رہنمائی کر دیجئے نا۔"

"تم میرے لئے اہم کام انجام دو گے؟" میں نے اسے گھورا۔

"سر! آپ بھی میرے ابا جی کی طرح یوں بے اعتباری سے میری طرف نہ دیکھیں۔ آپ تو انسانوں کو پرکھنے والے آدمی ہیں۔ میری شکل پر نہ جائیے سر! میری روح میں جھانک کر دیکھئے۔ کسی نے آج تک میری صلاحیتوں کو سمجھا ہی نہیں۔ کسی نے آج تک مجھ سے کوئی صحیح کام لینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کم از کم آپ تو میرے ساتھ ایسا مت کیجئے۔ مجھے احمق سمجھ کر میری ہر بات مت ٹالئے۔ مجھے دھکے مت دیجئے" اس کی آواز فوراً ہی گلوگیر ہو گئی۔

یکدم اتنے بہت سے الیہ ڈائیلاگز کی بوچھاڑ میرے ہوش

دینے کے لئے کافی تھی۔ میں نے جلدی سے مشفقانہ لہجے میں کہا "تمہیں احمق ہرگز نہیں سمجھ رہا۔ اور دھکے بھلا میں تمہیں دے رہا ہوں؟ میں تو گاڑی میں بیٹھا ہوں۔"

"میری مراد جذباتی دھکے دینے سے تھی سر!" وہ رومال نکال کر آنکھوں پر رکھتے ہوئے ہلکی ہلکی سی شوں شوں کے ساتھ بولا "دھکے الفاظ ہاتھوں سے ہی نہیں دیے جاتے سر! دھکے لفظوں سے بھی دیے جاتے ہیں۔ اور وہ ہاتھوں کے دھکوں سے زیادہ دل شکن ہوتے ہیں۔"

میں ایک بار پھر ایک لمحے کے لئے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ آخر کار میں نے مزید ملامت سے کہا "تم غلط سمجھ رہے ہو وسیم! مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم ایک بہت باصلاحیت نوجوان ہو۔ کوئی بھی کام کر سکتے ہو۔ لیکن اس وقت تمہیں بتانے کے لئے کوئی خاص کام میری سمجھ میں ہی نہیں آ رہا۔ میرے پاس ہر طرح کے کام کرنے کے لئے سیکڑوں آدمی ہیں۔ اس وقت کوئی ایسا کام نہیں ہے جو التوا میں پڑا ہو۔ جیسے ہی مجھے تمہارے لائق کوئی کام نظر آیا، میں اب وہ اپنے کسی آدمی کے سپرد کرنے کے بجائے تمہارے ہی سپرد کروں گا۔"

"سر! مجھے معلوم ہے آپ بڑے آدمی ہیں۔ سیکڑوں افراد آپ کا حکم بجا لانے کے لئے اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔ پھر بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ میرے لئے آپ کوئی ذمے داری ہی تلاش نہ کر سکیں۔ سر! آپ ڈپلومیٹک انداز میں مجھے ٹرخانے کی کوشش نہ کریں۔ خدا کے لئے کوئی خدمت میرے سپرد کر دیں تاکہ اسے انجام دے کر میرے دل کو کچھ سکون ملے۔"

"تم کس قسم کا کام کرنا چاہتے ہو میرے لئے؟" آخر کار میں نے تنگ آ کر پوچھا۔ وہ واقعی جان کو آ جانے والی چیز تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ یہیں سڑک پر کھڑے کھڑے بھوں بھوں کر کے رونا نہ شروع کر دے۔

وہ پُرامید سا ہو کر بولا "سر! کوئی بھی ایسا کام جس میں ذرا مشکلات ہوں.... سنسنی ہو..... تھوڑا سا ایڈونچر ہو..... کچھ مزہ تو آئے سر! یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جو میں گزار رہا ہوں۔"

"کام میں خواہ جان کا خطرہ ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔

"بے شک ہو سر!" وہ بلا تامل بولا "آپ کے کام کے لئے جان بھی حاضر ہے۔ آپ حکم تو کریں۔"

اس سے جان چھڑانے کی میرے ذہن میں اچانک ہی ایک تدبیر آئی تھی۔ میں نے اپنے بریف کیس سے اے نن کی ایک تصویر نکالی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لو۔ اس شخص کو شہر میں تلاش کرو اور زندہ یا نیم زندہ حالت میں میرے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرو۔"

گو کہ جب سے ہنی نے مجھے بتایا تھا کہ ریڈ ڈاٹ میں اے نن کی کوئی خاص اہمیت معلوم نہیں ہوتی تھی تب سے میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ دینے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ لیکن فی الحال کچھ دن کے لئے کچھ لوگوں کو اس کی تلاش میں لگائے رکھنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ جو اس قسم کے معاملات میں تربیت یافتہ نہیں تھے ان کی ذرا تربیت ہو جاتی۔ اور جو تربیت یافتہ تھے انہیں ذرا مشق ہو جاتی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اے نن کی تصویر دیکھ کر وسیم جیسا آدمی بھی کچھ مایوس سا نظر آنے لگا۔ اس کا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑتا نظر آیا۔ وہ ذرا بجھے بجھے سے لہجے میں بولا "یہ کون ہے سر؟ کیا بندر وغیرہ نچاتا ہے؟"

"بندر تو یہ خود نظر آتا ہے برادرم! یہ انسانوں کو نچاتا ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تم بھی دیگر سب لوگوں کی طرح اس کی شکل دیکھ کر دھوکا کھا گئے ہو۔ حالاں کہ مجھے اس معاملے میں تم سے ذہانت کی توقع تھی۔ خود سوچو کہ جب میں بذات خود یہ تصویر تمہارے حوالے کر رہا ہوں اور تمہیں اس شخص کی تلاش پر مامور کر رہا ہوں تو یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہوگا۔"

"ہاں..... یہ بات تو ہے سر!" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا اور اس کی گول گول سی آنکھوں میں تھوڑی سی چمک آ گئی "آئی ایم سوری! ابھی چند لمحے پہلے آپ نے ہی مجھے زندگی کا اہم اصول بتایا ہے کہ محض شکل دیکھ کر کسی کے بارے میں رائے قائم نہیں کرنا چاہئے۔"

الماس ایم اے کے ایمان افروز قلم سے

نورالدین زنگی

600 سے زائد صفحات

قیمت:-/250

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور

مجھے اس کو ذہن نشین کرلینا چاہئے۔ خود مجھے ہی لے لیجئے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں شکل سے احمق نظر آتا ہوں۔ شکل دیکھ کر ہی لوگ میرے بارے میں حتمی رائے قائم کرلیتے ہیں کہ میں احمق ہوں۔ میرے والدین تک کی رائے یہی رہی ہے۔ اسی لئے تو آج تک کسی نے بھی کبھی کوئی اہم کام میرے سپرد نہیں کیا۔"

وہ کم از کم اس حد تک تو غنیمت تھا کہ اسے اپنے بارے میں معلوم تھا' وہ شکل سے احمق نظر آتا ہے۔ ورنہ آج تک تو میں نے کسی کو یہ اعتراف کرتے بھی نہیں سنا تھا' خواہ شکل پر حماقت کے ڈونگرے برس رہے ہوں۔ اس اعتراف کے بعد تو وہ مجھے عقل مند معلوم ہونے لگا تھا۔

"بے فکر رہو" میں نے اس کا بازو تھپتھپایا "میری تمہارے بارے میں یہ رائے ہرگز نہیں ہے کہ تم احمق ہو۔ اسی لئے تو میں ایک انتہائی اہم کام تمہارے سپرد کررہا ہوں جس میں میرے تمام آدمی ابھی تک ناکام ہیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو ایک طرح سے میں بھی ناکام ہوچکا ہوں۔ دو ایک مرتبہ تو یہ چھلاوا میری گرفت سے بھی نکل چکا ہے۔"

"آپ مطمئن رہیں سر! میں اس مردود کو لا کر آپ کے قدموں میں ڈالنے کے لئے جان بھی لڑادوں گا" وہ کسی حد تک فلمی انداز میں بولا۔

"اس حد تک جان لڑانے کی ضرورت نہیں کہ جان ہاتھ سے ہی چلی جائے" میں نے جلدی سے کہا "اپنی جان بچاتے ہوئے اسے قابو میں کرنا ہے۔ اگر یہ ممکن نظر نہ آئے تو بے شک اس کام کو کسی بھی مرحلے پر چھوڑ دینا۔ یہ اب اتنا بھی ضروری نہیں کہ اس کے لئے تم اپنی جان گنوادو" مجھے اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ میں تو اس احمق سے جان چھڑانے اور اسے تھوڑا بہت سبق سکھانے کی نیت سے یہ کام بتا رہا تھا لیکن کہیں وہ اپنی کسی حماقت کی وجہ سے اے نن کے ہاتھوں ضائع ہی نہ ہوجائے۔ احمق ہونا اب کوئی جرم بھی نہیں تھا کہ اس بے چارے کو اتنی بڑی سزا دے دی جاتی۔

"ٹھیک ہے سر" وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر سیلوٹ کرتے ہوئے بولا "بس آپ سمجھ لیں کہ میں اس لمحے سے ہی اپنے مشن پر ہوں۔"

"خدا حافظ" میں نے جلدی سے کہا اور گاڑی آگے بڑھائی۔ مجھے اپنی اس حرکت پر خود ہی ہنسی بھی آرہی تھی۔ یہ میں نے اچھا سلسلہ شروع کردیا تھا کہ جو کوئی بھی مجھ سے کوئی "اہم" کام مانگتا تھا' میں اس کے ہاتھ میں اے نن کی تصویر تھما دیتا تھا۔ عارضی طور پر ان مضطرب و بے چین نوجوانوں سے پیچھا چھڑانے کا یہ اچھا طریقہ میرے ذہن میں آگیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو[illegible] ن [illegible] سیم احمد جیسے نوجوانوں کو تو شاید اے نن اپنے قریب پھٹکنے بھی نہ دیتا۔ لیکن بہرحال ان نوجوانوں کو دھندے [illegible] لگائے رکھنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

اس کے بعد میرے تین دن خالص کاروباری مصروفیات میں گزرے۔ کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ جذباتی "محاذوں" پر بھی سکوت چھایا رہا۔ کراچی سے راحیلہ کا کوئی فون نہ آیا' جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ناراض تھی۔ میری بدقسمتی تھی کہ بارہا ارادہ کرنے کے باوجود میں اسے فون نہیں کرپایا تھا۔ اب میں نے محسوس کرلیا تھا کہ صرف فون کرنے سے بات بنے گی بھی نہیں۔ اب میرا خود جا کر اسے منانا ضروری ہوگیا تھا لیکن اپنا شیڈول دیکھ کر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس روز کراچی جاسکوں گا۔

ستارہ نے بھی فون نہیں کیا تھا۔ پہلے تو وہ شہر سے باہر بھی شوٹنگ کے لئے جاتی تھی تو فون کرلیتی تھی۔ شاید اس کی انا بھی مجروح ہوگئی تھی۔ کوئی مناسب موقع دیکھ کر مجھے جا کر اس کی مجروح انا پر بھی محبت کا مرہم رکھنا تھا۔ طاہرہ خانم البتہ مست ملنگ عورت تھی۔ وہ ایک مرتبہ خود میرے گھر آگئی تھی۔ اس کی طرف اگر میں پچھلے دنوں میں زیادہ توجہ نہیں دے پایا تھا تو اس نے ہلکے پھلکے انداز میں تھوڑا بہت شکوہ ضرور کیا تھا لیکن منہ پھلا کر نہیں بیٹھی تھی۔ اسے زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔ اسے زندگی کے بہتے دریا میں سے مسرتوں کا جتنا حصہ مل جاتا تھا وہ اسی میں خوش رہتی تھی' دل کھول کر اسی سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ اور جو ہاتھ نہیں آتا تھا' اس کا غم نہیں کرتی تھی۔ اس جیسی بے فکری اور ہر حال میں خوش رہنے والی عورتیں میں نے کم ہی دیکھی تھیں۔ لیکن پارٹیوں وغیرہ میں وہ کسی پروفیسر کی طرح سنجیدہ' بلکہ کسی حد تک رنجیدہ سی عورت نظر آتی تھی۔ محفل میں اور خلوت میں وہ بالکل دو مختلف عورتوں کی طرح تھی۔ اپنے کارخانوں میں وہ ایک سخت گیر اور خشک مزاج مالک اور ایڈمنسٹریٹر کا تاثر رکھتی تھی۔

میرے جو دن کاروباری مصروفیات میں گزرتے تھے' انہیں میں "ہموار" دن میں ہی شمار کرتا تھا۔ گو کہ ان دنوں میں بھی سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی اور قدم قدم پر بہت سی الجھنیں بھی درپیش ہوتی تھیں۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا ہی محسوس کرتا تھا۔ کاروباری مصروفیات اور الجھنیں مجھے پریشان نہیں کرتی تھیں کیوں کہ میں نے اپنی زندگی کا ایک بنیادی اصول طے کرلیا تھا۔ کہ مجھے روپیہ کمانا ضرور ہے لیکن روپے کے لئے اپنے آپ کو ہلکان نہیں کرنا ہے' پیسے پر جان نہیں دینی ہے۔ اس لئے میں تمام تر مصروفیات اور الجھنوں کے باوجود پرسکون رہتا تھا۔

لیکن زیادہ دن "ہموار" انداز میں گزرنا شاید میرے مقدر میں نہیں لکھا تھا۔ چوتھے دن میں غلطی سے رات کا کھانا کھانے انٹر کان میں چلا گیا۔ اس رات تنہائی میں ہنی سے ملاقات ہوجانے کے بعد میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ کم از کم اس وقت تک انٹرکان کا رخ نہیں کروں گا جب تک وہ وہاں مقیم ہے اور اس کا ڈانس شو چل رہا ہے۔ میں اب اس سے قطعی لاتعلق نظر آنے کا تاثر دینا چاہتا تھا۔ لیکن انٹرکان میں ایک عرصے سے آمدورفت چلی آرہی تھی۔ کچھ عادت سی بن گئی تھی۔

جب میں ریستوران میں جا بیٹھا تب اچانک احساس ہوا کہ میں نے فی الحال ادھر کا رخ نہ کرنے کی حکمت عملی اپنائی ہوئی [illegible] ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ اٹھ کر ہل ٹن چلا جاؤں [illegible] پھر ارادہ ملتوی کردیا۔ میں نے سوچا' تھوڑی بہت "بدپرہیزی" [illegible] کوئی حرج نہیں ہے۔ میرے یہاں نظر آنے سے اب ہنی کی [illegible] پر کوئی ایسا اثر بھی نہیں پڑسکتا تھا کہ میری یا اس کی راتوں کی [illegible] ہی حرام ہوجاتی۔ چنانچہ میں نے اطمینان سے ٹانگیں پھیلا کر [illegible] ہوئے کھانے کا آرڈر دیا۔

آرڈر لینے والا ویٹر مجھے پہچانتا تھا اور اس سے پہلے عام طور پر [illegible] عاجزانہ مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا کرتا تھا لیکن آج تو اس [illegible] اپنی پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے بھی نہیں نوازا۔ کچھ ایسی گمبھیر [illegible] یدگی سے آرڈر نوٹ کرنے لگا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کھانے کے [illegible] میں بل ادا کئے بغیر فرار ہوجاؤں گا۔

جھک کر آرڈر نوٹ کرتے ہوئے وہ بڑبڑانے کے سے انداز [illegible] بولا "بہت اچھا ہوا آپ آج آگئے سر! ورنہ اب رات کے [illegible] چلے پھر مجھے آپ کی تلاش میں نکلنا پڑتا۔ نہ جانے آپ سے [illegible] قات ہوتی یا نہیں۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ میری خفتہ [illegible] سیات بھی یکدم بیدار ہوگئی تھیں۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ اگر وہ [illegible] رازدارانہ انداز میں کوئی بات کہہ رہا تھا تو میرا چونک کر اس کی [illegible] طرف دیکھنا مناسب نہیں تھا۔ آرڈر مختصر ہی تھا۔ اس نے مجھے کچھ [illegible] کہنے کا موقع نہیں دیا اور مستعدی سے واپس چلا گیا۔

میں بظاہر اسی طرح ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں بیٹھا رہا۔ پھر میں نے بے مقصد سے انداز میں سرسری نظر سے ہال کا جائزہ لیا۔ صرف چند میزوں پر اکا دکا لوگ موجود تھے اور ان میں سے کوئی بھی مشکوک معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا اور کوئی بھی ریڈ ڈاٹ کا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ آڈیٹوریم کی طرف سے آنے والی موسیقی کی نہایت مدھم سی آواز بتا رہی تھی کہ ابھی ڈانس شو چل رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے کمال نے سن یا منصو کے علاوہ بھی اگر کوئی شخص ہوٹل میں ہوگا تو وہ اس وقت آڈیٹوریم میں ہی ہوگا۔

بہرحال احتیاط بہتر تھی۔ ویٹر کھانا لے کر آیا تو اس کی دیو داس جیسی سنجیدگی برقرار تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آج اس کا رویہ بدلا ہوا کیوں تھا؟ وہ اجنبی نظر آنے کی پوری پوری کوشش کیوں کررہا تھا؟ اس نے خاص طور سے میرے آج آنے کو اچھا کیوں قرار دیا تھا؟ میں تو آج محض اتفاقاً ہی آگیا تھا۔ بہرحال یہ تو مجھے بارہا تجربہ ہوچکا تھا کہ اتفاقات میری زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتے تھے۔ شاید ہر شخص کی زندگی میں ہی اتفاقات اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن ہر شخص اتفاقات کو اتفاقات نہیں سمجھتا۔ کوئی اسے اپنی کارکردگی سمجھتا ہے اور کوئی تقدیر کا لکھا۔

کھانا لگانے کے دوران ویٹر نے کوئی بات نہیں کی۔ میں بھی خاموش ہی رہا۔ کھانے کے بعد وہ بل لے کر آیا جسے اچھے ہوٹلوں کے آداب کے مطابق چیک کہا جاتا ہے۔ چیک حسب معمول ایک فولڈر میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے چیک دیکھنے کے لئے فولڈر کھولا تو اس میں چیک کے ساتھ ایک چھوٹا سا لفافہ بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک نظر ویٹر کی طرف دیکھا مگر اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ ظاہر ہے وہ یہی چاہتا تھا کہ میں اس سلسلے میں اس سے کوئی سوال نہ کروں۔ چیک اٹھا کر دیکھتے وقت نہایت صفائی سے لفافہ میں نے اپنی جیب میں منتقل کرلیا اور ویٹر کے لئے فولڈر میں پانچ سو روپے ٹپ رکھ دی جو اصل بل کی رقم سے زیادہ تھی۔ وہ ٹرے اٹھا کر خاموشی سے واپس چلا گیا۔

وہ یقیناً کوئی اہم اور شاید خطرناک خط تھا۔ تبھی ویٹر اسے مجھ تک پہنچانے میں اتنی احتیاط برت رہا تھا۔ اسے غالباً اس سلسلے میں خاص ہدایات دی گئی تھیں۔ ورنہ ویٹر تو ہوٹل میں اکثر نشست و برخاست رکھنے والوں کو کسی نہ کسی کا کوئی پیغام بوقت ضرورت پہنچاتے ہی رہتے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی اور اس میں اتنی رازداری کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ میں بظاہر پرسکون ہی تھا لیکن اندر ہی اندر یہ سوال مجھے بے چین کئے جارہا تھا کہ خط کس کا ہوسکتا ہے؟

تھوڑی دیر کے بعد میں ریستوران سے اٹھ کر باہر آگیا۔ پارکنگ لاٹ میں گو کہ ابھی ویرانی ہی تھی لیکن وہاں بھی میں نے لفافہ نکال کر نہیں دیکھا۔ میں سیدھا گھر آگیا۔ بیڈ روم میں پہنچ کر لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے اس لفافے کو چاک کیا۔

اس میں نہایت باریک کاغذ پر خوردبینی سی لکھائی میں خاصا طویل خط موجود تھا۔ اس قسم کی تحریر میں نے کالج کے زمانے میں امتحانات کے موقع پر دو ایک نالائق قسم کے لڑکوں کے پاس دیکھی تھیں جو نقل مارنے کی فکر میں رہتے تھے۔ ان تحریروں کو "بوٹی" "پرچے" یا اس قسم کے دوسرے کئی نام دیے جاتے تھے۔ خط کے آغاز میں میرا نام' کوئی القاب یا آخر میں خط لکھنے والے کا نام وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ میں نے بیڈ پر نیم دراز ہو کر اسے پڑھنا شروع کیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اگر میں نے یہ خط مکمل کر بھی لیا تو تم تک پہنچا بھی پاؤں گا یا نہیں۔ کیوں کہ میرا تم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنا میرے حق میں بھی سخت خطرناک ہے اور تمہارے حق میں بھی۔ بہرحال میں بہت گھما پھرا کر کسی نہ کسی طرح یہ خط تم تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ کاش یہ بروقت تم تک پہنچ جائے تاکہ جو معلومات میں تمہیں فراہم کررہا ہوں اس سے تم کچھ استفادہ کرسکو اور اپنے آپ کو ایک بہت بڑے نقصان سے

بچانے کی کوئی تدبیر کرسکو۔ یہ خط لکھنے کا مقصد تمہیں ایک سازش سے خبردار کرنا ہے جسے مکمل طور پر تو میں خود بھی نہیں سمجھ سکا ہوں لیکن جتنا کچھ مجھے معلوم ہوسکا ہے وہ میں تمہیں بتانے کی کوشش کررہا ہوں۔ مزید معلومات کرنا' سازش کی کڑیاں جوڑنا اور اپنا بچاؤ کرنا تمہارا کام ہے۔

ایک بہت تھا سائز انٹیسپٹر جو ایک لاکٹ کی شکل میں خود میری تمام بات چیت کہیں نشر کرنے کے لئے ہر وقت میرے جسم کے ساتھ رہتا ہے' اس پر اتفاقاً میں نے شاید فریکوئنسی کی کسی گڑبڑی وجہ سے دو افراد کے درمیان بہت اہم گفتگو سن لی ہے۔ کراچی میں تمہارے فائیو اسٹار ہوٹل میں اٹھارہ جولائی کی شب کو وزیر خارجہ حفیظ احمد صاحب کے اعزاز میں ایک بہت بڑی ڈنر پارٹی کی بکنگ ہوئی ہے۔ ہمارے حامی چند ملکوں کے سفارت کاروں کی طرف سے یہ ڈنر دیا جارہا ہے۔ تمام انتظامات مکمل ہوچکے ہیں۔ وزیر خارجہ سترہ جولائی کو اسلام آباد سے لاہور آئیں گے۔ یہاں بھی ان کی کچھ مصروفیات ہیں۔ اٹھارہ جولائی کی صبح وہ کراچی پہنچیں گے۔ کچھ سولینوں کے پیش نظر وہ ڈنر سے چند گھنٹے پہلے ہی اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے تمہارے ہوٹل منتقل ہوجائیں گے اور چند گھنٹے وہیں قیام کریں گے۔ وہیں سے رات کو وہ بینکوئٹ ہال میں ڈنر میں شرکت کریں گے۔ ان کا پروگرام سفارت کاروں کی درخواست پر انہی کی تجاویز کے مطابق رکھا گیا ہے۔ انیس جولائی کی صبح وزیر خارجہ مشرق وسطیٰ کے چھ ملکوں کے دورے پر کراچی سے ہی روانہ ہوجائیں گے۔ ان کا یہ دورہ ایک خاص مشن کے سلسلے میں ہے۔

ان معاملات سے تو خیر تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو عالمی سیاست کی باتیں ہیں لیکن اس حد تک تمہارا بہرحال تعلق ہے کہ تمہارے ہوٹل میں عین اس تقریب کے دوران حفیظ صاحب کو قتل کروایا جائے گا۔ یہ ایک ہشت پہلو سازش ہے۔ اس سے بیک وقت کئی مقاصد حاصل ہوں گے۔ ایک تو تمہیں کاروباری طور پر بہت بڑا دھچکا پہنچانا مقصود ہے۔ تمہارا ہوٹل نیا ہے۔ پہلی بار اسے ایک بہت بڑے اور اہم ڈپلومیٹک ڈنر کی بکنگ ملی ہے اور اسی کا انجام اتنا خراب ہوجائے گا۔

تم اندازہ کرسکتے ہو کہ کسی ملک کے وزیر خارجہ کا قتل کوئی معمولی سا واقعہ نہیں ہوتا۔ تمہارا ہوٹل سرکاری طور پر تو بلیک لسٹ ہو ہی جائے گا لیکن ساتھ ہی اسے اتنی منفی شہرت ملے گی کہ دیگر ممتاز لوگ بھی یہاں نجی تقریبات کے لئے تو کیا' ویسے بھی نشست و برخاست کے لئے ادھر کا رخ کرنے سے گریز کریں گے۔ شاید اس منفی شہرت کو ہوا دینے کے انتظامات بھی کئے جائیں گے۔ ہوٹل کے مالک یا انتظامیہ کا تو ظاہر ہے اس سانحے میں کوئی قصور نہیں ہوگا لیکن ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہوٹل کی شہرت کو زیادہ سے زیادہ داغدار کرنے کے لئے شاید کچھ لوگوں کو رشوتیں بھی دی جائیں گی۔ صرف یہی نہیں' چوں کہ ایسے سانحے کی تحقیقات اور تفتیش بہت اونچے پیمانے پر ہوگی اور ایسے حالات بھی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ تمہیں بھی تفتیش میں کھینچ لیا جائے۔ اور یہ بات تمہارے سارے ہی کاروباری معاملات کے لئے تباہ کن ثابت ہوگی۔

وزیر خارجہ کو قتل کرانے کا دوسرا بڑا مقصد ایک خاص ملک سے ہمارے تعلقات خراب کرانا ہے اور اس سے بھی بڑا مقصد انہیں اس مشن پر جانے سے روکنا ہے جس کے لئے وہ مشرق وسطیٰ جارہے ہیں۔ عین وقت پر اس مشن کا ملتوی ہوجانا بہت دور رس اثرات مرتب کرے گا۔ عالمی سطح پر کئی بڑی تبدیلیاں اور مسائل رونما ہوں گے۔ اگر تم اخبارات ذرا توجہ سے پڑھتے ہو تو تمہیں کچھ اندازہ ہوگا اور جہاں تک مجھے اندازہ ہوچکا ہے اس کے مطابق میں بھی اس خط میں آگے چل کر اپنا خیال ظاہر کرنے کی کوشش کروں گا لیکن اسے تم محض اشارہ ہی سمجھنا۔ اصل میں کیا کچھ ہوگا' یہ میں بھی صحیح طور پر نہیں جان سکا۔ میرا سیاسی علم بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔

تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ وزیر خارجہ کے قتل کی سازش کون لوگ کررہے ہیں۔ مجھے ریڈ ڈاٹ کا باقاعدہ نام لینے کی تو ضرورت نہیں ہے پھر بھی محض وضاحت کے لئے لکھ رہا ہوں۔ لیکن ان کے علاوہ اس میں ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی "کو آرڈی نیٹرز انٹرنیشنل" کا نام بھی میں نے سنا ہے۔ یہ کمپنی بھی اس سازش میں اہم کردار ادا کررہی ہے۔ ان دو فریقوں کا آپس میں کیا تعلق ہے' اس کا بھی مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ ریڈ ڈاٹ کے کسی معاملے میں "کو آرڈی نیٹرز انٹرنیشنل" کا نام میں نے بھی پہلی بار سنا ہے۔ لیکن خیر..... میں کیا اور میری حیثیت ہی کیا۔ مجھے تو ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ یہ اتفاق تو شاید تمہاری ہی خوش قسمتی کا مرہون منت ہے کہ میں نے ٹرانسیٹر پر یہ اہم گفتگو کافی حد تک سن لی اور یہ ایک ایسی زبان میں تھی جسے تم نہیں سمجھ سکتے تھے گو کہ بظاہر بہت آسان تھی۔

میں یہ نہیں جان سکا کہ وزیر خارجہ صاحب کو قتل کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوگیا ہے کہ وہ کوئی ایسا روایتی طریقہ نہیں ہوگا جس کے لئے سیکیورٹی والے پہلے ہی سے تیار ہوتے ہیں یا تمام حفاظتی تدابیر اختیار کرچکے ہوتے ہیں....."

خط میں اس سے آگے بھی بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ جوں جوں میں پڑھتا گیا' میرے لہو کی حرارت کچھ کم سی ہوتی گئی۔ خط ختم کرنے تک میں اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ دیر تک میری نظریں ان باریک باریک لفظوں میں ہی الجھی رہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں اپنے اعصاب کی تمام تر مضبوطی کے باوجود فی الحال پریشان سا ہوگیا تھا۔

بنیادی طور پر تو میں وہی ایک دیہاتی اور سیدھا سادا سا آدمی

وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ اتنا عروج مل گیا تھا' یہ اوپر کی شان تھی۔ کس طرح سب کچھ ہوگیا تھا' یہ میری خود بھی میں نہیں آتا تھا۔ اب مجھے دنیا کو سمجھنے کا کچھ سلیقہ تو آگیا تھا' اونچے حلقوں میں اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے عالمی سیاست کا بھی کچھ پتا بہت سے معاملات کی شدبد تھی لیکن اس خوش فہمی میں کبھی نہیں ہوا تھا کہ میں کوئی مدبر یا ماہر سیاسیات بن گیا تھا۔

میں اپنی زندگی کو حتی الامکان سیدھی سادی ہی رکھنا چاہتا اخبارات وغیرہ میں سب کچھ پڑھتا تھا۔ غیر ملکی رسائل اور اخبارات بھی دیکھتا تھا۔ وہاں کے حالات سے بھی آگاہ رہنے کی کوشش کرتا تھا لیکن میرا مقصد زیادہ تر کاروباری ہوتا تھا۔ بڑا بس یہی ہوتا تھا کہ کہیں کوئی سودا کرکے پھنس تو نہیں جائیں کہیں سے مال منگوا کر یا کہیں مال بھیج کر روپیہ ڈوب تو نہیں جائے گا۔ بین الاقوامی سیاست تو کیا' کبھی ملکی سیاست میں بھی ٹرک یا ان ڈائرکٹ ٹانگ اڑانے یا کسی معاملے میں ملوث ہونے میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

لیکن کبھی کبھی حالات انسان کو کسی معاملے میں بالکل اسی طرح کی طرح دھکیل دیتے ہیں جو کسی ڈوبتے ہوئے شخص کو بچانے کے لئے سمندر میں کود پڑا تھا۔ وہ اس شخص کو بچا تو لایا تھا لیکن یہ سمجھے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ اسے دھکا کس نے دیا تھا؟ مجھے بھی کچھ پوشیدہ ہاتھ اس معاملے میں دھکا دے رہے تھے جس کا میں اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا تھا۔

میں اس معاملے سے لاتعلق ہوکر یا اسے نظرانداز کرکے بھی بیٹھ سکتا تھا کیوں کہ میرا ہوٹل میرے لئے خوب صورت خوابوں سے ایک تھا۔ وہ میرے لئے ایک خوب صورت پھول دار پودے کی طرح تھا جسے میں نے بڑی محنت سے سینچا تھا۔ ابھی تو اس پر پھول آنے شروع ہی ہوئے تھے۔ ابھی سے میں اسے بدنامیوں کے خطرناک اسکینڈلز کی دھوپ میں مرجھاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر میری ذات بھی کسی ایسے معاملے میں ملوث ہوسکتی تھی جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا' تو یہ اور زیادہ ناقابل برداشت بات تھی۔ جب میرا کوئی قصور ہی نہیں تھا تو میں اس قسم کی سزائیں برداشت کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھا خواہ سازش کرنے والوں کو اپنی طاقت پر کتنا ہی گھمنڈ تھا۔

دھیرے دھیرے میری رگ و پے میں پھیل جانے والی یخ بستگی کم ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ غصے کی تپش نے لے لی جو اندر ہی اندر غیظ و غضب کا پگھلتا ہوا آتش فشاں بھی بن سکتی تھی لیکن میں اپنے دماغ کو ٹھنڈا ہی رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ جس طرح ٹھنڈے انداز میں نہایت سفاکی کے ساتھ مجھے گھیرنے کی کوشش کی جارہی تھی' میں بھی اسی طرح ٹھنڈے دماغ کے ساتھ سازش سے نمٹنا تو زیادہ بہتر تھا۔ جوش اور جذباتیت میں شاید کوئی ایسی حرکت کرجاتا جو ریڈ ڈاٹ یا اس کے پس پشت کارفرما طاقتوں کو فائدہ پہنچا جاتی یہ بہت نازک معاملات تھے۔

مجھے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ کوئی طاقت میرے ملک کے وزیر خارجہ کو قتل کرانے میں کامیاب ہوجاتی۔ میری ان سے کوئی شناسائی نہیں تھی' مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا..... اور اس سے کوئی غرض بھی نہیں تھی کہ ان کے سیاسی نظریات کیا تھے۔ مجھے تو بس یہ معلوم تھا کہ وہ ہمارے ملک کے وزیر خارجہ تھے۔

ہمارا ملک خواہ چھوٹا تھا' ترقی پذیر تھا لیکن مجھے یہ سوچنا بھی اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کوئی بھی بڑی بڑی طاقتیں ہمارے اہم لوگوں کو شطرنج کے مہروں کی طرح استعمال کریں۔ کہ جب جی چاہا' بساط سے ہٹادیا۔ میں ان معاملات میں اپنے آپ کو ایک معمولی اور بے وقعت آدمی سمجھتا تھا لیکن جب اس قسم کا کوئی سوال پیدا ہوتا تھا تو اپنے اندر انا اور خودداری کا ایک طوفان اُمڈتا محسوس ہوتا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ ایسی کسی بھی کوشش کا منہ توڑ جواب دیا جائے۔

ماضی میں مجھ سے صرف اس حد تک نادانیاں ضرور سرزد ہوئی تھیں کہ میرے پاس روپے پیسے کی آمد کے ذرائع کچھ درست نہیں رہے تھے۔ لیکن وہ بات اب پرانی ہوچکی تھی۔ ایک عرصے سے میں ان ذرائع کو ترک کرچکا تھا اور اس سے کہیں زیادہ دولت میرے پاس درست اور جائز ذرائع سے آئی تھی اور آئے ہی چلی جارہی تھی۔ تب سے ہی میں اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اپنی اس دور کی حرکتوں کا کفارہ بھی ادا کرنے کی کوشش کررہا تھا اور اپنے آپ کو ایک معزز' معقول' متوازن اور محب وطن شہری کے سانچے میں

ناز کفیل گیلانی کا نیا رومانی' معاشرتی' سماجی

ناول

تین پیاسے درشن کے

قیمت =/150

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور

ڈھالنے کے لئے بھی کوشاں تھا۔ اور اگر اسے کوئی خود پرستی نہ سمجھتا تو میں کہہ سکتا تھا کہ میں ایسے بے شمار لوگوں سے بہتر تھا جو سیاست' سماجی بہبود یا زندگی کے ایسے دوسرے کئی محاذوں پر سماج کے ٹھیکیدار بنے ہوئے تھے۔ معاشرے میں جن کا بڑا مقام تھا لیکن جن کے اصل چہروں سے صرف گنتی کے چند لوگ ہی واقف ہوتے تھے۔

میرے خیالات ادھر ادھر بھٹک رہے تھے اور خط میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ خط ہنی نے لکھا تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر مرد کا صیغہ استعمال کیا تھا تاکہ اگر تمام تر احتیاطوں کے باوجود خط غلط ہاتھوں میں پہنچ جائے تو کم از کم فوری طور پر اس پر شبہ نہ جا سکے۔ یہ خط لکھ کر اس نے بلاشبہ حق دوستی ادا کر دیا تھا۔

اس نے لکھا تھا کہ اٹھارہ جولائی کی شب کراچی میں میرے ہوٹل میں اس سازش کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ جب کہ اس وقت سولہ جولائی کی شب بھی تقریباً گزر چکی تھی۔ بہت دیر پہلے رات کے بارہ بج چکے تھے یعنی حقیقتاً سترہ جولائی کی تاریخ آ چکی تھی اور میں ابھی لاہور ہی میں بیٹھا تھا۔ میں نے اپنی منتشر سوچوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ مجھے اس خط کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ پھر بھی منظم انداز میں کچھ کرنے کے لئے سب سے پہلے توہریات کی تصدیق ضروری تھی اور جو کام پہلے کرنا ضروری تھا اس کی طرف پہلے ہی توجہ دی جانی چاہئے تھی۔ ابھی میں اس خط کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے اسے سائڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ کر مقفل کر دیا اور فون پر اپنے کراچی کے بیورو چیف شفیع شاہ کا نمبر ڈائل کیا۔

تیسری گھنٹی پر ادھر ریسیور اٹھایا گیا۔ شفیع شاہ کی آواز بوجھل تھی۔ میں نے ملامت سے کہا "معاف کرنا شفیع..... تمہیں سوتے سے جگایا۔"

وہ میری آواز سنتے ہی بولا "سر! ایسی باتیں کر کے شرمندہ نہ کیا کریں۔ آپ کی آواز سن کر تو ہم بستر پر بھی اٹھ بیٹھیں گے۔ ویسے میں اس وقت سو نہیں رہا تھا۔ باہر سے ابھی ابھی آیا ہوں۔ کپڑے بدل رہا تھا" اس کی آواز سے بوجھل پن غائب ہو چکا تھا۔

"کیا عیاشی ہو رہی تھی؟" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"آج کل تو سب عیاشیاں بھولے ہوئے ہیں سر! بس ہوٹل میں لگے ہوئے ہیں" اس کے لہجے میں شگفتگی آ گئی "میں نے اس کے لئے کئی اہم کنٹریکٹ حاصل کئے ہیں۔ آپ سنیں گے تو یقیناً خوش ہوں گے سر! بہت..... کم عرصے میں ہمارا گراف سب سے زیادہ ہے۔ ابھی سے یہ عالم ہے کہ کسی کسی دن تو ہمارے ہاں ایک سنگل بیڈ روم بھی خالی نہیں ہوتا۔ ہمیں اسٹاف بھی بہت اچھا ملا ہے سر! سب لوگ بہت محنت کر رہے ہیں" شفیع شاہ میں یہ بھی ایک بڑی خوبی تھی۔ کبھی صرف اکیلے کسی کام کا کریڈٹ لینے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ دوسرے لوگوں کی محنت کا بھی ضرور ذکر کرتا تھا۔

"کیا ہمارے ہاں اٹھارہ جولائی کو فارن منسٹر کے اعزاز میں ڈنر کے لئے بکنگ ہوئی ہے؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔ میں ابھی اصل بات کر کے اسے چونکانا نہیں چاہتا تھا۔

"ہاں سر!" وہ مسرور لہجے میں بولا "آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس قسم کی تمام تقریبات وغیرہ اسلام آباد میں ہی ہوتی ہیں۔ سفارت کار اور کے سب لوگ اور تمام ڈپلومیٹس وغیرہ وہیں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ منسٹر صاحب کی مصروفیات کا شیڈول کچھ ایسا بنا کہ انہیں کراچی سے مڈل ایسٹ روانہ ہونے سے ذرا پہلے اس ڈنر کا پروگرام رکھنا پڑا۔ بیشتر سفارت کار بھی اسلام آباد سے ہی یہاں آئیں گے۔ انہی کی خواہش تھی کہ پروگرام ہوٹل میں رکھا جائے تاکہ انہیں لاجنگ اور بورڈنگ میں آسانی رہے۔ اور جب آتی ہے تو اب ہمارے ہی ہوٹل کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ وہ خاص طور پر فارن منسٹر صاحب کے ساتھ ہی آئے ہیں۔ باہر انہوں نے تھوڑی سی دلچسپی ظاہر کی۔ باقی کام ہمارے پرسونل منیجر اور دوسروں پر بھی وہی ان کے ساتھ جاتے ہیں۔ اسلام آباد میں راشد نے آگے بڑھ کر کر لیا۔ وہ اچھا اور ٹیلنٹڈ لڑکا ہے سر! ہیں۔ میری خود ان سے فون پر کئی مرتبہ بات ہو چکی ہے۔ شفیع شاہ مسرور لہجے میں سب کچھ بتائے جا رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔" وہ بدستور بڑے مسرور انداز میں تھا کہ جس اعزاز کے بارے میں وہ اتنا خوش ہے اس نے مجھے کتنی تفصیلات بتائے جا رہا تھا۔ میں یہ تمام فکر مند کر دیا ہے۔ وہ وزیر خارجہ اور دوسرے ملکوں کے اتنے اہم سفارت کاروں کے' اپنے ہوٹل میں اجتماع کو ایک بہت خوش آئند واقعہ سمجھ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ اعزاز کہیں ہمارے لئے ایک لمحے کے توقف کے بعد شفیع شاہ بولا "آپ نے رات کو وقت فون کیا ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں ضرور کوئی تشویش ہے ہی نہ بڑھ جائے۔ مسئلہ کیا ہے؟"

شفیع شاہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "آپ کو کسی نے اس ڈنر کے بارے میں بتایا تھا یا آپ نے اخباروں میں پڑھا ہے؟"

"مجھے نہ تو اس کے بارے میں کسی نے بتایا ہے اور نہ ہی یہاں کے اخباروں میں چھپی ہے" میں نے جواب دیا۔

"یہاں تو چھپی ہے سر! بلکہ بعض انگریزی اخباروں نے تو ہمارے ہوٹل کا نام بھی دیا ہے۔ ڈنر کے موقع پر بھی پورا پریس موجود ہوگا۔ ٹی وی کوریج بھی ہوگی۔ ڈنر سے پہلے بہت اہم قسم کی تقریریں ہوں گی نا' اس لئے اسے بہت اہمیت دی جا رہی ہے" جیسے اسے اپنا اصل سوال یاد آیا اور وہ چونکتے ہوئے بولا "لیکن آپ کو نہ تو کسی نے بتایا اور نہ ہی ابھی یہ خبر وہاں کے اخبارات میں چھپی..... تو پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

میں فی الحال اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا "اسے چھوڑو۔ یہ بتاؤ ہمارے سیکیورٹی کے انتظامات کیسے ہیں؟"

ہوٹل کے اپنے بھی سیکیورٹی کے انتظامات تھے۔ یہ باقاعدہ ایک الگ شعبہ تھا۔ آٹھ دس آدمی اس میں ملازم تھے لیکن ہے' ایک پرائیویٹ ادارے کے سیکیورٹی کے انتظامات تو ہوتے ہیں موٹے معاملات کے لئے ہی ہوتے ہیں۔

"انتظامات ٹھیک ہی ہیں سر! ڈنر کی رات میں ہوٹل میں خاص جگہوں پر اپنے چار چھ خاص آدمی بھی لگا دوں گا۔ لیکن تو ہم اپنے طور پر محض احتیاطاً کریں گے۔ منسٹر صاحب' ہوں اور دوسرے ڈپلومیٹس کی ذاتی سرکاری سیکیورٹی ہوگی۔ کے تو اپنے ہی الگ انتظامات ہوں گے۔ ہمارے اپنے آدمی بھی کچھ کریں گے' جہاں تعینات ہوں گے' ان کی اجازت سے ہوں اور ہمیں اپنے تمام انتظامات ان کی ہدایت کے مطابق کرنے ہوں گے۔ اس سلسلے میں اٹھارہ تاریخ کی صبح ہی سرکاری سیکیورٹی کے آ کر ان تمام جگہوں اور راستوں وغیرہ کا تفصیلی معائنہ کریں جہاں جہاں تقریب کے دوران معزز مہمانوں کی آمد و رفت ہوگی۔ مہمانوں کی آمد سے ایک گھنٹا پہلے سیکیورٹی چیف خود آ کر انتظامات دیکھیں گے اور سرکاری طور پر باضابطہ کلیئرنس دے دیں گے۔ اس کے بعد وہ واپس اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس جا کر منسٹر صاحب کو لے آئیں گے۔ سیکیورٹی چیف صاحب کا نام اکرام بیگ ہے۔ وہ خاص طور پر فارن منسٹر صاحب کے ساتھ ہی آئے ہیں۔ باہر کے ساتھ جاتے ہیں۔ اسلام آباد میں ان کے ساتھ ہی ہیں۔ میری خود ان سے فون پر کئی مرتبہ بات ہو چکی ہے۔ وہ بدستور بڑے مسرور انداز میں ہے۔" اسے نہیں معلوم تھا کہ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کتنی تفصیلات بتائے جا رہا تھا۔ میں ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ میں یہ تمام ذہن نشین کئے جا رہا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد شفیع شاہ بولا "آپ نے رات کو وقت فون کیا ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں ضرور کوئی تشویش ہے مسئلہ کیا ہے؟"

وہ ہوٹل کے سلسلے میں اتنے جوش و خروش سے کام کر رہا تھا میں ابھی کچھ بتا کر اسے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے جوش و خروش متاثر ہوتا۔ میں نے سرسری سے لہجے میں کہا "ایسی کوئی خاص تشویش نہیں ہے۔ بس ذرا ہوشیار رہنا۔ قسم کی تقریبات بہت بڑی ذمے داری ہوتی ہیں۔ ہمارا ہوٹل نیا اور تمہیں معلوم ہے' کراچی اور لاہور میں ہمارے بہت سے ہوں کے ساتھ ساتھ تھوڑے بہت بدخواہ بھی موجود ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں سر!" شفیع شاہ بغیر کسی تشویش کے بولا "ہم اللہ اس ذمے داری سے..... بلکہ اس سے بھی بڑی ذمے ہیں سے بلا رکاوٹ نمٹتے رہیں گے۔ کراچی کے جتنے بھی ہیں ان کے بارے میں میں نے آپ کو پہلے بھی کوئی نہیں ہونے دی۔ انشاء اللہ آئندہ بھی نہیں ہونے دوں گا۔"

"اس کا تو مجھے یقین ہے' اسی لئے تو میں سب کچھ تم پر چھوڑ کر بیٹھا ہوا ہوں۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"بہرحال..... اب آپ نے اشارہ دے دیا ہے تو میں اس میں خاص طور پر ہوشیار رہوں گا۔ لیکن میں آپ کو اس طرف سے بالکل مطمئن اور بے فکر دیکھنا چاہتا ہوں سر! آپ پر لاہور میں ہی کام کا جتنا بوجھ ہے' وہی کافی ہے۔ یہاں کے معاملات میں تو بس آپ کسی بہت ہی خاص موقع پر رہنمائی دیتے رہا کریں' وہی بہت ہے۔ اگر یہاں کے مسائل میں بھی آپ کو سر کھپانا پڑا تو پھر ہم جیسے آپ کے جاں نثاروں کی زندگی کا کیا فائدہ۔"

میں جو کچھ جان چکا تھا' وہ چوں کہ ابھی اس سے آگاہ نہیں تھا اس لئے اس معاملے کو روٹین میں لے رہا تھا۔ میرا مقصد فی الحال صرف یہی تصدیق کرنا تھا کہ ڈنر کا پروگرام واقعی طے تھا۔ اس کے علاوہ سردست میں اسے صرف تھوڑا سا ہوشیار کرنا چاہتا تھا' وہ میں نے کر دیا تھا۔ اب مجھے ہنی کی طرف سے موصول ہونے والے خط کے مندرجات کے بارے میں بالکل ہی شبہ نہیں رہا تھا۔ اب مجھے اگلا قدم اٹھانا تھا۔ شفیع شاہ کو خدا حافظ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کیا اور سوچ میں پڑ گیا کہ رات کو اس وقت فارن منسٹر صاحب کو اپروچ کرنے کی کیا صورت ہو سکتی تھی؟

میں نے ذہن پر بہت زور دیا کہ میرے جاننے والوں میں کون ایسا آدمی ہو سکتا ہے جس کا منسٹر صاحب سے کوئی تعلق واسطہ نکل سکتا ہو۔ اور تعلق واسطہ بھی ایسا۔ کہ جس کی وجہ سے منسٹر صاحب لاہور آتے ہی فوری طور پر مجھے ملاقات کا وقت دے دیں۔ انہیں اس سازش سے خبردار کرنے کے لئے اور کوئی غیر روایتی قسم کی حکمت عملی طے کرنے کے لئے میرا ذاتی طور پر ان سے ملاقات کرنا ضروری تھا۔ اس کے بغیر بات نہیں بن سکتی تھی۔ جس سازش کا مجھے اشارہ ملا تھا اسے کسی غیر روایتی حکمت عملی کے ذریعے ہی ناکام بنایا جا سکتا تھا جس کی سازشیوں کو بالکل توقع نہ ہو۔ ورنہ اہم شخصیات کی حفاظت کے روایتی انتظامات تو موجود ہی ہوتے ہیں۔ فارن منسٹر کا تعلق چونکہ بین الاقوامی معاملات سے ہوتا تھا' اس لئے ان کے حفاظتی انتظامات غیر معمولی ہوتے تھے لیکن بہرحال وہ سب بھی روایتی ہی ہوتے تھے جن کا سازشیوں کو بھی اچھی طرح علم تھا۔ اگر منسٹر صاحب کو قتل کرنے کے لئے کوئی روایتی طریقہ استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی تب تو ان انتظامات کے ذریعے اسے ناکام بنایا جا سکتا تھا۔ مثلاً مہمانوں میں سے کوئی دشمن کا آلۂ کار ہوتا یا کوئی شخص کسی بہروپ میں تقریب میں گھس آنے میں کامیاب ہو جاتا اور خنجر یا پستول وغیرہ سے منسٹر صاحب پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتا تب تو سیکیورٹی والے عمدگی سے اس سے نمٹ سکتے تھے اور شاید اس کوشش کو ناکام بھی بنا سکتے تھے۔ لیکن خط میں مجھے خبردار کیا گیا تھا کہ ایسا کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ طریقہ کیا ہوگا۔ بات چوں کہ بہت مبہم تھی اور بے پناہ سوچ بچار اور احتیاط کا تقاضا کرتی تھی اس لئے میں سیکیورٹی والوں پر زیادہ بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ لوگ عمل کے فقیر ہوتے ہیں۔

چند لمحے سوچنے کے بعد مجھے طارق نذیر صاحب کا خیال آیا۔ وہ ان دنوں چیمبرز آف کامرس کے صدر تھے اور بڑی جان پہچان والے آدمی تھے۔ وہ ان سے بھی جان پہچان رکھتے تھے جن سے انہیں کوئی کام نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی آئندہ کبھی کوئی کام پڑنے کا امکان نظر آتا تھا۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ طارق نذیر صاحب رت جگے کرنے والے آدمی تھے۔ رات کے ایک دو بجے تک تو ویسے ہی ان کی کوئی نہ کوئی مصروفیت چلتی رہتی تھی۔ اس کے بعد وہ خواب آور گولیاں کھاتے تھے اور بقول ان کے "گولیاں کبھی کبھی اثر دکھادیتی ہیں تو دو چار گھنٹے سولیتا ہوں ورنہ اپنا گزارا تو زیادہ تر نیند کے بغیر ہی چل رہا ہے۔ تم دیکھ لینا..... میرے جسم کی بناوٹ ہرا چھی خاصی نظر آنے والی یہ عمارت کسی روز اچانک ہی دھڑام سے زمین بوس ہوجائے گی۔ تم سے باتیں کرتے کرتے تمہارا یہ خادم کسی روز ٹیں بول جائے گا۔"

اس پر میں نے ان سے اظہار ہمدردی کرنے کے بجائے کہا تھا "آمین! اللہ ایسی آسان موت سب کو نصیب کرے۔"

طارق صاحب خفا نہیں ہوئے تھے۔ سر کھجاتے ہوئے بولے "یار چوہدری! تم ہر بات میں کوئی الٹا ہی نکتہ نکال لیتے ہو۔"

"طارق صاحب! الٹا نہیں' یہ تو سب سے سیدھا نکتہ ہے۔ مثبت پہلو تلاش کرنے کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ کوئی ضروری ہے کہ آدمی میتوں یا برسوں بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر' بہو بیٹوں کی کڑکڑ سن کر مرے؟"

یہ گفتگو یاد کرتے ہوئے میں نے ان کا نمبر ڈائل کیا۔ انہیں رات کے اس پہر فون کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ان کے ملازم نے پہلے یہ تفتیش کی کہ صاحب نے ابھی سیٹنگ پلز تو نہیں کھائیں؟ جب یہ تصدیق ہوگئی کہ ابھی ان کے بیڈ روم سے سیٹنگ پلز کھانے کی خبر نشر نہیں ہوئی ہے تو نوکر نے فون بیڈ روم میں ملادیا۔

طارق صاحب چھوٹتے ہی بولے "یار چوہدری! تمہاری عمر لمبی ہے۔ میں ابھی تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں کل ہی جاپان سے واپس آیا ہوں۔ میں تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جاپان جیسے ملک میں سوتی ساریوں کی زبردست مارکیٹ اچانک ہی پیدا ہوگئی ہے۔ ہمیں تو ایکسپورٹ پروموشن بیورو والوں تک نے نہیں بتایا..... خیر..... ان بے چاروں کو تو خود بھی معلوم نہیں ہوگا۔ اور ادھر انڈیا دھڑا دھڑ....."

"طارق صاحب!" میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "خدا کے لئے..... کم از کم بیڈ روم میں پہنچ کر تو کاروبار کو بھول جایا کریں۔ اگر یاد کرنا ہی ہے تو سوتی ساریوں کے بجائے ساری والیوں کو یاد کیا کریں۔ بلکہ آپ جیسے شادی شدہ انسان کا اخلاقی فریضہ تو یہ ہے کہ بیڈ روم میں پہنچنے کے بعد بیوی کے علاوہ کسی اور موضوع پر نہ سوچے۔"

"برادرم!" وہ تو بھڑک کر بولے "اب تو یہ موضوع بھی دو سم بیڈ روم میں چلا گیا ہے۔ دو سال سے الگ بیڈ روم میں سو رہی ہیں۔ اس لئے اب تو اس موضوع پر بھی سوچنے کی ضرورت نہ رہی" پھر وہ پہلے سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولے "وہ تو بار صاف کہہ چکی ہے کہ اگر خاندان کی عزت و ناموس اور جوان بچوں کی شرم نہ ہوتی تو وہ کم از کم پانچ سال پہلے مجھ سے طلاق لے چکی ہوتی۔ ابھی مجھ سے ناراض ہیں۔ بیٹا امریکا میں جا کر بیٹھا ہے۔ واپس آنے کا نام نہیں لیتا۔ بیٹی سوئٹزرلینڈ میں پڑھ رہی ہے مگر مجھے نہیں معلوم کیا پڑھ رہی ہے۔ چھٹیوں میں بھی گھر نہیں آتی۔"

"تو پھر آپ کس کے لئے اتنا کما رہے ہیں؟" میں نے پوچھا

"معلوم نہیں" وہ سادگی سے بولے۔ مگر وہ اتنے سادہ نہیں تھے۔ زیادہ سادہ ہوتے تو شاید اتنے بڑے سیٹھ نہ ہوتے۔ ایک لمحے کے توقف سے بولے "تمہاری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ تم کس کے لئے اتنا کما رہے ہو؟"

"معلوم نہیں" میں نے بھی انہی کی سی سادگی سے جواب دیا۔ "شاید اپنے لئے۔ لیکن کم از کم اتنا تو ہے کہ مجھے سونے کے سیٹنگ پلز نہیں کھانی پڑتیں۔"

"میری عمر کو پہنچو گے تو کھانے لگو گے۔ تمہاری عمر میں بھی نہیں کھاتا تھا بڑا خوردار!" ان کا کمال یہ تھا کہ کبھی مجھے بھائی بنا لیتے تھے' کبھی برخوردار اور کبھی بزرگوار کے مرتبے فائز کردیتے تھے۔ میں اصل موضوع کی طرف آنے کی سوچ رہا تھا کہ انہوں نے خود ہی میری مشکل حل کردی۔ بڑے شفقت میں بولے "ویسے رات کے تقریباً دو بجے تم نے میرے ان معاملات کریدنے کے لئے تو فون نہیں کیا ہوگا؟ یہ وقت تو سونے ہی کا ہے..... لیکن تم سے مجھے یہ امید نہیں ہے۔"

"طارق صاحب! میری یہ مجال کہاں۔ وہ..... اصل میں چھوٹا سا مسئلہ آن پڑا تھا۔ میں نے سوچا' آپ سے پوچھ لوں۔ ملنے جلنے والوں میں کوئی ایسا آدمی ہے جو صبح وزیر صاحب سے میری ملاقات کا انتظام کراسکے؟"

"وزیر خارجہ صاحب سے؟" وہ تعجب سے بولے "سپاورز کو تمہارے کاروبار پر کوئی اعتراض ہوگیا ہے جو وزیر خارجہ صاحب سے سفارش کرانا چاہتے ہو؟"

"کسی بھی قسم کی سفارش وغیرہ کا سلسلہ نہیں ہے" میں ان کے استہزائیہ لہجے کے جواب میں سنجیدگی سے کہا "پرائیویٹ سی بات ہے۔"

"ویسے تو خیر سفارش بھی خاصا پرائیویٹ معاملہ ہوتا ہے۔ تمہارا معاملہ کیا اس سے بھی زیادہ پرائیویٹ ہے؟ کسی شہزادی وغیرہ پر تو عاشق نہیں ہوگئے؟" پھر وہ جواب کا انتظار کئے بغیر بولے "ویسے تو خیر انسان جس عورت پر عاشق ہوجائے وہ

شہزادی نظر آتی ہے لیکن پھر بھی میں نے سوچا' پوچھ لوں تو بہتر ہے۔"

"طارق صاحب! زندگی میں پہلی بار آپ سے کام پڑا ہے۔ اور زندگی میں پہلی بار ہی میں ذرا زیادہ سنجیدہ ہوا ہوں تو آپ مذاق کرنے لگے ہیں۔ خدا کے لئے ذرا سنجیدگی سے میری بات کا جواب دیجئے" میں نے درخواست کی۔

"یار! جو آدمی سارا دن دفتر میں رونی صورت بنائے بیٹھا رہتا ہو' گھر آتا ہو تو گھر کی دیواریں بھی اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتی ہوں' ایسے آدمی کو کم از کم رات کے دو بجے تو تھوڑا بہت مذاق کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ خصوصاً جب کہ تمہارا سوال اتنا مزاحیہ ہے" طارق صاحب کے لہجے میں بہرحال بلا کی سنجیدگی تھی۔

"دنیا کا دستور یہی ہے طارق صاحب!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کوئی سخت مشکل میں ہوتا ہے لیکن دنیا کو اس کا مسئلہ بڑا مزاحیہ نظر آتا ہے۔ دنیا اس پر ہنستی ہے۔ میرا خیال ہے آپ میری کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ اچھا..... خدا حافظ۔"

"ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ ابھی فون بند مت کرنا" وہ جلدی سے بولے "آخر تمہاری بات کا جواب دینا بھی تو میرا اخلاقی فرض ہے۔ کہتے ہیں انسان گڑ نہ دے' گڑ جیسی بات تو کردے۔ میں تمہیں گڑ تو نہیں دے سکتا یعنی تمہارا کام تو نہیں کرسکتا لیکن گڑ جیسی بات ضرور کررہا ہوں یعنی نہایت عاجزی' انکسار... اور مٹھاس سے تمہیں بتا رہا ہوں کہ ایسا کوئی آدمی میرا اتنا اچھا واقف نہیں ہے جو اتنے ہنگامی انداز میں فارن منسٹر صاحب سے تمہاری میٹنگ ارینج کراسکے۔ البتہ اگر صنعت و تجارت کے منسٹر صاحب سے ملنا ہے تو بتاؤ۔ ان سے اپنی سلام دعا اچھی ہے۔ ان سے ملاقات چند گھنٹے کے نوٹس پر ہوسکتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے اپنے متعلقہ وزیر تو وہی ہیں۔ فارن منسٹر صاحب سے ہمیں کیا لینا ہے۔"

"ایک تو ہم کاروباری لوگوں کی یہ بڑی مصیبت ہے کہ صرف انہی سے سلام دعا رکھتے ہیں جن سے کوئی مطلب ہوتا ہے" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا "وزیر صنعت و تجارت سے ملاقات کرنا ہوتی تو کسی نہ کسی حوالے سے تھوڑی بہت سلام دعا تو آپ کے اس خادم کی بھی نکل ہی آتی۔ آپ کو تکلیف دینے کا مقصد یہی تھا کہ معاملہ ذرا غیر متعلقہ سے منسٹر صاحب کا آن پڑا ہے۔ خیر..... معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کا اور اپنا وقت ضائع کیا۔"

وہ دھیرے سے ہنسے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتے' میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔ وقت کی ناموزونیت کی پروا کئے بغیر میں نے شہر کی مزید دو چار بڑی بڑی کاروباری شخصیتوں کو فون کئے اور اپنی درخواست دہرائی۔ سب ہی نے معذرت کی۔ البتہ سب ہی میری ملاقات وزیر صنعت و تجارت سے کرانے پر تلے ہوئے تھے۔

میں نے دو چار ایسے دولت مندوں کو بھی فون کئے جو سیاست میں بھی منہ مارتے تھے۔ ان کی شناسائی صرف وزیر صنعت و تجارت تک نہیں بلکہ ہر زمانے' ہر حکومت میں ہر محکمے کے وزیروں تک رہتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ کام تو کوئی مشکل نہیں تھا لیکن اس کے لئے بہرحال وقت درکار تھا۔ انہیں فارن منسٹر کا شیڈول معلوم کرنا پڑے گا' پھر اس میں گنجائش دیکھ کر کہیں مجھے فٹ کرنا پڑے گا۔ اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان سے میری ملاقات کب ممکن ہوسکے گی۔ ایسی غیر یقینی کوشش کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اس ذریعے پر بھی انحصار نہیں کیا۔

ٹیلی فون بند کرکے ایک بار پھر نیم دراز ہو کر سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنی کہانی لے کر سرکاری حکام کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس طرح میں لمبے چکروں میں پھنس جاتا۔ جس کا میں متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ تجربہ بھی تھا اور کچھ میرا دل بھی کہتا تھا کہ ایسے نازک اور پیچیدہ مسائل کو ہماری سرکاری مشینری مزید الجھا تو سکتی تھی' مزید خراب بھی کرسکتی تھی لیکن ان کا کوئی حل نہیں نکال سکتی تھی۔ کیوں کہ مشینری بہ ذات خود ان مسائل سے بھی زیادہ الجھی ہوئی تھی۔

پھر مجھے ستارہ کا خیال آیا۔ فلمی ستاروں' اور خصوصاً خاتون فلمی ستاروں کے شناساؤں کے حلقے میں ہر طرح کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا' اگر ستارہ ذہن پر زور دے تو شاید اس کے جاننے والوں میں کوئی ایسی شخصیت نکل آئے جو منسٹر صاحب سے میری نجی ملاقات کا ذریعہ بن سکے۔

ایک مرتبہ پھر فون کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے مجھے کچھ شرم سی بھی آئی اور میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا "واہ میاں افضل چوہدری! شہر کے بڑے معزز آدمی' بہت بڑی کاروباری شخصیت' گروپ آف کمپنیز کے مالک' بہت بڑا حلقہ احباب رکھنے والے اور اپنے تئیں بڑے پھنے خان بنے پھرتے ہو لیکن عالم یہ ہے کہ اگر ہنگامی طور پر ایک مرکزی وزیر سے..... اسی کی بھلائی کی خاطر ملاقات کی ضرورت آن پڑے تو اس کے لئے وسیلے تلاش کرتے پھرتے ہو۔ خواتین دوستوں تک کو زحمت دینے کی سوچتے ہو۔ کیا فائدہ تمہاری اس شان و شوکت کا؟"

لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے اتنا قنوطی ہونے کی ضرورت نہیں۔ کبھی کبھی وقت اور حالات انسان کو کسی بھی ایسی عجیب و غریب الجھن میں ڈال سکتے ہیں جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔ اور ایسے موقعے پر کوئی ایسا انسان اس کے کام آسکتا ہے جس کے بارے میں کبھی اس نے سوچا بھی نہیں ہوتا۔

میں ستارہ کو فون کرنے جا ہی رہا تھا کہ اس سے پہلے مجھے طاہرہ خانم کا خیال آگیا۔ میں نے سوچا' اب خواتین دوستوں سے رجوع کرنے کی نوبت آہی گئی ہے تو پہلے طاہرہ خانم کو بھی پوچھ لیا جائے۔ وہ بھی خاصی باغ و بہار قسم کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ کچھ کہا نہیں

جا سکتا تھا کہ اس کے شناساؤں کے حلقے میں بھی کیسے کیسے لوگ شامل ہوں۔ اور کیسے کیسے اس حلقے سے گزر کر ادھر ادھر کہیں بکھرے ہوئے ہوں یا زندگی کے راستوں پر لمحوں کی دھول میں کہیں گم ہو چکے ہوں' یوں خیالات کی رو ذرا بھٹکی تو میں نے ستارہ کا نمبر ڈائل کرتے کرتے طاہرہ خانم کا نمبر ڈائل کر لیا۔

دوسری طرف سے اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی تو میں نے کہا "میرا تو خیال تھا کہ تم رات کو سوتی ہی نہیں ہو۔"

"اوہ..... یہ تم ہو!" میری آواز پہچان کر اس کے لہجے میں نیند کا خمار غائب ہو گیا "دراصل تمہاری نظر کرم کچھ زیادہ نہیں ہوئی ورنہ راتوں کی نیند ترک بھی کی جا سکتی تھی۔"

"طاہرہ خانم!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کبھی کبھی میں سوچتا ہوں....."

"کیا سوچتے ہو؟" وہ بے تابی سے میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"یہی کہ تم اتنی بدمعاش کیوں ہو؟"

اس نے مترنم سا قہقہہ لگایا "بدمعاشی صرف مردوں کی میراث تو نہیں ہے۔"

"ہرگز نہیں" میں نے تسلیم کیا "اس میراث پر تم بہ خوشی قبضہ کئے رکھو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اس وقت میں نے تمہیں ایک کام کی بات کرنے کے لئے زحمت دی ہے۔"

"میں آج رات دعا کرتے ہوئے ہی سوئی تھی کہ رات کے پچھلے پہر تمہیں مجھ سے کوئی کام پڑ جائے۔ بعض دعائیں کتنی جلدی قبول ہو جاتی ہیں" اس کے سنجیدہ لہجے میں ایسی شرارت چھپی ہوئی تھی کہ کوئی اور وقت ہوتا تو جسم میں گدگدی سی ہونے لگتی۔

ایک لمحے کے معنی خیز توقف کے بعد وہ اسی لہجے میں بولی "تو پھر تم آ رہے ہو میری طرف؟"

"طاہرہ! اگر تمہارا شیطانی ذہن تمہیں ایک لمحے کی فرصت دے تو پلیز..... ذرا میری بات سن لو۔ ایک شخص رات کو اس وقت تمہیں فون کر رہا ہے۔ وہ کسی مصیبت میں بھی ہو سکتا ہے" میں نے ملامت سے کہا۔

"مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ تمہارے ایج گروپ کے لوگوں پر ایسے اوقات میں کیا مصیبتیں پڑتی ہیں۔ تمہاری مصیبت دور کرنے کے لئے ہی تو تمہیں یہاں بلا رہی ہوں" وہ اطمینان سے بولی۔

"طاہرہ خانم! قسم سے' تمہاری صورت دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا کہ تم کیا چیز ہو" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"آج کے دور میں بیشتر صورتوں کا معاملہ ایسا ہی ہے چنانچہ" وہ مجھ سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اب تم خود کو ہی لے لو۔ قسم سے تمہاری بھولی بھالی شکل پر خلوص کے ڈونگرے برستے ہیں۔ جس کی طرف ذرا محبت سے دیکھتے ہو' اسے یہی یقین ہونے لگتا ہے کہ تم سے زیادہ مخلص آدمی دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔ مگر تم ہو کیسے پکے مطلبی۔ کبھی مطلب کے بغیر بھی فون ذرا کر لیا کرو۔"

"میں سمجھا تھا تمہیں وہ فون سننے کی عادت ہی نہیں رہی جن کا کوئی خاص مطلب ہی نہ ہو" میں نے کہا۔

"چلو خیر..... بیکار باتوں کو جانے دو" اس کا لہجہ اب بھی وہی تھا لیکن اندر ہی اندر وہ گویا سنجیدہ ہو گئی تھی "کہو..... کیا بات ہے؟ مجھ جیسی بے کار عورت سے تمہیں کیا کام آن پڑا؟"

میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے فوراً اپنا مدعا بیان کر ڈالا۔ اس سے قبل بھی میں نے جتنے لوگوں سے یہ درخواست کی تھی انہوں نے پہلے حیرت ہی کا اظہار کیا تھا کہ یہ بیٹھے بٹھائے اچانک مجھے وزیر خارجہ سے ملنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔ سبھی نے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ بھی کی تھی۔ طاہرہ خانم کا بھی پہلا ردعمل وہی رہا۔

"بزنس تو شاید بہت کر لیا۔ کیا اب عالمی سیاست میں ٹانگ اڑانے کا ارادہ ہے جو وزیر خارجہ صاحب سے راہ و رسم بڑھانے چل دیے؟" اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ پوچھا۔

"نہیں" میں نے کراہ کر کہا "تم عالمی سیاست کی بات کر رہی ہو' میں نے تو کبھی ملکی سیاست میں بھی ٹانگ نہیں اڑائی۔ مجھے اپنی ٹانگ عزیز ہے۔ میں ابھی اسے تڑوانا نہیں چاہتا۔ بات کچھ اور ہے۔ لیکن بہت اہم ہے۔ میرے لئے بھی' اور وزیر خارجہ کے لئے بھی۔"

"اگر ان کے لئے بھی اہم ہے تو ڈائرکٹ انہیں فون کر لو" طاہرہ خانم نے مشورہ دیا۔

"اس وقت تو وہ اسلام آباد میں ہیں۔ آج صبح دس بجے کے قریب لاہور پہنچیں گے۔ میں اگر اسلام آباد یا یہاں انہیں فون کرنے کی کوشش بھی کروں تو مجھے معلوم ہے کہ ان کا اسٹاف مجھے ٹال دے گا۔ بات کچھ ایسی ہے کہ فون پر نہیں کی جا سکتی۔ اور پوری بات سنے بغیر وہ قائل نہیں ہوں گے۔ بلکہ قائل تو شاید وہ پوری بات سن کر بھی نہ ہوں۔ لیکن میرا کوشش کرنا اشد ضروری ہے۔ میرے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے ورنہ میں ملاقات تو بہرحال کر ہی لیتا۔"

"ہوں....." طاہرہ خانم نے ہنکارا بھرا۔ وہ یقیناً ذہن پر زور دے رہی تھی پھر یکدم جیسے اسے یاد آیا "بھئی کمال ہو گیا۔ بالکل سامنے کا آدمی ہے لیکن میرے ذہن میں اس کا نام ہی نہیں آ رہا۔ برسوں سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی نا۔ وہ ہمارا دور پار رشتے دار ہی ہے۔ نذیر خان اس کا نام ہے لیکن نوجوانی میں اسے نذیر پہلوان کہا کرتے تھے کیوں کہ اسے پہلوانی اور باڈی بلڈنگ وغیرہ کا بہت شوق ہوا کرتا تھا۔ مجھ پر عاشق تھا وہ اس زمانے میں۔"

"اور تم؟" میں نے ایک لمحے کے لئے اصل موضوع

اسلم راہی ایم اے کے ولولہ انگیز تاریخی ناول

سائبیریا کا طوفان	۱۵۰/-	سرابوں کے صحرا	۳۰۰/-
آتش و آہن	۱۵۰/-	رقص درویش	۳۰۰/-
ظلمات	۱۵۰/-	دشت کے بھیڑیئے	۲۵۰/-
سراج منیر (اول دوم)	۵۰۰/-	غرناطہ کا چوپان	۳۰۰/-
طارق بن زیاد	۲۵۰/-	شیر شاہ سوری	۲۵۰/-
مقدس دیوداسی	۱۷۵/-	سندھ کا سورما	۲۵۰/-
ابلیکا (سات جلدیں مکمل سیٹ)	۱۹۵۰/-		

مکتبہ القریش ○ اردو بازار لاہور ۲ فون: ۷۲۲۴۶۶۵

بھولتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے بھی اسے لفٹ نہیں کرائی تھی۔ ویسے تو گپ شپ تھی' ہنسی مذاق تھا۔ آخر رشتے دار تھا۔ لیکن میں نے اس کے عشق کا جواب کبھی عشق سے دینے کی کوشش نہیں کی" وہ روانی سے بولی۔

"کیوں؟ کیا شکل کا برا تھا؟" میں نے کریدا۔

"نہیں۔ فقرا تھا بالکل۔ ایک نمبر کا گنگلا" اس نے اطمینان سے جواب دیا "عمر میں بھی مجھ سے بہت بڑا تھا۔ شادی شدہ تھا۔ بڑے بڑے بچے تھے اس کے۔ سرکاری نوکری کرتا تھا۔ معلوم نہیں کون سا ڈیپارٹمنٹ تھا اس کا۔ مگر شاید رشوت نہیں کھاتا تھا یا شاید اس کی نوکری میں رشوت کی گنجائش نہیں تھی۔ معلوم نہیں کیا چکر تھا۔ ایک چھوٹے سے سرکاری کوارٹر میں اپنی جھگڑالو بیوی کے ساتھ رہتا تھا اور مجھے لمبے لمبے خط لکھا کرتا تھا جس میں ساحر لدھیانوی کے آدھے آدھے دیوان نقل کیا کرتا تھا۔ اب میں پاگل تو نہیں تھی نا کہ ایک آدمی جو عمر میں مجھ سے اتنا بڑا ہو' اس کے اتنے بڑے بڑے بچے ہوں۔ اوپر سے غریب بھی ہو۔ اور میں اس کے عشق کا جواب عشق سے دوں۔ مجھے کیا پاگل کتے نے کاٹا تھا؟ چلو انسان اور چاہے کچھ بھی ہو۔ کم از کم غریب تو نہ ہو۔ میں نے تو نوجوانی سے ہی اصول بنا لیا تھا کہ کانے' لنگڑے لولے' بڈھے سے شادی کر لوں گی لیکن غریب سے نہیں کروں گی" وہ سفاکی کی حد تک صاف گو تھی۔

"نوجوانی میں ہی اتنی شاطر کیسے ہو گئی تھیں؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"شاید میں پیدائشی چالاک تھی" وہ اطمینان سے بولی۔

"تمہاری داستان حیات یقیناً کافی واہیات قسم کی ہو گی۔ کبھی فرصت میں سنوں گا۔ اس وقت تو نذیر پہلوان کی بات ہو رہی تھی۔ اگر وہ اتنا غریب تھا تو اس کی فارن منسٹر صاحب سے جان پہچان کہاں سے نکل آئی؟ کہیں بعد میں وہ سیاست میں حصہ لے کر دولت مند تو نہیں بن گیا تھا؟ کوئی منسٹری وغیرہ تو حصے میں نہیں آ گئی تھی اس کے؟"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے" وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولی "دراصل وہ بعد میں حفیظ احمد صاحب کا خصوصی سیکیورٹی گارڈ لگ گیا تھا۔ حفیظ احمد صاحب اس وقت وزیر خارجہ نہیں تھے۔ وہ

شاید امور خارجہ کی وزارت میں انڈر سیکریٹری تھے۔ مجھے کچھ صحیح طرح معلوم نہیں۔ بہرحال اس زمانے میں کچھ لوگ ان کے قبضے میں موجود ایک فائل حاصل کرنے کے لئے انہیں اغوا کرنا چاہتے تھے لیکن حفیظ صاحب عین وقت پر نہ جانے کہاں غائب ہوگئے تھے۔ ان کا ٹھکانا معلوم کرنے کے لئے ان لوگوں نے نذیر پہلوان ..... میرا مطلب ہے نذیر خان کو اغواء کرلیا تھا۔ اس پر بہت تشدد کیا تھا۔ جس میں اس کا ایک ہاتھ بھی ضائع ہوگیا تھا لیکن اس نے حفیظ صاحب کا پتا نہیں بتایا تھا۔ تب سے آج تک حفیظ صاحب اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔ اس کی کوئی بات نہیں ٹالتے۔"

"چلو..... شکر ہے' ہمارے کسی منسٹر میں اتنی وضع داری تو ہے" میں نے کہا "تو اب یہ نذیر خان کیا کرتا ہے؟ کہاں پایا جاتا ہے؟"

"سیکیورٹی کے کام کے تو وہ قابل نہیں رہا تھا۔ بلکہ دایاں ہاتھ آدھی کلائی تک ضائع ہوجانے کی وجہ سے اس کے لئے ہر کام ہی دشوار ہوگیا تھا۔ لیکن حفیظ صاحب نے ہی بہرحال اسے حکومت سے کافی رقم بھی دلوائی تھی اور بعد میں کسی برائیویٹ کمپنی کے آفس میں جنرل مینجر بھی رکھوا دیا۔ بس کچھ اسی قسم کی باتیں تھیں۔ مجھے کچھ زیادہ صحیح طرح تفصیلات یاد نہیں۔ بہرحال..... تم ملو گے تو خود ہی پوچھ لینا۔ اب اس کے حالات خاصے بہتر ہیں۔ وہ سمن آباد میں ایک چھوٹی سی کوٹھی میں رہتا ہے۔ میں ابھی اس کا ایڈریس تلاش کرکے تمہیں دیتی ہوں۔ میں نے سنا ہے حفیظ صاحب وزیر خارجہ بننے کے بعد بھی نذیر خان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ وہ جس وقت چاہے انہیں فون کرسکتا ہے۔ حفیظ صاحب اس کی کوئی بات نہیں ٹالتے۔ اور وہ میری کوئی بات نہیں ٹال سکتا۔ تم میرے حوالے سے جاکر اس سے مل لو۔ میں اسے فون بھی کروں گی۔ اچھا' شریف آدمی ہے۔ اس کی قسمت اچھی تھی جو مجھ جیسی عورت کے پلے نہیں پڑا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ منسٹر صاحب سے تمہاری کسی بھی وقت کی ملاقات طے کرادے گا۔"

"بس۔ پھر تو مسئلہ ہی حل ہوگیا۔" میں نے سکون کی سانس لے کر کہا "اتنی سی تو بات تھی۔ مجھے ایسے ہی کسی آدمی کی تلاش تھی۔"

"دیکھا..... کس طرح جنگی بجانے میں تمہارا مسئلہ حل کردیا؟ مجھ جیسا کھوٹا سکہ بھی کبھی کبھی کام آجاتا ہے۔ مجھے زندگی کے راستے پر بے پروائی سے کہیں ادھر ادھر نہ پھینک دینا۔"

"ہرگز نہیں۔ میں تو تمہیں طلائی اشرفی سمجھ کر سب سے اوپر والی جیب میں سنبھال کر رکھوں گا" میں نے محبت سے کہا "تم ذرا نذیر خان کا ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ مجھے بتاؤ۔"

اس نے کچھ دیر مجھے ہولڈ کرایا اور نہ جانے کہاں سے وہ ایڈریس وغیرہ تلاش کرکے مجھے لکھانے کے بعد بولی "کہیں اسی وقت اس کے گھر نہ چل دینا۔ میری بات اور ہے۔ لیکن یہ کسی شریف آدمی کے گھر جانے کا وقت نہیں ہے۔"

"نہیں۔ میں کم از کم صبح کا اجالا نمودار ہونے کا انتظار تو کروں گا" میں نے اسے تسلی دی "اب میں تمہارا رسمی شکریہ تو ادا کروں گا نہیں۔ شکریہ ادا کرنے کے لئے مجھے تمہارے گھر بھی آنا پڑے گا۔"

"یقیناً۔ تمہارے رسمی شکریے کی تو [illegible] ت بھی نہیں ہے۔ ویسے بائی دی وے..... اس وقت میری نیند خراب کرنے کے بعد اب تم خود کیا کرو گے؟"

"میں دو تین گھنٹے نیند لے لوں گا" میں نے اطمینان سے جواب دیا "نذیر خان سے ملاقات کے لئے جاتے وقت میرا ذہن ذرا تازہ ہو تو اچھا ہے۔"

"بڑے ہی کمینے اور خود غرض انسان ہو تم" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

"تعریف کا شکریہ" میں نے کہا "اور شب بخیر..... بلکہ اب تو شب بھی بے چاری تقریباً گزر ہی چکی ہے۔ اس لئے صبح بخیر۔"

سلسلہ منقطع کرکے میں اپنے آپ کو قدرے مطمئن محسوس کرتے ہوئے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ طاہرہ خانم سے شناسائی میرے لئے فائدے مند ہی ثابت ہوئی تھی۔ وہ عورت جیسی بھی تھی مگر اندر سے اچھی تھی۔ کم از کم کھری تو تھی۔

○☆○

علی الصباح اٹھ کر میں نے نذیر خان کے گھر فون کیا۔ کسی عورت نے ریسیو کیا اور بتایا کہ خان صاحب نماز پڑھ رہے ہیں۔ اس نے میرا نمبر لے لیا کہ چند منٹ بعد خاں صاحب خود مجھے فون کرلیں گے۔ نذیر خان نماز پڑھ رہا تھا۔ میں نے سوچا آدمی ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس سے کھل کر بات کرلینے میں شاید کچھ حرج نہ ہو۔ چند منٹ بعد اس کا فون آگیا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ غائبانہ طور پر مجھ سے واقف ہی نکل آیا۔ وہ جس کمپنی کی ایک برانچ کا جنرل مینجر تھا' اس سے ہماری کسی کمپنی کا کچھ لین دین تھا۔ میں نے طاہرہ خانم کا حوالہ دیا تو وہ بولا "اب اس کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں چوہدری صاحب! بہرحال میرے بارے میں اگر اس نے آپ کو بتایا ہے تو پھر آپ مجھے اپنا دہرا خادم سمجھیں۔ فرمایئے' میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں فوری طور پر اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کے مزاج میں اتنا انکسار تھا کہ فوراً بولا "یہ تو میرے لئے اعزاز ہوگا چوہدری صاحب! میں ابھی حاضر ہوجاتا ہوں۔ آپ اپنا ایڈریس مجھے بتایئے۔"

"نہیں۔ میں خود ہی آرہا ہوں" میں نے کہا۔ مجھے اچھا معلوم نہیں ہوا کہ اس کے انکسار سے فائدہ اٹھاؤں۔ کام اس سے مجھے تھا۔ بہتر یہی تھا کہ میں اس کے گھر چلا جاتا۔ اس نے بہت کہا کہ مجھے اس کے "غریب خانے" پر آنے کی زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ میں جہاں حکم کروں وہ حاضر ہوجائے گا لیکن میں نے اس کی یہ بات نہیں مانی۔

میں جب اس کا ایڈریس تلاش کرتا ہوا سمن آباد کی ایک گلی میں اس کی چھوٹی سی کوٹھی تک پہنچا تو وہ گیٹ کھولتے باہر ہی میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ ایک قد آور اور سرخ و سپید آدمی تھا۔ آدھے سے زیادہ بال سفید تھے۔ پچاس پچپن کے پیٹے میں تھا۔ معمولی سی سفید شلوار قمیص میں وہ ایک عام' سیدھا سادا' دکان دار ٹائپ سا آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے چہرے پر طمانیت کی چمک تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جو زندگی سے بہرحال مطمئن رہتے ہیں۔ کبھی شکوہ نہیں کرتے۔ اس لئے سکھ کی زندگی گزارتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد دنیا میں دن بدن گھٹتی جارہی ہے۔ اسے دیکھ کر کسی کو گمان تک نہیں گزر سکتا تھا کہ ملک کے وزیر خارجہ سے اس کی ایسی قریبی شناسائی ہوگی کہ وہ اس کی کوئی بات ٹالتے نہیں ہوں گے۔ اس کا ایک ہاتھ یقیناً مصنوعی تھا۔ اس پر دستانہ چڑھا ہوا تھا۔

میں گاڑی سے اترا تو اس نے "السلام علیکم" اور "جی آیاں نوں" کہتے ہوئے بہت گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ جو انکسار میں نے فون پر اس کے لہجے میں محسوس کیا تھا وہ اس کے رویے میں بھی موجود تھا۔ وہ مجھے سیدھا ڈرائنگ روم سے ملحق اپنے ڈائننگ روم میں لے گیا جہاں گھریلو لباس میں ایک نہایت خوب صورت لڑکی ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے لئے برتن لگوا رہی تھی۔ ایک نوکر اس کی مدد کررہا تھا۔

پہلی نظر میں تو اس لڑکی پر غیر ملکی ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ اس کے بال سنہرے اور آنکھیں نیلی تھیں۔ رنگت سفید فاموں کی طرح سرخ و سپید تھی۔ لگتا تھا ناشتے کے لئے کوئی خصوصی اہتمام ہورہا تھا۔ نذیر خان سے طے یہ پایا تھا کہ میں ناشتا اس کے ساتھ کروں گا۔ کمرے میں میرے داخل ہوتے ہی اس لڑکی نے مجھے سلام کیا۔ اس کی عمر تیس کے قریب ہوگی۔ وہ ذرا فربہی مائل تھی۔ لڑکی کیا' گھریلو سی عورت ہی معلوم ہوتی تھی۔ سلام کرتے ہی وہ دوپٹا سر پر ٹھیک کرتے ہوئے فوراً کچن میں چلی گئی۔

اس کی عدم موجودگی میں نذیر خان اس کا تعارف کراتے ہوئے بولا "یہ شکیلہ تھی۔ عام طور پر لوگ اسے میری بیٹی سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں۔ اس لئے میں پہلے ہی وضاحت کردوں تو بہتر ہوگا کہ یہ میری بیوی ہے۔"

اچھا ہی ہوا اس نے وضاحت کردی۔ غلط فہمی مجھے بھی ہونے لگی تھی۔ بہرحال یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ بندے پر تھوڑی سی خوش حالی آجائے اور وہ جستجو میں بھی رہے تو بڑی عمر میں بھی دوسری شادی کے لئے کم عمر اور حسین لڑکیاں میسر آجاتی ہیں۔

نذیر خان گویا میرے خیالات پڑھ رہا تھا۔ ہم بیٹھ چکے تو بولا "پہلی ہی ملاقات پر اس قسم کی وضاحتیں کرنا اور اپنے نجی معاملات

کے قصے سنانا اچھا تو نہیں لگتا لیکن آپ نہ جانے کیوں پہلی ہی ملاقات میں کچھ اپنے اپنے سے لگ رہے ہیں اس لئے بتا رہا ہوں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد میرا دوسری شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیوں کہ بچے تقریباً جوان ہی ہوچکے تھے۔ خاص طور پر عمر میں اپنے سے اتنی چھوٹی لڑکی سے شادی کرنے کا تصور میرے لئے کچھ ایسا خوش کن نہیں تھا لیکن یہ خود شکیلہ کا اصرار تھا۔ اس نے صرف مجھے ہی نہیں اپنے والدین کو بھی مجبور کردیا۔"

"پھر تو آپ کی خوش قسمتی میں کوئی شک نہیں" اب میں نے ذرا دلچسپی محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے ہلکا سا شبہ بھی ہوا کہ کہیں وہ مبالغہ آرائی تو نہیں کررہا تھا؟

وہ اپنے ہاتھوں سے سیرے لئے ایک پلیٹ سے نیپکن سے نمی صاف کرتے ہوئے بولا "وہ کسی حد تک فلمی سے حالات تھے جن میں شکیلہ سے میری شادی ہوئی۔ میں اسے بالکل نہیں جانتا تھا۔ میں تو ایک صبح ٹیکسی میں مزنگ چونگی سے گزر رہا تھا کہ صنم سینما کے قریب مجھے ایک عجیب تماشا نظر آیا۔ کالج کے یونیفارم میں ایک نہایت خوب صورت لڑکی کو تین ڈنگرے قسم کے غنڈے اٹھا کر ایک جیپ میں ڈالنے کی کوشش کررہے تھے۔ وہ دیکھنے میں جتنی نرم و نازک نظر آتی تھی اتنی ہی شدت سے مزاحمت کررہی تھی۔ اس کا یونیفارم پھٹ چکا تھا۔ کتابیں بس اسٹاپ کے سامنے بکھر چکی تھیں۔ بس اسٹاپ پر چند دوسری لڑکیاں بھی تھیں جو سہمی ہوئی ہرنیوں کی طرح ادھر ادھر دبک گئی تھیں۔ کوئی ان بدمعاشوں کو روکنے کی کوشش نہیں کررہا تھا کیوں کہ ان میں سے دو کے پاس رائفلیں تھیں۔ ٹریفک چلا جارہا تھا۔ لوگ نظر بچا کر گزرے چلے جارہے تھے۔ پولیس تو وہاں موجود نہیں تھی۔ میں خود پولیس میں نوکری کرچکا ہوں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ بعض اوقات پولیس موقع پر پہنچ سکنے کی اہل ہونے کے باوجود نہیں پہنچتی۔ وارداتوں کے بعد ہی پہنچتی ہے۔ بہرحال کچھ دور ایک ٹریفک کانسٹیبل موجود تھا۔ وہ بھی بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا حالانکہ وہ ٹریفک کا آدمی ہی سہی لیکن اس کے جسم پر قانون کی دی ہوئی وردی تو موجود تھی....."

ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر اس نے متاسفانہ سے انداز میں گہری سانس لی۔ میں نہایت انہماک سے اس شخص کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ لاہور جیسے شہر کی ایک بھری پری سڑک پر ہورہا ہے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ٹیکسی روکنے کے لئے کہا تو بولا "چھوڑیں جی! آپ کیوں چکر میں پڑتے ہیں۔ کیا پتا لڑکی کا پیچھے سے کوئی چکر ہو" میں عام طور پر شدید غصے کے عالم میں بھی گالی نہیں دیتا لیکن اس روز میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو گالی دی۔ وہ کچھ سہم چھ فٹ کا جوان تھا۔ میری مدد کرنے کے بجائے مجھے مشورے دے رہا تھا..... اور چوہدری صاحب! میں اس وقت بھی اسی طرح ٹھنڈا تھا....."

اس نے اپنا مصنوعی ہاتھ گویا یاد دہانی کے لئے بلند کیا۔ اس ہاتھ پر چڑھا ہوا لمبا دستانہ اس کی آستین میں گیا ہوا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "خان صاحب! ہمارے نظام کی خرابیوں نے اور تو جو گل کھلائے ہیں سو کھلائے ہیں لیکن ساتھ ہی ایک بہت بڑا ظلم یہ کیا ہے کہ بدمعاشوں کو یہ نظام دن بدن زیادہ بے خوف اور شریف آدمی کو دن بدن زیادہ بزدل بنا رہا ہے۔"

"اصل میں بدمعاش دن بدن زیادہ متحد' زیادہ منظم ہو رہے ہیں جب کہ شریف آدمی دن بدن بکھر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے زیادہ دور ہو رہے ہیں۔ پڑوسی بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے" نذیر خان نے کہا "بہرحال۔ چوہدری صاحب! وہ نظارہ دیکھ کر میری تو کھوپڑی گھوم گئی۔ ریوالور میرے پاس تھا۔ ٹیکسی سے اترتے ہی میں نے دو چار ہوائی فائر کئے اور اس نقلی ہاتھ سے ہی ان کی کھوپڑیاں پچکا کر رکھ دیں۔ یہ ان بریگ ایبل' ٹھوس پلاسٹک کا ہے اور مضبوط پٹیوں کے ذریعے کہنی تک بندھا ہوا ہے۔ یہ بھی میرا ایک معقول ہتھیار ہے۔ لکڑی کے ہتھوڑے کا کام دیتا ہے۔ آپ اسے خود پرستی یا گپ مت سمجھئے گا۔ مجھ اکیلے' اچھی بھلی عمر کے ٹنڈے آدمی نے ان کی درگت بنادی۔ انہیں ایک گولی بھی چلانے کی مہلت نہیں دی۔ یہ صرف جذبے کا کمال تھا۔ میں دل میں صرف ایک بے غرض جذبہ لے کر گیا تھا کہ مجھے اس بے بس اور کمزور لڑکی کو بدمعاشوں کے ہاتھوں سے بچانا ہے۔ میں نے صرف یہ تہیہ کیا تھا۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ باقی سب کچھ کیسے ہوتا چلا گیا۔ مجھے صرف اس وقت ہوش آیا جب میں نے انہیں جیپ میں بیٹھ کر بھاگتے دیکھا۔ شکیلہ کو وہ چھوڑ گئے تھے۔ ایک کی رائفل بھی وہیں گر گئی تھی۔"

"جب اصل اور سچے مرد میدان میں آتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں شکیلہ کو اس کے گھر چھوڑ کر آیا۔ اس کی کہانی کا پتا چلا۔ ایک صوبائی وزیر کا چکر تھا۔ موصوف کالج کی کسی تقریب میں شکیلہ کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئے تھے۔ عمر چالیس سے اوپر تھی۔ تین چار بیویاں پہلے سے موجود تھیں۔ کوئی گاؤں میں' کوئی شہر میں۔ دو چار داشتائیں بھی تھیں۔ روپیہ بے حساب تھا۔ زمین داری اور سیاست نے بے مہار بنا دیا تھا۔ کم ظرفوں کو یہ چیزیں ہضم نہیں ہوتیں۔ پہلے اس نے شکیلہ کے گھر رشتے کا پیغام بھیجا۔ شکیلہ کا تعلق نچلے متوسط طبقے سے تھا۔ اس کے والدین تو خوف اور الجھن میں کوئی جواب بھی نہ دے پائے مگر خود شکیلہ نے صاف انکار کر دیا۔ وزیر صاحب نے انا کا مسئلہ بنا لیا۔ وہی پرانے ہتھکنڈے' وہی غنڈہ گردی۔ اور آخرکار موصوف آخری حربے پر اتر آئے۔ غنڈے بھیج کر شکیلہ کو اٹھوانے کی کوشش کی۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بیچ میں ٹپک پڑے نذیر خان۔"

"کاش ایسے ہر موقع پر ٹپک پڑنے کے لئے دنیا میں بہت سے نذیر خان ہوں" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

نذیر خان سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "شکیلہ کے ذہن پر اس واقعے کا عجیب ہی اثر ہوا۔ اس نے گھر والوں سے دو ٹوک کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گی تو صرف مجھ سے۔ وہ پڑھی لکھی اور سوچنے والی لڑکی تھی۔ اس نے عجیب ہی فلسفہ اپنا لیا۔ کہنے لگی کہ وہ اس سوسائٹی میں کسی سے شادی کر کے کیا کرے گی جو اس کی عزت لٹتے دیکھ کر اس کی مدد کے لئے نہیں آسکتا۔"

"لیکن آپ بھی تو اسی سوسائٹی کے فرد تھے" میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ وہ مجھے اس گم گشتہ تہذیب کی بچی کھچی نشانیوں میں سے ایک قرار دیتی تھی جو اب نہ جانے دنیا کے کس گوشے میں منہ چھپائے پڑی ہے۔ وہی تہذیب جس کی روایتوں میں سے ایک روایت یہ بھی تھی کہ کسی پر ظلم ہوتے دیکھ کر خاموش نہ رہا جائے۔"

شکیلہ اگر کالج کے زمانے میں اتنا سوچ سکتی تھی اور اتنی زبردست قوت فیصلہ رکھتی تھی تو وہ بلاشبہ ایک ذہین اور منفرد لڑکی تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے نذیر خان بولا "شکیلہ کو ایک مضبوط مرد کا سہارا میسر آیا تو وہ ایسی شیرنی بنی کہ کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے عدالت میں بیانات دیئے۔ پریس کانفرنسیں کیں۔ ہر جگہ خم ٹھونک کر کھڑی ہوئی۔ ادھر اپنی بھی کچھ کام کے آدمیوں سے شناسائی تھی۔ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ سرکاری حلقوں میں بھی دو چار آدمی آپ کے اس خادم کی عزت کرتے ہیں۔ ہم حقیر فقیر لوگ تھے۔ لیکن صوبائی وزیر صاحب کو ہم نے اچھا رگڑا دیا۔ انہیں ہم جیل تو نہ بھجوا سکے لیکن وزارت سے بہرحال انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔ ان کے وہ خاص بدمعاش البتہ آج تک جیل میں سڑ رہے ہیں جنہوں نے شکیلہ کو اٹھا کر ان کی خدمت میں پیش کرنے کی ذمے داری لی تھی۔"

"بڑی خوشی ہو رہی ہے مجھے یہ سن کر" میں نے کہا۔

"بہرحال اس وقت مجھے ان لوگوں سے پنگا لینا اتنا مشکل محسوس نہیں ہوا تھا جتنی مشکل میں شکیلہ نے مجھے ڈال دیا تھا۔ وہ مجھ سے شادی کرنے پر تل گئی تھی جب کہ مجھے اپنی اور اس کی عمر کا فرق دیکھ کر..... اپنے تقریباً جوان بچوں کو دیکھ کر شرم آرہی تھی۔ لیکن بہرحال..... یہ کام ہونا تھا' سو ہو گیا۔ پہلی بیوی سے میرا ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ اتفاق ہے کہ لڑکی کی شادی بھی ملک سے باہر ہوئی اور لڑکا بھی نوکری کے سلسلے میں ملک سے باہر ہے۔ شکیلہ سے بھی میرے دو بچے ہیں۔ وہ ابھی چھوٹے ہی ہیں۔ اسکول جاتے ہیں۔ زندگی ٹھیک ٹھاک ہی گزر رہی ہے" وہ بہت دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا۔

"اور طاہرہ خانم کبھی یاد نہیں آتی؟" میں نے اس سے بھی دھیمی آواز میں پوچھا۔

وہ ہولے سے ہنسا "بڑی خبیث عورت ہے۔ اس نے یقیناً آپ کو بتا دیا ہوگا کہ کبھی میں دل و جان سے اس پر فدا تھا۔ انسان پر زندگی میں عجیب عجیب دور آتے ہیں۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں' قدرت جو کرتی ہے بہتری کرتی ہے۔ اچھا ہی ہوا مجھے دوسری شادی کے لئے طاہرہ خانم جیسی عورت میسر نہیں آئی۔ وہ عورت نہیں' طوفان ہے' اسے اپنے گھر تک' اپنی زندگی تک محدود رکھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ مجھے تو شکیلہ جیسی عورت ہی کی ضرورت تھی۔ میں قسمت کے اس فیصلے پر بہت خوش ہوں۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اچانک ہی پوچھا "آج کل وہ آپ پر مہربان ہے کیا؟"

نہ جانے کیوں اس موقعے پر میں سچ بولنے سے کترا گیا "کاروبار کی حد تک مہربان ہے۔ ہم جلد ہی ایک جوائنٹ وینچر شروع کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی بہت عزت کرتے ہیں اور بس۔"

"اچھی بات ہے" اس نے سر ہلایا "ہے وہ بڑی خبیث۔ لیکن عزت اس کی میں بھی کرتا ہوں۔ ابھی تک کرتا ہوں۔ بہرحال..... میں نے تو آپ کو اپنی رام کہانی سنا دی۔ جو میں تقریباً ہر نئے آنے والے کو سناتا ہوں۔ میں نے آپ کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اب آپ اپنی سنایئے۔ طاہرہ نے آپ کو کس سلسلے میں میرے پاس بھیجا ہے؟"

اب میں نے اسے اپنی رام کہانی سنائی۔ میں نے ریڈ ڈاٹ کا اور ہنی کا نام نہیں لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ سازش میرے لئے' ملک کے لئے اور خود وزیر خارجہ کے لئے خطرناک تھی۔ میں اس سلسلے میں ذاتی طور پر کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لئے منسٹر صاحب سے میری ملاقات ہونا اور ان کا مجھ سے متفق ہونا ضروری تھا۔ سازش کا سن کر وہ بھی فکرمند ہو گیا۔ تاہم اس نے غیر ضروری..... بلکہ ضروری سوالات بھی نہیں کئے۔

"منسٹر صاحب سے ملاقات تو کوئی مسئلہ نہیں ہے" چند لمحے کسی سوچ میں ڈوبا رہنے کے بعد وہ بولا "لیکن ان کو قائل کرنا آپ کا کام ہے۔ وہ بڑے ٹیڑھے آدمی ہیں۔"

"کوشش کر کے دیکھنا ہمارا فرض ہے۔ ورنہ ویسے تو یہ معاملہ میں نے اوپر والے پر چھوڑ دیا ہے۔ جو ہوگا سو دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔

اس نے قریب ہی تپائی پر رکھا ہوا فون اٹھا کر اپنے سامنے ڈائننگ ٹیبل پر رکھا اور یکے بعد دیگرے کئی نمبر گھمانے اور کئی افراد سے بات کرنے کے بعد فون واپس رکھتے ہوئے بولا "ابھی تو منسٹر صاحب کی فلائٹ ہی لاہور پہنچنے میں ایک گھنٹا باقی ہے۔ ایئرپورٹ پر پریس اور ٹی وی کے نمائندوں وغیرہ سے باتیں کرتے کراتے انہیں آدھا گھنٹا اور گزر جائے گا۔ وہ کافی عرصے بعد لاہور آرہے ہیں اور وہ بھی صرف ڈھائی تین گھنٹے کے لئے۔ اس دوران وہ صرف گورنر ہاؤس میں رہیں گے۔ بہت سے لوگوں سے ان کی ملاقاتیں طے ہیں۔ بہرحال آپ کو اس سلسلے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کی ملاقاتیں خواہ کسی سے بھی طے ہوں' ہم سے ملاقات بہرحال ہو جائے گی۔ لیکن اس کے لئے ہمیں کم از کم دو گھنٹے تو انتظار کرنا پڑے گا تاکہ وہ گورنر ہاؤس پہنچ چکیں اور ذرا سکون کی سانس لے چکیں۔ اس وقت تک آپ آرام سے ٹانگیں پسار کر بیٹھیں۔ ڈٹ کر' خالص لاہوری قسم کا ناشتا کریں۔ یہ غریب خانہ اس قابل تو نہیں لیکن پھر بھی آپ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔ میری بھی آج دفتر سے چھٹی ہے۔ آج یہی کام کر لیتے ہیں۔ کچھ گپ شپ کر لیتے ہیں۔"

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ چونک کر بولا "لیکن آپ تو بہت مصروف ہوتے ہوں گے۔ دو گھنٹے ضائع کرنے کے متحمل ہو سکیں گے؟"

"آپ کے پاس بیٹھنا وقت ضائع کرنا تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ویسے بھی میرے دوسرے معاملات تو چلتے ہی رہیں گے لیکن اس معاملے کو میرا ذاتی طور پر دیکھنا ضروری ہے۔ اب تو جتنا بھی وقت صرف کرنا ضروری ہوگا' کریں گے۔"

اس دوران میز پر ناشتا لگایا جا چکا تھا۔ ناشتا ملازم نے ہی لگایا تھا۔ شکیلہ دوبارہ کمرے میں نہیں آئی تھی۔ ناشتا واقعی خالص لاہوری قسم کا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نذیر خان نے لاہور کے ہر گوشے میں ناشتے میں استعمال ہونے والے لوازمات جمع کر لئے تھے۔ پوری' پراٹھا' پائے' نہاری' چھولے' لسی اور نہ جانے کیا کچھ موجود تھا۔

میں نے حیرت سے کہا "میں تو اکیلا ہی آپ سے ملنے آرہا تھا۔ آپ نے تو ناشتے کا انتظام پوری بٹالین کے لئے کیا ہوا ہے۔"

"میں نے سوچا۔ آپ کو ان میں سے نہ جانے کون سی چیز پسند ہو۔ میں نے سبھی کا انتظام کر لیا" وہ سادگی سے بولا "انگریزی ناشتے تو آپ کرتے ہی رہتے ہوں گے۔ میں ذرا دیسی سا آدمی ہوں۔ ویسے آدھی بٹالین تو آپ مجھے ہی سمجھ لیں۔ آدھی چیزوں کا صفایا تو میں کر دوں گا۔ جہاں تک آپ کا بس چلے آپ اپنی سی کوشش کیجئے۔ بس اب دیر مت کیجئے اور ان چیزوں پر ٹوٹ پڑیے۔"

اس کا اکلوتا ہاتھ حرکت میں آگیا۔ وہ واقعی ایک خوراک آدمی تھا۔ پہلوانوں کی طرح کھاتا تھا۔ میں کوشش کے باوجود اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ عمر کے زمانے میں دنیا کی ہر چیز کھا جانے کو جی چاہتا تھا۔ اب طبیعت سیر رہتی تھی۔ ویسے بھی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ طاقت ور رہنے کے لئے زیادہ کھانا ضروری نہیں تھا۔

کھانے کے بعد لسی کا دور چل رہا تھا جب میں نے میز پر

ئے اس کے مصنوعی ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "طاہرہ خانم
نے مجھے بتایا تھا کہ جس واقعے میں آپ کا یہ ہاتھ ضائع ہوا تھا'
راصل وہی واقعہ آپ کو منسٹر صاحب کے قریب لانے کی وجہ بنا تھا؟"

"جی ہاں۔ اور اسی واقعے کی وجہ سے میں نے آپ کی بتائی
ئی کہانی پر اتنی جلدی یقین کرلیا ہے۔ آپ نے کسی ملٹی نیشنل
کمپنی کی بات کی ہے۔ میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا اس میں
ی کوئی ملٹی نیشنل کمپنی ملوث تھی۔ وزارت خارجہ کا معاملہ تھا۔
اہر ہے بڑی لمبی چوڑی تحقیقات ہوئی تھیں۔ مجھے زیادہ تفصیل تو
علوم نہیں ہوسکی۔ میں تو اس وقت محض ایک باڈی گارڈ تھا۔
لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم ہوگیا تھا کہ ایک بڑے ملک کے اشارے
اس کمپنی کے بارے میں تحقیقات روک دی گئی تھی۔"

"ہوا کیا تھا؟" میں نے پوچھا اور کوشش کی کہ میرے لہجے سے
یادہ تجسس کا اظہار نہ ہو۔

"کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن اب بھی وہ وقت یاد آتا
ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے میرے اس مصنوعی ہاتھ میں اذیت کی لہریں
ڑ رہی ہیں۔ شاید وہ ہاتھ اب بھی کسی غیر مرئی رابطے کے ذریعے
پنی یاد دلاتا ہے جو اب اس بازو کے ساتھ نہیں ہے" وہ بغور اپنے
ستانہ پوش مصنوعی ہاتھ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "وہ شاید میرے لئے بیک
قت خوش قسمتی اور بدقسمتی کا لمحہ تھا۔ بدقسمتی اس لئے کہ مجھے
پنے دائیں ہاتھ سے' نہایت اذیت ناک انداز میں محروم ہونا پڑا۔
وش قسمتی اس لئے کہ یہ جو تھوڑی بہت عزت اور خوش حالی میری
زندگی میں آئی ہے' یہ اس واقعے کے بعد ہی رفتہ رفتہ آئی ہے۔
فیظ صاحب مہربان ہوئے تو ان کے وسیلے سے اللہ نے زندگی کی
ساری آسائشیں دے دیں۔ بچے بھی سیٹ ہوگئے۔ حتیٰ کہ شکیلہ
یسی بیوی بھی مل گئی۔"

لسی کا عظیم الشان گلاس میز پر رکھ کر ٹشو پیپر سے ہونٹ
صاف کرنے کے بعد بولا "ان دنوں حفیظ صاحب منسٹر نہیں تھے۔
سی منسٹری میں انڈر سیکریٹری تھے۔ منسٹر ہمیشہ ڈائریکٹ آتا ہے۔ وہ
پہلے منسٹر ہیں جو اسی وزارت سے' نچلے عہدے سے لئے گئے۔ گویا
صحیح معنوں میں "ٹیکنوکریٹ" ہیں۔ جس روز کا میں ذکر کررہا ہوں
اس روز میں انہیں ایک ریسٹ ہاؤس میں پہنچا کر آیا تھا۔ اس
وقت گارڈ کی ڈیوٹی بدل چکی تھی۔ اس لئے میں گھر واپس جارہا تھا۔
سرکاری گاڑی میں تھا۔ حفیظ صاحب کے قبضے میں چوں کہ ہر وقت
کوئی نہ کوئی اہم فائل رہتی تھی یا انہیں کم از کم یہ علم ضرور ہوتا
تھا کہ فلاں فائل کہاں ہے۔ اس لئے انہیں ہر وقت گارڈز کی
خدمات حاصل رہتی تھیں۔ انہوں نے شاید مجھ سے باتوں باتوں میں
ذکر کیا تھا کہ ریسٹ ہاؤس سے وہ کہاں جائیں گے لیکن میں نے اس
وقت توجہ سے سنا نہیں تھا کیوں کہ انہیں ریسٹ ہاؤس پہنچانے کے
بعد میری ڈیوٹی ختم ہورہی تھی۔ میرے حق میں' اور ان کے حق میں
بھی یہ اچھا ہی ہوا کہ میں نے ان کی بات توجہ سے نہیں سنی تھی۔"

اس نے جگ سے تھوڑی سی لسی گلاس میں انڈیلی۔ چائے کی
طرح اس کی چسکیاں لیتے ہوئے بولا "ریسٹ ہاؤس سے واپسی پر چند
آدمیوں نے مجھے دھوکے سے بے قابو کرکے اغوا کرلیا۔ آنکھوں پر
پٹی باندھ کر وہ مجھے نہ جانے کہاں لے گئے۔ جہاں میری آنکھوں
سے پٹی کھولی گئی وہ ایک بہت بڑا کچن تھا' جیسے عام طور پر ہوٹلوں
وغیرہ کے ہوتے ہیں۔ میرے پاؤں انہوں نے باندھ دیئے تھے۔ ہاتھ
البتہ کھلے ہوئے تھے۔ حفیظ صاحب اس روز دفتر سے اپنے بریف
کیس میں کوئی فائل لے کر چلے تھے لیکن مجھے ظاہر ہے اس کے
بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ باڈی گارڈز کو بھلا ایسی چیزوں کا کہاں
پتا ہوتا ہے۔ لیکن انہیں شاید کہیں سے کوئی غلط اطلاع ملی تھی یا کیا
بات تھی۔ بہرحال انہوں نے مجھ سے پوچھنا شروع کردیا کہ حفیظ
صاحب وہ فائل لے کر کہاں گئے ہیں۔ میں نے ان کے کسی بھی
سوال کا جواب دینے سے انکار کردیا۔ انہوں نے میرا دایاں ہاتھ
ٹھوس لکڑی کے ایک کاؤنٹر پر رکھا اور گوشت کاٹنے والا ایک
بھاری چاپڑ اٹھا کر چوڑے رخ سے اس پر مارا۔ میں نے اپنے ہاتھ
کی ہڈیاں ٹوٹنے کی آواز سنی۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر گویا میرے چہرے پر کوئی
ردعمل تلاش کرنے لگا۔ میں خاموش بیٹھا ایک ٹک اس کی طرف
دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا "میں نے بہت چیخیں ماریں لیکن ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ وہاں دور دور تک میری آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ چاپڑ کا
ایک وار کرکے میری ہڈیوں کو مزید چورا بناتے پھر پوچھتے "حفیظ
صاحب اس وقت کہاں ہیں؟" میں اپنے ہاتھ کا ملغوبہ بنتے دیکھ رہا
تھا اور چیخیں مار رہا تھا۔ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح ڈکرا رہا تھا
لیکن وہ گویا میری آوازیں سن ہی نہیں رہے تھے۔ انہیں صرف
اپنے سوال کے جواب سے غرض تھی۔ بار بار وہ اپنا سوال دہرائے
جارہے تھے۔ ہاتھ کا بالکل ملغوبہ بن گیا تو وہ اس سے ذرا اوپر کلائی
کی طرف آگئے۔ سچی بات ہے ..... میں آپ سے حقیقت نہیں
چھپاؤں گا ..... اذیت کی شدت کے باوجود میں بے ہوش بھی نہیں
ہورہا تھا ..... اور اذیت میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ آخر کار
میں نے انہیں بتادیا کہ میں نے کافی دیر پہلے حفیظ صاحب کو ریسٹ
ہاؤس میں چھوڑا تھا۔ آج سوچتا ہوں تو شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے
اشد مجبور ہوکر یہ بات بتا تو دی تھی مگر یہ جواب ان کے کسی کام کا
نہیں تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں وہ دیکھ چکے تھے۔ حفیظ صاحب وہاں
نہیں تھے۔ وہاں سے وہ کہیں اور روانہ ہوچکے تھے۔ کسی کو نہیں
معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے تھے۔ مجھے اغوا کرنے والوں کو یقین تھا کہ
مجھے ان کے پروگرام کا علم ہے۔ مجھے یاد تھا' انہوں نے مجھے بتایا تو
تھا کہ ریسٹ ہاؤس سے وہ دوسرے باڈی گارڈ اور دوسرے ڈرائیور
کے ساتھ کہیں جائیں گے لیکن میں نے ان کی بات زیادہ توجہ سے
نہیں سنی تھی۔ میرا ذہن کہیں اور پھنسا ہوا تھا۔ جگہ کا نام مجھے یاد

نہیں رہا تھا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا۔ میں لمبے چوڑے دعوے کرتا
اور نہیں کرتا۔ اگر مجھے یاد ہوتا تو کوئی بعید نہیں کہ اس اذیت کی
تاب نہ لاکر میں بتا ہی دیتا۔ انسان بہرحال انسان ہی ہوتا ہے۔
لیکن بس قدرت کو اس بہانے مجھے عزت دلانا مقصود تھا۔ میں نے
بعد میں حفیظ صاحب کو بھی سچ بتادیا تھا کہ وہ میری قوت برداشت کا
کمال نہیں تھا جو میں نے زبان بند رکھی۔ بلکہ مجھے یاد ہی نہیں رہا
تھا۔

اس کے باوجود حفیظ صاحب نے اسے میری قربانی ہی سمجھا۔
یہ ان کی انسان نوازی تھی۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ ان کے پاس
اسلحے کی ترسیل سے متعلق ایک بہت اہم فائل تھی جو اگر کسی کے
ہاتھ لگ جاتی تو ہمارے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔ اس
وقت موقع بھی بہت نازک تھا' بہرحال میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ
میری ذرا سی قربانی سے ملک ایک بڑے نقصان سے بچ گیا۔ اس
کے بعد حفیظ صاحب کے لئے حفاظتی انتظامات بہت بڑھا دیئے گئے
تھے اور فائلوں کی نقل و حمل میں بھی خصوصی احتیاطی تدابیر اختیار
کی جانے لگی تھیں۔"

نذیر خان ایک بار پھر ٹشو پیپر سے ہونٹ اور مونچھیں صاف
کرنے لگا تو میں نے پوچھا "اغوا کرنے والوں نے آپ کی جان کیسے
چھوڑی تھی؟"

"انہوں نے رفتہ رفتہ صرف میرا ہاتھ ہی نہیں بلکہ کلائی کا کچھ
حصہ بھی کچل ڈالا تھا" نذیر خان مزید بتانے لگا "پھر انہوں نے چاپڑ
سیدھا کرکے دھار کی طرف سے اس کچلے ہوئے ہاتھ اور کلائی پر
باقاعدہ ترتیب سے کٹ لگانے شروع کئے۔ بالکل اسی طرح جیسے
قصاب پسندے بنانے کے لئے پہلے گوشت کو چپٹا کرتا ہے پھر اس پر
آڑے ترچھے کٹ لگاتا ہے۔ میرے ہاتھ اور کلائی کا گوشت تو خیر
چپٹا نہیں ہوا تھا' بالکل ملغوبہ بن چکا تھا۔ ہڈیوں تک کا چورا بن چکا
تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے باوجود مجھے کٹ لگائے
جانے کی تکلیف بھی اسی شدت سے محسوس ہورہی تھی جس طرح
صحیح سلامت ہاتھ پر ہوسکتی تھی۔ اس بازو سے خون بھی بھل بھل
کرکے بہہ رہا تھا۔

آخر کار قدرت کو مجھ پر رحم آیا اور میں بے ہوش ہوگیا۔
میری حالت اس وقت ویسے بھی قریب المرگ شخص جیسی ہی تھی۔
اس کے علاوہ جس رفتار سے میرے بازو سے خون بہہ رہا تھا اس
کے پیش نظر شاید انہوں نے سوچا ہو کہ زیادہ خون بہہ جانے کے
باعث آخر کار مجھے مرجانا ہے چنانچہ وہ مجھے ایک سڑک کی گرین
بیلٹ پر جنگلے کی اوٹ میں پھینک گئے۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ سڑک
بالکل سنسان تھی۔ یہ صرف میری خوش قسمتی تھی کہ گھوڑوں پر
گشت کرتے ہوئے دو سپاہیوں کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس سے بھی
زیادہ خوش قسمتی یہ تھی کہ ان میں سے ایک سپاہی مجھے پہچانتا
تھا اس لئے اس نے مجھے اٹھا کر اسپتال پہنچانے میں کچھ زیادہ
مستعدی دکھادی ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ دونوں صلاح مشورے میں
مصروف رہتے اور میں اس دنیا سے رخصت ہوجاتا۔ کیوں کہ
اسپتال والوں نے بتایا تھا' اگر مجھے وہاں پہنچنے میں مزید چند منٹ کی
تاخیر ہوجاتی تو میرا بچنا مشکل تھا۔

بس اس واقعے کے بعد سے ہی حفیظ صاحب سے بہت ہی
قریبی تعلقات چلے آرہے ہیں۔ یہ ان کا ظرف اور وضع داری ہے
کہ وزیر خارجہ بننے کے بعد بھی انہوں نے ان تعلقات میں فرق
نہیں آنے دیا۔ انہوں نے ہی مجھے اپنے ساتھ امریکا لے جاکر یہ
مصنوعی ہاتھ لگوایا۔ انہوں نے ہی مجھے ایسی نوکری دلائی جس کا میں
کبھی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر میرے لئے وہ
عزت و اہمیت ہے جو وہ مجھ جیسے حقیر آدمی کو دیتے ہیں۔ کوئی چیز اس
عزت و اہمیت کی متبادل نہیں ہوسکتی۔ مجھے اپنے ہاتھ سے ضرور
"ہاتھ دھونا" پڑا لیکن انہوں نے مجھے یہ صدمہ اور محرومی
بھلادی۔"

"آپ نے ان لوگوں کی شکلیں دیکھی تھیں جنہوں نے آپ کو
اغواء کیا تھا" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ ان میں سے تو کسی خبیث نے نقاب تک پہننے کی
زحمت نہیں کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں کسی کا خوف
نہیں تھا۔ ان میں سے ایک سفید فام تھا۔ باقی چار دیسی ہی تھے"
نذیر خان نے بتایا۔

"سفید فام کس ملک کا باشندہ معلوم ہوتا تھا؟" میں نے
دریافت کیا۔

"میں زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں چوہدری صاحب! میں
ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں سارے سفید فام ہی انگریز معلوم
ہوتے ہیں۔ آپس میں وہ سارے ہی انگریزی میں بات کررہے تھے۔
مجھ سے اردو میں بات کرتے تھے۔ سفید فام نے تو مجھ سے کوئی بات
ہی نہیں کی۔ وہ جو بھی بات کرنا چاہتا تھا' مقامی لوگوں سے انگریزی
میں کرتا تھا۔ وہ آگے مجھ سے اردو میں کرتے تھے۔ حالاں کہ مجھے
سفید فام کی زبانی' انگریزی ہی میں بات سمجھ میں آجاتی تھی مگر وہ گویا
میرے لئے ترجمہ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔"

پھر وہ گویا اس وقت کو یاد کرتے ہوئے جھرجھری سی لے کر بولا
"چوہدری صاحب! ایک عجیب سی بات میں نے یہ محسوس کی تھی کہ
سفید فام مجھ سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔ حالاں کہ میرے لئے باقی
لوگوں کی طرح وہ بھی اجنبی تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اسے
دیکھا تھا' نہ اس کے بعد وہ زندگی میں کبھی مجھے نظر آیا۔ مگر ایسا
معلوم ہورہا تھا جیسے وہ مجھ سے شرمندہ تھا کہ مجھ پر سختی کی جارہی
تھی۔ ساری کارروائی ہمارے دیسی بھائیوں نے انجام دی۔ میرے
ہاتھ کا قیمہ انہوں نے ہی بنایا۔ اور بلا ہچکچاہٹ بنایا۔ سفید فام نے
مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ بلکہ ہاتھ کا قیمہ بننے کے دوران تو وہ
سر جھکائے کھڑا رہا جیسے اسے افسوس ہورہا ہو کہ بات یہاں تک پہنچ

گئی۔"

"لیکن کارروائی کا انچارج وہی معلوم ہو رہا تھا؟"

"جی ہاں۔ مگر وہی سست گواہ چست والا معاملہ معلوم ہو رہا تھا۔ جتنی مستعدی سے ہمارے دیسی بھائی کارروائی انجام دے رہے تھے اتنی شاید اسے بھی توقع نہیں تھی۔ میرا خیال ہے مجھے بے ہوشی کی حالت میں پھنکروایا بھی شاید سفید فام نے ہی ہو۔ ورنہ اپنے دیسی بھائی تو شاید میرا ایڑی سے چوٹی تک ہی قیمہ بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان لوگوں میں سے بھی کوئی زندگی میں دوبارہ مجھے نظر نہیں آیا آج تک۔"

"کیا وہ جگہ..... وہ کچن تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی؟" میں نے پوچھا۔

"کی گئی۔ لیکن میں اس سلسلے میں کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر وہاں لے جایا گیا تھا۔ آنکھوں سے پٹی ہٹی تو میں اس بند کچن میں کھڑا تھا۔ وہاں سے پھر مجھے بے ہوشی کی حالت میں ہی نکالا گیا اور جہاں لے جا کر پھینکا گیا وہ جگہ وہاں سے نہ جانے کتنی دور تھی۔ بہرحال مجھے چوں کہ اس پر کسی ہوٹل کے کچن کا گمان گزرا تھا۔ اس لئے مجھے بہت سے ہوٹلوں کے کچن لے جایا گیا مگر ان میں سے کوئی بھی وہ کچن نہیں تھا۔ پھر یہ کوشش ترک کر دی گئی کیوں کہ وہ کسی مکان کا کچن بھی ہو سکتا تھا۔ ماشاء اللہ ہمارے شہر میں ایسی ایسی کوٹھیاں اور بنگلے موجود ہیں جن کے کچن فائیو اسٹار ہوٹلوں کے کچن سے زیادہ بڑے اور عالیشان ہیں۔ محض کچن تلاش کرتے ہوئے کہیں تک پہنچنا بڑا مشکل تھا۔ پھر کچھ عرصے بعد تو معلوم نہیں کیوں، انوسٹی گیشن ہی بند کر دی گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم اس کیس کی فائل کا کیا بنا۔ میں نے کبھی حفیظ صاحب سے پوچھا بھی نہیں۔"

اسی طرح کی باتوں، اور پھر ادھر ادھر کی گپ شپ میں دو گھنٹے گزر ہی گئے۔ اس دوران اس کی بیوی شکیلہ بھی کچھ دیر کمرے میں آ کر بیٹھی اور اس سے رسمی سی گفتگو رہی۔ وہ سوچوں میں ڈوبی رہنے والی بڑی گہری سی عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بچے بھی اسکول جاتے وقت مجھ سے مل کر گئے۔ اس کے گھر میں مجھے ایک عجیب سے سکون اور اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اسی لئے اتنا وقت بغیر کسی اضطراب اور احساس زیاں کے گزر گیا۔ آئیڈیل دنیا میں حقیقت کے روپ میں کم ہی نظر آتے ہیں لیکن بہرحال وہ کافی حد تک ایک آئیڈیل گھرانا تھا۔

آخر کار نذیر خان نے خود ہی گھڑی دیکھ کر دوبارہ ٹیلی فون گھمانے شروع کئے۔ کئی نمبروں پر بات کرنے کے بعد وہ فون رکھتے ہوئے بولا "لو جی..... حفیظ صاحب گورنر ہاؤس پہنچ گئے ہیں۔ چند گھنٹوں کے لئے وہ گورنر صاحب کے مہمان ہیں۔ اپنی ملاقاتیں بھی انہوں نے وہیں رکھ لی ہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو گورنر صاحب اور حفیظ صاحب میں پرانی شناسائی ہے۔ حفیظ صاحب شاذ و نادر ہی کسی سے بے تکلف ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں سے اگر ہوئے بھی ہیں تو وہ پرانی ہی چلی آ رہی ہے۔ گورنر صاحب گنتی کے انہی چند لوگوں میں سے ایک ہیں۔"

"آپ کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ ہم ان سے ملاقات کے لئے جا سکتے ہیں" میں نے محض تصدیق کی خاطر کہا۔

"جی ہاں۔ گیارہ بجے ہماری ان سے ملاقات طے ہو چکی ہے" نذیر خان نے گھڑی دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "یہ ملاقات کتنی دیر کی ہونی چاہئے، یہ ہماری مرضی پر منحصر ہو گا۔ میری سب سے آخر میں جو بات ہوئی ہے وہ ان کے پی اے نسیم قریشی سے ہوئی ہے۔"

میں سن چکا تھا..... وہ اس سے بڑی بے تکلفی سے بات چیت کر رہا تھا۔ میں نے یوں ہی ذرا معلومات کے لئے پوچھا "کیا منسٹر صاحب کا پی اے بھی سفر میں ان کے ساتھ چلتا ہے؟"

"صرف پی اے ہی نہیں، ان کے اسٹاف کے کئی بنیادی اور خاص خاص لوگ تقریباً ہر سفر میں ان کے ساتھ جاتے ہیں" نذیر خان نے بتایا۔

"اکرام بیگ بھی؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ وہ ان کا سیکیورٹی چیف ہے۔ وہ بھی ضرور جاتا ہے" نذیر خان نے جواب دیا "ویسے تو منسٹر صاحب اندرون ملک یا بیرون ملک جہاں بھی جائیں گے، ان کی سیکیورٹی کی ذمے داری پروٹوکول کے مطابق وہیں کی کسی نہ کسی ایجنسی کی ہو گی۔ لیکن اس ایجنسی کے آدمی کافی حد تک اکرام بیگ ہی کی ماتحتی میں کام کریں گے۔ حتیٰ کہ غیر ممالک میں بھی سیکیورٹی کے انتظامات ان کے اپنے ہوں گے لیکن اکرام بیگ چاہے تو کسی چیز پر اعتراض کر سکتا ہے۔ مناسب جواز پیش کر کے وہ کسی بھی انتظام کو یا کسی بھی فرد کو تبدیل کر سکتا ہے۔ اگر کسی جگہ کے بارے میں وہ سیکیورٹی کے انتظامات کے بارے میں رائے دے کہ وہ ان سے مطمئن نہیں ہے تو منسٹر صاحب وہاں نہیں جائیں گے۔ بہت پرانا آدمی ہے۔ منسٹر صاحب قاعدے قوانین سے قطع نظر بھی اس پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا "کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"ارے نہیں" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اگر جانتا ہوتا تو آپ کو کیوں زحمت دیتا۔ میں نے کراچی میں اپنی کمپنی کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر شفیع شاہ کی زبانی اس کا نام سنا تھا۔"

"آپ کے ہوٹل میں تقریب سے پہلے کلیئرنس وہی دے گا۔ اچھا آدمی ہے۔ سنٹرل گورنمنٹ کا افسر ہے۔ سی آئی اے سے آیا ہے" پھر اس نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی "امریکا والی سی آئی اے نہیں۔ ایبی سی آئی اے۔"

میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا "چلیں؟"

"ہاں" وہ اٹھتے ہوئے بولا "وقت تو ابھی کافی ہے لیکن ہم ذرا آرام آرام سے چلیں گے۔ حفیظ صاحب جیسے لوگوں سے ملنے کے

لئے جاتے وقت ویسے بھی پانچ دس منٹ کی گنجائش رکھ کر نکلنا چاہئے۔ وقت کے بڑے پابند ہیں۔ زندگی کا بڑا حصہ دوسرے ملکوں میں ہی گزارا ہے نا۔"

میں اپنی گاڑی میں نذیر خان کو ساتھ لے کر گورنر ہاؤس کی طرف روانہ ہوا۔ تمام تر سست رفتاری کے باوجود ہم چند منٹ پہلے ہی پہنچ گئے۔ پہلے تو گیٹ سے داخل ہوتے ہی ہماری زبردست تلاشی ہوئی۔ گاڑی کو بھی انجن کی نوک سے لے کر پچھلے فینڈر تک اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا گیا۔ عین ممکن تھا کہ تلاشی لینے والے ہماری گاڑی کے نیچے بھی گھس جاتے کہ سامنے سے ایک باوردی پولیس آفیسر مسکراتا ہوا آ گیا۔ وہ نذیر خان کو جانتا تھا۔ دونوں گلے ملے۔ گرم جوشی سے ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کی اور مجھ سے بھی تعارف ہوا۔ اس دوران تلاشی لینے والوں نے گاڑی کے نیچے گھسنے کا ارادہ شاید ملتوی کر دیا اور ہمیں گاڑی اس حصے میں پارک کرنے کی ہدایت کی جو مہمانوں کی گاڑیوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس دوران داخلی ٹیلی فون وغیرہ پر یہ تصدیق کر لی گئی تھی کہ ہم "بلائے گئے" مہمان ہیں۔ بن بلائے نہیں۔

پولیس آفیسر اور نذیر خان ایک دوسرے کو مختصراً اپنے تازہ ترین حالات سے آگاہ کر چکے تو ہم آگے بڑھے اور کسی پلے گراؤنڈ سے زیادہ طویل و عریض، خوبصورت اور پُربہار سبزہ زار کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک استقبالیہ ہال میں پہنچے۔ یہاں خاصا ہجوم سا تھا۔ بہت سے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

ایک میز پر موجود شخص کو نذیر خان نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ اس نے اندر کسی سے فون پر بات کی۔ اونچے طرے اور کلاہ والا ایک قد آور جوان جو ملیشیا کے یونیفارم میں تھا، ہمیں ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا جہاں ایک بار پھر نئے سرے سے ہماری تلاشی ہوئی۔ حتیٰ کہ دھات کا سراغ دینے والے مینل ڈیٹیکٹر تک سے ہمیں سرتاپا چیک کیا گیا۔ جس نے میری جیب میں گاڑی کی چابیوں تک کی موجودگی پر "بیپ بیپ" کر کے شور مچا دیا اور مجھے وہ بھی نکال کر سیکیورٹی والوں کو دکھانا پڑیں۔ مجھے اس حد تک تو نہیں، البتہ کسی نہ کسی حد تک اس تلاشی وغیرہ کے چکر کا پہلے ہی اندیشہ تھا۔ اس لئے میں ہر وقت اپنے ساتھ موجود رہنے والا مشین پسٹل ٹانگ سے بندھا رہنے والا پتلا سا زہریلا خنجر اور دو ایک دوسری چھوٹی موٹی چیزیں احتیاطاً گھر ہی چھوڑ آیا تھا۔

میرا اور میرے آدمیوں کا بیشتر آتشیں اسلحہ لائسنس یافتہ تھا لیکن پھر بھی میرے پاس سے جو کچھ نکلتا اسے دیکھ کر تلاشی لینے والوں کو یقیناً تعجب ہوتا کہ..... شہر کے ایک بڑے اور معزز بزنس مین کو آخر خود اس قسم کی چیزیں اٹھائے پھرنے کی کیا ضرورت رہتی تھی؟ زیادہ ہی ضروری تھا تو میں اپنے لئے گارڈز وغیرہ رکھ سکتا تھا۔ اب ظاہر ہے ان لوگوں کے سامنے میں اپنے معاملات کی وضاحت تو نہیں کر سکتا تھا۔

اسی تنگ سے کمرے سے ہمیں راہداری کے ذریعے ایک گارڈ ہی کی رہنمائی میں ایک طویل و عریض، صاف ستھرے اور آراستہ و پیراستہ کمرے میں بھیج دیا گیا۔ اس کی آرائش ایک شاندار ڈرائنگ روم کے طرز کی تھی۔ سیاہ شیروانی اور سفید شلوار میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر شخص نے اس کمرے میں ہمارا استقبال کیا۔ وہ بھی نذیر خان سے بہت گرم جوشی سے ملا۔ نذیر خان نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ وہ منسٹر صاحب کا پی اے نسیم قریشی تھا۔

اس نے ہم سے کچھ نہیں پوچھا کہ ہم کس سلسلے میں آئے ہیں۔ بس ہمیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خوش خلقی سے

سپوکن ماڈرن جاپانی

★---- شاہد حمید

یہ کتاب سالہا سال کے ذاتی تجربات کا نتیجہ اور نچوڑ ہے۔

زُبان کے سلسلے میں بنیادی حقائق کی طرف خاص توجہ مبذول کی گئی ہے۔

مشکل نکات کو نہایت آسان الفاظ میں واضح کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

جس کے مختلف کالموں میں انگریزی الفاظ، جاپانی تلفظ اور جاپانی ترجمہ شامل ہے۔

خوبصورت سرورق۔ بہترین کمپوزنگ و طباعت

قیمت: -/120 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

ولا "آپ کو صرف تین چار منٹ انتظار کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔ منسٹر صاحب تشریف لا رہے ہیں" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

ہم بیٹھ گئے۔ مجھے منسٹر صاحب سے وقت کی پابندی کی اتنی امید نہیں تھی لیکن نذیر خان اور نسیم قریشی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ٹھیک تین منٹ بعد کمرے کا اندرونی دروازہ کھلا اور وہی سی آواز میں "السلام علیکم" کہتے ہوئے منسٹر صاحب اندر آگئے۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ منسٹر صاحب نے پہلے نذیر خان کا مصنوعی اور دستانہ پوش ہاتھ تھام کر خاصی گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سیاہ نائیلون کے دستانے میں چھپے ہوئے' پلاسٹک کے اس ہاتھ میں بھی خلوص کی حرارت محسوس کر رہے ہوں۔

خلوص کی حرارت اگر نذیر خان کے بے جان مصنوعی ہاتھ میں نہیں تھی تو اس کی آنکھوں میں ضرور تھی۔ بلکہ اس کی آنکھوں میں تو خلوص کا ایک سمندر موجزن تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ منسٹر صاحب کے سامنے شکرگزاری کے اظہار کے لئے کیا کرے۔

آخر کار اس نے حفیظ صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ میری کاروباری حیثیت اور پوزیشن وغیرہ بتانے کے بعد وہ بولا "سر! یہ میرے بڑے پرانے دوست اور مہربان ہیں۔ ان سے کاروباری تعلق بھی ہے...." حالاں کہ نذیر خان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی مگر اس نے مجھے پرانا دوست اور مہربان قرار دے دیا تھا۔ یہ اس کی مہربانی تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہ صرف بڑے کاروباری آدمی ہی نہیں' اپنے وطن کے زبردست خیرخواہ اور آپ جیسی شخصیتوں کے بڑے ہی قدردان ہیں' جنہوں نے ملک کے لئے بہت سی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اسی لئے یہ آپ کے بارے میں ایک بری خبر سنتے ہی میرے توسط سے فوراً آپ کے پاس چلے آئے ہیں۔ اگر آپ ان کی بات توجہ سے سن سکیں اور مان سکیں تو بڑی نوازش' بڑا کرم ہوگا۔"

نذیر خان کو ساتھ لانا اچھا ہی رہا تھا۔ میں شاید ایسے لجاجت بھرے اور ڈپلومیٹک انداز میں گفتگو نہ کرپاتا۔ منسٹر صاحب ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کی تصویریں بارہا دیکھی تھیں۔ دو ایک بار ٹی وی پر بھی دیکھا تھا لیکن وہ اپنی تصویروں کی نسبت بہتر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ سادہ مگر نفیس سی شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھے۔ ہونٹوں میں سگار دبا ہوا تھا۔

وہ یقیناً ساٹھ کی عمر کو پہنچ رہے ہوں گے مگر صحت نہایت شاندار تھی۔ سرخ و سپید رنگت' چہرہ شکنوں سے بے نیاز' کمر سیدھی' کندھے چوڑے اور آنکھیں بے پناہ چمکیلی تھیں۔ چہرے پر ہلکی سی نخوت بھی تھی۔ ان کے خدوخال سے جاگیردارانہ سا جلال جھلکتا تھا۔ حالاں کہ میری معلومات کے مطابق ان کا خاندانی پس منظر جاگیردارانہ نہیں تھا۔ ان کے ہونٹوں پر نہایت ہی مدھم اور نپی تلی سی مسکراہٹ تھی۔ بلکہ میری طرف دیکھتے ہوئے تو یہ مسکراہٹ بھی معدوم ہوگئی۔ مجھے ان کے چہرے مہرے سے قدرے سرد مہری کا احساس ہوا۔ شاید وہ اجنبیوں سے اسی طرح ملتے تھے۔

انہوں نے ہمیں بیٹھنے کے لئے کہا اور پوچھا کہ ہم کیا پئیں گے لیکن ایک تو میں اور نذیر خان گھر سے ہی ناشتے کے نام پر بہت کچھ ٹھونس کر گھر سے نکلے تھے' دوسرے ہمیں معلوم تھا کہ منسٹر صاحب کی دعوت صرف رسمی تھی۔ ان کا وقت اتنا قیمتی تھا کہ اس قسم کی رسمیات یا تکلفات میں ضائع کرنے کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ ان کے ساتھ تو اگر کسی کو واقعی چائے پینا ہوتی یا کھانا کھانا ہوتا تو اسے پہلے سے باقاعدہ شیڈول میں رکھنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ہم نے نہایت مودبانہ انداز میں انکار کردیا۔

نذیر خان کے کہنے پر میں نے اپنی رام کہانی شروع کی۔ ریڈ ڈاٹ اور ہنی کی جگہ مجھے اس کہانی میں "کچھ نامعلوم خطرناک لوگ" اور "معتبر ذرائع" وغیرہ جیسے الفاظ شامل کرنا پڑے.... فی الحال کسی سرکاری شخصیت کے سامنے ان دونوں کا ذکر کرنا میری نظر میں خلاف مصلحت تھا۔

اس دوران منسٹر صاحب ایک ٹک میری طرف دیکھتے رہے۔ وہ آنکھ بہت کم جھپکتے تھے۔ اس انداز اور اپنی آنکھوں کی مقناطیسی چمک کی بدولت وہ شاید کمزور اعصاب کے لوگوں کو نروس کردیتے ہوں۔ ان کی لائن ڈپلومیٹک تھی۔ انہیں دن رات جھوٹ سے واسطہ پڑتا تھا۔ اخبارات میں بیانات جاری کرنے کے لئے انہیں خواہ دوسرے کے دل کی بات کہنی پڑتی ہو' خواہ سچ پر کتنے ہی جھوٹ کا ملمع چڑھانا پڑتا ہو لیکن پس پردہ شاید وہ اپنی ان نظروں کے ذریعے سچ تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

انہوں نے خاموشی سے میری پوری بات سنی۔ اس دوران ایک بھی سوال نہیں کیا۔ وقفے وقفے سے سگار کے کش لیتے رہے۔ میں تمباکو نوش نہیں تھا لیکن خوشبو پہچانتا تھا۔ وہ ہوانا کا سگار پی رہے تھے۔ وہ اپنے تاثرات پوری طرح چھپائے رکھنے پر قادر تھے۔ اپنے قتل کی سازش کا سن کر انہوں نے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ ان کی آنکھوں سے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ وہ میری بات پر یقین کررہے تھے یا مجھے جھوٹا سمجھ رہے تھے۔

میرے خاموش ہونے پر وہ بولے "مسٹر چوہدری! آپ کی بات پر کوئی تبصرہ کرنے سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ نے جن "نامعلوم خطرناک لوگوں" کا ذکر کیا ہے وہ کون ہیں؟ دوسرے آپ کو خط لکھ کر اطلاع دینے والا کون ہے؟ ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ خبر کا ذریعہ خود کتنا قابل اعتبار ہے۔"

"سر! میں نے نامعلوم خطرناک لوگوں کا صیغہ اسی لئے استعمال کیا ہے کہ میں ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ خبر کے ذریعے کے بارے میں بھی میں صرف آپ کو اپنی ذاتی ضمانت ہی دے سکتا ہوں کہ وہ ایک قابل اعتبار شخصیت ہے اور جہاں بیٹھ کر اس نے یہ اطلاع بھجوائی ہے وہاں سے آنے والی خبر غلط نہیں ہو

سکتی۔ میں اس سلسلے میں زیادہ تفصیل آپ کو اس لئے بھی نہیں بتا سکتا کہ اس صورت میں مجھے خود اپنی جان کا خطرہ ہے" میں نے ملائمت سے کہا۔

"وہ کیوں؟" انہوں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"سر! میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ آپ کے توسط سے ان لوگوں کے بارے میں کسی سرکاری ایجنسی کا حرکت میں آجانا میرے لئے ان لوگوں کے غیظ و غضب کا باعث بن سکتا ہے۔ ابھی تک میرے بارے میں ان کا رویہ خوف ناک نہیں رہا ہے۔ شاید وہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ کسی مرحلے پر کبھی مجھے استعمال کریں گے لیکن اب اگر ان پر یہ ظاہر ہوگیا کہ میں ان کے بارے میں کوئی کہانی لے کر آپ کے پاس آیا تھا اور اس کے بعد سرکاری ایجنسیاں حرکت میں آگئی تھیں تو اس کا نتیجہ خوف ناک رد عمل کی صورت میں نکل سکتا ہے۔"

"مسٹر چوہدری! آپ کی آمد کا مقصد کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آپ میری حفاظت کے سلسلے میں.... اور مجھے اس سازش سے محفوظ رکھنے کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر آپ خود ہی اتنا ڈرتے ہیں تو آپ میرے لئے کیا کرسکتے ہیں؟"

"میں ڈرتا نہیں ہوں سر!" میں نے بدستور ملائمت سے کہا "بلکہ میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ مجھے سیکیورٹی کے سرکاری نظام اور ایجنسیوں کے طریقہ کار پر زیادہ بھروسہ نہیں ہے۔ یہ نظام آپ جیسی سرکاری شخصیتوں اور کچھ مخصوص خطوط پر کام کرنے والوں کو تو سوٹ کرسکتا ہے لیکن ایک عام شہری کو' مجھ جیسے شخص کو سوٹ نہیں کرسکتا۔ بعض معاملات بہت ہی باریک بینی' بہت ہی نفاست و نزاکت اور بہت ہی نرمی سے ہینڈل کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی روایتی طریقہ' پکڑ دھکڑ یا جلد بازی بہت سے بے گناہ انسانوں کی ہلاکت اور تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔ اس لئے فی الحال میں ان معاملات میں سرکاری مداخلت نہیں چاہتا۔ البتہ جہاں میں سمجھوں گا کہ معاملہ میرے وسائل اور اختیارات سے باہر ہوگیا ہے' یا جب میں محسوس کروں گا کہ اب اسے سرکاری وسائل سے ہی ہینڈل کرنا زیادہ بہتر رہے گا تو میں ضرور آپ کو سب کچھ بتادوں گا۔"

"بہت خوب!" منسٹر صاحب نے کہا۔ مگر اس لہجے میں تحسین والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ سگار کا کش لیتے ہوئے پُرخیال نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے ابھی تک ان سے نظر نہیں چرائی تھی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کی مثال کسی بھری چڑی عمارت میں نصب کئے گئے ایسے بم کی سی ہے جس کی ساخت کے بارے میں بم ڈسپوزل اسکواڈ بھی کچھ نہیں جانتا۔ اس لئے کوئی ذرا سی بھی غلط حرکت عمارت کو اور لوگوں کو بچانے کے بجائے ان کی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔ بم کو ناکارہ بنانے سے پہلے بم کی ساخت کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے۔"

"اور آپ کے خیال میں سرکاری ایجنسیاں یہ کام نہیں کرسکتیں" انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں ان کے بارے میں حسن ظن میں مبتلا رہنا بہتر نہیں سمجھتا" میں نے ڈپلومیٹک انداز میں جواب دیا۔

"شاید اس لئے کہ ایک عام آدمی کو سرکاری ایجنسیوں کی طاقت' پھیلاؤ اور رسائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ خواہ وہ شخص بہت بڑا بزنس مین یا بہت ہی باخبر آدمی کیوں نہ ہو" ان کے لہجے میں ہلکی سی سرد مہری در آئی "مسٹر چوہدری! آپ کو تو شاید معلوم بھی نہ ہو کہ ہمارے ملک میں کتنے قسم کی خفیہ ایجنسیاں کام کررہی ہیں۔"

"سر! ہوسکتا ہے اس معاملے میں میری معلومات ناقص ہوں۔ میں ایک عام آدمی ہوں اور عام آدمی کے کسی چیز کو ناپنے کے فارمولے بھی عام سے ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک عام آدمی شربت تیار کرنے کے لئے پانی میں میٹھا ڈالتا ہے تو اسے چکھ کر اندازہ لگاتا ہے کہ شکر درست مقدار میں ڈالی جاچکی ہے یا نہیں۔ عام آدمی کو اس سے غرض نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں کتنی ایجنسیاں کام کررہی ہیں' ان میں کتنی تعداد میں لوگ ملازم ہیں' ان کے کتنے دفاتر اور کتنی شان و شوکت ہے۔ وہ تو آخر میں صرف نتیجہ دیکھتا ہے کہ ان ایجنسیوں کی بدولت اس کے ملک میں کتنی سازشیں ناکام ہوئیں' کتنے خطرناک مجرموں کا سراغ لگا' کتنی تعداد میں ممکنہ اور متوقع حادثات کو روکا گیا' تخریب کاری کے کتنے منصوبوں کو ناکام بنایا گیا۔ میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ اس ضمن میں عام آدمی کا تجربہ کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے" میں صاف گوئی سے کام لینے پر تل گیا تھا۔

میں نذیر خان کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا لیکن مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ کچھ مضطرب ہوچکا تھا۔ اسے منسٹر صاحب سے اپنے قریبی تعلقات کا مان تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ ان کے سامنے صاف گوئی یا تلخ نوائی کا متحمل وہ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ میری منسٹروں سے زیادہ میل ملاقات نہیں تھی' زیادہ ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ اور میں میل ملاقات بلاضرورت رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے ان کے پاس جانے والے لوگوں کی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ صرف اپنا کام نکالنے ان کے پاس جاتے تھے' ان کی خوشامد کرتے تھے' انہیں مس گائیڈ کرتے تھے' ان کے کارناموں پر داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے تھے جو انہوں نے انجام نہیں دیے ہوتے تھے۔ منسٹر خواہ کسی بھی شعبے کا ہو' خواہ لوگوں کو اس سے کوئی قابل ذکر کام پڑتا یا نہ پڑتا لیکن وہ صرف واہ واہ سننے کا عادی ہوتا تھا۔ انہیں ایسا بنانے میں ہمارے نظام کا بھی قصور تھا' بکاؤ سیاست کا بھی قصور تھا.... اور نہ جانے کس کس کا قصور تھا۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ اس میں لوگوں کا بھی قصور تھا۔ لوگوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لئے قومی مفادات کو نظرانداز کردیا تھا۔ ہر کسی نے

خوشامد کرنے اور اپنا الو سیدھا کرنے میں دوسرے کو مات دینے کی ٹھانی ہوئی تھی۔

منسٹر صاحب کے چہرے پر صرف سرد مہری تھی۔ ناگواری یا کسی قسم کی ہلچل نہیں تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ہمارے ملک میں نہ جانے کیسی کیسی قوتیں سرگرم عمل رہتی ہیں' زیر زمین نہ جانے کیسے کیسے منصوبے بنتے رہتے ہیں۔ سیاست' سماجی بہبود' سفارتی مشن' غیر ملکی فلاحی ادارے.... ان سب چیزوں کی آڑ میں نہ جانے کون کون سی قوتیں کیا کچھ کرتی رہتی ہیں۔ ہمیں صرف اس وقت پتا چلتا ہے جب کوئی بہت بڑا سانحہ رونما ہو جاتا ہے یا کوئی برائی سیلاب بن چکی ہوتی ہے' ہمارے قابو سے باہر نکل چکی ہوتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس دوران ہماری ایجنسیاں کیا کرتی رہتی ہیں" میں کوشش کر رہا تھا کہ زیادہ سخت الفاظ استعمال نہ کروں۔ میری یہ ان سے پہلی ملاقات تھی۔ ویسے بھی ان کا محکمہ ایسا تھا کہ ان پر زیادہ دل کا غبار نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ آج میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ میں تو اس وقت کے حالات پر ہی رنجیدہ خاطر رہتا تھا' جذباتی ہو جاتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری گناہ گار آنکھوں کو یہاں کیا کیا سانحے' کیا کیا المیے' کیا کیا سازشیں اور کیا کیا شیطانی تماشے دیکھنا پڑیں گے۔

منسٹر صاحب نے گہری سانس لی اور تحمل سے بولے "یہ بڑی لمبی بحث ہے مسٹر چوہدری! ایجنسیوں کے اپنے طور طریقے ہیں اور عام آدمی کا سوچنے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ اس معاملے میں ہمیں ایک دوسرے کے نقطہ نظر اور حالات سے آگاہ ہونے کے لئے بہت زیادہ وقت چاہئے۔ اس لئے میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ منفی اور سازشی قوتیں ہر دور میں' ہر ملک میں سرگرم عمل رہتی ہیں۔ کسی بھی ملک کے خواہ کتنے بھی وسائل ہوں وہ اپنے آپ کو ہر سازش' ہر برائی سے بالکل پاک صاف نہیں کر سکتا۔ ایجنسیاں اپنی سی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ عام لوگوں کو ان کا علم نہیں ہونے پاتا۔ ہمارے ملک کی کسی بھی چیز کا ترقی یافتہ ملکوں سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی معاملہ ایجنسیوں کا بھی ہے۔ ہماری ایجنسیوں کی کارکردگی دوسرے ملکوں کی ایجنسیوں جیسی تو نہیں ہو سکتی۔ اور مجھے اعتراف ہے کہ ہمارے ہاں کام چوری اور کرپشن بھی زیادہ ہے۔ لیکن ایجنسیاں بہرحال ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھی رہتیں۔ اگر وہ بالکل ہی کچھ نہ کرتی ہوں تو یہاں غدر مچ جائے۔"

میں خاموش رہا۔ یہ واقعی بہت لمبی بحث تھی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولے "بہرحال یہ ویسے بھی ذرا الگ موضوع ہے۔ ہمارا اصل موضوع وہ کہانی ہے جو آپ میرے پاس لے کر آئے ہیں۔ یہ ایک جاسوسی کہانی ہے۔ اسپائی اسٹوری معلوم ہوتی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اب ہمارا اونچا طبقہ بھی اس قسم کی کہانیوں پر یقین رکھنے لگا ہے۔ یہ باتیں ناولوں' کہانیوں اور فلموں وغیرہ میں اچھی لگتی ہیں۔"

ایک لمحے کے لئے مجھے اپنی کنپٹیوں کے پاس ہلکی سی تپش کا احساس ہوا۔ شاید منسٹر صاحب مجھے بے وقوف سمجھ رہے تھے جو میں اس قسم کی ایک "کہانی" لے کر ان کے پاس چلا آیا تھا۔ ایک بار تو میرا جی چاہا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دوں۔ ان کے قتل کی وجہ سے میرے بزنس یا ہوٹل پر جو اثر پڑتا' وہ میں بھگت لیتا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے اپنی کھوپڑی ٹھنڈی رکھنی چاہئے۔ ہمارے ملک کے مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ جب کوئی ذرا بھی اونچے سنگھاسن پر بیٹھتا تھا تو وہ گویا ایک خول میں بند ہو جاتا تھا۔ اردگرد کا منظر اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ وہ حقائق کی دنیا سے کٹ جاتا تھا۔ اس کے خیال میں حقائق صرف وہ ہوتے تھے جو اسے اس کے مخصوص ذرائع سے بتائے جاتے تھے یا جو کچھ وہ خود محسوس کرتا تھا۔ دوسرے جو کچھ محسوس کرتے تھے یا اسے بتانے کی کوشش کرتے تھے' وہ اس کی نظر میں حقائق نہیں رہتے تھے۔

منسٹر صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے "حقیقی زندگی میں' اس قسم کی بڑی سازشیں کرنے والوں کے لئے کسی کو مروانا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہوتا کہ وہ گھما پھرا کر کوئی پُرپیچ اور لمبا راستہ اختیار کریں۔ وہ بس سیدھے سادے طریقے سے کرائے کے قاتلوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور آدمی کو مروا دیتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی مناسب موقع کسی نہ کسی قاتل کو مل ہی جاتا ہے۔ بس وہ سامنے آتا ہے اور ٹھاہ سے گولی مار دیتا ہے۔ زیادہ صحیح موقع نہ ملا یا زیادہ پُرتشدد اور ہنگامہ پرور انداز میں کسی کو مارنا ہوا تو کسی مقام پر' کسی گاڑی میں یا کسی عمارت میں بم رکھوا دیا۔ تفتیشی ایجنسیاں بعد میں ٹکریں مارتی رہتی ہیں۔ کبھی وہ سازش کرنے والے اصل لوگوں تک پہنچ نہیں پاتیں۔ اور کبھی سب کچھ سمجھ جانے کے باوجود زے داروں پر ہاتھ نہیں ڈال پاتیں۔ بڑے بڑے ملکوں کے صدور اور وزرائے اعظم کو اس انداز میں قتل کیا گیا ہے۔ میں کیا چیز ہوں۔"

میں نے حتی الامکان ملائمت سے کہا "سر! میں جس سازش کی بات کر رہا ہوں' ہم اس کی تمام تفصیلات سے واقف نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے اس میں صرف آپ کو قتل کرنا ہی اصل مقصد نہ ہو۔ شاید یہ کوئی ایک سے زیادہ مقاصد رکھنے والی سازش ہو۔"

"اس نقطہ نظر سے تو یہ بات اور بھی زیادہ بعید از قیاس نظر آتی ہے" وہ اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے "میرے قتل سے زیادہ مقاصد تو کیا' کوئی ایک مقصد بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی ملک میری پالیسیوں کی وجہ سے مجھے قتل کرانا چاہتا ہے تو اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ میرے مرنے سے ہمارے ملک کی پالیسیاں بدل نہیں جائیں گی۔ پالیسیاں کسی ملک کی حکومت اجتماعی طور پر بناتی ہے۔ وزیر خارجہ کا کام صرف انہیں آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ میں نہیں تو میری جگہ کوئی اور دوسرا آدمی ان پالیسیوں پر عمل درآمد

کرانے کے لئے آگے آ جائے گا۔ بات وہیں کی وہیں رہے گی۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولے "کوئی اور مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ فی الحال آپ کی کہانی سے صرف ایک ہی مقصد نظر آتا ہے۔ آپ کے ہوٹل' آپ کے کاروبار اور ساکھ کو نقصان پہنچانا اور آپ کے لئے پریشانیاں اور الجھنیں پیدا کرنا۔ جن نامعلوم اور خطرناک لوگوں کی آپ بات کر رہے ہیں اگر وہ واقعی اتنے ہی نامعلوم اور اتنے ہی خطرناک ہوں تو ان کے پاس دوسرے ہزاروں طریقے ہو سکتے ہیں جو زیادہ آسان ہوں گے۔ وہ ہوٹل کو بم سے بھی اڑا سکتے ہیں۔ آپ کو دوسرے کسی چکر میں بھی پھنسا سکتے ہیں۔ مجھے خاص طور پر آپ کے ہوٹل میں قتل کرانا کسی کے لئے بھی کوئی زیادہ فائدہ مند کام نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف ایک سنسنی خیز خبر تو بن سکتی ہے اور اس سے تھوڑی دیر کے لئے سرکاری اور قومی سطح پر خوف و ہراس کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے ماحول کے بوجھل پن کو قدرے کم کرنے کی غرض سے مسکراتے ہوئے کہا "سر! اگر آپ کا وجود یا عدم وجود برابر ہی ہے تو پھر آپ کی سیکیورٹی کا اتنا زبردست اہتمام کیوں کیا جاتا ہے؟ میں نے سنا ہے..... اور نذیر خان نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ صدر اور وزیر اعظم کے بعد سب سے زیادہ سیکیورٹی آپ ہی کی ہوتی ہے۔"

"یہ صرف وقار کی خاطر ہوتی ہے" وہ بلا تامل بولے "وزیر خارجہ کسی ملک کی ناک ہوتا ہے۔ کوشش یہی کی جاتی ہے کہ یہ ناک کٹنے نہ پائے۔ وہ پورے ملک کا دفتر معانی و مطالب اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتا ہے۔ اس کی خصوصی دیکھ بھال تو ہونی چاہئے نا۔"

اب ان کے چہرے پر پہلے جیسی سرد مہری نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ دل ہی دل میں میری بات کو کچھ اہمیت تو دے رہے تھے لیکن بحث و تمحیص کے ذریعے اس مسئلے کو محض اچھی طرح چھان پھٹک لینے کی غرض سے میرے خیال کی تردید کر رہے تھے۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ قدرے ملائمت سے بولے "بڑے ملک.... بڑی طاقتیں.... یا ان کے اشاروں پر کام کرنے والے بہت بڑے بڑے طاقت ور گروہ اور مافیا ٹائپ کی طاقتیں اگر کسی ملک کو سبق دینا چاہتی ہیں یا اسے اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتی ہیں تو اس کے لئے وزیر خارجہ کو قتل نہیں کرایا جاتا' سربراہ مملکت کو قتل کرا دیا جاتا ہے یا کسی اور طریقے سے راستے سے ہٹایا جاتا ہے یا پھر لیبی منصوبہ بندی کے ذریعے اس ملک کو سیاسی و معاشی غلام بنایا جاتا ہے۔ امداد' ٹیکنالوجی اور اس قسم کے دوسرے ہتھکنڈوں کے ذریعے اسے اپنا محتاج' اپنا دست نگر بنا کر ہمیشہ کے لئے ایسی زنجیروں میں جکڑ لیا جاتا ہے کہ وہ کبھی نکلنے نہ پائے۔"

"سر! آپ کی سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ آپ ان معاملات کا مجھ سے بہتر علم رکھتے ہیں لیکن مجھے جو خط موصول ہوا ہے اس میں ایک مقصد کی تو خاصے واضح طور پر نشان دہی کی گئی ہے" میں نے انہیں یاد دلایا "کراچی سے آپ سیدھے مشرق وسطی روانہ ہو رہے ہیں۔ مجھے موصول ہونے والے خط کے مطابق مشرق وسطی کے ایک ملک کو دوسرا ویت نام بنانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی' کو آرڈی نیٹرز انٹرنیشنل' کا بھی اس سلسلے میں نام آیا ہے....."

حفیظ صاحب کا سگار تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ انہوں نے خوب صورت سگار بکس سے ہوانا کا ایک اور سگار نکال کر طلائی لائٹر سے سلگایا۔ میں نے چین اسموکرز تو بہت سے دیکھے تھے لیکن عام طور پر وہ سگریٹ پینے والے ہوتے تھے۔ سگار کا چین اسموکر میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "سر! بے شک میں ایک بزنس مین ہوں لیکن ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طاقت اور وسعت کے بارے میں آپ یقیناً مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔ مثلاً جنرل موٹرز جتنی بڑی کمپنی ہے' اس کے مقابلے میں اگر پاکستان' سوئٹزرلینڈ اور ساؤتھ افریقہ کے تمام مالی وسائل یکجا کر دیئے جائیں تب بھی وہ اس کے برابر نہیں آ سکتے۔ جب کہ ان میں سے سوئٹزرلینڈ وہ ملک ہے جہاں دنیا بھر کے بڑے بڑے لوگوں' سربراہان مملکت' ٹیکس چوروں اور بڑے بڑے اسمگلروں کے جائز و ناجائز ہر طرح کی کمائی جمع ہے۔ اس کے باوجود یہ کئی ملک مل کر بھی مالی اعتبار سے جنرل موٹرز کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح "ڈچ شیل" ایسی کمپنی ہے جو ایران' وینزویلا اور ترکی کے مجموعی وسائل سے زیادہ اثاثے رکھتی ہے۔ "گلف ایئر ٹائر" نامی کمپنی سعودی عرب سے زیادہ دولتمند ہے۔ اسی طرح کو آرڈی نیٹرز انٹرنیشنل اس قسم کی جناتی کمپنیوں میں تیسرے نمبر پر ہے۔"

منسٹر صاحب کے چہرے پر اب سرد مہری کی جگہ خفیف سی مسکراہٹ نظر آنے لگی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اندر سے ان کا موڈ کافی خوش گوار تھا۔ کیوں کہ وہ اپنے تاثرات چھپائے رکھنے اور اپنی شخصیت کے سامنے ایک غیر مرئی سا پردہ تانے رکھنے کے عادی تھے۔ اس پردے میں سے اگر ذرا سی مسکراہٹ چھن کر باہر آ رہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ اندر مطلع کافی صاف تھا۔

"آپ اچھے بزنس مین ہیں مسٹر چوہدری!" وہ بولے "آپ کی معلومات معقول ہیں۔"

"شکریہ سر!" میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "سرمایہ جہاں اپنے ساتھ خوش حالی لاتا ہے' بے شمار مسائل حل کرتا ہے' وہاں حد سے زیادہ سرمایہ اپنے ساتھ بے شمار مسائل بھی لاتا ہے۔ اور اس کی ہوس کبھی ختم نہیں ہوتی۔ طلب کے اس سمندر کا کوئی کنارا نہیں ہے۔ بعض جناتی قسم کی کمپنیاں دنیا کی

سیاست پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ مختلف مقامات پر اسلحے کی ضرورت پیدا کرتی ہیں پھر اس کی سپلائی کا بندوبست بھی کرتی ہیں۔ ان کے ایجنٹ دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں جو خود کرو ڑپتی اور ارب پتی ہیں۔ میں اپنے ملکی رازوں میں دخل نہیں رکھتا اور نہ ہی اس موضوع پر آپ کو کریدنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن مجھے جس حد تک اشارہ ملا ہے اس حد تک بات ضرور کروں گا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ ایک انتہائی اہم مشن پر مشرق وسطیٰ جا رہے ہیں۔ آپ ایک ایسا منصوبہ لے کر جا رہے ہیں جو مشرق وسطیٰ کے ایک ملک کو دوسرا ویت نام بننے سے بچا سکتا ہے۔ اس طرح تو اسلحے کی کھپت کا ایک بڑا میدان تیار ہونے سے رہ جائے گا سر اور آپ کو معلوم ہی ہے اسلحے کی تجارت اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منافع بخش صنعت ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کا یہ مشن کسی طاقت کو..... اور اس کی وجہ سے کو آرڈی نیٹر زانٹرنیشنل کو بالکل پسند نہ ہو۔"

یہ بات میں انہیں شروع میں ہی بتا چکا تھا لیکن اس وقت وہ اکھڑے اکھڑے سے تھے اور اب بات ذرا تفصیل سے ہو رہی تھی۔ اب وہ ذرا چڑ خیال نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "سر! یہ درست ہے کہ ایک وزیر خارجہ راہ سے ہٹ جائے تو ملک کی پالیسیاں تبدیل نہیں ہو جاتیں' پالیسیاں حکومتوں کے ساتھ تبدیل ہوتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو حکومتوں کے ساتھ بھی تبدیل نہیں ہوتیں۔ لیکن پھر بھی آپ جیسی شخصیت کے منظر عام سے ہٹنے سے ایک خلا تو پیدا ہو جائے گا جو فوری طور پر پُر نہیں کیا جا سکے گا۔ ممکن ہے یہ منصوبہ جو آپ لے کر جا رہے ہیں' صرف آپ کے اپنے ہی ذہن کی تخلیق ہو۔ اسے زیادہ تر آپ نے صرف اپنی ہی کاوشوں سے مکمل کیا ہو۔ اس لئے اس کی باریکیوں کو بھی صرف آپ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر آپ کسی سازش کا نشانہ بن جاتے ہیں تو کم از کم وقتی طور پر تو منصوبہ ملتوی ہو جائے گا۔ بلکہ شاید پھر کبھی اس پر عمل درآمد ہی نہ ہو سکے۔ دونوں صورتوں میں ان نامعلوم طاقتوں کو مشرق وسطیٰ میں اپنا کھیل شروع کرنے کا موقع مل جائے گا۔ جنگ کا عفریت ایک بار بوتل سے باہر آ جائے تو پھر اسے قابو میں کرنا کسی کے بس کی بات نہیں رہتی۔"

وہ بدستور خاموش تھے۔ بس سگار کے ہلکے ہلکے کش لئے جا رہے تھے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "سب کو معلوم ہے کہ بڑی طاقتوں نے تمام چھوٹے اور ترقی پذیر ملکوں کو جاگیر کی طرح آپس میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ بعض ملک تو علی الاعلان ان کی کالونیاں بنے ہوئے ہیں اور بعض بظاہر بڑے شیر بنے رہتے ہیں لیکن درپردہ وہ بھی ان کے سامنے کھلاتے رہتے ہیں۔ انہوں نے واضح طور پر ہر خطے' ہر قوم کو دو بلاکوں میں بانٹ لیا ہے تاکہ دنیا ہمیشہ آپس میں دست بہ گریباں رہے' صرف وہ چند ممالک آپس میں بھی نہ الجھیں' ایک دوسرے کو کچھ نہ کہیں۔ صرف دنیا کو دکھانے کے لئے ذرا ایک دوسرے پر آنکھیں نکالتے رہیں' ایک دوسرے کو گیدڑ بھبکیاں دیتے رہیں لیکن درحقیقت یہ صرف دوسروں کی سرزمین کو میدان کارزار بنائے رکھیں اور دوسری قوموں کے افراد ان کی چھیڑی ہوئی جنگوں کا ایندھن بنتے رہیں۔ اس صورت حال کو اب پرائمری اسکولوں کے بچے بھی سمجھتے ہیں لیکن تمام چھوٹے ملکوں کے بڑے بڑے مدبر بھی مل کر تباہی و بدحالی کے اس گڑھے سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں کرتے۔"

"مجبوریوں کی زنجیریں بہت مضبوط ہیں مسٹر چوہدری!" حفیظ صاحب ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے "چوہے ادھر ادھر بھاگنے کی بہت کوشش کرتے ہیں مگر چوہے دان بڑی خوب صورتی سے تیار کئے گئے ہیں۔ پھر چوہوں کی اپنی نااتفاقیاں بھی ہیں۔ لیڈر شپ کے جھگڑے بھی ہیں۔ کرپشن بھی ہے۔ دولت کے لئے بک جانے والے اور ہر کام کر گزرنے والے بے ضمیر چوہے بھی ہیں جو اپنی ہی قوم' اپنے ہی ملک کی جڑیں کھوکھلی کرتے رہتے ہیں۔ اچھائی کی قوتیں خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہوں وہ برائی کی ان تمام قوتوں کو یکدم صاف کر کے اس دنیا کو صاف ستھری' پُرسکون اور آئیڈیل کبھی نہیں بنا سکتیں۔ بُری قوتیں اپنا کام کرتی رہتی ہیں' اچھی قوتیں اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ دنیا کا نظام اسی طرح چلتا رہتا ہے۔"

"مجھے آپ کی بات سے اختلاف نہیں ہے" میں نے کہا "میں بھی اچھائی کے ہاتھ مضبوط کرنے کے ارادے سے آیا تھا۔ میرے لئے میرا کاروبار یا ساکھ بھی اتنی اہم نہیں ہے جتنا میری نظر میں آپ کا مشن اہم ہے۔ میں اس مشن کی جزئیات اور تفصیلات سے واقف نہیں' مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے اور ہمارے برادر ملکوں کے مفاد میں ہیں لیکن عین ممکن ہے کہ بظاہر ہمارے ہمدرد نظر آنے والے کسی ملک نے ہی "کو آرڈی نیٹر زانٹرنیشنل" کو تھپکی دی ہو' گرین سگنل دیا ہو کہ حفیظ صاحب کو اس مشن سے روک دیا جائے کیوں کہ آپ کا مشن کامیاب ہونے کی صورت میں اسلحے کی تجارت کے بہت سے پول کھلنے کا بھی اندیشہ ہے۔ ایک ہی ملک بعض اوقات دو مختلف متحارب گروپوں کو اسلحہ سپلائی کر رہا ہوتا ہے لیکن دونوں جگہ اس نے مختلف نقابیں پہن رکھی ہوتی ہیں۔ یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں ہی ان کی نقابیں ہیں۔"

"کسی حد تک آپ کے تجزیے درست ہیں مسٹر چوہدری!" منسٹر صاحب پہلو بدل کر بولے "اس میں شک نہیں کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی خوفناک سرگرمیاں اپنے اصل کاروباروں سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ اسلحے کی تجارت میں بعض کمپنیوں کے کردار بھی مجھے علم ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ کمپنیاں بہت سے ملکوں میں کرپٹ اور ضمیر فروش سیاست دان تیار کرتی ہیں' انہیں پالتی ہیں' مقبول ہونے کے لئے انہیں حکمت عملیاں تیار کر کے دیتی ہیں' انہیں الیکشن لڑواتی ہیں' ان کے لئے ہر طرح کی سرمایہ کاری کرتی ہیں اور بعد میں یہ سب کچھ ان کی قوموں اور ان ملکوں سے مع سود وصول کرتی ہیں....."

منسٹر صاحب اب کچھ کھلنے پر آمادہ نظر آ رہے تھے تاہم اب بھی وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر' ایک ایک لفظ کو تولتے ہوئے بڑے محتاط اور مخصوص ڈپلومیٹک انداز میں بول رہے تھے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انہوں نے سلسلہ کلام جوڑا "جس قسم کے مشن پر میں جا رہا ہوں' مجھے اس سے روکنے کے لئے "کو آرڈی نیٹر زانٹرنیشنل" یا اس کی پشت پناہی کرنے والے ملکوں کے سامنے بہت سے طریقے ہو سکتے تھے۔ ہم پر سیاسی دباؤ ڈالا جا سکتا تھا۔ کسی بھی طریقے سے ہمارے اور ہمارے برادر ملکوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کی جا سکتی تھیں۔ مجھے بہت بھاری رشوت کی پیشکش کی جا سکتی تھی جس کا حساب سن کر میری عمر بھر کی اصول پسندی اور دیانت داری ڈگمگا جاتی..... اور کئی طریقے ہو سکتے تھے۔ لیکن مجھے قتل کرانا ان کے لئے محض دردِ سر ہو گا۔"

"وہ کیوں سر؟ میرے خیال میں تو یہ شارٹ کٹ ہے۔ کیوں کہ ان کے پاس وقت کم ہے' پرسوں تو آپ روانہ ہو رہے ہیں" میں نے کہا۔

ان کے ہونٹوں پر مربیانہ سی مسکراہٹ کی رمق نمودار ہوئی۔ "مسٹر چوہدری! مجھے اور آپ کو اس خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہئے کہ اس قسم کی طاقتوں کو ہمارے مشن کا عین وقت پر پتا چلا ہو گا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دنیا کے جاسوسی کے سب سے بڑے اور بہترین ادارے ان کے لئے خدمات انجام دیتے ہیں۔ ہم جیسے ملکوں میں تو کسی منصوبے پر ابھی کاغذی کام شروع ہوتا ہے تو انہیں پتا چل جاتا ہے خواہ ہم کتنی ہی رازداری برت لیں۔ انہیں جو کچھ کرنا ہوتا ہے اس کے لئے وہ بہت پہلے سے کام شروع کرتے ہیں۔ بہت لمبی منصوبہ بندی ہوتی ہے اور وہ بڑے صبر سے نتائج کا انتظار کرتے ہیں۔ اب جیسے یہ مشرق وسطیٰ میں نت نئے ناسور پیدا کرنے یا یہاں ایک نیا ویت نام بنانے کا مسئلہ ہے اس پر بھی بہت پہلے سے کام ہو رہا ہے۔ اگر فی الحال مجھ جیسے کچھ لوگوں کی کوششوں سے یا کچھ سربراہان مملکت کی سمجھ داری سے یہ مسئلہ ٹل بھی گیا تب بھی وہ اس منصوبے کو منسوخ نہیں کریں گے۔ خواہ کتنی ہی سست رفتاری سہی' لیکن اس پر کام جاری رہے گا۔ خواہ اس دوران حالات کے مطابق اس کی شکل بدل جائے' اس میں بہت سی تبدیلیاں آ جائیں لیکن پانچ سال' دس سال' حتیٰ کہ پندرہ یا بیس سال بعد بھی کسی نہ کسی طرح اس پر عمل ضرور ہو گا۔"

"لیکن وہ بات پھر بھی رہ گئی..... آپ کا قتل بھلا ان کے لئے دردِ سر کیوں ہو گا؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں نے کہا نا کہ وزیر خارجہ ہر ملک کی ناک ہوتا ہے" وہ بولے "اگر مجھے قتل کیا گیا تو اس کی بڑے پیمانے پر نمایاں قسم کی تفتیش ضروری ہو گی خواہ اس کی تفصیلات اخبارات میں نہ آئیں۔ ہماری ایجنسیاں خواہ کتنی ہی سست' نااہل اور کرپٹ ہو جاتی ہوں لیکن وہ اتنی گئی گزری بھی نہیں ہیں کہ وہ کچھ کرتی ہی نہ ہوں۔ تفتیش کا کوئی نہ کوئی سرا اس ملٹی نیشنل کمپنی تک ضرور پہنچے گا اور کسی نہ کسی ایجنسی کی رپورٹ میں اس کا نام ضرور آ جائے گا۔ اس بات کو نہ تو کمپنیاں پسند کرتی ہیں اور نہ ہی اس کی پشت پناہی کرنے والے ممالک۔ ان کے دھندے خواہ کچھ بھی ہوں لیکن وہ بہت نیک نام رہتی ہیں۔ اپنی نیک نامی پر وہ کروڑوں ڈالر ماہانہ خرچ کرتی ہیں۔ پریس کو خوش رکھنے کے لئے کروڑوں کے اشتہارات دیتی ہیں۔ خود اپنے انہوں نے سیکڑوں اخبارات و رسائل نکالے ہوئے ہوتے ہیں۔ ٹی وی چینل خریدے ہوئے ہوتے ہیں۔ سیکڑوں رفاہی ٹرسٹ اور ادارے ان کے زیر انتظام کام کرتے ہیں۔ وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتیں کہ کسی ملک کے وزیر خارجہ کے قتل کی تفتیشی رپورٹ میں ان کا نام آئے۔ اور پھر بھی ایک ایسا وزیر خارجہ جو بہت اہم امن مشن پر جا رہا تھا۔"

"سر! میں نے عرض کیا تھا کہ ضروری نہیں آپ کا قتل واقعی قتل نظر آئے۔ آپ کا نظریہ ہے کہ کسی کو قتل کرانے کے لئے صرف ڈائرکٹ ایکشن ہوتا ہے۔ یعنی بس نشانہ کر کے گولی مار دی جائے" میں نے کہا "لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہر موقعے پر ایسا ضروری نہیں ہوتا۔ خدانخواستہ آپ کو ہارٹ اٹیک بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں ہر ماہ باقاعدگی سے اپنا میڈیکل چیک اپ کراتا ہوں۔ میرا تازہ ترین میڈیکل چیک اپ پچھلے ہفتے ہی ہوا ہے۔ ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ میرا دل اتنا ہی صحت مند ہے جتنا کسی بیس سال کے نوجوان کا ہو سکتا ہے" حفیظ صاحب نپی تلی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

"ڈاکٹروں نے آپ کو یہ تو نہیں بتایا ہو گا کہ آپ پر زہر کا اثر نہیں ہو سکتا؟" میں نے سادگی سے کہا۔ یہی بات یہ تھی کہ حفیظ صاحب کے ردعمل نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جو انسان جتنے اونچے عہدے پر فائز ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اسے اپنی جان کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اسے اگر کوئی جھوٹے سے بھی جا کر کہہ دے کہ اس کے قتل کی سازش ہو رہی ہے تو وہ خوف سے اچھل پڑتا ہے' اس کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے اور وہ اپنی حفاظت کے ذمے دار افراد میں ایک ہلچل برپا کر دیتا ہے' آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔

لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ حفیظ صاحب یقین کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھے کہ کوئی انہیں قتل کرنے کی سازش کر سکتا

ہے۔ ان کا سارا زور بیان اور دلیلیں میرے اندیشوں اور میری اطلاعات کو غلط ثابت کرنے میں صرف ہو رہی تھیں۔ تاہم وہ بات کافی حد تک تحمل اور شفقت سے کر رہے تھے ورنہ شاید میں انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر چلا آتا۔ شاید وہ میرا حوصلہ آزما رہے تھے کہ میں اپنے موقف اور اپنے اندازوں پر قائم رہنے کے سلسلے میں کتنا مستقل مزاج ہوں۔ بعض لوگ اس طرح بھی کسی کی بات کے وزن کا اندازہ کرتے ہیں۔

ایک بار پھر وہ مربیانہ سے انداز میں بولے "مسٹر چوہدری! آپ ایک بڑے بزنس مین ہیں۔ آپ کو فارغ وقت میسر تو نہیں آتا ہوگا۔ لیکن اگر کبھی تھوڑی بہت فرصت میسر آجاتی ہے تو اس میں آپ اسپائی ایجنٹوں کی کہانیاں تو نہیں پڑھتے؟ ان میں بڑی دور کی کوڑی لائی جاتی ہے۔ مثلاً سی آئی اے ایجنٹ نے کسی ڈکٹیٹر کے جوتوں پر زہریلا پاؤڈر چھڑک دیا جس کے اثر سے اس کی مونچھیں اکثر کر گر پڑیں اور اس نے پٹ سے گر کر دم توڑ دیا۔ یا پھر کے جی بی ایجنٹ نے کسی بادشاہ کے پسندیدہ چیونگم کے ڈبے میں ایک زہریلا چیونگم شامل کر دیا جس سے اس کے دانت نکل کر گر پڑے اور آنتیں ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو گئیں۔ یہ سب خیالی پلاؤ ہے مسٹر چوہدری! یہ لوگوں کو وقت گزاری اور تفریح مہیا کرنے کے ذرائع ہیں۔ رائٹر بیٹھے اس قسم کی کہانیاں سوچتے رہتے ہیں۔ انہیں پڑھ کر لوگوں کا وقت کچھ اچھا گزر جاتا ہے۔ وہ اپنے مسائل سے چند دیر کے لئے فرار حاصل کر کے سنسنی خیزی کی ایک انوکھی دنیا میں چلے جاتے ہیں۔ لیکن ہم اور آپ جیسے لوگوں کو حقائق کی دنیا میں رہنا پڑتا ہے۔ خصوصاً میں تو بچپن میں بھی اس قسم کے فکشن اور فلموں سے لطف اندوز نہیں ہو سکا۔"

"سر!" میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے آخر کار ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں ہلکی سی سرد مہری بھی در آئی "بعض اوقات ساری دلیلیں، سارے جواز انسان کو دھوکا دے جاتے ہیں اور وہ کچھ ہو جاتا ہے جس کی کوئی دلیل، کوئی جواز نہیں ہوتا۔ ساری منطق دھری رہ جاتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں دلیلوں اور منطق سے زیادہ اپنی حسیات پر بھروسہ کیا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ میری حسیات نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا۔ آپ ایک اچھے آدمی ہیں۔ میں آپ کے عہدے کی وجہ سے نہیں، آپ کی اچھی شہرت کی وجہ سے آپ کی قدر کرتا ہوں۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ منطق، دلائل اور اپنی معلومات پر زیادہ انحصار نہ کریں۔ آپ میری بات مان لیں۔ میری حسیات پر بھروسہ کر لیں۔ اس میں آپ کا کوئی نقصان تو نہیں ہے۔ میری حسیات مجھے بتا رہی ہیں کہ مجھے موصول ہونے والی اطلاعات غلط نہیں ہیں۔ میں فضا میں سازش کی بو محسوس کر رہا ہوں۔ حتیٰ کہ میں آپ کو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ آپ کو کس طرح قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ خواہ اسے آپ میرا وجدان کہہ لیجئے۔"

"کس طرح؟" انہوں نے ایک لمحے کے گہرے سکوت کے بعد پوچھا۔ اب ان کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے الفاظ ان کے منطق پسند پتھریلے دل میں اتر چکے تھے۔

"آپ کو ہارٹ اٹیک کے ذریعے "قتل" کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کوئی اسے قتل کہہ ہی نہیں سکے گا۔ اس لئے تحقیقات، تفتیش اور دوسرے لمبے چکروں کی نوبت ہی نہیں آئے گی" میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے" وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی آواز اب سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

"عین آخری وقت پر تقریب کی جگہ بدل لیجئے۔ ڈنر میرے ہوٹل کے بجائے کہیں اور رکھ لیجئے۔ انتہائی رازداری کے ساتھ۔ کراچی میں یہ انتظامات میں بھی کرا سکتا ہوں۔ بالکل آخری گھڑی میں مہمانوں کو اس تبدیلی سے مطلع کیا جائے" میں نے تجویز پیش کی۔

"ناممکن" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے "جس سطح کے لوگ اس تقریب میں آ رہے ہیں ان کے ساتھ اس طرح نہیں کیا جاتا۔ یہ ذاتی طور پر میرے اور میرے ملک کے وقار کے بھی خلاف ہے۔ ڈنر میں بڑے ملکوں کے سفارت کار اور بعض ملکوں کے وزرائے خارجہ بھی موجود ہوں گے۔ سب کو اندازہ ہو جائے گا کہ سیکیورٹی کے مسئلے کی وجہ سے جگہ تبدیل کی گئی ہے۔ وہ دل میں ہنسیں گے کہ ہم ایک تقریب کے لئے سیکیورٹی کے مسائل سے نہیں نمٹ سکتے اور ایک امن مشن لے کر دنیا کے ایک اہم خطے میں امن قائم کرانے جا رہے ہیں۔ ہمارے مقام و منزلت کے غبارے سے یہیں ہوا نکل جائے گی۔ اس معمولی سی بات کے میرے مشن پر بہت برے اثرات مرتب ہوں گے۔"

"تو پھر میری دوسری تجویز مان لیجئے۔ وہ یہ کہ کم از کم آپ اس تقریب میں نہ کوئی چیز کھائیں نہ پئیں۔ چکھیں تک نہیں۔ حتیٰ کہ پانی بھی مت پئیں۔ خرابیٔ صحت کا بہانہ کر لیں۔ کچھ بھی کر لیں" میں نے کہا۔

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی انگلیوں میں دبے ہوئے سگار سے دھوئیں کی پتلی سی لکیر ایئر کنڈیشنڈ کمرے کی خنک فضا میں بلند ہو رہی تھی۔

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر ایک سرکش مسافر کی سرگرانی ابھی جاری ہے باقی واقعات چوتھے حصے میں پڑھیں۔